READING SECTION
Online Library For Pakistan

READING SECTION
Online Library For Pakistan
WWW.PAKSOCIETY.COM

جلد46 • شمارہ03 مارچ 2016 • زرِ سالانہ 800 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •
خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر215 کراچی 74200 • فون: 35895313 (021) فیکس 35802551 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول • مقام اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکسٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

انشائیہ

نیکی

جون ایلیا

بستیاں سوالوں کے انبوہ میں گھری ہوئی ہیں، ساتھ ہی وہ مسئلے ہیں جن سے ساری دنیا دوچار ہے۔ ہر مسئلہ اپنے سے بڑے مسئلے کا حل چاہتا ہے اور یہ دائرہ پھیلتا ہی چلا جاتا ہے۔ اگر ہماری آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی نہیں ہے، زبان گنگ نہیں گئی ہے اور عقل کو جنون نہیں ہو گیا ہے تو بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم زندگی کی ان تیز و تند حقیقتوں سے بھاگ کر اپنے اندر پناہ لینا چاہیں، مسئلوں کے اس ہجوم میں انسانیت کے کھوے چھل گئے ہیں۔ تم ذرا دیکھو تو انسانیت کی جواں ہمتی پر کس قدر بوجھ ڈال دیا گیا ہے۔ پر انسانیت کا یہ قافلہ افتاں و خیزاں برابر آگے بڑھ رہا ہے۔ جاننے، نہ جاننے اور سب کچھ جان کر انجان بننے کے درمیان ایک جنگ ہے جو صدیوں سے جاری ہے۔ آج بھی سچائی کو جھٹلایا جاتا ہے پر ایسا ہے کہ لہجے کی کھوٹ اور کپٹ اب نہیں چھپتی۔ انسان کی تمام بدبختیوں نے نادانی اور ناحق کوشی کی کوکھ سے جنم لیا ہے، جھگڑا بس یہ ہے کہ بعض مسخرے اس کرۂ ارض پر سر کے بل چلنا چاہتے ہیں۔ ہم نے انہیں ٹوکا اور برابر ٹوکتے رہیں گے، یہ ملکوں اور قوموں کا جھگڑا نہیں ہے، قدروں کا جھگڑا ہے۔

انسانیت ایک خاندان ہے نہ اس میں کوئی امتیاز ہے اور نہ تفریق، جو تفریق پیدا کرتے ہیں وہ اس مقدس خاندان میں شامل نہیں۔ لکھنے والوں اور بولنے والوں کا جتنا بھی مقدور ہو اس کے مطابق عالمگیر سماج کے قیام کی کوشش کرنا ان کا سب سے پہلا فرض ہے۔ یہ وہ مقصد ہے جو ہمیں سب سے زیادہ عزیز ہے۔ جب ہم امریکا یا انگلستان کو بُرا کہتے ہیں تو وہاں کے شریف عوام اور دانشور مراد نہیں ہوتے، وہ تو ہمارے خاندان کے محترم رکن ہیں۔ انسانیت دشمن چاہے پاکستان کے رہنے والے ہوں یا امریکا اور انگلستان کے، وہ ہماری نفرت کے یکساں طور پر مستحق ہیں۔ دنیا میں صرف دو عقیدے پائے جاتے ہیں۔ انسانیت اور انسانیت دشمنی اور صرف دو قومیں رہتی ہیں انسان اور انسان دشمن۔ یہ دنیا کے ہر حصے میں ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہیں۔ یہ شاید ایک اتفاق ہے کہ ہمیں ایک ایسے دور میں اپنے انسانی فرض کی بجا آوری کا موقع ملا ہے جب انسانیت کے دشمنوں نے مغرب کو اپنا مرکز قرار دیا ہے۔ اگر یہ مرکزیت مشرق کو حاصل ہو جائے تو پھر ہماری تمام سخت کلامیوں کا ہدف مشرق قرار پائے گا۔

پیشہ ور مجرموں کے اس عالمی جتھے سے خبردار رہو جو نہ مغرب کا دوست ہے اور نہ مشرق کا۔ تمہاری تمام مصیبتوں اور محرومیوں کے ذمے دار یہی لوگ ہیں۔ یہ اور ان کے ہوا خواہ انسانوں کو بہلانے اور بہکانے کے ہنر میں طاق ہیں۔ دیکھو، صرف اچھی باتوں ہی کو اپنا مداوا نہ سمجھو، صرف باتوں سے بدن پر گوشت نہیں چڑھتا۔ ان جھوٹے اور باتونی چارہ گروں کی باتوں میں نہ آنا، یہ تمہیں محض خوش آئند لفظوں پر قانع رکھنا چاہتے ہیں۔ اگر زندہ رہنا ہے تو ایسی قناعت سے پناہ مانگو۔ اور ہاں، عالمی اخوت کے جعلی نعروں کا فریب کبھی نہ کھانا۔ کچھ لوگ ہیں جو اس باب میں بہت عجیب باتیں کرتے ہیں، یہ اپنے سرپرستوں سے کچھ کم نہیں ہیں۔ انہوں نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے۔

لو انہیں پہچانو! یہ گروہ اپنے ذاتی عقیدے کو دوسروں پر مسلط کرنا چاہتا ہے۔ انہیں اس کی کوئی فکر نہیں کہ ایک شخص فاقے کی آگ میں جل رہا ہے، انہیں تو صرف اس بات سے سروکار ہے کہ وہ ان کا عقیدہ تسلیم کرتا ہے یا نہیں۔ یہ حضرات زمین اور اس کے معاملوں سے بہت بلند ہیں۔ انہوں نے تو آسمانوں کو گویا چھین لیا ہے۔ ان کے مقدس عقیدے کا نہ کوئی وطن ہے اور نہ کوئی زبان۔ یہ بستیوں کی امنگوں کو بجھا دینا چاہتے ہیں۔ عالمی سماج کا نظریہ تمہیں وطن دشمنی اور اپنی تہذیب سے غداری کرنے کی تعلیم نہیں دیتا۔ مگر جس عالمی اخوت کا نعرہ یہ لوگ بلند کرتے ہیں، اس کا حاصل یہ ہے کہ تم اپنی آزادی، استحکام، حب وطن سماجی سالمیت اور اپنی تخلیقی انا سے یکسر دست بردار ہو جاؤ، اچھا فرض کرو کہ ان کا مطلب یہ نہیں ہے اور ہم بہتان تراشی سے کام لے رہے ہیں، پر یہ سوچو کہ اگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں اور تم اپنی زبان، تہذیب اور اپنے وطن کی محبت سے یکسر بیگانہ ہو جاؤ تو اس کا فائدہ کون اٹھائے گا، تم یا تمہارے دشمن؟ یقین کر لو اس کا فائدہ تمہارے دشمن اٹھائیں گے جو خود ان حضرات کے بھی دوست نہیں ہیں۔

کچھ لوگ ہیں جو اس ملک کو برا کہہ کر ہی سکون پاتے ہیں۔ ایسے لوگ صرف یہیں پائے جاتے ہیں، دنیا کی کوئی قوم بھی ایسی نہیں ہے جو ایسے لوگوں کو اپنے درمیان پائے اور انہیں برداشت کرتی رہے۔ جنہیں اس قوم پر غصہ آتا ہے ان کا احترام کرو، ان کے سامنے محبت اور عقیدت سے گردنیں جھکاؤ مگر جو صرف برائی کرنا اور پاکستان کی تحریک کو طعنے دینا جانتے ہیں، انہیں نمک حرام اور غدار جانو کہ بُروں کو برا کہنا اور سمجھنا بھی بڑی نیکی ہے۔

☆....☆....☆....

محترم قارئین

السلام علیکم!

مارچ 2016ء کا خوب صورت شمارہ آپ کے حسین لحات کی نذر ہے۔ ہر سال کچھ یادگار دن اپنی تاریخی اہمیت کا احساس دلانے آتے اور...... گزر جاتے ہیں۔ انھی دنوں میں 23 مارچ کا حوالہ بھی کسی خوب صورت خواب کے مانند شامل ہے۔ بے شک اس خواب کی تعبیر اور تکمیل آنے والے دنوں میں ایسے ہوئی جیسے کوئی اپنے گھر کی تعمیر سے تزئین تک محنت و مشقت کرتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ یہ ملک ہمارا اپنا گھر ہے لیکن...... جس گھر میں بے قاعدگی اور بے اصولی جنم لے لے وہ گھر جہنم بھی بن جاتا ہے، جس کی چھوٹی سی مثال پچھلے دنوں دیکھنے میں آئی جب ایک شہری اپنی نئی بائیک پر سوار ٹریفک قوانین کی پاسداری کرتے ہوئے سگنل کھلنے کا منتظر تھا کہ ایک باوردی شخص قریب آیا اور بنا کسی قصور کے بائیک کی چابی اپنے اختیار میں کرلی۔ یہ صورت حال دیکھ کر آس پاس کھڑے شہری اصل بات سمجھ گئے اور یہ سوچتے ہوئے آگے بڑھ گئے کہ کیا نئی گاڑی خریدنا یا نیا گھر بنانا اس ملک میں غریب لوگوں کے لیے واقعی کوئی ایسا ہی جرم بن گیا ہے کہ چلتے پھرتے کوئی بھی شخص کبھی باوردی اور کبھی بنا وردی میں، پیسے وصولنے آجائے۔ یہ قابلِ فکر لمحہ ہے کہ کوئی اپنے ہی گھر میں ناحق زیادتیوں اور ناانصافیوں کا شکار ہوجائے۔ یہ تو معمولی سی بات ہے جس پر آنے والا کل اور آنے والی نسل غیر محفوظ ہیں شاید...... کیا ہمارے ملک میں ان چھوٹی چھوٹی زیادتیوں پر بھی قابو نہیں پایا جاسکتا جو مستقبل میں کسی بڑے جرم کا پیش خیمہ بن سکتی ہیں۔ گویا ڈھکے چھپے انداز میں بہت خوف ناک ماحول کی پرورش ہورہی ہے۔ ان تمام معاملات پر افسوس اپنی جگہ لیکن ایک اور دکھ نے دل میں گھر کرلیا ہے، چونکہ پرچے کی تیاری قبل از وقت کی جاتی ہے، اسی دوران 6 فروری 2016ء کو اچانک ایک المناک خبر ملی کہ اردو زبان میں طویل ترین داستان "دیوتا" کے خالق جناب محی الدین نواب جو کافی دنوں سے علیل تھے، رضائے الٰہی سے اپنے خالقِ حقیقی سے جاملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون...... اس محبوب قلمکار کی سسپنس سے طویل رفاقت بالآخر تمام ہوئی۔ ایک کامیاب مصنف کی یہی خوبی ہوتی ہے کہ بعد از مرگ بھی اپنی یادگار تحریروں میں ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔ محی الدین نواب نے بھی قارئین کے دل اپنے منفرد اسلوب اور خیالات کی اونچی پرواز سے جیت لیے تھے۔ اللہ رب العزت آپ کو بہت اونچا مقام عطا فرمائے۔ (آمین)۔ انھی باتوں کے ساتھ اب چلتے ہیں اپنی پیاری سی محفل کی جانب جہاں سب منتظر ہیں پیغامات کے۔

⌘ **محمد قدرت اللہ نیازی، حکیم ٹاؤن خانیوال سے محفل کی زینت بنے ہیں**

"یہ کس نے مانگا لہو کا خراج ہم سے
ابھی تو سوئے تھے مقتل کو سرخرو کرکے"

اے پی ایس اسکول کے شہداء کو خراج عقیدت پیش کرنے کے ایک ماہ بعد... جنوری میں.... دشمن پاکستانی قوم کو ایک بار پھر گہرا چرکا لگانے کے ناپاک مقصد میں کامیاب ہوگیا۔ کئی والدین کے کلیجے شق ہوگئے۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ پاک دشمن کو اپنے ناپاک ارادوں میں ناکام فرمائے۔ سانحہ چارسدہ کی سوگواری نے کئی دن تک سسپنس سے بھی دور رکھا۔ کرسیِ صدارت پر آغا سلمان پاشا کو براجمان پایا۔ ان کا تبصرہ پڑھنا شروع کیا تو عجیب الجھن محسوس ہوئی۔ موصوف کا کہنا تھا کہ باورچی خانے سے ذرا فرصت ملی تو...... ہم سوچنے لگے کہ ماجرا کیا ہے تاہم عمران سیریز کا حوالہ دیکھا تو پس منظر واضح ہوا اور یہ اندازہ بھی کہ موصوف عمران سیریز کے دیوانے ہیں۔ آغاجی! صدارت کی مبارک ہو۔ اپنے ایک اور آغا بھی ہوتے ہیں۔ آغا فریدان کو بھی ساتھ لیتے آنا تھا۔ سید ثاقب علی شاہ! شعری پسندیدگی کا شکریہ۔ آپ کے لیے دعاگو ہیں کہ آپ کو بھی بیگ صاحب جیسا وکیل میسر آئے اور آزادی آپ کا مقدر بنے۔ محمد یوسف سانول! آپ کو بھی اس بار پریکٹس مل گئیں اب تو مسکرادیں۔ اللہ تمام بیماروں کو شفائے کاملہ عطا فرمائے۔ ذومعنی جملے اور الفاظ کا چناؤ مزہ دے گیا، آتے رہا کریں۔ علاوہ ازیں زرین خان آفریدی بھائی نہیں بہن ہیں۔ مسز صدیقی! اتنی خلوص بھری پیاری دعا پر آپ کا بہت مشکور ہوں۔ آپ کی تجویز زبردست ہے۔ کہانیوں میں سب سے پہلی ترجیح بلاشبہ شیش محل ٹھہری۔ ربن دادا کی دوربیں نگاہیں شگفتلا کو بربادی سے بچانے کا سبب بن گئیں۔ ربن کو ایک جگہ سوچتے ہوئے فاروق نے اپنے

آپ سے کہا کہ بھائیہ سیٹھ کے بھتیجے کو کیسے مارا ہوگا رین تے؟ بالکل یہی بات میرے ذہن میں بھی گردش کرتی رہی کہ اس قدر نرم دل، پُرخلوص انسان داداگیری کیسے کرتا ہوگا؟ تحریر واقعی بہترین ہے اور پڑھتے ہوئے کیفیت عجیب ہوجاتی ہے۔ آخری صفحات پر ڈاکٹر بھٹی کشمیر کے سلگتے موضوع پر کفن بردوش کے ساتھ موجود تھے۔ وادیِ کشمیر کے پس منظر سے خوب آگاہی ملی۔ کئی تاریخی واقعات پہلی بار پڑھنے کو ملے۔ شیر علی کے باپ کے خدشات درست ثابت ہوئے اور شیر علی آخر کار بھارتی فوجیوں کے ہتھے چڑھ گیا۔ تنویر اور غزالہ پاکستانی بہن بھائی مقبوضہ کشمیر کی سیر و سیاحت پر نکلے ہوئے تھے۔ کاشف زبیر کی میاد ہمیشہ کی طرح بہترین رہی۔ سجاد اور شاہین خدا کی لاٹھی کا شکار ہوگئے۔ کاشف زبیر نے ایک بار پھر اچھوتے موضوع پر قلم اٹھایا اور ہم بھی سوچنے لگے کہ یادداشت گم ہونے اور واپس آنے کے درمیانی عرصے کی کیا صورتِ حال ہوتی ہوگی۔ سوشل میڈیا پر کاشف زبیر کی علالت کے بارے میں پڑھا۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ انہیں شفائے کاملہ عطا فرمائے۔ آمین۔'' (بالکل ٹھیک کہا آپ نے۔ اللہ تعالیٰ ہماری دعائیں قبول فرمائے۔ آپ کی تجویز نوٹ کر لی گئی ہے)

⌘ **اشفاق شاہین**، کراچی سے محفل میں شریک ہیں ''اداریے میں جون ایلیا کی پُرمغز اور گنجلک باتیں ہمیں جھنجوڑتی نظر آئیں اور ہم ہیں کہ خوابِ غفلت سے جاگنے کو تیار ہی نہیں، یہی ہماری بدقسمتی ہے۔ جس دن ہمارا ہنرمند اپنے ملک کو ترجیح دے گا تبھی ہم مضبوط بنیاد رکھ پائیں گے ایک نئے پاکستان کی۔ محفل میں پہنچے۔ آغا سلمان پاشا دبنگ انٹری کے ساتھ کرسیِ صدارت پر فائز تھے، خوش آمدید۔ ثاقب شاہ آپ کی ہمت کو سلام۔ عبادت کاظمی، میری نیک دعائیں آپ کے ساتھ۔ جبار رومی، صفدر معاویہ، جاوید خان، حنا عروج بہترین خطوط کے ساتھ شاملِ محفل تھے، باقی تمام دوستوں کے خطوط بھی بہت اچھے تھے۔ چلتے ہیں تبصرے کی طرف۔ سلطانہ، ڈاکٹر ساجد امجد نے تاریخ کے کئی خفیہ گوشوں سے روشناس کروایا۔ معلومات میں اچھا خاصا اضافہ ہوا۔ صیاد سسپنس سے بھرپور، پُراثر مختصر تحریر تھی۔ شیش محل پرچے کی جان ہے خصوصاً فاروق کا کردار اور ربن اور جولیٹ کے کردار بھی بہت دلچسپ اور اہم ہیں، بہت زبردست جارہی ہے۔ بدلتے موسم بھی خوب رہی۔ آسمان سے گرا، ملک صفدر حیات کا خوب کارنامہ تھا، پُراثر تحریر تھی۔ ویری گڈ۔ فرسٹ ڈیلیوری، بہت خوب صورت اور قابلِ داد تحریر تھی۔ حضرت سلطان باہوؒ کے حالاتِ زندگی سے آگاہی اور ان کی تعلیمات سے خود کو منور کیا۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کفن بردوش، آخری صفحات کی تحریر تھی۔ ان کا موضوع المناک ہے، بہت اچھا لکھتے ہیں۔ میری خواہش ہے کہ اب کے ڈاکٹر صاحب معاشرتی کہانیاں بھی لکھیں، انہی صفحات پر۔ محفل شعروسخن میں انتخاب زبردست رہا۔ میرا شعر انعامی رہا خوشی ہوئی۔ کرن شفیق، عارفہ جاوید اور اطہر حسین کا انتخاب لاجواب تھا۔ تمام احباب کو موسم بہار کی آمد مبارک ہو۔'' (بہت شکریہ)

⌘ **بشریٰ افضل**، بہاولپور سے تشریف لائی ہیں۔ ''سسپنس ڈائجسٹ کافی لیٹ ملا۔ صنفِ نازک دیا جلائے کس کے انتظار میں اداس بیٹھی ہے۔ بالوں کا اسٹائل بھی اچھا لگا۔ صنفِ نازک کہہ رہی ہے (آجا کہ انتظار میں جانے کو ہے بہار بھی) جون ایلیا کا (بے دولتی) پڑھا۔ ایک سچی سرگزشت نے ہماری معلومات کے ذخیرے میں اضافہ کیا۔ اپنی محفل میں پہنچے تو انکل کی باتیں سنیں۔ آغا سلمان پاشا کو کرسیِ صدارت پر براجمان پایا۔ محمد جاوید خان آپ کو دیکھ کر، سید عبادت کاظمی آپ کے قدم کیوں بوجھل ہوگئے، اتنی ٹینشن نہ لیا کریں۔ سید عبادت کاظمی آپ کی بات سے متفق ہوں مگر دنیا کے کام نہیں رکتے۔ بس اتنا ہی لکھ پاتی ہوں۔ باقی آئندہ ماہ۔'' (آئندہ ماہ آپ کے بھرپور تبصرے کا انتظار رہے گا)

⌘ **صادق معاویہ سعیدی** کی رحیم یار خان سے آمد ''سسپنس کا پرانا قاری ہوں۔ اتنا کہ اب ٹھیک سے یاد بھی نہیں کب پڑھنا شروع کیا تھا چونکہ سسپنس کا شدت سے انتظار ہوتا ہے۔ (پھر تو بار بار خوش آمدید...... اتنی محبت کا شکریہ) اس دفعہ 16 فروری 3 دن تاخیر سے ملا اور 3 دن بھی بہت زیادہ محسوس ہوئے۔ سسپنس سے تعلق تو بہت پرانا ہے لیکن بزمِ یاراں میں شرکت کی جسارت پہلی مرتبہ کررہا ہوں۔ قریب قریب ہر شمارے میں کسی نئے قاری کا خط پڑھتے ہوئے دو باتوں کا احساس ہوا۔ نمبر 1 سسپنس ہر قاری کا ہے اس پر کسی کی اجارہ داری نہیں۔ نمبر 2 آپ کے پاس ردی کی ٹوکری نہیں ہے۔ اگر ہوتی تو نئے قاری کا خط برسوں میں پڑھنے کو ملتا۔ اس لیے مجھے بھی حوصلہ ہوا (کافی گہری نظر ہے آپ کی) اور کاغذ قلم لے کر بیٹھ گیا البتہ بلیک لسٹ موجود ہے، اگر میرا خط شائع نہ ہوا' بلیک لسٹ کی نذر بھی ہوگیا تو مجھے یہ احساس ضرور ہوگا کہ میرا سادہ سا خط آپ کو مل تو ضرور گیا ہے۔ جیسے ہی سسپنس ملا، ٹائٹل سے نظریں چراتے ہوئے فہرست میں جھانکا اور اپنی پسندیدہ ترین کہانی شیش محل کا صفحہ نمبر دیکھا اور فوراً شیش محل میں گھس گئے مکمل پڑھ کر جان چھوڑی۔ کیا کہنے شیش محل کے۔ اسما قادری جی (سوا لکھ مبارکاں) یوں سمجھیے کہ اب سسپنس گویا صرف شیش محل کے لیے خریدتے ہیں۔ شیش محل پڑھتے ہی بزمِ یاراں کا نظارہ کیا۔ آغا سلمان پاشا کی شاندار انٹری اور صدارت کی کرسی مبارک ہو۔ باقی تبصروں میں جناب صفدر معاویہ کا تبصرہ پڑھا اور اچھا لگا۔ باقی تبصرے اور ڈائجسٹ زیرِ مطالعہ ہے، بلیک

لسٹ سے بچنے کے لیے فوری خط لکھ کر ارسال کر رہا ہوں اگر بزم یاراں میں داخلہ مل گیا تو آئندہ ماہ مکمل ڈائجسٹ اور پوری بزم یاراں پڑھ کر مکمل تبصرے کے ساتھ حاضری ہوگی۔'' (لیجیے جناب محفل میں تو شمولیت مل گئی......اب...... دیکھتے ہیں آپ کی اپنائیت کا عالم)

✠ زرین آفریدی، حیدر آباد سندھ سے محفل میں چلی آرہی ہیں ''تشکر استاف سسپنس واحباب سسپنس! اب انشاء اللہ میرا پورا سال کامیاب اور خوشیوں سے بھرا ہوگا۔ (میرا پہلا تبصرہ جو شائع شمارہ ہوا تھا) میں ان دنوں مری، ایوبیہ کے سیر سپاٹے پر ہوں۔ برف باری اور سردی انجوائے کرنے۔ وہیں سے ہی سسپنس ڈائجسٹ ماہنامہ فروری 2016ء خرید لیا۔ سب سے پہلے اپنی محفل کے درشن کیے۔ واللہ! محفل کی رونقیں تو مجھے مری کے مال روڈ کی رونق سے زیادہ اچھی لگیں۔ (یہ ہوتی ہے محبت...... بہت اچھا لگا) صدارت، آغا سلمان پاشا یہ نام بار بار پڑھا کیونکہ تبصرہ کچھ اور بتا رہا تھا، باورچی خانہ، دال ماش تڑکا اور تاک جھانک، کام زنانہ نام مردانہ یا حیرت! (کیسی حیرت...... سسپنس میں سسپنس نہ ہو یہ کیسے ممکن ہے) تبصرہ اے ون تھا، کایا پلیٹ تبصرے کا نام دوں گی جس نے ہمیں مسکرانے پر مجبور کردیا۔ مبارک باد۔ پاشا صاحب میں کرنل تو نہیں البتہ آرمی میں ضرور ہوں۔ سید ثاقب لیڈیز تو ہمیشہ سے ٹیلنٹڈ رہی ہیں۔ خصوصی شکریہ مسز صدیقی صاحبہ کا۔ باقی سب احباب کے چھوٹے بڑے تبصرے بیسٹ رہے۔ چونکہ گھر سے دور برف پوش پہاڑوں سے انجوائے کرنے کے دوران زیادہ کہانیاں نہیں پڑھ سکی۔ دو سلسلہ وار اسٹوریز اور ملک صفدر حیات کی کہانی سے انصاف کیا۔ شیش محل میں ربن داوا نے سفر کے دوران بھی ایکشن اور مار دھاڑ ڈھونڈ ہی لیا۔ ماجد علی کو مار بھگایا اور شگفتلا کو اس کے باپ کے حوالے کردیا۔ اب فاروق کا گر کر بے ہوش ہوجانا، لگتا ہے یہ غنڈا برادری اب چندی گڑھ میں اپنے کارنامے انجام دینے والی ہے۔ ادھر ماروی میں، باب النساء میں بہت کچھ ہوگیا۔ خبارے مکہ شریف پہنچ گئے، محبوب کو ماروی مل گئی۔ بہرحال داستان دلچسپی کا سامان لیے ہوئے ہے۔ ملک صفدر حیات کی آسمان سے گرا، بیچاری شکیلہ واقعی آسمان سے گری کھجور میں اٹکی اور مری۔ والدین کے غلط فیصلے پتا نہیں اور کتنی بیٹیوں کی جان لیں گے۔ چودھری افتخار کو تو سزا ملنی ہی تھی۔ ٹائٹل گرل اپنے محبوب سے ملنے کی آس میں دیا جلائے بیٹھی ہے۔ کہانیوں کی فہرست میں دوشیزہ کو دیکھ کر رجنی پٹیل کی یاد آگئی۔ محفل شعر و سخن میں بھی یہ تبدیلی اچھی لگی۔ مراسلے کم تھے لیکن اچھے تھے۔ محفل شعر و سخن پر کافی توجہ دی گئی ہے، اس بار محفل عروج پر تھی۔ ظہیر الدین، شازیہ، نعمان علی، زرمین، رمضان پاشا، آغا سلمان پاشا، اشفاق شاہین اور شاہین فاطمہ کے اشعار زیادہ دل کو بھائے۔ اگلے شمارے میں تمام کہانیوں پر تبصرہ دوں گی۔ اس بار معافی۔ (چلیں معاف کیا...... کیا یاد کریں گی، پسندیدگی کا شکریہ)

✠ سید عبادت کاظمی، ڈیرہ اسماعیل خان سے تشریف لائے ہیں ''سسپنس آج کل بہت انتظار کروانے لگ گیا ہے، کسی روٹھی ہوئی محبوبہ کی طرح بہت انتظار کرواتا ہے (کبھی کبھی اپنی اہمیت کا بھی احساس دلانا چاہیے) جب.... سسپنس ملا... اسی دن چارسدہ میں یونیورسٹی پر حملہ ہوگیا۔ امن کے دشمن پتا نہیں کب تک یوں کرتے رہیں گے۔ علم کے راہی اب خوفزدہ ہورہے ہیں، دل غم سے نڈھال ہے، سسپنس نے غم بانٹ لیا کچھ...... ٹائٹل بہت زبردست ہے۔ دیے سے نکلتا دھواں شاید حسینہ کو ناگوار گزر رہا تھا۔ بے دولتی جون ایلیا نے خوب کہا ہنر کے بارے میں...... آغا سلمان پاشا لیڈرنگ کر رہے تھے۔ زبردست تقریر کی انہوں نے، بہترین تبصرہ تھا۔ سید ثاقب علی شاہ کا تبصرہ بہت اچھا تھا۔ ویسے ہمت اور پیار کی بات ہے کہ جیل سے خط لکھ لیتے ہیں اللہ ان کو رہائی دے (آمین)۔ اس دفعہ محفل دوستاں میں سارے کے سارے ہم نوا بھائی تھے یعنی صنف نازک گنتی کی تھیں۔ وہ بھی صرف دو۔ واہ بھئی واہ یہ ہوئی نا بات۔ گزشتہ ماہ کے سسپنس میں صنف نازک بہت اٹھلا رہی تھی نا۔ (ہاں کبھی کے دن بڑے کبھی کی راتیں) حنا عروج، اطہر حسین، محمد صفدر معاویہ، ڈاکٹر نعیم اکبر، محمد قدرت اللہ نیازی، ناصر علی، جاوید خان اور ادریس احمد خان کے تبصرے اچھے تھے۔ ہمیشہ کی طرح شیش محل سے اسٹارٹ کیا، جولیٹ انتقام میں اندھی ہورہی ہے، اسے پلاننگ کرنی چاہیے۔ ایک نئے کردار شگفتلا کا اضافہ اچھا لگا لیکن جولیٹ کے ساتھ ٹھیک نہیں ہورہا پہلے ماں اب باپ بھی۔ اور فاروق کو پتا نہیں اس کی محبت کے ساتھ کیا ہورہا ہے عارف کو تو واپس مت لائیں، ولدار آغا کا انجام جلد نظر آجائے۔ اس کہانی نے مجھے اپنے سحر میں جکڑ رکھا ہے۔ ماروی تو پلیز اب ختم کردیں، بس...... کفن بردوش زبردست کہانی تھی۔ شیر علی جیسے کئی نوجوانوں کی ضرورت ہے کشمیر کو...... ڈاکٹر عبدالرجب بھٹی کی جاندار کہانی تبصرہ اینڈ پر ادھار رہا۔ سلطانہ تاریخی کہانی زبردست تھی، ایک لڑکی نے ہندوستان پر حکومت کی، ہمت کی بات ہے۔ آسمان سے گرا زبردست اور چونکا دینے والی تحریر تھی۔ فاروق انجم بڑا ہاتھ اور کاشف زبیر صیاد کے ساتھ چھائے رہے۔ بدلتے موسم اور دوسرا گال بھی اچھی کہانیاں تھیں۔ محفل شعر و سخن میں مدحت کا انتخاب اچھا لگا، پیارے دوست سیف خان کو سلام۔''
(رسالے کی پسندیدگی کا شکریہ)

اوریس احمد خان، ناظم آباد کراچی سے تبصرہ کر رہے ہیں ”سسپنس نئی آب و تاب لیے جلوہ گر ہوا۔ نائٹل گرل بھی ذاکر صاحب کی مہارت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ اندر انشائیہ بھی دلوں کی ترجمانی کر رہا تھا۔ خطوط کی محفل میں سرفہرست سلمان پاشا تھے۔ دیگر دوستوں سے بھی ملاقات ہوئی جو اپنی اپنی آراء کا اظہار کر رہے تھے۔ تاریخ کے جھروکوں میں ڈاکٹر ساجد امجد کی رضیہ سلطانہ کی زندگی کے حالات و واقعات سے آگہی ہوئی۔ جس طرح رضیہ سلطانہ نے مجاہدانہ زندگی بسر کی، خواتین میں اول نمبر پر رضیہ سلطانہ کا نام آتا ہے۔ اس کے بعد شیش محل شروع کی شروع سے آخر سطر تک نگاہ نہیں ہٹتی۔ کہانی میں بوریت کا احساس نہیں ہوتا اور واقعات کا تسلسل جاری رہتا ہے۔ بدلتے موسم تنویر ریاض کی کہانی نے بھی اچھا تاثر دیا۔ نئی اقتاد میں فرینک کو اپنے کیے کی سزا ہتھکڑی کی صورت ملی۔ محفل شعر و سخن میں معیاری اشعار نے مزہ دیا۔ دوسرا گال کہانی بھی افادیت کے لحاظ سے اچھی لگی۔ بڑا ہاتھ میں ہاتھ آئی دولت ہاتھ سے نکل گئی۔ اگر مسٹر جارج کو معنوی نام سے خط نہیں لکھتا تو وہ خطوط کو اتنا قیمتی نہیں سمجھتے کہ وہ دولت کی جگہ رکھ دیتے اور اپنی دولت بریف کیس میں بھر لی۔ مجرم ہاتھ ملتا رہ گیا۔ مستعدی بھی اچھی کہانی تھی۔ حضرت سلطان باہوؒ بڑے پائے کے ولی اللہ تھے جب صرف اللہ سے ہی لو لگائی جائے تو اللہ بھی بندے کی ہر خواہش کو پورا کر دیتا ہے بشرطیکہ اللہ سے ہی طلب کرے۔ ولیوں کے حالات میں دل نور اور ایمان کی روشنی سے منور ہو جاتا ہے۔ ولی جتنا دنیا سے دور بھاگتا ہے دنیا بھی اس کا پیچھا کرتی ہے۔ اصلی نقلی میں کٹلر کو نقل میں بھی اصل کا گمان لگا۔ اس میں اس کی بقا کا سامان بھی تھا، اس کی سونی زندگی میں بہار آ گئی۔ آخری صفحات کی بہترین کہانی کفن بہ دوش، ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی کہانی بہت اچھی اور دلچسپ پیرائے میں لکھی گئی کہانی ہے۔ جس میں وہ سب کچھ ہے جو کسی تحریر کی کامیابی کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے قاری کو بیٹھے بٹھائے کشمیر پہنچا دیا۔ کشمیر کی ثقافت و مقامات کا مکمل تعارف وہاں کے رسم و رواج غرض دلچسپی کا ہر عنصر ہے، کہانی بہت اچھی لگی۔“

شاکر لطیف، فیصل آباد سے حاضر ہوئے ہیں ”محترم مدیر میں نے انجام عجب انتقام عجب کے نام سے ایک کہانی ارسال کرنے کی جرأت کی تھی اور آپ سے اپنے خط میں درخواست کی تھی کہ تصدیق یا تردید ضرور کر دیا کریں مگر کراچی شاید ساتویں آسمان پر واقع ہے اس لیے لاہوریوں کی درخواست اسے کہاں سنائی دیتی ہے (ارے نہیں بھئی...... کیا کراچی کیا لاہور، پورا پاکستان ہی اپنا ساتھی ہے۔ آپ کی کہانی ناقابلِ اشاعت ہے) آپ پر بہت غصہ آیا اگر تھوڑا سا تبصرہ کر دیتے تو آپ کا کیا جاتا (اب تو غصہ ختم ہوا) سلطانہ اچھی رہی۔ اس سے زیادہ کراچی والوں کی تعریف نہیں کر سکتا ایک اور کہانی لکھ رہا تھا مگر آپ کی بے اعتنائی کے بعد نہیں لکھ سکا۔“ (اتنی اتنی سی باتوں پر بڑوں کو روٹھنا نہیں چاہیے)

محمد خواجہ، کورنگی، کراچی سے حاضر ہیں ”سبز رنگ سے لکھا سسپنس ڈائجسٹ کا نام بہت اچھا لگا۔ ایک خوب صورت حسینہ کی تصویر دو زلفیں چہرے کے دونوں جانب، معصوم چہرے پر چار چاند لگا دیے۔ بجھتے چراغ کی لَو کے سامنے امید اور تصویر چہرے پر عیاں۔ اٹھتے دھوئیں میں دو چہروں کا عکس ایک تصورِ جاناں کا خیال ہے شاید۔ جون ایلیا خوب لکھتے ہیں۔ اس دفعہ وہی تصوراتی کرب کی کہانی لیکن بہت ہی فلسفیانہ اندازِ تحریر میں ڈوبا ہوا۔ دولتی اور بے دولتی کی بہترین عکاسی جس کی مثال ہے کہ ایک برتن جس کے پیندے میں سو چھید ہیں اور پوری قوم اس کو بھرنے کی کوشش کر رہی ہے لیکن بے کار...... وہ برتن کبھی نہ بھرے گا۔ آپ ہی دل برداشتہ ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ 2016ء کی مبارک باد خوب دل کھول کر دے لیں لیکن ہوگا وہی کہ یہ بھی 2015ء کی طرح گزر جائے گا۔ آغا سلمان پاشا کو صدارت مبارک ہو۔ بڑا تفصیلی اور دلچسپ طرزِ تحریر ہے۔ تبصرے بھی بے لاگ اور اچھے ہیں۔ لکھتے رہیں، ہماری بہن حنا عروج کورنگی ہمارے علاقے کی بھی ہیں اور لکھتی بھی خوب ہیں۔ باقی ہر ایک خطوط کا مہمان ایک سے بڑھ کر ایک۔ عقل حیران ہے کس کس کی تعریف کروں۔ محمد یوسف سانول، اوریس احمد خان، ڈاکٹر نعیم اکبر بہت اچھا تبصرہ کرتے ہیں۔ آپ یقین کریں اس شمارے میں جتنی بھی کہانیاں ہیں دوسرے شماروں کی بہ نسبت بہت ہی چنیدہ اور لاجواب کہانیاں ہیں۔ سلطانہ، سلطان التمش کی بیٹی سلطانہ کا قصہ کورس میں پڑھا۔ ناولوں میں بھی پڑھا لیکن جو تفصیل اور تسلسل اس میں پڑھا سبحان اللہ بہت گہرے نقش چھوڑے۔ میں گزشتہ دو محفلوں میں شریک نہ ہوا جس کا افسوس ہے کیونکہ میری آنکھوں کا آپریشن ہوا تھا۔“ (اوہو، اللہ آپ کو صحت اور خوشیاں دے۔ آپ کی حوصلہ افزائی یقیناً رسالے کے معیار میں اضافے کا سبب بنتی ہے۔ شکریہ) صیاد، ایک بہترین کہانی۔ سچ کا سسپنس پوری کہانی انجام تک ایک معما اور آخری انتہائی غضب کا نتیجہ۔ آسمان سے گرا، ملک صفدر حیات کے کارنامے، ایک زندہ حقیقت، آدمی پڑھنے والا اپنے آپ سے بے خبر ہو جاتا ہے۔ ہمارے ملک میں چودھری اور وڈیرا طبقہ یوں تو بہت بدنام ہے لیکن جو قتل و غارت گری کے افسانے اور دیانتدار تھانے دار کی کاوشیں اور مجرم کو گردن سے پکڑنا، واہ

خوب مزہ۔ شیش محل، ایک انتہائی مہماتی کہانی ہے لیکن مصنفہ کئی کہانیاں اور کئی موڑ کو الجھا کر کہیں کہیں کہانی کے تسلسل کو توڑ دیتی ہیں۔ ربن دادا ہی اس کہانی کا اصل ہیرو ہے۔ ایک بہادر، جری پارٹی کا سردار لیکن اتنا رحم دل اور ایمان افروز انداز کہ بڑے بڑے شرفاء کو شرم آجاتی ہے۔ یہ نہایت سبق آموز کہانی ہے۔ بدلتے موسم، کہانی نسلی تعصب پر مبنی ہے۔ گورے ہر بار بھاری پڑ جاتے ہیں اور ان کے قوانین اپنے مفادات کی نگہبانی کرتے ہیں۔ جب حد برداشت ختم ہو جاتی ہے انسان خون خرابے میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ مستعدی، ایک بینک کے منیجر نے غبن کیا اور نبھانے کی لاکھ کوشش کی لیکن کلرک نے اپنی مستعدی سے بازی پلٹ دی اور ایسا انوکھا کام کرلیا جو کسی کی سمجھ میں آنا مشکل ہوتا ہے۔ اس کی حقیقت پسندی اور مستعدی نے منیجر کی کارکردگی کی مٹی پلید کردی۔ بڑا ہاتھ، اس کہانی کا سبق آموز پہلو ہے کہ کچھ لوگ چھوٹے پر مطمئن نہیں ہوتے بلکہ کوئی بڑا کام انجام دے کر سب کچھ حاصل کرنا چاہتے ہیں اور یہی حال ہوتا ہے کہ بڑے کام میں چھوٹا بھی جاتا رہتا ہے۔ اس نے بڑی دولت حاصل کرنے کے لیے بڑے دولت مند کو چونا لگانا چاہا لیکن اسے کیا معلوم یہ بڑا دولت منداس سے کئی گنا چالاک تھا۔ اس نے کامیاب منصوبہ بندی کی۔ نئی افتاد، ایک مجرم نے ایک بے گناہ مسافر کو لوٹنے کی کوشش کی۔ وہ بھول گیا کہ وہ ایک بے گناہ مسافر نہیں اور قدرت آج اس کے ساتھ نہیں۔ ایک تیسری آنکھ یہ تماشا دیکھ رہی تھی۔ وہ مسافر اس مجرم سے بھی بڑا گناہ گار تھا لہٰذا ایک چھوٹے جرم نے بڑے جرم میں پھنسا دیا۔ ایک سبق آموز داستان۔ اشعار کی محفل، اشعار کی سلیکشن اس دفعہ پہلے سے کہیں بہتر نظر آئی۔ یہ طبیعت کا سرور تھا یا موسم کی مہربانی، اشعار نے خوب مزہ دیا۔ عمدہ اشعار میں سعدیہ کمال، آغا سلمان پاشا، جاوید اختر رانا، وزیر محمد جان خاص کر لیکن دوسرے بھی بہت اچھے تھے۔ دوسرا گال، کیا کہانی تھی، کیا مقصد تھا۔ بالکل مزہ نہ آیا مجھے۔ شاید کسی کو آیا ہو۔ فرسٹ ڈلیوری، ایک مختصر لیکن انسانی جذبات کی بھرپور عکاسی کرتی ہوئی، دکھوں ذمہ داری، آس اور بے بسی، بسا اوقات ایک ساتھ ہی انسان پر گزر جاتے ہیں اور خدا انسان کو اسی وقت حوصلہ عطا کر دیتا ہے۔ سلطان باہوؒ، ایک ایمان افروز داستان ایک بہت بڑے ولی کی تفصیلی داستان۔ سبحان اللہ انسانوں کے مسیحا اور انسانیت کے لیے رحمت کے فرشتے۔ کفن بہ دوش، ڈاکٹر عبدالرب بھٹی صاحب نے غضب ڈھایا۔ کشمیر کی تاریخ، پس منظر ہندوستان کی زیادتیاں، قتل و غارت گری کا اتنا عمدہ تفصیلی جائزہ پیش کیا کہ یہ فن پارہ ہمارے بچوں کو نصاب کی طرح پڑھنا چاہیے۔" (اتنا تفصیلی تبصرہ، واہ بہت خوب)

⌘ رانا حبیب الرحمٰن، سینٹرل جیل لاہور سے محفل کی زینت بنے ہیں "آغا سلمان پاشا، صدارت کی مبارک باد قبول فرمایئے۔ عمران صاحب کو موردِ الزام ٹھہرانے سے پہلے یہ سوچ لیجیے کہ آپ بھی...... بہترین تبصرہ کرنے پر بھی مبارک۔ سید ثاقب علی شاہ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب قیدیوں کو جیلوں سے رہا کرے۔ آمین۔ اس دفعہ محفل میں صنف نازک صرف دو تھیں یعنی کہ مسز صدیقی آنٹی اور حنا عروج صاحبہ ماشاء اللہ دونوں دلیر لگ رہی ہیں۔ (جی تو صنفِ نازک جلدی جلدی آکر اپنی موجودگی کا احساس تو دلایئے) زرین آفریدی صاحبہ نے بھی پہلی بار آتے ہی غلطی سے اپنے ایک دو جملوں سے میرا دل دکھایا اور دوبارہ گم ہو گئیں۔ زرین صاحبہ آپ شاید نہیں جانتیں جن کو ہم دوست کہہ دیں اسے بھولتے نہیں۔ حنا عروج آپ کا تبصرہ بھی نمبر ون کے لائق تھا۔ بلیک لسٹ والے ہمت نہ چھوڑیں، دوبارہ ٹرائی کیجیے...... ناز پری صاحبہ اپنے جن یعنی اعجاز راحیل کو لے کر دوبارہ محفل میں انٹری دیں۔ فرسٹ ڈلیوری رشتوں کے خوب صورت تعلق کا احساس دلاتی ہوئی بہترین کہانی تھی۔ سلطان باہوؒ کے بارے میں بھی اچھی تحریر لکھی گئی تھی۔ میں خود بھی ضلع جھنگ میں ان کے مزار پر دو بار گیا ہوں۔ ماروی کی اس قسط میں مراد علی منگی روحانی علم کے ذریعے جنگیں جیتتا نظر آیا۔ شیش محل میں فاروق کی وجہ سے ہی ایک اور داداؤں کا گروہ مل گیا۔ غنڈوں کے گروہ کا اصلی چہرہ اور اچھا تاثر کہانی میں ملتا ہے۔ ایسا حقیقی تاثر صرف اور صرف جرائم پیشہ افراد میں گم ہو کر ہی ملتا ہے ورنہ ہمارے معاشرے میں انہیں بہت برا کہا گیا ہے۔ برے آدمی کہاں کس جگہ نہیں ہوتے۔"

⌘ وسیم احمد خان، خانیوال سے چلے آرہے ہیں "ٹائٹل پر ماہ جبیں نہ جانے کس بات پر غور کر رہی ہے، چراغ، تعویذ اور دھوئیں میں نادیدہ چہروں والا ٹائٹل بس مناسب ہی لگا۔ 6 یا 7 ماہ غیر حاضری رہی۔ کسی نے بھی ہماری کمی محسوس نہ کی سوائے اس مرتبہ صفدر معاویہ بھائی کے کہ میرے شہر والے باقی دوست کدھر ہیں حاضری دیں۔ لو صفدر بھائی آپ نے یاد کیا اور ہم حاضر ہو گئے۔ (پھر تو آپ کا شکوہ بجا نہیں رہا نا) آغا سلمان پاشا کی حاضری زبردست رہی، کیا بھرپور تبصرہ کیا ہے۔ آغا جی آپ کی پہلی شرکت اچھی لگی۔ باقی سب بھائیوں اور بہنوں کے تبصرے بھی بہت اچھے تھے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے اپنی فیورٹ کہانی شیش محل سے آغاز کیا۔ بمبئی سے چندی گڑھ تک کے سفر میں پیش آئے حالات اور واقعات دلچسپ رہے۔ اب دیکھتے ہیں کہ فاروق دوبارہ سر کی چوٹ کی وجہ سے چندی گڑھ میں قیام اور جولیٹ اور فاروق میں دوری کو کتنا عرصہ اور لگے گا۔ جولیٹ بیچاری کو ماں کے بعد باپ کی موت کا صدمہ سہنا پڑے گا۔ ثمر عباس کی کہانی اصلی اور نقلی بھی خوب کہانی رہی۔ تھوڑی پر پیچ بھی لگی تھوڑی سمپل بھی

گی۔ کفن بہ دوش ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی زبردست کاوش ہے۔ شیر علی اس کہانی کا میرا پسندیدہ کردار نہ جانے بھارتی فوجی اب کیا کرنے والے ہیں۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ حضرت سلطان باہو رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں مختصر اور جامع قصہ بہت اچھا لگا۔ ایمان میں پڑھ کر مزید تازگی پیدا ہوئی۔ باقی کہانیاں ابھی زیر مطالعہ ہیں۔ محفل شعر و سخن اشفاق شاہین، کراچی، مسٹر اینڈ مسز صفدر معاویہ خانیوال، بلقیس فاطمہ پشاور، آغا سلمان پاشا پاکیشیا کے اشعار بہت اچھے لگے۔ باقی محفل کے حاضرین بھی اپنے اپنے طور پر خوب صورت اشعار سے محفل گرما رہے تھے۔ کترنیں، معلومات، لطائف وغیرہ اس مرتبہ بہت کم رہے جو بھی ہیں وہ بہت زبردست رہے۔ اس وقت رات کے گیارہ بج رہے ہیں۔ سردی سے ہاتھ اکڑ رہے ہیں۔ موسم سرما اپنی شدت دکھا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اللہ پاک ہم سب مسلمانوں کو موسموں کی شدت اور ہمارے وطنِ عزیز کو دہشت گردی اور اندرونی و بیرونی سازشوں سے محفوظ رکھے، آمین۔ (ہماری نیک تمنائیں بھی آپ کے ساتھ ہیں)

✠ رمضان پاشا، گلشن اقبال، کراچی سے تبصرہ کر رہے ہیں ”فروری 2016ء کا سسپنس مل گیا۔ اس بار سرورق بہت ہی دلکش تھا۔ خاص کر دیے سے اٹھتا ہوا دھواں، خصوصاً دھوئیں سے ابھرتی ہوئی مردانہ شبیہ، کیا خوب! (ہوں...... خوب سمجھتے ہیں یہ مسکراہٹ اور یہ دھواں آپ کو کیوں اچھا لگا ہوگا) فہرست کی تزئین اور ترتیب سادہ سہی پھر بھی اچھی لگی۔ خطوط کی محفل میں اول نمبر آنے والے آغا سلمان پاشا صاحب کو مبارکباد۔ سب سے پہلے کفن بہ دوش یہ کہانی اثر انگیز تو تھی ہی، خاص بات یہ کہ اسے پڑھ کر کشمیر کے بارے میں میری ناقص معلومات کا پول کھل گیا۔ اب اگلی قسط میں مزید معلومات کی توقع ہے بشرطیکہ کشمیر پر بات ہو نہ کہ رومانی داستان پر...... مستندی، ایسی ہی کہانیوں کی خاطر میں سسپنس خریدتا ہوں۔ اصلی نقلی نے بھی کافی لطف بہم پہنچایا۔ حضرت سلطان باہوؒ کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا ہے مگر وہ معلومات ادھوری ادھوری تھیں۔ اب یہ مضمون پڑھ کر مکمل آگاہی ہوئی۔ اب ان کے مزار مبارک پر حاضری دینے کو دل بے چین ہے۔ فرسٹ ڈیلیوری بھی متاثر کن کہانی تھی۔ دو شاندار اور جاندار بلکہ دبنگ کہانیاں شیش محل اور ماروی کا مقابلہ جاری و ساری ہے۔ اب خدا جانے کون آگے کو نکلے گی۔ آسمان سے گرا اس بار صفدر حیات نے بہت بھاگ دوڑ کی۔ آخرکار اصل مجرم کو بے نقاب کر ہی دیا، کہانی مزیدار تھی۔ صیاد کافی پُراثر کہانی تھی۔ بہت عرصہ یاد رہے گی۔ دوسرا گال بالکل اچھی نہیں لگی۔ بڑا ہاتھ یہ کہانی جتنی مختصر تھی، اتنی ہی دلچسپ بھی تھی۔ اشعار کی محفل میں ظفر اقبال ظفر، عبدالرحیم اور ماہین فاطمہ کا انتخاب بہت عمدہ تھا۔“

✠ محمد صفدر معاویہ، خانیوال سے محفل میں تشریف لائے ہیں ”سرورق کو ایک خوب صورت دوشیزہ اور ساتھ میں چراغ سے نکلتے دھوئیں سے تین چہروں کے عکس بنا کر سجایا گیا۔ محترم جون ایلیا بے دولتی لے کر آئے۔ سچ کہا کہ ہم ایک دوسرے کو دھوکا دے رہے ہیں...... نہیں نہیں بلکہ ہم خود کو دھوکا دے رہے ہیں۔ جو ہنر پاکستان میں استعمال ہونا چاہیے تھا وہ غیر ممالک کے کام آ رہا ہے کیونکہ یہاں باصلاحیت شخص کی قدر ہی نہیں ہے یقین جاننے میں دعوے کے ساتھ کہتا ہوں پوری دنیا کی ذہانت ایک طرف اور اکیلے پاکستان میں بسنے والے افراد کی ذہانت ایک طرف کیا۔ کچھ نہیں دیا اس پاکستان نے ہمیں۔ کراچی کا ایک 8 سالہ بچہ نیویارک میں پورا بینک سسٹم ختم ہونے پر کراچی میں بیٹھ کر ایک گھنٹے میں سافٹ ویئر سسٹم آن کرتا ہے جو پورے امریکا کے سافٹ ویئر انجینئر نہ کر سکے۔ وہ اب چودہ سال کا ہو گا تقریباً۔ وہ آکسفورڈ یونیورسٹی میں پڑھ رہا ہے ان کی پیشکش پر اور ساتھ معاوضے پر لیکچر بھی دے رہا ہے۔ کیا کمی ہے میرے پیارے پاکستان میں۔ (بے شک ہم ہی ناقدرے ہیں۔ اللہ ہماری سرزمین کو ہمیشہ سلامت رکھے) آپ کا اداریہ پڑھا یہ حکمران ناسور کی طرح بن گئے ہمارے لیے۔ ان کو عیش و عشرت سے فرصت ملے تو عوام کے بارے میں سوچیں۔ تھر میں بچوں کی اموات پر سیاست کر رہے ہیں۔ وزیر اعلیٰ صاحب کہہ رہے ہیں سب اچھا ہے۔ سائیں کیا خاک اچھا ہے۔ یہ جو بچے مر رہے ہیں۔ اپنی محفل میں آئے تو عمران بہت ہی نپے تلے الفاظ میں تبصرہ کر رہے تھے اور بہت عمدہ تبصرہ کر رہے تھے۔ صدارت بہت مبارک ہو۔ ساتھ میں سسپنس میں بھی ویلکم سید ثاقب علی شاہ اڈیالہ جیل پنڈی سے محفل میں شریک، اللہ آپ کی مشکل حل کرے۔ مسز صدیقی بہت بہت شکریہ۔ آپ نے بہت اچھا مشورہ دیا ہے ادارے والوں کو۔ ڈاکٹر نعیم اکبر، اطہر حسین، حنا عروج بھی اپنے بے مثال تبصروں کے ساتھ محفل کی رونق بڑھاتے ہوئے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے ڈاکٹر ساجد امجد کی سلطانہ سے شروع کیا۔ بادشاہ التمش نے رضیہ کو اپنا جانشین مقرر کیا۔ اس نے حکومت تو اچھی کی مگر یاقوت حبشی کو زیادہ اختیارات دینے پر حکومت گنوا بیٹھی بلکہ جان سے بھی ہاتھ دھونے پڑے۔ کاشف زبیر صیاد لے کر آئے۔ بے مثال تحریر تھی، آخر تک سسپنس پھیلا رہا۔ سجاد اور شاہین دولت کے لالچ میں گھناؤنے دھندے کرتے رہے لیکن آخر انجام بھی برا ہوا۔ شیش محل کی یہ قسط بہت عمدہ رہی۔ رب نواز عرف ربن کا ماجد علی سے بچ نکلنا، شگفتہ کو باحفاظت اس کے گھر واپس کرنا، فاروق کا ایکشن ربن دادا کا کیل واس کے اڈے پر جانا، جولیٹ کا آغا سے انتقام لینے کا منصوبہ شاید فاروق پورا کرے گا۔ تنویر ریاض کی بدلتے موسم بھی گزارہ کر گئی۔ ملک

صفدر حیات آسمان سے گرا لے کر آئے۔ کہانی شکیلہ کی بھیانک موت سے شروع ہوئی پھر ملک صاحب نے کڑی سے کڑی ملاتے ہوئے قاتلوں کو ڈھونڈا۔ نئی اقتاد سلیم انور کے قلم سے مختصر مگر عمدہ تحریر۔ محفل شعر و سخن عمدہ اشعار سے مزین رہی۔ علی اختر کی دوسرا گال بہت عمدہ تحریر۔ جہاں روز آئینز نے دوسرا گال پیش کرنے کے بجائے باغی ہونا پسند کیا۔ فاروق انجم کی بڑا ہاتھ مسٹر جارج کا نوکر...... بیچارے کو کچھ ہاتھ نہ آیا، اتنی پلاننگ کر کے بھی۔ ماروی کیا ایکشن سے بھرپور رہی۔ اس دفعہ پلک جھپکنے کا موقع بھی نہ ملا حالانکہ میں موبائل کی ٹارچ میں پڑھ رہا تھا کیونکہ یہاں 10 بجے لائٹ آف کر دی جاتی ہے۔ توشابہ صدیقی کی فرسٹ ڈیلیوری عمدہ رہی۔ اثر نعمانی کی مستعدی میں کلرک ہاروے نے مروا دیا میسن کو۔ سلطان باہو پڑھ کر مزہ آ گیا۔ روح کو سکون مل گیا۔ ضلع جھنگ کی بہت نیک بزرگ شخصیت تھی۔ ثمر عباس کی اصلی نقلی میں سراغ رساں وہ تو نہ ڈھونڈ سکا جو اصلی والی تھی پر کسی کی خوشی کے لیے اس کی ماں کو لے آیا۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کفن بہ دوش لے کر آئے، ہماری خواہش پوری ہوئی۔ (دیکھ لیجیے ہم پوری کوشش کرتے ہیں کہ آپ کی خواہش پوری کریں) جنتِ نظیر وادی کا جو نقشہ کھینچا وہ لاجواب ہے۔ اگلی قسط کا بے چینی سے انتظار ہے۔ اس دفعہ ڈائجسٹ بہت ہی عمدہ رہا۔'' (رسالے کی پسندیدگی کا بے حد شکریہ)

✠ ناصر علی، پشاور سے محفل میں شریک ہیں ''اس بار ٹائٹل کی حسینہ کچھ سادہ سی نظر آئی۔ کپڑوں اور آنکھوں میں ایک بات مشترک تھی، دونوں نیلے رنگ کے تھے۔ صدارت کی کرسی پر آغا سلمان پاشا موجود تھے۔ تبصرے سے بریانی کی خوشبو آ رہی تھی۔ آپ کا تبصرہ بہت اچھا تھا۔ محمد یوسف سانول اللہ تعالیٰ آپ کی والدہ کو صحت دے، آمین۔ اپنا خط دیکھ کر دل خوش ہو گیا انکل آپ کا بہت شکریہ۔ (آپ کی اپنی محفل ہے) کہانیوں میں سب سے پہلے شیش محل سے اسٹارٹ کیا۔ ماجد علی استاد کے روپ میں فراڈی نظر آیا۔ شگفتا کی قسمت اچھی تھی رہن دادا نے اس کو بچا لیا۔ ماروی میں ایک مراد سے دو مراد ہو گئے اور پھر پوری ریاست پر اپنی حکومت قائم کر دی۔ ماروی کی یہ قسط اچھی رہی۔ آخری صفحات پر ڈاکٹر عبدالرب بھٹی صاحب شاہکار ناول لیے، پڑھ کر مزہ آیا۔ ناول میں شفیق اور زلیخاں کی محبت کی کہانی بہت پسند آئی۔ صیاد کاشف زبیر کی خوب صورت اسٹوری تھی۔ غلط کام کا انجام آخر میں برا ہوتا ہے۔ آسمان سے گرا دلچسپ اسٹوری تھی۔ فرسٹ ڈیلیوری اچھی اسٹوری تھی۔ سلطانہ میں بھی وہی ہوا یعنی امراء سازشی اور لالچی تھے۔ تاریخ کی جس کہانی کو بھی دیکھو، بادشاہ کے امیر سازش پھیلاتے ہیں۔''

✠ مرحا گل، ورا بن ڈی آئی کے سے حاضر محفل ہیں ''محبت کے تعویز سے بندھی خوش شکل حسینہ جلتا دیا جس سے اٹھتا دھواں تین خیالی شکلیں، کسی بابے کے آستانے کا منظر پیش کر رہا تھا۔ ٹائٹل حسینہ پیچھے سے بندھے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ عامل بابے کی داسی بنی ہوئی تھی۔ بہت روحانی و پراسرار ٹائٹل تھا۔ اس کے بعد جون ایلیا سے خود کو سیراب کیا اور اداریہ سے مستفید ہوئے۔ محفل کی دنیا میں آغا سلمان پاشا کو بے تاج بادشاہ پایا۔ پڑھ کر پتا لگا صاحب برادر کو کنگ اینڈ باتوں کے ماہر ہیں۔ سید ثاقب علی شاہ سب سے پہلے ایک بہن کی طرف سے پُرخلوص دعا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور باقی سب ساتھیوں کو جیل سے رہائی دے، آمین...... اور ہاں شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں اس بار آپ نے وزارت حاصل کر لی اور باقی مرد بھی سب سے اوپر نظر آئے۔ محمد یوسف کا تبصرہ پسند آیا۔ محمد جاوید آپ کی حیرت ختم ہو گئی۔ سید عبادت جی! گزارش ہے کہ خدارا کہیں سرورق کی حسیناؤں پر قربان نہ ہو جائیں۔ یہ تو ہر ماہ بدلتی رہتی ہیں، آپ کس کس کو خوش رکھیں گے۔ بشیر احمد بھٹی ماضی کو بھلائیں اور حال میں جئیں۔ انجینئر بھٹی صاحب آپ انجینئر بندے ٹھہرے آپ کا شاعری سے کیا لینا دینا۔ بھئی کہانیاں پڑھیں بہت ہے۔ قدرت اللہ نیازی یہی شوخیاں تو زندگی کا حصہ ہیں اور بونگیاں سے کیا مراد ہے آپ کی۔ اگر مبارک دینی تھی تو قلم کو سیدھی طرح جنبش دیتے ٹیڑھے میڑھے الفاظ لکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ اطہر حسین کا تبصرہ مزے کا تھا۔ کھایا اور بہت اچھا لگا۔ واقعی سسپنس جاسوسی کو جھپٹنا پڑتا ہے۔ حنا عروج صاحبہ! کیا آپ پر پابندی عائد کر دی گئی ہے کہ لیٹرز پر تبصرہ بالکل نہیں کرنا، کمال ہے۔ بھئی اتنے مزے کے تبصروں پر آپ تبصرہ کرنے سے قاصر رہیں۔ باچا خان یونیورسٹی میں قیامت خیز دھماکے سے پوری قوم لرز گئی۔ پاک آرمی اسکول والے واقعے کو ابھی سال گزرا کہ بزدلوں نے معصوم نوجوانوں کی جان لے لی۔ اللہ تعالیٰ ان کے پیاروں کو صبر دے۔ سب سے پہلے تاریخی وسازشی کہانی کو رونق بخشی۔ 2016ء کی بیسٹ تاریخی کہانی پھر اس کے بعد کاشف زبیر کی صیاد کہانی کے اردگرد پڑاؤ کیا۔ جو کافی لمبا اور دلچسپ لگا جیسے بیچ جنگل میں شیروں کا شکار۔ شاہین سجاد کو اپنے کیے دھرے کی سزا ملی۔ شیش محل زبردست ہوتی جا رہی ہے۔ جولیٹ کے قادر کو کچھ نہیں ہونا چاہیے اور پلیز فاروق کی ملاقات جلد از جلد کروائیں جولیٹ سے۔ ماروی خواہ مخواہ بہت طویل جا رہی ہے۔ آسمان سے گرا ملک صاحب کی زبردست تحریر تھی۔ گرداب کے چودھری افتخار جیسا انجام ہوا چودھری افتخار کا۔ علی اختر کی دوسرا گال ایک سفاک تحریر تھی۔ اچھا ہوا جیکولین برے انجام کو پہنچ گئی۔ فاروق انجم کی بڑا ہاتھ مارنا چاہا مگر کچھ نصیب نہ ہوا۔ بدلتے موسم واقعی عبرت ناک کہانی تھی۔ ماضی کی دبی چنگاریوں کو نہ چھیڑیں تو بہتر ہے۔ ثمر عباس کی

تحریر محبت سے گندھی ہوئی تھی۔ یہ سب اصل نقل تو چلتا رہتا ہے۔ سلطان باہو کے قصے نے دل کو سیراب کیا۔ جمعے کا دن ہو پھر نماز کے بارے میں ایسا بیان پڑھنا۔ مسرت وشادمانی سے بھرپور۔ اثر نعمانی کی تحریر نے بھی دماغ پر اثر کیا۔ سسپنس کی جان آخری کہانی ڈاکٹر صاحب کی کہانی سسپنس سے بھرپور تھی۔ کشمیر پاکستان کی رگِ جاں۔ شیر علی جس کا حوصلہ پہاڑوں جیسا تھا کہانی میں اتنی گہرائی ہے کہ ڈوب جانے کو جی چاہتا ہے۔ پہلے سے بھی سردی میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ محمد علی ایک محنت کش انسان اسے کسی آزمائش میں مت ڈالیے گا۔ چاچا قاسم کمانڈر عبدالرحمان زینو سب بہت مزے کے کردار ہیں۔ مجاہدوں کے حوصلے بہت بلند تھے۔ اللہ انہیں کامیابی عطا فرمائے۔ اگلے حصے کا انتظار ہے۔ محمد یوسف سانول لنگڑیال کا شعر سب سے بیسٹ رہا۔ حقیقت سے قریب تر۔ دوسرے نمبر پر ثنا کا شعر بیسٹ رہا۔ تیسرے نمبر پر قدرت اللہ صاحب کا شعر بیسٹ رہا۔ باقی اشعار بھی ستاروں کی طرح چمکتے رہے۔ جدید کترنیں زبردست تھیں، کریڈٹ صاحب کے ریاض بٹ کی کترنیں مزے کی تھیں۔ ''اینڈکس اور اسلام'' محمد جاوید کی معلومات اچھی رہیں، معلومات میں اضافہ ہوا۔ پورا رسالہ ایک رات میں ختم کرنا پڑا۔'' (اتنا دلچسپ تبصرہ......مزہ آگیا)

✖ محمد انعام، لودھراں سے تبصرہ کررہے ہیں ''پلیز انکل میرا خط شائع کرکے دل خوش کردیں۔ (لیجیے شائع کردیا......اب یہ ضرور بتائیے گا دل کتنا خوش ہوا؟) کہانیوں کا آغاز شیش محل سے کیا جو کہ مسلمانوں کی آزادی سے پہلے ہندوستان کے حالاتِ زندگی کو اس طرح لکھا گیا ہے کہ گویا یہ سب ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو۔ دادا نے ماجد علی کی سازش کو بے نقاب کرکے اس کی دھلائی کی۔ اس کے بعد ماروی پڑھی۔ اس کہانی کے حالات حقیقت کے قریب نہیں ہیں۔ رضیہ سلطانہ کی تاریخی کہانی مزہ دے گئی۔ معلومات کے ساتھ ساتھ یہ کہ عورت ہونے کے باوجود حکومت بہت زبردست کی۔ ملک کو جو کہ ہندوستان تھا، اس کو خوشحالی تک لے آئی۔ لیکن ایک حبشی غلام کی وجہ سے زیادہ سال تک حکومت نہ کرسکی۔ لیکن اس نے ثابت کردکھایا کہ وہ حکومت کرنے کے قابل تھی۔ صیاد میں جو دوسروں کے ساتھ اچھا کرتا ہے، اس کے ساتھ بھی اچھا سلوک ہوتا ہے۔ آسمان سے گرا انسان دولت کے لیے اتنا اندھا ہوجاتا ہے کہ سگے رشتے اس کے آگے کچھ بھی اہمیت نہیں رکھتے۔ سلطان باہو جو کہ اللہ کے ولی تھے انہوں نے اپنی زندگی کا مقصد صرف اللہ کی رضا اور بندوں کی خدمات کو سمجھا۔ معلومات کے ساتھ ساتھ ان کی زندگی ہمارے لیے مشعلِ راہ ہے۔ کفن بہ دوش میں کشمیر کی جنگ کفر اور اسلام کی جنگ ہے۔ اقوام متحدہ کا مقصد ظلم کو ختم کرنا ہے لیکن جب ظلم مسلمانوں کے علاوہ کسی اور پر ہوتا ہے تو وہ ظلم ہوتا ہے۔ یہی کفار کا انصاف ہے۔ دوستوں کی محفل میں پہنچے۔ آغا سلمان پاشا تو کھانے پکانے کے ماہر ہیں۔ اسی فن کے بل بوتے پر سب پر بازی لے گئے۔ ثاقب علی انصاف کی توقع نہیں ہے۔ سید عبادت کاظمی، ناصر علی، اشفاق شاہین کے خط زبردست تھے۔ فروری کا یہ شمارہ کچھ کہانیوں کے حساب سے زبردست تھا۔''

✖ مرزا طاہر الدین بیگ، میرپور خاص سے حاضر ہیں ''سب سے پہلے تاریخی کہانی رضیہ سلطانہ بہت اچھی لگی، کیا رضیہ سلطانہ پہلی خواتین حکمران تھیں لکھا گیا کہ رضیہ سلطانہ کی سپاہ اور ان کے بڑے لوگوں کو عورت کی حکمرانی پسند نہیں تھی۔ تاریخ نے اپنی روایت دہرائی اور رضیہ سلطانہ اپنے ہی لوگوں کے ہاتھوں؟......مگر تاریخ آگے بتانے سے قاصر ہے رضیہ سلطانہ اور اس کے شوہر کا کیا بنا؟ کس نے قتل کیا؟ فاروق انجم کی زبردست کہانی بڑا ہاتھ دلچسپ بھی اور عبرت لیے ہوئے تھی مزے دار کہانی پڑھ کر دل سے نکلا بہت خوب انجام کا کیا کہنا۔ کفن بہ دوش تاریخی کشمیر کے پس منظر میں لکھی ہوئی کہانی سطر سطر اپنے اندر زبردست کشش لیے ہوئے جسے بغیر کسی وقفے کے لگاتار پڑھا اور اب دوسری قسط کا بڑی بے صبری سے انتظار ہے۔ اثر نعمانی صاحب نے خوب مستعدی دکھائی اور مستعدی تو محترمہ سیکریٹری صاحبہ نے بھی خوب دکھائی اچھی اور دلچسپ کہانی۔ ملک صفدر کا ایک اور زبردست کارنامہ آسمان سے گرا۔ ملک صاحب نے بڑی بھاگ دوڑ کی اور ان کی محنت رنگ لائی۔ ایک کے بعد ایک ملزم پکڑے گئے بہت خوب ملک صاحب آپ نے خوب کہا اللہ تعالیٰ کی جب پکڑ آتی ہے تو پھر بڑے بڑے پھنے خان اپنے سب پھنے پن بھول جاتے ہیں اور کہانیاں بھی اچھی رہیں۔ آپ کے خط دلچسپ تبصرہ پاکیشیا سے کیا ہے۔ باورچی خانے سے فرصت کے بعد خط لکھا اور اول نمبر پر مبارک باد۔ آپ نے تبصرہ پسند کیا شکریہ۔ آپ نے ابنِ صفی (مرحوم) کی یاد دلا دی۔ کیا بات تھی موصوف کے ناولوں کی اور بلیک زیرو کا بہت اچھا کردار ایک بار پھر شکریہ۔''

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہوسکے۔

ایم عمران جونانی، کراچی۔ محمد یونس چودھری، لاہور۔ اطہر حسین، کراچی۔ ذیشان قادری، فیصل آباد۔ جنید احمد ملک، گلستان جوہر، کراچی۔ حنا عروج، کراچی۔ انجم کمال، کراچی۔ مہتاب احمد، حیدرآباد۔ ناہید یوسف، اسلام آباد۔ وسیم احمد، ملتان۔ ثاقب کمال، کراچی۔ نعمان وہاب، سرگودھا۔ مہتاب الٰہی، کوئٹہ۔

سلسلے بغاوت کے

ڈاکٹر ساجد امجد

جیسے ایک نیام میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں اسی طرح ایک تخت پر دو بادشاہ نہیں بیٹھ سکتے اور یہ بات وقت نے بھی ثابت کی ہے۔ پھر اس ایک سلطنت کے کئی حصے اس تخت شاہی پر بیٹھنے والا کیسے برداشت کرسکتا تھا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اکبر کے دور میں سلطنت نے جتنی وسعت پائی اتنی ہی بغاوتوں نے جنم لیا۔ گویا آستین کے سانپوں نے پھن نکالا اور جو جتنا قریب تھا اس نے اتنی ہی آسانی سے اپنے محسن کو ڈس لیا... حتیٰ کہ اس کے اپنے ہی بیٹے نے سب سے بڑے باغی کا روپ دھار لیا... بس زمین و آسمان کے یہی رنگ ڈھنگ ہیں جو روپ بدل بدل کر آدمی کو اپنے درمیان انسان بن کر رہنے کے اصول سکھاتے ہیں مگر تاریخ گواہ ہے کہ دولت اور طاقت کے نشے میں انسانیت کو بھولنے والے انسان فقط مٹی کے پتلے بن کر عام سی زندگی گزار بیٹھے۔ زمین پہ اکڑ کر چلنے والے جب زمین کے اندر دفن ہوئے تو بہت سوں کے لیے عبرت کا سامان کر گئے... مگر بغاوتوں کا دراز ہوتا سلسلہ پھر بھی نہ تھم سکا... چہرے بدل کر وقت اپنے دائرے میں سفر کرتا رہا اور تاریخ رقم کرتے ہوئے آنے والی نسلوں کے لیے کاتبِ تقدیر کے فیصلوں اور عیاروں کی تدبیریں تحریر کرتا رہا۔

ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

مالوہ کی روپ متی کے حسن کے چرچے زبانوں کا زیور بنے ہوئے تھے۔ ادہم خاں کی حریص آنکھیں اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے پر تول رہی تھیں لیکن یہ امر محال ہی تو تھا۔ آگرہ سے مالوہ تک کا فاصلہ طے کرنا اس کی بینائی سے بعید تھا۔ دوسرے یہ کہ وہ کوئی عام عورت نہیں تھی۔ مالوہ پر باز بہادر کی حکومت تھی اور وہ اس کی محبوبہ جس کے لیے وہ شعر کہتا اور نغمے چھیڑتا تھا۔ باز بہادر ہندوستانی نغموں کی اقسام اور گانے کے فن میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔ روپ متی بھی اس پر فدا تھی۔ وہ خود بھی بڑے اچھے شعر کہتی تھی۔ حسن و جمال میں ایسی یکتا تھی کہ اپنے زمانے کی "پدمنی" کہلاتی تھی۔ ہندو پنڈتوں نے بہ اعتبارِ حسن عورتوں کی جو قسمیں بیان کی ہیں...... "پدمنی" ان میں سب سے اعلیٰ سمجھی جاتی ہے۔

باز بہادر اس پر ایسا فریفتہ تھا کہ سلطنت کے کام کاج چھوڑ کر اس کی بانہوں میں گرفتار رہنا اس کا مشغلہ بن گیا تھا۔

ادہم خاں ان حالات کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس فکر میں تھا کہ کسی طرح مالوہ پر حملہ کردیا جائے۔ باز بہادر

کو زیر کرلیا جائے تو روپ متی ہاتھ آسکتی ہے۔ وہ شہنشاہ اکبر کا مقربِ خاص ضرور تھا لیکن خود مختار نہیں تھا کہ مالوہ (گجرات) پر چڑھ دوڑتا۔ پھر ایک خیال سے اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اس نے اکبر کو باز بہادر کے خلاف اکسانا شروع کردیا۔

''باز بہادر ہمیشہ لہو ولعب میں مشغول رہتا ہے۔ سلطنت کے کاموں کے بجائے اس کا زیادہ تر وقت حسینوں اور طوائفوں کی صحبت میں گزرتا ہے۔ اس کی اس بے اعتنائی کی وجہ سے ظالموں اور جابروں کی بن آئی ہے۔ غریبوں کی زندگی اجیرن ہوگئی ہے۔ مخلوقِ خدا زندگی سے عاجز آگئی ہے۔''

اس نے روپ متی اور اس کے حسن و جمال کا تذکرہ جان بوجھ کر نہیں کیا تھا کہ کہیں بادشاہ بھی اس کی دید کا مشتاق نہ ہوجائے۔ اس کا مطلب یہ بھی ہوسکتا تھا کہ جذبۂ رقابت اس کے دل میں گھر کرچکا تھا۔

وہ نہایت پھونک پھونک کر قدم رکھ رہا تھا۔ بادشاہ سے جب بھی ملاقات ہوتی تو وہ باز بہادر کے خلاف بادشاہ کے کان بھرنے سے نہ چوکتا لیکن اس احتیاط کے ساتھ کہ اس کا اپنا اشتیاق ظاہر نہ ہونے پائے۔

ہمایوں نے اکبر کی صورت میں جانشین چھوڑا ضرور تھا لیکن وہ ابھی دس گیارہ سال کا نابالغ لڑکا تھا۔ ایک وسیع ملک جو ابھی فتح نہیں ہوا تھا کہ ہمایوں کو موت آگئی۔ دشمنوں کا ایک جمِ غفیر تھا جو پورے ملک کے حصے کرنے پر تلا ہوا تھا۔

اس لڑکے (اکبر) نے تخت پر پاؤں رکھتے ہی باپ کی وصیت کے مطابق بیرم خاں کو ''خان بابا'' کا لقب دیا اور وکالت اتالیقی اور سپاہ سالار کے عہدے تفویض کرکے سلطنت کے سارے اختیارات اس کے سپرد کردیے۔ بیرم خاں نے نوعمر بادشاہ کی تربیت کی، اس کی بادشاہت کو مستحکم کیا اور دشمنوں کو شکست دی۔ اکبر کے پردے میں بیرم خاں گیارہ سال تک حکومت کرتا رہا لیکن سازشی بھی برابر اپنا کام کرتے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اکبر اس سے بدظن ہوگیا۔ بیرم خاں کی رسوائی اور بدنامی کی خبریں پر لگا کر اڑنے لگیں۔ بادشاہ کی نظریں پھریں تو دوست بھی دشمن بن گئے۔ بیرم خاں کا اقبال مائل بہ زوال ہوگیا۔ بیرم خاں نے گھبرا کر حج بیت اللہ کا ارادہ کرلیا۔ اکبر کا خط اسے موصول ہوا۔

''ہم نے ابتدا میں اپنی کم عمری اور سیر وشکار کے شوق میں اور ناتجربہ کاری کی بنا پر خان بابا کو تمام امورِ سلطنت سپرد کردیے۔ اب ہم رعیت اور سلطنت کے معاملات کو خود سرانجام دینا چاہتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ تم نے کعبۃ اللہ کا احرام باندھ لیا ہے اور کئی حیثیتوں سے تم پر حج کا فریضہ واجب اور لازم ہے اس لیے اب تم کو علائقِ دنیا سے دست کش ہوجانا چاہیے۔''

اس پیغام کے ملتے ہی بیرم خاں نے حکم کی تعمیل کی علم اور نقارہ، ہاتھی گھوڑے، امارت و تجمل کا سارا سامان اپنے معتمد ملازم کے ذریعے بارگاہِ شاہی میں بھیج دیے۔ بیرم خاں کے بساط سے ہٹتے ہی اس کے پٹے ہوئے مہرے اٹھ اٹھ کر خانہ بندی کرنے لگے۔ ان میں ملا پیر محمد، ادہم خاں پیش پیش تھے۔ جب بیرم خاں سفرِ حج کے لیے روانہ ہوا تو انہی دونوں کی سازشوں سے بیرم خاں کو قتل کردیا گیا۔

بیرم خاں کے ہٹتے ہی اکبر خود مختار تھا۔ وہی سازشی عناصر جو بیرم خاں کے قتل میں شریک تھے اکبر کے گرد گھیرا ڈال کر بیٹھ گئے۔ اکبر ناخواندہ بھی تھا اور ناتجربہ کار بھی۔ وہ ان خوشامدی امراء پر ضرورت سے زیادہ بھروسا کرنے لگا۔ ادہم خاں ان میں سب سے آگے تھا۔ اس نے اکبر کے دل میں اتنی جگہ بنالی کہ وہ اس سے خلوت میں بھی ملنے لگا۔

خود مختاری کی ہوا چلتے ہی اکبر کے دل میں ''وسعتِ ملک'' کی تمنا مچلنے لگی۔ اس کا اظہار وہ گاہے بگاہے مقرب امراء کے سامنے بھی کرنے لگا۔ ادہم خاں جیسے زیرک امیر نے اس کا پورا فائدہ اٹھایا۔ اس نے اکبر کو پوری طرح آمادہ کیا کہ وہ باز بہادر کے خلاف قدم اٹھائے۔ اس نے موقع دیکھ کر صاف کہہ دیا۔

''اس وقت عزتِ سلطنت کا تقاضا یہ ہے کہ ولایت مالوہ کو سلطنت عظیم میں شامل کرلیا جائے تاکہ وہاں امن وامان قائم ہو اور آپ وہاں کے غریبوں کی دعاؤں کے حق دار ٹھہریں۔''

''یہ مہم اتنی آسان نہیں۔ خان بابا نے بھی کوشش کی تھی لیکن وہ ناکام رہے۔''

''ظلِ سبحانی کا اقبال بلند ہو۔ یہ مہم آپ میرے سپرد فرمائیں۔ میں مالوہ کو آپ کے قدموں میں لاکر ڈال دوں گا۔''

''مابدولت تمہاری وفاداری پر ناز کرتے ہیں۔ عنقریب ایک لشکر دے کر تمہیں روانہ کریں گے۔''

طبلِ جنگ بج گیا۔ بادشاہ نے مالوہ کی فتح کو ادہم خاں کے سپرد کیا اور پیر محمد خاں کو اس کا نائب مقرر کرکے لشکر روانہ کردیا۔

باز بہادر خوابِ غفلت میں ایسا مدہوش تھا کہ بادشاہی

فوجوں کی پیش قدمی کی خبریں برابر پہنچ رہی تھیں مگر اس کے کان پر جوں تک نہیں رینگی اور وہ بدستور اپنی رنگ رلیوں میں مشغول رہا۔ اسے تو اس وقت ہوش آیا جب شاہی فوج اس مقام پر پہنچی جو ملک کے درمیان واقع تھا اور جہاں سے سارنگ پور صرف دس کوس پر تھا۔ باز بہادر اس وقت اسی شہر میں تھا۔ وہ ہوش میں آتے ہی سارنگ پور سے نکلا۔ دو کوس کے فاصلے پر آ کر اس نے قلعہ بنایا اور بیٹھ گیا۔

ادہم خاں کو یہ خبر مل گئی۔ اس نے چند امراء کو ہراول دستے کے طور پر روانہ کیا کہ اس قلعے کے چاروں طرف جو باز بہادر نے اپنے لشکر کے گرد بنایا تھا، دیکھیں اور کوئی ایسی ترکیب کریں کہ وہ قلعے سے باہر آ جائے۔ شاہی فوج کے پرے کے پرے باز بہادر کے قلعے کے چاروں طرف پہنچ گئے۔ باز بہادر نے فوجوں کی ترتیب کی اور جنگ کے لیے تیار ہو گیا لیکن وہ افغان امراء جو باز بہادر سے رنجیدہ تھے بھاگ کھڑے ہوئے۔ ان کے بھاگتے ہی باز بہادر نے بھی فرار ہونے میں عافیت سمجھی۔ اس نے اپنے گھرانے کے چند افراد اور جواہرات وغیرہ ساتھ لیے اور بے جاپور کے جنگلوں میں نکل گیا۔

فرار کے وقت باز بہادر روپ متی کو اپنے ساتھ نہیں لے جا سکا تھا۔ وہ اس کے پیچھے وہیں رہ گئی تھی۔ ادہم خاں نے معمولی جھڑپوں کے بعد بہ آسانی پورے مالوہ پر قبضہ کر لیا۔ خزانے، لاؤ لشکر، ہاتھی، گھوڑے، خوب صورت گانے والیاں سب کچھ اس کے تصرف میں آ گیا۔ اسے کسی عورت سے کوئی غرض نہیں تھی۔ وہ تو روپ متی کا مشتاقِ دید تھا۔ اس نے کچھ گانے والیوں کو اپنے پاس بلوایا اور ان سے روپ متی کے بارے میں دریافت کیا۔ ان میں سے ایک نے یہ خبر دی کہ وہ باز بہادر کے ساتھ نہیں جا سکی۔ شاہی فوج کے ہاتھوں وہ بھی گرفتار ہوئی ہے لیکن اس وقت وہ کہاں ہے، یہ اسے نہیں معلوم۔ ادہم خاں کو یہ اطمینان تو ہو گیا کہ وہ یہیں ہے لیکن اسے تلاش کرنا مسئلہ تھا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اس نے بھیس بدل لیا ہو۔ اس نے ایک گانے والی کو اپنے ساتھ ملایا جو روپ متی کو پہچانتی تھی اور اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ جہاں جہاں گرفتار عورتیں رکھی گئی ہیں، وہاں روپ متی کو تلاش کیا جائے۔ تلاشِ بسیار کے بعد سپاہیوں نے روپ متی کو تلاش کر لیا اور ادہم خاں کے سامنے پیش بھی کر دیا۔ ادہم خاں اسے دیکھ کر سانس لینا بھول گیا۔ اس نے ایسا حسن پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ اٹھ کر اس کا استقبال کرنے پر مجبور ہو گیا۔ وہ بھی پورے وقار اور تمکنت کے ساتھ آئی تھی لیکن اس وقت اس کا چہرہ بجھ گیا جب ادہم خاں نے اس سے قربت کا مطالبہ کیا۔ وہ ایک وفاشعار عورت تھی۔ پہلے تو اس نے بھی نرم ہو کر کبھی گرم ہو کر اس معاملے کو ٹالنا چاہا لیکن جب اس نے دیکھا کہ ادہم خاں کے سامنے کچھ پیش چلنے کی نہیں تو اس نے بڑی منت سماجت کر کے ایک دن کی مہلت مانگ لی۔

دوسرے دن اس نے غسل کیا۔ بناؤ سنگھار کیا۔ کپڑے بدلے اور یہ ظاہر کیا کہ آج وہ ادہم خاں سے ملنے جا رہی ہے اور اس نے زہر کھا کر جان دے دی۔

ادہم خاں کا تو کھیل ہی چوپٹ ہو گیا۔ اب اس کے لیے سارنگ پور میں کیا رکھا تھا۔ اس نے سارا مالِ غنیمت اپنے تصرف میں رکھا۔ صرف چند ہاتھی دربار میں بھجوا دیے اور اردگرد کے بقیہ قلعوں کی تسخیر کے لیے کوچ کر دیا۔ اب اس کا مقصد مال و زر کا حصول تھا۔ روپ متی کی تسخیر نہیں کہ اب وہ اس دنیا میں تھی ہی نہیں۔

اس نے روپ متی سے بھی سبق نہیں سیکھا کہ وہ اپنے مالک کی کتنی وفادار تھی کہ جان دے دی مگر آبرو پر حرف نہ آنے دیا اور وہ اپنے مالک سے ایک طرح کی بغاوت کر کے آگے بڑھ رہا تھا۔ اس نے اس سفر میں پیر محمد خاں کو بھی ساتھ نہیں لیا تھا۔

اکبر کو جب یہ اطلاع ملی کہ ادہم خاں نے مالوہ کے سارے مال و زر پر قبضہ کر لیا ہے اور اب وہ دیگر قلعوں کی طرف روانہ ہوا ہے تو وہ خود اس قلعے کا عزم کر کے روانہ ہوا جس پر ادہم خاں حملہ کرنے کے لیے جا رہا تھا۔ یہ اکبر کی پہلی یلغار تھی لیکن وہ اس خود اعتمادی کے ساتھ جا رہا تھا جیسے وہ اس قسم کے بہت سے حملے کر چکا ہے۔ چار پانچ سو سوار اس کے ساتھ تھے اور وہ برق رفتاری سے چلا جا رہا تھا۔ راستوں کی زبان ہوتی تو وہ اس تعجب کا اظہار ضرور کرتے کہ اس نے ایک ماہ کی مسافت ایک ہفتے میں طے کر لی۔ ادہم خاں ابھی راستے ہی میں تھا کہ اسے جا لیا۔

ایک ایسے لشکر کو دیکھ کر جس کی قیادت خود جلال الدین اکبر کر رہا ہو، ادہم خاں کا لشکر کائی کی طرح پھٹ گیا۔ اکبر نے میدان میں خیمے ڈالے اور ادہم خاں کی طلبی کا حکم دیا۔ وہ اس حال میں حاضر ہوا کہ اس کی تلوار گلے میں لٹک رہی تھی۔

''ادہم خاں! تم کیا سمجھ رہے تھے کہ آگرہ سے یہاں تک کا فاصلہ ہمارے پاؤں پکڑ لے گا۔''

''غلام کی یہ مجال کہاں۔''

''تو پھر تم نے یہ کیوں سوچ لیا کہ مالوہ کے مال وزر پر تصرف کرلو گے اور ہمیں خبر نہ ہوگی۔''

''حضور کا اقبال بلند ہو۔ غلام سے غلطی ہوئی۔''

''اور پھر تم ہماری اجازت کے بغیر دیگر قلعوں کی طرف بھی بڑھے۔ ان غلطیوں کا انجام جانتے ہو؟''

''مجھے امید ہے کہ ظلِ سبحانی عفو و درگزر سے کام لیں گے ورنہ یہ سر حاضر ہے۔''

''تم کیا سمجھتے ہو، اتنی بڑی غلطیوں کے بعد ہم عفو و درگزر سے کام لیں گے؟''

''حضور کی رحم دلی سے یہی امید ہے۔''

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ اکبر کے خیمے کے باہر وہ ہاتھی آکھڑے ہوئے جن پر مالوہ سے لوٹا ہوا سامان لدا ہوا تھا۔ ادہم خاں نے اپنی آبرو بچانے کے لیے سارا مال واسباب اکبر کی خدمت میں پیش کر دیا۔ جب وہ اکبر سے ملاقات کے لیے آرہا تھا تو ہاتھی بانوں سے کہتا آیا تھا کہ مال واسباب لے کر پہنچ جائیں۔

اس نے مال واسباب پیش کیا اور معافی کے لیے گڑگڑانے لگا۔ اکبر کو اس پر رحم آگیا۔ اس کے سارے قصور معاف کر دیے اور خلعت و انعام سے نوازا۔

ادہم خاں یہ سمجھے ہوئے تھا کہ اس کے قصور معاف ہو گئے اب مالوہ کی حکومت بھی اسے مل جائے گی لیکن اکبر کی دوراندیشی نے اس کے ارمانوں پر اوس ڈال دی۔ اس نے مالوہ کی حکومت پیر محمد شاہ کے حوالے کر دی اور ادہم خاں کو اپنے ساتھ آگرہ لے آیا۔

☆☆☆

باز بہادر اپنی ولایت سے نکلا تو بے تحاشا بیجاپور کی طرف بھاگا اور پہاڑوں میں جا کر پناہ لی اور ایک دشوار گزار مقام پر اپنے اہل و عیال کو ٹھہرا دیا۔ جو مال واسباب ساتھ لایا تھا، اسے محفوظ کر دیا۔ کچھ دن تو اس علاقے میں گھومتا پھرتا رہا اور پھر ایک ارادے کے ساتھ برہان پور کے حاکم کے پاس پہنچ گیا۔

''جلال الدین اکبر اس علاقے کی تسخیر کے لیے کمر کس رہا ہے۔ مالوہ کا حشر آپ نے دیکھ لیا۔ اب برہان پور بھی اس کی زد سے محفوظ نہیں رہے گا۔ اب بھی وقت ہے کہ ہم سب متحد ہو کر شاہی فوج سے مقابلہ کریں۔ اگر ہم اکیلے لڑتے رہے تو کوئی بھی محفوظ نہیں رہے گا۔ میں نے نواح کے زمینداروں کو آمادہ کر لیا ہے۔ آپ بھی اگر ساتھ دیں تو ہماری طاقت بہت بڑھ جائے گی۔''

پیر محمد خاں کو جب یہ خبر ملی تو اس نے فوراً فوج کشی کر دی۔ باز بہادر تو ظاہر ہے وہاں موجود نہیں تھا، پیر محمد نے کسی مزاحمت کے بغیر باز بہادر کے اہل و عیال اور تمام مال واسباب قبضے میں لے کر برہان پور کا رخ کیا۔

باز بہادر اس وقت تک حاکم برہان پور کو ساتھ دینے پر آمادہ کر چکا تھا۔ اس نے جن اندیشوں کا اظہار کیا تھا، وہ سامنے آگئے تھے۔ پیر محمد آندھی طوفان کی طرح بڑھتا چلا آرہا تھا۔ باز بہادر کے ساتھ برہان پور کا حاکم بھی مقابلے کے لیے باہر نکلا۔ برہان پور سے سات آٹھ کوس کے فاصلے پر دونوں فوجیں آمنے سامنے آگئیں۔

پیر محمد کی بدسلوکی نے اس کی فوج کو اس سے اتنا برگشتہ کر دیا تھا کہ وہ نہایت بے دلی سے لڑ رہی تھی جبکہ باز بہادر عقاب کی طرح جھپٹ جھپٹ کر حملے کر رہا تھا۔ اس کا انتقامی جذبہ اسے سر دھڑ کی بازی لگانے پر مجبور کر رہا تھا۔ اس کی سلطنت چلی گئی تھی۔ اس کے اہل و عیال پیر محمد کے قبضے میں تھے۔ برہان پور کی فوج بھی اپنے علاقے کے دفاع میں لڑ رہی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پیر محمد خاں کو بری طرح شکست ہوئی اور بادشاہی لشکر کا سارا ساز و سامان لٹ گیا۔ بڑی تعداد میں فوجی مارے گئے۔ پیر محمد اس بری طرح بدحواس ہو کر بھاگا کہ پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ وہ برہان پور کی فوج سے تو بچ کر نکل آیا تھا لیکن راستے میں علاقے کے مفسدوں سے سامنا ہو گیا جو سب کے سب باز بہادر کے طرف دار تھے۔ جو سپاہ بچ آئی تھی اسے انہوں نے ٹھکانے لگا دیا۔ وہ اس وقت دریائے نربدا کے کنارے کنارے چل رہا تھا۔ مجبور ہو کر اپنا گھوڑا دریا میں ڈال دیا۔ اتفاق سے اونٹوں کی ایک قطار اس کے نزدیک پہنچ گئی۔ اونٹوں نے اس کے گھوڑے پر حملہ کر دیا۔ اس وقت اسے یہ یاد ضرور آیا ہوگا کہ بیرم خاں کے قتل میں وہ برابر کا شریک تھا بلکہ وہ اس کی سرکوبی کرتا ہوا اس مقام تک لے گیا تھا جہاں اسے بالآخر قتل کر دیا گیا۔

پیر محمد کے ساتھ آئے ہوئے باقی امراء مالوہ پہنچے لیکن جب انہوں نے مالوہ کی حفاظت اپنی طاقت سے باہر دیکھی تو وہ مالوہ سے واپس آگئے۔ بادشاہ نے اس جرم میں انہیں قید کر دیا کہ وہ اجازت کے بغیر کیوں واپس آئے۔ باز بہادر دوبارہ مالوہ پر قابض ہو گیا اور اپنے دارالحکومت میں پہنچ کر ازسرنو اپنے ملک کے بندوبست میں مشغول ہو گیا۔

اکبر نے اس نقصان کی تلافی کے لیے عبداللہ خاں ازبک کو روانہ کیا اور چند بہادر امراء کو اس کی کمک کے لیے

متعین کیا۔ عبداللہ خاں ایک آراستہ فوج کے ہمراہ مالوہ پہنچ گیا۔ باز بہادر بھی دلیرانہ اس کے مقابلے پر اترا لیکن قسمت میں شکست لکھی تھی۔ ناچار بھاگ کر اسی بے جاپور کے کوہستان میں پناہ لی جہاں وہ پہلے جا کر چھپا تھا۔

عبداللہ خاں نے ''مانڈو'' تک اس کا پیچھا کیا اور پھر فتح کی خوش خبری بادشاہ تک پہنچا دی۔ باز بہادر کے انجام کے بارے میں ''طبقاتِ اکبری'' کا بیان قدرے مختلف ہے۔

باز بہادر کچھ عرصے تک رائے اودھے سنگھ کی پناہ میں رہا۔ اس نے ایک مدت گجرات میں گزاری اور بالآخر اکبر کے حضور حاضر ہوا اور زمانے کے حوادث سے پناہ پائی۔

☆☆☆

ادہم خاں اپنی بے عزتی پر سانپ کی طرح لوٹ رہا تھا۔ اسے مالوہ سے بلوا لیا گیا تھا۔ بادشاہ کا مقرب وہ اب بھی تھا لیکن بادشاہ اب اسے اعتبار کے لائق نہیں سمجھتا تھا۔ عہدے دوسروں کو دیے جا رہے تھے۔ سرکار دربار میں شمس الدین خاں کو بہت اہمیت دی جانے لگی تھی۔ بادشاہ نے اسے خانِ اعظم کا لقب دے کر وکالت اور نیابت کے سارے اختیارات دے دیے تھے۔ ادہم خاں اپنی فطرت سے مجبور تھا۔ حسد کی آگ اسے اندر ہی اندر جلائے دے رہی تھی۔ وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گیا تھا کہ شمس الدین خاں اس کے خلاف سازشیں کرتے ہیں اور انہوں نے بادشاہ کو اس سے برگشتہ کر دیا ہے۔ اس نے اس کانٹے کو راہ سے ہٹانے کے لیے کوششیں شروع کر دیں۔

باتوں کے انبار لگے، راتیں جاگنے لگیں، سازشوں کے جال بُنے جانے لگے۔ شہاب الدین احمد خاں، محمد قاسم میر بحر، منعم خاں، احمد خاں نیشاپوری جیسے با اثر امراء اس سازش میں شریک تھے۔ ادہم خاں ان سب کا سرغنہ بنا ہوا تھا۔ اس کے محل میں تدبیریں بنتی اور بگڑتی تھیں۔

یہ لوگ عرصے تک ریشہ دوانیوں میں مشغول رہے لیکن کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔ ادہم خاں کی جوانی کو زیادہ صبر نہ ہو سکا۔ وہ ایک دن موقع پا کر شمس الدین خاں کی خلوت میں پہنچ گیا اور تعظیم و تکریم کا بہانہ کر کے شمس الدین خاں کے بالکل قریب پہنچ گیا اور اسے باتوں میں لگا کر حملہ کر دیا۔

پورے محل میں شور اور ہنگامہ برپا ہو گیا۔ پہرے دار اور عزیز و اقارب اس کثرت سے جمع ہو گئے کہ ادہم خاں کو بھاگنے کا موقع بھی نہ مل سکا۔ وہ یہاں آتے ہوئے یہ بھی بھول گیا تھا کہ شمس الدین خاں کا محل بادشاہ کی خواب گاہ خاص کے قریب ہے۔ اکبر اس وقت اپنی خواب گاہ میں آرام کر رہا تھا کہ شور سن کر باہر نکل آیا۔ باہر عالم ہی دوسرا تھا۔ خانِ اعظم کی لاش زمین پر پڑی تھی اور ادہم خاں اس کے سرہانے کھڑا تھا۔

اکبر نے غضب ناک ہو کر ادہم خاں سے اس قتل کے بارے میں دریافت کیا۔

''بدبخت، خانِ اعظم نے تیرا کیا بگاڑا تھا؟''

ادہم خاں کا برا وقت آ چکا تھا۔ اس وقت اسے کوئی عذر بھی نہیں سوجھ رہا تھا۔ غالباً وہ یہ سوچ کر آیا ہی نہیں تھا کہ یہ صورتِ حال بھی پیش آ سکتی ہے۔ وہ کچھ دیر تو خاموش کھڑا رہا اور پھر آگے بڑھ کر اکبر کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ یہ سخت بے ادبی تھی کہ کوئی امیر بادشاہ سے اتنا بے تکلف ہو جائے۔

بادشاہ نے ایک جھٹکے سے اپنے ہاتھ چھڑائے اور ادہم خاں کے منہ پر دو تھپڑ ایسے رسید کیے کہ وہ چکرا کر زمین پر گر گیا۔

''اس گستاخ کو محل کی چھت سے نیچے گرا دیا جائے۔''

حکم کی دیر تھی کہ پہرے دار دوڑ پڑے۔ ادہم خاں کے دونوں ہاتھ پیچھے کی طرف باندھے اور اسے محل کی چھت پر لے جا کر اسے نیچے پھینک دیا۔ اسے جب پھینکا جا رہا ہوگا تو یقیناً اسے بیرم خاں کا خیال آیا ہوگا جس کے قتل کی سازش میں وہ بھی شریک تھا۔ بیرم خاں کا خون رنگ لا رہا تھا۔

ان تمام امراء کے چہرے خوف سے پیلے پڑ گئے جو اس سازش میں شریک تھے۔ ادہم خاں کسی کا نام نہ لے سکا تھا لیکن دل کے چوروں نے بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ جن لوگوں نے اس فساد میں کوشش کی تھی، ان میں سے ہر ایک نے موت کے خوف سے اپنی راہ لی۔ منعم خاں اور محمد قاسم میر بحر نے دریائے جمنا عبور کر کے پل تڑوا دیا۔ شہاب الدین احمد خاں بھی چھپ گیا۔

دوسرے دن اشرف خاں میر منشی کو حکم ہوا اور اس نے منعم خاں، شہاب الدین احمد خاں اور قاسم میر بحر کو تسلی دے کر اکبر بادشاہ کے حضور میں حاضر کیا۔

منعم خاں اس لالچ میں حاضرِ دربار ہو گیا تھا کہ اب ادہم خاں بھی نہیں رہا، شمس الدین خاں بھی درمیان سے ہٹ گیا۔ اب صرف وہ ہے۔ اب اس کے سوا کوئی ملکی مہمات میں شامل نہیں ہوگا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اب اس کے دل کے چور نے سر اٹھانا شروع کیا۔ وہ اور قاسم میر بحر اس نتیجے پر پہنچے کہ بادشاہ کا غصہ ابھی فرو نہیں ہوا ہے۔ شمس الدین خاں کے قتل کا فتنہ کبھی نہ کبھی سر اٹھائے گا۔ وہ عتاب

شاہی کا شکار ہو کر رہے گا۔

ایک سرد رات میں منعم خاں اور میر بحر نے ملاقات کی۔ بادشاہ کی طرف سے دونوں کے دلوں میں غبار تھا۔ دونوں کو اپنے جرائم معلوم تھے۔ یہی طے ہوا کہ جلد سے جلد آگرہ چھوڑ کر کابل کا رخ کیا جائے اور وہاں جا کر قسمت آزمائی کی جائے۔ دو چار دن کا وقفہ دے کر دونوں گھوڑے پر سوار ہوئے اور آگرہ سے نکل گئے۔

کبھی گھوڑے دوڑاتے کبھی دلکی چلتے منزلیں طے کرتے ہوئے ایک ایسے علاقے میں پہنچ گئے جہاں کا جاگیردار اکبر کے خیر خواہوں میں تھا۔ اس نے دونوں کی پریشانی سے محسوس کرلیا کہ وہ بادشاہ کے حضور سے بھاگ کر جارہے ہیں۔ قصبے کے اوباشوں کی ایک جماعت کے ساتھ جو اس وقت اس کے ہمراہ تھی، ان کے سروں پر پہنچ گیا اور دونوں کو پکڑ کر بادشاہ کے حضور میں بھیج دیا۔

اکبر نے ایک مرتبہ پھر چشم پوشی کی اور فراخ دلی کا مظاہرہ کیا۔

☆☆☆

جس وقت باز بہادر نے مالوہ پر دوبارہ قبضہ جمالیا تھا، اکبر نے اس کی سرکوبی کے لیے عبداللہ خاں ازبک کو روانہ کیا تھا اور باز بہادر شکست کھا کر بھاگ کھڑا ہوا تھا۔

اب یہ خبریں آرہی تھیں کہ اس نے مالوہ میں بغاوت کردی۔ اس بغاوت کو دبانے کے لیے اکبر نے ایک لشکر روانہ کیا۔ عبداللہ خاں کو جیسے ہی معلوم ہوا کہ شاہی فوج روانہ ہوگئی ہے، وہ مالوہ کے شہروں اور قصبوں کو لوٹ کر احمد آباد کی طرف فرار ہوگیا۔

اس بغاوت سے دوسرے شرپسندوں کے حوصلے بھی جوان ہوئے۔ خان زماں اور بہادر خاں ہمیشہ کوئی نہ کوئی مسئلہ کھڑا کیے رہتے تھے۔ اکبر ان سے ہمیشہ بدظن رہتا تھا۔ اس نے یہ تک ارادہ کرلیا تھا کہ وہ انہیں اپنی قلمرو سے باہر نکال دے گا۔ جب عبداللہ ازبک نے مالوہ میں بغاوت کی تو ان دونوں بھائیوں نے بھی جو ملک شرقی پر مامور تھے، بغاوت پر کمر باندھ لی۔ ان کا ساتھ دینے کے لیے جتنے ازبک اس وقت ہندوستان میں تھے، وہ بھی ان کے ساتھ ہوگئے۔ تیس ہزار سواروں کی فوج منظم کرلی اور تمام بلاد شرقی میں ہنگامہ آرائی شروع کردی۔

اکبر نے مشہور کردیا کہ وہ شکار کے لیے نکل رہا ہے۔ جاں نثاروں کی ایک جمعیت ساتھ لی جیسا کہ وہ اکثر شکار کے وقت کیا کرتا تھا اور آگرہ سے نکل کر جنگلات کا رخ کرلیا۔

شکار کھیلتے اور سیر و تفریح کرتے ہوئے وہ صوبہ بہار تک چلا گیا اور اچانک ان باغیوں پر حملہ کردیا۔ صف آرا وہ بھی ہوئے لیکن اکبر کے ساتھ مختصر سی جماعت دیکھ کر شک میں پڑ گئے اور صلح کے لیے آمادہ ہوگئے۔ خان زماں نے صلاح کے لیے اپنی والدہ کو اکبر کے پاس بھیجا۔ اس خاتون نے اپنے بیٹوں کی زندگی کے لیے اکبر کے آگے جھولی پھیلا دی۔ یہ سفارش ایسی تھی کہ اکبر اسے ٹھکرا نہ سکا لیکن پھر بھی کچھ شرائط ایسی تھیں جن کا اظہار ضروری تھا۔

”میں تمہاری خاطر ان کی خطاؤں کو معاف کرتا ہوں لیکن یہ نہیں معلوم کہ یہ لوگ مطیع و فرمانبردار رہیں گے بھی یا نہیں۔“

”میں اس کی ضمانت لیتی ہوں۔ اس وقت میرے بچوں کی جاں بخشی فرمائیں۔“

”اگر یہ بات ہے تو میں نے انہیں معاف کیا۔“

”ان کی جاگیروں کے متعلق کیا حکم ہے؟“

”جب ہم نے ان کی خطائیں معاف کردیں تو ان کی جاگیروں کے متعلق کیا مضائقہ ہے۔ لیکن انہیں چاہیے کہ جب تک ہم یہاں مقیم ہیں وہ لوگ دریا سے اس پار نہ جائیں۔ جب ہم آگرہ میں مقیم ہوں تو ان کے وکیل وہاں آئیں اور جاگیروں کے فرامین حاصل کریں اور ان فرامین کے مطابق اپنی اپنی جاگیروں پر قبضہ کریں۔“

اس حکم کے ساتھ ہی اکبر نے جنگ سے ہاتھ اٹھالیا اور امرائے عظام کو حکم دیا کہ دربار میں حاضر ہوں۔ اس قضیے سے فارغ ہوتے ہی اکبر نے مراجعت کی مگر ابھی وہ جونپور پہنچا تھا کہ اسے خان زماں اور بہادر خاں کے دوبارہ باغی ہونے کی اطلاع ملی۔

مصالحت کے لیے شرط یہ طے ہوئی تھی کہ دونوں بھائی قبل از حکم دریا عبور نہیں کریں گے۔ خان زماں نے بادشاہ کے پشت پھیرتے ہی دریا عبور کرلیا اور اپنی ایک جماعت کو غازی پور اور جونپور کی فتح کے لیے روانہ کردیا۔

اکبر بمشکل اپنے لشکر تک پہنچا تھا کہ اس خبر نے اس کے غضب کو آواز دے لی۔ اشرف خاں میر منشی کو حکم ہوا کہ جونپور روالدۂ خان زماں کو گرفتار کر کے قلعہ جونپور میں قید کردے۔

اشرف خاں نے جونپور پہنچتے ہی دونوں باغیوں کی والدہ کو گرفتار کر کے حاکم جونپور کے حوالے کردیا کہ اسے قیدی رکھا جائے۔ کابل اور پنجاب کی طرف سے تشویش

ناک خبریں پہنچ رہی تھیں لہٰذا اکبر باغیوں کی سرکوبی کے معاملے کو کسی اور وقت کے لیے ملتوی کر کے آگرہ واپس چلا گیا۔

اس کے منہ پھیرتے ہی خان زماں کو موقع مل گیا اور وہاں کے حاکم سے جنگ کر کے اسے شکست دی۔ اپنی والدہ کو قید سے نکال لیا اور اس کی جگہ حاکم جونپور کو قید کر دیا۔

اکبر ان دنوں کابل اور پنجاب میں اٹھنے والے فتنوں سے نبرد آزما ہو رہا تھا۔ اس کا ارادہ کچھ دن پنجاب میں ٹھہرنے کا تھا لیکن پھر یہ ارادہ ترک کیا اور سب سے پہلے خان زماں کے فتنے کو ختم کرنے کی فکر کی۔ اس سے پہلے کہ خان زماں کو بادشاہی حملے کی خبر پہنچتی اکبر اس کے سر پر جا پہنچا۔ خان زماں کو چونکہ اپنے قصوروں کی معافی کی اب کوئی توقع نہیں تھی اس لیے مقابلے کے سوا اب کوئی راہ نہیں تھی۔ اس نے جان پر کھیل کر مقابلہ کیا اور واقعی جان پر کھیل گیا۔ اس کا بھائی بہادر خاں زندہ گرفتار ہوا۔ بعد میں اسے بھی قتل کر دیا گیا۔ ان بھائیوں کے ہمراہیوں کو قید کر لیا گیا اور ان کو بادشاہ کے حکم سے ہاتھی کے پاؤں سے بندھوا کر گھمایا گیا۔

☆☆☆

قلعہ چتوڑ کی فتح کے بعد اکبر نے قلعہ رن تھنبور کی تسخیر کا ارادہ کیا جو وہاں کے حاکم سورجن کے قبضے میں تھا۔ مغل شہنشاہ اکبر، مغلِ اعظم کہلانے کی طرف تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ اپنی حدودِ مملکت میں اضافہ کرتا رہے اس کی تلوار دشمنوں کے گلے کاٹتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ وہ چتوڑ اور اودے پور فتح کر چکا تھا اور اب قلعہ رن تھنبور کے سامنے کھڑا تھا۔

رن اور تھنبور نامی دو پہاڑ آسمان کی بلندیوں کو چھو رہے تھے۔ ان دونوں پہاڑوں کے درمیان ہندوستان کا سب سے مضبوط قلعہ اپنی مضبوطی کی داستان سنا رہا تھا۔ ان دو پہاڑوں کی رعایت ہی سے یہ قلعہ رن تھنبور کہلاتا تھا۔

اکبر کا لشکر جس کی راہبری وہ خود کر رہا تھا، کئی مہینے سے اس کا محاصرہ کیے ہوئے تھا۔ یہ دیکھنے کو آنکھیں ترس گئی تھیں کہ قلعے میں کون ہے۔ فصیل پر کوئی نظر نہ آتا تھا مگر تیروں کی بارش ہوتی رہتی تھی۔ اکبر کے جاں باز سپاہی کفِ افسوس مل رہے تھے کہ کوئی مقابلے پر ہی نہیں، مقابلہ کریں تو کس سے کریں۔ وہ نشیب میں تھے اور قلعہ بلندی پر۔ ان کے تیر وہاں تک پہنچنے سے پہلے ہی لوٹ آتے تھے یا قلعے کی دیواروں کا منہ چوم کر بدمزہ ہوتے رہتے تھے۔

کامیابی کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ مایوسی کی کئی راتیں کٹ چکی تھیں کہ ایک صبح اکبر نے اپنے سرداروں کو طلب کیا اور انہیں حکم دیا کہ توپیں ان پہاڑوں کے اوپر پہنچا دی جائیں۔ کسی کو لب کشائی کی جرأت نہ ہو سکی لیکن ان کا یہ سوچنا بجا تھا کہ توپوں کو پہاڑوں پر چڑھانا کتنا مشکل ہو گا۔ آپس میں سرگوشیاں بھی ہوئیں لیکن بے سود۔ انجام یہ ہوا کہ توپیں اوپر پہنچا دی گئیں۔ اکبر نے حکم دیا کہ گولہ باری اس طرح کی جائے کہ گولے قلعے کے اندر جا گریں۔ اتفاق یہ ہوا کہ پہلا ہی گولہ حاکم قلعہ کے محل کے اندر جا گرا۔ اس کے محل کا آدھا حصہ منہدم ہو گیا۔ وہ ایسا سراسیمہ ہوا کہ قلعے سے نکلا اور اکبر کی خدمت میں پہنچ گیا۔ قلعے کی چابیاں اکبر کے قدموں میں رکھ دیں۔

اکبر کے دل میں یہ خیال کیسے آیا کہ توپیں پہاڑ پر لے جائی جائیں؟ دراصل اکبر کو بشارت ہوئی تھی۔ کوئی بزرگ اس سے کہہ رہے تھے کہ رن پہاڑ دشمن کے لیے مورچے کا کام دے رہا ہے۔ اگر تم اس مورچے سے گولہ باری کرو تو فتح یقینی ہے۔ اکبر کے خیال میں یہ بشارت دینے والے بزرگ خواجہ اجمیر تھے لہٰذا اب ان کی خدمت میں پہنچنا ضروری تھا۔ اس لیے بھی کہ اس وقت وہ اجمیر سے قریب تھا۔

مالوہ سے ایک مرتبہ پھر بغاوت کی خبریں آ رہی تھیں۔ اس نے اپنے چند امرا کو ایک آراستہ لشکر دے کر باغیوں کی سرکوبی کے لیے مالوہ روانہ کیا اور خود اجمیر پہنچ کر شہنشاہوں کے شہنشاہ حضرت خواجہ معین الدین اجمیری کے مزار پر پہنچ گیا۔ دنیا دیکھ رہی تھی کہ وہ زائرین کے ہجوم میں پیدل چل کر مزار کے دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جلالِ شاہی کو باہر چھوڑا اور خود مزار کے قریب گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ ہاتھ دعا کے لیے اٹھ گئے۔

”میں وارثِ تخت سے محروم ہوں۔ مجھے وارث عطا ہو تا کہ میرے بعد بھی اس کفرستان میں کوئی چراغ جلانے والا ہو۔ میں نے منت مانی ہے کہ اگر میرا وارث مجھے مل گیا تو میں ننگے پاؤں اجمیر تک آؤں گا۔“

مزار سے باہر نکلا تو دل کو ایسا اطمینان ہو رہا تھا کہ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ اس کی عمر اٹھائیس سال ہو گئی تھی لیکن ابھی تک اولاد سے محروم تھا۔ یہاں حاضری دینے کے بعد اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کا وارث اس کے سامنے کھڑا ہے۔

مختصر سا لشکر جو اس کے ہمراہ تھا، اسے لے کر وہ آگرہ کی طرف روانہ ہوا۔ جب آگرہ دس بارہ کوس دور رہ گیا تو ایک ویران مقام نے اس کے پاؤں پکڑ لیے۔ کوئی غیبی آواز تھی جو اس سے کہہ رہی تھی۔ یہاں پڑاؤ ڈالو، کچھ ظہور میں آنے والا ہے۔ اس نے حکم جاری کیا کہ یہاں پڑاؤ ڈالا جائے۔ اب پڑاؤ کی ضرورت نہیں تھی۔ آگرہ کچھ ہی فاصلے پر تو رہ گیا تھا لیکن اس کا حکم تھا کہ یہیں پڑاؤ ہوگا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ اس مقام کا نام "سیکری" ہے۔ یہاں ویرانے کے سوا کچھ نہیں تھا لیکن اکبر کا دل کہہ رہا تھا کہ اس ویرانے میں کوئی پھول ضرور کھلنے والا ہے۔

وہ اس ویرانے میں پڑاؤ ڈالے بیٹھا تھا جہاں چند پہاڑوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ سیر و شکار کا بھی کوئی موقع نہیں تھا لیکن اکبر کی آنکھیں کسی کی منتظر تھیں۔ قدرت کی طرف سے کوئی بات دل میں ڈالی جارہی تھی۔ پھر ایک دن اس انتظار میں چار بزرگوں کی صورتیں نمودار ہو گئیں۔ چار افراد اس سے ملنے کے لیے اس ویرانے میں پہنچ گئے۔

"ہم چار دوست ہیں اور چاروں نے ایک ہی خواب دیکھا ہے۔ ہم اجمیر میں اپنے اپنے گھروں میں سو رہے تھے۔ ہمیں قطعی معلوم نہیں تھا کہ آپ سیکری میں پڑاؤ ڈالے ہوئے ہیں۔ ہمیں عالم خواب میں بتانے والے نے بتایا کہ سیکری میں شاہی لشکر خیمہ زن ہے۔ وہاں جاؤ اور اکبر بادشاہ سے مل کر اسے بتاؤ کہ سیکری میں ایک بزرگ حضرت سلیم چشتی تشریف فرما ہیں۔ کتنی عجیب بات ہوگی کہ وہ وہاں ٹھہرے اور ان بزرگ سے ملاقات کیے بغیر چلا جائے۔"

"وہ بزرگ کہاں ہیں؟"

"یہ تو ہمیں نہیں معلوم۔ ہمیں تو صرف یہی بتایا گیا تھا جو ہم نے آپ تک پہنچا دیا۔"

اکبر نے ان چاروں کو بیش قیمت انعامات سے نوازا اور وہ رخصت ہو گئے۔ ان کے جانے کے بعد اکبر کا یہ سوچنا بجا تھا کہ ان بزرگ کو تلاش کیا جائے۔ اس نے اپنے مصاحبوں کو طلب کیا اور ان کے سامنے اس خواب کو بیان کیا۔ اتفاق سے ایک مصاحب ایسا بھی تھا جو اس علاقے کو جانتا تھا اور حضرت سلیم چشتی کے ٹھکانے کو جانتا تھا۔ وہ اس مصاحب کے ہمراہ حضرت سلیم چشتی سے ملاقات کے لیے روانہ ہوا۔ وہ دل میں یہ سوچتا جارہا تھا کہ اس کی ملاقات پہاڑ پر بیٹھے ہوئے کسی تارک الدنیا فقیر سے ہوگی لیکن وہاں پہنچ کر اسے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ وہ تارک الدنیا نہیں، صاحبِ اولاد ہیں۔ ان کی خانقاہ ضرور ہے لیکن برابر میں ان کا مکان بھی ہے جس میں وہ بیوی بچوں کے ساتھ رہتے ہیں۔

وہ جلد ہی ان کی روشن ضمیری کا بھی قائل ہو گیا۔ جب وہ وہاں پہنچا تو اس نے دیکھا کہ حضرت شیخ سلیم کے مرید صفیں باندھے کھڑے ہیں۔ انہیں پہلے سے کیسے معلوم ہو گیا کہ وہ آنے والا ہے۔ یہ خیال بھی اس کے دل میں آیا کہ وہ بادشاہ ہے اس لیے اس کا استقبال ہو رہا ہے۔ اس کی یہ غلط فہمی جلد ہی دور ہو گئی جب ان بزرگ نے فرمایا۔

"ہم دنیادار نہیں کہ کسی لالچ میں تمہارا استقبال کریں لیکن جس نے تمہیں بھیجا ہے، اس کا تقاضا تھا کہ ہم تمہارا استقبال کریں۔"

"میں چاہتا ہوں آپ میرے حق میں دعا فرمائیں۔"

"ہم تو سب ہی کے لیے دعا کرتے ہیں۔"

"آپ پر سب روشن ہے۔ میں اولاد کی نعمت سے محروم ہوں۔ میرے بعد تخت کا وارث کون ہوگا۔"

"انسان بہت بے صبر ہوتا ہے۔" حضرت شیخ نے کچھ دیر مراقبے میں رہنے کے بعد فرمایا۔ "تیرے نصیب میں ایک نہیں کئی شہزادے ہیں۔"

"میں آپ سے ایک درخواست اور کروں گا۔ اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے فرزند عطا کیا تو اس کی پرورش کے لیے اسے میں آپ کے سایہ عاطفت میں رکھوں گا اور آپ کے نام پر اس کا نام رکھوں گا۔"

"ہم تمہاری خواہش کا احترام کرتے ہیں۔"

اکبر نے وہاں تین دن تک مہمانداری کا لطف اٹھایا اور پھر اجازت لے کر آگرہ کی راہ لی۔ خدا کا کرنا یہ ہوا کہ اکبر کی ایک بیوی کو حمل ٹھہر گیا۔ جب ولادت کا وقت قریب آیا تو اس بیوی کو اکبر نے حسبِ وعدہ سیکری پہنچا دیا اور شیخ کی مستورات کے ساتھ ٹھہرایا۔

وہ آگرہ میں بدستور دن گزار رہا تھا کہ اسے فرزند کی ولادت کی خبر ملی۔ خبر ایسی تھی... جس کی خوشی سنبھالے نہیں سنبھل رہی تھی۔ جو سامنے آیا اسے شاہانہ نوازشوں سے مالا مال کر دیا۔ یہ معلوم ہوتا تھا وہ خزانہ خالی کر دے گا۔ آگرہ سے سیکری تک سونا اچھالتا چلا گیا۔ یہی لڑکا آگے چل کر نورالدین جہانگیر کہلایا۔

خوشی کے شادیانوں کا شور ابھی کم نہیں ہوا تھا کہ اسے اپنی منت یاد آئی۔ اس نے منت مانی تھی کہ اگر اس کی مراد پوری ہوئی تو وہ آگرہ سے اجمیر تک پیدل منزلیں طے کرے گا۔ اس نے یہ منت پوری کی اور بارہ بارہ کوس کی منزلیں پاپیادہ طے کرتا ہوا سترھویں دن اجمیر پہنچ گیا۔

اس ولادت باسعادت کی ایک اور کرامت اکبر نے دیکھی جو قلعہ کالنجر کی فتح کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ قلعہ کالنجر شیر شاہ کے بعد سے کافروں کے قبضے میں چلا آرہا تھا۔ اکبر ہمیشہ اس قلعے کی فتح اور تدبیر میں رہتا تھا۔ شہزادہ سلیم (جہانگیر) کی ولادت کے موقع پر حاکم قلعہ رام چند نے قلعے کی کنجیاں شہزادے کی مبارک باد دیتے ہوئے اکبر کی خدمت میں روانہ کردیں اور اطاعت کا اظہار کیا۔

یہ ایسی انہونی بات تھی جسے وہ آسانی سے نظر انداز نہیں کرسکتا تھا۔ اسے اتنی تیزی سے فتوحات حاصل ہورہی تھیں کہ اس نے انہیں حضرت شیخ سلیم کی دعاؤں کا نتیجہ تصور کیا اور سیکری کو "فتح پور" کا نام دے کر اسے پایۂ تخت قرار دیا۔

اس اعلان کے ساتھ ہی اس جنگل کو عمارتوں کا جنگل بنادیا گیا۔ شیخ کی خانقاہ کے قریب پہاڑ کے اوپر عالی شان عمارت کی تعمیر کی بنیاد رکھی۔ تمام امراء اور اراکینِ سلطنت نے بھی اپنے اپنے معیار اور مرتبے کے مطابق اپنے اپنے مکان تعمیر کیے۔ مسجد، مدرسے، چوک، بازار، باغات سب مہیا ہوگئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک بہترین شہر آباد ہوگیا جو فتح پور سیکری کے نام سے مشہور ہوا۔

حکم صادر ہوا کہ اجمیر کو بھی رشکِ جنت بنادیا جائے۔ ایک مضبوط اور مستحکم قلعہ تیار کیا جائے اور اپنے رہنے کے لیے ایک عالی شان محل بنوایا۔ امراء، خواتین اور شاہی دربار کے مقربین اپنے اپنے مکانات کی تعمیر میں ایک دوسرے پر سبقت کرتے تھے۔

اکبر نے اجمیر کے نواح کے مواضعات و دیہات کو امراء میں تقسیم کردیا تاکہ وہاں کی آمدنی سے مکانات تعمیر ہوسکیں۔

☆☆☆

احمد آباد (گجرات) سے انتشار کی خبریں آرہی تھیں۔ بادشاہ کی مصروفیات ان خبروں کو اہمیت نہیں دے رہی تھی لیکن جب سلطان مظفر گجراتی کے وزیر کا خط موصول ہوا تو بادشاہ نے ولایت گجرات کو فتح کرنے کا مصمم ارادہ کرلیا۔ خط میں لکھا تھا۔

"اس وقت ملک میں کوئی کرتا دھرتا نہیں رہا ہے۔ امیروں کے نفاق کی وجہ سے احمد آباد کی سلطنت ڈانواں ڈول ہورہی ہے۔ اگر بادشاہ فوج کشی کریں تو ذرا سی توجہ اور کوشش پر یہ ملک امرائے شاہی کے قبضے میں آجائے گا۔"

اس عریضے کے پہنچنے پر اکبر نے پیر محمد خاں اتکہ کو ایک لشکر بطور ہراول دے کر روانہ کیا اور خود اس کے پیچھے چلنے کی تیاری کرنے لگا۔

پیر محمد جب ایک مقام "سروہی" کے راجا کی سرحدوں پر پہنچا تو راجا نے اپنا ایلچی بنا کر ایک راجپوت کو اس کے پاس بھیجا۔ اس ایلچی نے راجا کا پیغام پہنچایا۔ پیر محمد سے اس کے آنے کا مقصد دریافت کیا۔ نہایت دوستانہ ماحول میں باتیں ہوتی رہیں۔ جب ایلچی رخصت ہونے لگا اور ہاتھ ملانے کے لیے آگے بڑھا تو اس راجپوت نے "جمدھر" (چھری) نیام سے نکالی اور پیر محمد کے پیٹ میں گھونپ دی۔

اس سے پہلے کہ وہ فرار ہوتا پیر محمد کے ہمراہیوں نے اسے دبوچ لیا اور اسی وقت اسی کے خنجر سے اس کا کام تمام کردیا۔

پیر محمد کو زخم تو کاری آیا تھا لیکن وہ جانبر ہوگیا البتہ فوج کشی نہ کرسکا اور بادشاہ کی خدمت میں لوٹ آیا۔ اس کی ناکام واپسی کے بعد اکبر نے خود گجرات پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا۔ جب شاہی لشکر قصبہ پتن (احمد آباد) پہنچا تو اکبر نے وہاں کے حاکم کو در پردہ اپنے ساتھ ملالیا۔ ایک تیر چلائے بغیر "پتن" گجراتیوں کے قبضے سے نکل گیا۔ یہیں اسے شہزادہ دانیال کی ولادت کی خبر ملی جسے اس نے نیک شگون سمجھا اور ایک نئے عزم کے ساتھ احمد آباد کی طرف کوچ کرگیا۔

ابھی وہ احمد آباد کے نزدیک پہنچا ہی تھا کہ سلطان مظفر استقبال کے لیے خدمت میں حاضر ہوگیا۔ بادشاہ نے بھی عنایات کیں اور مظفر خاں کے خطاب سے سرفراز کیا۔

ایک قطرہ خون بہائے بغیر سارا ملک اس کے قبضے میں آگیا۔ اس فتح عظیم کے بعد اکبر فتح پور میں مقیم تھا کہ اطلاع ملی اختیار الملک گجراتی اور محمد مرزا نے مل کر ایک بڑا لشکر فراہم کرلیا ہے اور اب وہ احمد آباد کا محاصرہ کیے ہوئے ہیں۔

اکبر نے خان اعظم کو احمد آباد کی صوبہ داری پر متعین کردیا تھا اور اب وہ محاصرے میں تھا۔ اکبر نے فوراً چند ہزار منتخب سواروں کو ہراول کے طور پر رخصت کیا۔ چند روز کے بعد وہ بھی چند ہزار سواروں کے ہمراہ فتح پور سے نکلا۔

پوری مسافت چالیس روز کی تھی۔ سلاطین کا قافلہ جب چلتا تھا تو یہ فاصلہ تین چار ماہ سے کم میں طے نہیں ہوتا تھا۔ اس نے یہ سفر تیز رفتار اونٹنیوں پر طے کیا۔ رات دن مسلسل سفر کرکے صرف نو دن میں شہر کے دروازے پر پہنچ گیا۔

شہر کے دروازے کے قریب ایک ندی تھی۔ اس

وقت اختیار الملک کے لشکر کا ایک سوار اپنے گھوڑے کو پانی پلا رہا تھا۔ اتفاق سے اسی وقت احمد آباد میں محصور صوبہ دار کا ایک سپاہی بھی گھوڑے کو پانی پلانے وہاں پہنچ گیا۔

''آج یہ کون سا سردار فوج لے کر آیا ہے۔'' اختیار الملک کے سپاہی نے پوچھا۔

''یہ کوئی سردار نہیں جلال الدین محمد اکبر بذاتِ خود تشریف لائے ہیں۔'' صوبہ دار کے سپاہی نے جواب دیا۔

''کیوں جھوٹ بولتا ہے۔ ہمارے جاسوس تو نہیں روز پہلے بادشاہ کو فتح پور میں چھوڑ کر آئے ہیں۔ اتنی جلدی وہ یہاں کیسے پہنچ سکتے ہیں۔''

''تمہارے مخبر نے خبر صحیح دی ہوگی۔ اس وقت وہ وہیں تھے۔ انہوں نے تیز رفتاری سے سفر طے کیا ہوگا بہر حال اب وہ یہاں ہیں۔ اپنے مالکوں سے کہو کہ جنگ کی تیاری کرلیں۔''

وہ سوار اپنے گھوڑے پر سرپٹ دوڑا اور لشکر تک یہ خبر پہنچادی۔

''ہمیں کانوں کان خبر نہ ہوئی اور بادشاہ یہاں تک پہنچ گیا۔'' اختیار الملک نے حیرانی سے کہا۔

''یہ فاصلہ اس نے اتنی جلد طے کیسے کرلیا۔ کیا ہمارے مخبروں نے غلط اطلاع پہنچائی تھی؟''

''یہ ایسی باتیں کرنے کا وقت نہیں۔'' اختیار الملک نے کہا۔ ''ہمیں جنگ کی تیاری کرنی ہوگی۔ ہم دو فوجوں کے درمیان ہیں، اندر صوبہ دار ہے باہر اکبر۔ سخت حکمتِ عملی کی ضرورت ہے۔''

انہوں نے حکمتِ عملی طے کی۔ اختیار الملک پانچ ہزار سوار لے کر شہر کے دروازے کے سامنے کھڑا ہوگیا تاکہ صوبہ دار بادشاہ کی مدد کے لیے شہر سے باہر نہ آسکے۔ محمد حسین مرزا نے بادشاہی فوج کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔

ہنگامہ کارزار گرم ہوگیا۔ ایک مرحلہ وہ آیا کہ دشمن کا دباؤ بڑھنے لگا۔ شاہی لشکر پیچھے ہٹنے لگا۔ شکست کے آثار پیدا ہوگئے تھے کہ اکبر کی بہادری نے پانسا پلٹ دیا۔ وہ اپنے خاص جاں نثاروں کے ساتھ نکلا اور محمد حسین مرزا کی طرف بڑھا۔ محمد حسین مرزا کی نظر جونہی اس پر پڑی وہ ایسا بدحواس ہوا کہ میدان جنگ سے پیٹھ پھیر کر بھاگ نکلا۔ اس کے پیچھے اس کی فوج بھی بھاگ کھڑی ہوئی۔

اکبر نے حکم دیا کہ محمد حسین مرزا کا تعاقب کیا جائے۔ محمد حسین مرزا پوری رفتار سے بھاگے جارہا تھا کہ اچانک اس کے گھوڑے کو ٹھوکر لگی اور اس نے سوار کو گرادیا۔ تعاقب کرنے والوں نے اسے گرفتار کرلیا اور اکبر کے حضور لے آئے۔

محمد حسین مرزا کو جو لوگ لے کر آئے تھے، انعام کے لالچ میں ان میں سے ہر ایک کا دعویٰ تھا کہ مرزا کو اس نے گرفتار کیا۔ یہ تکرار اتنی بڑھی کہ جھگڑے کی صورت اختیار کرنے لگی۔

اکبر کی آواز گونجی۔ ''مرزا خود بتائے گا کہ اسے کس نے گرفتار کیا۔'' پھر وہ حسین مرزا سے مخاطب ہوا۔ ''تو بتا تجھے کس نے گرفتار کیا؟''

''مجھے کسی شخص نے گرفتار نہیں کیا۔ مجھے اگر کسی نے گرفتار کیا ہے تو وہ میرا کفرانِ نعمت ہے اور بادشاہ کا اقبال تھا بس۔'' اس کے اسی جواب سے بادشاہ کا غصہ فرو ہوگیا۔ اس نے بس اتنا کیا کہ حسین مرزا کو رائے سنگھ کے حوالے کردیا کہ اس کے ساتھ جو چاہے سلوک کرے جس نے اسے قتل کرادیا۔

اختیار الملک اس فتح سے بے خبر صوبہ دار کا راستہ روکے شہر کے دروازے کے قریب کھڑا تھا کہ اس کے لشکر میں یہ افواہ اڑگئی کہ شاہی فوج کو شکست ہوگئی۔ وہ لوٹ مار کے لالچ میں ایسا اندھا ہوا کہ مورچا چھوڑ کر شاہی لشکر کو لوٹنے کے لیے آگے بڑھا۔ اس وقت بادشاہ کی ساری فوج بھاگے ہوئے لشکر کے تعاقب میں تھی۔ اکبر ایک درخت کے نیچے آرام کررہا تھا۔ اس کی حفاظت کے لیے صرف دو سو سوار اس کے ساتھ تھے کہ غنیم کے لشکر کی آمد کا شور مچ گیا۔ اکبر نیند سے بیدار ہوا اور مقابلے پر آگیا۔

صوبہ دار خان اعظم نے جب دیکھا کہ اختیار الملک راستے سے ہٹ گیا ہے تو وہ شہر سے باہر نکل آیا اور اپنی فوج کو لے کر اختیار الملک کے تعاقب میں چلا۔ اختیار الملک کا پانچ ہزار کا لشکر اس افتاد سے گھبرا گیا اور بے ترتیب ہوگیا۔ اختیار الملک لاعلمی میں اس درخت کی طرف بھاگا جہاں اکبر ٹھہرا ہوا تھا۔ اس کے محافظوں نے اختیار الملک کو پہچان لیا اور آن کی آن میں اس کا سر کاٹ کر اکبر کے حضور پیش کردیا گیا۔

اس نے خان اعظم کو بدستور احمد آباد پر متعین کیا اور آگرہ لوٹ آیا۔

☆☆☆

بادشاہ کی خوش قسمتی اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ اس نے کابل فتح کرلیا تھا۔ کشمیر تک کا علاقہ اس کے قبضے میں آگیا تھا۔ اس کی فتوحات انسان کے رزق کی طرح اس کا پیچھا کررہی تھیں۔ اس کی شہرت نے بڑے بڑے اہل لوگوں کو اس کے دربار میں لاکھڑا کیا تھا۔ دکن کے دو ممتاز

امیر برہان الملک اور شاہ فتح اللہ شیرازی اس کے دربار میں حاضر ہوئے اور ملازمت کے خواہاں ہوئے۔ اکبر نے انہیں شاہی خدمات پر مامور کردیا۔

ان دونوں نے دکن پر حملے کا مشورہ دیا۔ اکبر نے بھی یہ موقع غنیمت جانا۔ اس نے شاہ فتح اللہ شیرازی کو عضدالدولہ کا خطاب دے کر اس مہم پر مقرر کردیا کہ وہ پہلے احمد آباد خان اعظم کے پاس جائے پھر دونوں مل کر برہان پور اور برار پر حملہ کریں۔ برہان الملک کو بھی عمدہ منصب دیا۔ ہاتھی اور جواہرات عطا کیے اور ان دونوں کا رفیق بنا کر روانہ کیا۔

یہ دونوں امیر احمد آباد روانہ ہوگئے۔ خان اعظم نے ان کا اسی طرح احترام کیا جو دربار اکبری میں ان کی شہرت تھی۔ خان اعظم نے جنگ کی تیاریاں کیں اور آپس میں یہ طے ہوا کہ پہلے برار پر حملہ کیا جائے۔ برار ان دنوں نظام الملک کے زیر اقتدار تھا۔ شاہی لشکر روانہ ہوا اور صوبہ برار کے حاکم نشیں شہر ایرج پور پہنچ گیا اور اس پر قبضہ کرلیا۔

ابھی زیادہ دن نہیں گزرے تھے۔ علاقے کا ٹھیک طرح بندوبست بھی نہیں کرپائے تھے کہ نظام الملک کی فوج راجی خان کی سرداری میں پہنچ گئی۔ برار اور برہان پور کے تمام امیر بھی دوسمتوں سے ٹڈی دل فوج لے کر پہنچ گئے۔ خان اعظم ان کے مقابلے پر نہ ٹھہر سکا اور یہ بہانہ کرکے کہ احمد آباد میں فساد ہوگیا ہے، اپنے تعلقے پر چلا گیا۔

اس ناکام مہم کے بعد اکبر کا ارادہ تھا کہ وہ خود دکن پر فوج کشی کے لیے جنوب کی طرف جائے لیکن اسی وقت "پیر روشنائی" کا فتنہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے مرید پٹھانوں نے شاہی احکام کو پسِ پشت ڈال کر شرانگیزی کا بازار گرم کر رکھا تھا اور لوٹ مار کا بازار گرم کیا ہوا تھا۔

زمانہ سابق میں ایک ہندوستانی شخص افغانوں کی جماعت میں گیا اور اس نے کفر والحاد کے مذہب کا رواج شروع کردیا۔ اکثر احمق اس کے مرید ہوگئے اور اس کا نام پیر روشنائی رکھا۔ رفتہ رفتہ یہ ایک قبیلے کی صورت اختیار کرگئے۔ اس کے جہنم رسید ہونے کے بعد اس کے بیٹا "جلالہ" نے اس کی جگہ لی۔ کثیر مخلوق کو اپنے ساتھ ملالیا۔ راہزنی کا بازار گرم کردیا اور ہندوستان سے کابل جانے والا راستہ بند کردیا۔

مصلحت یہی تھی کہ پہلے اس فتنے کا سدباب کیا جائے۔ اکبر نے دکن کی مہم ترک کی اور سرکش پٹھانوں کا قلع قمع کرنے کے لیے زین خاں اور شیخ فیضی کو مقرر کرکے روانہ کیا۔

ان دونوں نے بڑی جدوجہد کی لیکن کامیابی نہ ہوسکی۔ پہاڑی دروں میں پٹھانوں کی کثیر تعداد موجود تھی اور ان کو وہاں سے نکالنا مشکل تھا۔ اکبر نے ایک اور تازہ فوج مان سنگھ کی راہنمائی میں روانہ کی۔ پٹھانوں نے اس فوج کا بھی منہ پھیر دیا۔ ایک اور فوج بیربل کی سرکردگی میں بھیجی گئی۔ یہ فوج دس ہزار جنگ آزما تجربہ کار سواروں اور پیادوں پر مشتمل تھی۔

بیربل کے پہنچتے ہی تمام فوجوں نے افغانوں کو تاخت وتاراج کرنا شروع کیا۔ مفسد پٹھانوں کی ایک بڑی جماعت قتل ہوگئی۔ ان کے دشوار گزار ٹھکانوں کو تباہ کردیا گیا۔ بہت سا مالِ غنیمت ہاتھ آیا۔

فوج کشی پوری سرگرمی کے ساتھ جاری تھی۔ کوتل کوہ کے دامن میں جس کے قریب ہی ناہموار چٹانوں سے بنا ہوا ایک دشوار درّہ موجود تھا، جاسوسوں نے بیربل کو آکر خبر دی کہ پٹھان آج کی رات بادشاہی فوج پر شب خون ماریں گے۔ بیربل ایک خودرائے شخص تھا۔ کسی سے مشورہ کرنے کا قائل نہیں تھا۔ اس نے کسی سے مشورہ نہیں کیا۔ اس نے سوچا تین چار کوس کا تو درّہ ہے۔ اپنے لشکر کو لے کر نکل جائے۔ اس مقام سے ہٹ جائے جہاں شب خون کا خطرہ ہے۔ وہ پورے لشکر اور باربردار دستوں کو لے کر کوچ کرگیا۔ پٹھانوں کا ایک جاسوس بھی موجود تھا جس نے آگے بڑھ کر بڑی ہوشیاری سے پٹھان سرداروں کو اس کوچ کی اطلاع دی۔ بیربل جونہی اس تاریک درّے میں داخل ہوا، پٹھانوں نے اس درّے کو گھیر لیا۔ آگے پیچھے سے راستہ بند کردیا۔ اندر اندھیرا تھا اور باہر سے سنگ باری ہورہی تھی۔ فوج اس تنگ درے میں ایسی پھنسی تھی کہ نہ آگے جاسکتی تھی نہ پیچھے۔ جو جہاں تھا، وہیں کھڑا رہ گیا۔ باہر سے جو پتھر بھی لڑھکتا ہوا آتا تھا، تین چار آدمیوں کے سر پھوڑتا ہوا گزرتا تھا۔ اندر چیخوں کے سوا کچھ سنائی نہ دیتا تھا۔ رات بھر ان قیدیوں کے سروں پر پتھر، تیر اور گولیاں برستی رہیں۔ صبح ہوئی تو ان میں سے ایک بھی زندہ نہ تھا۔ بیربل سمیت سب مارے گئے۔

اس حادثے میں تقریباً آٹھ ہزار آدمی مارے گئے۔ زین خاں اور ابوالفتح بچ گئے کیونکہ وہ بیربل کے ساتھ نہیں تھے بلکہ انہیں معلوم تک نہیں تھا کہ بیربل اور اس کے لشکر پر کیا گزر رہی ہے۔ اس قتل عام کے بعد یہ دونوں دشمن کے مقابلے میں ٹھہر نہ سکے اور خیمہ گاہ کو مع ساز وسامان چھوڑ کر ایسے بھاگے کہ قلعہ اٹک میں آکر دم لیا۔

اکبر نے اس شکست کا بدلہ لینے کے لیے راجا ٹوڈرمل کو ایک عظیم لشکر کے ساتھ روانہ کیا۔ ٹوڈرمل اپنی تجربہ کاری کی بنا پر کوہستان پہنچا۔ اس نے چند مقامات پر قلعے بنوائے اور بڑی تدبیر و کوشش کے بعد افغانوں پر دنیا تنگ کر دی۔ کنور مان سنگھ نے درۂ خیبر میں اس گروہ کا مقابلہ کیا۔

شاہی لشکر کو فتح و نصرت حاصل ہوئی۔ اس قضیے سے نمٹنے کے بعد اکبر ایک مرتبہ پھر دکن کی طرف متوجہ ہوا۔ اس نے خان خاناں کو شہزادہ دانیال اور دوسرے امراء کی فوجوں کے ساتھ روانہ کیا۔ جب خان خاناں مندو پہنچا تو اسے اطلاع ملی کہ برہان شاہ نظام الملک کے مرنے پر احمد نگر پر بے یاپور کے عادل شاہ نے لشکر کشی کر دی اور اس لڑائی میں برہان شاہ کا بیٹا مارا گیا۔ اس کے بعد نظام الملک کے ایک وزیر میاں منجو نے سارے اختیارات ہاتھ میں لے لیے۔ اختیارات سنبھالتے ہی میاں منجو نے احمد آبادی شہزادہ مراد کے پاس خط بھیجا کہ جلد آ کر دکن پر حملہ کرو۔ شہزادہ مراد بھی نہایت عجلت کے ساتھ دکن کی طرف روانہ ہو گیا۔

ان دنوں احمد آباد میں نظام الملک کی بیٹی چاند بی بی برسر اقتدار آ گئی تھی۔ میاں منجو اور اس کے ساتھی شہزادہ مراد اور خان خاناں کو خط لکھ کر بلاتے رہے۔ ان کے بلانے پر جب مغل لشکر پہنچ گیا تو اب پچھتانے لگے مگر چاند بی بی کے ہمت دلانے پر جنگ کی تیاری شروع کر دی۔

خان خاناں اپنے ہراول کو لے کر آگے بڑھا اور قلعہ احمد نگر کا محاصرہ کر لیا۔ چاند بی بی نے بھی بڑی ہمت سے کام لیا اور جم کر مقابلہ کیا۔ جہاں کہیں بھی شاہی فوج زرِ کثیر خرچ کر کے مورچے باندھتی، نقب لگاتی اور دمدمے اڑاتی، چاند بی بی محاذ پر پہنچ جاتی اور مدافعانہ تدبیریں کرتی۔ راتوں میں شب خون مارنے کے انتظام کرتی۔

چاند بی بی کی اس انتھک محنت کی وجہ سے شاہی فوج کو قطعی کامیابی نہیں ہو رہی تھی۔ آخر بڑی مشکل سے بارودی نقب قلعے کی دیوار اور برج تک پہنچائی گئی۔ چاند بی بی کے جاسوسوں نے اسے بروقت اطلاع دے دی۔ اس نے حملے کے مقررہ دن سے پہلے ہی قلعے کے اندر سے اس مقام تک نقب لگائی جہاں مغلوں نے نقب لگا کر بارود کے تھیلے دبا رکھے تھے اور وہ سارے تھیلے نکلوا لیے اور ان کی جگہ پانی سے بھرے ہوئے کٹورے رکھوا دیے تاکہ نقب اڑانے پر بجائے آگ کے پانی کے فوارے نکلیں۔ صرف ایک جگہ کا اسے پتا نہ چل سکا کہ وہ کس جگہ لگائی گئی ہے۔

شہزادہ مراد اور خان خاناں مقررہ دن محاذ پر پہنچے۔

گوہر آبدار

☆ جب آپ مجھ میں کوئی عیب دیکھو تو مجھے ہی بتاؤ کسی اور کو نہیں کیونکہ اس عیب کو میں نے بدلنا ہے کسی اور نے نہیں۔

☆ مجھ سے کہو گے تو نصیحت کہلائے گی اور اجر ملے گا، دوسروں سے کہو گے تو غیبت کہلائے گی اور گناہ ملے گا۔

☆ مصنفین اپنی کتابوں کی شکل میں اپنے مرنے کے بعد بھی اپنے چاہنے والوں کی لائبریری میں محفوظ رہتے ہیں۔

☆ کسی چیز کو روکنے کے لیے خود کو روکنا پڑتا ہے۔

☆ موت سانس ختم ہونے کا نام نہیں بلکہ موت تو یہ ہے کہ ہمیں یاد کرنے والا کوئی نہ ہو۔

☆ ناممکن سے "نا" ہٹا دیا جائے تو وہ ممکن بن جاتا ہے۔

☆ جو مرد بیوی کو پاؤں کی جوتی سمجھتے ہیں وہ بھی کبھی سر کے تاج نہیں بن سکتے۔

مرسلہ۔ مرحا گل، ورابن کلاں

کلمہ طیبہ

کلمہ طیبہ کے دو حصے ہیں

دونوں میں بارہ بارہ حرف ہیں۔

دونوں نقطوں کے بغیر ہیں۔

پہلا حصہ مقصد زندگی سکھاتا ہے اور دوسرا حصہ طرز زندگی۔

24 حروف تقاضا کرتے ہیں کہ انسان اپنی 24 گھنٹے کی زندگی دین کے مطابق گزارے۔

نقطے نہ ہونے میں بھی ایک حکمت ہے۔ وہ یہ کہ خدا کی خدائی اور مصطفیٰ کی مصطفائی میں کوئی شریک نہیں، یہاں تک کہ ایک نقطہ بھی نہیں۔

مرسلہ۔ محمد جاوید خان، تحصیل علی پور

شہزادے نے سرنگوں میں آگ لگانے کا حکم دیا۔ ایک دھماکا ہوا اور ایک برج کے قریب پچاس گز تک کی فصیل اڑ گئی۔ فوجیں منتظر کھڑی تھیں کہ دوسری دو سرنگیں بھی پھٹیں اور قلعے کا دوسرا برج اڑ جائے تو آگے بڑھیں لیکن دوسری سرنگیں نہ پھٹ سکیں۔ یہ وہی تھیں جس میں چاند بی بی نے پانی بھروا دیا تھا۔ شاہی فوجیں حیران تھیں کہ کیا ہوا۔

ادھر چاند بی بی نے نسوانی پردہ بالائے طاق رکھا۔ مردانہ لباس پہنا، گھوڑے پر سوار ہوئی۔ ہتھیاروں سے لیس ہوئی اور اس جگہ پہنچ گئی جہاں کی فصیل اڑ گئی تھی اور شگاف پڑ گیا تھا۔ مغل فوج اس شگاف سے اندر آسکتی تھی۔ چاند بی بی نے حکم دیا کہ توپ کے گولے داغے جائیں۔ اس حملے کی آڑ میں فصیل کے شگاف کو بھی مستحکم کیا جاتا رہا۔ تمام کاموں کی نگرانی چاند بی بی کر رہی تھی۔ وہ گھوڑے پر سوار ہوکر ادھر ادھر لشکر کے کمانداروں کے علاوہ عام لشکریوں کا بھی جائزہ لیتی رہی اور ان کا حوصلہ بڑھاتی رہی۔

مغل دن کے دو بجے سے شام تک جنگ کرتے رہے لیکن کامیابی کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔ شگاف کے ذریعے اندر آنے کی جرأت نہ ہوسکی۔ دن ختم ہونے پر ناکام اپنے اپنے ٹھکانوں پر لوٹ گئے۔

اندھیرا ہوتے ہی چاند بی بی گھوڑے پر سوار ہوئی، ہاتھ میں مشعل لی اور شکستہ دیوار پر پہنچ گئی۔ مزدوروں، بیل داروں کو کام پر لگا کر صبح ہونے تک دیوار تعمیر کراتی رہی۔ رات بھر میں پچاس گز لمبی دیوار کھڑی کر دی۔

صبح ہوئی تو مغل فوج نے حیرت سے اس دیوار کو دیکھا۔ چاند بی بی نے اسی رات دکن کے سرداروں کے نام خطوط روانہ کیے۔ ان خطوں میں اس نے دشمن کے غلبے، اہلِ قلعہ کی کمزوری اور غلے کی گرانی وغیرہ کا ذکر کیا تھا۔

قاصد کی روانگی کی خبر زیادہ دیر چھپی نہ رہ سکی۔ شاہی لشکر میں یہ افواہیں گردش کرنے لگیں کہ سہیل خان بیجاپوری ستر ہزار کا لشکر لے کر بیجاپور سے چل پڑا ہے۔ دوسرے بادشاہی لشکر کی رسد منقطع ہوگئی تھی۔ سارے علاقے میں گھاس اور چارے کا کال پڑ گیا تھا۔ گھوڑے اور جانور مرنے لگے۔ ایسے میں انہوں نے یہی فیصلہ کیا کہ چاند بی بی سے اس شرط پر صلح کرلی جائے کہ برار کا علاقہ مغلوں کو دے دیا جائے اور باقی تمام ملک پر بدستور نظام شاہیوں کا قبضہ رہے۔

صلح کی بات چیت شروع ہوئی تو چاند بی بی نے پہلے تو انکار کیا لیکن جلد ہی یہ بات اس کی سمجھ میں آگئی کہ موجودہ حالات میں جنگ مناسب نہیں۔ اہلِ قلعہ کا حال بھی وہی تھا جو باہر پڑے ہوئے لشکر کا تھا۔

ان شرائط پر صلح طے ہوگئی کہ شہزادہ مراد قلعہ احمد نگر اور دولت آباد کا محاصرہ اٹھا لے اور ان علاقوں کا پوری طرح تخلیہ کردے اور اس سارے علاقے کو چاند بی بی اور برہان نظام شاہ کے پوتے بہادر شاہ کے حوالے کردے۔ تاوانِ جنگ میں مراد کو صوبہ برار اور احمد آباد بیدر کے بعض پرگنے تفویض کیے جائیں گے۔

لڑائی بند ہوگئی۔ شہزادہ مراد اور خان خاناں برار کی طرف لوٹ گئے اور وہاں قصبہ شاہ پور کو اپنا مستقر بنا کر قیام کیا۔ ابھی اطمینان کے چند دن بھی نہیں گزرے تھے کہ بتحقیق معلوم ہوا کہ سہیل خان بیجاپوری، امیروں اور چاند بی بی کے اتفاق سے ساٹھ ہزار سوار اور توپ خانہ لے کر احمد نگر سے آگے بڑھ چکا ہے۔ شہزادے نے بھی اپنی فوج آگے بڑھا دی تاکہ سہیل خان کو راستے ہی میں روک لیا جائے۔ دونوں لشکر آمنے سامنے ہوئے تو جنگ لازمی تھی۔

یہ ایک جان توڑ مقابلہ ثابت ہو رہا تھا۔ دونوں فریقوں کے ہراول دستے یکے بعد دیگرے غالب و مغلوب ہوتے رہے۔ ایک موقع وہ آیا جب شاہی فوج غالب ہونے لگی۔ اسی وقت دکنیوں نے ایک چال چلی۔ وہ پسپا ہوتے ہوئے شاہی فوج کو ایک مشکل مقام تک لے آئے پھر یہاں پر انہوں نے پلٹ کر ایک زبردست حملہ کیا اور شام ہونے تک گھیر گھیر کر حملے کرتے رہے۔ بڑے بڑے امراء قتل ہوگئے۔ شاہی لشکر کو بری طرح شکست ہوئی اور تقریباً ساری مغل فوج میدان سے فرار ہوگئی۔ لوگ بدحواس ہوکر بھاگے جا رہے تھے لیکن خان خاناں کی غیرت نے اسے بھاگنے نہیں دیا۔ وہ توپ خانے کے قریب ٹھہرا رہا۔

دکنیوں نے جب شاہی لشکر کو بھاگتے ہوئے دیکھا تو انہوں نے مالِ غنیمت کے لالچ میں تعاقب شروع کردیا۔ اس تگ و دو میں انہوں نے اپنے سردار کو بھی تنہا چھوڑ دیا۔ مغرب کے بعد سپہ سالار سہیل خان اپنی فتح پر شاداں ایک ندی کے کنارے ٹھہر گیا۔ یہی وہ مقام تھا جہاں خان خاناں اپنے ساتھیوں کے ساتھ چھپا ہوا تھا۔ دونوں کو معلوم نہیں تھا کہ وہ ایک دوسرے کے اتنے قریب ہیں۔

رات بہت تاریک تھی اس لیے خان خاناں نے اس وقت کوچ کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اس انتظار میں بیٹھا رہا کہ صبح ہوتے ہی یہاں سے نکل جائے گا۔ وہ توپ خانے کو مورچا بنائے بیٹھا تھا کہ اسے چند مشعلیں جلتی ہوئی نظر آئیں۔ اس

تھوڑی بہت روشنی میں آدمیوں کا بہت بڑا انبوہ نظر آیا۔ خان خاناں کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ سہیل خان بالکل سامنے ٹھہرا ہوا ہے۔ یہ اندازہ بھی ہوگیا کہ اس کا پڑاؤ ایک گولے کی زد پر ہے۔ توپیں بارود سے بھری تیار کھڑی تھیں۔ اس نے حکم دیا اور آتش بازوں نے روشنی کا نشانہ لے کر فتیلہ دکھا دیا۔ دکنیوں کے مجمعے میں اچانک جو گولے آکر گرے تو انتشار پھیل گیا۔ ان گولوں سے بچنے کے لیے یہ لوگ ادھر اُدھر بھاگنے لگے۔ جس کو جہاں موقع ملا جاکر چھپ گیا۔ خان خاناں نے نقارچیوں کو حکم دیا کہ وہ فتح کے شادیانے بجائیں۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ وہ مغل سپاہی جو رات گزارنے کے لیے غاروں میں چھپ گئے تھے اس آواز پر دوڑے چلے آئے اور خان خاناں کے گرد جمع ہوگئے۔ اس سنسان رات میں نقاروں کی آواز دور دور تک پہنچ رہی تھی۔ بار بار نقارے بجے تو مغلوں کی جو جماعت بھاگ گئی تھی، وہ بھی واپس آنے لگی۔ دکنیوں پر ہراس طاری ہوگیا کہ فتح کے شادیانے کون بجارہا ہے۔ جو سپاہی دور تھے، وہ یہ سمجھے کہ مغلوں کو فتح مل گئی ہے۔ وہ واپس آنے کے بجائے کونوں کھدروں میں چھپ گئے یا قریب کے دیہات میں چلے گئے۔ اس کے باوجود سہیل خان کے اطراف بارہ ہزار سوار جمع ہوگئے۔ خان خاناں کے پاس بھی چار ہزار مغل جمع ہوگئے۔ رات کا اندھیرا ابھی دن میں تبدیل نہیں ہوا تھا کہ خان خاناں نے سبقت کرکے دشمن پر حملہ کردیا۔

جب مغل جنگجو جنگی نعرے لگاتے ہوئے دشمن کی طرف دوڑے تو رات کے اندھیرے میں اسے تعداد کا اندازہ نہ ہوسکا۔ وہ یہی سمجھے کہ مغلوں کی پوری فوج آگئی۔ ان کی صفیں بے ترتیب ہوگئیں۔ سیکڑوں زخمی ہوئے یا قتل ہوگئے۔ اس جنگ میں سہیل خان بھی زخمی ہوا اور وہ گھوڑے سے گر پڑا۔ اندھیرے میں کوئی اسے پہچان نہ سکا ورنہ گرفتار ہوگیا ہوتا۔ اس کے ساتھی اسے لے کر میدانِ جنگ سے فرار ہوگئے۔

خان خاناں اس فتح کی خبر لے کر شہزادہ مراد کی خدمت میں حاضر ہوگیا۔ اس فتح کے نتیجے میں نظام الملک کے تعلقے کاویل، کھیرلہ اور قلعہ پرنالہ سمیت کئی علاقوں پر قبضہ ہوگیا۔

چاند بی بی اور دکن کے امراء کے درمیان اقتدار پر قبضے کے لیے رسا کشی جاری تھی۔ یہ موقع ایسا تھا کہ اس انتشار کی بدولت بہ آسانی پورے دکن پر قبضہ ہوسکتا تھا لیکن شہزادہ مراد اور خان خاناں میں اختلافات ہوگئے۔ مراد نے اسے دربار اکبری میں واپس بھیج دیا۔ پھر حالات بڑی تیزی سے بدلے۔ شہزادہ مراد کا انتقال ہوگیا۔ دکنیوں نے اس کے انتقال کا فائدہ اٹھایا اور ہر طرف سے یورش کرکے مفتوحہ علاقوں پر دوبارہ قبضہ کرلیا۔

دکن کے انتشار کی خبریں مسلسل دربار میں پہنچ رہی تھیں۔ یہ خبریں اکبر کے لیے پریشان کن تھیں۔ آخر کار اس نے خان خاناں اور شہزادہ دانیال کو دکن کی طرف روانہ کیا۔

اس کے اگلے ہی سال بادشاہ خود بھی آگرہ، دہلی اور پنجاب کا نظم ونسق اور چتوڑ کے رانا کی مہم جہانگیر کے سپرد کرکے اسّی ہزار فوج کے ساتھ دکن کی طرف روانہ ہوگیا۔

یہ غیر معمولی بات تھی کہ اکبر بذاتِ خود دکن کی طرف جارہا تھا۔ اکبر نے برہان پور پہنچنے کے بعد تجربہ کار امیروں کو محاصرہ کرنے اور مورچے باندھنے کے لیے جگہ جگہ متعین کردیا۔

بادشاہی فوجوں نے قلعے کی تسخیر کے لیے اپنی ساری قوت لگادی۔ اس کے باوجود قلعے کی تسخیر میں چار پانچ سال کا عرصہ لگ گیا۔

مغلوں کی راہ روکنے والا اب کوئی نہیں تھا۔ شہزادہ دانیال کسی مزاحمت کے بغیر احمد نگر پہنچ گیا اور قلعے کا محاصرہ کرلیا۔ محاصرہ اتنا سخت تھا کہ وہ کوئی قاصد کسی طرف نہیں دوڑا سکتی تھی۔ وہ شاہی حرم سرا کی دیواروں کو حسرت سے دیکھ رہی تھی۔ اسی وقت ایک پرندہ اڑتا ہوا آیا اور قلعے کی دیواروں کو پار کرگیا۔ چاند بی بی کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ یہ پرندہ قلعے کے باہر جاسکتا ہے لیکن میں نہیں جاسکتی۔ حالات نے مجھے کتنا حقیر بنا دیا ہے۔ جن گھروں میں نااتفاقیاں ہوں، ان گھروں کا یہی حال ہوتا ہے۔

مغل فوجیں نقب لگا رہی تھیں۔ سرنگیں کھودنے کی آوازیں اس کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ کچھ ہی دیر میں قلعہ فتح ہوجائے گا اور کوئی روکنے والا نہیں ہوگا۔ اس نے اپنے ایک سالار جنید خاں خواجہ سرا کو بلایا۔

”دکن کے امراء کی سرکشی کا نتیجہ ہے کہ اکبر بذاتِ خود دکن کی طرف آیا ہے۔ ظاہر ہے چند دنوں میں قلعہ فتح ہوجائے گا۔“

”چاند سلطان، جو ہوا سو ہوا۔ آپ اظہارِ رائے فرمائیں۔“

”میری رائے تو یہ ہے کہ ہمیں قلعہ شہزادہ دانیال کے سپرد کرکے اپنی جان بچانی چاہیے اور خود“ جنید ”پہنچ کر

خداوند تعالیٰ کی مدد کا انتظار کرنا چاہیے۔"
جنید خاں کو چاند بی بی کی یہ رائے اتنی ناپسند ہوئی کہ فوراً حرم سرا سے باہر آیا اور تمام اہلِ قلعہ کو جمع کر کے بلند آواز سے پکارا۔
"چاند بی بی نے اکبری امراء سے سازباز کر لی ہے اور قلعہ شہزادہ دانیال کے حوالے کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"
اہلِ قلعہ یہ سن کر فوراً اشتعال میں آگئے اور ہلّا بول کر حرم سرا میں داخل ہو گئے۔
چاند بی بی اس وقت تک مردانہ لباس زیب تن کر کے جنیر جانے کی تیاری کر چکی تھی کہ یہ لوگ اندر آئے۔ اس نے ہتھیار ابھی باندھے بھی نہیں تھے کہ مقابلہ کرتی، نہایت بے رحمی سے قتل کر دی گئی۔ جن کو بچانے کے لیے نکل رہی تھی، انھی کی بھینٹ چڑھ گئی۔
نقب میں بھری بارود نے قلعے کی دیواریں گرادیں۔ مغلوں نے اندر داخل ہو کر تمام دکنیوں کو گرفتار کر لیا۔ شہزادہ دانیال نے جواہرات اور خزانے پر قبضہ کر لیا اور قلعے کو اپنے امیروں کے حوالے کر کے اکبر کے پاس برہان پور چلا گیا۔

☆☆☆

جس زمانے میں اکبر دکن کی مہم پر روانہ ہو رہا تھا اس نے جہانگیر شہنشاہ کہہ کر مخاطب کیا تھا اور اپنا ولی عہد بنا کر اسے چتوڑ کے رانا کی سرکوبی کے لیے متعین کر دیا تھا۔
شہزادہ سلیم (جہانگیر) نے اجمیر پہنچ کر رانا پر حملہ کرنے کے لیے فوجوں کو متعین کر دیا اور خود اس علاقے کی سیر و شکار میں مشغول ہو گیا۔
جب رانا کو بادشاہی فوجوں کے پہنچنے کی اطلاع ملی تو اس نے سرکار کے چند محال اور تعلقوں کو لوٹ لیا لیکن جیسے ہی مغل فوج کے بہادر چاروں طرف سے اس کے علاقے میں داخل ہوئے تو وہ سراسیمہ ہو کر پہاڑوں میں بھاگ گیا۔ مغل فوج نے تمام شرپسند آبادیوں کو اپنے گھوڑوں کی سموں سے پامال کر دیا اور کافروں کے اہل و عیال کو گرفتار کر کے ان کے مال و اسباب ضبط کر لیے۔
ابھی اس یورش پر پوری طرح قابو بھی نہیں پایا جاسکا تھا کہ اس کے وکیل کی جانب سے اسے یہ اطلاع ملی کہ اس کی محبوبہ مہرالنسا (نورجہاں) کی شادی علی قلی نامی ترک سے کر دی گئی ہے اور اسے شیر افگن کا خطاب دیا گیا ہے۔
وہ اب تک باپ کی طرف سے ہونے والی عنایات پر خوش تھا کہ اسے ولی عہد بنایا۔ اجمیر کی جاگیر عطا کی اور اس پر اتنا اعتبار کیا کہ رانا سے مقابلے کے لیے بھیجا لیکن یہ خبر سنتے ہی سب کچھ اس کی سمجھ میں آگیا۔ اس کے ساتھ دھوکا کیا گیا تھا۔ اسے جان بوجھ کر آگرہ سے دور بھیجا گیا اور اس کی غیر موجودگی میں مہرالنسا اس سے چھین لی گئی۔ "مجھے یہ جاگیر، یہ ولی عہدی نہیں چاہیے۔ مجھے مہرالنسا کیوں چھینی گئی۔" وہ اتنی زور سے چیخا کہ اس کے کئی ہمراہی اس کے خیمے میں آگئے۔ ابھی وہ غصے میں تو تھا ہی۔ باپ کے خلاف جو کچھ کہہ سکتا تھا اس نے کہا۔ سب دم سادھے اس کی نفرت کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اسے سمجھاتا۔ پھر جیسے جہانگیر نے خود ہی موقع دے دیا۔
"بنگال کے زمینداروں کی شورش کی اطلاع ملی ہے کہ وہاں سرکشوں نے غلبہ حاصل کر لیا ہے۔ میں اپنی ذات سے زیادہ ملک کی فکر کر رہا ہوں۔ آپ لوگ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟" بولنے کی خود دعوت دے دی تو ان خوشامدیوں اور فتنہ پردازوں کو موقع مل گیا۔
"بنگال کی مہم پر تو مان سنگھ کو بھی بھیجا جاسکتا ہے۔ آپ کو تو اس وقت کسی بڑے منصوبے کی فکر کرنی چاہیے۔"
"اس منصوبے سے تمہارا مقصد علمِ بغاوت بلند کرنا تو نہیں؟"
"یہ علم آپ بلند نہیں کریں گے۔ یہ علم تو بادشاہ سلامت پہلے ہی بلند کر چکے ہیں۔ آپ کی پسند کسی اور کے حوالے کر کے انھوں نے آپ کو بغاوت کی دعوت دے دی ہے۔"
"یہ ہم نے بھی سوچا تھا لیکن کیا تمہیں ظلِ الٰہی کی طاقت کا اندازہ ہے...... کیا ہم ان سے ٹکرا سکیں گے؟"
"بادشاہ سلامت تو کتنے ہی صوبے چھوڑ کر دکن جیسے دور دراز مقام پر گئے ہوئے ہیں۔ آپ آگرہ پہنچ کر تمام سیر حاصل پرگنوں پر قبضہ کر سکتے ہیں اور خزانہ اکٹھا کر کے فائدہ حاصل کر سکتے ہیں۔"
کوئی اور موقع ہوتا تو وہ سب جہانگیر کے زیرِ عتاب آجاتے لیکن اس وقت اس کے جذبات بھڑکے ہوئے تھے۔ مہرالنسا سے بچھڑنے کا افسوس تھا، باپ کے خلاف غصہ تھا۔ ایسے میں یہ مشورے اسے صائب معلوم ہوئے۔ یہ گھمنڈ بھی ہوا کہ میرا ساتھ دینے والے موجود ہیں۔
اس نے راجا مان سنگھ کو بنگال کے انتظام کے لیے روانہ کیا۔ رانا کی مہم ملتوی کی اور آگرہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ راستے میں تمام شاہی تعلقے اور جاگیرداروں کے علاقے قبضے میں لیتے ہوئے قلعہ آگرہ کے سامنے جا کر پڑاؤ ڈال دیا۔

اکبر کی والدہ مریم مکانی (حمیدہ بانو بیگم) شہزادے کو فرزند سے زیادہ چاہتی تھیں۔ اس کے ارادے کو سن کر باہر نکل آئیں۔ ان کی سواری شہزادے کے خیمے کے سامنے آ کر رکی تو شہزادہ گھبرا کر خیمے سے باہر نکل آیا اور اپنی دادی کو نہایت احترام سے خیمے کے اندر لایا۔

''تم اپنی دادی کا تو اتنا احترام کر رہے ہو لیکن وہ باپ جس نے ہزار منتوں سے تمہیں حاصل کیا، تمہیں مانگنے اجمیر تک پاپیادہ گیا، اس کے فرمان پر چلنے کو تیار نہیں۔ اس کے خلاف بغاوت پر آمادہ ہو۔ کیا یہ تمہیں زیب دیتا ہے؟''

''کیا آپ کو نہیں معلوم کہ انہوں نے ہمارے ساتھ کیا کیا ہے۔ ہماری محبوب ہستی ہم سے چھین لی۔''

''تم اگر مہرالنسا کی بات کر رہے ہو تو ہم تم سے یہ کہیں گے کہ ایک عورت کے لیے باپ کے خلاف صف آرا ہو رہے ہو۔''

''وہ محض عورت نہیں، ہماری محبت ہے۔''

''اگر باپ نے ایک کھلونا نہیں دلایا تو تم گھر کو آگ لگا دو گے۔ اس سے پہلے کہ باپ کو خبر ہو واپس چلے جاؤ اور جس مہم پر تمہیں بھیجا گیا ہے اسے انجام دو۔ باپ کی خوشنودی میں تمہاری دنیا بھی ہے اور آخرت بھی۔''

شہزادہ شرمندہ تو بہت ہوا لیکن اپنے ارادے سے باز نہ آیا۔ خاص خاص آدمیوں کے ساتھ کشتی میں سوار ہوا اور الٰہ آباد پہنچ گیا۔ اس کا لشکر خشکی کے راستے اس کے پیچھے پیچھے تھا۔

الٰہ آباد پہنچنے کے بعد اس نے یہ جسارت کی کہ شاہی تعلقے اپنی سرکار کے آدمیوں میں ترقی، اضافہ اور خطاب دے کر تقسیم کر دیے اور ہر جگہ اپنے حکام مقرر کر کے خود مختار بن گیا۔ بادشاہی خزانے میں نقد تیس لاکھ روپے تھے جو وہ اپنے تصرف میں لے آیا۔

اس خبر کو دکن کی لشکر گاہ تک پہنچنے میں دیر نہیں لگی۔ سلیم سے بادشاہ کی محبت نے یہاں بھی اس کے قدم روک لیے۔ مشورے تو یہ مل رہے تھے کہ شہزادے کے خلاف سخت کارروائی کی جائے لیکن اس کی پدرانہ شفقت کچھ اور کہہ رہی تھی۔ دو بیٹوں کے انتقال سے اس کا دل پہلے ہی داغدار تھا۔ مراد بھی چلا گیا تھا، دانیال بھی انتقال کر گیا تھا۔ اب ایک سلیم (جہانگیر) ہی رہ گیا تھا۔ وہ اس کی بغاوت پر رنجیدہ ضرور تھا لیکن ضبط سے کام لے رہا تھا۔ اسے طرح طرح کے مشورے مل رہے تھے لیکن اس نے وہ کیا جو اس کے دل نے کہا۔ اس نے بادشاہ اکبر کو ایک طرف رکھ دیا اور باپ بن کر سوچا۔ اس نے نہایت مخلصانہ فرمان لکھا اور قاصد کے حوالے کر دیا۔ زبانی بھی محبت آمیز کلمات کہے اور شہزادے کو پیغام بھجوایا کہ وہ اس کی خدمت میں حاضر ہو جائے تاکہ مفسدوں کو موقع نہ مل سکے۔ قاصد بھی اسے بنایا جو شہزادے کا ہم سبق اور کھیل کود کا ساتھی تھا۔

قاصد محمد شریف آیا تو شہزادے نے آداب شاہی کے مطابق اس کا استقبال کیا۔ شاہی فرمان ملاحظہ کیا اور اس کے جواب میں باپ کے پاس جانے کا دل میں ارادہ کر لیا۔ فرمان کو مشورے کے لیے ساتھیوں کے سامنے رکھا۔ سب کا مشورہ یہی ہوا کہ شہزادہ ابھی بغاوت سے ہاتھ نہ اٹھائے۔ ناتجربہ کار شہزادہ جوانی کے جوش میں ان کی باتوں میں آ گیا اور باپ کے پاس جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ نہ صرف یہ بلکہ محمد شریف کو اپنے پاس روک لیا اور اپنا وکیل السلطنت بنا لیا۔

جب قاصد واپس نہ آیا اور یہ معلوم ہوا کہ شہزادے نے اسے روک لیا ہے تو اکبر کو معاملے کی نزاکت کا احساس ہوا۔ دکن کی مہم قریب الختم تھی اور یہ امید تھی کہ بہت جلد بیشتر شہر اور قلعے اس کے قبضے میں آ جائیں گے۔ اس کے باوجود اکبر نے واپسی کا ارادہ کر لیا۔ وہ شیخ ابوالفضل کو برہان پور میں متعین کر کے آگرہ کی طرف کوچ کر گیا۔

اس کا دل جانتا ہو گا کہ وہ کیا سوچتا ہوا آگرہ کی طرف جا رہا تھا لیکن دنیا نے یہ دیکھا کہ کوچ کی خبر سنتے ہی جہانگیر نے زیادہ سے زیادہ فوج جمع کرنی شروع کر دی۔

جتنی دیر میں اکبر آگرہ پہنچا جہانگیر بھی چالیس ہزار سواروں اور جنگی سامان کے ساتھ آگرہ کی طرف چل دیا اور شہرت یہ دی کہ وہ باپ سے ملاقات کے لیے جا رہا ہے لیکن اس کا لشکر صاف بتا رہا تھا کہ معاملہ کچھ اور ہے۔

جب سے شہزادہ الٰہ آباد سے روانہ ہوا تھا، اکبر کو اس کے کوچ کی خبریں برابر مل رہی تھیں۔ جن امیروں کی جاگیروں پر شہزادے نے قبضہ کیا تھا، ان کی فریادیں برابر بادشاہ کے حضور پہنچ رہی تھیں۔ یہ کتنی بڑی نافرمانی تھی کہ جو جاگیریں بادشاہ نے عطا کی تھیں، شہزادہ انہیں چھینتا چلا آ رہا تھا۔

جب یہ فریادیں حد سے بڑھنے لگیں تو بادشاہ کو بھی تشویش ہوئی۔ اس نے ایک مرتبہ پھر بیٹے کے نام خط لکھا۔

''اس فرزند کے دیدار کا اشتیاق حد سے زیادہ ہے لیکن اس شان و شکوہ کے ساتھ اس کا آنا ہمارے دل پر شاق گزر رہا ہے۔ اگر اس کا مطلب اظہارِ تجمل اور لشکر کا مظاہرہ ہے تو یہ بات بخوبی ظاہر ہو چکی۔ اب بہتر یہ ہے کہ اس بھیڑ بھاڑ کو ہٹاؤ۔ لوگوں کو ان کی جاگیروں پر رخصت

کردو اور مقررطریقے پر جریدہ پہنچ کر باپ کی منتظر آنکھوں کو ٹھنڈا کرو اور اگر بدخواہوں کی ہرزہ سرائی سے تم کسی وسوسے اور اندیشے میں گرفتار ہو تو یقین کرو، ہمارے دل میں تمہاری طرف سے کوئی میل نہیں ہے۔ تم الٰہ آباد واپس چلے جاؤ۔ جس وقت تمہارے دل سے یہ وہم نکل جائے، خدمت میں حاضر ہو جانا۔"

یہ خط شفقت کے قلم سے لکھا گیا تھا لیکن اسے اس میں بھی سازش کی بو آرہی تھی۔ جب دل صاف نہ ہو تو سوئی بھی بھالا معلوم ہوتی ہے۔ بادشاہ نے اسے یہ پیشکش کی تھی کہ وہ اپنے آدمیوں کو جہاں چاہے متعین کردے اور خود ملک کے نظم ونسق میں مصروف ہو جائے۔ اس سے شہزادے نے یہ مطلب نکالا کہ بادشاہ اسے اکیلا کر دینا چاہتا ہے۔ میں اپنے سرداروں کو کہیں اور متعین کر کے خود سے جدا نہیں کرسکتا۔ جو بادشاہ مجھ سے مہرالنسا چھین سکتا ہے، وہ میری طاقت چھیننے کی بھی کوشش کرسکتا ہے۔ یہ سردار ہی تو میری طاقت ہیں۔ ہمارے سردار اور ہماری فوج ہمارے ساتھ رہے گی۔ وہ اتاوہ ہی میں ٹھہرا رہا کہ کوچ کر کے وہاں تک آچکا تھا۔ یہاں سے اس نے ایک عرضداشت بادشاہ کی خدمت میں بھیجی۔

"میرا تو ارادہ صرف حضور سے ملاقات کرنے کا تھا اور جو باتیں موقع طلب لوگ بناتے ہیں، ان کا خیال تک میرے دل میں نہیں گزرا ہے۔ اب جبکہ آپ کا حکم صادر ہو گیا ہے، میں اطاعت امر کو واجب سمجھتا ہوں اگرچہ کچھ روز کے لیے حضور سے جدا رہنا پڑے گا۔"

اس کے بعد شہزادے نے الٰہ آباد کی طرف کوچ کردیا۔ اس کے واپس ہوتے ہی اکبر نے ازراہِ شفقت صوبہ بنگال اور اڑیسہ کو شہزادے کی جاگیر میں دے دیا اور وہاں کی صوبہ داری بھی اسے عطا کردی۔

الٰہ آباد میں شہزادہ اسی طرح ٹھہرا رہا اور بادشاہوں کی طرح جاگیروں کے عطا کرنے، خطاب اور نقارہ دینے اور امیروں کو محالات پر مقرر کرنے میں مشغول رہا۔

وہ الٰہ آباد میں رہ کر بادشاہت ضرور کررہا تھا لیکن پھونک پھونک کر قدم رکھ رہا تھا۔ بادشاہ کی طرف سے اب بھی کھٹکا لگا ہوا تھا کہ نہ جانے کب کس کے بہکاوے میں آکر آنکھیں پھیر لے۔ اسے یہ خدشہ یونہی نہیں تھا۔ اب دربار اکبری پہلے کی طرح نہیں رہا تھا۔ اب اس کے گرد ایسے لوگ جمع ہوگئے تھے جنہوں نے اسے گمراہ کر کے بے دین کردیا تھا۔ یہاں تک کہ اس نے دینِ الٰہی کے نام سے ایک مذہب خود ایجاد کرلیا تھا۔ فیضی اور ابوالفضل اس کی گمراہی میں برابر کے شریک تھے۔ یہ دونوں شیخ مبارک کے بیٹے تھے۔ یہ شخص فلاسفہ کی کتابیں پڑھ پڑھ کر دہریہ ہو گیا اور رفتہ رفتہ بے دینوں کا پیشوا بن گیا۔ اس کے بیٹے بادشاہ کے اکثر مصاحبوں اور مقربوں کے مقتدا بن گئے۔ پھر ان لوگوں نے اکبر کے مزاج کو بھی ایسے رخ پر ڈال دیا کہ لوگوں میں اس کی ذات بھی ہدف بن گئی۔

☆☆☆

اکبر جب دکن سے آگرہ واپس آیا تھا تو ابوالفضل کو برہان پور میں چھوڑ آیا تھا۔ اب شہزادہ سلیم (جہانگیر) کے جاسوسوں نے یہ خبر پہنچائی کہ ابوالفضل بادشاہ کے طلب کرنے پر دارالحکومت جانے کی تیاری کررہا ہے۔ یہ اطلاع اسے اس وقت پہنچائی گئی جب وہ شراب کی ایک محفل میں سر سے پاؤں تک نشے میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس اطلاع نے اس کا نشہ اور بڑھا دیا۔ اس کے دل میں یہ خیال پہلے ہی سے موجود تھا کہ ابوالفضل جیسے لوگوں نے بادشاہ کو بے راہ روی کا شکار کردیا ہے۔ یہاں تک کہ بادشاہ نے دین الٰہی کے نام سے نیا مذہب اختیار کرلیا ہے۔ اکبر کو خوش کرنے کے لیے درباری امراء بھی اسی رنگ میں رنگ گئے تھے۔ شہزادہ، اکبر کی زندگی کے اس پہلو سے ناخوش تھا اور اس کا ذمے دار ابوالفضل کو سمجھتا تھا۔ اب جو اس کے دارالحکومت کی طرف جانے کی خبر سنی تو ضرور یہ سمجھا کہ اگر وہ بادشاہ تک پہنچ گیا تو اس کے خلاف ریشہ دوانیوں سے باز نہیں آئے گا۔ بادشاہ کا دل اس کی طرف سے پھیر دے گا۔ "وہ آگرہ تک نہیں پہنچے گا۔" اس نے نشے کی بوجھل آواز میں کہا۔ محفل برخاست کردی اور راجا نرسنگ راؤ کو اپنے حضور طلب کیا۔

"مجھے تمہاری بہادری اور وفاداری پر ناز ہے۔" جہانگیر نے نشے میں ڈولتے ہوئے کہا۔

"حضور کی ذرہ نوازی ہے۔"

"اس وقت ہم نے تمہیں ایک خاص کام سے بلایا ہے جسے کوئی اور انجام نہیں دے سکتا۔"

"میں حضور کے لیے جو کرسکتا ہوں کروں گا۔"

"یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ تم ابوالفضل سے واقف ہو یا نہیں۔ میرے باپ کو بہکانے والوں میں ابوالفضل سرفہرست ہے۔ اس شخص کی وجہ سے مملکت کا نظام درہم برہم ہو رہا ہے۔ اب یہ ہمارے خلاف شکایتوں کا پشتارہ لے کر دارالحکومت جارہا ہے۔ اب یہ تمہارا کام ہے کہ اسے دارالحکومت تک نہ پہنچنے دو۔ تم اس کے گوالیار پہنچنے

سے پہلے وہاں پہنچ جاؤ اور راستے ہی میں اسے روک کر اس کا کام تمام کردو۔"

"ایسا ہی ہوگا۔"

"خیال رکھو کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔"

"میرے اچانک غائب ہوجانے پر شک تو ہوگا۔"

"اس کا سدباب کرنا تمہارا کام ہے۔"

راجا نے اثبات میں گردن ہلائی۔ شیخ ابوالفضل سے اس کی پرانی دشمنی تھی اور اب اسے انتقام لینے کا بہترین موقع مل رہا تھا۔ اسی لیے وہ اتنی جلدی رضامند ہوگیا تھا۔ اس نے اپنے وطن جانے کا بہانہ کیا اور شہزادے سے رخصت ہوکر حسب الحکم گوالیار پہنچ گیا اور شیخ ابوالفضل کا انتظار کرنے لگا۔ اس نے اپنے بااعتماد آدمیوں کو اس راستے پر چھپا رکھا تھا جہاں سے ابوالفضل کو گزرنا تھا۔

شیخ ابوالفضل ایک چھوٹی سی جمعیت کے ساتھ گوالیار کے قریب پہنچا تھا کہ راجا کے آدمیوں نے جو گھات لگائے بیٹھے تھے، حملہ کردیا۔ یہ حملہ اتنا اچانک تھا کہ ابوالفضل کو فرار کا موقع نہ مل سکا۔ موقع پر ہی اس کا کام تمام ہوگیا۔ اس کے ساتھ آئے ہوئے آدمیوں میں سے بھی کچھ قتل ہوئے کچھ فرار ہوگئے۔

اس سانحے کی اطلاع اکبر کو ملی تو اسے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ حرکت کس کی ہوسکتی ہے۔ اطلاع دینے والے نے راجا نرسنگ راؤ کا نام لیا تھا اور راجا نرسنگ اس وقت جہانگیر کی ملازمت میں تھا۔

اطلاع ملتے ہی کمرا اکبر کی گرجدار آواز سے گونج اٹھا۔

"گستاخ سلیم نے جلالِ اکبری کو آواز دی ہے۔ اس نے ہماری نرمی کا غلط فائدہ اٹھایا ہے۔ ہم اپنی فوجوں کو حکم دیں گے کہ وہ سلیم کا سر اتار کر ہماری خدمت میں پیش کرے۔"

جہانگیر کی خوش قسمتی کہ اکبر اس وقت اپنی والدہ کے قدموں میں بیٹھا تھا۔ انہوں نے اکبر کی گرج سنی تو اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

"بیٹا، کیا میں نے اپنے پوتے کو اسی دن کے لیے گودوں میں کھلایا تھا کہ وہ جوان ہو تو اس کا باپ اسے قتل کرنے کی باتیں کرے۔"

"آپ دیکھ رہی ہیں کہ اس نے کیسی مذموم حرکت کی ہے۔"

"بے شک! یہ قتل ہوا ہے لیکن یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ یہ قتل اس کے حکم سے نہ ہوا ہو۔ اگر اس کے حکم سے ہوا بھی ہے تو ابوالفضل اور میرے سلیم کا کوئی مقابلہ نہیں۔"

"اکبر کے عدل کا تقاضا ہے کہ قاتل کو سزا دی جائے۔"

"ہم خوں بہا دینے کو تیار ہیں۔"

"اگر اسی طرح خوں بہا ادا ہوتا رہا اور ہمارے امراء قتل ہوتے رہے تو جلالِ اکبری کا خوف کیسے رہے گا۔"

"سلیم ابھی بچہ ہے اور مفسدوں میں گھرا ہوا ہے۔ اسے پیار سے سمجھایا جاسکتا ہے۔"

"اب کچھ نہیں ہوسکتا۔ ہم نے سمجھا کر دیکھ لیا۔ عنایات کی بارش کرکے دیکھ لیا۔ وہ کسی طرح ماننے کو تیار ہی نہیں۔"

"تمہارے سمجھانے کی بات اور ہے ہمارے سمجھانے کا اثر دوسرا ہوگا۔ اس سے ہماری ملاقات کا بندوبست کیا جائے۔"

"اب کوئی فائدہ نہیں۔"

"ہم تمہاری ماں ہونے کی حیثیت سے تمہیں حکم دیتے ہیں کہ ملاقات کا بندوبست کیا جائے۔"

اکبر نے گردن جھکادی۔ اس نے اقرار بھی نہیں کیا کہ ملاقات کرائی جائے گی، انکار بھی نہیں کیا اور ماں کے پاس سے اٹھ گیا۔ یہاں سے اٹھ کر شہزادے کی سوتیلی والدہ سلیمہ سلطان بیگم کے محل میں پہنچا۔ یہ خاتون دانائی اور سخن سنجی میں بے مثل تھیں۔ اکبر کو جب بھی کوئی مشکل پیش آتی تھی، وہ ان سے مشورہ کیا کرتا تھا۔ اس وقت بھی وہ اسی مقصد سے وہاں پہنچا تھا۔ غصے میں بھرا ہوا تو تھا ہی، شہزادے کو غائبانہ خوب سخت سست سنائیں۔ والدہ سے جو باتیں ہوئی تھیں، وہ بھی دہرادیں۔

"آپ نے تمام باتیں سن لیں۔ اب آپ فرمایئے ہمیں کیا کرنا چاہیے۔"

"مریم مکانی درست فرماتی ہیں۔" سلیمہ سلطان نے کہا۔ "جوانی کا غصہ ہے، سمجھانے ہی سے ٹھنڈا ہوسکتا ہے۔"

"اسے کس بات کا غصہ ہے۔ ہم نے اس کے ساتھ کیا نہیں کیا۔"

"وہ مہرالنسا کو نہیں بھول سکا ہے۔"

"مریم مکانی بھی یہی فرماتی ہیں، آپ بھی یہی کہہ رہی ہیں۔ سب کے حواس پر مہرالنسا کیوں سوار ہے۔"

"اس لیے کہ مہرالنسا شہزادے کی ضد بن گئی ہے۔ اس کی یہ ضد کسی بھی طوفان کا پیش خیمہ بن سکتی ہے۔ طوفانوں کے رخ تلواروں سے نہیں، تدبیر سے موڑے جاتے ہیں۔"

"یہ تدبیر ہی تو تھی کہ ہم نے مہرالنسا کی شادی کرادی۔"

''یہ تدبیر نہیں غلطی تھی۔ ہم نے اس وقت آپ کو سمجھانے کی کوشش کی تھی، اب سلیم کو سمجھانے کا وقت ہے۔''
''آپ کے بقول وہ ہماری غلطی تھی، کیا اب وہ غلطی واپس ہو سکتی ہے؟ اسے مہرالنسا کے بغیر ہی ہمارا فرمانبردار بننا ہوگا۔''
''اگر غلطی کا ازالہ نہیں ہو سکتا تو ضروری نہیں کہ ایک اور غلطی کی جائے۔ بچہ جب روتے روتے تھک جاتا ہے تو چاہتا ہے کوئی اسے چپ کرائے۔ یہی حال سلیم کا ہے۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو مریم مکانی کے ہمراہ ہم بھی سلیم کے پاس جائیں اور اسے سمجھائیں۔''
اکبر نے بادل ناخواستہ اجازت دے دی۔ دونوں خواتین روانہ ہوئیں۔ اکبر نے خاصہ کے ایک مشہور ہاتھی ''فتح لشکر'' نامی خلعت جواہرات اور دوسرے تحفے بیٹے کے لیے بھیجے۔
یہ دونوں خواتین الٰہ آباد پہنچیں تو شہزادے نے نہایت ادب اور خوش دلی سے استقبال کیا۔ ان میں سے ایک دادی تھی اور ایک والدہ۔ شہزادے پہ دونوں کا استقبال فرض تھا لیکن جس کیفیت سے وہ گزر رہا تھا اور سب کو اپنا دشمن سمجھنے لگا تھا، اس کی روشنی میں ایسا استقبال حوصلہ افزا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ کم از کم ان دونوں خواتین کے لیے اس کے دل میں نرم گوشہ ہے اور گفتگو کی جا سکتی ہے۔
گفتگو شروع ہوئی تو آغاز دادی نے کیا۔
''بیٹا جو روش تم نے اختیار کی ہے وہ تمہارے باپ کو بہت رنج پہنچا رہی ہے۔ ہم تو یہ دیکھ رہے ہیں کہ ان کا دل سلطنت کے کاموں کی طرف سے ہٹتا جا رہا ہے۔ چنداں یہی حالت رہی تو مفسدوں کو ہنسنے کا موقع مل جائے گا۔ وہ دل کتنے خوش ہوں گے جو دل سے یہ چاہتے ہیں کہ باپ بیٹوں کے درمیان یہ رنجش برقرار رہے۔''
''انہیں ہمارا نہیں رعبِ شاہی کے اٹھ جانے کا رنج ہو رہا ہوگا۔''
''تم ایک عورت کے لیے اپنے والد سے بدگمان ہو رہے ہو۔''
''مہرالنسا عورت نہیں، ہماری محبت ہے۔''
''مغل شہزادوں کو زیب نہیں دیتا کہ اپنی محبت کے لیے ملک کا سکون غارت کر دیں۔ جانتے ہو ملک میں شورش بڑھ رہی ہے۔''
''یہ شورش ہم نے نہیں، انہوں نے پیدا کی ہے۔ ہم تو ان سے ملاقات کے لیے گئے تھے۔ ان کا حکم ہوا کہ ہم الٰہ آباد واپس چلے جائیں۔ ہم نے ان کے حکم پر سر جھکایا اور الٰہ آباد چلے آئے۔''
''تم چالیس ہزار کے لشکر کے ساتھ آئے تھے۔ کون کہہ سکتا تھا کہ تمہارا ارادہ جنگ کرنے کا نہیں تھا۔ باپ بیٹوں کی ملاقات تلواروں کے سائے میں نہیں ہوتی۔''
''اگر تنہا جائیں تو اس کی کیا ضمانت ہے کہ ہمیں قید نہیں کر لیا جائے گا؟''
''تمہاری حفاظت کی ذمے داری ہم لیتے ہیں۔ میں تمہاری دادی ہوں اور یہ تمہاری والدہ۔ کیا یہ ضمانت کافی نہیں؟''
شہزادہ یہ سمجھ رہا تھا کہ اس سے ابوالفضل کے قتل کے بارے میں باز پرس ہوگی لیکن جب ساری گفتگو میں قتل کا کہیں ذکر نہیں آیا تو وہ کچھ نرم پڑ گیا۔ پھر دونوں خواتین نے ضمانت بھی لی تو وہ آگرہ آکر باپ سے ملاقات کے لیے آمادہ ہو گیا۔
دونوں خواتین اس سے وعدہ لینے کے بعد آگرہ واپس آگئیں اور یہ انتظار ہونے لگا کہ شہزادہ کب آگرہ کی جانب کوچ کرتا ہے۔ پھر ایک دن خبر ملی کہ شہزادے نے کوچ کر دیا ہے۔
جاسوس پل پل کی خبریں پہنچا رہے تھے۔ جب شہزادے کی سواری دارالخلافہ سے ایک منزل دور رہ گئی تو مریم مکانی خود اس کے استقبال کے لیے گئیں اور اعزاز و اکرام کے ساتھ اسے اپنے محل میں اتارا۔
باپ اور بیٹا عرصہ دراز کے بعد ایک شہر میں تھے لیکن ابھی آمنا سامنا نہیں ہوا تھا۔ پہلے یہ سوچا گیا کہ سلیم، اکبر سے ملاقات کے لیے جائے لیکن مریم مکانی کی بوڑھی آنکھوں نے بڑی دور تک دیکھا۔ اگر شہزادہ ملاقات کے لیے خود گیا تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہوگی۔ بیٹے باپ سے ملنے جایا ہی کرتے ہیں۔ اگر باپ اپنے بیٹے سے ملنے آئے تو اس سے ظاہر ہوگا کہ اسے ندامت ہے لہٰذا یہی فیصلہ کیا گیا کہ اکبر خود اس سے ملنے آئے۔
باادب باملاحظہ کی صدائیں بلند ہوئیں۔ بابا جانی خود اس سے ملنے آئے ہیں۔ وہ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ دوسرے ہی لمحے جلال الدین محمد اکبر مغل اعظم شہنشاہ ہند اس کے سامنے تھا لیکن اس وقت وہ بادشاہ نہیں باپ تھا۔ چہرے پر شفقت کی نرمی، بازو پھیلے ہوئے۔ شہزادے نے تعظیم میں اپنا سر جھکا دیا۔ بادشاہ نے اسے سینے سے لگا لیا۔
''جانِ پدر! اپنے باپ کو معاف نہیں کرو گے؟''
''ظلِ الٰہی! کیوں ہمیں گناہ گار کرتے ہیں۔

معافی تو ہمیں طلب کرنی چاہیے۔ نادانستگی میں ہم نے آپ کا دل دکھایا۔"

"ہم سے جو کچھ سرزد ہوا تمہاری اور مملکت کی بہتری کے لیے ہوا۔ ہمارے فیصلے غلط ہو سکتے ہیں، ہم غلط نہیں۔"

"ہم شرمندہ ہیں۔"

"پچھتاوا ہمیں بھی کم نہیں لیکن ہم نے اس وقت جو بہتر سمجھا، وہ کیا۔ مصلحت کا تقاضا یہی تھا۔ ہمیں یہ خبر نہیں تھی کہ ہمارا ضدی بیٹا ہمارے فیصلے پر اتنا ناخوش ہوگا۔"

"آپ خود تشریف لائے، میں نے ہر گلہ فراموش کردیا۔"

شہزادے نے نذرانے میں ہزار مہریں اور سات ہاتھی پیش کیے۔ اکبر نے بھی بیٹے کو ہاتھی دیا اور طرح طرح کے جواہرات اور مرصع سامان عطا فرمایا۔ اپنی پگڑی سر سے اتار کر بیٹے کے سر پر رکھ دی۔ دوبارہ مستقل ولی عہدی دینے کا اعلان کردیا اور شادیانے بجانے کا حکم ہوا۔

ملاقات کا یہ جشن سات روز تک جاری رہا۔ پورا آگرہ روشنی میں نہایا ہوا تھا۔ حاجت مندوں کی حاجتیں پوری ہوتی رہیں۔ امراء اور سرداروں کو خطابات سے نوازا جاتا رہا۔

سات دن سات ساعتوں کی طرح گزر گئے۔ جشن سے فراغت کے بعد اکبر کو اس مہم کا خیال آیا جسے چھوڑ کر شہزادہ الٰہ آباد کی طرف روانہ ہو گیا تھا۔ ایک مرتبہ پھر شہزادے کو رانا کی مہم پر مامور کر کے نامور امراء کی ایک جماعت کے ساتھ رخصت کیا گیا۔

سازشیوں کو یہ کیسے گوارا ہو سکتا تھا کہ باپ بیٹوں میں اتفاق ہو جائے۔ انہوں نے شہزادے کے رخصت ہوتے ہی سازشوں کے جال پھیلانے شروع کردیے۔

جہانگیر نے پہلا پڑاؤ فتح پور سیکری میں رکھا تا کہ خزانہ اور لشکر جس کی منظوری دی جا چکی تھی، وہاں پہنچ جائے۔ شاہی کارندوں نے جان بوجھ کر تاخیر کی۔ وہ انتظار کرتا رہا۔ نہ خزانہ پہنچا نہ لشکر۔ دن پر دن گزرتے جا رہے تھے اور کوئی اسے پوچھنے والا نہیں تھا۔ جب زیادہ ہی دن گزر گئے تو اس کے دل میں بادشاہ کی طرف سے بدگمانی پیدا ہونے لگی۔ اس نے یہی سمجھا کہ بادشاہ پھر کسی کے بہکاوے میں آگیا ہے اور اسے مہم پر بھیج کر پچھتا رہا ہے۔

اس نے بادشاہ کے نام خط لکھا۔

"آخر اس بندے کا قصور کیا ہے کہ سرکار کے دفتری اور گماشتے ضروری سامان مہیا کرنے میں اس طرح سستی کر رہے ہیں۔ میری سبکی ہو رہی ہے۔ سخن طرازوں کو دراندازیوں کا موقع مل رہا ہے۔ یہ مرید تو مرشد اور قبلہ گاہ کے حکم کو حکم آخر جانتا ہے چنانچہ حسب فرمان یہاں آکر ٹھہرا ہوا ہے اور چند دن سے برابر انتظار کر رہا ہے لیکن اب تک سازوسامان کا کوئی انتظام نہ ہو سکا۔ یہ بات دنیا پر روشن ہے کہ رانا کی مہم کے اس قدر وسیع ملک میں دشوار گزار پہاڑوں پر فوج کشی کرنی پڑے گی۔ روپے کے بغیر اور لشکر و توپ خانے کے خاطر خواہ انتظام کے بغیر یہ مہم سرانجام نہیں پا سکتی۔ ان انتظامات کے لیے بار بار منت سماجت کرنے سے آپ کو بھی ملال ہوگا اور مجھے بھی خفت ہوگی۔ اس لیے حضور مجھے کچھ عرصے کے لیے جاگیر پر جانے کی اجازت دے دیں تا کہ وہاں جا کر لڑائی کی خاطر خواہ تیاری کرلوں۔"

اس عرضداشت کے بعد بادشاہ نے اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی۔ اس کی چچی بخت النساء بیگم کو ایک دو محرم راز امیروں کے ہمراہ روانہ کیا۔ انہوں نے بھی سمجھایا لیکن وہ اپنی ضد پر اڑا رہا۔ مجبور ہو کر بادشاہ نے اسے الٰہ آباد جانے کی اجازت دے دی۔

شہزادہ سلیم کوچ پر کوچ کرتا ہوا الٰہ آباد کی طرف روانہ ہو گیا۔ بادشاہ نے اس مرتبہ بھی اس کے پاس تحائف روانہ کیے۔ شہزادے نے تشکر آمیز الفاظ کا تبادلہ ضرور کیا لیکن اپنا رویہ نہیں بدلا۔

الٰہ آباد میں اسے روکنے والا کوئی نہیں تھا۔ الٰہ آباد پہنچتے ہی اسے خوشامدیوں نے گھیر لیا۔ اس کے نادان دوست اسے ہر وقت شراب اور افیون میں غرق رکھنے کے لیے موجود تھے۔ اس نشے میں اس سے عجیب و غریب حرکتیں سرزد ہو جایا کرتی تھیں۔

بادشاہ تک یہ خبریں برابر پہنچ رہی تھیں لیکن وہ اپنی محبت سے مجبور تھا۔ اسے خوش رکھنے کے لیے تحفے تحائف بھیجتا رہتا تھا۔ بادشاہ کی نرمی نے اسے بے خوف کردیا۔ اس کے دل کے کسی گوشے میں یہ بات محفوظ ہو گئی تھی کہ شاید بادشاہ اس سے ڈرتا ہے۔ وہ جو کچھ کرتا رہے، بادشاہ کچھ نہیں کر سکتا۔

☆☆☆

ایک خوب صورت لڑکا شہزادے کی خدمت میں حاضر ہوا اور ملازمت کا خواستگار ہوا۔ لڑکا کیا تھا پری پیکر تھا۔ کسی مصور کا شاہکار تھا۔ خوب صورت بھی تھا، نازک اندام بھی۔ نسوانی ادائیں تھیں۔ سبزے کا ابھی آغاز ہوا

تھا۔ چمپئی رنگ، سیاہ زلفیں، باتوں میں مٹھاس۔ شہزادہ اسے دیکھتے ہی اس پر فریفتہ ہوگیا۔ اس کی قابلیت سے زیادہ اس کے حسن پر مرمٹا اور اسے اپنی ملازمت میں رکھ لیا۔ اس نے بھی دولت کے لالچ میں شہزادے کو رجھانا شروع کردیا۔ شہزادہ بھی اس پر ایسا عاشق ہوا کہ اس لڑکے کو ہر وقت اپنے ساتھ رکھنے لگا۔ باوقار امراء ایک معمولی لڑکے کے ہر وقت شہزادے کے ساتھ رہنے سے سخت نالاں تھے لیکن وہ شہزادہ تھا، خود مختار تھا اسے کون روک سکتا تھا۔ یہ ضرور ہورہا تھا کہ اس کی شکایتیں دربار تک پہنچائی جارہی تھیں۔ ان شکایتوں کا علم شہزادے کو بھی تھا۔ ان شکایتوں سے بچنے کے لیے اس نے بادشاہ کے مقرر کردہ بہترین جاگیرداروں کے تبادلے شروع کردیے۔

عبداللہ خاں کو شہزادے نے ہی ترقی دی تھی اور بلند مراتب پر پہنچایا تھا۔ وہ خلوت میں شہزادے کو سمجھاتا رہتا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ نصیحتوں کا کوئی فائدہ نہیں تو شہزادے کو بتائے بغیر الٰہ آباد سے نکلا اور بادشاہ کے پاس پہنچ گیا۔ یہاں جو کچھ ہورہا تھا، اس کی روداد بادشاہ کے سامنے بیان کی۔ بادشاہ نے اس کے سوا کچھ نہیں کیا کہ اسے اپنے پاس روک لیا۔

کچھ دن نہیں گزرے تھے کہ اس لڑکے کا ایک اور عاشق پیدا ہوگیا۔ یہ شہزادے کا ایک واقعہ نگار تھا۔ وہ لڑکا بھی ایسا ہرجائی نکلا کہ شہزادے کے ساتھ ساتھ اس واقعہ نگار سے بھی تعلق پیدا کرلیا۔ بعض لوگوں کو شک ہوگیا۔ سائے گردش کرنے لگے۔ لڑکے کو معلوم بھی نہیں ہوا کہ اس کا پیچھا کیا جارہا ہے۔ جب اچھی طرح تصدیق ہوگئی تو شکایتیں شہزادے تک بھی پہنچنے لگیں۔ واقعہ نگار کو بھی معلوم ہوگیا کہ رقابت کا کھیل شروع ہوچکا ہے۔ رقیب بھی کوئی اور نہیں مستقبل کا بادشاہ ہے، ولی عہد سلطنت ہے۔ بات کھلی تو سزا یقینی ہے۔ اس نے اس لڑکے کو ایسے سبز باغ دکھائے اور شہزادے کی طرف سے ملنے والی سزا سے ایسا ڈرایا کہ وہ لڑکا اس کے ساتھ دکن کی طرف بھاگ جانے پر تیار ہوگیا لیکن ڈر اب بھی رہا تھا۔

''میں تمہارے ساتھ چلنے کو تیار تو ہوں لیکن شہزادہ جانے دے گا؟''

''ہم کون سا اسے بتا کر جائیں گے۔''

''کسی نہ کسی طرح پتا چل ہی جائے گا۔''

''میں تمام خفیہ راستوں سے واقف ہوں۔ کچھ لوگ میری مدد کرنے والے ابھی موجود ہیں۔ بس اتنا کرو جب تک میں یہاں سے نکلنے کا انتظام نہ کرلوں، اپنی اداؤں سے شہزادے کو دیوانہ بنائے رکھو۔ اسے تمہارے سوا کچھ نظر بھی نہ آئے۔ کوئی اس سے تمہاری شکایت بھی کرے تو اس پر یقین نہ کرے اور مجھ سے ملنا تو بالکل ہی ترک کردو۔''

لڑکے نے اس کی باتوں پر پوری طرح عمل کیا۔ شہزادہ کچھ دنوں سے اس کی طرف سے سرد مہری دیکھ رہا تھا۔ اب جو ٹوٹ کر ملا تو شہزادے کا نشہ گہرا ہوگیا۔ جتنی شکایتیں مل رہی تھیں، سب ساغر کی تہ میں بیٹھ گئیں۔

''لوگ مجھے تمہارے خلاف ورغلا رہے ہیں۔''

''میرے خلاف؟ میں کوئی بڑا جاگیردار ہوں جو میرے خلاف بھڑکاتے ہیں۔'' اس لڑکے نے شہزادے کے ساغر میں شراب انڈیلتے ہوئے کہا۔

''ان میں سے ایک کہتا ہے تم مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ گے۔''

''میں اگر آپ کے دسترخوان سے اٹھ جاؤں تو بھوک سے مر ہی نہ جاؤں۔''

''پھر لوگ مجھے کیوں تنگ کرنے چلے آتے ہیں؟''

''صرف اس لیے کہ جس انعام سے آپ مجھے نوازتے ہیں، وہ انہیں ملنے لگے۔''

''ایسی صورت کہاں سے لائیں گے بے چارے۔''

شہزادے نے کہا اور اس لڑکے نے ایک ساغر اور بھر دیا۔ نشہ اور گہرا ہوا۔ ''یاد رکھو، ہم تمہاری جدائی برداشت نہیں کرسکیں گے۔''

''آپ سے الگ ہوکر میں بھی زندہ نہیں رہ سکوں گا۔''

''تم نے ٹھیک کہا۔ تم اگر ہم سے جدا ہوئے تو ہم بھی تمہیں زندہ نہیں رہنے دیں گے۔''

وہ لڑکا سر سے پاؤں تک کانپ اٹھا۔ اسے وہ سزا یاد آگئی جس کا ذکر واقعہ نگار نے کیا تھا۔ اس نے یہ بھی سوچا کہ کبھی نہ کبھی یہ معاملہ کھلے گا ضرور کہ میرے تعلقات واقعہ نگار سے بھی ہیں۔ اس سے پہلے کہ بات کھلے، اسے یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ واقعہ نگار ٹھیک کہتا ہے۔

وہ جب شہزادے کے پاس سے اٹھا تو انجانے خوف سے اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ وہ اسی رات واقعہ نگار سے ملا۔ ایک سایہ پھر اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

''شہزادے کو شک ہوگیا ہے۔''

''کیسا شک؟'' واقعہ نگار نے پوچھا۔

''یہی کہ میں اسے چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔''

''اس نے کیا کہا تم سے؟''

''یہی کہ میں اس سے جدا ہونے کو ہوں اور یہ دھمکی

بھی دی کہ اگر میں اس سے الگ ہوا تو وہ مجھے زندہ نہیں رہنے دے گا۔ کچھ لوگ ہیں جو اسے ورغلاتے ہیں۔"

"اس سے پہلے کہ اس کا شک یقین میں بدلے، ہم یہاں سے نکل جائیں گے۔"

"میں یہی تو بتانے آیا تھا کہ ہمیں یہاں سے جلد نکل جانا چاہیے۔"

"ہم کل رات ہی کو یہاں سے نکل جائیں گے۔ جب آدھی رات ادھر آدھی ادھر ہو تو میرے پاس چلے آنا۔" وہ لڑکا اندھیرے میں اندھیرا بن کر گم ہو گیا۔

دوسرے دن کا سورج طلوع ہوا پھر رات آئی۔ مشعلیں روشن ہوئیں۔ وہ لڑکا حسب وعدہ واقعہ نگار کی خدمت میں پہنچ گیا۔ وہ اس کے ساتھ محل سے نکلا۔ محل سے باہر باغ میں کسی روشنی کا انتظام نہیں تھا۔ وہ دونوں چلتے رہے۔ ایک جگہ پہنچ کر واقعہ نگار رک گیا۔

"یہاں سے وہ سرنگ شروع ہو جائے گی جو ہمیں باہر نکالے گی۔ اندر بالکل اندھیرا ہوگا، احتیاط سے قدم اٹھاتے ہوئے چلتے رہنا۔"

"کیا ہم دکن تک پیدل جائیں گے؟"

"کوئی سوال مت کرو، بس چلتے رہو۔"

یہاں چند سیڑھیاں تھیں جنہیں اتر کر وہ سرنگ میں پہنچ گئے۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا لیکن وہ چلتے رہے۔ اس سرنگ نے انہیں ایک جنگل میں پہنچا دیا۔ یہاں اندھیرے میں دو گھوڑے بندھے نظر آئے۔

"اس جنگل میں یہ گھوڑے؟"

"چپ رہو۔ میں نے کہا تھا ناکہ میرے کچھ درد کرنے والے یہاں ہیں۔"

ایک آدمی کسی درخت کی اوٹ سے باہر آیا۔ واقعہ نگار نے ایک تھیلی اس کی طرف بڑھا دی۔ اس میں یقیناً وہ معاوضہ ہوگا جو گھوڑے والے سے طے ہوا ہوگا۔

وہ آدمی کسی طرف روپوش ہو گیا۔ وہ دونوں ان دو گھوڑوں پر سوار ہوئے اور چل دیے۔ ابھی کچھ دور ہی گئے ہوں گے کہ ان کے گھوڑوں کی ٹاپوں میں کئی اور گھوڑوں کی آوازیں بھی شامل ہو گئیں جو کچھ فاصلے سے آرہی تھیں۔

"گھوڑا تیز بھگاؤ۔ کوئی ہمارا پیچھا کر رہا ہے۔"

"کون ہو سکتا ہے؟"

"یہ سوچنے کا وقت نہیں۔ جتنی تیز بھاگ سکتے ہو بھاگو۔"

اب وہ ایک کچی سڑک پر آگئے تھے اس لیے گھوڑے پوری رفتار سے بھاگ سکتے تھے لیکن پیچھے سے آنے والی آوازیں قریب سے قریب تر ہوتی جا رہی تھیں۔

آٹھ دس سوار قریب ہوتے ہوتے ان کے سروں پر پہنچ گئے اور حلقہ بنا کر انہیں گھیر لیا۔ ان کے فرار ہوتے ہی شہزادے کو خبر ہو گئی تھی۔ وہ سایہ جو ہر وقت اس لڑکے کے ساتھ ساتھ رہتا تھا، اس وقت بھی قریب ہی تھا جب وہ دونوں سرنگ میں اتر رہے تھے۔ دونوں گرفتار کر کے شہزادے کے روبرو لائے گئے۔

"ہم نے کہا تھا نا کہ تم جب ہم سے الگ ہوئے ہم تمہیں زندگی سے آزاد کر دیں گے۔" شہزادے نے اس لڑکے سے مخاطب ہو کر کہا۔

خوف سے اس لڑکے کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔ بولنا تو کجا اپنے پیروں پر کھڑا بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ شہزادے نے اپنے روبرو ان دونوں کی کھال کھنچوا دی۔

اب تک ان مظالم کی کہانیاں اکبر کے سامنے پیش کی جا رہی تھیں جو شہزادے نے جاگیرداروں پر روا رکھے تھے۔ شراب نوشی کے قصے بھی سنتا رہتا تھا۔ ابوالفضل کے قتل تک کو فراموش کر دیا تھا لیکن اس دردناک سزا کا سن کر وہ بے چین ہو گیا۔

"ہم تو اپنے سامنے ذبح کی ہوئی بکری کی کھال بھی کھنچوانے پر راضی نہ ہوں۔ معلوم نہیں ہمارے بیٹے میں یہ سخت دلی کہاں سے آگئی۔"

"حضور! کچھ اور نہیں یہ ہر وقت کی شراب نوشی کا خمیازہ ہے۔"

"ہم اب اسے اس لیے معاف نہیں کر سکتے کہ وہ نشے میں رہتا ہے۔ ہم خود الٰہ آباد جائیں گے۔ ضدی سلیم ہمارے سوا کسی کی زبان نہیں سمجھے گا۔"

اس اعلان کے ساتھ ہی قلعے میں کھلبلی مچ گئی۔ حرم کی خواتین سراسیمہ تھیں۔ اکبر کے الٰہ آباد جانے کا مطلب یہ تھا کہ باپ بیٹے کے درمیان جنگ چھڑ جائے۔ اس مرتبہ اکبر نے والدہ کی سفارش بھی ٹھکرا دی۔ کوچ کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں۔ اکبر کسی کی سفارش ماننے کو تیار نہیں تھا۔

☆☆☆

مہرالنسا نے بہت دن بعد قلعے میں قدم رکھا تھا اور اس وقت شہزادے کی والدہ کے پاس بیٹھی تھی۔ شہزادے کے بارے میں جو باتیں ہو رہی تھیں، سب اس کے کانوں میں پڑ چکی تھیں۔ وہ شہزادے کو تقریباً بھول چکی تھی لیکن قلعے میں قدم رکھتے ہی اسے سب کچھ یاد آگیا۔ ایک وفادار بیوی کی طرح اسے اس وقت شہزادے سے زیادہ اپنے

شوہر کی جان کی فکر تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اگر شہزادے کا غصہ ٹھنڈا نہ ہوا تو اس کے شوہر کی جان خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ اس نے شہزادے کی والدہ سے بات کی۔

"اگر کسی طرح شہزادے سے میری ملاقات کرادی جائے تو ممکن ہے میں اسے سمجھا سکوں۔"

"کوئی فائدہ نہیں۔ وہ تمہاری ضد کررہا ہے، تمہیں طلب کرے گا لیکن اب تم کسی اور کی ہو۔ تمہیں دیکھ کر اس کا غصہ مزید بھڑکے گا۔"

"میں کوشش تو کرسکتی ہوں۔"

"یہ کوشش بھی ظلِ الٰہی کی اجازت کے بغیر نہیں کی جاسکتی۔"

"آپ میری یہ درخواست ظلِ الٰہی تک پہنچادیں۔"

"اپنے بیٹے کی زندگی کے لیے میں یہ بھی کرکے دیکھ لوں گی۔"

بادشاہ کے سامنے یہ پیشکش رکھی ضرور گئی لیکن ہر سفارش کی طرح اس نے یہ سفارش بھی ٹھکرادی۔

"اب ہمارے ملازموں کی بیویاں شہزادوں کو سمجھائیں گی۔ ہرگز نہیں۔"

اکبر نے جو کہا تھا، وہ کردکھایا۔ بیٹے کو الٰہ آباد سے اپنے ہمراہ لانے کے لیے کشتی سے کوچ کیا۔ اتفاق سے کشتی ریت کے ٹیلے پر چڑھ گئی۔ ملاحوں کی کوشش کے باوجود وہاں سے نہ نکل سکی۔ آخرکار دوسری کشتی لائی گئی اور اکبر اس پر سوار ہوکر روانہ ہوا۔ اکبر کے ساتھیوں نے اسے بدشگونی قرار دیا۔ اکبر ان باتوں کا بہت قائل تھا لیکن اس وقت ایسا غصہ سوار تھا کہ کوئی پروا نہیں کی۔

سفر پھر شروع ہوا۔ ابھی وہ پیش خانہ کی منزل پر جاکر اترا ہی تھا کہ سخت بارش شروع ہوگئی۔ یہ بارش دوسرے دن تک جاری رہی۔ ستارہ شناسوں نے اسے بھی بدشگونی قرار دیا۔

نصب شدہ خیمے پانی پر تیر رہے تھے۔ صرف شاہی خیمہ اور چند امراء کے خیمے تھے جو شدید بارش اور تیز آندھی کا مقابلہ کرسکے۔ جو لوگ شہر سے خیمہ گاہ تک ابھی نہ آسکے تھے، بارش کے سبب نکل نہ سکے۔ ستارہ شناسوں نے ایک مرتبہ پھر بادشاہ کو قائل کرنے کی کوشش کی۔

"حضور! ہمارا حساب کہتا ہے کہ اس وقت آپ کا سفر میں رہنا ٹھیک نہیں۔"

"کیا تمہارے ستارے بارش کو بھی روک سکتے ہیں۔ اب ہمیں کسی کی کوئی پروا نہیں۔"

ستارہ شناس زیادہ بحث کے متحمل نہیں ہوسکتے تھے۔ وہ خاموشی سے اٹھ گئے لیکن جلد ہی یہ افواہیں گردش کرنے لگیں کہ ستارہ شناسوں کے قیافوں کے مطابق کوئی بڑی آفت ہے جو بادشاہ کا پیچھا کررہی ہے۔ لوگ خوف زدہ ہوگئے۔ چند امراء شاہی سراپردہ میں حاضر ہوئے اور بادشاہ کو ان افواہوں سے آگاہ کیا۔

بارش رک گئی تھی۔ مطلع صاف ہوگیا تھا۔ بس پانی اترنے کا انتظار تھا کہ کشتیاں پھر دریا میں ڈال دی جاتیں۔ ایک سوار تقریباً پانی میں تیرتا ہوا "پیش خانہ" کی طرف آتا ہوا دکھائی دیا۔ جلد ہی معلوم ہوا کہ وہ آگرہ سے منزلیں مارتا ہوا یہاں تک پہنچا ہے۔ وہ کیا خبر لایا ہے کسی کو کچھ بتانے کو تیار نہیں تھا لیکن یہ سب جان گئے تھے کہ خبر غیر معمولی ہوگی اسی لیے وہ اس طوفان میں یہاں تک پہنچا ہے۔ وہ سیدھا شاہی سراپردہ کے سامنے جاکر ٹھہر گیا تھا۔ جلد ہی اسے باریابی کی اجازت مل گئی۔ جلد ہی یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اکبر کی والدہ مریم مکانی کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہوگئی ہے۔

ایک بدشگونی اور ظاہر ہوگئی۔ اب لوگوں کو یقین تھا کہ بادشاہ الٰہ آباد جانے کا ارادہ ترک کرکے آگرہ کی طرف کوچ کرجائے گا لیکن اکبر نے کوئی اور ہی راہ اختیار کی۔ سلیم (جہانگیر) کا بیٹا خرم (مستقبل کا شاہ جہاں) دادا کے ساتھ سفر کررہا تھا اور اس وقت قریب ہی بیٹھا تھا۔ اکبر نے اسے روانہ کیا کہ وہ آگرہ جائے اور دادی کی خیریت معلوم کرکے فوراً اطلاع دے۔ خرم نے کشتی دریا میں ڈال دی۔ ملاح اسے آگرہ کی طرف لے چلے۔

اکبر وہیں ٹھہرا رہا کہ آگرہ سے خیریت کی اطلاع آنے کے بعد ہی وہ آگے قدم بڑھائے گا۔ خرم نے واپس آکر اطلاع دی اور دادی کی زبانی عرض کیا۔

"اگر آخری دیدار کا ثواب حاصل کرنا چاہتے ہو تو لوٹ آؤ اور ماں کی خوشنودی حاصل کرلو۔ دونوں جہاں کی بھلائی اسی میں ہے کہ ماں کے سرہانے اس کے آخری وقت میں حاضر رہو۔"

اکبر کو یہ سنتے ہی اپنی کوتاہی یاد آگئی۔ والدہ حضور میرے الٰہ آباد جانے کی مخالف تھیں۔ میں ان کی حکم عدولی کرکے رخصت ہوا تھا۔ اسی لیے راستے مجھ پر بند ہوتے گئے۔ پہلے کشتی ریت پر چڑھی پھر بارشوں نے راستہ روکا اور اب یہ خبر آگئی۔

اس نے الٰہ آباد جانے کا ارادہ ترک کردیا اور آگرہ لوٹ آیا۔ مریم مکانی کی آنکھیں اس کے انتظار میں کبھی کھلتی تھیں کبھی بند ہوجاتی تھیں۔ اطبا دو رویہ صفیں باندھے

کھڑے تھے کہ با ادب باملاحظہ کی صدائیں بلند ہوئیں۔ اطبا ایک ایک کر کے باہر نکل گئے۔ اکبر نے کمرے میں قدم رکھا اور ماں کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ مریم مکانی نے بہ مشکل آنکھیں کھولیں۔

''مجھے معلوم تھا تم ضرور واپس آ جاؤ گے۔''

''ہاں، میں واپس آ گیا ہوں۔ اب کہیں نہیں جاؤں گا۔ یہیں آپ کے قدموں میں بیٹھا رہوں گا۔''

''نہیں میرے بچے۔ تم بادشاہ ہو۔ تمہیں مملکت کے کام سنبھالنے ہیں۔ بس میرے بچے سلیم کا خیال رکھنا۔ اسے ٹھیس نہ پہنچے۔''

یہ ان کے آخری الفاظ تھے۔ اس دن شام تک وہ خالقِ حقیقی سے جا ملیں۔

☆☆☆

جہانگیر الہٰ آباد میں تھا۔ اس تک یہ خبریں پہنچیں کہ اکبر نے الہٰ آباد کی طرف کوچ کر دیا ہے تو اس نے بھی جنگ کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ پھر یہ خبر آئی کہ وہ آگرہ کی طرف لوٹ گیا ہے اور اب یہ خبر اس کے سامنے تھی کہ اس کی دادی اس دنیا میں نہیں رہیں۔ دادی بھی کیسی جو اس کے سامنے ڈھال بن کر کھڑی ہو جاتی تھیں۔ اکبر کے قدموں میں زنجیر ڈال دیا کرتی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی اسے باپ کا غمزدہ چہرہ یاد آیا۔ وہ اب اکیلے ہوں گے۔ میں بھی وہاں نہیں ہوں کہ دلاسا دیتا۔ باپ کی محبت اچانک جاگ اٹھی۔ وہ اپنے قصور معاف کرانے کے لیے باپ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ باپ نے بھی کنجوسی نہیں کی۔ پشیمان بیٹے کو گلے لگا لیا۔

☆☆☆

اکبر نے جب سے بے راہ روی اختیار کی تھی اور گمراہی کے راستے پر چل نکلا تھا، اس کے امراء کی ایک بڑی تعداد نے اسے خوش کرنے کے لیے اس کی روش اختیار کر لی۔ بادشاہ کی تقلید میں ڈاڑھی منڈوالی تھی اور اسے سجدہ کرنے لگے تھے لیکن چند ایسے بھی تھے جو اس روش کے خلاف تھے۔ ان ہی میں ایک خان اعظم کوکلتاش بھی تھا جس کا اصل نام مرزا عزیز تھا۔ نثر و نظم میں اور اکثر علوم میں وہ اپنے زمانے کا بڑا دانش ور اور صاحبِ کمال تھا۔ اس کی ماں نے اکبر کو دودھ پلایا تھا۔ اس رعایت سے وہ اکبر کا رضاعی بھائی تھا اسی لیے سر چڑھا تھا اور بادشاہ سے بے تکلفی سے بات کیا کرتا تھا۔ جب اکبر کے دینی خیالات میں تبدیلی آئی اور اس نے امراء کو ڈاڑھی منڈوانے کی ترغیب دی تو خان اعظم نے اپنی ڈاڑھی چھوڑ دی۔ ابوالفضل اور شیخ فیضی سے

بیٹی

حضرت محمد ﷺ نے فرمایا۔

☆عورت کے لیے یہ بہت ہی مبارک ہے کہ اس کی پہلی اولاد لڑکی ہو۔

☆جس شخص کی بیٹیاں ہوں اس کو برا مت سمجھو۔ اس لیے کہ میں بھی بیٹیوں کا باپ ہوں (دل گداز فرمان)

☆جب کوئی لڑکی پیدا ہوتی ہے تو اللہ پاک فرماتا ہے اے لڑکی تو زمین پر اتر میں تیرے باپ کی مدد کروں گا۔

☆جب اللہ خوش ہوتا ہے تو زمین پر بیٹی پیدا کرتا ہے۔

☆بیٹی اللہ کی رحمت ہے۔ پس جتنی بیٹیاں ہوں گی گویا اللہ کی رحمت اتنی ہی برسے گی۔ پس والدین بالخصوص باپ کو چاہیے اپنی بیٹیوں سے بے حد پیار کرے۔ بیٹی مثل کونج ہوتی ہے جس نے جلد یا بدیر بچھڑ ہی جانا ہوتا ہے اور بیٹی کو بھی چاہیے اپنے بابل کے اوڑھائے گئے آنچل کی مکمل حفاظت کرے۔ اپنے بابل کی اجلی عزت پر حرف نہ آنے دے۔

مرسلہ۔ محمد جاوید، تحصیل علی پور

باب علم حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لاجواب جوابات

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس ایک عیسائی اور ایک یہودی آئے اور آپ کو لاجواب کرنے کے لیے دو سوال کیے۔ 1۔ وہ کون سی چیز ہے جو ہم دیکھتے ہیں لیکن اللہ نہیں دیکھتا۔ 2۔ تم کہتے ہو قرآن میں ہر چیز کا علم ہے وہ کیا ہے جو قرآن میں نہیں لکھا ہے؟

حضرت علی رضی اللہ عنہ مسکرا کے بولے۔
1۔ اللہ تعالیٰ خواب نہیں دیکھتا کیونکہ اسے نیند نہیں آتی
2۔ قرآن پاک میں سب کچھ لکھا ہے جھوٹ نہیں لکھا۔

مرسلہ۔ محمد جاوید، تحصیل علی پور

دینی مباحثہ کرتا رہتا تھا جس سے وہ دونوں سخت خفا تھے اور چاہتے تھے کہ وہ کسی طرح دربار سے چلا جائے چنانچہ اسے کوشش کر کے احمد آباد کا صوبے دار مقرر کرا دیا تھا۔

چند سال گزرنے پر اس کی والدہ کی درخواست پر اکبر نے اس کو حاضر ہونے کا فرمان لکھا کہ چونکہ تمہاری والدہ تمہارے لیے بہت بے چین ہیں اس لیے تم احمد آباد میں اپنا نائب مقرر کر کے جلد دربار میں حاضر ہو جاؤ۔ کافی دن گزر گئے اس نے اس نامے کا جواب تک نہیں دیا۔ اس پر اکبر نے سختی سے لکھا۔

''تمہاری ڈاڑھی اتنی بوجھل ہو گئی ہے کہ اپنے قبلہ گاہ کی حاضری سے تم کو روک رہی ہے۔''

اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اب وہ بادشاہ کے عتاب کا شکار ہونے والا ہے۔ اس نے دربار میں جانے کے بجائے بعض پرگنوں کو تاخت و تاراج کیا اور کافی نقد فراہم کر لیا اور فوج کے مطالبات ادا کر کے اپنے اہل و عیال کے ساتھ کھنبایت کی بندرگاہ کو چلا گیا جہاں سے تمام بندرگاہوں کو جہاز جاتے تھے۔ یہاں سے وہ ایک جہاز پر سوار ہو کر کعبۃ اللہ چلا گیا۔ جب اکبر کو اس کی روانگی کی اطلاع ملی تو اس کے پاس ایک نصیحت آمیز فرمان بھیجا۔

''میری اجازت کے بغیر سنگ وگل کے کعبہ کی زیارت کے لیے جانا عقل کے خلاف ہے اور تمہارے اسلام کے خلاف بھی جس کا تم بہت دم بھرتے ہو۔''

جتنا سخت خط اکبر نے لکھا تھا، اس سے زیادہ اس نے لکھ دیا۔

''تم کو بدخواہوں نے راہِ راست سے بھٹکا دیا ہے اور دنیا بھر میں بدنام کر دیا ہے۔ یہ تو سوچا ہوتا کہ کبھی کسی بادشاہ نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے۔ کیا کوئی چیز کلام اللہ کی طرح تم پر بھی نازل ہوئی ہے۔ کیا کوئی معجزہ ''شق القمر'' کی طرح تم سے واقع ہوا ہے یا تمہارے چار یار صفا ہیں کہ تم نے اپنے آپ کو اس دین بدنامی سے وابستہ کر لیا ہے۔ میں تمہارے خیر خواہوں سے جو دراصل بدخواہ ہیں، زیادہ وفادار ہوں۔ بیت اللہ بھی اسی لیے آیا ہوں کہ یہاں مقیم رہ کر تمہارے راہِ راست پر لوٹ آنے کی دعا کرتا رہوں۔ امید ہے اس گناہ گار کی دعا قاضی الحاجات کی بارگاہ میں قبول ہوگی اور وہ تمہیں راہِ راست پر لے آئے گا۔''

یہ باتیں گستاخی پر مبنی ضرور تھیں کہ وہ بادشاہ کو ''تم'' سے مخاطب کر رہا تھا لیکن حقیقت پر مبنی تھیں مگر پھر ایسا ہوا کہ شریف مکہ نے اس کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا اور وہ خفا ہو کر پھر اکبر کے پاس چلا آیا۔ نہ صرف آ گیا بلکہ بادشاہ کی خوشنودی کے لیے ڈاڑھی منڈوا دی، سجدہ کرنے لگا اور دوسری تمام باتوں میں بادشاہ کی پوری پوری متابعت کرنے لگا۔

یہ وہی زمانہ تھا جب سلیم (جہانگیر) الٰہ آباد سے واپس آگرہ آچکا تھا اور باپ بیٹوں میں صلح ہو گئی تھی۔ اس نے آتے ہی جہانگیر کے خلاف بادشاہ کے کان بھرنے شروع کر دیے۔ یہ اس لیے ضروری تھا کہ وہ جہانگیر کے بیٹے خسرو کو آگے لانا چاہتا تھا کیونکہ خسرو اس کا داماد تھا۔ اس وقت دربار میں دو آدمیوں کا طوطی بول رہا تھا۔ راجا مان سنگھ اور خان اعظم کو کلتاش اور خسرو سے دونوں کی رشتے داری تھی۔ خسرو، خان اعظم کا داماد اور یہ لڑکی راجا کی بھانجی تھی۔

دونوں اس گٹھ جوڑ میں لگ گئے کہ کسی طرح ولی عہدی کا تاج جہانگیر کے بجائے اس کے بیٹے خرم کے سر پر سجا دیا جائے۔ انہوں نے یہ کہہ کر اکبر کے کان بھرنا شروع کر دیے کہ کثرت شراب نوشی سے جہانگیر کے دماغ میں خلل پیدا ہو گیا ہے لہٰذا اسے علاج کی ضرورت ہے۔

بادشاہ مان سنگھ سے بھی خوش تھا اور خان اعظم سے اس لیے خوش ہو گیا تھا کہ اس نے بادشاہ کے دین کو اختیار کر لیا تھا۔ جب ان دونوں نے ایک ہی بات کی تو بادشاہ ان کی باتوں میں آ گیا۔

اکبر نے ایک روز سلیم (جہانگیر) کو اپنے پاس بلایا۔ وہ اس وقت دربار میں نہیں حرم سرا میں بیٹھا تھا۔ جہانگیر نہایت ادب سے اس کے سامنے پیش ہوا۔ بادشاہ نے نہایت شفقت سے فرمایا۔

''مسلسل سفر میں رہے ہو۔ شرانگیزوں کے مسلسل بہکانے سے الٹی سیدھی حرکتوں میں مبتلا رہے۔ اب کچھ عرصہ خلوت خانے میں آرام کرو تاکہ اطبا تمہارے مزاج کو معتدل کرنے کے لیے تدبیر کریں۔''

''آپ صاف کیوں نہیں کہتے کہ مجھے نظر بند کیا جا رہا ہے۔''

''مجھے اگر تمہیں نظر بند کرنا ہوتا تو کسی قلعے میں نظر بند کرتا۔ یہاں تمہاری ماں کے سامنے یہ ذکر نہ چھیڑتا۔ بس میں تو یہ چاہتا ہوں کہ تم محل تک محدود رہو اور ہماری نظروں کے سامنے رہو جسے تم نگرانی بھی کہہ سکتے ہو۔''

اس اچانک نظر بندی کا نتیجہ یہی ہونا تھا کہ شہزادہ یہ سمجھا کہ باپ نے اسے دھوکے سے نظر بند کر دیا ہے۔ اس وقت وہ بے بس تھا۔ وہ اپنا لشکر اپنے ساتھ نہیں لایا تھا۔ حرم

کی خواتین اسے تسلیاں دے رہی تھیں کہ یہ نظر بندی بہت جلد ختم ہو جائے گی لیکن وہ سمجھتا تھا کہ یہ نظر بندی باپ کے مرنے پر ہی ختم ہوگی۔

قلعے میں سازشیں اپنے عروج پر تھیں۔ خان اعظم اور مان سنگھ برابر اپنی کوششوں میں لگے ہوئے تھے کہ کسی طرح جہانگیر کو باپ کی نظروں سے گرا دیا جائے۔ اس نظر بندی کو جہانگیر نے قبول کرلیا تھا۔ اب دونوں یہ چاہتے تھے کہ نظر بندی کے دوران اس سے کوئی ایسی حرکت سرزد ہو جو بادشاہ کے عتاب کا سبب بن جائے۔

انہوں نے ہمدردی جتانے کے لیے بادشاہ کو تجویز دی کہ مسلسل نظر بندی کی وجہ سے جہانگیر کے دل میں ملال رہتا ہوگا۔ اس کا دل بہلانے کے لیے تفریح کا کوئی سامان کیا جائے۔ بادشاہ اس تجویز پر ان کا شکر گزار ہوا اور ہاتھیوں کی لڑائی کا جشن منعقد کیا۔

جہانگیر کے پاس ایک ہاتھی ''گراں بار'' نامی تھا جو تن و توش، طاقت اور لڑائی میں بہت مشہور تھا۔ خسرو کے پاس بھی ایک قوی ہیکل ہاتھی ''آپ روپ'' نام کا تھا۔ یہ ہاتھی بھی لڑنے میں نہایت مہارت رکھتا تھا۔ بار ہا دیکھا گیا تھا کہ کوئی ہاتھی اس کے سامنے ٹھہر نہیں سکتا تھا۔ اکبر نے مقابلے کے لیے ان ہی دو ہاتھیوں کا انتخاب کیا۔ لڑائی کے قاعدے کے مطابق ایک مددگار ہاتھی کی بھی ضرورت تھی۔ اس کے لیے شاہی خاصہ کے ایک ہاتھی ''ورن تھمن'' کا انتخاب ہوا تاکہ جب بھی مقابلے کے دو ہاتھیوں میں سے کوئی ایک مغلوب ہونے لگے تو ''ورن تھمن'' اس کی مدد کرے۔

مقابلے کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ بادشاہ اپنے مصاحبین کے ساتھ جھروکے میں بیٹھا۔ سلیم اور خسرو گھوڑوں پر سوار ہوئے۔ دونوں کوہ پیکر ہاتھی ایک ساتھ چھوڑے گئے۔ ایک زوردار چنگھاڑ کے ساتھ دونوں ہاتھی ایک دوسرے سے ٹکرائے۔ پھر بار بار ایک دوسرے سے ٹکرانے لگے۔ سارا میدان دہلنے لگا۔

چند ایک زبردست ٹکروں کے بعد جہانگیر کا ہاتھی اپنے مقابل پر غلبہ پانے لگا۔ بس یہی موقع تھا جب سازش پر عمل ہونا تھا۔ خسرو نے جہانگیر کے نوکروں کو اپنے ساتھ ملایا تھا۔ انہوں نے منصوبے پر عمل کرتے ہوئے بڑھتے ہوئے ہاتھی کو روکنے کے لیے چیخنا چلانا شروع کردیا اور شاہی فیل بان پر پتھر پھینکے۔ ایک پتھر لگنے سے فیل بان کی پیشانی زخمی ہوگئی اور خون بہنے لگا۔ اب سازش کے دوسرے مرحلے پر عمل کرنا تھا۔ خسرو ہجوم میں سے گزرتا ہوا دادا کے پاس پہنچ گیا۔

''دیکھا آپ نے...... شاہ بھائی (جہانگیر) نے کیا حرکت کی ہے۔ انہوں نے میری مدد کے لیے آنے والے ہاتھی کو روکنے کے لیے اپنے نوکروں کو اکسایا۔ انہوں نے ایسے پتھر پھینکے کہ فیل بان زخمی ہوگیا۔ وہ ہمیشہ اپنی چلاتے ہیں۔ دوسروں کو حقیر سمجھتے ہیں۔ مسلسل نظر بندی سے بھی انہیں کوئی فائدہ نہیں ہوا۔''

بادشاہ کے نزدیک ہی خان اعظم اور مان سنگھ بھی براجمان تھے۔ انہوں نے بھی خسرو کی حمایت کی۔

''یہ واقعی خسرو کے ساتھ زیادتی ہے۔ شاہ بھائی نے آپ (اکبر) کے ادب ولحاظ کا پاس بھی نہیں رکھا۔ آپ کی موجودگی میں انہوں نے یہ حرکت کی ہے۔ شاہی آداب کا مذاق اڑایا ہے۔ ان کی سرکشی بڑھتی ہی جارہی ہے۔''

اکبر بھی دور سے دیکھ چکا تھا کہ فیل بان کی پیشانی سے خون بہہ رہا ہے لیکن اس کی سمجھ میں یہ نہیں آیا تھا کہ وہ زخمی کیسے ہوا۔ خسرو نے رنگ آمیزی کے ساتھ جو کچھ بیان کیا، اسے سن کر وہ برہم ہوگیا۔ شہزادہ خرم کو جو اس کے قریب ہی بیٹھا تھا یہ کہہ کر سلیم کے پاس بھیجا۔

''تم اپنے شاہ بھائی کے پاس جا کر کہو، شاہ بابا کہتے ہیں دونوں ہاتھی اور دونوں مہاوت تمہارے ہی ہیں پھر ایک جانور کی طرف داری میں ہمارے ادب ولحاظ کو نظر انداز کردینا اور ہمارے آدمیوں کو تکلیف دینا کہاں تک درست تھا۔''

شہزادہ خرم باپ کے پاس گیا اور دادا کا پیغام پہنچا دیا۔ سلیم نے جواب میں نہایت ادب کے ساتھ کہلا بھیجا۔

''یہ حرکت میرے علم واطلاع اور مرضی کے بغیر ہوئی ہے۔ میں خود اس بے جا جرأت اور گستاخی کو پسند نہیں کرتا۔''

خرم نے واپس آکر نہایت خوش اسلوبی سے باپ کی وکالت بھی کی اور بادشاہ کے رنج وملال کو دور کردیا۔

خان اعظم اور مان سنگھ کو یہ امید تھی کہ اب بادشاہ کا عتاب جہانگیر پر نازل ہوگا اور یہ پھانس، بانس بن جائے گی۔ بادشاہ کے دل میں یہ بات راسخ ہو جائے گی کہ جہانگیر کا ذہنی فتور ابھی دور نہیں ہوا لیکن معاملے کو یوں یہ آسانی رفع دفع ہوتے دیکھ کر وہ دونوں وہاں سے کھسک گئے۔ خسرو بھی اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔

☆☆☆

شہزادہ مراد کی موت کے بعد بھی اکبر نے تسخیر دکن کی مہم جاری رکھی تھی۔ نظام شاہی امراء نے قوت حاصل کرکے حاکم بٹیر شیر خواجہ کو شکست دی اور شہر کا محاصرہ کرلیا۔ اکبر

کے امراء نظام شاہیوں کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہ رکھتے تھے۔ اکبر نے خان خاناں پر لطف وکرم کی نظر کی اور اس کی بیٹی کو شہزادہ دانیال کے ساتھ بیاہ دیا اور دانیال کو دکن کی طرف روانہ کیا۔ شہزادے کی روانگی کے بعد خود بھی دکن کا سفر کیا۔

خان خاناں اور دانیال دکن پہنچے تو معلوم ہوا قلعہ اسیر کا حاکم بہادر خاں اپنے باپ کے برعکس بادشاہ کا مطیع وفرمانبردار نہیں۔ دانیال کے پیچھے پیچھے آتا ہوا اکبر بھی وہاں پہنچ گیا۔ اس نے دانیال کو احمد نگر کی طرف روانہ کیا اور بہادر خاں کو نصیحت کرنے اور سمجھانے کے لیے خود وہیں رک گیا۔

جب تنبیہ ونصیحت کا کوئی اثر نہ ہوا تو بادشاہ برہان پور آگیا اور شاہی امراء قلعہ اسیر کو فتح کرنے میں مصروف ہوگئے۔ محاصرہ بہت دیر تک جاری رہا اس وجہ سے قلعے میں گندگی پھیل گئی۔ لوگ بیمار ہوہوکر مرنے لگے۔ فوج کی کثرت، قلعے کے استحکام اور غلے کی موجودگی کے باوجود بہادر خاں ہمت ہار بیٹھا اور اس نے بادشاہ سے جان کی امان طلب کرتے ہوئے اسیر کا عظیم الشان قلعہ اس کے حوالے کردیا۔ قلعے کا تمام سازوسامان، خزانے اور جواہرات بھی بادشاہ کے حصے میں آگئے۔ قلعہ احمد نگر پہلے ہی فتح ہوچکا تھا۔ ابراہیم عادل شاہ نے صلح کی درخواست کی۔ بادشاہ نے یہ درخواست اس شرط کے ساتھ قبول کی کہ ابراہیم عادل شاہ اپنی بیٹی کی شادی شہزادہ دانیال سے کردے گا۔ ابراہیم عادل شاہ نے یہ شرط منظور کرلی۔ ابراہیم اس وقت بادشاہ کی خدمت میں برہان پور آیا ہوا تھا جبکہ دلہن بیجاپور میں تھی۔ اکبر نے میر جمال الدین انجو کو دلہن اور دیگر تحائف وغیرہ لانے کے لیے روانہ کیا۔ اسیر، برہان پور، احمد نگر اور برار کے علاقے دانیال کے سپرد کرکے آگرہ واپس آگیا۔

میر جمال انجو جس کو بیجاپور روانہ کیا گیا تھا، وہ دلہن اور پیشکش لے کر ابراہیم کے ایلچی کے ہمراہ واپس آیا۔ دریائے گوداوری کے کنارے مونگی پٹن کے قریب جشن شادی منعقد کیا گیا اور دلہن شہزادہ دانیال کے حوالے کردی گئی۔

میر جمال آگرہ آیا اور پیشکش کی رقم بادشاہ کے حضور میں پیش کی۔ اسی سال کے شروع میں شہزادہ دانیال شراب نوشی کی کثرت کی وجہ سے بیمار پڑ گیا اور جلد ہی اس نے داعی اجل کو لبیک کہا۔

اکبر کو ذرا تسکین ہوئی تھی کہ سلیم راہ راست پر آگیا ہے۔ دکن کی طرف سے بھی وہ مطمئن ہوگیا تھا کہ آگرہ سوگ کی فضا میں ڈوب گیا۔ درودیوار نے ماتمی لباس پہن لیا۔ دکن سے شہزادہ دانیال کے انتقال کی خبر پہنچی تھی۔ ابھی ایک سال بھی نہیں ہوا تھا کہ اس کی شادی ہوئی تھی۔

اس ناگہانی موت کی خبر اکبر پر بجلی بن کر گری۔ شہزادہ مراد کا ماتم وہ پہلے ہی کرچکا تھا کہ اب چھوٹا بیٹا دانیال بھی رخصت ہوگیا۔ اسے دو جوان بیٹوں کی موت کا ایسا صدمہ ہوا کہ بستر سے لگ گیا۔ پوری زندگی مشقت میں گزری تھی۔ اب جو آرام ملا تو وہ اٹھنا بھول گیا۔ بیماری روز بہ روز بڑھتی جارہی تھی۔ علاج معالجے بھی بے کار ہوگئے۔ یہ اندازہ عام طور پر ہونے لگا کہ اب وہ بستر مرگ سے اٹھنے کا نہیں۔

اکبر کی آنکھیں ابھی بند نہیں ہوئی تھیں کہ سازشوں نے سر ابھارا۔ لطف یہ تھا کہ اس کی ابتدا خود سلیم (جہانگیر) کے گھر سے ہوئی۔ اس کا چھوٹا بیٹا خرم دادا کی تیمارداری کے لیے اس کے پلنگ سے لگا بیٹھا تھا لیکن اس سے تین سال بڑا بھائی خسرو تخت پر قابض ہونے کے خواب دیکھنے لگا۔

دربار میں دو بااثر امیر تھے خان اعظم کوکلتاش اور راجا مان سنگھ۔ خسرو کی دونوں سے رشتے داری تھی۔ خان اعظم کے گھر میں راجا مان سنگھ کی بہن تھی اور اسی ہندو عورت کی بیٹی خسرو سے منسوب تھی۔ خسرو نے اپنے خواب کی تکمیل کے لیے ان دونوں سے مدد مانگی۔ ان دونوں نے بھی سوچا کہ جہانگیر کے تخت نشین ہونے کی صورت میں انہیں کچھ نہیں ملے گا جبکہ خسرو کے بادشاہ بن جانے کے بعد پس پردہ وہی حکومت کریں گے کیونکہ خسرو میں اتنی صلاحیت نہیں تھی کہ بادشاہت کرتا۔ اکبر بھی خسرو کے مقابلے میں خرم کو اہمیت دیتا تھا کیونکہ اس نے دیکھ لیا تھا کہ خرم میں حکومت کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ (تاریخ نے بھی ثابت کیا کہ اسی خرم نے شاہ جہاں بن کر ہندوستان پر حکومت کی)

جب معاملہ خان اعظم اور مان سنگھ کے سپرد ہوا تو یہ سوال سامنے آیا کہ سلیم کو کیسے راستے سے ہٹایا جائے کیونکہ اکبر کے بعد اسے تخت نشین ہونا تھا۔ ہاں سلیم نہ رہے تو خسرو کو حکومت مل سکتی تھی۔

”سلیم باپ کے خلاف بغاوت کرچکا ہے۔ بادشاہ سلامت ہرگز یہ نہیں چاہیں گے کہ تاج اس کے سر پر رکھا جائے۔“ خان اعظم نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

”آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں۔“ مان سنگھ نے کہا۔

”اس کی بغاوت کے باوجود بادشاہ سلامت اس سے محبت کرتے ہیں۔ آپ نے دیکھا نہیں کہ وہ بار بار اس کی خطائیں معاف کرتے رہے ہیں۔ اس کے خلاف بھی

جارحانہ قدم نہیں اٹھایا۔ اگر اب بھی انہوں نے اس کے حق میں فیصلہ دے دیا تو ہم اور آپ کیا کر سکتے ہیں۔''

خسرو کچھ زیادہ ہی بے تاب تھا۔ اس نے نہایت دردناک تجویز پیش کی۔

''اس حالت میں تو یہی ہو سکتا ہے کہ ابا حضور کو راستے سے ہٹا دیا جائے۔''

''یہ مت بھولو کہ بادشاہ ابھی زندہ ہے۔ اگر ہم نے سلیم کا قصہ پاک کر دیا اور بادشاہ صحت یاب ہو گیا تو ہمارا کیا حشر ہوگا۔'' راجا مان سنگھ نے اس تجویز کو رد کرتے ہوئے کہا۔

''ہم فی الحال کوئی قدم نہیں اٹھائیں گے۔'' خان اعظم نے کہا۔

''تو کیا یونہی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں؟'' خسرو نے کہا۔

''اس عرصے میں سلیم پر نظر رکھو۔ ایسے بااعتماد آدمیوں کا انتخاب کرو جو تیار رہیں۔ بادشاہ کی آنکھیں جیسے ہی بند ہوں، سلیم کو گرفتار کر کے قید خانے میں ڈال دو۔''

''اگر دیر ہو گئی؟'' خسرو نے کہا۔

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ سلیم کی فوج دارالخلافہ سے بہت دور ہے۔ وہ ہمارا مقابلہ نہیں کر سکے گا۔ کوشش یہ بھی کرتے رہو کہ بادشاہ صحت یاب نہ ہونے پائے۔''

''اس کے لیے ہمیں طبیبوں میں سے کسی کو اپنے ساتھ ملانا ہوگا۔''

''یہ کوئی مشکل نہیں۔''

خان اعظم کی ایک کنیز ایک ستون کے پیچھے چھپ کر یہ باتیں سن رہی تھی۔ یہ کنیز بھی شہزادہ سلیم کی منظور نظر رہ چکی تھی۔ اس کے دل میں ابھی تک اس کی محبت کروٹیں لے رہی تھی۔ یہ توقع بھی دل میں کروٹیں لینے لگی کہ اگر یہ اطلاع وہ شہزادے تک پہنچا دے تو وہ اسے مالا مال کر دے گا۔ وہ اس ستون سے ہٹی اور کسی نہ کسی طرح سلیم تک پہنچ گئی۔

''درشہوار! کہو اتنے دن بعد تمہیں ہمارا خیال کیسے آگیا۔''

''صاحب عالم! آپ کی جان کو سخت خطرہ ہے۔''

''کس سے خطرہ ہے؟ کھل کر بتا۔''

''یہاں کوئی ہماری باتیں تو نہیں سن رہا ہوگا؟''

''بے فکر ہو کر بتاؤ۔ یہاں پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا۔''

''حضور کے دشمن حضور کو قید کر کے تخت پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔''

''تو یہ کیسے کہہ سکتی ہے؟''

''میں سب کچھ اپنے ان گناہ گار کانوں سے سن کر آرہی ہوں۔''

''کھل کر کیوں نہیں بتاتی، بات کیا ہے؟''

کنیز نے وہ ساری گفتگو شہزادے کے گوش گزار کردی جو وہ سن کر آرہی تھی۔ شہزادے نے تمام باتیں سکون سے سنیں اور اپنے گلے میں پڑا ہوا ہار اس کی طرف اچھال دیا۔

''اطلاع دینے پر یہ ہماری طرف سے تمہارے لیے انعام ہے۔ اس بارے میں اور جو کچھ تمہیں معلوم ہو اس کی بروقت اطلاع ہمیں دیتی رہنا۔ ہم تمہاری وفاداری کا سلسلہ دیتے رہیں گے۔''

کنیز نے شہزادے کا دیا ہوا ہار گریبان میں چھپایا اور خاموشی سے نکل گئی۔ اس نے کنیز کی باتیں سکون سے سنی ضرور تھیں اور اس وقت اس کی سنگینی کا شاید اسے احساس بھی نہیں تھا۔ کنیز کے چلے جانے کے بعد جب اس نے ان باتوں پر غور کرنا شروع کیا تو اسے سنگینی کا احساس ہوا۔ اس سازش کے پیچھے جو لوگ تھے، وہ کوئی معمولی لوگ نہیں تھے۔ خان اعظم کوکلتاش اور راجا مان سنگھ سے ٹکرانا فی الوقت اس کے بس میں نہیں تھا۔ خصوصاً اس حالت میں کہ اس کی فوج بھی دارالحکومت میں موجود نہیں تھی بلکہ احمد آباد اور دوسری جاگیروں میں تقسیم تھی۔ دوسری طرف اس کے حریف تھے جو پوری طرح دربار پر چھائے ہوئے تھے۔ وہ یہ بھی سوچ سکتا تھا کہ صرف یہ دو امیر ہی نہیں قلعے میں پھیلے ہوئے اور بہت سے لوگ بھی اس سازش میں شریک ہوں گے۔ وہ یہاں رہ کر کب تک اپنا بچاؤ کر سکے گا۔ اسے کسی بھی وقت گرفتار کیا جا سکتا ہے۔ اس سے پہلے کہ یہ سازش پر پرزے نکالے، اسے یہاں سے چلا جانا چاہیے۔ قلعے میں رہ کر وہ اپنی حفاظت نہیں کر سکتا۔

وہ قلعے سے نکلا اور اپنی حویلی میں خانہ نشیں ہو گیا۔ اتنا محتاط ہوا کہ قلعے میں باپ کی تیمارداری کے لیے آمد و رفت تک بند کر دی۔

اس کا بیٹا خرم دادا کی تیمارداری کے لیے قلعے ہی میں رک گیا تھا۔ سلیم کو اس کی طرف سے بھی فکر لگی ہوئی تھی۔ اس نے خرم کو کئی مرتبہ پیغام بھجوایا کہ وہ دشمنوں کے نرغے میں نہ رہے اور وہاں سے نکل آئے لیکن اس نے ہر مرتبہ باپ کو یہ پیغام بھجوایا کہ دم واپسیں تک میں دادا حضرت کی تیمارداری ہی میں لگا رہوں گا۔ ان کو چھوڑ کر نہیں اٹھوں گا۔ جب ہر

تدبیر نا کام ہوگئی تو جہانگیر نے خرم کی ماں کو قلعے میں بھیجا۔ وہ گئیں اور اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''اگر تمہیں کچھ ہوگیا تو میں کہیں کی نہیں رہوں گی۔ میرے بچے، میں تو جیتے جی مرجاؤں گی۔''

''امی حضور! ہمیں کچھ نہیں ہوگا۔ دادا حضور کی دعائیں ہمارے ساتھ ہیں۔ وہ ہمیشہ ہمیں اپنے ساتھ رکھتے تھے، اب ہم انہیں چھوڑ کر کیسے چلے جائیں۔''

''دشمنوں سے کچھ بعید نہیں کہ وہ تمہیں نقصان پہنچائیں۔''

''ان کی جنگ شاہ بھائی سے ہے، ہم سے نہیں۔ ان سے کہیں کہ وہ اپنا خیال رکھیں۔''

''کیا تمہارے دادا کے حقوق تمہارے باپ سے زیادہ ہیں؟''

''شاہ بھائی اپنا دفاع کرسکتے ہیں۔ دادا حضور اس وقت بیمار ہیں۔ دشمن انہیں بھی تو نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ وقت سے پہلے مار سکتے ہیں۔ ہم ان کی حفاظت کے لیے ان کے پاس رہنا چاہتے ہیں۔''

ماں نے ہر طرح سے سمجھانے کی کوشش کی، منت ساجت کی لیکن خرم نے یہ کہہ کر بات ہی ختم کردی۔

''جب تک شاہ بابا کی سانس چل رہی ہے، میں ان کو چھوڑ کر نہیں جاسکتا۔''

بے چاری ماں بیٹے کو خطرے میں چھوڑ کر اکیلی واپس چلی گئی۔ بعد میں پتا چلا کہ خرم کے نہ جانے ہی میں خرم کی بھلائی تھی۔ خان اعظم اور مان سنگھ کے مسلح آدمی قلعے کے دروازوں پر متعین تھے کہ جیسے ہی خرم باہر نکلے اسے گرفتار کرلیں۔

دشمنوں کے نرغے میں امید کی ایک کرن تھی جو جگمگا رہی تھی۔ یہ ذات تھی بخشی مرتضیٰ خاں کی۔ یہ ایک ایسا امیر تھا جو سلیم کا پوری طرح طرف دار تھا اور کھلے عام سلیم کی حمایت کیا کرتا تھا۔ اس نے جب دیکھا کہ سلیم کے گرد گھیرا تنگ ہوتا جارہا ہے تو اس نے بہادر جاں نثاروں کی ایک جماعت لے کر سلیم کی مدد اور رفاقت پر کمر باندھ لی اور اپنی جماعت کے ساتھ شہزادے کی حویلی کے سامنے جاکر کھڑا ہوگیا۔

ادھر خان اعظم کے آدمیوں میں پھوٹ پڑگئی اور وہ بھی مایوس ہوکر سست پڑگیا۔ اس کے ہٹ جانے کے بعد صرف مان سنگھ خسرو کی پشت پر رہ گیا۔ نادان خسرو نے اتنا بڑا منصوبہ تیار تو کرلیا تھا لیکن کوئی فوج بنا کر نہیں رکھی تھی جو اس کے ارادوں کی تکمیل میں اس کی مدد کرتی۔ وہ ابھی تک مان سنگھ پر تکیہ کیے بیٹھا تھا۔ خان اعظم کے پیچھے ہٹ جانے کے بعد صرف مان سنگھ رہ گیا تھا۔ بخشی مرتضیٰ خاں نے اس کا علاج بھی تلاش کرلیا۔ اس نے بادشاہ سے کہہ کر اسے بنگال کی صوبہ داری کی خلعت دے کر دارالحکومت سے رخصت کردیا۔

جب قلعے پر سے مخالفوں کا تسلط ختم ہوگیا تو شہزادہ سلیم باپ کی تیمارداری کے لیے حاضر ہوگیا۔ قلعے کے دروازوں اور شہر میں داخل ہونے والے راستوں پر اپنے بھروسے کے آدمیوں کو نگرانی کے لیے متعین کردیا۔

جلال الدین اکبر آخری سانسیں لے رہا تھا۔ جہانگیر کو دیکھ کر اکبر کے چہرے پر کچھ دیر کے لیے زندگی کے آثار نظر آنے لگے۔ شہزادے نے اپنا سر اس کے سینے پر رکھ دیا۔ بادشاہ نے خود شہزادے کو اپنا جانشین مقرر کیا اور تقریباً نصف صدی کروفر کے ساتھ حکومت کرنے کے بعد دنیا سے رخصت ہوگیا۔

اب کوئی طاقت باقی نہیں رہ گئی تھی جو شہزادہ سلیم کو تختِ شاہی پر قدم رکھنے سے روکتی۔ اس نے جہانگیر کا لقب اختیار کیا اور ابوالمظفر نورالدین محمد جہانگیر کے نام سے تختِ شاہی پر جلوہ گر ہوگیا۔

☆☆☆

بغاوتوں کا جو سلسلہ ادہم خاں سے شروع ہوا تھا اور جہانگیر تک پہنچا تھا، اس سلسلے میں خسرو کی بغاوت نے ایک اور بغاوت کا اضافہ کردیا۔

جہانگیر کے بیٹے خسرو نے جو پہلے بھی بادشاہت کے خواب دیکھ رہا تھا، بغاوت کا راستہ اختیار کیا۔ اس نے ایک جماعت کو ساتھ لیا اور قلعہ آگرہ سے نکل کر لاہور کی طرف چلا گیا۔ ارادہ یہی تھا کہ لاہور کے قلعے پر قبضہ کرکے اپنی بادشاہت کا اعلان کردے گا۔ جب جہانگیر کو اطلاع ملی تو اس نے خود خسرو کے تعاقب میں جانے کا فیصلہ کرلیا تاکہ یہ فتنہ ابتدا ہی میں ختم ہوجائے۔

خسرو لاہور کی طرف چلا جارہا تھا۔ اس کے ساتھی جہاں بھی پہنچتے تھے تاجروں، مسافروں، راہ گیروں کو لوٹ لیتے تھے۔ بادشاہی خزانے کے محاصل لے لیتے تھے۔ رعایا کی زراعت تباہ کردیتے تھے اور دیہاتوں کو جلاتے چلے جارہے تھے۔

لاہور کا صوبہ دار دلاور خاں دربار میں آنے کے لیے روانہ ہوا تھا۔ وہ راستے میں تھا کہ اسے خسرو کی بغاوت کا علم ہوا۔ وہ الٹے پاؤں لاہور کی طرف لوٹ گیا۔ جتنی دیر میں خسرو لاہور پہنچا، وہ قلعے میں محصور ہوگیا۔

خسرو لاہور پہنچا تو قلعے کے دروازے بند پائے۔
خسرو کے پاس دس بارہ ہزار سوار تھے جن میں زمانے بھر کے لفنگے شامل ہوگئے تھے۔ ان خاطر خواہ سواروں کے باوجود وہ بدحواس ہوگیا تھا کیونکہ اس کے تعاقب میں بخشی مرتضیٰ خاں جو جہانگیر کا بڑا ہمدرد تھا اور ہمیشہ اس کی مدد کرتا رہا تھا، چلا آرہا تھا۔
خسرو کے پاس ایسا بھاری جنگی ساز و سامان نہیں تھا کہ قلعے کی دیواروں کو گرا سکتا۔ وہ تو اس امید پر چلا تھا کہ صوبہ دار خود قلعہ اس کے حوالے کردے گا۔ اس نے تین دن تک قلعے میں داخل ہونے کے لیے ہاتھ پاؤں مارے لیکن جب اس نے دیکھا کہ محاصرے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا تو قلعہ چھوڑ کر مرتضیٰ خاں کے مقابلے پر چلا گیا لیکن مرتضیٰ خاں سے ایک معمولی جھڑپ کے بعد ہی اس کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ میدان چھوڑ کر بھاگ گیا۔
خسرو کے بھاگنے کے بعد اس کی سواری کی پالکی، جواہرات کے صندوقچے کے ساتھ مرتضیٰ خاں کے ہاتھ آگئی۔
جہانگیر کو معلوم ہوا تو وہ خود مرتضیٰ خاں کے کیمپ میں گیا اور حالات سے باخبر ہوا۔ دوسرے دن راجا باسو کو جو اس نواح کا سب سے بڑا زمیندار تھا، خسرو کے تعاقب میں روانہ کیا۔
شکست کے بعد خسرو نے اپنے ہمراہیوں سے مشورہ کیا۔ پٹھان تو اسے آگرہ بہار کی طرف لوٹ چلنے کا مشورہ دے رہے تھے مگر حسن بیگ مشرقی علاقوں میں جانے کا مخالف تھا۔ وہ کابل کی طرف جانے کا مشورہ دے رہا تھا۔ اس نے یہ پیشکش بھی کی کہ قلعہ روہتاس میں چار لاکھ روپیا اور دوسرا سامانِ جنگ موجود ہے، وہ سب خسرو کی نذر کرے گا۔ خسرو اس خزانے کے لالچ میں حسن بیگ کی تائید کرنے لگا۔ یہ بات پٹھانوں کو پسند نہ آئی اور انہوں نے خسرو کا ساتھ چھوڑ دیا۔
اس بحث و مباحثے میں اتنا وقت گزر چکا تھا کہ جب وہ چناب پر پہنچا تو اس طرف کے تمام حاکموں کے نام خسرو کی راہ بندی کے احکام پہنچ چکے تھے۔ وہاں کے ملاحوں کو خبردار کردیا گیا تھا کہ وہ دریا عبور کرنے میں مدد نہ کریں۔ انہوں نے خسرو کا حکم نہ مانا اور بھاگ گئے۔ خسرو کے ہمراہیوں نے بڑی دوڑ دھوپ کے بعد ایک کشتی تلاش کرلی۔ اس کے ملاحوں تک ابھی شاہی حکم نہیں پہنچا تھا۔ خسرو اپنی ایک جماعت کے ساتھ اس پر سوار ہوگیا۔ ان ملاحوں نے بھی یہ کیا کہ کشتی ریت کے ایک ٹیلے پر چڑھا دی
اور بھاگ گئے۔ شاہی کارندوں کو خبر مل چکی تھی۔ خسرو اپنے ہمراہیوں کے ساتھ گرفتار ہوگیا۔
جہانگیر اس وقت لاہور کے قریب ”کامران باغ“ میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اس نے حکم دیا کہ کامران باغ سے قلعہ لاہور کے دروازے تک راستے پر دو رویہ پھانسیاں گاڑی جائیں اور باغیوں کو ان پر چڑھا دیا جائے۔ خسرو کے ایک اہم ساتھی حسن بیگ کو جس نے خسرو کو کابل چلنے کا مشورہ دیا تھا، بیل کی کھال میں سی کر گدھے پر الٹا سوار کر کے گشت کرایا گیا۔ وہ اس کھال میں چار گھڑی سے زیادہ زندہ نہ رہ سکا۔
جب دوسرے باغیوں کو پھانسیاں دے دی گئیں تو حکم ہوا خسرو کو ہاتھی پر بٹھاؤ اور اس کے گلے میں طوق ڈالو اور ان پھانسیوں کے درمیان سے گزارو۔ حکم کی تعمیل ہوئی۔ خسرو کو ہاتھی پر اس طرح بٹھا دیا گیا جیسے وہ کوئی بادشاہ ہو۔ جب اسے ان پھانسیوں کے درمیان سے گزارا گیا تو نقیب آوازیں لگا رہے تھے۔
”بادشاہ سلامت کو امراء مجرا کر رہے ہیں۔“
یہ کوئی سزا نہیں تھی بس خسرو کو ذلت آمیز احساس دلانا تھا۔ بعد میں خسرو کے ہاتھ پاؤں سونے کی زنجیروں میں جکڑ کر ایک امیر اعتبار خاں کی نگرانی میں دے دیا گیا۔
ان واقعات سے جہانگیر کی طبیعت مکدر ہوگئی تھی لہٰذا سیر و تفریح کے لیے کابل روانہ ہوگیا۔ خسرو قید میں تھا لیکن اس کے کچھ حامی جو بچ نکلے تھے، اب بھی کسی امید پر سازشوں کے جال بنتے پھر رہے تھے۔ ان لوگوں نے یہ عہد باندھا تھا کہ خسرو کو قید سے نکال کر تخت پر بٹھا دیں گے۔ منصوبہ یہ تھا کہ جس وقت بادشاہ کی سواری نکلے اسے قابو کرلیا جائے اور خسرو کی بادشاہت کا اعلان کردیا جائے۔
سازش پر عمل ہونے سے پہلے ہی اس سازش نے دم توڑ دیا۔ سازشیوں میں سے کسی ایک شخص کا کسی بات پر اختلاف ہوگیا۔ اس نے شہزادہ خرم کو ساری بات بتادی۔ شہزادے نے بادشاہ کے کانوں تک یہ بات پہنچائی۔
بادشاہ نے اس سازش کے سرغنوں کو طلب کرلیا اور ان سے تمام سازشیوں کے نام معلوم کر کے ان سب کو پھانسی پر چڑھا دیا۔ اس بغاوت کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہوگیا۔
اب خسرو اکیلا تھا اور قیدی تھا۔ پھر قید ہی میں رہا!

ماخذات

مغلیہ دور حکومت۔ خافی خاں۔ طبقاتِ اکبری، نظام الدین احمد۔ تاریخ فرشتہ۔ محمد قاسم فرشتہ

ناہید سلطانہ اختر

قصہ شہرِ شاہاں

بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے... اکثر یہ سوچ اسے ایک انجانی سی افسردگی میں مبتلا رکھتی تھی کیونکہ ترقی کے نام پر معاشرتی تباہ کاریوں کو دیکھ کر کوئی بھی حساس دل خوش نہیں رہ سکتا... عوام کے درمیان سے نکل کر ایوانوں میں بیٹھنے والے جب خالی جیب اور خالی پیٹ بھرنے کی ہوس میں مبتلا ہو جائیں تو کب یاد رہتا ہے کہ کبھی کچھ اندھیری راتیں ان کے بھی کچے مکانوں میں اتری تھیں... کسی بیماری نے ان کے کسی پیارے کی اذیتوں میں بھی اضافہ کیا تھا... اور شاید کبھی بھوک وافلاس میں کچھ خواب ان کی پیاسی آنکھوں میں بھی سجے تھے مگر... تعبیریں اتنی الٹی ہوں گی کبھی کسی نے نہ سوچا ہوگا... اپنے خیالوں میں گم جب وہ بھی پرانے رستوں پر نکلا تو ماضی نے بہت دور تک اس کا پیچھا کیا۔

حساس دلوں میں درد کی ٹیس بن کر اتر جانے والی پرفکر تحریر

بیسویں صدی کے آخری عشرے کے تیسرے برس جب محمود اپنے گاؤں کی ایک قدآور سیاسی شخصیت کی سفارش پر ایک وفاقی محکمے میں ملازمت حاصل کرنے کے بعد پہلی بار اسلام آباد آیا تو اسے یوں لگا جیسے وہ گاؤں سے کسی جنتِ ارضی میں آ گیا ہو۔ حالانکہ گاؤں میں اس کے سنگی ساتھیوں نے اسے اسلام آباد جانے سے باز رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔

”یار! کہاں جا رہا ہے۔ اسلام آباد بھی کوئی رہنے کی جگہ ہے بھلا۔ مردہ شہر!...... ادھر اپنے گاؤں میں تو رات تک

گھروں میں چولہے جلے رہتے ہیں۔'' اس کے کزن مصطفیٰ نے کہا تھا۔

''ہاں جی۔'' باجی ریحانہ کے دیور نے تائید کی۔ ''جب وہاں گھر کی عورتیں بچوں کو لحاف اوڑھا کر بستر پر لٹا دیتی ہیں، اس وقت ہمارے گاؤں کے بچے ماؤں کے ساتھ چولہوں کے سامنے بیٹھے آگ تاپ رہے ہوتے ہیں۔''

''اوئے یارا ادھر تو سائیکل پر بیٹھے اور جدھر مرضی آئی نکل گئے۔ ادھر تو سنا ہے گاڑی بغیر گزارہ ہی نہیں...... کہاں سے لائے گا تو گاڑی۔''

''مجبوری ہے یار۔'' دوستوں کی تشویش کا محمود کے پاس ایک ہی جواب تھا۔ ملازمت اس کی مجبوری بن گئی تھی۔ بی کام کے بعد تین سوا تین برس تک وہ چھوٹی موٹی نوکریوں میں رلتا رہا۔ کبھی کسی دکان پر سیلز مین کی نوکری تو کبھی کسی اسٹیٹ ایجنسی میں کمیشن پر کام۔ برادری کے ایک بااثر شخص کے کئی ماہ پاؤں دباتا رہا تب کہیں جا کر گاؤں کی ایک بااثر سیاسی شخصیت تک رسائی ہوئی۔ کوئی نیک گھڑی تھی کہ اس نے سفارش کر دی، نہ کوئی درخواست نہ انٹرویو گھر بیٹھے اسے ایک وفاقی محکمے میں چودہ گریڈ اسامی پر تقرری کا پروانہ مل گیا مگر مقامِ تعیناتی اسلام آباد تھا۔ اپنا گھر چھوڑ کر اپنے لوگوں سے دور جانا کوئی آسان تو نہ تھا۔ اس پر مستزاد دوستوں کی حوصلہ شکن باتیں...... اسے اسلام آباد جانے سے باز رکھنے کو مختلف حیلے حربے آزمائے جا رہے تھے۔

''او یار بندہ کدھر بھی چلا جائے رزق تو اسے اتنا ہی ملنا ہوتا ہے جتنا مقدر میں ہوتا ہے۔''

''یہاں تیرا اپنا گھر ہے، اپنے لوگ ہیں...... گھر سے نکلے گا تو سو خرچے نکل آئیں گے...... کرائے پر گھر لے گا یا ادھر اپنے گھر والوں کو پیسے بھیجے گا...... کھانا یا تو ہوٹل سے کھانا پڑے گا یا خود پکانا ہوگا...... تو نوکری کرے گا یا کھانا پکائے گا۔''

''یارا! ادھر مہنگائی بھی بہت ہے۔ سنا ہے اچھے اچھوں کا گزارہ مشکل سے ہوتا ہے وہاں۔''

''مجبوری ہے یار...... نوکری بھی تو کرنی ہے۔''

''جھلے! جو کمائے گا ادھر ہی خرچ ہو جانا ہے...... اپنا گھر چھوڑ کر دور جانے کا فائدہ؟''

''ماموں کہتا ہے جب تک نوکری نہیں ہوگی وہ شادی بھی نہیں دے گا۔''

''نہ دے...... لڑکیوں کی کوئی کمی ہے۔''

''نہیں یار! وہ میری بچپن کی مانگ ہے۔''

ماموں کی بیٹی شائستہ سے اس کا بچپن ہی میں رشتہ طے پا گیا تھا۔ شائستہ گورنمنٹ کالج میں سیکنڈ ایئر کی طالبہ تھی اور ماموں نے اس کی شادی محمود کی پکی نوکری سے مشروط کر رکھی تھی۔ محمود کی ماں جب بھی بھائی سے محمود اور شائستہ کی شادی کی بات کرتی وہ کہتا۔ ''پہلے محمود کی پکی نوکری لگ جانے دو۔''

محمود کی سرکاری نوکری لگ جانے سے ماں بہت خوش تھی۔ محمود کو پروانۂ تقرری ملنے پر وہ مٹھائی کا ڈبا لے کر سب سے پہلے بھائی کے گھر ہی گئی تھی۔ ''اب تو محمود کی پکی نوکری ہو گئی۔ اب تو شادی دو گے نا؟'' اس نے بھائی سے دفورِ مسرت سے کہا۔

''ہاں ہاں...... مگر پہلے اسے نوکری پر چڑھنے تو دو۔'' بھائی نے جواب دیا۔

''لو اب نوکری چڑھنے میں کیا دیر...... دو چار دن میں محمود اسلام آباد چلا جائے گا...... بتا رہا تھا چودہ دن کے اندر اندر اسے اسلام آباد پہنچنا ہے۔''

''اللہ خیر کرے گا...... اس سے کہنا اسلام آباد پہنچنے میں دیر نہ کرے۔ کہیں اس کی جگہ کسی اور کو نہ کھڑا کر دیں نوکری پر۔''

''نہیں نہیں...... دیر کیوں کرنی...... دو چار دن میں چلا جائے گا۔''

اپنے پرایوں سے مبارکباد ملنا شروع ہو گئی۔ محمود کی خوش قسمتی پر لوگوں کی رال ٹپکنے لگی۔ جوان بیٹوں کے والدین نے محمود سے سفارشیں شروع کر دیں۔ ''محمود بیٹا! اسلام آباد جاؤ تو میرے بیٹے کے لیے بھی کوئی نوکری دیکھنا۔'' بعض نے تو تحریری درخواستیں بھی اسے پہنچا دیں۔ پکی سرکاری ملازمت کا پروانہ پا کر محمود وی آئی پی بن گیا تھا۔ شادی کے لیے ماموں کی شرط پوری کرنا بھی ضروری تھی۔ سو اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی اسلام آباد جانے کو رختِ سفر باندھ لیا۔

☆☆☆

اسلام آباد ان دنوں بڑے سبک سے نقش و نگار والا شہر ہوا کرتا تھا۔ راولپنڈی ریلوے اسٹیشن پر ٹرین سے اترنے کے بعد وہ اپنا سفری بیگ کندھے پر لادے لوگوں سے پوچھتا پاچھتا اسلام آباد جانے والی وین میں بیٹھ گیا۔ وین انتہائی سبک رفتاری سے سفر کرتی پنڈی سے اسلام آباد کی حدود میں داخل ہو گئی۔ طویل ہائی وے کا منظر نہایت دلفریب تھا۔ دائیں بائیں ڈھلانوں پر سبزہ اور درخت...... گرین بیلٹ پر

رنگ برنگ نورستہ گلابوں کے پرے۔ محمود کی تو طبیعت باغ باغ ہوگئی۔ اپنے گاؤں میں اس نے اتنے ڈھیر سارے اور رنگ رنگ کے گلاب کب دیکھے تھے بھلا۔

''زیرو پوائنٹ۔'' بس کنڈیکٹر نے آواز لگائی اور وین جو موڑ کاٹ چکی تھی رک گئی۔

محمود کھڑکی کے نزدیک بیٹھا نہایت اشتیاق سے باہر دیکھ رہا تھا۔ کیسا دلفریب منظر تھا۔ صاف ستھری سڑک، دو رویہ درخت، سبزہ، سڑک پر بڑے نظم وضبط سے چلتی گاڑیاں، وین میں خاموشی سے سفر کرتے باتمیز مسافر اور فضا میں بسی گہری رومانویت...... یار دوست خوامخواہ ڈرا رہے تھے۔ اسلام آباد تو بڑا صاف ستھرا، پرسکون اور انسان دوست سا شہر لگتا ہے۔ مسافر وین ٹاپوں ٹاپ سفر کرتی، کسی کو اتارتی، کسی کو چڑھاتی محمود کی منزلِ مقصود پر جا پہنچی۔ جونہی کنڈیکٹر نے صدا لگائی۔ ''سپر مارکیٹ'' محمود نے بیتابانہ کہا۔ ''روکنا یار۔''

''روکی ہوئی ہے جی۔'' کنڈیکٹر بولا۔

محمود جھینپ گیا۔ ''میرا مطلب تھا چلا نہ دینا مجھے اترنا ہے۔''

''اترو سرکار۔''

محمود وین سے اتر گیا۔ جیب میں پڑی وہ پرچی نکالی جس پر وہ پتا درج تھا جہاں اسے جانا تھا۔ گاؤں میں اس کے دوست راشد نے اسے اپنے کسی دور پار کے رشتے دار کا پتا دیا تھا جو کسی اسکول میں چوکیدار تھا اور اسکول ہی کے ایک کوارٹر میں رہتا تھا۔ راشد نے اس سے فون پر رابطہ کرکے محمود سے کہا تھا اپنی رہائش کا بندوبست ہونے تک وہ اس کے پاس ٹھہر سکتا تھا۔

سڑک کنارے کھڑے کھڑے محمود نے چہار اطراف طائرانہ نظر دوڑائی۔ وہی نظم وضبط، وہی رومانویت جو وہ اسلام آباد میں داخل ہونے کے بعد راستے بھر دیکھتا آیا تھا۔ گاؤں میں تو مسافر وین جہاں کھڑی ہوجاتی بھرنے تک ہلنے کا نام نہ لیتی۔ یہاں تو وین ٹاپوں ٹاپ اڑتی چلی آئی تھی۔

ایک راہ گیر سے اس نے مطلوبہ مقام تک پہنچنے کا راستہ سمجھا اور چل پڑا۔ راستے میں ایک دو راہ گیروں سے مزید راہنمائی لینے کے بعد وہ راشد کے دیے ہوئے پتے پر جا پہنچا۔ راشد کے رشتے دار اقبال شاہ نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور اپنے کوارٹر کی جانب لے گیا۔ ''چھٹی کے بعد یہ سارا اسکول اپنا ہوتا ہے۔'' اقبال شاہ نے بڑی فیاضی سے کہا۔ کوارٹر میں اقبال شاہ کے بال بچے مقیم تھے۔ اس نے محمود کا اسکول کے ایک کمرے میں بستر لگا دیا۔ اقبال شاہ کا بیٹا گرم چائے لے آیا اور کچھ دیر بعد کھانا بھی۔

''اسکول میں دو چوکیدار ہیں۔ ایک میں دوسرا ایک لڑکا ہے یعقوب۔ اس کی ڈیوٹی دن میں ہوتی ہے۔'' اقبال شاہ نے محمود کو بتایا۔

''میرے یہاں رہنے پر کسی کو اعتراض تو نہیں ہوگا؟'' محمود نے پوچھا۔

''دن کو تم ڈیوٹی پر چلے جاؤ گے۔ اپنا بیگ کوارٹر میں رکھ جانا...... شام کو جب تم واپس آؤ گے تو سارا اسکول ہی اپنا ہوگا...... کوئی مسئلہ نہیں آرام سے رہو۔'' اقبال شاہ نے اسے تسلی دی۔

گاؤں میں موسم نہ گرم تھا نہ سرد مگر اسلام آباد میں خاصی خنکی تھی۔ اقبال شاہ نے اسے بستر کے ساتھ ایک پرانا کمبل بھی اوڑھنے کو دیا اور پہننے کے لیے ایک پرانی جیکٹ بھی۔ محمود جیکٹ پہننے میں متردد ہوا تو اقبال شاہ بولا۔ ''پہنو یار پہنو...... نئے بندے کو اسلام آباد کی سردی جلدی لگتی ہے۔''

رات آرام سے گزری۔ اگلی صبح محمود نے دفتر جانے کے لیے کچھ اقبال شاہ سے راہنمائی لی کچھ راستے میں ایک دو اور لوگوں سے معلوم کیا اور بالآخر اس دفتر تک پہنچ گیا جہاں اسے جوائننگ دینی تھی۔

☆☆☆

اگرچہ اسکول میں اقبال شاہ کے ساتھ رہنے میں اسے کوئی پریشانی نہ تھی۔ اقبال شاہ بڑا دوست نواز سا آدمی تھا۔ ہر ایک سے اچھی دعا سلام رکھتا۔ اسکول کی پرنسپل، اساتذہ اور دیگر ملازمین سے بھی اس کے اچھے تعلقات تھے۔ محمود سے اس کی چند ہی دنوں میں اچھی گپ شپ ہوگئی تھی مگر پھر بھی محمود کو زیادہ دن اس کے پاس رہنا اچھا نہ لگا۔ دفتر سے چھٹی کے بعد وہ کسی معقول جائے رہائش کی تلاش میں نکل جاتا۔ اس تلاش میں اس نے تقریباً سارا شہر ہی دیکھ ڈالا۔

اسلام آباد ان دنوں بڑا طلسماتی سا شہر تھا۔ سبزہ اور رنگ برنگ پھولوں سے مزین۔ شہر کی حدود محدود، محلے منظم، گلیاں اور راستے مصفا، ہر سیکٹر میں ایک بازار جو مرکز کہلاتا تھا۔ شہر کی آبادی کم، گاڑیوں کا شور نہ ہونے جیسا، سرکاری تعلیمی اداروں کی عمارتیں پرشکوہ، رہائشی مکانوں سے زیادہ دفاتر۔ شہر کی انتہائی حد پر ایک نیا سیکٹر جی الیون زیر تعمیر تھا جہاں چھوٹے، درمیانہ اور بڑے مکانات تعمیر کے آخری مراحل میں تھے۔ جی الیون سے سیکریٹریٹ تک، سیکریٹریٹ سے زیرو پوائنٹ تک، زیرو پوائنٹ سے فیض آباد تک اور

فیض آباد سے فیصل مسجد تک براستہ سیدھا اور آسان تھا۔ شہر کے نواح میں چھوٹے چھوٹے دیہی علاقے شہری رنگ روپ میں ڈھل رہے تھے۔ ان علاقوں سے اصلی دودھ، دہی اور مکھن محمود کے اپنے گاؤں سے زیادہ اچھا مل جاتا اور وہ بھی تقریباً اسی بھاؤ! محمود حیران ہوتا کہ یار لوگوں نے اسلام آباد میں مہنگائی کی خبریں ویسے ہی گرم کررکھی تھیں۔

محمود کے دفتر کے چار پانچ چھڑے مرد کراچی کمپنی میں اپنے ہی دفتر کے ایک ساتھی کو الاٹ شدہ سرکاری مکان میں کرائے پر رہ رہے تھے، محمود بھی ان کے ساتھ شامل ہوگیا اور اس طرح رہائش کا مسئلہ بھی حل ہوگیا۔

نجی مکانات کا کرائے پر ملنا بھی ان دنوں مشکل نہ تھا اور کرایہ بھی مناسب، شہری نقش ونگار میں ڈھلے دیہی علاقوں میں مکانوں کے کرائے اور بھی کم تھے۔ راول ٹاؤن اور شہزاد ٹاؤن جیسے علاقوں میں بے شمار مکانات آسانی سے کرائے پر دستیاب تھے۔

شام ہوتے ہی شہر میں سناٹا چھا جاتا۔ پبلک ٹرانسپورٹ خال خال دستیاب ہوتی۔ تھوڑی بہت چہل پہل ہوتی تو ہر سیکٹر کے مرکز میں یا پھر سرکاری اسپتالوں میں۔ پولی کلینک، پمز اور سی ڈی اے اسپتالوں کی بتیاں بھی باہر سے دیکھنے والوں کو عجیب سی پراسراریت میں ڈوبی دکھائی دیتیں۔

محمود کو باقی سب تو ٹھیک لگتا مگر سرد موسم میں جلد سر پر آکھڑی ہونے والی رات اس کے دل کو ایک عجیب سی کیفیت سے دوچار کردیتی۔ گہرا سناٹا اس کے من میں اتر جاتا۔ دل درد میں ڈوب جاتا۔ کبھی اسے ماں یاد آنے لگتی کبھی ابا، کبھی بہن بھائی، کبھی یار دوست اور کبھی شائستہ! گاؤں کے باغوں میں کوکتی کوئلوں کی کوک اس کی یادوں میں گونجنے لگتی۔ وہ کروٹیں بدلے جاتا۔ نیند آنکھوں سے کوسوں دور رہتی۔ اسلام آباد آنے کے بعد اس نے کہیں دور سے سنائی دینے والی ایک پرندے کی آواز اور بھی سنی تھی جو کوئل کی کوک کی طرح دل کو انجانے درد سے دوچار کردیتی تھی۔ اس کے پوچھنے پر اس کے ایک روم میٹ نے بتایا تھا کہ وہ فاختہ کی آواز تھی جو یوسفؑ کے کھوہ میں ہونے کا پتا دیتی تھی۔ ''یوسفؑ کھوہ...... یوسفؑ کھوہ'' محمود کو اس کے اس انکشاف سے بڑی حیرت ہوئی تھی۔ کان لگا کر سنا تو اسے اپنے روم میٹ کی بات میں صداقت محسوس ہوئی۔ صبح جب وہ دفتر جانے کو تیار ہورہا ہوتا دور سے آنے والی ''یوسفؑ کھوہ'' کی پکار اسے ماورائی سی محسوس ہوتی۔ عجیب بات تھی گاؤں کی کوئلوں کی کوک کی یاد اور یہاں اسلام آباد میں یوسفؑ کھوہ کی پکار سن کر اسے ماں، ابا، بہن بھائی، یار دوست نہیں صرف شائستہ کا خیال آتا۔

☆☆☆

گاؤں میں ماں اس کی شادی کا سامان کرنے لگی تھی۔ گاؤں سے کوئی اسلام آباد آتا جاتا تو ماں اسے سندیسہ بھجوا دیتی۔ ''پنڈی بازار سے دو چار سوٹ خرید کر بھجوا دینا۔'' وہ ماں کو رنگ برنگی امریکن جارجٹ، مخمل اور چائنا سلک بھجواتا رہا۔ ماں، شائستہ کے لیے سوٹوں پر کڑھائیاں کروا کروا کے رکھ رہی تھی۔ ان دنوں گاؤں میں عورتیں کڑھائی کا کام بھی تو کتنا سستا کردیا کرتی تھیں۔ پچاس، ساٹھ روپے میں قمیص، موتیوں اور گوٹے ٹھپے کا کام۔ محمود چھٹی پر گھر گیا تو ماں نے سارے کامدار جوڑے اسے ایک ایک کرکے دکھائے، کالے رنگ کی امریکن جارجٹ کے قمیص دوپٹے پر متیشی جال دیکھ کر اس نے سوچا تھا۔ ''شائستہ یہ سوٹ پہن کر کتنی اچھی لگے گی۔''

شائستہ کو اللہ جانے کہاں سے اتنا حسن مل گیا تھا۔ اس کے ماں باپ تو دونوں ہی گہری سانولی رنگت کے تھے۔ محمود کی ماں بڑے فخر سے کہا کرتی تھی۔ ''شائستہ اپنی دادی پر گئی ہے۔'' شائستہ کی دادی جو محمود کی نانی ہوتی تھی گلگت کی تھی۔ محمود کا نانا جو فوج میں سپاہی تھا گاؤں میں شادی کرنے کے بجائے گلگت کی گوری چٹی لڑکی بیاہ کر لایا تھا۔ گاؤں میں دھوم مچ گئی تھی۔ محمود کے نانا کے تین بچے ہوئے دو بیٹیاں، ایک بیٹا۔ تینوں اپنے باپ پر تھے۔ اگلی نسل میں شائستہ اپنی دادی پر گئی تھی۔ گوری چٹی، آنکھیں نیلی اور بال بھورے۔ محمود کی ماں نے بھتیجی کے بچپن ہی میں اسے اپنے بیٹے کے لیے مانگ لیا تھا۔ محمود کی نوکری اسلام آباد میں لگنے سے شائستہ اور اس کے گھر والے بھی خوش تھے۔ شائستہ کی ماں گھر آنے جانے والوں کو یہ بتاتے نہ تھکتی کہ شائستہ کو شادی کے بعد اسلام آباد چلے جانا ہے جہاں اس کا ہونے والا داماد سرکاری ملازمت کرتا ہے۔

''محمود نے سرکار کو مکان کے لیے درخواست دے دی ہے۔ انشاءاللہ اسے جلدی سرکاری بنگلا مل جائے گا۔'' شائستہ کی ماں لوگوں کو بتاتی۔

یہ تو بے چارہ محمود ہی جانتا تھا کہ اسلام آباد میں سب سے مشکل کام کسی سرکاری ملازم کو سرکاری مکان کی الاٹمنٹ ملنا تھی۔ نئے سرکاری مکانوں کی تعمیر نہ ہونے کے برابر تھی اور جو برسہا برس قبل تعمیر شدہ سرکاری مکانوں میں بیٹھے تھے وہ نکلنے کا نام نہ لیتے تھے۔ سرکاری ملازم کی ریٹائرمنٹ کے

بعد مکان اگلی نسل میں کسی سرکاری ملازم کے بیٹے یا بیٹی کے نام ہوجاتا اور برسوں کی چھٹی ہوجاتی۔ اسی لیے سرکاری مکانوں میں رہائش پذیر سرکاری ملازمین کی پوری کوشش ہوتی کہ ان کی ریٹائرمنٹ سے قبل کوئی بیٹا یا بیٹی سرکاری ملازمت میں آجائے تاکہ مکان کی الاٹمنٹ اس کے نام کروائی جاسکے۔ سرکاری مکان نسل در نسل اپنے قبضے میں رکھنے کی خاطر اکثر سرکاری ملازمین اپنے اچھے بھلے باصلاحیت بچوں کا مستقبل بھی داؤ پر لگانے سے گریز نہ کرتے۔ کسی کی تعلیم چھڑوا کر اور کسی کی صلاحیتوں کو نظرانداز کر کے کسی بھی سرکاری محکمے میں اسے چھوٹے موٹے گریڈ پر بھرتی کروا دیا جاتا اور سفارش کروا کے وزارت ہاؤسنگ سے دو درجہ اوپر مکان کی الاٹمنٹ کروالی جاتی۔ پھر ریٹائر ہونے والا ملازم سرکاری مکان کی دہلیز پر بیٹھ کر چین کی بانسری بجاتا اور اس مکان کی خاطر اپنے تابناک مستقبل کو قربان کرنے والی اولاد اگلی فصل کی کاشت میں لگ جاتی۔

اسلام آباد جتنا طلسماتی شہر تھا اس سے کہیں زیادہ سرکاری مکانات جادواثر تھے۔ اکثر سرکاری ملازمین نے ان مکانات میں اضافی کمرے تعمیر کر کے یا تو اپنے لیے ان مکانوں کی مکانیت میں اضافہ کرلیا تھا یا پھر ان اضافی کمروں کو کرائے پر اٹھا دیا تھا۔ گزیٹڈ سرکاری ملازمین کو الاٹ مکانات میں سرونٹ کوارٹرز بھی تھے جو اپنی جگہ ایک مکمل رہائشی یونٹ تھے۔ بیشتر سرکاری ملازمین نے اپنے سرونٹ کوارٹرز کرائے پر اٹھا رکھے تھے۔ کرائے داروں سے ملنے والا کرایہ بسا اوقات سرکاری ملازم کی تنخواہ میں سے منہا ہونے والے کرایہ مکان اور مزید پانچ فیصد کی مجموعی رقم سے بھی زیادہ ہوتا۔ یوں مکان بالکل مفت پڑتا۔ سرکاری مکانوں میں پانی، بجلی، گیس کی کوئی پریشانی نہ ہوتی۔ سو اچھے بھلے لوگ بھی مکان کرائے پر لینے کے بجائے سرکاری مکانوں کے سرونٹ کوارٹرز کرائے پر لینے کو ترجیح دیتے۔ اس ترجیح کی ایک دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ سرکاری مکانات زیادہ تر شہر کے ان سیکٹرز میں تھے جہاں آس پاس روزمرہ ضرورت کی سہولتیں مثلاً شاپنگ سینٹرز اور شفاخانے دستیاب تھے، کرائے دار دور افتادہ پرائیویٹ مکانات میں رہنے کے بجائے ان سرونٹ کوارٹرز میں رہنا پسند کرتے۔ بعض سرکاری مکانوں میں سرونٹ کوارٹرز کے علاوہ بھی اضافی کمرے تعمیر کر کے انہیں کرائے پر چڑھا دیا گیا تھا۔ حاصل شدہ کرایہ سرکاری ملازمین کے مالی وسائل میں خاطر خواہ اضافہ کرتا۔ سرکاری مکانوں میں اضافہ شدہ کمروں سے حاصل ہونے والے کرائے سے دوراندیش قسم کے الاٹیوں نے جائیدادیں بنالی تھیں۔ لشکارے مارتی گاڑیاں رکھی ہوئی تھیں۔ محمود نے بھی سرکاری مکان کی الاٹمنٹ کے لیے درخواست تو جمع کروادی تھی مگر الاٹمنٹ دلی دور است والا معاملہ لگتا تھا۔ وہ اکثر سوچتا حکومت اگر چھوٹے گریڈ والے لوگوں کو سرونٹ کوارٹر الاٹ کرنا شروع کردے تو کتنا اچھا ہو۔

☆☆☆

محمود نے اسلام آباد میں تقریباً ڈھائی سال تنہا زندگی گزاری۔ آمدورفت میں آسانی کے لیے اس نے ماہانہ اقساط پر ایک موٹر سائیکل خرید لی تھی۔ اسلام آباد اسے بہت اچھا، بہت اپنا سا لگنے لگا تھا۔ صبح وہ اپنے ایک روم میٹ کو موٹر سائیکل پر اپنے ساتھ بٹھا کر دفتر جانے کو گھر سے نکلتا اور سیدھی سیدھی سڑکوں، صاف ستھرے راستوں سے ہوتا دفتر پہنچ جاتا۔ شہر کی سڑکوں میں ان دنوں زیادہ پیچ وخم نہیں تھے۔ سہ پہر کو دفتر سے چھٹی کے بعد وہ اور اس کا ساتھی اکٹھے انہی راستوں سے گزرتے گھر لوٹ آتے۔ کھانا بھی سب مل کر اکٹھے پکا لیتے، کبھی بازار سے لے آتے۔ مرکز میں تنور بھی تھے اور چھوٹے چھوٹے ہوٹل اور چائے خانے بھی۔ افغانی نان اور کابلی پلاؤ سے محمود اسلام آباد آکر ہی آشنا ہوا۔ اس کے اپنے گاؤں میں تو گھر گھر تنور لگے تھے۔ صبح وشام فضا ان تنوروں میں لگائی جانے والی روٹیوں کی خوشبو سے اشتہا انگیز ہوجایا کرتی تھی۔ اسلام آباد کے افغانی نان بڑے بڑے سرخی مائل، کبھی کرارے اور کبھی نرم بھی ہوتے۔ ایک نان شکم سیر کردیتا۔ محمود کو افغانی نان چائے کی چسکیوں کے ساتھ کھانے میں بڑا مزہ آتا۔ مہینے کی ابتدائی تاریخوں میں جب محمود اور اس کے ساتھیوں کی جیبیں بھاری ہوتیں، پشاور موڑ جاکر کسی افغانی ہوٹل میں چپلی کباب اور افغانی نان کھانے کی عیاشی بھی ہوجاتی۔ ایک کباب اور ایک نان محمود کو تو بہت ہوتا۔ نان اور چپلی کباب کے بعد سوڈا واٹر پینا تو نہایت لازم ہوتا۔ موسم سرد ہوتا تو مہینے کے شروع کے دنوں میں دو تین بار گرما گرم سوپ پینے کی عیاشی بھی ہوجاتی۔ سوپ پینے کے بعد گھر واپس لوٹتے ہوئے مونگ پھلی خرید کر آپس میں بانٹ لی جاتی۔ جیکٹ کی جیب میں بار بار ہاتھ ڈال کر مونگ پھلی نکالنے اور چھیل کر کھاتے ہوئے باتیں کرتے چلے جانے کی گرمی ہی اور ہوتی۔

موسم کے اعتبار سے اسلام آباد محمود کے اپنے گاؤں سے بہت مختلف تھا۔ یہاں گرمی بھی خوب ہوتی اور سردی تو بندے کا نام پوچھ لیتی۔ بارش بہت ہوتی اور کبھی کبھی تو

لگاتار کئی کئی دن...... محمود کے اسلام آباد آنے کے بعد جب پہلی مرتبہ بارش ہوئی تو وہ دفتر نہیں گیا تھا۔ بارش بھی سردیوں کی تھی جس نے کپکپی چھڑا رکھی تھی۔ رات بھر برستی رہنے والی بارش سے بڑھ جانے والی سردی نے صبح محمود کو بستر سے نکلنے کی ہمت ہی نہ دی۔ اگلے روز وہ دفتر گیا تو اس کے ایک ساتھی نے پوچھا۔ ”خیریت تھی محمود صاحب...... کل آپ آفس نہیں آئے۔“

”یار بارش تھی۔“ اس نے جواب دیا۔

ساتھی بے ساختہ مسکرایا اور بولا۔ ”یہ کیا بات ہوئی۔“

”ہمارے گاؤں میں بارش والے دن سب چھٹی کر کے بیٹھ جاتے تھے۔“ محمود نے نہایت سادگی سے بتایا۔

ساتھی ہنس دیا۔ ”محمود صاحب! یہاں تو سال میں پانچ چھ مہینے بارش کے دن ہوتے ہیں۔ کتنی چھٹیاں کریں گے آپ؟“

محمود نے بازار سے ایک چھتری اور پشاور موڑ کے اتوار بازار میں لنڈا اسیکشن سے ایک پرانی برساتی خرید لی تھی۔ اب وہ بارش میں برساتی اوڑھ کر بارش والے دن بھی دفتر جانے کا عادی ہو گیا تھا۔

اسلام آباد نے محمود کو اور بھی بہت سے قرینے سکھا دیے تھے۔ موسم گرما میں صبح و شام لمبی واک، سرما میں لنڈا سے خریدے سوئٹرز، جیکٹ اور کوٹ سے اپنی پرسنالٹی شاندار بنا کر دفتر جانا، بارش کی کیچ بیچ سے بچنے کے لیے گھر سے لنڈا سے خریدے لانگ بوٹس پہن کر دفتر جانا اور دفتر پہنچ کر جوتے تبدیل کر لینا۔ محمود اپنے لباس کے بارے میں بھی نہایت محتاط ہو گیا تھا۔

عید، بقر عید پر اسلام آباد تہوار سے کئی دن پہلے ہی خالی ہونے لگتا۔ دوسرے علاقوں سے بہ سلسلۂ ملازمت و کاروبار، اسلام آباد آئے لوگ عید، بقر عید منانے کے لیے اپنے اپنے علاقوں کو جانے لگتے۔ اکیلے مرد، اکیلی عورتیں اور پورے پورے کنبے بھی۔ اپنا اپنا رختِ سفر اٹھائے اسلام آباد سے جانے لگتے۔ ویگنوں میں جگہ نہ ملتی۔ لاری اڈوں پر مسافروں کا اژدحام دکھائی دیتا۔ ہر کس و ناکس جلدی میں نظر آتا۔ محمود بھی عید، بقر عید پر سرکاری چھٹیوں کے ساتھ تین چار دن مزید چھٹی لے کر گاؤں چلا جاتا۔ کبھی کسی خوشی غمی پر بھی گاؤں جانا پڑ جاتا۔ باوجود یہ کہ اسلام آباد اسے راس آ گیا تھا، اپنے گاؤں جانے کی خوشی ہی اور ہوتی۔

☆☆☆

شائستہ سے اپنی شادی ہونے سے پہلے ہی محمود نے سیکٹر ایف سکس میں ای کیٹیگری کے ایک سرکاری مکان کا سرونٹ پورشن کرائے پر لے لیا۔ اسے سرکاری مکان الاٹ ہونے کی فی الحال کوئی امید نہ تھی اور اسلام آباد میں پرائیویٹ مکان کا کوئی ایک پورشن بھی کرائے پر لینا اس کی تہائی تنخواہ تو لے ہی جاتا سو اس نے سرکاری مکان کا سرونٹ پورشن ہی کرائے پر لینا بہتر سمجھا۔ رہنے کو تو شائستہ شادی کے بعد گاؤں میں اس کے والدین کے ساتھ بھی رہ سکتی تھی وہ مہینا دو مہینا بعد گاؤں کا چکر لگا لیا کرتا مگر ماں اس حق میں نہ تھی۔ اس کا خیال تھا شادی کے بعد بیوی کو اپنے شوہر کے ساتھ ہی رہنا چاہیے۔ دکھ سکھ، بیماری آزاری سو مسائل ہوتے ہیں جو میاں بیوی ایک ساتھ رہ کر ہی بٹا سکتے ہیں۔ خواہش تو محمود کی اپنی بھی یہی تھی کہ شادی کے بعد شائستہ اس کے ساتھ ہی رہے۔

ایف سکس میں سرونٹ کوارٹر کرائے پر لینے کی متعدد وجوہات تھیں۔ یہ سیکٹر محمود کے دفتر کے نزدیک تھا۔ تین چار منٹ کی پیدل مسافت پر پبلک ٹرانسپورٹ صبح سے رات تک دستیاب ہوتی۔ آس پاس چھوٹی بڑی کئی مارکیٹیں تھیں جہاں روزمرہ ضرورت کا ہر سامان مل جاتا۔ ٹہلتے ٹہلتے مین روڈ تک جا نکلنے پر سپر مارکیٹ بھی جو ایک بارونق مرکز خرید و فروخت ہونے کے ساتھ اچھا بھلا تفریحی مقام بھی تھی جہاں محمود اور شائستہ جیسے محدود وسائل والے سفید پوش جوڑے بھی دس روپے کے فرنچ فرائیز یا پانچ روپے کے مکئی کے دانے لے کر سپر مارکیٹ میں ونڈو شاپنگ کرتے ہوئے اپنی جتنی شامیں چاہے رنگین بنا سکتے تھے۔ مہینے کی ابتدائی تاریخوں میں برگر اور کولڈ ڈرنک کی عیاشی بھی ممکن تھی اور گھر واپس لوٹتے ہوئے سپر مارکیٹ میں واقع مشہور و معروف بیکری سے ملکی بریڈ، فرنچ بریڈ، انڈے اور مکھن بھی خرید کر گردن اکڑائی جا سکتی تھی اور مہینے کی ابتدائی تاریخوں ہی میں بشرط ”رعایتی سیل“ شائستہ کے لیے کوئی جوتی، کوئی شال، کوئی سوٹ بھی خریدنے کی ہمت کی جا سکتی تھی...... ہاں موسم سرما میں چکن کارن سوپ پینے اور ریڑھی والوں سے مونگ پھلی اور میوے والا گڑ خریدنے کی سہولت بھی دستیاب رہتی۔ گھر سے نکل کر چہل قدمی کرتے کرتے پریڈ گراؤنڈ، سیکرٹریٹ اور حکمرانوں کی قیام گاہوں کا بھی دور ہی سے نظارہ کیا جا سکتا تھا۔ برس کے برس پریڈ گراؤنڈ میں یوم پاکستان کے لیے فوجی پریڈ کی ریہرسل اور آہنی جنگلے کے پیچھے سے فائنل پریڈ بھی دیکھی جا سکتی تھی۔

محمود نے جو سرونٹ کوارٹر کرائے پر لیا وہ ایک سرکاری

افسر کے سرکاری مکان کا حصہ تھا مگر اصل مکان سے بالکل الگ تھلگ۔ سرونٹ کوارٹر میں ایک رہائشی کمرا تھا، اس سے متصل چھوٹا سا کچن، آگے چھوٹا سا صحن، کمرے کی بیرونی جانب کھلنے والا دروازہ ایک چھوٹی سی راہداری سے کمرے کے عین مقابل بنے باتھ روم اور سرونٹ کے بیرونی دروازے کی طرف راہ دیتا تھا۔

اس سیکٹر میں رہنے کا سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ محمود پیدل بھی اپنے دفتر آ، جا سکتا تھا۔ موٹر سائیکل پر تو ہر ایرا غیرا لفٹ لینے کے چکر میں رہتا۔ اس کا روم میٹ بھی جو مستقل اس کے ساتھ آیا جایا کرتا تھا جب تک اس کا تبادلہ لاہور نہ ہو گیا مفتیا ہی بنا رہا تھا۔ جب سے وہ تبادلہ ہو کر لاہور گیا تھا دوسرے تاک میں رہنے لگے تھے۔

”یار ذرا جی ایٹ تک اتار دینا۔“

”مجھو جانا ہے...... تم ادھر ہی سے تو گزرتے ہو...... مجھے بھی ڈراپ کر دینا۔“

”محمود صاحب آپ پارہ سے تو گزریں گے نا؟“

”مقدر صاحب میں تو چائنا چوک سے سیدھا نکل لیتا ہوں۔“

”ارے صاحب آج ہماری خاطر آبپارہ سے ہوتے چلے جایئے گا۔“

”بیٹھیے۔“ وہ نیم دلی سے کہتا۔

اور تو اور چھٹی والے دن کے لیے پہلے ہی بکنگ ہو جاتی۔ ”یار محمود صاحب کل سنڈے مارکیٹ جانا ہے۔ چلئے تو جاؤ واپسی پر ٹیکسی والوں کے نخرے دیکھنا پڑتے ہیں۔ میں آپ کی طرف آ جاؤں گا۔ دونوں بھائی مل کر چلے چلیں گے۔ دوپہر کا کھانا آپ ہمارے ساتھ ہی کھایئے گا...... آپ کی بھابی ساگ زبردست بناتی ہیں۔“

ساگ کھانے کا اسے ایسا کوئی خاص شوق نہیں تھا۔ گاؤں میں برسوں تک ہر طرح کا ساگ کھا کر رجا ہوا تھا وہ مگر ساگ کا لالچ دینے والے کو سنڈے بازار تو بہرحال لے جانا پڑتا۔

ان مفتیا سواریوں سے نجات کی بس ایک ہی تدبیر سوچ رکھی تھی اس نے۔ شادی کے بعد جب شائستہ اس کے ساتھ اسلام آباد آ جائے گی تو وہ موٹر سائیکل پر دفتر آنے جانے کے بجائے پیدل آیا جایا کرے گا۔ موٹر سائیکل کی پچھلی سیٹ صرف اور صرف شائستہ کے لیے مختص ہو گی۔ وہ شائستہ کو اسلام آباد کے چپے چپے کی سیر کرائے گا۔ شکر پڑیاں، دامن کوہ، پیر سوہاوہ، چڑیا گھر، راول ڈیم، شاہدرہ، گرمیوں میں وہ اسی موٹر سائیکل پر شائستہ کو چھتر پارک، سالگراں اور مری گھمانے لے جائے گا۔

ایف سکس میں سرونٹ پورشن کرائے پر لینے کا ایک اور بڑا فائدہ پولی کلینک کا نزدیک ہونا تھا۔ شائستہ کے آنے کے بعد اماں، ابا میں سے کوئی رہنے کو آ گیا اس کے پاس اور خدانخواستہ انہیں ڈاکٹر کو دکھانے کی ضرورت پڑی تو دور نہیں جانا پڑے گا۔ سیدھی سڑک، پھر مڑے اور دو سڑکیں پار کر کے سامنے ہی پولی کلینک۔ اماں، ابا کو ضرورت نہ بھی پڑی ڈاکٹر کے پاس لے جانے کی تو شائستہ کو تو سہولت رہے گی نا۔

ایف سکس تھا رہائش کے لیے نہایت آئیڈیل سیکٹر۔ ایک طرف حکمرانوں کے ایوان، قوم کے مقدر نویسوں کے بنگلے اور غیر ملکی سفارت کاروں کے دفاتر، دوسری طرف طبقۂ اشرافیہ کی پسندیدہ سپر مارکیٹ، پیدل مسافت پر سرکاری اسپتال اور اس سے وابستہ معالجین کی نجی علاج گاہیں۔ شہید ملت سیکریٹریٹ کے اس پار بلیو ایریا کا تجارتی مرکز جہاں امپورٹڈ اشیا کا بازار گرم رہتا۔ تین چار منٹ کی ڈرائیو پر میلوڈی مارکیٹ اور اس سے دو اسٹاپ پرے آب پارہ!

واہ! کیا غنائیت تھی ”آب پارہ“ نام میں...... آب پارہ!...... اسلام آباد کے پرانے علاقوں کے ناموں میں ایسی ہی غنائیت تھی...... آب پارہ...... رمنا...... شالیمار...... مرگلہ...... غنائیت تو اس پورے شہر کا خاصہ تھی...... طلسم ہوشربا! نشہ تھا جو سر چڑھ کے بولتا اور اسلام آباد آنے والے کو یوں اپنے سحر میں جکڑ لیتا کہ آنے والا واپس جانے کا نام نہ لیتا۔ محمود چھٹی پر گھر جاتا تو اسے جلد ہی اسلام آباد کی یاد ستانے لگتی۔

☆☆☆

شادی کے بعد شائستہ اس کے ساتھ اسلام آباد آئی تو وہ بھی اس طلسم ہوشربا کی اسیر ہو گئی۔ اپنے حسن کی ضوپاشی اور ماں سے سیکھے سگھڑاپے سے اس نے چھوٹے سے سرونٹ کوارٹر کو جنت بنا دیا۔ ہر اتوار کو محمود کے ساتھ سنڈے بازار جا کر وہ گھر کے ہفتہ وار سودا سلف کے ساتھ گھر کی آرائش کے لیے بھی کچھ نہ کچھ ضرور خرید لاتی۔ کبھی کھڑکیوں، دروازوں پر لٹکانے کے لیے لنڈا سے پردے، کبھی فرش پر بچھانے کے لیے غالیچہ، کبھی خوشنما فلور کشن، کبھی مصنوعی گلدستے، کبھی کوئی دیوار گیر آرائش، کبھی دہلیز پر ڈالنے کو نمدہ، کبھی چھوٹے سے صحن کی آرائش کے لیے موسمی پھولوں کے گملے، کبھی مہمانوں کے لیے چائے کے خوب صورت مگ تو کبھی میلامائن کی پلیٹیں اور سالن کے ڈونگے۔ ماں باپ نے شائستہ کو جہیز میں روزمرہ گھریلو استعمال کا جو سامان دیا

تھا۔ وہ محمود کے گاؤں والے گھر میں اسی طرح بند ھا رکھا تھا۔ محمود نے ماں سے کہا تھا جب اسے اپنا مکان الاٹ ہو جائے گا تب لے جائے گا۔ اسلام آباد آنے کے بعد شائستہ تھوڑی تھوڑی کر کے جو روزمرہ گرہستی جوڑ رہی تھی۔ اس کا مزہ بھی اور تھا۔ وہ دونوں مل کر اپنی ایک نئی نویلی دنیا آباد کر رہے تھے۔ چھٹی والے دن گھر کے کاموں سے نمٹ کر جب محمود، شائستہ کو اپنی موٹر سائیکل پر بٹھا کر اسے سیر کرانے کو باہر لے جاتا تو اسے یوں لگتا جیسے شائستہ کی صورت ہفت اقلیم کی دولت اس کے ساتھ ہے۔ اس دولت کے نشے میں ڈوبا وہ اسلام آباد کے سہانے رستوں پر دیوانہ وار گھومتا پھرتا......

شائستہ کے آجانے سے اس کی زندگی کتنی با معنی ہو گئی تھی۔ شائستہ کے ہوتے اسے کسی اور کی یا ضرورت ہی محسوس نہ ہوتی تھی۔ شائستہ سے شادی کے بعد پہلی عید آئی تو وہ اسے لے کر اپنوں کے ساتھ عید منانے گاؤں گیا لیکن بقر عید پر اس نے شائستہ کی طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے اسلام آباد ہی میں رہنا پسند کیا۔ تیسرے دن نکڑ پر بیٹھے موچی کو جوتے گانٹھتے دیکھ کر وہ اپنے ایک پرانے جوتے کی مرمت کروانے اس کے پاس لے گیا تو موچی جو روزانہ اس راستے سے اس کے آنے جانے کے باعث اسے پہچانتا تھا۔ بولا۔

"بابو صاب! سارا اسلام آباد عید منانے اپنے گھر کو گیا ہے آپ ادھر کیا کرتا ہے؟"

"تم ادھر کیا کرتا ہے؟" محمود نے الٹا سوال داغ دیا۔

موچی اس کے جوتے کی جوڑی کے مرمت طلب حصوں کا معائنہ کرتے کرتے چونکا اور اسے دیکھنے لگا پھر بولا۔ "ہم تو ادھر مزدوری کرتا ہے۔"

"ہم بھی مزدوری کرتا ہے خان بھائی۔" محمود نے خوش دلی سے کہا۔

"یار! تم مزدوری کدھر کرتا ہے...... تم تو روز لش پش ہو کر ادھر سے دفتر جاتا ہے۔"

"ہمارا گھر والی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھا اس لیے ہم گھر نہیں گیا۔" محمود نے موچی کو گاؤں نہ جانے کا سبب بتانے میں عار نہ سمجھا۔

"اچھا اچھا! پھر تو آپ کو ادھر ہی رہنا چاہیے۔ پولی کلینک نزدیک ہے نا۔"

"ہاں ادھر بہت آسانی ہے۔"

شائستہ امید سے تھی۔ محمود نے اس کا نام پولی کلینک ہی میں لکھوا دیا تھا۔ زچہ بچہ وارڈ میں اس کے ایک سینئر افسر کی اہلیہ ماہر امراض زچہ و بچہ تھیں۔ ان کی وجہ سے شائستہ کو جب وہ معائنے کے لیے اسپتال جاتی خصوصی توجہ مل رہی تھی۔

☆☆☆

بچے کی پیدائش سے دو ماہ پہلے محمود کی والدہ اس کی چھوٹی غیر شادی شدہ بہن تسنیم کے ساتھ اسلام آباد آگئیں۔ تسنیم نے آتے ہی گھر داری سنبھال لی۔ موسم اچھا تھا۔ سردی ہوتی تو ماں برداشت نہ کر پاتی۔ محمود نے صحن میں جستی چادروں کی چھت ڈلوالی تھی۔ رات کو وہ اپنا پلنگ صحن ہی میں بچھا لیتا۔ ماں بھی آٹھ نو بجے تک صحن ہی میں بیٹھی رہتی۔ رات کو تینوں عورتیں کمرے میں سو رہتیں۔ ماں اور بہن کے آنے سے محمود کو یہ تسلی ہو گئی تھی کہ اس کی عدم موجودگی میں شائستہ کو اسپتال لے جانے کی ضرورت پڑی تو وہ دونوں سنبھال لیں گی۔

محمود کے ہونے والے بچے کے لیے ماں کچھ ضروری چیزیں گاؤں سے لے کر آئی تھی۔ باقی تیاری اس نے صحن میں ٹین کی چھت کے نیچے بیٹھ کر کی۔ صبح کو ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد وہ اپنا بکسوا اور تنے پرانے کپڑے نکال کر بیٹھ جاتی اور آنے والے ننھے مہمان کے لیے پوتڑے، نہالچے، گدیلے، جھبلے، ٹوپے اور صدریاں سیے جاتی۔ زچگی کے بعد شائستہ کے سر پر باندھنے کے لیے اس نے سرخ اور سبز رنگ کا ماتھا بندھی کر اس پر سنہری ستاروں کی بیل ٹانکی تھی۔ بچے کو چٹانے کے لیے وہ گاؤں سے اصلی شہد اور گھٹی بھی لے کر آئی تھی اور شائستہ کے لیے گوند اور اچھوانی بنانے کو خشک میوہ جات اور دیسی گھی بھی۔

"ماں جی کیا ضرورت تھی یہ سب کچھ لانے کی...... یہاں سب کچھ مل جاتا ہے۔" محمود نے ماں سے کہا تھا۔

"میرا بچہ نہ ایسا شہد ملتا ہو گا یہاں نہ ایسا سچا گھی۔" ماں نے کہا پھر اسے جتایا۔ "گھی کے لیے میں نے تیری خالہ حمیدہ کو کب سے کہلوا رکھا تھا۔ اس نے اپنی ہمسائی سے لے کر دیا ہے...... بالکل خالص گھی ہے...... سونے کی طرح۔"

محمود مسکرا دیا۔ "ماں جی! ملاوٹ تو سونے میں بھی کی جاتی ہے۔"

"مجھے پتا ہے...... لیکن پہچاننے والے پہچان لیتے ہیں کہ سونا اصلی ہے یا اس میں کھوٹ ہے۔"

"کسوٹی پر رگڑ کر نا پھپھو۔" شائستہ نے ساس کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"میری نوں! کسوٹی نہ بھی ہو تو پہچان رکھنے والے ہاتھ اپنے ہاتھ میں سونا لے کر پہچان لیتے ہیں کہ خالص ہے یا کھوٹ ہے۔"

''ماں جی! کوئی نام شام بھی سوچا؟'' محمود نے شائستہ کو کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے ماں سے پوچھا۔

''ہاں ہاں...... '' ماں گرم جوشی سے بولی۔ ''پوتا ہوا تو علی محمود اور پوتی ہوئی تو منا ہل...... سب کے صلاح مشورے سے لے کر آئی ہوں یہ نام...... بیٹا ہو یا بیٹی...... اللہ خیر سے میری شائستہ بیٹی کے ہاتھ پاؤں چھڑائے...... بڑا نازک مرحلہ ہوتا ہے...... جیتی جان سے ایک نئی جان پیدا ہوتی ہے۔ عورت مر کے جیتی ہے۔''

''ماں جی! تمہاری بہو تو پہلے ہی بہت گھبرائی ہوئی ہے اسے اور نہ ڈراؤ۔'' محمود بولا۔

''ایک بات کر رہی ہوں بیٹا...... اللہ کرے گا خیر ہوگی۔'' یہ کہتے ہوئے ماں نے شائستہ کو اپنے گلے سے لگالیا۔

☆☆☆

نارمل ڈلیوری ہوئی۔ شائستہ بیٹے کی ماں بن گئی۔ پہلی اولاد اور وہ بھی بیٹا! محمود، شائستہ، محمود کی ماں اور بہن ہر ایک کی خوشی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ محمود کی ماں مٹھائی کا ڈبا لیے وارڈ بھر میں ایک ایک کا منہ میٹھا کراتی پھری۔ دو ہی بیٹے تھے اس کے۔ بڑا اللہ لوگ۔ دین دنیا سے بے خبر۔ دوسرا محمود...... اللہ نے کرم کیا جو اسے بیٹا دیا۔ محمود نے بیٹے کی پیدائش کی خوشی میں اپنے دفتر کے ساتھیوں کو ٹریٹ دی۔ پلاؤ کباب، رس ملائی اور ٹھنڈی ٹھار بوتلیں۔

''محمود صاحب آپ کو تو یہ دعا دینے کو جی چاہتا ہے کہ خدا آپ کو ہر سال ایک بیٹا دے۔'' دفتر کے ایک ساتھی ٹریٹ کے دوران بولے۔

''شکر ہے آپ نے ہر روز نہیں کہا۔'' دوسرے نے پھبتی کسی۔ حاضرین نے زوردار قہقہہ لگایا۔

بچے کا نام وہی رکھا گیا جو ماں گاؤں سے سوچ کر بلکہ دیگر اہلِ خانہ سے بھی اس کی منظوری حاصل کر کے چلی تھی...... علی محمود!

علی محمود کی پیدائش نے محمود اور شائستہ کے رشتے کو مزید تقویت اور جلا دی۔ محمود کی ماں اور بہن بچے کی پیدائش کے بعد تقریباً ڈھائی ماں اور اسلام آباد میں رہیں۔ ان کے ہونے سے شائستہ کو نہ گھر کے کام کاج کی فکر رہی نہ بچے کی دیکھ بھال میں کوئی پریشانی۔ ان کے جانے کے بعد اسے معلوم ہوا کہ ساس نندیں بھی کیا نعمت ہوتی ہیں۔ جب تک محمود کی والدہ رہیں اسے پتا ہی نہ چلا کب بچے کے گندے کپڑے دھل گئے، کب پوتڑے، نہالچے اور گدیلے تہ کر کے اس کے سرہانے رکھ دیے گئے۔ بچے کو نظر لگے تو نظر کیسے اتاری جائے، پیٹ میں درد ہو تو کیا علامت ہوتی ہے اور اس کا کیا علاج کیا جائے۔ بچے کی رنگت زرد ہونے لگے تو یرقان کی اس علامت کو بڑھنے سے کیسے روکا جائے...... یہ سب کچھ اس نے محمود کی والدہ سے سیکھا...... انہوں نے ہی اسے بتایا تھا کہ نوزائدہ بچوں کو فرشتے اپنی دیکھ بھال میں رکھتے ہیں۔ جب کوئی فرشتہ ننھے بچے سے کہتا ہے تیری ماں مر گئی تو وہ منہ بسورنے لگتا ہے اور جب وہ کہتا ہے تیری ماں جی گئی تو وہ مسکرانے لگتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب...... یہ سینہ گزٹ تھا جو نسل در نسل سادہ لوح اور ان پڑھ عورتوں سے ایک دوسرے کو منتقل ہوتا چلا آرہا تھا۔

ساس اور نند کے جانے کے بعد شائستہ کا ایک پاؤں کمرے سے باہر کچن یا صحن میں ہوتا اور دوسرا علی کی دیکھ بھال کے لیے کمرے میں۔ چھوٹا تھا مگر کتنے بہت سے کام کرنے پڑتے تھے اس کے...... محمود دفتر سے آجاتا تو شائستہ کو کچھ آسانی ہوجاتی۔ وہ علی کی دیکھ بھال بڑے ذوق وشوق سے کرتا۔

☆☆☆

بیسویں صدی کے آخری عشرے کے آخری برسوں میں اسلام آباد جو آبادی' سڑکوں پر گاڑیوں کی تعداد اور ٹریفک کے شور کے اعتبار سے نہایت پرسکون سا شہر ہوا کرتا تھا' دیکھتے ہی دیکھتے ایک گنجان آباد اور پُرشور شہر بن گیا۔ آس پاس کے علاقوں اور بالخصوص کراچی سے بڑے پیمانے پر نقل مکانی ہوئی۔ روشنیوں کے شہر عروس البلاد کراچی کے باسی کسی اور شہر کے خوگر ہوسکتے تھے بھلا مگر اسلام آباد ایسا شہر طلسم تھا کہ کراچی والے بھی اسلام آباد آکر کراچی کو بھولنے لگے۔ کراچی کے حالات سے تنگ آئے جوق در جوق لوگوں کی اسلام آباد آمد سے نہ صرف شہر کی آبادی گنجان ہوئی بلکہ مکانوں، دکانوں اور زمین کی قیمتوں میں بھی ہوشربا اضافہ ہوا اور سڑکوں پر ٹریفک کا دباؤ بھی بڑھ گیا۔ اسلام آباد کی طلسماتی خموشی چنگھاڑ میں بدل گئی۔

شائستہ دوسرے بچے کی ماں بن گئی۔ محمود کی بہن تسنیم کی شادی ہوچکی تھی۔ وہ اس بار شائستہ کی زچگی نمٹوانے ماں کے ساتھ نہ آسکی تاہم ماں اپنی ایک رشتے دار کو جو بال بچوں سے فارغ تھی اسلام آباد دکھانے کے بہانے اپنے ساتھ لے آئی۔ اس نے محمود کی ماں کا ہاتھ تو کیا بٹانا تھا مہمان بن کر بیٹھ گئی اور اس پر مستزاد مری گھمانے پھرانے کی پرزور فرمائش۔ محمود کی ماں نے بہت ڈرایا کہ مری میں تو

برف پڑی ہوگی تو کمزور عورت۔ کہیں پھسل کر گر پڑی تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے مگر وہ بھی پکی تھی اپنی فرمائش سے دستبردار ہو کر نہ دی۔ ناچار محمود کو اسے مری گھمانے کے لیے ساتھ لے جانا پڑا۔ اسی کی وجہ سے محمود کی ماں بہو کی اس زچگی کے بعد پہلی مرتبہ کی طرح زیادہ دن نہ ٹھہر سکی۔ شائستہ کو چلہ نہلاتے ہی اس نے واپسی کی تیاری کر لی اور بہو، بیٹے کو چپکے سے سمجھا دیا کہ اس گلے لگائی مصیبت سے گلوخلاصی کے لیے جانا ضروری ہے۔ محمود اور شائستہ نے بھی اسی میں عافیت سمجھی۔ دو بچوں کی دیکھ بھال کے لیے شائستہ کو خود ہی کمر کسنا پڑی۔ ویسے ایمان کی بات یہ تھی کہ خدا نے اسے بہت تعاون کرنے والا شوہر دیا تھا۔ دفتر سے واپسی پر وہ نہ صرف بچوں کی دیکھ بھال بلکہ گھر کے کام کاج میں بھی اس کی خاطر خواہ مدد کرتا تھا۔ صبح شائستہ کے سرہانے ڈبل روٹی کے مکھن لگے سلائس رکھتے ہوئے آہستگی سے کہتا۔

”بے بی ناشتا کر لو پھر سو جانا۔“

”سونے دیتا ہے آپ کا یہ چھوٹا۔“ شائستہ جسے اس کے اپنے گھر میں اور خاندان بھر میں پیار سے ”بے بی“ کہا جاتا تھا آنکھیں کھول کر محمود سے کہتی۔

”مجھے پتا ہے...... پتا ہے مجھے۔“ محمود محبت سے اس کے بالوں میں اپنی انگلیاں گھماتے ہوئے کہتا۔

محمود طبعاً نہایت شریف اور ایثار پسند آدمی تھا۔ شائستہ تو اس کی شریک زندگی تھی اسے غیروں کے کام آ کر بھی خوشی ہوتی تھی۔ پہلے بیٹے علی محمود کی پیدائش کے بعد اسے ہر بچہ اچھا لگنے لگا تھا۔ دفتر سے واپسی پر جب وہ پیدل چلتا ہوا اپنے سیکٹر میں داخل ہوتا تو جی ٹائپ سرکاری مکانوں کے درمیان ذیلی سڑک سے گزرتے ہوئے اسے گھروں کے باہر کھیلتے بچے بہت اچھے لگتے۔ وہ کسی کو ہیلو ہائے کہتا، کسی سے ہاتھ ملاتا، کسی کے سر کو پیار سے چھوتا، کسی سے حال چال پوچھتا وہاں سے گزرتا۔ سپید رنگت اور سنہری بالوں والا ایک چھوٹا سا بچہ جو ایک سرکاری مکان کے سرونٹ کوارٹر سے آتا جاتا دکھائی دیتا تھا محمود کو دیکھتے ہی بہ آواز بلند سلام داغتا۔ محمود ٹھٹک جاتا۔ ”ہاں بھئی چھوٹو کیا حال ہے؟“

”ٹھیک ٹھاک۔“ وہ مسکراتے ہوئے جواب دیتا۔

محمود کو اس راستے سے عجیب انسیت ہو گئی تھی۔ ذیلی سڑک پر کھیلتے کودتے اور سائیکلنگ کرتے بچے جو کبھی کبھی اسی سڑک پر کرکٹ بھی کھیلتے دکھائی دیتے۔ سڑک کے دونوں پہلوؤں میں جا بجا ایستادہ اونچے اور گھنے درخت جو ہر نئے موسم میں نیا چولا پہن لیتے۔ کبھی سبز، کبھی زردی مائل، کبھی بھورا اور کبھی ان کی شاخیں بالکل ننگی ہو جاتیں۔ خزاں میں ان درختوں کے پتے شاخوں سے جدائی کے دکھ میں سڑک پر کھڑکھڑاتے اور راہ گیروں کے قدموں میں رلتے پھرتے۔ پھر کسی دن علاقے کا خاکروب اپنی لمبی، تنومند اور مضبوط تنکوں والی جھاڑو سے سڑک پر رلتے ان خشک پتوں کو سمیٹ کر اکٹھا کرتا اور انہیں دیا سلائی دکھا دیتا۔ ڈھیروں ڈھیر پتے دیکھتے ہی دیکھتے جل کر خاک ہو جاتے، کسی کو یاد بھی نہ رہتا کہ سڑک کنارے پڑی سیاہ راکھ کبھی کسی بلند و بالا درخت کی شاخوں کا سبز پیراہن ہوا کرتی تھی۔

گاؤں میں محمود نے صرف دو موسم دیکھے تھے۔ گرمی اور سردی مگر اسلام آباد آ کر تو اسے برس کے برس کئی موسموں سے سابقہ پڑا۔ گرمی، سردی، بہار، خزاں، ساون، بھادوں، پت جھڑ، پولن الرجی...... ہاں ایک موسم الرجی کا بھی تو ہوتا تھا۔

الرجی کا نام محمود نے اسلام آباد آنے سے پہلے گاؤں میں بھی سن رکھا تھا۔ محمود کے بچپن میں جب گاؤں کا کوئی بندہ جسم پر کھجلی، پت یا دانے، پھنسیوں کا شکار ہو جاتا تو کہا جاتا خارش ہو گئی ہے لیکن محمود کی جوانی میں جب گاؤں قدرے ترقی یافتہ ہو چکا تھا خارش کو الرجی کہا جانے لگا تھا۔ اسلام آباد آنے کے بعد محمود کو پتا چلا خارش کے علاوہ بھی ایک الرجی ہوتی ہے اور وہ ہے ”پولن الرجی۔“

موسم بہار اسلام آباد کے بے شمار باسیوں کے لیے موسم آزار بن کر آتا۔ ادھر درختوں پر غنچے چٹکنا شروع ہوتے ادھر پولن سے الرجک افراد کی جان پر بن جاتی۔ سرکاری اور نجی اسپتالوں میں مریضوں کا ہجوم بڑھ جاتا۔ نیبولائزر کم پڑ جاتے۔ الرجی کا شکار افراد کو فوری طبی امداد بہم پہنچانے کے لیے رضاکار جماعتیں کیمپ لگا لیتیں۔ مریضوں پر جو بیتتی سو بیتتی ان کے متعلقین کی جان پر بھی بنی رہتی۔ طبی امداد ملنے میں دیر ہوئی سانس بند اور مریض ختم...... سانس کی آمد و رفت ہی سے تو زندگی کی ڈور بندھی تھی۔ پولن الرجی سانس کی گھٹن کا معاملہ تھا۔ اموات ہوتی رہتی تھیں مریض اور متعلقین اخبار کھولتے تو سب سے پہلے فضا میں پولن کی تعداد کی خبر دیکھتے۔ پولن الرجی کے موسم میں تقریبات کم سے کم رکھی جاتیں۔ الرجی کا شکار وہ افراد جن کا ملازمت، کاروبار یا کسی اور مجبوری کی وجہ سے گھر سے باہر نکلنا ضروری ہوتا تو کسی ہنگامی ضرورت کے لیے انہیلر ساتھ رکھتے۔ بارش ہوتی تو مریضوں کو کچھ افاقہ محسوس ہوتا لیکن بارش کے بعد جونہی دھوپ نکلتی پھر وہی آزار شروع ہو جاتا...... وسط اپریل میں جب اس آزار کا زور ٹوٹتا تو

مریضوں کے چہروں پر رونق اور ان کے متعلقین کی جان میں جان آتی۔
اکتوبر میں جب ہوا خنک ہونے لگتی تو پولن الرجی کا ایک جھٹکا پھر لگتا مگر یہ جھٹکا پہلے جھٹکے کی طرح نہ تو شدید ہوتا نہ طویل۔
موسم ٹھنڈا ہوتے ہی محمود پنڈی کے بازار جاتا اور خشک میوہ جات خرید لاتا۔ لحاف میں دبک کر شائستہ کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے خشک میوے ٹونگنا عجیب لطف دیتا۔ اب تو علی محمود بھی ان کے ساتھ بیٹھ کر مونگ پھلی کے دانے، چلغوزے، کشمش اور بادام کی گری ٹونگنے لگا تھا۔
''آپ کو مکان کب الاٹ ہوگا؟'' شائستہ پوچھتی۔
''دیکھو کب ہوتا ہے۔''
''کوشش کریں نا...... بچے بڑے ہوں گے تو ہمیں بڑے گھر کی ضرورت ہوگی۔''
''کوشش سے کچھ نہیں ہوتا...... لمبی لائن لگی ہوئی ہے...... تگڑی سفارش ہو یا پھر بھاری رشوت۔''
''ڈھونڈیں نا کوئی سفارش۔''
''کہاں سے ڈھونڈوں یار۔''
''تو...... پھر...... رش...... وت۔'' شائستہ رک رک کر نہایت محتاط لہجے میں کہتی۔
''اپنے بس کی بات کہاں...... ہزاروں نہیں لاکھوں کی بات کرتے ہیں...... دو تین لاکھ۔''
''خدا سمجھے انہیں۔'' شائستہ کے لہجے میں دل گرفتگی در آتی۔
''ہاں خدا ہی سمجھے گا...... بندے تو نہیں سمجھ سکے۔''
''تو کیا ہم ساری زندگی...... سرونٹ ہی میں پڑے رہیں گے۔'' شائستہ ملول ہو کر کہتی۔
''سرونٹ میں کیوں پڑے رہیں گے...... اللہ کو ہماری ساری ضرورتوں کا علم ہے۔ اسے پتا ہے کب ہمیں اپنا مکان ملنا ضروری ہے...... فکر نہ کرو۔ جب اللہ چاہے گا مکان الاٹ ہو جائے گا ہمیں۔''
''کسی ایسے سیکٹر میں الاٹ کرانا جہاں رات کو اندھیرا نہ ہوتا ہو...... بندے کو کسی وقت رات کو بھی تو باہر آنے جانے کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔''
محمود مسکرا دیتا۔ شائستہ کو اندھیرے سے بڑا ڈر لگتا تھا۔ صد شکر کہ ان کی اپنی رہائش ایسے سیکٹر میں تھی جو دارالخلافہ کے حساس علاقوں میں شمار ہوتا تھا، اسی لیے وہاں رات بھر بتیاں جلی رہتیں۔
محمود کو اسلام آباد کی بس یہی ایک بات ناپسند تھی حکمرانوں کی قیام گاہوں کی طرف جانے والے راستے تو سرِشام روشن ہو جاتے اور رات بھر جگمگاتے رہتے۔ عوامی سیکٹرز میں شام ڈھلتے ہی گھروں سے باہر گلیاں اور سڑکیں اندھیروں میں ڈوب جاتیں۔ حالانکہ ان میں سے بعض راستے تو اتنے پُرخطر تھے کہ ان راستوں پر کسی نئے اور انجانے آدمی کو حادثہ بھی پیش آسکتا تھا۔ گہرے نالے اور کھائیاں جہاں ذرا قدم چوکا یا ذرا راستے کا اندازہ غلط ہوا اور آدمی کسی گہرے نالے یا کھائی میں۔ بعض راستے تو ایسے تھے جو سبزے سے ڈھکے دکھائی دیتے مگر نیچے گہرائی میں دلدل۔ جگمگاتی شاہراہوں پر سفر کرتے حکمرانوں کو اندھیروں میں ڈوبی ان عوامی گزرگاہوں پر چلتی رعایا کے مسائل کا کوئی احساس ہوتا تو ان پُرخطر راستوں پر بھی کوئی دیا تو ٹمٹماتا دکھائی دیتا۔
ہر شخص اپنی رعیت کے بارے میں جوابدہ ہوگا۔
آفرین ان حکمرانوں پر جو اپنی رعیت کی خبر گیری کے لیے بھیس بدل کر گلی محلوں میں نکلا کرتے تھے۔
علی محمود کے اسکول میں داخلے کا وقت آنے تک فرشتہ دنیا میں آچکی تھی۔ محمود کو شائستہ کے نام کے وزن پر اپنی ننھی پری کے لیے یہی نام سوجھا تھا۔

☆☆☆

محمود نے دارالخلافہ میں رہتے ہوئے کئی منتخب جمہوری حکومتوں کی بساط لپٹتے ہوئے بھی دیکھی۔ منتخب وزیراعظم پاکستان کو اقتدار سے معزول کرنے کا دن اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اس روز اسے کسی کام سے پنڈی جانا پڑ گیا تھا۔ دفتر میں حاضری لگا کر آدھ پون گھنٹا دفتر میں بیٹھنے کے بعد وہ اسلام آباد اور پنڈی کے روٹ پر چلنے والی وین میں بیٹھ کر پنڈی چلا گیا۔ کام نمٹا کر واپسی ہوئی تو ہر چوک ہر رستے پر باوردی اسلحہ بردار دکھائی دیے جو مسافر گاڑیوں کو راستہ بدل کر جانے کا اشارہ دے رہے تھے۔ عجب پُراسراریت تھی محمود کے ساتھ مسافر وین میں بیٹھے ہوئے مسافر ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کیا ہوا ہے؟ کسی کے پاس کوئی حتمی جواب نہ تھا فقط قیاس، اندازے اور افواہیں...... وین پنڈی سے دارالحکومت پہنچی تو وہاں بھی وہی پُراسراریت دکھائی دی۔ اس پُراسراریت کا پردہ چاک ہوا تو پتا چلا جمہوری حکومت ختم ہو گئی تھی۔ چشمِ فلک نے محمود کو عجیب نظارہ دکھایا۔
نظارے تو وہ اور بھی بہت سے دیکھ رہا تھا۔ دارالحکومت اور اس کے جڑواں شہر کا نقشہ بدل رہا تھا۔

سیدھے سادے راستوں میں پیچ وخم آ رہے تھے۔ شہر انتہا اور محمود دونوں طرح سے پھیل رہے تھے۔ فیض آباد فلائی اوور سے ائرپورٹ کی طرف جانے والی ہائی وے کے دونوں پہلوؤں میں نئی نئی بستیاں آباد ہو رہی تھیں۔ بلڈرز گہرائیوں کی بھروائی کروا کے بستیاں بسا رہے تھے۔ فیز ون، فیز ٹو، فیز تھری...... آبادیات سے وابستہ ایک بزنس ٹائیکون نے تو ایک نیا شہر ہی آباد کر دیا تھا۔ اس کی منصوبہ بندی قابلِ داد بھی تھی، قابلِ دید بھی مگر اس کی دیکھا دیکھی ایسوں نے بھی اپنی دکانیں کھول لی تھیں جو آبادیات کی ابجد سے بھی ناواقف تھے۔ سر چھپانے کے لیے سائبانوں کے طلب گاران کے ہتھے بھی چڑھ رہے تھے۔

آمریت کے دور میں سبھی کچھ تیزی سے بدلا۔ مہنگائی ہوشربا، آزادی بے مہار، عریانی بلاخیز...... دورِ آمریت میں مہنگائی اتنی بڑھی کہ محمود بے چارا موسم سرما شروع ہوتے ہی...... بازار سے تھیلا بھر خشک میوہ جات لاتا تو کجا ان کا ذائقہ بھی بھول گیا۔ کبھی کبھی مونگ پھلی البتہ خرید لاتا۔ چھٹی والے دن شائستہ اور بچوں کو لے کر اتوار بازار جاتا تو مچھلی کے اسٹالز کو دور ہی دور سے دیکھ کر جی مسوستا پلٹ آتا...... شائستہ کو تلی مچھلی بہت مرغوب تھی۔ جب تک سستائی رہی وہ ہر ہفتہ مچھلی ضرور لاتا، شائستہ مسالا لگا کر رکھ دیتی اور تقریباً ہر روز ہی دو تین ٹکڑے تل کر دسترخوان پر سجا دیتی۔ شائستہ تو بنگالیوں کی طرح مچھلی کی ہڈیاں بھی مزے سے چبا جایا کرتی تھی۔

”تمہیں تو بنگال میں پیدا ہونا چاہیے تھا۔“ محمود اسے مچھلی کی ہڈیاں چباتے دیکھ کر کہتا۔

شائستہ کی مسکراہٹ!

اس مسکراہٹ میں تو اس کی جان تھی۔ اس مسکراہٹ کی خاطر وہ کچھ بھی کر سکتا تھا سوائے ماضی میں چالیس تا ساٹھ ستر روپے کلو ملنے والی سلور رہو بھی اب ڈیڑھ سو روپے فی کلو خریدنے کے! خدایا مچھلی کے نرخ اور وہ بھی اتوار بازار میں کہاں سے کہاں جا پہنچے تھے۔ کتوں کو گود میں اٹھا کر تصویریں کھنچوانے والے آمروں نے اپنے بدیسی آقاؤں کی خوشنودی کے لیے غریبوں کے منہ سے ان کے نوالے بھی چھین لیے تھے۔ محمود جو چودہ گریڈ سے ترقی کر کے سولہ گریڈ میں پہنچ چکا تھا، بیوی اور بچوں کو بازار لے کر جاتا تو کبھی بیٹوں کو ستے سے گیند بلے پر ٹرخا کر اور کبھی فرشتہ بیٹی کو دس دس روپے ملنے والے ہیئر بینڈ، ہیئر کلپس یا بریسلٹ سے خوش کر کے ہفتہ بھر کے سودا سلف کے تھیلے اٹھائے بیوی بچوں سے کچھ جھینپا جھینپا

سانا خوش گھر لوٹ آتا۔

☆☆☆

نئے انتخابات کے بعد حکومت بدلی تو گاؤں کے اسی سیاسی خانوادے کے سیاسی اثرونفوذ سے جس نے محمود کو سرکاری ملازمت بھی دلوائی تھی۔ ہاؤسنگ اور تعمیرات کی وزارت سے ایک جلد ہی خالی ہونے والے سرکاری مکان کی الاٹمنٹ کا پروانہ بھی مل گیا۔ محمود کے نزدیک یہ سفارش ناجائز نہ تھی۔ جہاں اس سے کہیں جونیئر سرکاری ملازمین محض سفارش یا رشوت سے دو دو کیٹگری اوپر کے مکان الاٹ کروا کے ٹھاٹ سے سرکاری مکانوں کے مکین بنے ہوئے تھے وہاں اس کا اپنے ہی گریڈ کا سرکاری مکان الاٹ کرانے کے لیے سفارش لگانا گناہ نہیں ضرورت تھی۔ وزارت ہاؤسنگ وتعمیرات نے اسے ''آؤٹ آف ٹرن'' الاٹمنٹ ''سبجیکٹ ٹو ویکیشن'' کی تھی۔ یعنی مکان خالی ہوگا تو اسے مل جائے گا۔

خوش قسمتی سے مکان کا موجودہ الاٹی جو چند ماہ بعد ہی سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہونے والا تھا لاولد تھا۔ بیوی خاتونِ خانہ تھی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد مذکورہ الاٹی مروجہ قانون کے تحت سرکاری مکان بعد از ریٹائرمنٹ حد سے حد چھ ماہ اور اپنے تصرف میں رکھنے کا مجاز تھا۔

محمود اس خیال سے خوش تھا کہ سال بھر سے کم عرصے میں وہ سرکاری مکان میں شفٹ ہوجائے گا۔ پھر تو مکان کی فکر سے لمبی چھٹی ہوجانی تھی۔ ابھی اس کی اپنی ریٹائرمنٹ میں بھی کافی وقت تھا پھر ماشاءاللہ دو بیٹوں میں سے کوئی ایک تو سرکاری ملازمت میں ہوگا ہی۔ مکان کی الاٹمنٹ اس کے نام پر منتقل ہوجائے گی۔ کرایہ داری کی علت سے جان چھوٹنے کا تصور ہی محمود کے لیے خاصا دل خوش کن تھا۔ شائستہ اور بچے اس خوشی میں اس کے برابر کے شریک تھے۔

مگر ہوا یہ کہ مکان کے الاٹی نے بالا ہی بالا کوئی تدبیر لڑا کر مذکورہ مکان اپنی ایک افسر بھتیجی کے نام الاٹ کروا کے اسٹیٹ آفس کے نچلے عملے سے کچھ سازباز کی اور اپنی ریٹائرمنٹ سے پہلے ہی اسے قبضہ دے کر خود بری الذمہ ہوا۔ بھتیجی نے عدالت میں کیس داخل کردیا کہ وہ خود سرکاری افسر ہے مکان کا سابق الاٹی اس کا سگا چچا اور لاولد ہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد وہی چچا اور اس کی اہلیہ کی دیکھ بھال کی ذمے دار ہوگی لہٰذا انسانی ہمدردی کی بنیاد پر اسے اس مکان کی محمود کو کی جانے والی الاٹمنٹ کے خلاف اسٹے آرڈر جاری کیا جائے۔ عدالت نے اسے اسٹے دے دیا اور یہ سارا قصہ محمود کے علم میں اس وقت آیا جب وہ عدالت سے حکمِ امتناعی حاصل کرچکی تھی۔

اب محمود نے بھاگ دوڑ شروع کی۔ حکمِ امتناعی کے خلاف آواز اٹھانے کے لیے وکیل کیا جس نے فیس ہاتھ میں لینے سے قبل محمود کو امید دلائی کہ چونکہ الاٹمنٹ پہلے اسی کی ہوئی تھی لہٰذا فیصلہ اسی کے حق میں ہوگا۔ لیکن تقریباً دس گیارہ ماہ عدالتی جنگ کے دوران اسٹیٹ آفس کے کارندے محمود کی حریف خاتون کے ساتھ بڑے استقلال سے کھڑے نظر آتے رہے نہ صرف یہ بلکہ انہوں نے اندر ہی اندر ایسا جال بچھایا کہ اسٹیٹ آفس کے ریمارکس نے محمود کا معاملہ کمزور اور خاتون کا پلڑا بھاری کردیا۔ بالآخر عدالت نے اسٹیٹ آفس کے ریمارکس کی روشنی میں خاتون کے حق میں فیصلہ دے دیا اور اسٹیٹ آفس کو ہدایت کی کہ محمود کو اسی کیٹگری کا کوئی دوسرا مکان جلد از جلد الاٹ کیا جائے۔

عدالت کے فیصلے سے محمود اتنا بددل ہوا کہ اس نے دوسرا سرکاری مکان الاٹ کرانے کا خیال ہی ترک کردیا۔ بعد میں اسے مصدقہ ذریعے سے معلوم ہوا کہ عدالت میں اسٹیٹ آفس سے اپنے حق میں ریمارکس پیش کروانے کے لیے محمود کی حریف خاتون نے تقریباً چار لاکھ کی رقم خرچ کی تھی۔

عدالتی جنگ ہارنے کے بعد محمود کا جب کبھی کچہری کے سامنے سے گزر ہوا اس نے عجیب سا کرب محسوس کیا۔ اسٹیٹ آفس کے کارندے اپنی بغلوں میں فائلیں دبائے اب بھی نہ جانے کس کس کے حق پر عدالتوں میں شب خون مارتے پھرتے ہوں گے۔

مکان کے سلسلے میں عدالتی جنگ کے دنوں کو یاد کرکے محمود کے دل میں اکثر بڑے باغیانہ خیالات سر اٹھانے لگتے تھے۔

مکان کا کیس ہارے جانے پر شائستہ اور بچے بھی بہت دل گرفتہ ہوئے تھے۔ ''آپ کا وکیل تو کہتا تھا فیصلہ آپ ہی کے حق میں ہوگا۔'' شائستہ نے رنجور لہجے میں محمود سے کہا۔

''میری زبان نہ کھلواؤ شائستہ...... میں بہت ہرٹ ہوا ہوں۔'' محمود کا بس نہ تھا کہ رو دے۔ ''یہاں انصاف بکتا ہے۔'' وہ گھائل لہجے میں بولا۔

''درفع کریں۔'' شائستہ نے ہمیشہ کی طرح ایک اچھی بیوی ہونے کا ثبوت دیا پھر محمود کا دل رکھنے کو بولی۔ ''سچ پوچھیں تو مجھے تو سرکاری مکانوں پر نحوست سی چھائی دکھائی دیتی ہے۔''

محمود اسے دیکھنے لگا...... ٹکٹکی باندھ کر...... پھر اچانک اس کے ہونٹوں پر بڑی بے بس سی مسکان پھیل گئی۔ ''انگور کھٹے ہیں۔'' اس کے لہجے میں تلخی تھی، دکھ تھا۔

شائستہ نے اپنا ہاتھ دھیرے سے اس کے شانے پر دھر دیا۔

''تم نہ ہوتیں شائستہ تو میں کیا کرتا۔'' محمود نے گردن موڑ کر اپنے ہونٹ اپنے کندھے پر دھرے شائستہ کے ہاتھ کی پشت سے مس کر دیے۔

☆☆☆

محمود کو سرکاری مکان تو الاٹ نہ ہوا البتہ اس نے شہزاد ٹاؤن میں ایک مکان کی ہائرنگ کرالی۔ ''ہائرنگ'' تو ضرورت مندوں کی ضرورت تھی۔ ''سیلف ہائرنگ'' پالیسی سازوں کی عجیب اختراع تھی۔ یہ کہاں کا انصاف تھا بھلا کہ جن سرکاری ملازمین کے پاس اپنا گھر نہ ہو ان کو تو سرکاری مکان کی الاٹمنٹ بھی جوئے شیر لانا ٹھہرے اور پرائیویٹ مکان ''ہائر'' کرانے میں بھی ہزار دقتیں اور جن کے پاس ذاتی مکان موجود ہو ان کی جیبیں ''سیلف ہائرنگ'' کے عنوان سے مزید گرم گویا بھرے کو مزید بھرنا...... ''سیلف ہائرنگ'' پالیسی سازوں کی ایسی اختراع تھی جس سے ان کے اپنے مفادات بھی وابستہ تھے خود سرکاری رہائش گاہوں میں رہتے اور ذاتی مکان یا تو کسی پرائیویٹ پارٹی کو کرائے پر اٹھا دیتے یا پھر کسی قریبی فرد کے نام جو سرکاری ملازمت میں ہوتا ہائرنگ کرا دیتے۔ ہائرنگ سے ملنے والی خاطر خواہ رقم کا سرکاری چیک ایسے لوگوں کے اثاثوں میں مزید اضافے کا سبب بنتا۔ یہ وہ لوگ تھے جو دونوں ہاتھوں سے فائدے سمیٹ رہے تھے۔ ڈھٹائی سے نعرہ لگاتے ''سب سے پہلے پاکستان! سب سے پہلے پاکستان!''

☆☆☆

شہزاد ٹاؤن میں ہائر کیے جانے والے مکان کے لیے محمود کو سرکاری کھاتے سے جو کرایہ ملتا اس کے علاوہ بھی اسے اپنی جیب سے مالک مکان کو اضافی رقم ادا کرنی پڑتی۔ شائستہ اور بچے خوش تھے کہ ''سرونٹ کوارٹر'' کا لیبل ہٹ کر انہیں ایک ''پراپر'' گھر رہنے کو مل گیا تھا۔ جب سے بچے بڑے ہوئے تھے گھر میں ان کے دوستوں کا آنا جانا بھی ہو گیا تھا اور وہ ماں باپ سے بار بار سرونٹ کوارٹر کو چھوڑ کر کسی مناسب گھر میں رہنے پر مصر رہنے لگے تھے۔

لیکن شہزاد ٹاؤن میں شفٹ ہونے سے محمود کو دفتر آنا جانا دور پڑنے لگا۔ بچوں کے اسکول بھی گھر سے کافی دور ہو گئے۔ ایف سکس میں تو بچوں کی اسکول بسیں انہیں گھر سے چند قدم کے فاصلے سے اٹھاتی اور چھوڑتی تھیں۔ شہزاد ٹاؤن والی بسیں باہر باہر مین روڈ سے گزر جاتیں۔ ہائرنگ پر لیا جانے والا گھر مین روڈ سے کافی دور تھا۔ محمود صبح کے وقت تو بچوں کو اپنے ساتھ لے جا سکتا تھا مگر واپسی پر دفتر اور بچوں کے اسکولوں کی چھٹی کا وقت مختلف ہونے کی وجہ سے نہ تو وہ دفتر سے جلدی نکل سکتا تھا نہ اپنی وجہ سے بچوں کو چھٹی کے بعد دو ڈھائی گھنٹے اسکول میں مارا مارا پھرنے کو چھوڑ سکتا تھا۔ چنانچہ تینوں بچوں کے لیے سوزوکی وین لگوانی پڑی۔ اخراجات بڑھ گئے۔ بہرحال شائستہ اور بچے ایک پراپر گھر میں رہ کر خوش تھے۔

گھر کے تین کمروں میں سے ایک کو شائستہ نے ڈرائنگ روم کے طور پر آراستہ کر لیا۔ ایک کمرا اس نے اپنا اور محمود کا بیڈروم بنا لیا۔ ایک کمرا بچوں کے بیڈروم کے طور پر استعمال ہونے لگا۔ گاؤں سے مہمان آنے کی صورت میں چھوٹا سا لاؤنج بھی خواب گاہ میں بدل جاتا۔ تینوں بچوں میں سے کوئی بھی کسی مہمان کے لیے اپنا کمرا چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوتا۔ یہ بے مروتی انہیں اسلام آباد کی عطا کردہ تھی۔ اسلام آباد میں رہنے کو وہ اپنے لیے ایسا اعزاز سمجھتے جس کا خراج وہ اپنی تعطیلات میں گاؤں جانے پر ننھیال اور ددھیال دونوں سے دونوں ہاتھوں سے وصول کرتے۔ دونوں خاندان ان کے ناز اٹھاتے نہ تھکتے۔ محمود کی ماں ان کے گاؤں پہنچنے سے پہلے ہی ایک ایک کو فخر سے بتانے لگتی۔ ''اسلام آباد سے محمود کے بچے آ رہے ہیں۔'' شائستہ کی ماں ایک ایک کو جتاتی۔ ''میری شائستہ کے بچے اسلام آباد کے بڑے انگریزی اسکولوں میں پڑھتے ہیں۔ فرفر انگریزی بولنا اور لکھنا عام آدمی کے بچوں کا روگ نہیں ہے جو بچے کر کر کے انگریزی پڑھنا اور لکھنا سیکھتے ہیں، محمود کے بچے جتنے دن گاؤں میں رہتے وی آئی پی پروٹوکول پاتے اور دوسروں کے لیے باعث رشک بنے رہتے۔

☆☆☆

اسلام آباد اور جڑواں شہر کے نقش و نگار نہایت سرعت سے تبدیل ہوئے۔ پنڈی میں مری روڈ کی کشادگی اور کمیٹی چوک پر انڈر پاس کی تعمیر مری روڈ پر دکانیں جمائے بیٹھے کاروباری طبقے کے معاشی قتل عام کا باعث تو بنی ہی بے شمار قدیم عمارات بھی کہیں پوری کی پوری اور کہیں ان کے اگلے حصے نہایت بے دردی سے ڈھا دیے گئے۔ قدیم طرز تعمیر کی جو عمارات سڑک کی کشادگی اور انڈر پاس کے لیے ڈھائی

گئیں، اگر کسی مغربی ملک میں ہوتیں تو انہیں آثار قدیمہ کے طور پر محفوظ رکھا جاتا۔ انہیں منہدم کرنا تو کجا ان کے کسی چوبارے یا بالاخانے کی مرمت کے لیے بھی سرکاری اجازت نامہ حاصل کرنا ضروری ہوتا اور کیا عجب کہ عمارت کو اس کی اصل حالت میں برقرار رکھنے کے لیے سرکار مرمت کی اجازت بھی نہ دیتی۔ بوسیدگی کا بھی تو اپنا حسن، اپنی اہمیت، اپنی قدر ہوتی ہے۔

اسلام آباد میں بھی انڈر پاسز کی تعمیر کے لیے دیوہیکل مشینیں جابجا سڑکیں اکھیڑنے لگیں۔ ٹریفک کا رخ کہیں یہاں کہیں وہاں موڑ دیا گیا۔ بڑی سڑکیں بند، گاڑیاں گلی محلوں سے گزرنے لگیں بعض لوگوں کو مشکل تو بعض کو آسانی میسر آئی۔ گھر سے نکلے اور گاڑی کو ہاتھ کے اشارے سے روک لیا۔

محمود کو راستے بند ہونے یا ٹریفک کا رخ تبدیل ہونے کی چنداں پروا نہ تھی۔ اپنی موٹر سائیکل پر وہ ”باہر ہی باہر“ دفتر آتا جاتا۔ بچے البتہ کچھ دیر سے گھر پہنچتے۔ محمود کے وہ ساتھی جو راستے بند ہونے کے باعث ادھر ادھر سے ہو کر جوں توں دفتر پہنچتے دفتر آتے ہی بڑبڑانے لگتے۔ ”زندگی عذاب کردی ہے ان انڈر پاسوں نے...... جدھر دیکھو سڑک کھدی پڑی ہے...... جہاں سے گزرنے کی کوشش کرو راستہ بند ملتا ہے۔“

”یہ ساری وقتی تکلیف ہے بھائی میاں...... آرام پانے کے لیے کچھ تکلیف تو جھیلنا ہی پڑتی ہے...... انڈر پاس بن جائیں گے تو بڑی آسانی ہو جائے گی۔“ انڈر پاسز کا کوئی حمایتی پرجوش لہجے میں کہتا۔

”خاک آسانی ہو جائے گی...... کمیشن چل رہا ہے بھائی صاحب کمیشن...... نیچے سے اوپر تک سب کی پانچوں انگلیاں گھی میں سر کڑاہی میں۔“ کوئی دل جلا اپنے دل کا پھپھولا پھوڑتا۔

”ترقی بھائی میاں ترقی...... ترقی یونہی ہوتی ہے۔“

”ہونہہ! ایسی ترقی جو عام آدمی کو صبح سے شام کرنا عذاب بنا دے جائے بھاڑ میں۔“

محمود سب کی چپ چاپ سنتا رہتا اور دل ہی دل میں شکر ادا کرتا کہ اس عذاب سے دوچار ہونے سے پہلے ہی وہ وہاں سے نکل آیا تھا جہاں راستے بند اور سڑکیں کھدی پڑی تھیں۔

محمود کی عادت تھی دفتر پہنچ کر اخبار ضرور پڑھتا۔ انہی دنوں جب اسلام آباد میں زیادہ ٹریفک والے راستوں پر انڈر پاسز کی تعمیر کے لیے نہایت سرگرمی سے کھدائی کی جا رہی تھی اس نے اخبار میں ایک خبر پڑھی۔ شہید ملت سیکریٹریٹ انڈر پاس کی تعمیر کے لیے کی جانے والی گہری کھدائی میں رات گئے ایک خاتون کار سوار اپنی کار سمیت کھائی نما گہری کھدائی میں جا گری تھی۔ پولی کلینک نزدیک ہی تھا لیکن خاتون کی کار اتنی بلندی سے گہرائی میں گئی تھی کہ خاتون جانبر نہ ہو سکی تھی۔

اس خبر نے محمود کو کچھ دیر نہیں، ایک دو دن بھی نہیں بلکہ دنوں ملول رکھا۔ گو یہ تو اسے اگلے ہی دن کے اخبار سے معلوم ہو گیا تھا کہ متوفیہ اسلام آباد کے ایک پوش علاقے کی رہائشی تھی۔ شوہر بیرون ملک تھا وہ رات گئے کار میں اکیلی ہی جا رہی تھی۔ مگر محمود کا حساس ذہن دنوں اسی ادھیڑبن میں رہا کہ خدا جانے اس خاتون کو ایسی کیا ضرورت درپیش تھی کہ رات گئے تنہا باہر نکل گئی...... خدا جانے اس کے متعلقین پر اس دلخراش سانحے سے کیا بیتی ہو گی...... اس کے بچے بھی تھے یا نہیں...... تھے تو کتنے بڑے اور ان پر کیا گزری...... کیا جائے وقوعہ پر روشنی کا کوئی بندوبست نہیں تھا...... اگر روشنی تھی تو کیا پروجیکٹ کے ذمے داروں نے راہ گیروں اور کار سواروں کے لیے کوئی ایسی علامت نہیں لگا رکھی تھی جس سے انہیں خبردار کیا جا سکتا کہ آگے گہری کھدائی ہے...... کیا وہاں سیکیورٹی اور سیفٹی کا کوئی بندوبست نہیں تھا۔

محمود ابھی اس خاتون کی ناگہانی المناک موت کے سانحے کو بھلا نہیں پایا تھا کہ اس نے ایک اور اندوہناک خبر اخبار میں پڑھی۔ چائنا چوک انڈر پاس کی کھدائی کے دوران چند مزدور ریت کے ایک تودے تلے دب گئے تھے جن میں سے ایک وہ نوجوان بھی تھا جس کا باپ بھی کھدائی کرنے والے مزدوروں میں شامل تھا اور اس نے اپنے جگر گوشے کو اپنی آنکھوں سے زندہ مٹی کے تودے تلے دبتے دیکھا تھا۔

اس رات محمود اپنے دونوں بیٹوں کو اپنی باہنوں میں سمیٹ کر اپنے سینے سے لگا کر بڑی بے کلی سی نیند سویا تھا۔

بے کلی کی یہ کیفیت اس پر اکیسویں صدی کے پانچویں برس اکتوبر میں آنے والے قیامت خیز زلزلے کے بعد بھی دنوں نہیں ہفتوں بلکہ مہینوں طاری رہی تھی۔ شائستہ اور بچے جو اس کے لیے زندگی کا دوسرا نام تھے انہیں چوری چوری دیکھتے ہوئے وہ بار بار یہی سوچتا...... خدانخواستہ اور اس سے آگے اس کا دل جیسے بیٹھنے لگتا تھا۔

اکتوبر دو ہزار پانچ کا زلزلہ کسی قیامت سے کم نہ تھا۔ اس قومی آفت کے اثرات یوں تو وطن کے گوشے گوشے میں

محسوس کیے گئے لیکن اسلام آباد اور اس کے جڑواں شہر کے باسیوں نے اس قیامت سے متاثرہ ہم وطنوں کو بہت نزدیک سے دیکھا۔ دونوں شہروں کے اسپتال زخمیوں سے اور رفاہی ادارے متاثرین سے بھر گئے تھے۔ ایسی قیامت تھی کہ الاماں! اور جن پر گزری تھی وہ ایسے ایسے قصے سناتے کہ سننے والوں کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے۔

شائستہ نے محمود کو اس کے، بچوں کے اور اپنے بہت سے کپڑے، جوتے اور استعمال کی چیزیں دو بڑے بڑے تھیلوں میں بھر کر زلزلہ زدگان کی امداد کے لیے ایک رفاہی ادارے کو پہنچانے کے لیے دیں۔ محمود اپنے دفتر کے ساتھیوں کے ہمراہ اسلام آباد اور پنڈی کے کئی اسپتالوں میں گیا۔ ایسے ایسے دلدوز مناظر دیکھنے کو ملے کہ وہ لرز کر رہ گیا۔ کٹے پھٹے چہرے، گھائل جسم اور دلخراش قصے...... اپنی نوعیت کے اس غیر معمولی قومی سانحے پر ایک طرف اگر ہم وطنوں کی اکثریت متاثرین کی دامے، درمے، سخنے مدد کے لیے متحد اور پرعزم نظر آئی تو کچھ کالی بھیڑیں بھی اپنے چہروں پر موقع پرستی کی نقابیں اوڑھے اپنے مذموم مقاصد کے حصول میں سرگرم دکھائی دیں۔ بے شمار لاوارث بچے اور جوان لڑکیاں اسپتالوں، رفاہی اداروں اور زلزلے سے متاثرہ علاقوں سے غائب ہوئیں اور بہت سوں کا کچھ پتا نہ چلا کہ زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ زلزلہ زدگان کی مدد کے لیے مخیر ہم وطنوں اور غیر ممالک سے بھجوایا جانے والا امدادی سامان کھلے عام بازاروں میں فروخت ہوتا دکھائی دیا۔ زلزلے کے بعد بے شمار نام نہاد رفاہی ادارے جل ککھمبیوں کی طرح وجود میں آئے اور چند دن اپنی بہار دکھا کر بیٹھ گئے۔

دارالخلافہ میں انڈر پاسز تمام تر مخالفتوں اور تنقید کے باوجود مکمل ہو کر رہے۔ انہیں آمدورفت کے لیے کھول دیا گیا اور ان کے فوائد و مضمرات بھی سامنے آنے لگے۔ انڈر پاسز کی تعمیر سے اسلام آباد میں ٹریفک کے زیادہ دباؤ والے راستوں پر ٹریفک کا دباؤ کم ہوگیا۔ چوراہوں پر گاڑیوں کو دیر تک رکنے اور صبر آزما انتظار کی کوفت سے نجات ملی لیکن فاصلے بڑھ گئے۔ پیدل چلنے والوں کو بڑی دقت ہوئی۔ وہ فاصلہ جو پہلے ایک سڑک پار کرنے سے مسافر کو منزل پر پہنچا دیا کرتا تھا۔ اب یا تو جان ہتھیلی پر رکھ کر اجل کی طرح آتی لشکارے مارتی گاڑیوں سے بچتے بچاتے گزر کر طے پاتا یا پھر دیوہیکل آہنی زینوں اور جنگلوں پر سے گزرتے ہوئے۔ بچوں، عورتوں اور بوڑھوں کے لیے ان زینوں پر چڑھنا اور آہنی جنگلوں سے گزرنا بجائے خود

ایک دشوار امر تھا۔ ٹیکسی والوں کی بن آئی تھی۔ جس مقام پر پہنچانے کے لیے پہلے چالیس پچاس روپے طلب کرتے تھے اب سو ڈیڑھ سو کی بات کرنے لگے۔ ایف سکس میں محمود کے ایک سابق پڑوسی شہاب احمد ایک روز اتفاقیہ سیکریٹریٹ میں محمود سے ملے تو حال چال پوچھے جانے پر نہایت شاکی لہجے میں بولے۔

''کیا بتاؤں محمود صاحب انڈر پاس نے زندگی عذاب کردی ہے۔ پہلے تو بیگم دونوں لڑکوں کو ساتھ لے کر گھر سے نکلتی تھیں اور شارٹ کٹ مار کر چائنا چوک اسٹاپ پر جا پہنچتی تھیں۔ ایک نمبر پکڑی اور سیدھے آب پارہ...... جب سے انڈر پاس بنا ہے چائنا مارکیٹ سے گزر کر یا پھر گھوم گھام کر اسٹاپ پر جانا پڑتا ہے بیگم کہتی ہیں مجھ سے اتنا پیدل نہیں چلا جاتا لہٰذا اب مجھی کو بار برداری کرنی پڑتی ہے۔ گھر میں کوئی بیمار پڑ جائے تو اور مصیبت...... پہلے تو گھر سے نکلتے تھے امریکن سینٹر کے پیچھے سڑک پار کی اور پیدل چلتے ہوئے پولی کلینک جا پہنچتے تھے۔ اب نہ بیگم پیدل جانے کو تیار ہوتی ہے نہ بچے۔ انڈر پاس نے تو ہم جیسوں کے لیے پولی کلینک جانا بھی مشکل کر دیا ہے۔''

محمود نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ ایسی وقت کا سامنا ہونے سے پہلے ہی ایف سکس چھوڑ گیا تھا۔ کبھی پولی کلینک جانے کی ضرورت پڑتی تو شہزاد ٹاؤن سے نکل کر ''باہروں باہر'' پولی کلینک کا راستہ پکڑتا۔

''کسی روز چکر لگائیں نا محمود صاحب...... ہماری بیگم اور بچے تو اکثر آپ لوگوں کو یاد کرتے ہیں۔'' شہاب احمد نے بڑی گرمجوشی سے محمود کو اپنے ہاں آنے کی دعوت دی۔

''جی ضرور...... آپ لوگ بھی آئیں کسی دن غریب خانے پر۔'' محمود نے جواب دعوت میں کہا۔

''آپ آیئے گا تو پھر ایڈریس وغیرہ دیجیے گا ضرور آئیں گے ہم بھی۔'' شہاب احمد بولے۔

''ان شاء اللہ۔''

گرمجوش مصافحے کے ساتھ دونوں سابق پڑوسی ایک دوسرے سے رخصت ہوئے۔

☆☆☆

زندگی کی گوناگوں مصروفیات نے محمود کو شہاب احمد سے کیا ہوا وعدہ نبھانے کی فرصت ہی نہ دی۔ بچے بڑے ہو گئے تھے، کبھی ایک کا کوئی مسئلہ ہوتا کبھی دوسرے کا۔ کبھی گاؤں سے کوئی مہمان آیا ہوتا کبھی دفتر میں محمود کی مصروفیت بڑھی ہوتی۔ زندگی انسان کو اپنے شکنجے میں اسی طرح کس کے رکھتی ہے۔

گزرے برسوں میں بہت کچھ بدل گیا تھا...... محمود کی اپنی شکل و صورت کی طرح...... اب وہ دبلا پتلا، اسمارٹ سا نوجوان نہیں رہا تھا۔ فربہ ہو گیا تھا۔ بالوں میں کچھ کچھ سفیدی بھی جھلکنے لگی تھی۔ روزانہ شیو کی علت سے اکتا کر اس نے ڈاڑھی بھی رکھ لی تھی۔ شائستہ کا خیال تھا ڈاڑھی سے اس کی شخصیت میں رعب و دبدبہ آ گیا تھا...... اسلام آباد کی سڑکوں کی طرح!

اسلام آباد کی سڑکیں ہی کیا سارا شہر بدل گیا تھا...... وہ سادگی، پرکاری اور طلسم جو اس شہر کا خاصہ ہوا کرتے تھے گویا داستانِ گم گشتہ بن گئی تھی۔ اب نہ تو شہر شام کو جلدی سنسان ہوتا تھا نہ اہالیانِ شہر جلدی سوتے تھے۔ شہر کا کلچر ہی تبدیل ہو گیا تھا۔ ہاکی، فٹ بال اور کرکٹ گراؤنڈز میں پہلے سی رونقیں رہی تھیں نہ اہلیانِ شہر صبح و شام لمبی چہل قدمی کو نکلتے تھے۔ اب تو گھر گھر کیبل اور کمپیوٹر نے لوگوں کو گھروں کے اندر محصور کر کے رکھ دیا تھا۔ گھر کے بڑے بستروں میں دبک کر کھانستے کھنکھارتے اور جوان موبائلوں پر ٹیکسٹنگ میں اپنی راتیں بتاتے۔ سر بہ فلک عمارتیں آسمان سے باتیں کرتیں۔ نگاہوں کو خیرہ کرتے شاپنگ مالز زرداروں سے اپنی قیمت وصولتے اور بے زروں کو ان کی اوقات میں رکھتے۔ ہوٹلز، موٹلز، ریسٹوران اور گیسٹ ہاؤسز شب بیداریاں جگاتے۔ برانڈڈ مصنوعات کی آؤٹ لیٹس باذوقوں کو اپنی طرف متوجہ رکھتیں۔ موبائل، کمپیوٹر اور لیپ ٹاپ کی دکانوں پر مشتمل مارکیٹیں وجود میں آ گئی تھیں۔ موبائل کمپنیوں نے اپنے پلازے سجا رکھے تھے۔ لوگ بھوکے پیٹ سونا گوارا کرتے مگر اپنی موبائل سم پر پیکیج لینا نہ بھولتے۔ گرل فرینڈ اور بوائے فرینڈ نامانوس اصطلاحات نہ رہیں۔ اونچا طبقہ ہی نہیں درمیانہ طبقے کے لڑکے لڑکیاں بھی موبائل فون پر آزادانہ رابطہ رکھتے اور موقع ملنے پر اکٹھے گھومتے پھرتے بھی تھے۔ بڑے پیمانے پر تبدیلی آئی تھی۔ محمود اور شائستہ اپنے بچوں کو مناسب آزادی کے ساتھ پرانی اقدار کا پابند بھی رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔

☆☆☆

اسلام آباد ابھی انڈر پاسز کا عادی ہونہ پایا تھا کہ ''میٹرو بس'' کا غلغلہ اٹھا۔ ''میٹرو بس پروجیکٹ'' کے لیے خطیر رقوم سے تعمیر کیے گئے انڈر پاسز ادھیڑ کر رکھ دیے گئے۔ شفاخانوں اور اسپتالوں میں دوا کی گولیوں کے لیے دھکے کھاتے غریب غرباء کو تصویرِ حیرت بنے دیکھا...... کیا

میٹرو بس زیادہ اہم اور ضروری تھی یا غریبوں کے زندہ رہنے کے لیے روٹی اور مریضوں کے لیے دوائیں۔ سرکاری علاج گاہوں کا وہ حال تھا کہ الاماں! قدم قدم پر فیس! فلاں ٹیسٹ کی پرچی اتنے کی، فلاں ٹیسٹ کی فیس اتنی!

محمود کے دفتر میں نئی بحث چھڑ گئی۔ صبح دفتر آتے ہی لوگ میٹرو بس کو کوسنے اور اپنے اپنے دکھڑے رونے لگتے۔

''کوئی حد ہے بے حسی کی۔ عوام کا پیسا بے دریغ لٹایا جا رہا ہے۔'' ایک کونے سے آواز آتی۔

''بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' تائید میں آواز سنائی دیتی۔

''نہ عام آدمی کے لیے کوئی نئی بستی آباد کی جارہی ہے نہ نئے اسکول، کالج کھولے جارہے ہیں۔ اسپتالوں میں بیماروں کو دوائیں پوری نہیں ملتیں۔ میٹرو بس کے شوقینوں کو ایک دن کسی سرکاری اسپتال میں دھکے کھانے پڑیں تو میٹرو بس کا سارا شوق ہرن ہوجائے۔'' کوئی دل جلا کہتا۔

''ارے صاحب سرکاری اسپتالوں میں تو یہ حال ہے کہ آدمی وہاں پہنچ جائے تو قدم قدم پر ذلیل ہوتا ہے۔''

''جی ہاں...... بیٹے کے سر میں مسلسل درد رہتا تھا۔ ڈاکٹر نے اسکین کروانے کے لیے پرچی دی۔ پرچی لے کر اسکین کروانے گیا تو پتا چلا فیس دینی ہوگی...... چپ چاپ واپس آگیا...... اتنے پیسے ہی نہیں تھے جیب میں۔''

''صاحب! آپ تو سرکاری ملازم ہیں۔''

''کسی روز جا کر دیکھیے...... اوقات کھل جائے گی...... ڈسپنسری کی جو کھڑکی سینئر سٹیزن کے لیے مخصوص ہے وہاں مشٹنڈوں کی قطار نظر آتی ہے۔ سرکاری ملازمین والی کھڑکی پر اسپتال کے اہلکار دوائیں بٹورتے دکھائی دیتے ہیں۔''

''خدا پوچھے گا حکمرانوں سے...... عوام کی زندگی ... دوبھر کر کے رکھ دی ہے انہوں نے۔''

''ایک تو مہنگائی!''

''جی ہاں۔''

''لوگوں کو روٹی، کپڑا، مکان میسر نہیں اور یہ میٹرو بس پر پانی کی طرح پیسا بہا رہے ہیں۔''

''ان کی کون سی اپنی جیب سے جاتا ہے...... عوام کا پیسا یا غیر ملکی قرضے ان کی اپنی جیب سے جائے تو یہ حساب رکھیں۔''

''ارے ہاں...... وہ ہاؤسنگ فاؤنڈیشن کی اسکیم کا کیا بنا؟''

گفٹ

شوہر کی سالگرہ پر بیوی شوہر سے......

''ڈارلنگ! میں کیا گفٹ دوں آپ کو۔''

شوہر۔ ''ڈیئر! بس پیار سے دیکھا کرو، عزت کیا کرو، تمیز سے بات کرلیا کرو...... بس یہی کافی ہے۔''

بیوی تھوڑی دیر خاموش رہ کر بولی۔

''نہیں، میں تو گفٹ ہی دوں گی۔''

☆☆☆

Google

''یار! میں سوچ رہا تھا کہ Google لڑکی ہے یا لڑکا؟''

''100 فیصد لڑکی ہے کیونکہ کبھی بھی آپ کو بات پورا کرنے کا موقع نہیں دیتی، پہلے ہی اپنے مشورے شروع کردیتی ہے۔''

☆☆☆

لوڈشیڈنگ

ایک انگریز پر بجلی کی تار گر گئی۔ وہ تڑپ تڑپ کر مرنے ہی والا تھا کہ لائٹ چلی گئی۔ انگریز اٹھ کر بھاگا اور نعرہ لگایا۔ ''پاکستان زندہ باد!''

مرسلہ۔ محمد قدرت اللہ نیازی، حکیم ٹاؤن، خانیوال

چکر

ایک چھوٹا بچہ۔ ''پاپا! آپ کسی لڑکی کو پیار کرتے ہیں؟''

باپ۔ ''ہاں...... تمہاری ماں سے۔''

بچہ۔ ''بڑے چالاک ہو...... گھر میں ہی چکر چلایا ہوا ہے۔''

☆☆☆

کیوں

زندگی ملتی ہے ایک بار۔ موت آتی ہے ایک بار۔ پیار ہوتا ہے ایک بار۔ دل ٹوٹتا ہے ایک بار۔ جب سب کچھ ہوتا ہے ایک بار تو پھر بجلی کیوں جاتی ہے بار بار...؟

مرسلہ۔ محمد جاوید، تحصیل علی پور

"سفید ہاتھی کہیں صاحب سفید ہاتھی ......
فاؤنڈیشن تو کسی کام کی نہیں۔ اپنے سلیم صاحب مرحوم کو دس سال پہلے جس اسکیم میں پلاٹ ملا تھا اس کا آج تک قبضہ نہیں ملا...... سلیم صاحب بے چارے پلاٹ کا قبضہ لینے کی حسرت میں دنیا سے چلے گئے اور ان کے بچے آج تک کرائے کے مکانوں میں رل رہے ہیں۔"

محمود کو خوف آنے لگا کہ کہیں ایسا نہ ہو وہ بھی سلیم صاحب کی طرح دورانِ ملازمت ہی کسی روز دنیا سے گزر جائے اور اس کے بچے کرائے کے مکانوں میں رلتے پھریں۔ اب تو شائستہ کو بھی اپنا مکان بنانے کی فکر رہنے لگی تھی۔ سرکاری مکان کی الاٹمنٹ کا خواب تو ان دونوں نے ہی کب سے دیکھنا چھوڑ دیا تھا۔

☆☆☆

انڈر پاسز کی طرح میٹرو بس منصوبہ بھی ہزار مخالفت اور تنقید کے باوجود مکمل ہو کر ہی رہا۔ منصوبے کی تکمیل کے دوران چند حادثات بھی ہوئے۔ جڑواں شہر میں زمین سے اوپر بلندی پر بنائے جانے والے ٹریک پر میٹرو بس چلنے سے بعض قدیم رہائشی علاقوں کے گھروں کی پردہ داری بھی متاثر ہوئی۔ دارالحکومت میں نباتاتی حیات بھی متاثر ہوئی۔ سبزہ ہٹنے سے شادابی بھی کم ہوئی۔ موسمی حالات کا متاثر ہونا بھی لازم ٹھہرا مگر میٹرو بس چل پڑی۔ پیدل سڑکیں عبور کرنے والوں کو ایک نیا مسئلہ درپیش آ گیا اور میٹرو بس سفر کرنے والوں کی مشکل یہ ٹھہری کہ میٹرو بس اسٹیشن پر بس سے اتر کر زمین دوز راستہ یا بلند و بالا سیڑھیاں یا خودکار زینے پر چڑھ کر اسٹیشن سے نکلو پھر اصل منزل مقصود تک لمبی مارچ پاسٹ یا سو دو سو روپے کرایہ پر ٹیکسی! میٹرو بس جوانوں اور سیر سپاٹے کے شوقینوں کے لیے تو ایک اچھی سہولت تھی۔ خودکار زینوں سے خائف بچوں اور سینئر سٹیزنز کے لیے میٹرو بس کی کوئی خاص افادیت نہ تھی۔ اس سے بدرجہا اچھی تو یورپ میں عام سڑکوں پر چلنے والی وہ مسافر بسیں ہیں جو فٹ پاتھ کے نزدیک رک کر خودکار فٹ بورڈ کے ذریعے بوڑھوں اور بچوں کو بہ سہولت بس سے اتارتی ہیں۔

میٹرو بس چلی تو شائستہ اور بچوں کو بھی میٹرو میں سیر کا شوق ہوا۔ پروگرام بنا کہ چھٹی والے دن بذریعہ وین فیض آباد جائیں۔ وہاں سے میٹرو بس میں سوار ہو کر پنڈی آخری اسٹاپ، وہاں کچھ کھانا پینا پھر واپسی اسلام آباد میٹرو کے آخری اسٹاپ تک۔ محمود کو اپنا پرانا محلہ دیکھنے کا شوق بھی چرایا۔ پرانے پڑوسی شہاب احمد سے سیکریٹریٹ میں ملاقات اور ان کا اپنے گھر آنے کی دعوت دینا بھی یاد آیا۔ اس نے شائستہ سے کہا۔ "واپسی پر شہاب صاحب کے ہاں بھی چلیں گے...... بہت اصرار سے دعوت دی تھی انہوں نے اپنے ہاں آنے کی۔"

"ٹھیک ہے...... مگر کھانے کے وقت نہیں...... اور پہلے سے بتا کر بھی نہیں...... وہ کچھ اہتمام کریں گے تو انہیں تکلیف ہوگی اور ہمیں شرمندگی...... زیادہ ہوا تو آخری اسٹاپ پر میٹرو بس سے اتر کر انہیں فون کر دیں گے کہ آ رہے ہیں...... پنڈی اتریں گے تو ان کے ہاں لے جانے کے لیے وہیں سے کیک، مٹھائی کچھ لے لیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔" محمود نے تائید کی۔

بچے میٹرو بس میں سفر کے پروگرام سے بہت خوش تھے۔

☆☆☆

چھٹی والے دن محمود، شائستہ اور بچے حسب پروگرام میٹرو بس میں سفر کے لیے نکلے۔ ٹیکسی لے کر شہزاد ٹاؤن سے فیض آباد پہنچے۔ طویل اور بلند آہنی زینے سے اوپر رسائی ہوئی۔ شائستہ نے قطار میں لگ کر ٹکٹ خریدے۔ بس آئی تو کھچا کھچ بھری ہوئی۔ کمیٹی چوک تک ان میں سے کسی کو بیٹھنے کو جگہ نہ مل سکی۔ تاہم بچے میٹرو میں سفر کرتے ہوئے نہایت ایکسائیٹڈ تھے۔ علی اور وقاص جو محمود کے ساتھ مردانہ حصے میں تھے گردنیں اچکا اچکا کر ماں اور چھوٹی بہن کو اشارے کرتے رہے۔ پنڈی کے بعض حصوں سے بس کے گزرتے ہوئے بعض گھروں کے اندرونی حصے تک دکھائی دینے پر شائستہ نے سوچا۔ "ان بے چاروں کی تو بہت بے پردگی ہو گئی۔"

آخری اسٹاپ پر بس سے اترنے کے بعد حسب پروگرام بینک روڈ پر باجماعت چہل قدمی کی گئی۔ شائستہ نے ایک دکان پر سیل دیکھ کر فرشتہ کے لیے سینڈلز خرید لیے۔ سموسوں کی ایک دکان کے فیملی سیکشن میں بیٹھ کر سموسہ چاٹ کھائی گئی اور اپنی اپنی پسند کی سافٹ ڈرنک پی گئی۔ باہر نکلے تو بچوں کی فرمائش پر ایک آئس کریم شاپ سے آئس کونز خریدی گئیں۔ شہاب صاحب کے گھر لے جانے کے لیے ایک بیکری سے دو پونڈ وزن کا کیک خریدا۔ دوبارہ ...... اسلام آباد جانے کے لیے ٹکٹ خریدے گئے۔ بس میں سخت دھکم پیل کے بعد بالآخر شائستہ کو سیٹ مل ہی گئی۔ فرشتہ کو اس نے اپنے زانوؤں پر لٹکا لیا۔ ساتھ بیٹھی ہمسفر بار

بارنا گواری سے پہلو بدلتی رہی۔ میٹرو اسٹاک ایکسچینج اسٹاپ پر رکی تو مردانہ حصے سے محمود کی آواز سنائی دی۔ ”فرشتہ بیٹے! ماں سے کہنا پریڈ گراؤنڈ اتریں گے۔“

”کہہ دو ٹھیک ہے۔“ شائستہ نے فرشتہ سے کہا۔

”ٹھیک ہے پاپا۔“ فرشتہ نے گردن موڑ کر جواب دیا۔

پریڈ گراؤنڈ اسٹیشن پر بس سے اترنے کے بعد سیڑھیاں چڑھ کر اسٹیشن سے باہر نکلے اور پیدل چلتے ہوئے اپنے سابقہ رہائشی علاقے کی طرف چلے۔

”پاپا جی دیکھیں یہ نئی فٹ پاتھ بن گئی ہے۔“ علی نے محمود کو بتایا۔

”ہاں جب ہم یہاں تھے تب تو نہیں تھی۔“

”پاپا! وہ دیکھیں وہ بلڈنگ بھی نئی بنی ہے۔“ وقاص نے ... لب سڑک واقع ایک عمارت کی طرف انگلی اٹھائی۔

”بلڈنگ پرانی ہے بیٹا رنگ روغن نیا ہوا ہے۔“ محمود نے کہا۔

باتیں کرتے وہ اپنے سابقہ محلے میں آپہنچے۔ اپنے سرونٹ کوارٹر کی طرف نہایت اشتیاق سے دیکھا، محمود نے ایک دو شناساؤں سے علیک سلیک کی۔ بچوں کے ایک دو دوست بھی دکھائی دیے جو انہی کی طرح قد نکال چکے تھے۔ شہاب احمد اور ان کے اہلِ خانہ پرانے محلہ داروں کی آمد پر نہایت خوش ہوئے۔

چائے پی جارہی تھی کہ ایک اور سابق پڑوسن شائستہ کی آمد کی خبر سن کر اس سے ملنے کے لیے مع عیال چلی آئیں۔ خواتین باتوں میں لگ گئیں۔ بچے اپنی اپنی دلچسپیوں میں۔ کسی نے موبائل پر گیم کھیلنا شروع کردیا۔ کوئی کمپیوٹر کے سامنے براجمان ہوگیا۔ کوئی بلا لے کر کوئی گیند اچھالتا گھر کے صحن میں۔ شہاب احمد سے ان کے کوئی شناسا ملنے کے لیے آگئے۔ محمود نے ان کی بات چیت میں حارج ہونا مناسب نہ سمجھا اور شہاب احمد سے بولا۔ ”میں ذرا باہر کا چکر لگا کر آتا ہوں شہاب صاحب۔“

”پرانی یادیں تازہ کرنا چاہتے ہیں۔“ شہاب احمد مسکرائے۔

”جی ...... یہی سمجھیے۔“

”فی امان اللہ۔“

محمود گھر سے باہر نکل آیا۔ اسٹریٹ کے نکڑ تک پہنچا اور ٹھٹک کر پیش منظر کا جائزہ لینے لگا۔ سڑک کے موڑ پر وہ کھوکھا جس سے سارا محلہ ہی روزمرہ ضرورت کی خریداری کیا کرتا تھا غالباً کسی سرکاری کارروائی کے نتیجے میں حرفِ غلط کی طرح مٹ چکا تھا۔ محمود سڑک کے کنارے کنارے چلنے لگا۔ اسٹیٹ لائف بلڈنگ تک پہنچا۔ بائیں ہاتھ پر مڑا اور پختہ فٹ پاتھ پر چلتا موڑ تک جا پہنچا۔ بہت عرصے بعد اس کا اس طرف آنا ہوا تھا۔ اس کی عادت تھی جس راستے پر کام نہ ہوتا اس کا بلاوجہ قصد نہ کرتا۔ آج بھی بچوں نے میٹرو بس میں سفر کی فرمائش نہ کی ہوتی تو شاید آج بھی نہ آنا ہوتا۔ فٹ پاتھ کے موڑ پر ٹھٹک کر اس نے دائیں، بائیں اور سامنے دیکھا۔ سب کچھ بدل گیا تھا۔ انڈر پاس، چوڑی چوڑی سڑکیں، پختہ فصیلیں، میٹرو بس راہداری جس نے گرین بیلٹ کو نگل لیا تھا۔ تاحد نظر بلند و بالا عمارتیں، سڑکوں پر تیز رفتاری سے دوڑتی گاڑیاں، پولی کلینک جو پہلے کی طرح نزدیک نہیں دور دکھائی دیتا تھا اور وہ بھی پورا نہیں۔ ترقیاتی منصوبوں نے نہایت ضروری مقامات تک رسائی میں بھی رکاوٹیں حائل کردی تھیں۔ محمود کو بہت سی سوچوں اور فکروں نے آگھیرا۔ ”بڑے لوگوں کا تو خیر کوئی مسئلہ نہیں ...... آس پاس سرکاری مکانوں اور کوارٹروں میں رہنے والے بچے جو صبح صبح پیدل ہی اپنے اسکولوں کو جایا کرتے تھے اب کیونکر جاتے ہوں گے ...... ارے ہاں وہ تو اب بڑے ہوچکے ہوں گے علی، وقاص اور فرشتہ کی طرح ...... مگر ان کے بعد آنے والے؟ بچوں کا یہی تو ہے ...... چھوٹے بڑے ہوجاتے ہیں ...... بڑوں کی جگہ چھوٹے لے لیتے ہیں ...... بوڑھے لوگ اتنی چوڑی اور خطرناک سڑکیں کیونکر پار کرتے ہوں گے ...... ادھر سے کار ادھر سے موٹر سائیکل ...... یا پیادہ مریضوں کو تو آس پاس کے علاقوں سے پولی کلینک جانے آنے میں بڑی مشکل ہوتی ہوگی ...... بوڑھے مریض، حاملہ خواتین، تیز بخار یا کسی ایمرجنسی سے دوچار بچے ...... سب کے پاس گاڑیاں تھوڑی ہوتی ہیں کہ بیٹھے اور پہنچ گئے ......“ محمود بہت دیر فکروں میں غلطاں کھڑا رہا اور کچھ ہی دور واقع بلند و بالا ایوانوں کے مکین اس کی فکروں سے بے نیاز و بے خبر اپنے مصاحبوں کے راگ سنتے اور سر دھنتے رہے۔ بے چارے محمود کی تڑپن کا احساس تو انہیں تب ہوتا جب انہیں زندگی کے مسائل کا اپنی اس رعیت کے ایک عام آدمی کی طرح سامنا ہوتا جس کے کندھوں پر سوار ہوکر وہ قصرِ شاہی تک پہنچے تھے۔

ایوانِ بالا کو جانے والے چوڑے چکلے، صاف ستھرے راستے کو ایک نظر دیکھتے ہوئے محمود نہایت دکھے دل سے واپس پلٹا۔ اسے ہر روز اپنے دفتر میں بکتے جھکتے اور زندگی سے سخت ناراض لوگوں کی باتیں یاد آنے لگیں۔

ٹھیک ہی تو کہتے تھے وہ لوگ...... جس ملک میں عوام کو زندگی کی بنیادی سہولتیں بھی دستیاب نہ ہوں...... روٹی، کپڑا اور مکان ایک دلکش اور پُرسحر نعرہ بن کر رہ جائے...... جہاں نصف سے زائد آبادی خطِ غربت سے نیچے زندگی گزارنے پر مجبور ہو...... ستر فیصد سے زائد عوام پینے کے صاف پانی سے بھی محروم ہو...... نکاسی آب کا مناسب بندوبست نہ ہو...... انسانوں کے پیٹ سے نکلنے والی غلاظت گھروں کے اندر ہی زیرزمین ناقص سیپٹک ٹینکوں میں رہ کر داخلی راستے ہی سے تعفن اور جرثوموں کی افزائش کا باعث بنے...... ملک کے بڑے شہروں میں ہی نہیں دارالخلافہ اور اس کے جڑواں شہر میں بھی کچرے کے ڈھیر دکھائی دیں...... قبل از برسات نالوں کی نام نہاد صفائی سے کیچڑ میں لتھڑے پولی تھین بیگز کے پہاڑ کھڑے ہوجائیں...... عوام کو بجلی نہ ملے مگر بل ہوشربا آتے ہوں...... گیس کی عدم فراہمی ٹھنڈے چولہوں کو روتی خواتین کو سڑکوں پر نکل آنے پر مجبور کردے...... جہاں آٹھ ہندسوں میں بچوں کی تعداد بنیادی تعلیم سے بھی محروم رہے...... تعلیمی اداروں کی حالتِ زار دیکھ کر رونا آئے...... بیماروں، ناداروں کو سرکاری اسپتالوں میں بھی قدم قدم پر ادائیگی کی پرچیاں ملیں...... غریب آدمی علاج معالجہ کی استطاعت نہ رکھنے کے باعث بے علاج ہی مرجائے...... جل کمبیوں کی طرح ادارے تو بہت ہوں مگر کارکردگی صفر...... سرکاری ملازمین کی آبادکاری کا ادارہ دس سال میں بھی ایک سیکٹر کو پورے طور پر آباد نہ کرپائے...... ایک عام سرکاری ملازم اپنا اور بال بچوں کا پیٹ کاٹ کر ممبر شپ لے اور پلاٹ حاصل کرکے اپنا گھر بنانے کا خواب دیکھتے دیکھتے قبر میں جاسوئے...... جہاں عام آدمی کو زندگی نعمت نہیں جبرِ مسلسل لگے سزا اور عذاب محسوس ہو...... وہاں میٹروبس جیسے منصوبوں پر خطیر سرمایہ کاری اور اسے انقلاب قرار دینا خود ستائی اور رعایا فریبی نہیں تو پھر کیا ہے؟

اپنی سوچوں میں گم، بوجھل دل کے ساتھ محمود جی ٹائپ مکانوں کے درمیان اس ذیلی سڑک کی طرف جانکلا جو اس علاقے میں اس کی رہائش کے زمانے میں اس کی آمدورفت کا راستہ رہی تھی۔ کئی سال تک وہ اسی راستے سے اپنے دفتر پیدل آتا جاتا رہا تھا۔

برسوں بعد آج اس راستے پر قدم پڑتے ہی وہ دم بخود رہ گیا۔ اسے لگا وہ راستہ بھول گیا تھا۔ یہ وہ راہ گزر تو نہیں تھی جہاں سے وہ گزرا کرتا تھا...... نہیں...... تھی تو وہی راہ گزر...... اس راستے کو وہ بھلا کیسے بھول سکتا تھا۔ وہی مکان...... اور ان مکانوں کے باہر ایستادہ سرو اور کچنار کے ساکت و صامت درخت...... مگر نہ گھروں کے باہر پھولوں کی کیاریاں تھیں...... نہ کرکٹ کھیلتے، سائیکلنگ کرتے اور ہر آتے جاتے کو گرمجوشی سے سلام داغتے بچے...... کبھی سرمگیں دکھائی دینے والی سڑک خاک آلودہ تھی...... ریت ہی ریت...... شاید کسی انڈر پاس کی تعمیر کے لیے ہونے والی کھدائی کی باقیات جسے انڈر پاس مکمل ہونے کے بعد صاف کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی گئی تھی...... اور خاک بسر سڑک پر آوارہ گردوں کی طرح بھٹکتے ڈھیروں سوکھے پتے...... اس خاک آلودہ سنسان سڑک پر واحد ذی نفس محمود تھا۔

وہ ایک گہرے اور ناقابلِ بیان صدمے کی کیفیت میں اس راہ سے گزرا اور شہاب احمد کے گھر واپس چلا آیا جہاں شائستہ اور بچے اس کے منتظر تھے۔

☆☆☆

اس روز جب وہ دفتر کا وقت ختم ہونے کے بعد اپنی موٹر سائیکل پر روزانہ کے راستے سے گھر جانے کو نکلا تو سرینہ سے آگے راستہ بند ملا۔ پولیس اہلکار جابجا چوکنا کھڑے تھے اور پیدل چلنے والوں کو اس درجہ حقارت سے اِدھر اُدھر ہنکال رہے تھے جیسے وہ انسان نہیں بھیڑ بکریاں ہوں اور ہنکالے جانے والے بھی بنا کسی مزاحمت کے اِدھر اُدھر یوں دبک رہے تھے جیسے یہی ان کا مقدر ہو۔ راستہ کھلنے کا انتظار کرتی ان گنت گاڑیوں کے ہجوم میں محمود بھی اپنی موٹر سائیکل روک کر کھڑا ہوگیا۔ دفعتاً ٹریفک کے اس ہجوم میں پچھلی صفوں میں کہیں ایک ایمبولینس اپنا ہنگامی سائرن بجاتی آرکی۔ سائرن کی بیتابی کہتی تھی اسے راستہ دیا جائے...... شاید کوئی جاں بہ لب مریض...... شاید کوئی زخمی...... شاید فوری طبی امداد کا طلب گار کوئی بیمار...... یا شاید کوئی میت...... جو بھی تھا سائرن کی درد بھری آواز دل کے آرپار ہوئی جاتی تھی۔ محمود نے گردن موڑ کر دیکھا تو انتہائی بے کلی سے رقصاں ایمبولینس کی سرخ روشنی والی بتی کے سوا کچھ نہ دیکھ پایا۔ ایمبولینس شور مچاتی رہی...... روٹ لگا رہا...... وی آئی پی سواری گزرنے کے بعد راستہ کھلا تو ہر ایک کو پہلے گزرنے کی پڑی تھی۔ ایمبولینس کسی فریادی کی طرح نالہ کناں پہلے نکلنے کو راہ مانگتی رہی۔ محمود حسبِ عادت احتیاط سے موٹر سائیکل چلاتا اپنے روزمرہ کے راستے پر آیا تو اس نے ایمبولینس کو

تیزی سے آگے نکلتے دیکھا لیکن شہزاد ٹاؤن موڑ سے کچھ ہی آگے جا کر ایمبولینس ایک دھچکے سے یک لخت رک گئی۔
محمود نے موڑ کاٹنے سے قبل موٹر سائیکل روک لی اور تجسس سے ایمبولینس کی طرف دیکھنے لگا۔ ایمبولینس کا اگلا دروازہ کھول کر ڈرائیور کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھا شخص نہایت تیزی سے باہر نکلا اور اس نے ایمبولینس کا عقبی سلائیڈنگ دروازہ بے تابی سے کھولا۔ ایمبولینس ڈرائیور بھی نیچے اتر آیا تھا۔ عقبی حصے سے ایک عورت سینہ کوبی کرتی ایمبولینس سے باہر نکلی اور آسمان کی جانب اپنا چہرہ کر کے آہ و بکا کرنے لگی۔ لوگ ایمبولینس کے نزدیک رکنے لگے محمود بھی وہاں جا پہنچا۔ زندگی کی صعوبتوں سے آزاد ہو جانے والی میت کا منہ چادر سے ڈھانپا جا چکا تھا۔ محمود کے استفسار پر پتا چلا ایمبولینس میں سوار مرد اور عورت کا جوان بیٹا تھا جسے امراضِ قلب کے اسپتال لے جایا جا رہا تھا مگر اس کا دل ہی ساتھ چھوڑ گیا...... حاکمِ وقت کے قافلے کو پروٹوکول دیا جانا نہایت ضروری تھا۔
محمود گھر پہنچا تو خلافِ معمول بے حد تھکا تھکا سا دونوں ہاتھ اپنے گھٹنوں پر رکھتے ہوئے لاؤنج میں پڑے تخت کے کنارے پر بیٹھ گیا۔ شائستہ جو ایک اچھی بیوی کی طرح شوہر کا چہرہ دیکھتے ہی اس کے دل کی کیفیت بھانپ لینے کا وصف رکھتی تھی قدرے تشویش سے بولی۔ ''خیریت؟''
محمود نے ہاتھ کے اشارے سے اسے اطمینان دلایا۔ وہ لپک کر پانی کا گلاس لے آئی۔ ''طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' اس نے محمود کو پانی کا گلاس تھما کر اس کی پیشانی کو چھوا۔
محمود نے گلاس سے پانی کا ایک گھونٹ بھرا پھر ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے بڑی درماندگی سے بولا۔ ''بھلیے! نوکری کی مجبوری ہے ورنہ اب اس شہر میں رہنے کو جی نہیں چاہتا۔''
''کیوں!'' شائستہ چونکی۔ ''کیا ہوا؟'' اس نے تشویش سے محمود کو دیکھا۔
محمود نے ایک نظر اسے دیکھا۔ پانی کا گلاس ایک طرف رکھا اور شائستہ کا ہاتھ تھام کر اسے اپنے پاس بٹھاتے ہوئے نہایت دل گرفتہ لہجے میں بولا۔ ''جہاں میٹرو چلے مگر ایمبولینس کے گزرنے کے لیے راستہ نہ بنایا جائے...... حکمرانوں کی سواریاں گزرنے پر عوام کو غلام بنا کر کھڑا کر دیا جائے...... جہاں بڑے لوگوں کے پینے کا پانی باہر ملکوں سے آئے اور ہم جیسوں کو نلکوں سے بھی صاف پانی نہ ملے...... جہاں عام آدمی کو بجلی اور گیس بھی اس کی ضرورت کے مطابق نہ ملے...... جہاں انصاف بکتا ہو...... درخت کاٹ دیے جائیں...... پھول کم ہو جائیں...... اور اندھیری رات میں طالب علموں پر گولیاں برسانے کا حکم دینے والا سر آنکھوں پر جگہ پائے...... وہاں کس کا جی چاہے گا رہنے کو!''
برسوں کی رفاقت نے شائستہ کو شوہر کا مزاج آشنا بنا دیا تھا۔ وہ سمجھ گئی آج کوئی خاص بات ہوئی تھی...... کوئی غیر معمولی بات...... جس نے محمود کو اس درجہ دل گرفتہ کر دیا تھا...... اتنا دکھی تو وہ سرکاری مکان کی الاٹمنٹ کا کیس ہارنے پر بھی نہیں ہوا تھا...... وہ تو فطرتاً بڑا صابر اور تحمل مزاج آدمی تھا۔
''کیا ہو گیا ہے جو آپ آج ایسی باتیں کر رہے ہیں؟'' شائستہ نے نہایت فکرمندی سے اسے دیکھا۔
''بھلیے!'' محمود کی آواز میں درد تھا۔ ''برسوں پہلے جب میں گاؤں سے پہلی بار اسلام آباد آ رہا تھا تو یار لوگ منع کرتے تھے کہ نہ جا...... اسلام آباد مردہ شہر ہے...... بیس بائیس سال گزار کر پتا چلا کہ شہر آبادی کم ہونے، سڑکوں پر ٹریفک کا رش نہ ہونے یا سرِشام لوگوں کے گھروں میں بند ہو کر بیٹھ جانے سے مردہ نہیں ہوتے...... شہر تو اس وقت مردہ ہوتے ہیں جب حکمرانوں کے دل پتھر ہو جائیں...... خوفِ خدا ان کے دل سے نکل جائے...... عوام کی ضرورتوں اور بنیادی مسائل کا انہیں احساس نہ رہے...... جوان اولاد کی موت پر سینہ پیٹتی ماں کی آہ و زاری ان کی پروٹوکول گاڑیوں کے شور میں دب کر رہ جائے...... ان کے مصاحب ''سب اچھا ہے'' کا بھنگڑا ڈال کر انہیں خوش کرتے رہیں اور غریب عوام اپنے نصیبوں پر نوحہ کناں رہے...... حکمران بھول جائیں کہ ہر شخص کو ایک دن خدا کے سامنے اپنی رعیت کے لیے جوابدہ بھی ہونا ہے۔ وہ بھول جائیں کہ انہیں بھی مرنا ہے۔'' محمود بولتا ہی چلا گیا۔ اس کے منہ سے نکلنے والے بیشتر الفاظ اعادہ تھے ان الفاظ کا جو وہ اپنے دفتر میں ساتھیوں سے سنتا رہتا تھا...... الفاظ اس کا پیچھا کرتے اس کے گھر تک آ پہنچے تھے۔
محمود کی شریکِ زندگی شائستہ کی دائیں آنکھ کی بالائی پلک پر ایک قطرۂ آب ستارے کے مانند کوندا اور شائستہ نے اسے بڑی نزاکت، احتیاط اور رازداری سے اپنی دائیں انگشتِ شہادت کی نوک پر لے لیا۔

قسط:7

شیش محل

اسماء قادری

جہاں پر انسان کی بے بسی کی انتہا ہو... وہیں سے ربِّ جلیل کی رحمتوں کی ابتدا ہوتی ہے۔ یہ بات کبھی اس نے بچپن میں سنی تھی مگر حادثات و واقعات اور طبقاتی کشمکش میں گھری مختصر سی فانی زندگی کے پیچ و خم میں الجھ کر اسے کچھ یاد نہ رہا.. اسے نہیں معلوم تھا کہ یکسانیت سے بے زار اور تنوع کے متلاشی لوگ معزز اور بلند مقام کے حصول کی خاطر خود کو کتنی پستی میں گرا لیتے ہیں۔ وہ ذہین وفطین نوجوان بھی آنکھوں میں خوش امیدی کے خواب لیے راہ میں پلکیں بچھائے اس کا منتظر رہتا تھا لیکن ناکام آرزوئوں اور ناآسودہ تمنائوں کے انجام نے اس کے مندمل زخموں کو لہو لہو کردیا... راکھ میں دبی چنگاری نے اس کے تمام ارادوں کو خاکستر کر ڈالا۔ دل کی بے ترتیب دھڑکنوں کے ساز کے درمیان جو خوش امیدی کبھی اس کی زندگی کا حصہ تھی اب نہ تو وہ خوش دکھائی دیتا تھا اور نہ ہی کسی کی آنکھ میں اس کے لیے کوئی امید باقی تھی۔ جانے یہ زندگی کا کونسا موڑ تھا... وہ تو شیش محل کے ہر منظر میں محبوب کی مسکراتی آنکھوں کے جلتے دیپ میں اپنے عکس کو دیکھنے کا عادی تھا... کھلتے گلابوں اور محبتوں کی برستی پھوار میں خود کو بھیگا محسوس کرتا تھا کہ اچانک اس شیش محل میں ہر جانب لپکتے شعلوں کی جھلک دکھائی دی تو احساس ہوا کہ وہ لوگوں کے ہجوم میں کس قدر تنہا ہے... جسے وہ اپنا ہمسفر اور رفیق سمجھتا رہا اس سے بڑا رقیب کوئی نہ نکلا۔

اسرار و تحیر کے پردوں میں ملفوف سطر سطر رنگ بدلتی وارداتِ قلبی کی عکاس دلچسپ داستان

فاروق کی آنکھ کھلی تو اردگرد کے مخصوص ماحول نے اسے باور کروادیا کہ وہ کسی اسپتال کے کمرے میں موجود ہے۔ فوری طور پر اسے یاد نہیں آیا کہ وہ یہاں کیوں موجود ہے، بس سر میں اٹھتی ٹیسیں تھیں جو اسے احساس دلارہی تھیں کہ وہ کسی حادثے کا شکار ہوکر اسپتال پہنچا ہے۔

''مسٹر فاروق کو ہوش آگیا ہے، میں ڈاکٹر کو بلاتی ہوں۔'' ابھی وہ خود کو پیش آنے والے حادثے کے بارے میں کچھ سوچ نہیں پایا تھا کہ کمرے میں ابھرنے والی دھیمی سی آواز نے احساس دلایا کہ اس کمرے میں اس کے سوا کوئی اور بھی موجود ہے۔ اس نے بائیں جانب گردن گھما کر آواز کے ماخذ کی سمت دیکھا۔ یہ جملہ ادا کرنے والی کیتھرائن تھی اور اس کا مخاطب ربن تھا جس نے کیتھرائن کی بات کے جواب میں محض اپنا سر ہلایا اور گدی دار بینچ سے اٹھ کر فاروق کی طرف بڑھا۔ وہ بستر کے قریب آکر کھڑا ہوا تو فاروق نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں سرخی ہے۔

''کیسا ہے رے تو؟ جاستی درد تو نہیں ہورہا؟'' اس کے مخصوص کھردرے لہجے میں جو محبت تھی اسے فاروق محسوس کرسکتا تھا۔

''میں ٹھیک ہوں پر ٹھیک سے یاد نہیں آرہا کہ یہاں کس وجہ سے لایا گیا ہوں۔'' تکلیف کو نظر انداز کرکے اس نے اپنی الجھن کا اظہار کیا۔

''آجائے گا یاد بھی۔ کاہے کی جلدی ہے۔'' ربن نے اسے ٹالا۔ اسی وقت کیتھرائن ڈاکٹر کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی۔

''اب آپ کیسا فیل کررہے ہیں؟'' ڈاکٹر نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ کے ساتھ اس سے پوچھا اور پھر اس کا معائنہ کرنے لگا۔

''سر میں زیادہ درد تو نہیں ہے؟'' اس کی آنکھوں کے پپوٹوں کو الٹ کر دیکھتے ہوئے ڈاکٹر نے دریافت کیا۔

''تھوڑی تھوڑی دیر میں ٹیسیں سی اٹھ رہی ہیں۔'' اس نے بتایا۔

''ایسا چوٹ کی وجہ سے ہورہا ہے۔ ابھی زخم تازہ ہے اس لیے تکلیف دے رہا ہے۔ پر فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ زیادہ گھبراؤ نہیں ہے، جلد بھر جائے گا۔'' اپنے کام کو جاری رکھتے ہوئے ڈاکٹر نے اسے تسلی دی پھر طبی اصطلاحات میں کیتھرائن کو ہدایات دینے لگا۔ کیتھرائن کو اس کی سابقہ تکلیف کی وجہ سے تشویش تھی کہ سر پر لگنے والی یہ نئی چوٹ کہیں مسئلہ نہ بن جائے لیکن ڈاکٹر کو اطمینان تھا کہ ایسا کچھ نہیں ہے۔ اس کے مطابق لگنے والی چوٹ نے وقتی طور پر تو شاک لگایا تھا لیکن ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی جو پیچیدگی کا سبب بنتی۔

''میری رائے کے مطابق تو ان کی حالت تسلی بخش ہے۔ ٹیسٹوں کی رپورٹ آجائے تو آپ کا رہا سہا شک بھی دور ہوجائے گا۔ اس بیچ آپ انہیں پابندی سے میڈیسن دیتی رہیں۔ میں نے بمبئی میں مسٹر فاروق کے ڈاکٹر سے ڈسکس کرنے کے بعد ہی ان کے لیے دوائیں تجویز کی ہیں۔'' ادھیڑ عمر ڈاکٹر نے بہت تسلی سے کیتھرائن کے سارے شکوک و شبہات دور کرنے کی کوشش کی پھر فاروق کے بازو پر ہلکی سی دوستانہ تھپکی دیتے ہوئے باہر کا رخ کیا۔

''شکنتلا اور اس کے باپ کو ہوٹل فون کرکے بتادے کہ فاروق اب ہوش میں ہے۔ آکر اس سے مل جائیں۔ بے چارے مروت میں اپنا سفر کھوٹا کیے بیٹھے ہیں۔'' ڈاکٹر چلا گیا تو ربن نے کیتھرائن کو حکم دیا۔ اس کے منہ سے شکنتلا کا نام سنتے ہی فاروق کو بہت کچھ یاد آگیا۔ وہ شکنتلا کا پرس چھین کر بھاگنے والے اچکے کے پیچھے ہی تو بھاگا تھا جو ایک پتھر سے ٹھوکر کھا کر گر گیا تھا اور سر پر لگنے والی چوٹ نے بے ہوش کردیا تھا۔

''شکنتلا کا پرس چھیننے والا اچکا پکڑا گیا یا نہیں؟'' اس نے بے قراری سے ربن سے دریافت کیا۔

''بھاگ کر کدھری جائے گا۔ پکڑا تو جانا ہے اس نے۔'' ربن نے بے پروائی سے اس کی بات کا جواب دیا۔ فاروق سمجھ گیا کہ فی الحال وہ اسے کچھ بتانے کے موڈ میں نہیں ہے، اس نے بھی اصرار نہیں کیا اور نیا سوال داغا۔

''شکنتلا اور اس کے فادر تو بمبئی کے لیے فلائٹ لینے والے تھے پھر ابھی تک ہوٹل میں کیوں ہیں؟''

''تیری وجہ سے رک گئے۔'' ربن نے اسے جواب دیا۔

''شکنتلا کے پرس میں اچھی خاصی رقم اور زیور تھا۔ انہیں اس کی بھی فکر ہوگی۔ میں اس اچکے کو ہرگز بھی پرس لے جانے نہیں دیتا لیکن عین وقت پر قسمت دھوکا دے گئی۔'' اس نے افسوس کا اظہار کیا۔

''رقم اور زیور کا مسئلہ نہیں ہے، پر اپنے کو اس اچکے کو چھوڑنے کا بھی نہیں ہے۔ تو ادھری اسپتال میں نہ پڑا ہوتا تو اپن پہلے اس کا حساب کتاب کرتا۔'' ربن کی کہی اس بات پر اسے ذرا بھی شک نہیں تھا وہ اس کی اپنے لیے محبت سے بھی واقف تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ وہ کیسا نڈر اور باعمل آدمی ہے جو یونہی کوئی بات نہیں کہتا بلکہ جو کہتا ہے اس کو پورا کر

دکھانے کی پوری پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ ''تیرے سر پر پھر چوٹ لگ گئی تھی اس لیے اپن ٹینشن میں آ گیا تھا، پر اب ڈاکٹر نے تیرے سامنے ہی بولا ہے کہ فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ تیرے کو ادھر سے چھٹی مل جائے تو اپن شملہ چلتے ہیں۔ اپنے کو بھی واپس بمبئی لوٹنے کا ہے، ادھر بھی سالا بہت کچھ الٹا پڑا ہے۔'' اس کی آنکھوں کی لالی میں بہت سی فکریں ڈول رہی تھیں۔

''میری مانو استاد تو یہیں سے واپس پلٹ جاؤ۔ میں کوئی اکیلا تو ہوں نہیں۔ گولو اور کیتھرائن ہیں میرے ساتھ۔ پھر جانا بھی سیٹھ کی گاڑی میں ہے۔'' فاروق نے اپنے طور پر اس کی پریشانی کم کرنے کی کوشش کی۔

''تیرے کو معلوم ہے، اپن کوئی کام ادھورا نہیں چھوڑتا۔ اپن نے تیرے کو خود شملہ پہنچانے کا بولا تھا تو پہنچا کر ہی واپس جائے گا۔'' ربن نے دوٹوک لہجے میں اسے جواب دیا۔ اس کے اس انداز کے بعد فاروق کے پاس بحث کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی اس لیے اس بات کو چھوڑ کر التجا آمیز لہجے میں بولا۔

''ہوٹل جا کر تھوڑی دیر آرام ہی کر لو۔ پتا نہیں کب سے نیند نہیں لی ہے۔ مانا کہ بہت ہمت والے ہو، پر ہو تو گوشت پوست کے آدمی ہی اور آدمی کو آرام کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔''

''اپنے کو سب معلوم ہے رے۔ اپن بھی خود کو اپنے کو اپنی برداشت سے بڑھ کر کٹھنائی میں نہیں ڈالتے۔'' ربن نے اسے جواب دیا اور دروازے سے داخل ہوتی کیتھرائن کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''فون کر دیا سیٹھ کو؟''

''جی، وہ لوگ ہاسپٹل آ رہے ہیں۔ میں فون کرنے کے بعد ذرا ہاسپٹل کی لیبارٹری چلی گئی تھی تاکہ پتا کر سکوں کہ مسٹر فاروق کے ٹیسٹوں کی رپورٹ آنے میں کتنا وقت لگے گا۔ وہیں پر تھوڑا ٹائم لگ گیا۔'' اس نے تفصیل سے جواب دیا۔

''پھر کیا بولا لیبارٹری والوں نے؟'' ربن کو تجسس ہوا۔

''کل دوپہر تک کا ٹائم لگے گا۔'' اس نے بتایا۔

''ان سے ریکویسٹ کریں سسٹر کہ رپورٹ جلدی دے دیں ہمیں شملہ بھی جانا ہے۔'' فاروق نے بے صبری کا مظاہرہ کیا۔

''ایسا پاسیبل نہیں ہے مسٹر فاروق۔'' کیتھرائن نے اسے نرمی سے جواب دیا۔

''کاہے کو اتنی جلدی مچا رہا ہے ہیرو۔ اپنے کو بمبئی لوٹنے کی فکر ہے پر تیرے سے بڑھ کر نہیں۔ بمبئی میں اپنے پاس ایک اڈے کی گدی ہی ہے نا، پر تیرے کو دل کی بولیں...... اگر اپنے کو جا کر برطانیہ کے تخت پر بھی بیٹھنا ہوتا تو اپن تیرے آگے اس کی بھی پروا نہیں کرتے۔ پر تو اس بات کو سمجھتا نہیں ہے اور بار بار غیریت دکھا کر اپنے دل کو تکلیف پہنچاتا ہے۔'' کیتھرائن کے نرم لہجے کے مقابلے میں ربن کا لہجہ خاصا تلخ تھا لیکن اس تلخی میں جو محبت چھپی تھی اسے فاروق اچھی طرح پہچانتا تھا، سو اپنے طرزِ عمل پر خود ہی شرمندہ ہو گیا۔ وہ تو بس ربن کو مزید زحمت سے بچانا چاہتا تھا لیکن اسے یہ بات سمجھ لینی چاہیے تھی کہ اس طرزِ عمل سے ربن کے بے پناہ خلوص کو دھچکا لگے گا۔ اس نے چاہا کہ اپنے رویے پر معافی مانگ لے، پر یہ سوچ کر رک گیا کہ کہیں یہ چیز بھی اس کے لیے تکلیف کا باعث نہ بن جائے۔

''آپ تھوڑا سا کچھ کھا پی لیں مسٹر فاروق۔ اس کے بعد مجھے آپ کو دوائیں کھلانی ہوں گی۔'' کمرے کی فضا بدلنے کے لیے کیتھرائن نے غیر محسوس طور پر دخل اندازی کی اور اس سے پوچھنے لگی کہ وہ اس وقت کیا کھانا پسند کرے گا۔ ڈاکٹر نے اس کے لیے فی الحال نرم اور رقیق غذا تجویز کی تھی۔ کیتھرائن کی گنوائی ہوئی اشیا میں سے فاروق نے دودھ اور بسکٹ کے لیے ہامی بھر لی۔ کیتھرائن نے اسے سہارا دے کر تکیوں کی مدد سے بٹھا دیا۔ فاروق اس کے سہارے کی ضرورت محسوس نہیں کر رہا تھا لیکن اس کی پیشہ ورانہ ذمے داریوں میں رکاوٹ ڈالنا مناسب نہ سمجھا کہ مبادا اسے بھی ربن کی طرح برا لگ جائے۔

دودھ اور بسکٹ پر مشتمل ہلکے کھانے کے بعد کیتھرائن نے اسے دوائیں دیں۔ وہ دوائیں کھا کر دوبارہ لیٹا ہی تھا کہ شکنتلا اور انوپم اگروال چلے آئے۔ دونوں نے بہت خلوص سے اس کی طبیعت کے بارے میں دریافت کیا۔ اس نے انہیں بہتر ہونے کے بارے میں بتایا۔ ربن نے بھی ڈاکٹر کی تسلی آمیز گفتگو سے آگاہ کرتے ہوئے مشورہ دیا کہ وہ فاروق کی طرف سے بے فکر ہو کر بمبئی کے لیے روانہ ہو جائیں کیونکہ وہ لوگ خود بھی کل شملہ روانہ ہونے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس نے فاروق کے ٹیسٹوں اور ان کی رپورٹس سے متعلق کوئی بات نہیں چھیڑی تھی جس سے فاروق نے اندازہ لگایا کہ ربن ان لوگوں کے جلد از جلد بمبئی لوٹ جانے کے حق میں ہے۔

تھوڑی دیر میں سیٹھ نے بمبئی کے لیے ٹکٹ بک

کروانے جانے کا عندیہ دیا تو ظاہر ہو گیا کہ ربن اپنی کوشش میں کامیاب رہا ہے۔ فاروق کا اندازہ تھا کہ سیٹھ کو بیٹی کے پرس میں موجود نقدی اور زیورات کا علم نہیں ہوگا اسی لیے اس نے اتنی آسانی سے واپسی کی ہامی بھر لی ہے۔

"آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا فاروق صاحب۔ کیا ضرورت تھی آپ کو اس لفنگے کے پیچھے جانے کی؟ بھگوان آپ کی رکھشا کرے لیکن آپ کو اس طرح بستر پر لیٹے دیکھ کر مجھے بڑی شرم آرہی ہے۔ آپ میرے پرس کی خاطر ہی تو کشٹ میں پڑے تھے۔" انوپم اگروال کی روانگی کے بعد شکنتلا فاروق کے پاس بیٹھ کر نہایت دل سوزی سے بولی۔

"شرمندہ تو میں ہوں گڑیا۔ تم ہمارے ساتھ تھیں۔ تمہاری اور تمہارے سامان کی حفاظت ہماری ذمے داری بنتی تھی۔ تم اندازہ بھی نہیں کر سکتیں کہ اپنی نظروں کے سامنے تمہارے پرس کا چلے جانا میرے لیے کیسی خفت کا باعث ہے لیکن تم فکر نہیں کرو، ہم سب مل کر تمہاری چیزیں حاصل کر کے رہیں گے۔ مجھے اندازہ ہے کہ اگر تمہارے پرس میں موجود نقدی اور زیورات واپس نہیں ملے تو تمہیں اپنے گھر میں بڑی مشکل ہو جائے گی اور تمہاری مشکل ہمیں گوارا نہیں ہے۔" فاروق نے بھی پورے خلوص سے اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

"اوہو تو آپ اس کارن ایسے سرپٹ دوڑ پڑے تھے کہ میرے پرس میں کیش اور جیولری ہے لیکن پرس میں ایسا کچھ تھا ہی نہیں۔ چاچاجی نے پہلے ہی سب چیزیں میرے پرس سے نکلوا کر ڈیڈی کے بیگ میں رکھوا دی تھیں۔" اس کی بات کے جواب میں شکنتلا نے مزے سے اسے اطلاع دی تو وہ چونک گیا اور سوالیہ نظروں سے ربن کی طرف دیکھا۔ ربن نے سر کی اثباتی جنبش سے شکنتلا کے بیان کی تصدیق کر دی۔ اس موقع پر فاروق ایک بار پھر ربن کا قائل ہو گیا۔ اس کا ذہن رسا ہمیشہ قبل از وقت ہی حالات کے مطابق فیصلے اور عمل کرواتا تھا۔ اس وقت بھی اس کی ایک احتیاط اور دوراندیشی نے شکنتلا کو بڑی پریشانی سے بچالیا تھا البتہ یہ بات اپنی جگہ تھی کہ اپنے ساتھ موجود خاتون کے پرس کو چھینا جانا اب بھی اس کے لیے ناقابلِ قبول تھا اور وہ سمجھتا تھا کہ یہی سوچ ربن کی بھی ہوگی۔

"مجھے اور ڈیڈی کو تو بس آپ کی چنتا تھی اس لیے ہم نے اپنے ٹکٹ کینسل کروا دیے تھے۔ آپ چاچاجی کے کتنے لاڈلے ہیں، اس بات کا ہمیں اچھی طرح اندازہ ہو گیا ہے۔ اس لیے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ ہم انہیں پریشانی میں اکیلا چھوڑ کر چلے جاتے۔ اب بھی آپ کی طرف سے اتنی تسلی دی گئی ہے تو ڈیڈی سیٹیں بک کروانے گئے ہیں اور انہوں نے بمبئی اپنے منیجر اور ممی دونوں کو فون کر کے بتا دیا تھا کہ ابھی وہ بمبئی واپس نہیں آسکتے اس لیے وہ دونوں مل کر بزنس کے معاملات دیکھ لیں۔" اس کی سوچوں سے بے خبر شکنتلا اپنی بولتی چلی گئی۔ اس کی باتوں سے فاروق کے ہر خیال اور اندازے کی تردید ہو رہی تھی۔ پہلے اس نے اندازہ لگایا تھا کہ شاید سیٹھ اگروال کو شکنتلا کے پرس میں موجود سامان کی خبر ہی نہ ہو، بعد میں وہ سوچ رہا تھا کہ سیٹھ اس سامان کی بازیابی کے لیے وہاں رکا ہوا ہے لیکن اصل صورتِ حال یہ تھی کہ سیٹھ واقف بھی تھا اور اس کے رکنے کی وجہ اپنی قیمتی اشیا کے حصول کے بجائے اس کی ذات تھی۔ اپنے غلط اندازوں پر شرمندہ، وہ شکنتلا سے صرف اتنا کہہ سکا۔

"تھینک یو سوچ شکنتلا۔ تم لوگوں کا یہ خلوص مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔"

"تھینک یو کی کیا بات ہے فاروق صاحب۔ آپ لوگ سب خود اتنے اچھے ہو کہ دوسرا آپ سے محبت کیے بغیر رہ ہی نہیں سکتا۔ خیر جانے دیجیے ان سب باتوں کو اور اب آپ ریسٹ کیجیے ورنہ مس کیتھرائن مجھے کان سے پکڑ کر باہر نکال دیں گی۔ انہوں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ آپ سے زیادہ باتیں نہیں کرنی ہیں لیکن بس بات سے بات نکلتی چلی گئی۔" شکنتلا ہلکے پھلکے لہجے میں کہتی ہوئی ربن کے ساتھ جا بیٹھی۔ فاروق نے دیکھا کہ ربن کی آنکھوں میں شوخ سی مسکراہٹ تھی اور صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس کے ہر خیال اور اندازے سے واقف تھا۔ اس نے اپنے چہرے کے تاثرات سے مصنوعی خفگی کا اظہار کیا اور کروٹ بدل کر آنکھیں موند لیں۔ اسے سچ مچ آرام کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔

☆☆☆

اس کے قدموں کو زمین نے جکڑ سا لیا تھا اور چاہتے ہوئے وہ ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ پا رہی تھی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اس سے پہلے ہی موت کا فرشتہ اسپتال کے اس وارڈ میں داخل ہو چکا ہو۔ اس کا احساس، وہاں موجود فرشتۂ اجل کی آہٹیں بہت واضح طور پر سن رہا تھا۔ اس نے کچھ عرصہ پہلے ہی تو اپنی ماں کو اس فرشتے کے حوالے کیا تھا اور اب اتنی جلدی اسے اپنے باپ کے قریب محسوس کر کے کسی ننھی بچی کی طرح سہم گئی تھی۔ اس کے پاس اس دنیا میں زیادہ رشتے نہیں تھے۔ ماں، باپ اور

عارف...... بس ان تینوں کے گرد ہی اس کی زندگی گھومتی تھی۔ ماں اور عارف کو اس نے کھو دیا تھا اور اب باقی رہ جانے والے واحد رشتے کی جدائی کا مرحلہ بالکل قریب محسوس کر کے سن سی ہوگئی تھی۔ اس کی آمد پر اس کی طرف متوجہ ہوجانے والے جانی نے اس کی کیفیت بھانپ لی اور اپنی جگہ سے چلتا ہوا اس کے قریب آیا۔

''تھینک گاڈ سسٹر کہ تم یہاں پہنچ گیا۔ تمہارا فادر تمہیں بہت یاد کر رہا تھا۔ آؤ اس سے مل لو، وہ تمہارا ویٹ کر رہا ہے۔'' اس نے بولتے ہوئے جولیٹ کے شانے کو آہستہ سے دبایا تو اس کے منجمد ہوجانے والے جسم میں تحرک پیدا ہوا اور وہ جوزف کے زندہ ہونے کا یقین آجانے پر تیر کی طرح اس کے بستر کی طرف بڑھی۔ مختصر عرصے میں جھٹک کر لاغر ہوجانے والا جوزف کا وجود بس اس کا سایہ ہی محسوس ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور چہرے پر ایسی زردی کھنڈی تھی کہ جولیٹ کو اس پر کسی لاش کا گمان ہوا۔ جوزف کے قریب کھڑا ڈاکٹر اگر اس کے بازو میں دوا انجیکٹ کرتا ہوا نظر نہ آتا تو وہ یہی گمان کرتی کہ وہ اپنے باپ کو کھو چکی ہے۔ جوزف کے پائنتی کھڑی نرس اس کے تلووں کو سہلا رہی تھی اور یہ سارا اہتمام تو زندہ لوگوں کے لیے ہی ہوتا ہے۔ دل میں کچھ تقویت سی محسوس کرتے ہوئے اس نے جوزف کو پکارا۔

''ڈیڈ......'' اس کی یہ لرزیدہ پکار جوزف کی سماعتوں سے ٹکرائی تو اس کی آنکھوں کے پپوٹوں نے جنبش کی۔

''آنکھیں کھولیں ڈیڈ۔ یہ میں ہوں آپ کی جولی۔'' اس بار اس نے جوزف کا ہاتھ تھام کر اسے آواز دی۔ اس کی یہ پکار رائگاں نہیں گئی اور جوزف نے آنکھیں کھول دیں۔ آنکھیں کھولتے ہی اسے سامنے جولیٹ کا چہرہ نظر آیا تو ویران آنکھوں میں زندگی کی رمق سی جاگی۔

''جولی...... مائی ڈارلنگ ڈاٹر۔'' بہت دھیمی آواز میں اس نے جولیٹ کو کچھ اس طرح سے پکارا کہ اس کی آنکھیں جذبات سے برس پڑیں۔ جوزف نے اپنا ہاتھ اٹھا کر اس کے برستے آنسوؤں کو صاف کرنا چاہا لیکن ناتوانی کے باعث اس کا ہاتھ درمیان میں ہی گر گیا۔ جولیٹ نے فوراً ہی اس کا گر جانے والا ہاتھ تھاما اور بے تحاشا چومنے لگی۔ اس بار جوزف کی آنکھوں سے بھی آنسو بہہ نکلے۔

''آئی ایم سو سوری مائی ڈیئر ڈاٹر۔'' بہت ہلکی آواز میں ادا کیا گیا اس کا یہ جملہ جولیٹ نے قریب بیٹھے ہونے کے باوجود بہت مشکل سے سنا اور اس کا مطلب بھی سمجھ گئی۔ اسے یقین تھا کہ جوزف اس سے اس لیے معافی مانگ رہا ہے کہ جوزفین کی جدائی کے غم میں ڈوب کر وہ خود اس کی کیئر نہیں کر سکا تھا اور بیوی کی محبت بیٹی کی محبت پر سبقت لے گئی تھی۔ ایک باپ کی حیثیت سے یقیناً اپنا یہ طرزِ عمل اس کے لیے باعثِ ندامت رہا ہوگا لیکن جولیٹ کو اس سے کوئی شکوہ نہیں تھا۔ اسے تو اپنی ماں کی قسمت پر رشک آتا تھا جسے اتنا ٹوٹ کر چاہنے والا جیون ساتھی ملا تھا جو اس کی جدائی میں خود ٹوٹ کر رہ گیا تھا جبکہ خود اس کی قسمت اپنی ماں کے بالکل برعکس تھی۔ عارف نے تو محبت کے سارے دعوے اور وعدے لمحوں میں بھلا دیے تھے اور پہلی ہی آزمائش میں ناکام ہوگیا تھا۔

''اپن تم سے بہت لو کرتا ہے، پر اپنے سے اب جوزفین کا جدائی سہا نہیں جاتا۔ تم......'' دھیمی آواز میں بولتا وہ اچانک ہی خاموش ہوگیا تو اس کی نبض تھامے کھڑے ڈاکٹر نے چونک کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا اور پھر اپنے ہاتھوں سے اس کے سینے پر مالش کرنے لگا۔ جوزف جو اپنے حواس میں تھا اور بس ذرا تھک جانے کی وجہ سے خاموش ہوگیا تھا، اس کے اس طرزِ عمل پر خفیف سا مسکرایا اور اپنی بات دوبارہ شروع کی۔

''تم اپنی مام کا ڈائری ضرور پڑھ لینا۔ آئی ہوپ کہ اپنے بعد تم اس ورلڈ میں اکیلا نہیں رہیں گا۔'' جملہ مکمل کر کے وہ ایک بار پھر مسکرایا اور اس کی نظریں جولیٹ کے چہرے سے ہٹ کر کسی نادیدہ نقطے پر جم گئیں۔ اس پل اس کی آنکھوں میں اتنی چمک تھی کہ لگتا تھا وہ دنیا کا سب سے خوش کن اور مسحور کر دینے والا نظارہ دیکھ رہا ہو لیکن نہیں...... وہ اس دنیا کا نظارہ نہیں دیکھ رہا تھا کیونکہ اس کی کلائی پر گرفت کیے ڈاکٹر کو اب اس کی خاموش ہوجانے والی نبض نے چپکے سے بتا دیا تھا کہ اب وہ اس دنیا میں نہیں رہا ہے۔ حیرت زدہ ڈاکٹر نے اس کے دل کی دھڑکن چیک کی اور اپنے طور پر، خاموش ہوجانے والے دل کو دوبارہ جگانے کے لیے چند کوششیں بھی کر ڈالیں لیکن راہی تو جا چکا تھا۔

''آئی ایم سوری مس۔ ہی از نو مور۔'' آخر کار ڈاکٹر کو اپنی ناکامی کا اعتراف کرنا پڑا۔ جولیٹ نے اس انداز میں اس کی طرف دیکھا جیسے اس کا جملہ سمجھنے کی اہل نہ ہو۔ جانی نے اس کی اس کیفیت کو بھانپ لیا اور خود آگے بڑھ کر جوزف کی ساکت مگر اب تک جگمگاتی آنکھوں کو بند کرنے کے بعد اس سے مخاطب ہوا۔ ''تمہارا فادر چلا گیا سسٹر۔ گاڈ تم کو یہ غم سہنے کا حوصلہ دے۔ ابھی تم ہمارے ساتھ گھر چلو۔ ہم مسٹر جوزف کی ڈیڈ باڈی کو گھر پہنچانے کا ارینجمنٹ کرتا

ہے۔ وہاں باقی لوگوں سے مشورہ کر کے اس کی تدفین کا بھی ڈیسائڈ کریں گا۔''

جیانی بہت ہمدردی کے ساتھ ایک معقول بات کر رہا تھا لیکن جوزف کے لیے ڈیڈ باڈی کا لفظ سن کر اسے جھٹکا سا لگا اور وہ زور سے چیخی۔ ''شٹ اپ۔''

''پلیز مس۔ خود کو سنبھالیے۔ بے شک آپ غم زدہ ہیں لیکن اپنے ہمدرد کے ساتھ ایسا سلوک ٹھیک نہیں۔ ان صاحب نے آپ کے پیچھے آپ کے فادر کو بہت اچھی طرح لک آفٹر کیا ہے۔'' وہ نرس جواب تک جوزف کے پاؤں کے تلوے سہلاتی رہی تھی، خاموش نہ رہ سکی اور جولیٹ کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے سمجھانے لگی۔

''کوئی بات نہیں سسٹر۔ یہ اپنا سسٹر ہے اور اپن اس کی کسی بات کو مائنڈ نہیں کرتا۔'' جانی نے نرم لہجے میں کہتے ہوئے جولیٹ کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھا تو اس کا دل پگھلنے لگا اور وہ بے ساختہ ہی جانی کے سینے سے لگ کر رونے لگی۔ جانی کسی بڑے بھائی کی سی شفقت کے ساتھ اسے دلاسا دیتا رہا۔ دنیا کی بھیڑ میں رشتوں سے محروم ہو کر تنہا رہ جانے والی جولیٹ کے لیے اس وقت اس کا وجود غنیمت تھا۔

☆☆☆

وہ ایک بار پھر منو پہلوان کے اڈے پر موجود تھے۔ پچھلی بار یہاں آمد پر منو پہلوان کے چچا اور مربی کپل داس نے بہت اصرار کیا تھا کہ وہ کچھ عرصے ان کے اڈے پر قیام کریں لیکن سفر کی عجلت اور ہوٹل میں موجود خواتین کی وجہ سے ربن نے اس دعوت کو قبول کرنے سے گریز کیا تھا۔ اب یہ اتفاق تھا کہ فاروق کے ساتھ حادثہ پیش آ گیا اور اسے اسپتال میں داخل ہونا پڑا، جس کی وجہ سے نہ چاہتے ہوئے بھی ان کا قیام چندی گڑھ میں بڑھ گیا۔ فاروق کے سر کی چوٹ کچھ ایسی نوعیت کی تھی کہ ذرا سی بھی غفلت نہیں برتی جا سکتی تھی چنانچہ جب تک اس کی ساری رپورٹس نہیں آ گئیں اور ڈاکٹرز نے یہ رائے نہیں دے دی کہ حالیہ چوٹ سے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا ہے، تب تک اسے اسپتال میں ہی رکھا گیا۔ اس عرصے میں انوپم اگروال اور شکنتلا واپس بمبئی لوٹ گئے تھے۔ کیتھرائن مسلسل فاروق کے ساتھ اسپتال میں ہی رہی تھی اور پوری جانفشانی سے اس کی دیکھ بھال کرتی رہی تھی۔ گولو اور ربن اسپتال انتظامیہ کی طرف سے عائد کردہ پابندی کی وجہ سے وہاں مستقل نہیں رہ سکتے تھے لیکن جتنی دیر اجازت ملتی وہیں رہتے تھے۔ گولو سیدھا سادہ بندہ تھا اس لیے اسے زیادہ تر ہوٹل تک ہی محدود رہنا پڑتا تھا البتہ ربن کی بابت اس نے فاروق کو بتایا تھا کہ وہ کم ہی ہوٹل میں ٹکتا ہے اور عموماً بس رات کو ہی موجود رہتا ہے۔ ربن نے چونکہ خود اپنی مصروفیت کے بارے میں کوئی ذکر نہیں کیا تھا اس لیے فاروق نے بھی اس سلسلے میں اس سے استفسار کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ آج جب اسے اسپتال سے ڈسچارج کیا گیا تو کیتھرائن کو آرام کا مشورہ دینے کے بعد ربن نے ان دونوں کو تیار ہونے کا حکم دیا اور پھر اپنے ساتھ لے کر منو پہلوان کے اڈے پر پہنچ گیا۔

یہاں حسبِ سابق، ان کا پرتپاک استقبال کیا گیا اور موہن داس عرف منو پہلوان اور اس کے چچا کپل داس نے انہیں بے حد عزت دینے کے ساتھ ساتھ خوب خاطر تواضع کی۔ کھانے پینے کا شوقین گولو یہاں آ کر بہت خوش تھا اور پنجاب کے روایتی کھانوں سے خوب انصاف کیا تھا۔ ربن نے بھی خاصی بے تکلفی دکھائی تھی اور یوں کپل داس کے ساتھ گھل مل گیا تھا جیسے برسوں کا یارانہ ہو۔ فاروق البتہ کچھ بندھا بندھا سا بیٹھا رہا تھا اور وہاں ہونے والی گفتگو میں بس جواب دینے کی حد تک ہی حصہ لیا تھا۔ وہ اس چیز کے ظہور میں آنے کا منتظر تھا جس کی خاطر اس کے خیال میں ربن انہیں یہاں تک لایا تھا۔ اگر ربن کی بات نہ ہوتی تو وہ یہاں تک بالکل نہیں آتا۔ وہ جس افسردگی اور بے کلی کو اپنے ساتھ بمبئی سے لے کر چلا تھا، آج اس میں کچھ اور بھی اضافہ ہو گیا تھا اور رہ رہ کر جولیٹ کی طرف دھیان جاتا تھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ جولیٹ سے اتنی شدید محبت کرتا ہے کہ اس سے دوری پر اس حد تک بے چین ہو جائے گا کہ کہیں کسی صورت قرار ہی نہیں ملے گا حالانکہ سچ تو یہ تھا کہ بمبئی میں رہ کر بھی وہ کون سا جولیٹ کے قریب تھا۔ صبح شام کی لمحاتی دید کے سوا وہاں اسے حاصل ہی کیا تھا لیکن لگتا تھا کہ وہ لمحاتی دید ہی زندگی کا حاصل تھی جس کے بغیر زندگی نامکمل ہو کر رہ گئی تھی۔

اپنی اس محرومی کے علاوہ بھی اس کے دل میں ایک کھٹک سی تھی۔ کسی انجان واسطے سے اسے سگنل ملتا تھا کہ جولیٹ کسی مشکل اور پریشانی میں گرفتار ہے۔ ربن کی زبانی وہ جوزفین کی موت کے بارے میں سن چکا تھا اس لیے خود کو یہ کہہ کر ہی تسلی دیتا رہتا تھا کہ جولیٹ کے بارے میں ابھرنے والے خیالات اس کی ماں کی موت کا ردِعمل ہیں۔ ماں کی موت کا صدمہ ایک کھلی حقیقت ہے اسی لیے وہ محسوس کرتا ہے کہ جولیٹ کسی مشکل میں گرفتار ہے۔ بے حد عزیز

شخص کی جدائی کو سہنے کی تکلیف سے بڑھ کر بھلا کیا مشکل ہوسکتی ہے اور اس مشکل سے انسان کو اللہ تعالیٰ ہی نکالتا ہے۔ وہی ہے جو آدمی کو غم سہہ کر صبر کرنے کا ہنر سکھاتا ہے۔ آس پاس موجود لوگ تو بس اپنی بساط بھر غم بانٹنے کی کوشش ہی کرتے رہتے ہیں اور اسے اپنی حیثیت کا علم تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ جولیٹ کی نظروں میں اتنی عزت و وقعت بھی نہیں رکھتا کہ وہ اسے غم گساری کی اجازت دے ڈالے۔ وہ اگر ربن سے ضد کر کے کسی طرح یہیں سے بمبئی لوٹ بھی جاتا تو حاصل کیا ہوتا۔ وہ تو اسے خود سے مخاطب ہونے کی بھی اجازت نہیں دیتی تھی۔

''تسی وڈے چپ بیٹھے ہو بھرا۔ کی گل اے؟ اساں دے سنگ جی نہیں لگیا کیا؟'' وہ نہایت غائب دماغی کے ساتھ ہاتھ میں موجود مشروب کے گلاس پر انگلیاں پھیر رہا تھا کہ موہن داس نے عاجزانہ لہجے میں سوال کر کے چونکا دیا۔ وہ اس سوال پر سٹپٹا سا گیا۔ منو پہلوان نے بالکل درست قیاس آرائی کی تھی لیکن وہ اس کی تصدیق کر کے اپنے میزبان کو دکھ نہیں پہنچا سکتا تھا چنانچہ ہونٹوں پر مصنوعی مسکراہٹ سجا کر بولا۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ بس ذرا طبیعت ست ہے اس لیے خاموش بیٹھا ہوا ہوں۔''

''شما کرنا بھرا۔ اس گل کا تو اساں نو خیال ہی نہیں تھا۔ تسی بولو تو تہاڈے واسطے منجی بستر کا انتظام کروا دوں؟'' منو پہلوان نے فوراً ہی معذرت کرتے ہوئے اسے پیشکش کی۔

''نہیں یار۔ اب اتنی بھی طبیعت خراب نہیں ہے۔'' اس نے موہن کا بازو تھپتھپاتے ہوئے انکار کیا اور خود کو ذرا سنبھال کر اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا۔ موہن کو بمبئی جانے کا اشتیاق تھا اور وہ نہایت معصومانہ اشتیاق کے ساتھ وہاں کے متعلق سوالات کر رہا تھا۔ اس کے انداز سے لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ ایک اڈے کا دادا ہے اور سارا شہر اسے منو پہلوان کی حیثیت سے جانتا اور ڈرتا ہے۔ اس کے تجسس کو دیکھتے ہوئے فاروق بھی اسے خاصے تسلی بخش جوابات دے رہا تھا۔ کھانے پینے کا سلسلہ ختم ہوا تو منو نے بھی اپنی گفتگو کو سمیٹ لیا اور چوکی پر اپنی مخصوص جگہ جا بیٹھا۔

''کالیا کو لے کر آؤ۔'' اپنی جگہ سنبھال لینے کے بعد اس نے بارعب لہجے میں حکم صادر کیا، اب وہ بالکل بدلا ہوا آدمی تھا اور ایک دادا کے سے رعب و دبدبے کا ہی مظاہرہ کر رہا تھا۔ اس کی طرف سے حکم جاری ہوتے ہی ایک دبلے پتلے لڑکے کو اس کے سامنے حاضر کر دیا گیا۔ لڑکے کے چہرے پر نظر پڑتے ہی فاروق چونک گیا۔ یہ وہی اچکا تھا جو شکنتلا کا پرس چھین کر بھاگا تھا۔ اس وقت اس کا سر جھکا ہوا تھا اور چہرے پر شرمندگی کے تاثرات تھے۔

''کیوں بھرا...... یہی ہے نا وہ بندہ جینو تہاڈے سنگ موجود زنانی دا بٹوا چھینیا سی؟'' فاروق کی سمت دیکھتے ہوئے منو نے اس سے سوال کیا۔ جواب میں فاروق نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ سارا قصہ خود بخود ہی اس کی سمجھ میں آ گیا تھا۔ اس شہر میں منو پہلوان اور اس کے چاچا پکل داس کی حکمرانی تھی۔ اڈے کے لوگ اگر کہیں راج کرتے ہیں تو خود کو اس راج پاٹ کا اہل بھی ثابت کرتے ہیں۔ ان کی پہنچ قانون کے ہرکاروں سے بھی آگے تک ہوتی ہے اس لیے یہ کوئی حیرت کی بات نہیں تھی کہ وہ شکنتلا کا پرس چھین کر لے جانے والے کو اپنے روبرو دیکھ رہا تھا۔ منو اور اس کے چاچا کے لیے تو یہ اپنی ساکھ کا معاملہ بن گیا ہوگا۔ ان کے شہر میں کوئی اچکا ایسے افراد کو ہاتھ دکھا جائے جنہیں وہ اپنا دوست تسلیم کر چکے تھے، بھلا ان کے لیے یہ کیسے قابلِ برداشت ہوسکتا تھا چنانچہ انہوں نے مجرم کو پکڑ کر ان کے روبرو کر دیا تھا۔

''اساں نو شما کرو دستاد۔ اسیں نئیں جاندے سے کہ تسی ساڈے پہلوان دے پروہنے ہو۔ اسیں لالچ وچ آ گئے تھے۔ وہ حرام خور اساں نو دسیا سی تے کڑی دے پرس وچ لمبا مال رکھیا ہے۔'' کالیا کے نام سے وہاں لائے جانے والے اس شخص کے الفاظ چونکا دینے والے تھے۔ فاروق ذرا سنبھل کر بیٹھ گیا اور اسے بہ غور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کس نے تمہیں بتایا تھا کہ لڑکی کے پرس میں لمبا مال ہے؟''

''وہی ماں کا...... جو شکل نال شریف لگدا ہے پر ہے نہیں۔'' کالیا نے ایک بڑی سی گالی اپنے جملے میں شامل کرتے ہوئے اسے جواب دیا۔ اس کے بعد اس نے جو تفصیلات بتائیں، اس کے مطابق وہ شہر میں موجود بازارِ حسن میں اپنا دھندا کرتا تھا۔ وہاں آنے والے افراد کی جیبیں عموماً بھری ہوئی تھیں اور بہکے بہکے قدموں سے ترنگ میں چلتے انہیں پتا ہی نہیں چلتا تھا کہ کب ان کی جیب خالی کر دی گئی ہے۔ کالیا کچھ بندھے اصولوں کے تحت وہاں اپنا کام کرتا تھا اس لیے بازار میں کوٹھوں پر دھندا کرنے والی طوائفوں، ان کے دلالوں اور دکان داروں سمیت بہت سے لوگ اس سے واقف ہونے کے باوجود اس کی وہاں موجودگی پر تعرض نہیں کرتے تھے۔ کچھ دخل منو پہلوان کی

دہشت کا بھی تھا اور کسی میں جرأت نہیں تھی کہ منو پہلوان کے بندے کو بازار میں داخل ہونے سے روکے۔

ان لوگوں کی چندی گڑھ آمد کے دوسرے دن ہی ایک شناسا دلال نے کالیا کو ایک نوجوان سے ملوایا تھا نوجوان نے کالیا کو اپنا نام نہیں بتایا لیکن کچھ اس طرح سے اپنی باتوں کے جال میں پھنسایا کہ وہ آمادہ ہو گیا کہ وہ اپنے دادا سے بالا ہی بالا اس کا بتایا ہوا کام کر ڈالے گا۔ نوجوان نے اسے یقین دلایا تھا کہ اسے جس لڑکی کا پرس چھیننے کے لیے کہہ رہا ہے، اس کے پرس میں سے اتنا کچھ مل جائے گا کہ آدھے آدھے کا سودا بھی برا نہیں رہے گا۔ نوجوان نے نگرانی اور معلومات کی فراہمی کا ذمہ خود لے کر اسے بس اس حد تک پابند کیا کہ وہ شوالک ہوٹل سے قریب ایک چھوٹے ہوٹل میں ہر وقت موجود رہے گا۔ یہ زیادہ کڑی شرط نہیں تھی۔ کالیا نے اڈے پر حاضری سے غائب رہنے کے جواز کے طور پر اپنی بیماری کی خبر پہنچا دی۔ یوں وہ واقف ہی نہ ہو سکا کہ ربن اور اس کے ساتھیوں کا اڈے سے کیسا رشتہ جڑ گیا ہے۔ اگر اسے ان کی منو اور کپل داس سے دوستی کی خبر ہو جاتی تو کسی صورت اس کام کے لیے راضی نہیں ہوتا۔

اس نے خود کو ٹپ دینے والے نوجوان کی ہدایت پر ان لوگوں کی ہوٹل سے روانگی کے وقت شکنتلا کا پرس چھینا اور بھاگ کھڑا ہوا اور فاروق کے تعاقب کرنے کے باوجود اس مخصوص مقام تک پہنچ گیا جہاں وہ نوجوان اس کا منتظر تھا۔ حسب وعدہ اس نے پرس نوجوان کے حوالے کر دیا۔ نوجوان نے پرس کھول کر اس کا جائزہ لیا تو اس میں سے کچھ نہ نکلا۔ پرس کو خالی پا کر وہ کالیا پر الٹ پڑا کہ اس نے بے ایمانی کی ہے اور پہلے ہی پرس سے سارا مال نکال لیا ہے۔ کالیا نے اسے لاکھ یقین دلانے کی کوشش کی کہ وہ سیدھا اس کے پاس آیا ہے اور راستے میں کہیں پرس کھول کر دیکھا تک نہیں لیکن وہ نوجوان نہ مانا اور غصے میں بے قابو ہو کر کالیا پر ہاتھ اٹھا لیا۔ کالیا کیونکر برداشت کرتا۔ وہ تو خود خواہ مخواہ کی خواری پر طیش میں آیا ہوا تھا۔ نتیجتاً دونوں کے درمیان خوب جھگڑا ہوا۔ جھگڑا اسی ہوٹل کے کمرے میں ہو رہا تھا جہاں کالیا ٹھہرا ہوا تھا۔ شور شرابے کی آوازیں سن کر ہوٹل کا عملہ اور چند گاہک کمرے میں پہنچ گئے اور بڑی مشکل سے دونوں فریقین کو قابو میں کر کے جھگڑا ختم کروایا۔

اپنے ایک آدمی کے پھڈے کی خبر منو تک کیسے نہیں پہنچتی۔ فوراً ہی کالیا کی اس کے سامنے پیشی ہو گئی۔ کالیا میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ منو کو مزید دھوکے میں رکھ پاتا چنانچہ اس نے سب اگلا پچھلا اگل دیا۔ اس اثناء میں فاروق کے حادثے کی خبر بھی اڈے تک پہنچ گئی۔ دو جمع دو چار والا سیدھا سادہ حساب کتاب تھا اس لیے منو اور کپل فوراً سمجھ گئے کہ ان کے مہمانوں کے کسی مخالف نے یہ کارروائی کروائی ہے۔ انہوں نے کالیا کو ورغلانے والے نوجوان کی تلاش کروائی اور دلال کی مدد سے اسے عین اس وقت پکڑنے میں کامیاب ہو گئے جب وہ چندی گڑھ سے فرار ہونے کے لیے ریل میں سوار ہونے والا تھا۔ اس موقعے پر منو پہلوان نے پکڑے جانے والے نوجوان کو پیش کرنے کا حکم دیا۔ جب وہ نوجوان سامنے لایا گیا تو فاروق کو یہ دیکھ کر قطعی حیرت نہیں ہوئی کہ وہ ماجد علی ہے، شکنتلا کا نام نہاد عاشق جو اسے محبت کا جھانسا دے کر گھر سے بھگا لایا تھا اور اس کا مال و زر لوٹنے کے ساتھ ساتھ اسے بازار حسن میں بیچنے کا ارادہ بھی رکھتا تھا۔ شکنتلا کی قسمت اچھی تھی کہ اسے ان کی ہمسفری نصیب ہو گئی اور ربن کی گھاگ نگاہوں نے ماجد علی کی اصلیت کو پہچان لیا۔

اپنے طور پر ان لوگوں نے ماجد علی کو راستے میں ہی ریل سے اتار کر شکنتلا کی اس سے جان چھڑا دی تھی لیکن وہ بھی کوئی بہت ہی ڈھیٹ قسم کا بندہ تھا جو ہونے والی بے عزتی کے بعد بھی ان کے پیچھے پیچھے چندی گڑھ پہنچ گیا تھا اور خود سامنے آئے بغیر کالیا کی مدد سے شکنتلا کا مال لوٹنے کی کوشش کی تھی لیکن یہاں بھی ربن کی دوراندیشی نے کام دکھایا اور ماجد علی کے ہاتھ خالی پرس کے سوا کچھ نہ آ سکا۔ ممکن تھا کہ اگر اسے شکنتلا سے ملاقات کا موقع مل جاتا تو وہ اسے ایک بار پھر ورغلانے کی کوشش کرتا اور دھوکے سے بازار میں بیچ کر اپنے پورے منصوبے پر عمل کر ڈالتا لیکن اس جیسے چالباز کو پوری طرح اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ اس کا کن لوگوں سے واسطہ پڑا ہے ورنہ دوبارہ ان کے آڑے آنے کے بجائے جان بچا کر بھاگ نکلنے کو ہی غنیمت سمجھتا۔

"کہتے ہیں تعلیم آدمی کو سنوار دیتی ہے لیکن تمہیں تو تمہاری تعلیم نے کاغذ کے چند ٹکڑوں کے سوا کچھ نہیں دیا۔ یہاں تک کہ تم استاد جیسے رتبے پر فائز ہونے کے باوجود اپنی فطرت کے کمینے پن سے باز نہیں آئے۔ ریل میں جب تم سے تمہاری داستان سنی تھی تو تمہارے جرم کی سنگینی کے باوجود صرف اس وجہ سے رعایت دے دی تھی کہ انتقام کے جوش میں تمہارے قدم بہک گئے ہیں لیکن اب تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ انتقام کا تو صرف بہانہ تھا ورنہ حقیقتاً تم وہ آدمی ہو جس کے اندر کمینہ پن کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔" ماجد علی کو

روبرو پاکر فاروق اسے سخت سست سنائے بغیر نہیں رہ سکا۔
اس کی ساری باتیں ماجد علی نے خاموشی سے سنیں لیکن فاروق نے محسوس کیا کہ اس کی نگاہوں میں وہ شرمساری نہیں ہے جو اپنے فعل پر نادم کسی شخص کی آنکھوں میں دکھائی دیتی ہے۔ وہ شاید شرمندہ تھا بھی نہیں۔ ہاں اپنے انجام کی طرف سے کچھ فکرمند ضرور نظر آتا تھا۔

"کیوں بھینس کے آگے بین بجا رہا ہے ہیرو۔ کتے کی دم کو سو برس نلکی میں رکھو پھر بھی ٹیڑھی کی ٹیڑھی ہی رہتی ہے۔ ایسے حرام کے جنوں کو زبان سے سمجھانے سے کچھ نہیں ہوتا۔ ایسوں کو تو ان کے کیے کا سبق سکھانا پڑتا ہے۔" ربن نے زہر میں ڈوبے لہجے میں فاروق کو ٹوکا۔ اس کی غضب ناک نگاہیں مسلسل ماجد علی کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں اور وہ ان نگاہوں کی تندی پر گھبرا رہا تھا۔

"تسی ٹھیک دس رہے ہو بھرا۔ اس کی سزا دا فیصلہ تم سناؤ، تم جو چاہو گے وہی ہوگا۔" کپل داس نے ربن کی تائید کرتے ہوئے اس سے فرمائش کی۔

"اپن کے دل کی پوچھو تو اپنا دل بولتا ہے ایسے فراڈی کو زمین سے گاڑ کر اس پر کتے چھوڑ دیں تاکہ پھر اس جیسا کوئی دوسرا کسی کی بہن بیٹی پر غلط نگاہ ڈالتے ہوئے دس بار سوچے۔" ربن کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔

"تسی بولو تو ایسا بھی ہوسکدا ہے۔ اساں دے چندی گڑھ میں زمین بھی ہے اور کتوں کی بھی کمی نہیں ہے۔" کپل داس نے بڑے اطمینان سے ربن کو پیشکش کی۔ اس کی یہ فراخ دلانہ پیشکش سن کر ماجد علی سرتاپا کانپ اٹھا اور بہت تیزی سے اپنی جگہ سے حرکت کر کے ربن کے قدموں میں جا گرا۔

"رحم کرو مائی باپ، مجھ بدنصیب پر رحم کرو۔ مجھ پر رحم نہیں آتا تو میری ماں پر رحم کرو۔ وہ بے چاری تو میرے ایسے انجام کا سن کر اپنی جان سے چلی جائے گی۔" وہ ربن کے پیر پکڑے بلند آواز میں روتے ہوئے اس سے التجائیں کر رہا تھا۔

"پرے ہٹ۔" ربن نے اسے نفرت سے دھتکارا۔ "تیرے جیسا کمینہ رحم کی بھیک مانگتا اچھا نہیں لگتا۔ تو نے شکنتلا جیسی نادان لڑکی کو گھر سے بھگا کر بازار میں بیچنے کا فیصلہ کرتے ہوئے سوچا تھا کہ اس معصوم پر کیسی قیامت گزرے گی اور اس کی ماں اپنی جوان بیٹی کے غائب ہو جانے پر کس طرح جیے گی؟ آج تو خود کو کتوں سے نچوائے جانے کے خیال سے کانپ رہا ہے لیکن یہ سوچ کر تیرا دل نہیں کانپا تھا کہ جو لڑکی تیری محبت میں ہر حد سے گزر جانے کو تیار ہے، اس کے کومل بدن کو حریص اور بدکردار مرد کتوں کی طرح بھنبھوڑیں گے تو اس پر کیا گزرے گی۔" ربن بولنے پر آیا تو بولتا چلا گیا۔

"مجھے اپنا ہر جرم قبول ہے۔ واقعی میں بڑا بدذات اور کمینہ آدمی ہوں لیکن پھر بھی تمہاری اچھائی کو دیکھتے ہوئے امید کرتا ہوں کہ تم میرے حوالے سے کیا گیا اپنا خطرناک فیصلہ تبدیل کر دو گے اور مجھے دی جانے والی سزا میں نرمی برتو گے۔" وہ اپنی خلاصی کے لیے خوشامد اور چاپلوسی پر اتر آیا۔

"اپن تو تیرے ساتھ کوئی نرمی نہیں کرسکتا، پر اگر بھائی کپل داس تیرے لیے کوئی ہلکی سزا سوچ سکے تو یہ اس کی تجھ پر مہربانی ہوگی۔ کپل داس کی مہربانی سے تیرے جیسا حرام خور پکڑا گیا ہے اس لیے اس کا حق بنتا ہے کہ تیرے لیے کوئی نئی سزا تجویز کرے۔"

ربن نے اکھڑے ہوئے لہجے میں ماجد علی کی التجاؤں کا جواب دیا تو وہ امید بھری نظروں سے بوڑھے کپل داس کو دیکھنے لگا اور پھر اس کے آگے اپنے ہاتھ جوڑ دیے۔ "آپ ہی مجھ پر رحم کریں بزرگوار۔ میں آپ کے بچوں جیسا ہوں۔ مجھے اپنا بچہ سمجھ کر ہی ..... معاف کر دیں۔"

"چپ کر مردود۔ تیرے جیسا مکار اساں دے پورے کنبے وچ نہیں ہے۔ ساڈے بچے شہ زور ہوندے سی ہور زنانیوں نوں ساڈی لڑائی وچ نہیں لاندے۔" اس کی بات کپل داس کو بچھو کے ڈنک کی طرح لگی اور اس نے فوراً ہی اسے جھڑک کر رکھ دیا۔

"غلطی ہوگئی پہلوان جی۔ غصے اور لالچ میں میری مت ہی ماری گئی تھی لیکن میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ کبھی ایسی غلطی نہیں ہوگی۔" وہ جھڑکی سن کر خاموش بیٹھ جانے والا آدمی نہیں تھا۔ اس وقت تو ویسے بھی اس کی جان پر بنی ہوئی تھی اس لیے ڈانٹ پھٹکار سن کر بھی اس کوشش میں لگا ہوا تھا کہ کسی طرح ربن کی تجویز کردہ سزا کو معاف کروا لے۔

"پاپ کو غلطی بول کر اکھیاں وچ دھول نہ جھونک۔ ایسی مکاری وچ منصوبہ بنا کر کڑی نوں گھر سے بھگانا غلطی نہیں پاپ ہے پاپ ...... ہور پاپ کا بھگتان تو دینا ہی پڑے گا۔" سختی سے کپل داس نے اسے دوبارہ جھڑک ڈالا۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں، مجھ سے گناہ ہی ہوا ہے لیکن معافی مانگنے پر تو اوپر والا بھی رحم کر دیتا ہے۔ آپ بھی مجھ پر

رحم کیجیے۔" ماجد علی نے بڑے استقلال سے اپنی جاں خلاصی کی کوشش جاری رکھی۔

"تو دس منو......تو کیا کہتا ہے؟" کپل داس نے موہن داس سے پوچھا۔

"جیسی تہاڈی مرضی چاچا جی۔" منو پہلوان کی حیثیت سے شہر میں اپنی دہشت جمانے والا وہ تنومند جوان اپنے بوڑھے اور کمزور چچا کا فرمانبردار تھا۔

"نہ......تو دس۔" کپل داس نے جیسے اسے حکم دیا۔

"انہاں نو تھانیدار دے حوالے کر دیتے ہیں فیر تھانیداراں نو دس دیں گے کہ انہاں نو کتنے دن واسطے پروہنا بنانا ہے ہور کتنی خاطر داری کرنی ہے۔ تھانیداری چھترول دو چار ماہ میں انہاں نو بندے دا پتر بنا دے گی۔" آخر کار منو پہلوان نے ان کے لیے سزا تجویز کر دی جس سے کسی نے اختلاف نہیں کیا۔ ماجد علی نے البتہ کچھ بولنے کی کوشش کی لیکن اسے یہ کہہ کر خاموش کروا دیا گیا کہ اگر اسے منو پہلوان کی تجویز کردہ سزا قبول نہیں تو پھر پہلی سزا پر عمل درآمد ہوگا۔ ظاہر ہے وہ کتوں سے اپنا گوشت نچوانا کسی صورت قبول نہیں کر سکتا تھا چنانچہ چاروناچار خاموش ہو گیا۔ فیصلہ ہو جانے کے بعد اسے اور کالیا دونوں کو وہاں سے لے جایا گیا۔ کالیا کو اس کے کیے کی کیا سزا دی جانے والی تھی، اس کا اعلان نہیں کیا گیا تھا۔ ان میں سے کسی نے اس بابت دریافت بھی نہیں کیا کہ یہ منو پہلوان کے اڈے کا اندرونی معاملہ تھا اور وہ اسے اپنے طور پر جس طرح چاہتے نمٹاتے۔

ان دونوں کو وہاں سے لے جائے جانے کے بعد ربن نے بھی اجازت طلب کر لی۔ وہ لوگ اڈے سے ہوٹل کے لیے روانہ ہوئے تو اپنی اپنی جگہ بالکل خاموش تھے۔ یہاں تک کہ بہت بولنے والا نادان سا گولو بھی چپ تھا۔

☆☆☆

جولیٹ کی آنکھوں میں ویرانی کا راج تھا۔ چہرے کی رنگت میں زردی گھنڈی تھی۔ نیم وا خشک ہونٹوں پر پپڑیاں سی جم گئی تھیں اور وہ گھر کی ایک دیوار سے پشت ٹکائے بیٹھی حسرت و یاس کی تصویر نظر آتی تھی۔ محلے والے اپنی سی کوشش کر رہے تھے کہ اس کا غم بانٹ سکیں لیکن غم بانٹنے والے ہمدردوں کو بھی اندازہ تھا کہ یہ اتنی آسان بات نہیں ہے۔ جوزف کی موت نے اسے بالکل تہی داماں کر دیا تھا اور ایسے محروم انسان کا دکھ جس انتہا پر ہوتا ہے، اس کے لیے ہمدردی و خلوص کے سارے لفظ مل کر بھی اثر نہیں دکھا پاتے۔ صبر و ہمت کی تلقین کرنے والوں کو بھی معلوم ہوتا ہے کہ دکھ کی اس انتہا پر صبر کرنا آسان نہیں ہوتا...... خاص طور پر ابتدائی مرحلے میں۔ ہاں وقت آگے سرکتا ہے تو قدرتی طور پر غم کی شدت میں کمی آنا شروع ہو جاتی ہے اور قدرت کی طرف سے ہی ایسے انتظامات ہونے لگتے ہیں کہ آدمی دنیا کی گہما گہمی میں شامل ہوتا چلا جاتا ہے لیکن یہ سب بتدریج ہی ہوتا ہے۔ جولیٹ بھی ابھی ابتدائی مراحل کی تلخی سے گزر رہی تھی۔

جوزف کو آخری رسومات کی ادائیگی کے بعد اس کی ابدی آرام گاہ پہنچا دیا گیا تھا اور اس سارے عمل سے گزرتی جولیٹ جیسے ماں کی موت کے غم سے بھی دوبارہ گزر رہی تھی۔ دلدار آغا کی قید میں ہونے کی وجہ سے اسے جوزفین کی آخری رسومات میں شریک ہونے کا موقع نہیں ملا تھا لیکن جوزف کی آخری رسومات میں شامل جیسے وہ ان سارے مراحل سے بھی گزر رہی تھی جن میں پہلے شریک نہیں ہو سکی تھی۔ دوہرے غم کے اس طلاپ نے اسے نڈھال کر دیا تھا اور اس کی حالت دیکھنے والوں کو یہی محسوس ہو رہا تھا کہ وہ کسی بھی لمحے بے ہوش ہو کر گر سکتی ہے۔ خواتین کوشش کرتی رہی تھیں کہ اسے تقویت پہنچانے کے لیے پانی یا کوئی مشروب پلا دیں لیکن وہ اپنے حلق سے ایک قطرہ بھی نیچے اتارنے کے لیے راضی نہیں ہوئی تھی۔ اب بھی اس کے سامنے کھانے کے برتن رکھے تھے جنہیں اس نے نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ اطراف سے بے خبر وہ اپنے آپ میں گم تھی اور اس بات سے قطعی بے نیاز نظر آتی تھی کہ اس کے گرد کتنے غم بانٹنے والے موجود ہیں۔

"جولی! کھانا کھا لے بیٹی۔ تو کب سے ایسے ہی بھوکی پیاسی بیٹھی ہے۔ اس طرح بھوکا رہنے سے کیا ملے گا۔ بھوکا پیاسا رہنے سے پرلوک سدھار جانے والے لوٹ کر تو نہیں آجاتے نا۔ چل میری بچی تھوڑا سا کھا لے۔" یہ للیتا موسی تھی جو اس کے قریب بیٹھی اسے سمجھا رہی تھی۔

"میرا کچھ کھانے پینے کا دل نہیں چاہ رہا موسی۔" اس نے بے بس سے انداز میں موسی کو جواب دیا۔

"تیرے من کے حال کی مجھے خبر ہے بچی۔ میں پورے پچاس ورشوں کی تھی جب میرا بابو پرلوک سدھارا تھا۔ مرنے سے پہلے اس نے سال بھر کھاٹ پر پڑے بیماری کاٹی تھی پھر بھی اس کے جانے پر میرے من کو چین نہیں آتا تھا تو بھلا تیرے لیے چند دنوں میں چٹ پٹ ہو جانے والے ماں باپ کی موت کا صدمہ سہنا کہاں آسان ہوگا...... لیکن جینا تو ہے نا اور جب تک جیون ہے،

اس پاپی پیٹ کو بھی بھرنا ہے۔'' للیتا نے رقت آمیز لہجے میں اسے سمجھایا۔
''موسی ٹھیک کہہ رہی ہیں جولیٹ۔ زندگی ہے تو زندگی کے لوازمات بھی پورے کرنے پڑتے ہیں۔ ماں باپ اور شوہر سب مجھے چھوڑ کر چلے گئے لیکن پھر بھی میں جی رہی ہوں نا۔ اللہ نے بیٹے کی صورت جینے کا ایک سبب بنا دیا ہے۔ وہ بہت رحیم و غفور ہے۔ اپنے بندوں کو آزمائش میں ضرور ڈالتا ہے لیکن ان پر ظلم نہیں کرتا۔ اس کے کارخانہ قدرت میں کب کیا اور کیوں ہوتا ہے، ہم کم علم انسان اس کا سبب نہیں جانتے لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ کچھ بھی بے سبب نہیں ہوتا۔ یہ کائنات اس نے بنائی ہے اور وہی بہتر جانتا ہے کہ اسے کیسے چلانا ہے۔ ہم تو اس کے حکم پر سر جھکانے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔''
یہ ثریا بانو تھی جو ذرا مختلف انداز میں اس کی غم گساری کا فریضہ انجام دے رہی تھی۔ مجو دادا سے رہن کے ذریعے خلاصی کے بعد وہ خاصی پُرسکون ہو گئی تھی اور آہستہ آہستہ محلے میں اس کا میل ملاپ بھی شروع ہو گیا تھا اسی لیے آج وہ جوزف کی موت پر جولیٹ کے گھر میں بھی موجود تھی۔ ثریا بانو کے بعد محلے کی دوسری عورتیں بھی اپنے اپنے طور پر اسے سمجھانے اور دلاسا دینے کا فریضہ انجام دینے لگیں۔ ان سب کے پیہم اصرار پر اس نے روٹی کا ایک نوالہ سالن میں ڈبو کر اپنے منہ میں ڈالا۔ سالن کیا تھا اس پر اس نے پہلے ہی توجہ نہیں دی تھی۔ اب منہ میں نوالہ ڈالنے کے بعد بھی اسے کوئی ذائقہ محسوس نہیں ہوا۔ وہ بے دلی سے منہ میں ڈالے نوالے کو چبانے کی کوشش کرنے لگی لیکن وہ تو گویا ربر کا نوالہ تھا جو کسی طور اس سے چبایا ہی نہیں جا رہا تھا۔ اس نے چاہا کہ کسی طرح زبردستی اس نوالے کو اپنے حلق سے نیچے اتار لے لیکن اس کوشش میں بھی اسے ناکامی ہوئی اور نتیجہ ایک زوردار ابکائی کی صورت میں نکلا۔ ابکائی کے ساتھ ہی اس کے منہ میں موجود نوالہ بھی باہر آ گیا اور وہ بے دم سی ہو کر گہری گہری سانسیں لینے لگی۔
ثریا بانو نے جلدی سے گلاس میں پانی انڈیل کر اس کے لبوں سے لگایا، ایک عورت اس کی پشت سہلانے لگی اور یوں بڑی دقت سے اس نے پانی کے دو گھونٹ حلق سے نیچے اتارے۔ پانی پلانے کے بعد ان لوگوں نے اسے وہیں لٹا دیا۔ آہستہ آہستہ اس کے نڈھال سے وجود کو نیند نے اپنی مہربان آغوش میں لے لیا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ کتنی دیر مدہوشی جیسی اس نیند کی آغوش میں رہی لیکن گھر میں موجود رش کے چھٹ جانے سے اتنا اندازہ ضرور ہو گیا کہ اچھا خاصا وقت گزر گیا ہے اس لیے بیشتر خواتین واپس جا چکی ہیں۔
اس وقت وہاں للیتا موسی اور دو تین دوسری عمر رسیدہ خواتین ہی موجود تھیں۔ اس نے موسی کی ہدایت پر غسل خانے کا رخ کیا۔ نہانے سے اس کی بوجھل طبیعت اور ٹوٹتے جسم پر اچھا اثر پڑا۔ غسل خانے سے نکل کر وہ واپس کمرے میں آئی تو ثریا بانو اپنے بیٹے کے ساتھ آئی بیٹھی تھی۔ اس کے برابر میں جست کا ایک توشے دان بھی رکھا تھا۔ سلام دعا کرنے کے بعد اس نے جولیٹ سے اس کا حال دریافت کیا۔
''پہلے سے بہتر ہوں۔'' اس نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔
''اللہ تعالیٰ مزید بہتری عطا کرے گا۔ اب ہمت کر کے تھوڑا سا کچھ کھا لو۔ میں خاص طور پر تمہارے لیے دلیا بنا کر لائی ہوں۔ مجھے اندازہ ہوا تھا کہ تمہارے لیے روٹی چبا کر کھانا مشکل ہو رہا ہے، روٹی کی نسبت تم یہ دلیا آسانی سے کھا لو گی۔'' نرم لہجے میں کہتے ہوئے ثریا بانو نے توشے دان کھولا اور ایک پلیٹ میں اس کے لیے دلیا نکالا۔ دلیے کی خوشبو اشتہا انگیز تھی اور دیکھنے میں بھی خوش ذائقہ محسوس ہوتا تھا۔
''لو بیٹا تصور! اپنے ہاتھ سے اپنی باجی جان کو یہ دلیا کھلاؤ۔'' دلیا پلیٹ میں نکالنے کے بعد ثریا بانو نے اپنے چھ سالہ بیٹے کو مخاطب کیا تو بچہ کچھ شرماتا اور جھجکتا ہوا ماں کے حکم کی تعمیل کے لیے اپنی جگہ سے اٹھا۔ ماں جیسے ہی نقوش اور رنگت رکھنے والا وہ بچہ خاصا من موہنا تھا۔ جولیٹ کے دل کو بھی اس نے چھو لیا چنانچہ جب اس نے چمچ بھر کر دلیا اس کی طرف بڑھایا تو وہ انکار نہیں کر سکی اور فوراً ہی منہ کھول دیا۔ تصور اسے ایک کے بعد دوسرا اور پھر تیسرا چمچ کھلاتا چلا گیا۔ دلیا بہت ذائقے دار تھا اور سب سے بڑھ کر تصور کے معصومانہ حسن و ادا کا کمال تھا کہ جولیٹ نے کافی حد تک پلیٹ میں نکالا گیا دلیا کھا لیا۔
''ارے بچے تو نے تو چمتکار دکھا دیا۔'' جولیٹ کھانے کے بعد پانی پی رہی تھی جب للیتا موسی نے تصور کی بلائیں لیتے ہوئے خوشی سے کہا۔
''بچے تو ہوتے ہی جادوگر ہیں۔ تو بھی اب جلدی سے بیاہ کر لینا جولی۔ دو تین بچے گود میں آ جائیں گے تو سارے دکھ بھاگ جائیں گے۔ ویسے بھی اب تو بالکل اکیلی رہ گئی ہے۔ تیرا بیاہ ہو جائے تو اچھا ہے۔ کسی دن بلا اس دفتر والے لڑکے کو۔ ہم محلے والے اس سے بیاہ کی بات کریں

گے۔'' وہاں موجود ایک دوسری عورت گفتگو میں شامل ہوئی اور ایک ایسا موضوع چھیڑ دیا جس نے جولیٹ کے دل کو بڑی زور کا چرکا لگایا۔ تکلیف ایسی تھی کہ وہ اپنے چہرے کے تاثرات کو چھپانے میں کامیاب نہیں ہوسکی۔

''ابھی ان باتوں کو جانے دے کوشلیا۔ یہ سنبھل جائے تو پھر دیکھا جائے گا۔'' للیتا موسی سے اس کی کیفیت چھپی نہیں رہی اور اس نے عورت کو ٹوک دیا۔ عورتوں کی فطرت کے مطابق وہ کھوجی اور باتونی تو ضرور تھی لیکن پرانی محلے داری کے باعث جولیٹ سے محبت بھی کرتی تھی اس لیے اس وقت بھی اس کا تکلیف میں مبتلا ہونا برداشت نہیں کرسکی تھی۔

''ہاں ہاں۔ یہ سنبھل جائے تب ہی بیاہ کی بات کریں گے۔'' کوشلیا نامی عورت نے بھی فوراً ہی اس کی تائید کی۔ اس کے بعد وہ سب اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگیں۔ جولیٹ عدم توجہی سے ان کی باتیں سنتی رہی۔ سب سے پہلے ثریا بانو وہاں سے رخصت ہوئی پھر ایک ایک کرکے سب اپنے گھروں کو واپس چلی گئیں۔ واحد للیتا موسی تھی جو رکی رہی۔ وہ رات اس کے ساتھ ہی رکنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ جولیٹ کو بھی اس کا دم غنیمت معلوم ہوا کیونکہ آج گھر کی تنہائی ایسی تھی جو کاٹ کھانے کو دوڑتی محسوس ہو رہی تھی حالانکہ اس سے قبل وہ جوزف کے اسپتال میں داخل ہونے کے وقت بھی اکیلی گھر میں رک چکی تھی لیکن اس وقت یہ عالم نہیں تھا۔ شاید اس لیے کہ اس وقت اس گھر کے در و دیوار کو یہ امید تھی کہ ان کا مالک لوٹ کر یہاں واپس آئے گا لیکن اب تو در و دیوار بھی مایوس ہو کر حسرت و یاس کی تصویر بن گئے تھے اور جوزف کی موت پر بین کرتے محسوس ہو رہے تھے۔

موسی سب کے جانے کے بعد کچھ دیر تو اس کے پاس بیٹھی تسلی دلاسے کی باتیں کرتی رہی لیکن آہستہ آہستہ اس پر سستی چھانے لگی۔ اس کے کئی گھنٹے بے آرامی میں گزر چکے تھے اور اب جسم آرام مانگ رہا تھا چنانچہ آخر کار وہ ہمت ہار کر سو ہی گئی۔ جولیٹ کی آنکھوں سے البتہ نیند دور تھی۔ اس کا ذہن مسلسل اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعات و حادثات میں الجھا ہوا تھا اور وہ سوچ رہی تھی کہ اس کی زندگی میں اتنی تیزی سے اور اتنے ڈھیر سارے حادثات کیوں پیش آ گئے۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے ہی کی تو بات تھی کہ وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ ایک سیدھی سادی اور خوش باش زندگی گزار رہی تھی۔ والدین کی طرف سے اسے تھوڑے میں بہت سا خوش رہنے کی فطرت ورثے میں ملی تھی چنانچہ وہ اسی میں خوش تھی کہ وہ ایک تعلیم یافتہ اور برسرِ روزگار لڑکی ہے۔ عارف کی محبت بھی اس کے لیے ایک خوشی تھی اور وہ اس کے ساتھ ایک پُرسکون زندگی گزارنے کے خواب دیکھا کرتی تھی لیکن مختصر عرصے میں ہی سب کچھ برباد ہو کر رہ گیا۔ دلدار آغا کے انٹرویو کے لیے جانا اس کے لیے عذاب ہو گیا تھا۔ آغا نے پہلے اسے اپنی دولت اور نوازشات کے جال میں پھنسانے کی کوشش کی اور پھر اپنے ان حربوں کو ناکام جاتا دیکھ کر بربریت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے اغوا کروا کر برباد کر ڈالا۔ اس کے اغوا کے حادثے نے ایک طرف جوزفین کی جان لے لی تو دوسری طرف عارف محبت کی آزمائش میں ناکام ہو کر اس کی زندگی سے نکل گیا.....

جوزفین کی موت جوزف کے لیے ایک ناقابلِ برداشت سانحہ بن گئی اور وہ ایسا بستر سے لگا کہ پھر موت کی آغوش میں جا کر ہی سکون پایا۔ اتنے ڈھیر سارے نقصانات سہنے کے بعد وہ ابھی تک اپنے مجرم سے انتقام لینے میں ناکام تھی۔ جانے قدرت کو کیا منظور تھا کہ اس کی تمام تر کوشش کے باوجود آغا اس کے نشانے پر آنے سے رہ جاتا تھا۔ اس بار بھی اس نے کامل ارادہ کر لیا تھا کہ آغا کو موت کے گھاٹ اتار کر ہی دم لے گی۔ جلسے میں شرکت اور وہاں آغا کو نشانہ بنانے کی اس نے اپنے ذہن میں مکمل منصوبہ بندی بھی کر لی تھی لیکن اسپتال سے آنے والے فون نے سب درہم برہم کر ڈالا۔ اسپتال پہنچ کر وہ ایسی الجھی کہ اسے آغا سے بدلہ لینے والی بات یاد بھی نہ آسکی۔ ہتھیلی کا چھالا بنا کر پرورش کرنے والے باپ کی موت کے صدمے نے اسے نڈھال کر ڈالا اور بے پناہ شدت رکھنے والا جذبۂ انتقام بھی اس صدمے کے زیرِ اثر قلیل عرصے کے لیے ماند پڑ گیا لیکن اب جبکہ وہ ابتدائی صدمے کے مراحل سے گزر چکی تھی، ایک بار پھر آغا کے لیے نفرت کا الاؤ دہک گیا تھا اور انتقام کی خواہش اور بھی شدت سے ابھر رہی تھی۔ اس خواہش میں جلتی سلگتی وہ نیند سے کوسوں دور تھی اور پہاڑ جیسی رات گزارنا مشکل ہو رہا تھا۔ بہت دیر بستر پر کروٹیں بدلنے کے بعد بالآخر اس نے تھک ہار کر بستر چھوڑ دیا۔ اس کی کیفیت سے بے خبر للیتا موسی گہری نیند سو رہی تھی اور کمرے کی خاموشی میں اس کے ہلکے ہلکے خراٹوں کی آواز ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔

موسی کو سوتا ہوا چھوڑ کر وہ دبے قدموں کمرے سے باہر نکلی۔ وہ دونوں جس کمرے میں سونے کے لیے لیٹی تھیں، وہ جوزف اور جوزفین کا کمرا تھا۔ سونے کے لیے اس

کمرے کا انتخاب اس نے خود ہی کیا تھا۔ اس انتخاب کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ یہاں دو بستر موجود تھے چنانچہ وہ اور موسی آرام سے سو سکتے تھے۔ دوسری وجہ جو اس نے موسی کو نہیں بتائی تھی، وہ یہ تھی کہ وہ اپنے ماں باپ کے کمرے میں ان کی خوشبوؤں کے حصار میں سونا چاہتی تھی لیکن یہ خواہش اسے مہنگی پڑی اور دیگر عوامل کے علاوہ یادوں کی یلغار نے بھی اسے اتنا بے چین کیا کہ ایک پل کے لیے بھی آنکھ نہ لگ سکی۔ آدھی سے زیادہ رات آنکھوں میں کاٹنے کے بعد وہ اس کمرے سے نکل کر اپنے کمرے میں پہنچ گئی۔ اس کا بہت سلیقے اور ترتیب سے رہنے والا کمرا اس وقت ابتری کا شکار تھا۔ گھر زیادہ بڑا نہیں تھا اس لیے تعزیت کے لیے آنے والی عورتوں میں سے کئی عورتیں اس کے کمرے میں بھی بیٹھی تھیں۔ چند عورتوں کے ساتھ ان کے بچے بھی موجود تھے اس لیے کمرے کی حالت بگڑ کر رہ گئی تھی۔ اس نے وقت گزاری کے لیے چیزیں اٹھا اٹھا کر ان کی جگہ پر رکھنا شروع کر دیا۔ سب چیزیں اپنے ٹھکانے پر پہنچ گئیں تو وہ بستر کی چادر کی طرف متوجہ ہوئی۔ چادر میلی ہو رہی تھی۔ اس نے میلی چادر بستر پر سے اتاری اور دھلی ہوئی چادر نکالنے کے لیے الماری کی طرف بڑھی۔ الماری کھول کر اس نے اس میں سے چادر نکالی تو اس نقرئی باکس پر بھی نظر پڑ گئی جو جوزف نے اس کے حوالے کیا تھا۔ بے ساختہ ہی اس نے ہاتھ بڑھا کر باکس باہر نکال لیا۔ چاندی کے اس چمکتے ہوئے باکس پر اس کی ماں کے ہاتھوں کا نادیدہ لمس موجود تھا۔ اس نے دفور شدت سے باکس کو چوما تو ایسا لگا کہ ماں کی خوشبو نے اسے اپنے حصار میں لے لیا ہو۔ اس نے بڑی محبت اور احتیاط سے باکس کو اپنی لکھنے کی میز پر رکھ دیا اور پہلے بستر کی چادر تبدیل کرنے لگی۔

چادر تبدیل کرنے کے بعد وہ باکس ہاتھ میں لے کر بستر پر ہی آبیٹھی۔ اسے یاد آرہا تھا کہ جوزف نے اس باکس کو اس کی ماں کی امانت قرار دیتے ہوئے اس کے حوالے کیا تھا اور دوبارہ مرنے سے پہلے بھی بطور خاص اسے ہدایت کی تھی کہ وہ اپنی مام کی ڈائری ضرور پڑھ لے۔ جوزف نے ہی اسے یہ بھی بتایا تھا کہ ڈائری اس باکس میں موجود ہے۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ اس ڈائری کو پڑھنے کے بعد وہ اس دنیا میں تنہا نہیں رہے گی۔ یعنی کوئی راز تھا جو اس ڈائری میں چھپا ہوا تھا۔ راز کو جاننے کے فطری سے تجسس کے تحت اس نے چاندی کے اس باکس کو کھولا تو اس کی انگلیوں میں کپکپاہٹ سی تھی۔ باکس کو کھولتے ہی اس کے نتھنوں سے ایک کیف آگیں سی خوشبو ٹکرائی، اس کے بعد اس کی نظروں نے اس لمبی اور چپٹی ڈبیا کو دیکھا جو یقیناً صندل کی لکڑی سے بنائی گئی تھی اور اس کی حسِ شامہ سے ٹکرانے والی خوشبو صندل ہی کی تھی۔ اس نے ڈبیا کو باہر نکال کر ذرا قریب سے غور سے دیکھا۔ اس پر بہت خوب صورت نقش و نگار کندہ تھے جو یقیناً کسی بہت ماہر فنکار کے فن کا منہ بولتا ثبوت تھے۔ فن کے اس نمونے سے متاثر ہوتے ہوئے اس نے ڈبیا کو کھولا تو اس کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ ڈبیا کے اندرونی حصے میں سرخ مخمل کی تہ بچھی ہوئی تھی اور اس تہ کے اوپر سونے کی بل کھاتی موٹی سی چمکتی ہوئی زنجیر میں ایک ایسا لاکٹ پرویا ہوا تھا جس کے درمیان میں موجود سبز رنگ کا چوکور جگمگاتا ہوا پتھر ننھے ننھے ست رنگی شعاعیں منعکس کرتے شفاف پتھروں سے گھرا ہوا تھا۔ جولیٹ دم بخود سی اس لاکٹ کو دیکھتی رہی۔

اس کا تعلق سفید پوش گھرانے سے تھا اور اس نے کبھی اپنی ماں کو قیمتی زیورات پہنے نہیں دیکھا تھا۔ اس کے اردگرد بسنے والی دیگر خواتین کے پاس بھی سونے کا ایک آدھ ہی زیور موجود تھا، ایسے میں ہیرے جواہرات کی تو گنجائش ہی نہیں نکلتی تھی۔ ہاں یونیورسٹی میں البتہ ثنا اور اس کے طبقے کی چند لڑکیاں خاص مواقع پر ایسے کانوں کے ٹاپس، لاکٹ یا لونگ پہن آتی تھیں جن میں ہیرے جڑے ہوتے تھے چنانچہ وہ کسی حد تک ہیرے کی جگمگاہٹ اور شان سے واقف تھی لیکن اس وقت اس کے سامنے جو جڑاؤ لاکٹ رکھا تھا اس کی شان تو سب سے جدا اور نرالی تھی۔ ثنا اور اس کے طبقے کی لڑکیوں کے پاس دیکھے گئے ہیرے جڑے زیورات سے اس لاکٹ کا کوئی مقابلہ ہی نہیں تھا۔ یہ تو زیورات کی اس قسم میں سے معلوم ہوتا تھا جنہیں نوادرات میں شمار کیا جاتا تھا۔ اس نے اخبارات میں چھپنے والی ہندوستان کے شاہی خاندان کے نادر زیورات اور ملکۂ برطانیہ کے زیورات کی تصاویر دیکھ رکھی تھیں اور اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے سامنے موجود لاکٹ ان زیورات کا ہم پلہ تھا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ اس کی ماں کے پاس اتنے قیمتی زیور کی موجودگی کا کیا سبب تھا۔ زیور تو دور کی بات، اس نے جوزفین کو کبھی بہت زیادہ قیمتی لباس بھی پہنے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ میانہ روی سے زندگی گزارنے والے اس کے ماں باپ دونوں ہی کی یہ خواہش ہوتی تھی کہ وہ اپنی ذات سے زیادہ جولیٹ پر خرچ کریں۔ اپنی اس خواہش کے زیرِاثر ہی انہوں نے اسے اچھی تعلیم بھی دلوائی تھی۔ جوزف نے جس وقت یہ جیولری باکس اس کے حوالے کیا تھا اس نے بھی سوچا

تھا کہ اس سے بے پناہ محبت کرنے والی ماں نے جوڑ توڑ کر کے شاید اس کے لیے کچھ زیورات بنوائے ہیں اسی لیے اس نے فوری طور پر اس جیولری باکس کو کھول کر دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی جس میں موجود قیمتی زنجیر میں پرویا ہوا یہ بیش قیمت لاکٹ معما بن گیا تھا۔ معمے کے حل کے لیے اسے اس ڈائری کا خیال آیا جسے پڑھنے کی جوزف نے اسے بطورِ خاص تاکید کی تھی۔

مستطیل شکل کے جیولری باکس کے اوپری حصے میں تو صرف اس لاکٹ اور زنجیر کی ڈبیا ہی رکھی تھی۔ اس نے جیولری باکس کا جائزہ لیا تو اندازہ ہوا کہ اس کے اوپری خانے کو کھسکا کر نچلا خانہ کھولا جا سکتا ہے۔ ڈائری کی جستجو میں اس نے نچلے خانے کو کھولا۔ حسب توقع وہاں ایک ڈائری موجود تھی۔ چھوٹے سائز کی سرخ مخملیں جلد والی اس ڈائری کو باکس سے باہر نکالتے ہوئے اس نے اپنی انگلیوں کی واضح لرزش کو محسوس کیا۔ ایک انجان سا احساس تھا جو اس کے دل کو بری طرح دھڑکا رہا تھا اور وہ محسوس کر رہی تھی کہ اس پر کچھ ایسے انکشافات ہونے والے ہیں جو براہِ راست اس کی زندگی پر اثر انداز ہوں گے۔ زندگی کچھ عرصے سے یوں بھی اس کے لیے سلسلۂ آزمائش بن چلی تھی اس لیے اسے خدشہ تھا کہ اس ڈائری کو پڑھنے سے آزمائشوں کا یہ سلسلہ مزید دراز ہو جائے گا لیکن اس خدشے کے تحت وہ ڈائری پڑھنے سے باز بھی نہیں رہ سکتی تھی کیونکہ جوزف نے کہا تھا کہ ممکن ہے اس ڈائری کو پڑھنے کے بعد وہ تنہا نہ رہے۔ وہ تنہائی کی اذیت سے نکلنا چاہتی تھی اس لیے بھی یہ ڈائری پڑھنا ضروری تھا اور پھر جیولری باکس میں سے نکلنے والے بیش قیمت لاکٹ کا معما بھی تو حل کرنا تھا کہ یہ لاکٹ اس کی ماں کی تحویل میں آیا تو کیسے؟ کیونکہ جہاں تک جوزف اور جوزفین نے اسے اپنے پس منظر سے آگاہ کیا تھا، وہاں تو غربت و افلاس کے ڈیرے تھے اور جہاں اتنی غربت ہو وہاں ایسی قیمتی چیزیں خریدنا تو درکنار تحفے میں ملنا بھی ممکن نہیں ہوتا کہ قسمت سے اگر غریب آدمی کے کسی پیسے والے سے روابط قائم بھی ہو جائیں تو دینے والا سامنے والے کی حیثیت دیکھ کر ہی تحفہ دیتا ہے اور یہ لاکٹ تو اتنا قیمتی اور نادر لگ رہا تھا کہ دینے والا اپنے کسی ہم پلہ فرد کو بھی اسی صورت دے سکتا تھا کہ کوئی خاص مقصد یا خصوصی جذباتی وابستگی کا معاملہ ہو۔

اسے معلوم تھا کہ اس کے والدین بچپن کے ساتھی اور دوست تھے اور ان کی شادی باہمی رضامندی سے انجام پائی تھی۔ اس لیے اس بات کا بھی کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا تھا کہ جوزفین کو کسی امیر زادے نے اپنی محبت کی نشانی کے طور پر یہ لاکٹ تحفے میں دیا ہو۔ سارے امکانات کو رد کرنے کے بعد اس کے ذہن میں ایک زہریلا امکان کلبلایا کہ ممکن ہے اس کے والدین میں سے کسی نے اس لاکٹ کو کہیں سے چرایا ہو لیکن اس صورت میں انہیں لاکٹ فروخت کر دینا چاہیے تھا نہ کہ ساری زندگی سفید پوشی کا بھرم رکھنے میں گزار دینی چاہیے تھی۔ کیا انہوں نے یہ لاکٹ اس لیے بچا کر رکھا تھا کہ بعد میں جولیٹ اس کے سہارے ایک پرتعیش زندگی گزار سکے؟

جوں جوں وہ سوچتی جا رہی تھی اس کا ذہن الجھتا ہی جا رہا تھا۔ خود اس کو الجھن سے نکالنے کا بہترین طریقہ یہی تھا کہ وہ اس ڈائری کو پڑھ ڈالتی چنانچہ دھک دھک کرتے دل کے ساتھ ڈائری کھول کر اس کا پہلا صفحہ نکالا۔ یہ بہت زیادہ پرانی ڈائری نہیں تھی اور اس پر چند سال قبل کا سن ہی درج تھا۔ ڈائری کے چکنے صفحے پر نیلی روشنائی میں درج جوزفین کی موتیوں جیسی تحریر جگمگا رہی تھی۔ اس نے تحریر پڑھنی شروع کی۔ جوزفین نے اسے مخاطب کرتے ہوئے لکھا تھا۔

''پیاری بیٹی جولی! تم مجھے کتنی عزیز ہو اس بات کا اندازہ شاید اسی وقت لگا سکو جب خود ماں بنو کیونکہ اولاد ماں کے وجود ہی کا ایک حصہ ہوتی ہے اور اپنی ذات سے محبت عین فطرت ہے۔ تمہیں اپنے وجود کا سب سے قیمتی حصہ تسلیم کرتے ہوئے میں ضروری سمجھتی ہوں کہ تم سے وہ سب کچھ شیئر کروں جو میری زندگی کا حصہ رہا لیکن تم اس سے لاعلم رہیں حالانکہ میری زندگی سے تمہاری زندگی اس طرح جڑی ہے کہ تم ہر سچائی جاننے کا پورا پورا حق رکھتی ہو۔ میں تم سے پوشیدہ اپنی زندگی کے ابواب کو تمہاری امانت جان کر اس ڈائری میں تحریر کر رہی ہوں لیکن میں نے فیصلہ کیا ہے کہ یہ ڈائری تمہارے حوالے اس وقت کی جائے گی جب تمہاری زندگی میں میرا اور جوزف کا کردار ختم ہو جائے گا۔ موت اور زندگی کے بارے میں تو خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کون کب تک جیے گا اور کسے پہلے موت دبوچ لے گی البتہ میں نے جوزف کو اپنے اس فیصلے سے آگاہ کر دیا ہے کہ ہم دونوں میں سے جو باقی رہ گیا، وہ اپنا آخری وقت قریب دیکھ کر تمہاری امانت تمہارے سپرد کر دے گا۔ ہماری اچانک یا حادثاتی موت کی صورت میں بھی تمہیں گھر کے سامان میں سے یہ جیولری باکس مل ہی جائے گا اس لیے میں مطمئن ہوں

کہ تمہیں تمہاری امانت پہنچ جائے گی۔ اپنی داستانِ حیات کا باقاعدہ آغاز کرنے سے پہلے میں تم سے اتنی درخواست ضرور کروں گی کہ اس ڈائری کو جولیٹ نہیں جوزفین بن کر پڑھنا تاکہ اصل روح تک اتر سکو اور اپنی ماں کو مجرم نہ سمجھو۔ اگر پھر بھی تمہیں لگے کہ میں قصوروار تھی تو میرے پاس تم سے معذرت کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں کیونکہ جو کچھ بیت چکا، اسے بدلا نہیں جاسکتا تھا البتہ میں نے اپنی سی پوری کوشش ضرور کی کہ زندگی میں تمہارے لیے جو بہترین کرسکتی ہوں، ضرور کروں اور اس کے لیے میں جوزف کی بے حد شکرگزار ہوں کہ اس نے زندگی کے ہر امتحان میں میرا بھرپور ساتھ دیا اور مجھ سے محبت کے دعوے کو اس طرح سے نبھایا کہ میرا رواں رواں اس کی محبت سے ڈوب گیا ہے اور میں پورے یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ اگر جوزف مجھے اندھی کھائی میں کودنے کا حکم بھی دے تو میں بلاجھجک کود جاؤں گی کہ مجھے اس پر اعتبار ہے کہ وہ کبھی میرے ساتھ کچھ غلط کر ہی نہیں سکتا اور اس کے حکم پر اندھی کھائی میں کود کر بھی مجھے کسی گل گلزار سے ہی واسطہ پڑے گا۔"

جوزفین کے الفاظ پڑھتے ہوئے اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ کتنی مثالی محبت تھی اس کے ماں باپ میں۔ وہ دونوں جیسے ایک دوسرے کے لیے ہی بنے تھے اور اتنی شدت سے ایک دوسرے کو چاہا تھا کہ زندگی کا پل پل ساتھ گزارنے کے بعد بھی اس شدت میں کمی نہیں آئی تھی جب ہی تو جوزف اپنی جوزفین کی چند دن کی جدائی بھی نہ سہہ سکا تھا اور اس کے پیچھے ہی اپنی آخری منزل کی طرف گامزن ہوگیا تھا۔

"میں نے تمہیں لمبی تمہید میں الجھا لیا۔ بہتر ہوگا کہ اب میں یہ تمہید بند کردوں اور وہ لکھوں جسے تم تک پہنچانا ضروری ہے۔ بہت سی نیک تمناؤں اور دعاؤں کے ساتھ۔
تمہاری ماں جوزفین جوزف۔"

بھیگی آنکھوں کے ساتھ اس نے اس تمہیدی مضمون کی باقی رہ جانے والی آخری چند سطریں پڑھیں اور صفحہ پلٹ کر ڈائری کا وہ حصہ کھولا جس میں جوزفین نے اس کے لیے اپنی داستانِ حیات رقم کی تھی۔ اس صفحے پر لکھا پہلا لفظ تھا "جوزف۔" وہ جوزف کے نام سے آگے لکھے الفاظ کو پڑھ نہیں پائی تھی کہ للیتا موسی کی آواز پر چونکی۔

"اے جولی...... تو کب اٹھی؟ میں پہلے تیرے کو رسوئی میں دیکھنے گئی تھی، ادھر نہیں ملی تو یہاں آگئی۔ تو یہاں کیا کر رہی ہے؟ اتنی صبح کیا لکھنے پڑھنے بیٹھ گئی ہے؟"

موسی کمرے کے دروازے پر کھڑی اس سے سوال جواب کر رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں موجود ڈائری کو دیکھ کر یقیناً وہ یہی سمجھی تھی کہ جولیٹ لکھنے پڑھنے کا کوئی کام کر رہی ہے۔ جولیٹ نے غیر محسوس طور پر بستر پر پڑی چادر جیولری باکس پر رکھ کر اسے چھپا دیا۔ اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ ابھی موسی کی نظر اس جیولری باکس پر نہیں پڑی ہے اور یہ اس کے حساب سے اچھا تھا۔ اگر موسی کی نظر پڑ جاتی تو وہ اپنی کھوجی فطرت کی وجہ سے فوراً اس جیولری باکس کا جائزہ لینے کے لیے لپکتی اور اس صورت میں اس کی نظروں میں وہ ڈبیا بھی آجاتی جس میں لاکٹ اور زنجیر موجود تھے۔ اتنی غیر معمولی شے نظر میں آجاتے پر موسی کے لامتناہی سوالات کا سلسلہ شروع ہوجاتا اور ابھی تو اسے خود ہی کچھ علم نہیں تھا تو موسی کے سوالوں کا کیا خاک جواب دیتی اور ضروری تو نہیں تھا کہ علم ہونے کی صورت میں بھی وہ موسی کو کچھ بتا پاتی۔ لاکٹ کا غیر معمولی پن اسے کسی غیر معمولی انکشاف کا اشارہ دے رہا تھا۔

"ایسے بیٹھی کیا ٹکر ٹکر میری صورت تک رہی ہے۔ چل چھوڑ یہ سب...... ابھی شاردا ناشتا لے کر آتی ہوگی اور تو نے تو لگتا ہے اٹھ کر منہ ہاتھ بھی نہیں دھویا ہے۔ جانے کب سے اٹھ کر ایسے ہی بیٹھی ہوئی ہے۔" اسے خاموش پا کر موسی بولتی ہی چلی گئی۔

"تم چلو موسی میں ابھی آتی ہوں۔" بالآخر اس نے لب کھول کر موسی کی تسلی کے لیے جواب دے ہی دیا۔

"میرے ساتھ ہی چل۔ ابھی آتی ہوں بول کر تو گھنٹا لگا دے گی۔" موسی کو اس کی بات پر گویا اعتبار نہیں تھا۔

"نہیں لگاؤں گی گھنٹا بس دو منٹ لگیں گے۔" وہ اتنی اہم چیزوں کو یوں ہی چھوڑ کر وہاں سے نہیں اٹھنا چاہتی تھی اس لیے موسی کو وہاں سے ٹالنے کی کوشش کی۔ اسی وقت قدرت کی طرف سے مدد کے طور پر بیرونی دروازے پر دستک کی آواز ابھری۔

"لگتا ہے شاردا ناشتا لے کر آگئی ہے۔" شاردا موسی کی بہو کا نام تھا۔ دروازے پر اس کی موجودگی کا قیاس کرتے ہوئے وہ تیزی سے باہر کی طرف لپکی۔ جولیٹ نے اس موقع کو غنیمت جانا اور جلدی سے جیولری باکس بند کرکے اسے الماری میں رکھ دیا۔ ڈائری کو اس نے دوبارہ باکس میں رکھنے سے گریز کیا تھا۔ باکس کو بار بار نکالنا مناسب نہیں تھا اور ڈائری کے مندرجات پڑھنے کے لیے اسے کئی بار نکالے جانے کی ضرورت تھی تاہم اس نے ڈائری بھی

حفاظت سے الماری کے اندر ہی رکھی اور الماری کے پٹ بند کر کے اسے تالا لگا دیا۔ جیولری باکس میں موجود بیش بہا شے کی موجودگی کے انکشاف کے بعد اس قسم کے حفاظتی اقدام ضروری تھے۔

☆☆☆

بالآخر وہ چنڈی گڑھ چھوڑ کر شملہ کے لیے روانہ ہونے میں کامیاب ہو ہی گئے تھے۔ بھابیہ سیٹھ کی بڑی سی گاڑی اس وقت چنڈی گڑھ سے شملہ جانے والے راستے پر گامزن تھی۔ بل کھاتا یہ پہاڑی راستہ اچھا خاصا دشوار گزار تھا لیکن بڑی گاڑی کی آرام دہ نشستوں پر انہیں نسبتاً کم تکلیف کا سامنا تھا۔

”اوہ گاڈ! کتنا ڈینجرس راستہ ہے۔ ہمارا تو سر چکرانے لگا۔“ کیتھرائن جس نے راستے کی پیچیدگی کے سبب پیشگی ہی فاروق کو سکون آور دوا کھلا کر راستے میں سوتے رہنے کی ہدایت کی تھی، خود کھڑکی سے باہر کے نظارے کرتی ہوئی جارہی تھی۔ راستہ خوب صورت تھا اور اس خوب صورتی کے سحر میں ہی گرفتار وہ بھول گئی تھی کہ اس طرح کا پیچیدہ چکردار راستہ عموماً خود پر سے گزرنے والوں کو بھی چکرا کر رکھ دیتا ہے۔ اس نزاکت کا خیال اسے اس وقت آیا جب راستے کی خوب صورتی پر اس کی پیچیدگی حاوی ہو کر اس کے اعصاب پر اثر انداز ہونے لگی۔ اس وقت اس نے ایک جھرجھری سی لے کر اپنا رخ بدلا اور آہستہ سے بڑبڑائی۔

”تمہارا تو باہر دیکھنے سے سر چکرا رہا ہے سسٹر۔ اپن تو آنکھیں بند کر کے بیٹھا ہے پھر بھی گول گول گھوم رہا ہے۔“ آنکھیں بند کر کے زیر لب کچھ پڑھتے گولو نے لمحہ بھر کے لیے اپنے ورد کا سلسلہ روکا اور بڑے دردناک لہجے میں اس کی بات پر تبصرہ کیا۔ اس کی بات سن کر کیتھرائن کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ چند دن کے ساتھ میں اسے پتا چل گیا تھا کہ گولو نہایت سادہ مزاج اور معصوم لڑکا ہے اور اپنی اس سادگی و معصومیت کی وجہ سے ہی ربن اور فاروق کا چہیتا بنا ہوا ہے۔ کیتھرائن نے دیکھا تھا کہ گولو کے ہم عمر لڑکے کیسے ہر وقت خود کو عقل مند اور بہادر ظاہر کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں لیکن اس نے نہایت معصومیت سے اعتراف کر لیا تھا کہ اسے ڈر لگ رہا ہے۔ گولو کے برابر میں فاروق موجود تھا۔ اس کا سر سیٹ کی پشت گاہ سے لگا ہوا تھا اور سانسوں کے تلاطم سے واضح تھا کہ وہ گہری نیند سو رہا ہے۔ ربن البتہ نہ صرف جاگ رہا تھا بلکہ راستے کو بھی اچھی طرح نظر میں رکھے ہوئے تھا۔ اس کے چہرے کے پُرسکون تاثرات بتا رہے تھے کہ اس چکردار راستے پر سفر کرتے ہوئے اسے کوئی پریشانی محسوس نہیں ہو رہی ہے۔ یہ اس کے مضبوط اعصاب کا مالک ہونے کا ایک اور ثبوت تھا۔

”ڈرائیور بھیا! تم اس گھمن پھیری راستے پر موٹر کیسے چلا رہے ہو۔ تمہارا سر نہیں چکرا رہا کیا؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ سر چکرائے اور تم موٹر کہیں دے مارو۔“ آنکھیں بند کیے دعاؤں کا ورد کرتے گولو کو ایک نئی فکر دامن گیر ہوئی اور اس نے ڈرائیور کو مخاطب کر کے اس سے دریافت کیا۔ اس سوال کو کرنے کے لیے اس نے اپنی آنکھیں ذرا دیر کے لیے کھولی تھیں اور یہ اتفاق تھا کہ عین اسی وقت گاڑی ایک خطرناک موڑ سے گزر رہی تھی۔ مارے دہشت کے گولو کے

تو فرشتے کوچ کر گئے اور اس نے گھبرا کر آنکھیں بند کرنے کے ساتھ ہی اپنے دونوں ہاتھ بھی چہرے پر اس طرح رکھ لیے جیسے کسی نادیدہ بلا سے بچنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس کی اس کیفیت پر ڈرائیور کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی تاہم وہ سنجیدگی سے بولا۔

''اپنا تو آئے دن اس راستے پر آنا جانا لگا رہتا ہے اس لیے اپنے لیے یہ راستہ بالکل ایسا ہے جیسے آپ لوگوں کے لیے بمبئی کی سڑکیں۔''

''بمبئی کی سڑکوں پر سفر کرنا کون سا آسان ہے۔ جگہ جگہ سے اکھڑی سڑکوں پر فٹ فٹ بھر موٹر اچھلتی ہے۔ بس میں بیٹھ جاؤ تو سالا اور بھی برا حال ہو جاتا ہے۔ بس کو جیٹ جہاز سمجھ کر سڑک پر چلاتے ہیں کم بخت ڈرائیور۔ اپن تو ادھر بھی کم ہی باہر نکلتا ہے۔ ابھی بھی اپنے فاروق بھیا کی خاطر اتنی دور آ گیا ہے۔ اپنے کو خبر ہے کہ اپنے جیسا کوئی فاروق بھیا کا دیکھ بھال نہیں کر سکتا ہے۔'' گولو نے بند آنکھوں کے ساتھ ہی ڈرائیور کی بات کے جواب میں اپنا موقف پیش کیا تو کیتھرائن کے ہونٹوں پر بے ساختہ ہی مسکراہٹ دوڑ گئی۔

بمبئی کی سڑکوں اور بسوں کے بارے میں گولو کے تبصرے سے اسے زیادہ اختلاف نہیں تھا۔ رہی فاروق کی دیکھ بھال والی بات تو اسے یقین تھا کہ وہ یہ کام بہت اچھی طرح کر سکتی ہے لیکن ساتھ ہی اسے گولو کی فاروق سے بے تحاشا محبت کا بھی اندازہ ہو چکا تھا اس لیے وہ اسے اس کے اس خیال میں بھی حق بجانب سمجھتی تھی کہ اس کی طرح کوئی فاروق کی دیکھ بھال نہیں کر سکتا کیونکہ اس درجے محبت کرنے والے بندے کا دل واقعی کسی دوسرے سے مطمئن نہیں ہو پاتا۔ اس نے دیکھا تھا کہ جب شگفتلا کا پرس چھیننے والے اچکے کا تعاقب کرتے ہوئے فاروق ٹھوکر کھا کر گرا تھا تو گولو کی اپنی حالت کتنی تباہ ہو گئی تھی۔ وہ بالکل ننھے بچوں کی طرح دھاڑیں مار مار کر رونے لگا تھا اور اس کے اسپتال میں قیام کے عرصے میں بھی روزانہ نماز پڑھ کر بڑی باقاعدگی سے اس کی صحت یابی کے لیے دعا مانگا کرتا تھا۔ ایسا شخص اگر اپنے سوا کسی دوسرے کی خدمت پر یقین نہیں رکھتا تھا تو اس سے بحث نہیں کی جا سکتی تھی۔ یوں بھی اس کی چند یوم کی بامعاوضہ خدمت گولو کی بے لوث محبت کا کسی طور مقابلہ نہیں کر سکتی تھی، سو وہ کچھ بھی کہے بغیر ایک بار پھر بیرونی مناظر کی طرف متوجہ ہو گئی۔

راستے کی خطرناکی کے ساتھ جو حسن جڑا ہوا تھا وہ زیادہ دیر اس سے نظر نہیں چرا سکتی تھی۔ صنوبر، چیڑ اور دیودار کے درختوں کے دامن میں ڈھلوان سطح پر بنے رنگین چھتوں والے مکانات کو چلتی گاڑی سے دیکھنا بہت خوش کن تجربہ تھا۔ سبزے کے بیچ موجود یہ لال، ہرے اور نیلے رنگوں کی چھتیں الگ ہی چھب دکھا رہی تھیں۔ رنگوں کی اس برسات سے آنکھ مچولی کرتے بالآخر راستہ کٹ ہی گیا اور وہ سات پہاڑیوں کی چوٹیوں پر تعمیر شدہ، ہماچل پردیش کے دارالحکومت شملہ پہنچ گئے۔ ڈرائیور نے ترچھی سرخ چھتوں والی بھابیہ سیٹھ کی رہائش گاہ کے سامنے گاڑی روکی تو ان سب کا دل خوش ہو گیا۔ رہائش گاہ کا بیرونی نظارہ ہی گواہی دے رہا تھا کہ اندر سے بھی عمارت بہت خوب صورت ہو گی۔ دور تک پھیلے سبزے اور درختوں کے جھنڈ میں گھری اس رہائش گاہ کو دیکھ کر بڑی سی بیربہوٹی کا خیال آتا تھا۔ فاروق نے بھی اس جگہ کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا۔ اپنی قلبی کیفیات اور کیتھرائن کی ہدایات کے باعث وہ راستے میں زیادہ تر سوتا رہا تھا اس لیے بہت سے خوب صورت مناظر سے بھی محروم رہ گیا تھا۔ اب جو بھابیہ سیٹھ کی رہائش گاہ سامنے آئی تو اس کی بیزاری طبیعت پر بھی خوش گوار اثر پڑا۔

اندر سے ایک ملازم نے نکل کر ان کا استقبال کیا۔ اس ملازم اور ڈرائیور نے ہی مل کر ان کا اسباب بھی اندر پہنچا دیا۔ ان کی یہاں آمد کی اطلاع چونکہ پہلے ہی سے تھی اس لیے ان کی رہائش کے لیے کمرے بھی تیار تھے۔ انہیں ان کے کمروں میں پہنچانے کے تھوڑی دیر بعد ہی ملازم نے اطلاع دی کہ نہانے کے لیے غسل خانوں میں انتظام کر دیا گیا ہے۔ سفر کی طوالت سے زیادہ پیچیدگی نے ان کے جسموں کو تھکا دیا تھا چنانچہ سب نے ہی غسل کر کے تازہ دم ہونا مناسب سمجھا۔ غسل نے طبیعت پر اچھا اثر ڈالا اور تھکن زدہ جسم کے جوڑ کھلتے ہوئے محسوس ہوئے۔ ان لوگوں کے تازہ دم ہوتے ہی ملازم نے کھانا لگ جانے کی اطلاع کے ساتھ ڈائننگ روم میں چلنے کی درخواست کی۔ ڈائننگ روم خاصا وسیع تھا۔ لکڑی کی طویل ڈائننگ ٹیبل کے گرد بہت سی کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ جن برتنوں میں کھانا پیش کیا گیا، وہ بھی قیمتی اور دیدہ زیب تھے۔ تھکے ہوئے جسم غسل اور اس کے بعد ملنے والے پرتکلف کھانے سے غنودگی کی طرف مائل ہونے لگے اس لیے کھانے کے بعد کسی نے بھی محفل جمانے کی خواہش ظاہر نہیں کی اور اپنے اپنے کمروں کی طرف چل پڑے۔

کیتھرائن نے سونے کے لیے جانے سے قبل حسب

معمول فاروق کا چیک اپ کیا اور اسے اپنی نگرانی میں دوائیں کھلائیں۔ گولو نے اپنے لیے الگ کمرا لینے کے بجائے فاروق کے کمرے میں ہی رہنے کی خواہش ظاہر کی تھی اس لیے اس کے لیے وہیں سونے کا انتظام کردیا گیا تھا۔ کیتھرائن اس کے ساتھ والے کمرے میں رہتی یوں اس کے لیے بھی فاروق کی طرف سے باخبر رہنا آسان ہوجاتا۔ اسپتال سے ڈسچارج ہونے کے بعد فاروق نے کسی تکلیف کا اظہار تو نہیں کیا تھا لیکن پھر بھی اس پر توجہ رکھنا ضروری تھا۔ یوں بھی کیتھرائن نے یہ بات نوٹ کرلی تھی کہ فاروق ہلکی پھلکی تکلیف کے اظہار سے گریز کرتا تھا اس لیے بھی ضروری تھا کہ خود سے اس پر نظر رکھی جائے۔

اس وقت وہ اپنی معمول کی ڈیوٹی ادا کرکے اپنے لیے مخصوص کمرے میں پہنچی تو اس کا ارادہ بھی جلد سوجانے کا تھا لیکن شب خوابی کا لباس بدلنے سے پہلے ہی اس کے کمرے کے دروازے پر دستک کی آواز ابھری۔ دستک بہت دھیمی اور محتاط تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا تو رین کو سامنے پاکر حیران رہ گئی۔

”اپنے کو تیرے سے ایک کام ہے۔ اندر چل کر بات کرتے ہیں۔“ ربن نے دھیمی آواز میں اس سے کہا تو اس نے ایک طرف ہٹ کر اسے اندر آنے کا راستہ دے دیا۔ کم عمری میں ہی اس نے دنیا کو اس کے مکروہ روپ میں دیکھ لیا تھا اس لیے ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ اس وقت ربن کو اپنے کمرے میں آنے کی اجازت نہیں دیتی۔ ایک ایسا شخص جو بمبئی کا نامی گرامی دادا تھا، ایک نوجوان لڑکی کے تنہا کمرے میں چپکے سے داخل ہو تو اس کا تشویش میں مبتلا ہونا بنتا ہے لیکن کیتھرائن خوف یا شک میں مبتلا نہیں تھی، وہ صرف حیران تھی کہ ربن اتنی رازداری سے کس کام کی غرض سے اس کے کمرے میں آیا ہے۔ چند دن کے ساتھ میں اس نے ان لوگوں کے کردار کو پرکھ لیا تھا اور جانتی تھی کہ بے شک وہ دادا گیری کرنے والے ہیں لیکن بدنظر اور بدکردار نہیں ہیں۔

”تجھ سے یہ ٹیلی گرام پڑھوانا تھا۔ اپنے کو انگریزی پڑھنی نہیں آتی اور فاروق سے پڑھوانا نہیں چاہتے تھے کہ جانے اس میں کیسی خبر ہو۔“ کیتھرائن کی پیشکش پر ایک کرسی پر بیٹھنے کے بعد اس نے اپنی آمد کا مقصد بیان کرتے ہوئے ٹیلی گرام والا لفافہ اس کی طرف بڑھایا۔ ٹیلی گرام اسی کے نام آیا تھا اور یہاں آمد کے تھوڑی دیر بعد ہی ملازم نے یہ بتاتے ہوئے کہ صبح سے آیا رکھا ہے، اس کے حوالے

دوست اور دشمن

ایک بار یوں ہوا کہ ایک خادم نے دوسرے خادم پر جوتا اتار کر پھینکا۔ صلاح الدین ایوبی کمرے سے نکل رہا تھا، جوتا اسے جالگا۔ دونوں خادم تھر تھر کانپنے لگے لیکن صلاح الدین ایوبی نے دونوں کی طرف سے منہ پھیر لیا اور آگے نکل گیا۔ یہ کردار کی عظمت کا مظاہرہ تھا۔ دوست تو دوست، دشمن بھی اس کے سامنے آتے تو اس کے مرید بن جاتے تھے۔

مرسلہ۔ میاں غضنفر محمود بوتالوی،
گوجرہ، ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ

کردیا تھا۔ اس نے کسی سے اس کا ذکر نہیں کیا اور اب موقع ملتے ہی کیتھرائن سے پڑھوانے کے لیے اس کے کمرے میں پہنچ گیا۔

”جولیٹ کا باپ جوزف بیماری میں چل بسا۔“ کیتھرائن نے کاغذ پر موجود تحریر پر نظر دوڑانے کے بعد اسے اس کے مفہوم سے آگاہ کیا۔ وہ دیکھ چکی تھی کہ ٹیلی گرام رام داس عرف راموکی طرف سے بھیجا گیا ہے۔ بمبئی کے اسپتال میں فاروق کے قیام کے عرصے میں راموکا بھی وہاں آنا جانا لگا رہتا تھا اس لیے وہ راموسے واقف تھی۔

”اچھا ہوا اپن نے یہ ٹیلی گرام فاروق سے نہیں پڑھوایا۔“ ملنے والی خبر کو سن کر ربن نے بے ساختگی سے تبصرہ کیا۔

”کون ہے یہ جولیٹ اور اس کا باپ جوزف؟ کیا مسٹر فاروق سے ان کا کوئی خاص تعلق ہے؟“ ربن کے الفاظ اور چہرے پر موجود تاثرات نے کیتھرائن کو سوال کرنے پر اکسایا۔

”ایسا ہی سمجھ۔ دل کے ناتے سے بڑھ کر بھلا کون سا تعلق ہوتا ہے۔ جان چھڑکتا ہے اپنا شہزادہ اس جولیٹ پر لیکن وہ پڑھی لکھی اچھی نوکری کرنے والی لونڈیا اس کی طرف دیکھتی بھی نہیں تھی۔ کچھ دنوں سے بڑی مشکل میں پڑی ہوئی ہے۔ ادھر اپنا شہزادہ بیمار ہے اس لیے اپن اس کے ذہن کو بوجھ سے بچانے کے لیے ادھر لے کر آگئے۔ تو اس کے عشق کا عالم دیکھ کہ خوابوں میں جولیٹ کو پریشان دیکھتا ہے اور ہر طرح کے آرام میں رہ کر بھی اس کے لیے بے چین رہتا ہے۔ اگر بیچ اس پر گزری سے آگاہ ہوگیا تو جانے کیا غضب ہوگا اس لیے اپن اس سے ہر بات چھپا کر رکھے ہیں۔“ ربن نے اسے مختصراً جولیٹ کے پورے

حالات سے آگاہ کردیا۔
''ویری سیڈ۔ اس بے چاری پر تو بہت ٹف ٹائم آگیا ہے۔ اس پر سے پیرنٹس کی ڈیتھ......'' کیتھرائن کو جولیٹ کے حالات سن کر دلی دکھ ہوا۔
''سارا نصیب کا چکر ہے۔ نصیب کا لکھا آدمی کو بھوگنا ہی پڑتا ہے پر تو دھیان رکھنا کہ فاروق کے سامنے کوئی بات نہ نکلے۔ اپن اسے اس سارے لفڑے سے دور رکھنے کے واسطے ہی ادھر لایا ہے۔ ادھر رہ کر پہلے اس کا طبیعت بالکل فرسٹ کلاس ہونے دو پھر اپن دیکھ بھال کر اسے سب اگلا پچھلا بول دیں گے۔'' ربن نے اسے ایک بار پھر ہدایت دینا ضروری سمجھا۔
''ڈونٹ وری سر...... میں مسٹر فاروق کو کچھ نہیں بتاؤں گی۔ میں اچھی طرح سمجھتی ہوں کہ یہ ان کی صحت کے لیے ٹھیک نہیں ہوگا لیکن بعد میں شاید آپ کو بہت پرابلم ہو۔ وہ آپ سے بہت ناراض ہوں گے کہ آپ نے ان سے اتنی اہم باتیں چھپا کر رکھیں۔'' کیتھرائن نے اسے اپنے تعاون کی یقین دہانی کروانے کے ساتھ ساتھ آئندہ حالات کی طرف بھی توجہ دلائی۔
''وہ اپن سنبھال لے گا۔ اصل مسئلہ تو ابھی کا ہے۔ اپنے لیے اپنے ہیرو کی طبیعت ٹھیک ہونا سب سے زیادہ اہم ہے۔ تو ادھر رہ کر اس کی دیکھ بھال کرنا۔ اپن کل ہی بمبئی لوٹ جائیں گے۔ ادھر جا کر دیکھیں گے کہ کیا کرنا ہے۔ لونڈیا کی عزت خراب کرنے والے کو تو اپن خود بھی نہیں چھوڑنے والے...... بس وہ ایک بار اس حرام کے جنے کا نام اپنی زبان پر لے آئے۔ رب کی قسم دھرتی پر اس کا نام باقی نہیں چھوڑیں گے۔'' ربن نے اپنے عزائم کا اظہار کیا۔
کیتھرائن کو یقین تھا کہ وہ اپنے دعوے میں سچا ہے۔ وہ شخص جس نے راستے میں ملنے والی شکنتلا کا اتنا خیال کیا تھا، اپنی محلے دار اور فاروق کی محبوبہ جولیٹ کے ساتھ بدسلوکی کرنے والے کو کس طرح معاف کرسکتا تھا۔
''چل اب سو جا۔ بڑا کٹھن سفر تھا۔ تو بھی تھک گئی ہوگی۔'' خاموشی کے پل بھر کے وقفے کے بعد ربن اس سے کہتا ہوا اچانک ہی اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔ اس کے جانے کے بعد کیتھرائن نے شب خوابی کا لباس تبدیل کیا اور سونے کے لیے لیٹ گئی۔ تھکن واقعی بہت زیادہ تھی۔ جلد ہی نیند اس کے حواس پر غالب آنے لگی۔ نیند کی وادی میں اترنے سے پہلے تک وہ جولیٹ اور اس کے حالات کے بارے میں سوچتی رہی تھی۔ وہ لڑکی بیک وقت اسے بہت خوش قسمت اور بدنصیب محسوس ہوئی تھی۔ خوش قسمت اس لیے کہ اسے فاروق جیسا شخص اتنا ٹوٹ کر چاہتا تھا اور بدنصیب اس لیے کہ وہ فاروق کی محبت کی قدردان نہیں تھی۔ کیتھرائن کو یقین تھا کہ اگر جولیٹ نے فاروق کی محبت کو قبول کرلیا ہوتا تو وہ ایسے حالات سے کبھی دوچار نہیں ہوتی۔ وہ بہادر اور غیرت مند شخص تھا جو مشکل حالات میں جولیٹ کا سائبان بن کر اسے حالات کی کڑی دھوپ اور تند بارش سے بچا لیتا۔

☆☆☆

''جوزف......'' جوزفین کی درد بھری پکار تھی جس نے قطار میں کھڑے جوزف کو بے قرار کردیا اور وہ تیزی سے قطار سے نکل کر اس جانب دوڑا جہاں اس نے جوزفین کو چھوڑا تھا۔ یہ اسکول میں آدھی چھٹی کے اوقات تھے۔ ان اوقات میں بچے کھیلتے کودتے اور کھاتے پیتے تھے۔ اسکول کا چوکیدار ان اوقات میں لکڑی کی ایک میز پر اپنی عارضی دکان سجا لیتا تھا۔ اس دکان پر کھٹی میٹھی گولیاں، جانوروں کی اشکال والے بسکٹ، فانٹا، چورن کی پڑیا، نقل اور اسی جیسے چھوٹے موٹے دیگر سستے آئٹم بکا کرتے تھے کیونکہ اسکول میں پڑھنے والے تقریباً سب ہی بچے نچلے طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور ان کے پاس یہ معمولی اشیا خریدنے کے لیے بھی مشکل ہی سے پیسے ہوتے تھے۔ جوزف اور جوزفین کا شمار بھی ان ہی بچوں میں ہوتا تھا جو زیادہ تر لکڑی کی میز پر سجی رنگ برنگی کھانے کی اشیا کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنے پر ہی اکتفا کرنے پر مجبور ہوتے تھے۔ ایسا دن بہت مشکل ہی سے آتا تھا جب اسکول آتے ہوئے ان کی مائیں ان کی ہتھیلی پر کوئی سکہ رکھ دیتی ہوں۔ جوزف کے لیے آج وہی خوش قسمت دن تھا اور وہ آدھی چھٹی کے وقت جوزفین کو کھٹی میٹھی گولیاں لانے کی نوید سنا کر اس قطار میں لگ گیا تھا جو چیز خریدنے کے لیے بحالت مجبوری بنائی جاتی تھی۔ اسکول کا چوکیدار خاصا سخت گیر تھا اور بغیر قطار کے آنے والے بچے کو چیز نہیں بیچتا تھا۔ اس کی نظریں بھی بہت تیز تھیں اس لیے کسی بچے کی مجال نہیں تھی کہ بیچ میں سے قطار میں گھس پاتا۔
جوزفین کو اس کی من پسند چیز کھلانے کے اشتیاق میں جوزف بہت ایمانداری سے اس قطار میں لگا تھا اور اب درمیان میں بس دو بچے ہی باقی رہ گئے تھے کہ جوزفین کی درد بھری پکار نے اس کے ذہن سے کھٹی میٹھی گولیاں خریدنے کا خیال اڑنچھو کردیا اور وہ تقریباً دوڑتا ہوا اس جگہ پہنچا جہاں جوزفین کو چھوڑ کر آیا تھا۔ وہاں پہنچ کر جوزفین

فوری طور پر اسے نظر نہیں آئی کیونکہ بچوں کے ایک چھوٹے سے ہجوم نے اسے اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ وہ دو بچوں کو ہاتھ سے دھکیلتا ہوا اس دائرے میں داخل ہوا جس کے بیچ جوزفین فرش پر اپنا گھٹنا تھامے بیٹھی تھی۔ اس کے گھٹنے پر خراش آئی تھی اور اس خراش میں سے بہت معمولی سا خون بھی نکل رہا تھا۔ خون کی ان دو تین ننھی بوندوں سے زیادہ جوزف کے لیے وہ آنسو تکلیف دہ تھے جو جوزفین کی آنکھوں سے نکل کر اس کے پھول سے رخساروں پر شفاف موتیوں کی طرح لڑھک رہے تھے۔

''کیا ہوا جوزفین...... تمہیں کیسے چوٹ لگی؟'' وہ وہیں گھٹنوں کے بل جوزفین کے قریب بیٹھ گیا اور اس کے گھٹنے پر لگی خراش کا جائزہ لینے لگا۔

''ٹونی نے دھکا دیا تھا۔ میں گر گئی اور مجھے چوٹ لگ گئی۔ دیکھو کتنا بلڈ نکل رہا ہے۔'' جوزفین نے منہ بسور کر بتاتے ہوئے خون کے ان گنتی کے قطروں کی طرف اشارہ کیا جو نکلنے کے بعد بہہ بھی نہیں سکے تھے اور اسی جگہ جمنے لگے تھے۔

''ٹونی کو تو میں ابھی مزہ چکھاتا ہوں۔'' جوزفین کا جملہ مکمل ہوتے ہی وہ اچھل کر اپنی جگہ سے کھڑا ہوا اور چند ہی لمحوں میں ٹونی کو جو دیگر ہم جماعتوں کے ساتھ پکڑم پکڑائی کھیل رہا تھا، جالیا اور اس سے قبل کہ ٹونی کچھ سمجھ پاتا، اس کی ٹھیک ٹھاک دھنائی کر ڈالی۔ ٹونی کے دوستوں نے شور مچادیا اور دوست کو بچانے کے لیے خود جوزف پر پل پڑے۔ ذرا سی دیر میں وہاں اچھا خاصا ہنگامہ کھڑا ہو گیا جسے سن کر دکان سجائے چوکیدار سمیت اندر سے دو تین اساتذہ بھی صورتِ حال جاننے کے لیے دوڑے چلے آئے۔ ٹونی کی دھنائی کرنے والا جوزف اس عرصے میں ٹونی کے دوستوں کے ہاتھوں خود بھی اچھی خاصی ٹھکائی کھا چکا تھا اور اس کا حلیہ ابتر ہو رہا تھا۔ ٹونی کے دوستوں کی شکایت سن کر اساتذہ نے اس سے باز پرس کی کہ کیوں اس نے بلاوجہ ٹونی کو مارا تو اس کی زبانی ان پر یہ عقدہ کھلا کہ اس نے جوزفین کو دھکا دینے کے جرم میں ٹونی کے ساتھ یہ سلوک کیا تھا۔ ذرا سی مزید تفتیش پر جو حقیقت سامنے آئی، وہ یہ تھی کہ پکڑم پکڑائی کھیلتے ہوئے کیسے جوزفین کو ٹونی کا دھکا لگا اور وہ گر گئی۔ اس بات کا تو کھیل کی دھن میں مگن ٹونی کو علم ہی نہیں تھا۔ یہ ایک سراسر نادانستہ غلطی تھی جو ٹونی سے سرزد ہوئی تھی چنانچہ اساتذہ نے اسے معمولی سی سرزنش کی البتہ جوزف کو خوب ٹھیک ٹھاک ڈانٹ پڑی کہ اس نے کیوں معمولی بات پر ٹونی کے ساتھ ایسا سلوک کیا۔ ٹونی کے دوستوں کو بھی تنبیہ کی گئی۔ غرض وہ دن کئی بچوں کے لیے برا ثابت ہوا۔ اس روز جوزف اسکول سے واپس آنے کے بعد بھی شام تک اداس ہی رہا۔ جوزفین نے عمر میں چھوٹی ہونے کے باوجود اس کی یہ اداسی محسوس کرلی اور یہی سمجھی کہ وہ آج اسکول میں بچوں کے ہاتھوں ہونے والی پٹائی اور اساتذہ کی ڈانٹ کی وجہ سے اداس ہے چنانچہ اس کے قریب بیٹھ کر آہستہ سے بولی۔

''سوری جوزف! میری خاطر تمہیں آج بہت مار کھانی پڑی اور ٹیچرز نے ڈانٹا بھی۔''

''تمہیں چوٹ میں زیادہ درد تو نہیں ہو رہا جوزفین۔'' جوزف نے اس کی بات پر زیادہ توجہ دینے کے بجائے اس کے گھٹنے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ معمولی سی سوتی کپڑے کی یہ فراک جوزفین کو اس کی ماں نے پچھلے سے پچھلے کرسمس پر بنا کر دی تھی جو اب اسے خاصی چھوٹی ہو جانے کی وجہ سے گھٹنوں سے اوپر تک آرہی تھی۔ فراک میں دو جگہ دو مختلف رنگ کے کپڑوں کے پیوند بھی لگے ہوئے تھے اور ابھی جوزفین کو نا معلوم مدت تک یہ فراک پہننی تھی کہ اس کی تولیا فیکٹری میں ملازمت کرنے والی ماں اپنی اکلوتی بیٹی کو بھی چند نئے جوڑے بنا کر دینے کی استطاعت نہیں رکھتی تھی۔ اونچی فراک کی وجہ سے اس کے گھٹنے پر لگی خراش واضح دکھائی دے رہی تھی۔ خراش پر لال رنگ کی کوئی دوا بھی لگائی گئی تھی اس لیے اور بھی نمایاں ہو رہی تھی۔

''اب درد نہیں ہو رہا۔ سسٹر ماریا نے دوائی لگائی تھی نا تو درد ٹھیک ہو گیا۔''

''یہ تو اچھا ہوا۔'' جوزف نے سن کر تبصرہ کیا اور دوبارہ خاموشی سے سر جھکا کر بیٹھ گیا۔

''تم کچھ بولتے کیوں نہیں جوزف...... اتنے چپ کیوں ہو؟ ان بچوں نے تمہیں بہت زور سے مارا تھا کیا؟ کہیں درد ہو رہا ہے تو بتاؤ؟'' جوزف کی خاموشی اسے بری طرح محسوس ہو رہی تھی۔

''نہیں درد نہیں ہو رہا۔ اپن بالکل ٹھیک ہے۔'' جوزف نے اسے تسلی دی لیکن اس کا لہجہ اب بھی اداس تھا۔

''ٹھیک ہو تو مجھ سے باتیں کیوں نہیں کرتے؟'' جوزفین نے اس کی بات کا یقین نہیں کیا۔

''کر تو رہا ہوں بات۔'' جوزف نے جیسے اپنی جان چھڑائی۔

''تم بات نہیں کر رہے۔ تم تو صرف مجھے جواب دے

رہے ہو۔" چھوٹی سی جوزفین نے حاضر جوابی کا مظاہرہ کیا۔ اصل میں دنیا میں آنے کے ساتھ ہی اس کا جوزف سے پالا پڑا تھا اور وقت کے ساتھ ساتھ ان کے تعلق میں مضبوطی آتی جارہی تھی اس لیے وہ بہت چھوٹی ہونے کے باوجود اس کے مزاج کے رنگوں کو پہچاننے کی صلاحیت رکھتی تھی۔

"ان لڑکوں سے لڑنے میں میرا کوائن گر گیا تھا اس لیے اپن تیرے واسطے کھٹی میٹھی گولیاں نہیں لے سکا۔ بس اس واسطے سیڈ ہے۔" آخر کار جوزف نے اس کے سامنے حقیقت اگل ہی دی۔ ننھی جوزفین کو اس کی اداسی کی وجہ جان کر اس پر ڈھیروں پیار آیا۔ اتنی بے تحاشا محبت کے جواب میں محبت کے سوا اور کیا بھی کیا جاسکتا تھا۔

☆☆☆

دوسرے دن ناشتے کے فوراً بعد ربن واپسی کے لیے تیار کھڑا تھا۔ فاروق کو منزل پر پہنچانے کے بعد اب اسے خود واپسی کی جلدی تھی۔

"ابھی تو آپ کی کل کے سفر کی تھکن بھی نہیں اتری ہوگی اور آپ پھر دوبارہ سفر کے لیے تیار ہیں۔ ایک آدھ دن ٹھہر کر واپس چلے جاتے۔" اس کے ارادے کے بارے میں خبر ہونے پر کیتھرائن نے ہمدردی سے کہا۔

"اپن بالکل فٹ ہے ری۔ اپنے جیسے لوگ ذری ذری سی باتوں پر نہیں تھکتے۔ اگر تھکنے لگیں تو سالے اپنے بھائی بند ہی ریٹائرڈ کردیتے ہیں۔" ربن نے ہنس کر اس کی بات کا جواب دیا۔

"انہیں جانے دو سسٹر۔ وہاں بمبئی میں انہیں بہت کام ہوتے ہیں۔ میں تو ان کے ساتھ آنے کے حق میں بھی نہیں تھا لیکن ان کے خیال میں، میں کوئی چھوٹا بچہ ہوں جسے یہ اکیلے اتنی دور کا سفر کرنے کی اجازت نہیں دے سکتے تھے۔" ربن کی حمایت کرتے ہوئے فاروق نے آخر میں ذرا سی ناراضی کا اظہار کیا۔

"انہوں نے ساتھ آکر اچھا کیا مسٹر فاروق۔ مجھے تو ان کے ساتھ ہونے سے بڑی تسلی رہی۔ راستے میں کتنے پرابلمز انہوں نے سولو کیے۔ یہ نہیں ہوتے تو بیماری کی حالت میں آپ اکیلے کیا کیا دیکھتے۔"

اس بار کیتھرائن نے ربن کی حمایت کی تو وہ ہنسنے لگا اور اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ "اس کے ساتھ جاذتی مغز ماری مت کر۔ یہ اپنے حساب سے سوچتا اور بولتا ہے پر اپن کو معلوم ہے کہ کب اسے کیسے لے کر چلنا ہے۔ تیرے کو بھی پتا لگ جائے۔ اپن تیرے کو بول دیتے ہیں کہ ادھر تو اس کی باس ہے۔ جو تجھے اس کے واسطے ٹھیک لگے، وہ کرنا۔ اس کی باتوں پر جاذتی کان دھرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" فاروق کے منہ بنانے کی پروا کیے بغیر وہ کیتھرائن کو اس کے سلسلے میں ہدایات دیتا چلا گیا۔ "تیرے کو اپنا بمبئی کا پتا لکھوا دیے ہیں۔ ذرا بھی گڑبڑی کرے تو اپنے کو فوراً تار بھیج دینا۔ اپن خود آکر اس کے کان کھینچ لیں گے۔ اپنے کو شملہ اتنا بھی دور نہیں پڑے گا کہ آنے کو گھبرا جائیں۔" کیتھرائن مسکراتے ہوئے اس کی ہدایات سنتی رہی۔ اسے ربن اور فاروق کے درمیان تعلق خاص کا اچھی طرح اندازہ ہوچکا تھا اور سمجھتی تھی کہ دونوں ہی ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے ہیں۔ بظاہر سختی، گرمی، ناراضی کسی بھی جذبے کا اظہار ہو رہا ہو، بنیاد میں جذبۂ محبت ہی کارفرما ہوتا تھا۔

"اپن ٹیلی فون کر کے خیر خبر لیتے رہیں گے۔ تو ادھر اپنے ساتھیوں کے واسطے تفصیلی خط لکھ کر بھیج دیا کرنا۔ حرام کے جنوں کو تسلی رہے گی ورنہ میرے کان کھاتے رہیں گے۔ کوئی زیادہ ایمرجنسی کی بات ہو تو وکیل بابو کے نمبر پر فون کر کے بول دینا وہ فوراً اپنے کو بتا دے گا۔" کیتھرائن کے بعد ربن فاروق کی طرف منہ کر کے براہِ راست اسے ہدایات دینے لگا۔

"بالکل ہی دودھ پیتا بچہ سمجھ لیا ہے۔ اتنی فکر ہے تو یہاں چھوڑ کر ہی کیوں جارہے ہو۔ اپنے ساتھ واپس بمبئی لے چلو۔" فاروق نے جھنجلاہٹ کا مظاہرہ کیا۔

"لوٹ کر تو ادھر ہی جانا ہے۔ ابھی تھوڑے دن یہاں صبر سے رک۔ طبیعت سنبھل جائے تو تجھ کو واپس ادھر ہی بلا لیں گے۔" ربن نے اسے کسی بچے کی طرح پچکارا جس پر فاروق کا منہ مزید بن گیا لیکن اب ربن اس کے بجائے کولو کی طرف متوجہ ہوچکا تھا جو اس کا چھوٹا سا سفری بیگ اٹھائے وہاں آیا تھا۔

"تو پھر ہم چلتے ہیں شہزادے...... تو اپنے فاروق بھیا کا خیال رکھنا۔" وہ قریب آکر کھڑا ہوا تو ربن نے اس کے شانے پر تھپکی دی۔ وہ فوراً ہی ربن سے لپٹ گیا۔

"مت جاؤ نا بابا۔ تمہارے بغیر دل نہیں لگے گا۔" وہ ربن کے سینے میں منہ چھپا کر بسورا۔

"تو چل میرے ساتھ بمبئی واپس چل۔" ربن نے نہایت سنجیدگی سے اسے پیشکش کی۔ وہ ایک جھٹکے سے ربن سے الگ ہوگیا۔

"کیا بولتا ہے؟ چلے گا اپنے ساتھ؟ جا کر اپنا سامان لے آ۔" ربن کی سنجیدگی دیدنی تھی۔

''ادھر...... فاروق بھیا کو اکیلے چھوڑ کر کیسے؟ نہیں اپن اپنے فاروق بھیا کو اکیلے نہیں چھوڑ سکتا۔'' گولو نے اپنی حیرت پر قابو پا کر اسے انکار میں جواب دیا۔

''اپنے کو اچھی طرح معلوم ہے کہ تیرے کو ادھر اپنے فاروق بھیا کے ساتھ ہی جڑ کر بیٹھنے کا ہے پھر اپنے ساتھ کیوں یہ اداسی کا ناٹک کرتا ہے سالے۔'' ربن نے اس کی پیٹھ پر ایک دھموکا جڑا۔ وہ بڑے خوشگوار موڈ میں تھا اور سب ہی سے ہنسی مذاق کر رہا تھا۔

''اپن ناٹک نہیں کر رہا۔ اپنے کو بھی میں تمہاری یاد آئے گی پر اپن فاروق بھیا کو اکیلے ادھر چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ تم تو ادھر سب کے بیچ میں رہو گے۔ اپنے کو تمہاری اتنی فکر نہیں ہے۔'' گولو نے جھٹ اپنی صفائی پیش کی۔

''گاڑی تیار ہے جناب۔ ڈرائیور باہر آپ کا انتظار کر رہا ہے۔'' اسی وقت ملازم نے آ کر اطلاع دی تو ربن اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''ٹھیک ہے۔ اپن ابھی آتے ہیں۔''

''توشے دان بھی گاڑی میں رکھوا دیا ہے۔ کچوریاں، آلو پوری اور سوجی کا حلوا ہے اس میں۔ معلوم نہیں تھا کہ آپ کو واپس جانا ہے ورنہ سفر میں ساتھ دینے کے لیے دو چار چیزیں تیار کر دیتا۔'' ملازم کا لہجہ معذرت خواہانہ تھا۔

''اتنا بھی بہت ہے رے۔ اپن اکیلے سفر میں اتنی تام جھام ساتھ لے کر چلنے کے قائل نہیں ہیں۔ اکیلے آدمی کا کیا ہے، کیسے بھی کھا پی کر گزارہ کر لیتا ہے۔ اپن تو بھنے چنے کھا کر بھی پیٹ بھر سکتے ہیں۔'' ربن نے شان بے نیازی سے اسے جواب دیا اور باہر کی طرف جانے کے لیے قدم اٹھائے۔ باقی لوگ بھی اس کے پیچھے تھے۔ اس کے سامان کا بیگ ملازم نے اٹھا لیا تھا۔ باہر آنے کے بعد ملازم اس کا بیگ گاڑی میں رکھوانے لگا اور باقی لوگ الوداعی ملاقات کرنے لگے۔ کیتھرائن نے خود ہاتھ آگے بڑھا کر اس سے مصافحہ کیا، جواب میں اس نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ گولو کو اس نے گلے لگا کر اس کا ماتھا چوما۔ سب سے آخر میں فاروق اس کے گلے لگا۔

''جلدی سے ٹھیک ہو جانا۔ ادھر سب تیری راہ تکتے ہوں گے۔'' خود کو باندھ کر رکھنے کے مزاج کے باوجود اس پل ربن تھوڑا سا جذباتی ہو گیا۔

''میں خود بھی تو ان سب کے بیچ رہنے کے لیے بے قرار ہوں۔ میرا کب یہاں دل لگے گا۔'' فاروق کی آواز ہلکی سی تھرا گئی۔ ربن نے تسلی دینے والے انداز میں دھیرے سے اس کی پیٹھ تھپکی پھر الگ ہو کر گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ گاڑی اسے لے کر روانہ ہوئی تو وہ سب اس وقت تک کھڑے ہاتھ ہلاتے رہے جب تک گاڑی نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئی۔ واپس اندر آنے کے بعد کیتھرائن نے فاروق کا معمول کا چیک اپ کیا اور ناشتے کے بعد کھانے والی دوائیں کھلائیں۔ آج ربن کی روانگی کے چکر میں یہ دونوں کام قدرے تاخیر سے انجام پائے تھے۔ دوا کھانے کے بعد فاروق اخبارات دیکھنے لگا۔ ملازم انگریزی، اردو اور ہندی تینوں زبانوں کے اخبارات لاؤنج میں رکھ گیا تھا۔ کیتھرائن خود بھی اخبار بینی کے اس مشغلے میں اس کے ساتھ شامل ہو گئی۔ ڈاکٹر نے فاروق کے زیادہ مطالعہ کرنے پر پابندی عائد کی تھی لیکن اس نے فوری طور پر اسے اس لیے نہیں ٹوکا کہ ربن کے جانے سے فضا میں ایک اداسی سی چھا گئی تھی اور فارغ رہنے سے یہ اداسی فاروق کو مزید اپنی لپیٹ میں لے کر متاثر کرتی چنانچہ اس وقت اس کا ایک محدود حد تک مطالعہ کر لینا ہی بہتر تھا۔

کیتھرائن نے مطالعے کے لیے انگریزی اخبار کا انتخاب کیا جبکہ فاروق انگریزی اور ہندی کے اخبارات پر سرسری نظر ڈالنے کے بعد اردو اخبار کی طرف متوجہ تھا۔ اردو اس نے کسی درس گاہ سے نہیں سیکھی تھی بلکہ گھر میں ہی بڑے اہتمام کے ساتھ پڑھائی گئی تھی۔ ہندوستانی مسلمانوں کی زبان کی حیثیت سے ان کے گھر میں بچوں کو اردو پڑھانے سکھانے کا خصوصی انتظام کیا جاتا تھا۔ بچپن میں کلام پاک مع ترجمہ پڑھنے کے ساتھ ساتھ اس نے اردو کی بھی ڈھیروں کتابیں پڑھی تھیں۔ تدریس کے لیے گھر پر آنے والے استاد کی محنت اور قابلیت اپنی جگہ لیکن اسے اصل شوق اپنے چھوٹے چچا کی وجہ سے ہوا تھا۔ وہ اپنے چچا جان کے بہت قریب تھا اور وہ خود اردو ادب کا اچھا ذوق رکھتے تھے۔ وہ ہی اس کے شوق اور دلچسپی کو دیکھتے ہوئے اس کی عمر اور ذہنی سطح کے حساب سے کتابیں لا کر دیا کرتے تھے۔ سیکنڈری کلاسز میں پہنچنے کے بعد وہ ان کے ذخیرۂ کتب سے مستفید ہونے لگا تھا۔ یوں اس کی اردو بہت اچھی ہو گئی تھی اور اسے اردو پڑھنے میں لطف آنے لگا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس وقت بھی اس نے مطالعے کے لیے اردو اخبار کو ترجیح دی تھی۔

اس کے زیر مطالعہ اخبار کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ خبریں جو انگریزی اور ہندی اخبارات چھاپنے سے گریز

کرتے تھے یا بہت سرسری انداز میں چھاپتے تھے، وہ بھی تفصیل سے مل جاتی تھیں۔ ملک کی سیاسی فضا میں آنے والی تبدیلیوں سے باخبر رہنے کے لیے ان تفصیلات سے باخبر رہنا بھی ضروری تھا۔ انگریزی حکومت یا کانگریس کے حامی اخبارات میں اس انداز سے خبریں شائع کی جاتی تھیں کہ حقائق کا چہرہ ہی مسخ ہو کر رہ جاتا تھا۔ دونوں ہی کی یہ کوشش تھی کہ تحریک پاکستان کو کسی نہ کسی طرح دبا دیا جائے خاص طور پر کانگریسی راہنما ہندوستانی مسلمانوں کو یہ باور کروانے کی کوشش کرتے رہتے تھے کہ وہی ہندوستان کی واحد نمائندہ جماعت ہیں اور مسلمانوں کی بہتری اسی میں ہے کہ وہ بھارت میں ہی مل جل کر رہیں۔ مسلم راہنماؤں کو بھی اس پروپیگنڈے کا توڑ کرنے کے لیے ابلاغ کا سہارا لینا پڑتا تھا اور گنتی کے مسلمان دوست اخبارات میں اس امر کی وضاحت کی جاتی رہتی تھی کہ مسلمانوں کے لیے ایک الگ وطن کا قیام کیوں ضروری ہے۔

فاروق کے زیرِ مطالعہ اخبار میں کالم نگار نے جنوبی پنجاب کے ایک گاؤں میں پیش آنے والے اندوہناک سانحے کا ذکر کیا تھا۔ گاؤں میں مسلمان اقلیت میں تھے اور گنتی کے چند مسلمان گھرانوں میں سے ایک گھر کا بائیس سالہ نوجوان لڑکا جو حصولِ روزگار کے لیے کلکتہ میں مقیم تھا، تحریک پاکستان میں شامل ہو گیا تھا۔ وہ لڑکا ملاقات کے لیے گھر جاتا تو اپنے گھر والوں اور دوستوں کے سامنے بھی اس سلسلے میں زوروشور سے دلائل دیتا رہتا۔ اس سلسلے میں اس کی گاؤں کے ہندو لڑکوں سے ایک دو بار بحث بھی ہوئی اور آخری نتیجہ یہ نکلا کہ الگ وطن کی حمایت کرنے کے جرم میں ایک رات اس کے پورے گھر کو ہی جلا کر بھسم کر دیا گیا۔ یہ واقعہ انسانیت کے منہ پر طمانچہ تھا اور ہندوستان کو بھائی قرار دینے والوں کے لیے آئینہ بھی۔

فاروق کو بھی اس واقعے نے بہت متاثر کیا۔ وہ اور اڈے کے دیگر افراد ابھی تک سیاسی معاملات سے بالکل الگ تھلگ تھے اور اپنے لگے بندھے معمول پر ہی چل رہے تھے لیکن اب خود فاروق کے ذہن میں سوچوں کے در کھلنے لگے تھے اور وہ سوچ رہا تھا کہ وہ لوگ کب تک اس اتنے بڑے ہنگامے سے الگ تھلگ رہ کر غیر جانبداری کے مظاہرے میں کامیاب رہیں گے۔ ساتھ ہی وہ ان لوگوں کے بارے میں بھی سوچ رہا تھا جنہیں آٹھ سال پہلے اپنے پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ اسے صحیح طرح سے اندازہ نہیں تھا کہ اس ساری سیاسی اکھاڑ پچھاڑ میں ان لوگوں کا کیا ردِعمل ہوگا۔ وہ لوگ ہندوستان میں بہت اچھی طرح سیٹل تھے۔ دھن، دولت، عزت سب تھا ان کے پاس۔ بڑے بڑے انگریز افسروں کا حویلی میں آنا جانا رہتا تھا۔ ہندوؤں سے بھی بہترین کاروباری تعلقات تھے۔ لیکن اپنے مسلم تشخص کو بھی پوری طرح قائم دائم رکھا جاتا تھا۔ اس طرح کے لوگوں کے لیے کوئی حتمی فیصلہ کرنا سب سے زیادہ مشکل ہوتا ہے۔

''واٹ آر یو تھنکنگ مسٹر فاروق؟'' کیتھرائن نے اسے پکارا تو وہ اپنے خیالات سے باہر آیا۔

''کچھ نہیں بس ہندوستان کے سیاسی حالات پر غور کر رہا تھا۔'' اس نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے کیتھرائن کو جواب دیا۔

''ہاں حالات تو بہت خراب ہیں۔ کئی جگہ ہندو مسلم فسادات سننے میں آ رہے ہیں۔ گاڈ نوز...... یہاں کیا ہونے والا ہے۔'' وہ بھی حالات سے باخبر اور کچھ کچھ فکرمند تھی۔

''آپ نے کیا سوچا ہے مسٹر فاروق۔ اگر مسلمانوں نے اپنا سیپریٹ کنٹری بنا لیا تو...... آپ کہاں رہیں گے؟ یہیں ہندوستان میں یا نیو کنٹری میں؟'' اچانک ہی اس کے ذہن میں سوال ابھرا تو اس نے فاروق سے دریافت کیا۔

''پتا نہیں۔ میں نے ابھی تک اس سلسلے میں کچھ سوچا نہیں ہے۔ پھر میں کوئی اکیلا تھوڑی ہوں۔ جو سب کا فیصلہ ہوگا، میں بھی وہی کروں گا۔ میرا جینا مرنا تو ان لوگوں کے ساتھ ہی ہے۔''

''اور آپ ان لوگوں کے ساتھ کیسے ہیں؟ آپ تو ان میں سے نہیں لگتے۔'' اس کے جواب پر کیتھرائن نے بڑی بے ساختگی سے سوال کیا۔ اس سوال کو سن کر وہ خاموش ہو رہا۔ ''آئی ایم سوری۔ میں نے شاید کوئی غلط کوئسچن کر لیا۔'' کیتھرائن نے اس کی خاموشی کو محسوس کیا۔

''اٹس اوکے۔ آپ نے کوئی غلط سوال نہیں کیا بس میرے لیے ہی جواب کچھ مشکل ہے۔ ویسے بھی میرے متعلق جان کر کیا کیجیے گا۔ کچھ اپنے بارے میں بتائیے۔'' فاروق نے گفتگو کا رخ اس کی طرف موڑ دیا۔

''اپنے بارے میں کیا بتاؤں؟ بڑی عام سی لڑکی ہوں۔'' کیتھرائن کی آنکھوں میں اداسی چھا گئی۔

''تو عام سی ہی باتیں بتائیے نا جیسا کہ والدین کیا کرتے تھے؟ کتنے بہن بھائی ہیں؟ آپ نے تعلیم کہاں سے حاصل کی وغیرہ وغیرہ۔'' وہ نہیں چاہتا تھا کہ موضوعِ سخن اس کی ذات بنے چنانچہ کیتھرائن کو اس کی اپنی ذات میں الجھا دیا۔

"کبھی کبھی عام سی باتیں بھی عام نہیں ہوتیں نہ ہی سمپل کوئسچنز کے آنسرز سمپل ہوتے ہیں۔" کیتھرائن کی اداسی مزید گہری ہوگئی۔

"اگر بتانے میں کوئی حرج ہے تو مت بتایئے۔ میں نے تو بس یونہی......" اس بار فاروق اس کا انداز محسوس کر کے ٹھٹک گیا اور قدرے ندامت سے بولا۔

"آپ کی غلطی نہیں بس میرے ہی کوائف کچھ ایسے ہیں کہ کسی کے سامنے بیان کرتے ہوئے شرمندگی سی ہوتی ہے۔" کیتھرائن نے اسے نادم پا کر وضاحت کی۔

"میں ہرگز بھی آپ کو شرمندہ نہیں دیکھنا چاہتا اگرچہ مجھے یقین ہے کہ آپ کی زندگی میں اگر کچھ غلط ہے تبھی تو اس کی ذمے دار ہرگز بھی آپ خود نہیں ہوں گی لیکن کیونکہ آپ سمجھتی ہیں کہ آپ کو شرمندگی ہوگی تو اس بات کو جانے دیجیے۔ آئندہ میں کبھی اپنے سوالات کو نہیں دہراؤں گا۔" فاروق نے نہایت نرمی سے کہتے ہوئے یکدم ہی موضوع بدلنے کی کوشش کی اور اس سے پوچھا۔ "چائے کے بارے میں کیا خیال ہے......چائے پینا پسند کریں گی آپ؟"

کیتھرائن نے بے دھیانی کے عالم میں سر کو اثباتی جنبش دی تو فاروق ملازم کو بلا کر اسے چائے کے سلسلے میں ہدایات دینے لگا۔ کیتھرائن اپنی جگہ خاموش بیٹھی رہی۔ جب ملازم ہدایات لے کر وہاں سے چلا گیا تو بالکل اچانک ہی اس نے بولنا شروع کر دیا۔

"میں نہیں جانتی کہ میرے پیرنٹس کون تھے۔ مجھے پالنے والوں نے مجھے بتایا تھا کہ ایک رات کوئی چپکے سے مجھے چرچ کے باہر لگے جھولے میں ڈال گیا تھا۔ اس لیے میں نہیں کہہ سکتی کہ میں کسی کے گناہ کی پیداوار ہوں یا میرے باپ نے غربت و افلاس سے گھبرا کر مجھے اس جھولے میں ڈال دیا تھا۔ میں بس اتنا جانتی ہوں کہ میں ایک خیراتی ادارے میں چھوٹی چھوٹی خواہشات کے لیے ترستی اپنوں کی محبت کے بغیر پروان چڑھی ہوں۔ میری پرورش کرنے والی سسٹر اینی چاہتی تھیں کہ میں نن بنوں۔ میں شاید بن بھی جاتی اگر تیرہ سال کی عمر میں فادر اسمتھ کا گھناؤنا چہرہ میرے سامنے نہیں آجاتا۔ چہرے پر شفقت اور روحانیت کا نقاب چڑھائے اس شخص نے اپنی بیٹی کی عمر کی لڑکی کو برباد کرنے کی کوشش کی۔ اس روز اگر سسٹر اینی وہاں نہیں پہنچ جاتیں تو شاید آج میں آپ کے سامنے نہ ہوتی۔ فادر اسمتھ بہت پاورفل آدمی تھا۔ سسٹر اینی نے اسے اس کی حرکت پر باتیں تو سنائیں لیکن وہ اس کے خلاف کوئی ایکشن نہیں لے سکتی تھیں۔ بس پھر انہوں نے مجھے نن بنانے کا فیصلہ بدل ڈالا اور یوں میں مشنری اسکول سے پڑھنے کے بعد نرسنگ کی طرف آگئی۔ جاب کرتے ہوئے مجھے احساس ہوا کہ یہاں تو قدم قدم پر فادر اسمتھ جیسے گدھوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ منوہر بھانیہ والا واقعہ آپ کی اپنی آنکھوں کے سامنے کا ہے۔ ایسے لوز کریکٹر لوگوں سے بچنے کے لیے میں نے خود پر سختی اور بدلحاظی کا خول چڑھا رکھا ہے۔ بہت کم کسی پر ظاہر ہونے دیتی ہوں کہ میں اس دنیا میں اکیلی ہوں کیونکہ اکیلی لڑکی کو آسان شکار سمجھ کر بھیڑیے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ عام طور پر میں کسی سے اپنے متعلق بات نہیں کرتی اگر کروں بھی تو سچائی نہیں بیان کرتی کہ لوگ مجھے گناہ کی پیداوار سمجھ کر گناہ پر اکسانا آسان سمجھتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ میں نے پہلے بھی آپ لوگوں کو اپنے بارے میں کچھ بتایا ہو لیکن پوری سچائی سے نہیں بتایا ہوگا۔ میں لوگوں کو اپنے بارے میں اتنی جھوٹی کہانیاں سنا چکی ہوں کہ مجھے خود بھی یاد نہیں رہتا کہ کسے اپنے بارے میں کیا بتایا تھا۔ اب تک ملنے والے لوگوں میں سے آپ لوگ مجھے سب سے ہٹ کر لگے۔ اس لیے یہ سمجھ لینے کے باوجود کہ آپ لوگوں کا تعلق اڈے پاڑے کی دنیا سے ہے، میں نے آپ کے ساتھ آنا منظور کر لیا اور آپ باہر کی دنیا کے پہلے فرد ہیں جسے میں نے اپنی زبان سے اپنے بارے میں بالکل سچائی سے بتایا ہے۔"

اس نے جھکی نظروں سے اپنی پوری داستانِ حیات فاروق کے سامنے بیان کر دی۔ فاروق نے مزید ایک پل کے لیے اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔ کم عمر کیتھرائن کا خوب صورت چہرہ اندرونی تپش سے سرخ ہو رہا تھا۔ وہ اندازہ کرسکتا تھا کہ چند منٹوں میں بیان کردہ اس داستان حیات کا ایک ایک پل اس پر بہت بھاری رہا ہوگا۔ اس نے زندگی کا ہر دن کانٹوں پر چلتے ہوئے گزارا ہوگا جب ہی تو وہ اتنی کم عمری میں بھی اتنی سمجھ دار تھی کہ اپنے لیے درست راہ کا انتخاب کر سکے۔ وہ اپنے بارے میں کسی خوش فہمی کا شکار نہیں تھا لیکن اتنی بات تو وثوق سے کہہ سکتا تھا کہ رین کے اڈے سے وابستہ کسی شخص میں یہ جرأت نہیں ہوسکتی کہ وہ کسی عورت کی عزت پر ہاتھ ڈال سکے۔ کیتھرائن نے بھی اس حقیقت کو سمجھ لیا تھا اس لیے اس کی تیمارداری کے لیے بمبئی سے اتنی دور آنا منظور کر لیا تھا۔

"ہم پر اعتماد کرنے کا شکریہ۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کا یہ اعتبار ہمیشہ قائم رہے گا۔ عورت کو ہم نے

ہمیشہ قابلِ احترام جانا ہے اور آج آپ کی داستان سننے کے بعد آپ کی عزت میری نظروں میں اور بھی بڑھ گئی ہے۔ آپ کی پیدائش پر میں کوئی بات نہیں کروں گا کہ جس معاملے میں آپ کا اختیار نہیں تھا اس کی بنیاد پر آپ کو قصوروار یا موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ میں انسان کو اس کے ذاتی کردار کی بنیاد پر مقام دینے کا قائل ہوں اور آپ نے اتنے نامساعد حالات میں اپنی عزت و حرمت کی حفاظت کرکے ثابت کردیا ہے کہ آپ ایک معزز اور قابلِ احترام خاتون ہیں بلکہ میری نظر میں تو آپ ان خواتین سے بھی زیادہ قابلِ احترام ہیں جو گھروں کی چاردیواری میں محفوظ ہیں اور کبھی کسی غیر مرد نے ان کی صورت نہیں دیکھی۔ ان خواتین کو تو ان کی عزت کے رکھوالے میسر ہیں اس لیے ان کی پاک دامنی ایسی قابلِ ذکر نہیں۔ میرے نزدیک تو عزت و مقام کی اصل حق دار آپ جیسی خواتین ہیں جو زمانے کے سردوگرم میں بھی خود کو بڑی احتیاط سے بچائے ہوئے ہیں۔ میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں کہ آج سے میں آپ کو صرف روایتی طور پر آپ کے پیشے کے اعتبار سے ہی سسٹر کہہ کر نہیں پکاروں گا بلکہ اپنی سگی بہن کی طرح ہی محسوس کروں گا۔ آج سے آپ کو اختیار ہوگا کہ ایک بہن کی طرح مجھ پر اپنا حق جتائیں اور جو چاہیں فرمائش کریں۔'' جوں جوں فاروق بولتا جارہا تھا، کیتھرائن کا چہرہ کھلتا جارہا تھا۔

''تھینک یو سوچ۔'' فاروق خاموش ہوا تو وہ اپنے لرزتے ہونٹوں سے بس اتنا ہی کہہ سکی۔

''کسی شکریے کی ضرورت نہیں۔ میں نے کہا نا کہ آج سے آپ کا مجھ پر حق ہے اور جہاں حق ہو وہاں شکریہ نہیں ادا کرتے۔ آئی سمجھ میں۔'' فاروق نے اسے ٹوکا تو اس نے یوں مسکراتے ہوئے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی کہ اس کی آنکھوں میں شفاف پانی چمک رہا تھا۔

''ارے یہ کیا؟ گفتگو کے درمیان چائے بن کر آئی بھی اور ٹھنڈی بھی ہوگئی۔'' موضوع تبدیل کرنے کے لیے فاروق نے میز پر رکھی چائے کی ٹرے کی طرف اشارہ کیا۔ یہ ٹرے ملازم رکھ کر اس کے اشارے پر خاموشی سے پلٹ گیا تھا۔ اس نے کیتھرائن کی گفتگو میں دخل اندازی کو نامناسب جان کر چائے کو نظرانداز کردیا تھا۔ یوں بھی وہ کوئی ایسی خوشگوار داستان نہیں تھی جو چائے کے ساتھ لطف اندوز ہوتے ہوئے سنی جاتی۔ کیتھرائن اسے اپنی روح کے زخم دکھارہی تھی اور اتنے نازک موضوع پر بات کرتے ہوئے کھانے پینے کا سلسلہ کوئی بے حس انسان ہی جاری رکھ سکتا تھا۔

''میں ابھی تازہ گرم چائے تیار کروا دیتی ہوں۔'' کیتھرائن اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی۔

''رہنے دیجیے، اب موڈ نہیں رہا ہے۔ ایسا کرتے ہیں کہ کچھ دیر باہر نکل کر چہل قدمی کرتے ہیں۔ اردگرد اتنے خوب صورت مناظر ہیں۔ آپ کی طبیعت بھی بہل جائے گی اور میری صحت پر بھی اچھا اثر پڑے گا۔'' فاروق نے اسے روک دیا تو اس نے بھی ہنستے ہوئے اس کے نئے پروگرام کی توثیق کردی۔ وہ دونوں اٹھ کر باہر آئے تو کچھ حیرت گولو سے ملاقات ہوگئی۔

''یہ دیکھیے فاروق بھائی یہ بادل کتنے نزدیک ہیں۔ میں چاہوں تو انہیں ہاتھ بھی لگا سکتا ہوں۔'' فاروق پر نظر پڑتے ہی اس نے پُرجوش لہجے میں اسے بتایا اور اپنی بات کا عملی ثبوت پیش کرنے کے لیے بچوں کی طرح اچک کر اوپر تیرتے بادلوں کو اپنی مٹھی میں لینے کی کوشش کی۔ کیتھرائن بھی اس شغل میں اس کے ساتھ شامل ہوگئی۔ ذرا سی دیر میں شملہ کی فضاؤں میں اس لڑکی کی کھلکھلاہٹیں بکھرنے لگیں جس کے دل پر کئی زخم تھے لیکن آج کسی نے اس کے زخموں پر مرہم رکھ کر اس کی چارہ گری کی تھی۔

☆☆☆

جوزف کی ماں کو بہت تیز بخار ہورہا تھا۔ جوزفین پانی میں بھیگی پٹیاں اس کے ماتھے اور سر پر رکھنے کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی زیرلب بڑبڑانے بھی لگتی تھی۔

''بہت کیئرلیس بوائے ہے جوزف۔ پتا نہیں دن بھر کہاں مارا مارا پھرتا ہے۔ اتنا بھی خیال نہیں کہ آنٹی کی طبیعت خراب ہے تو کچھ دیر گھر پر ہی ٹک جائے۔'' بڑبڑانے کے ساتھ اس نے ایک بار پھر سرہانے کی ٹوٹے پائے والی میز پر رکھی دوا کی بوتل کو کھول کر دیکھا۔ وہ بلامبالغہ کوئی پچاس بار اس بوتل کو کھول کر دیکھ چکی تھی۔ بوتل میں دوا ختم ہوگئی تھی لیکن وہ ہر بار اسے یوں کھول کر دیکھتی تھی جیسے کسی جادوئی طاقت کے بل پر بوتل میں خودبخود ہی دوا آگئی ہوگی اور وہ اسے پلا کر آنٹی کا بخار اتار سکے گی۔

''میں نے انکل سے کل کہا بھی تھا کہ آنٹی کی دوا ختم ہونے والی ہے پھر بھی یہ بوتل خالی پڑی ہے۔ فادر اور سن دونوں ایک جیسے کیئرلیس ہیں۔''

خالی بوتل کا ڈھکن بند کرتے ہوئے اس بار اس نے جوزف کے ساتھ ساتھ اس کے باپ کو بھی نہیں بخشا۔ اپنے باپ کی موت کے بعد سے اس کا زیادہ وقت جوزف کے گھر میں ہی گزرتا تھا کہ اس کی اپنی ماں تو تولیا فیکٹری میں

مشقت کی بھٹی میں جھلس کر پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے ایندھن فراہم کرنے میں ہی دن بتا دیتی تھی۔ ایسے میں جوزف کا گھر ہی اسے تنہائی اور خوف سے پناہ دینے کا سبب بنتا تھا۔ بچپن کی قربت کی وجہ سے اسے جوزف کی ماں سے محبت ہی بہت تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اس کی بیماری پر شدت سے پریشانی محسوس کر رہی تھی حالانکہ وہ اکثر ہی بیمار رہتی تھی۔ پے در پے پیدا ہونے والے تین مردہ بچوں نے اس کے جسم سے ساری توانائی نچوڑ لی تھی اور یہ ناتواں جسم بہت آسانی سے کسی بھی بیماری کو اپنے اندر جگہ دے دیتا تھا۔ آج کل بھی وہ موسمی بخار کا شکار تھی۔ دو دن پہلے اسے ڈاکٹر سے دوا دلوائی گئی تھی۔ دوا کے اثر سے اس کا بخار کم بھی ہو گیا تھا لیکن اس سے قبل کہ بخار ختم ہوتا، دوا ختم ہو گئی اور نتیجتاً اس کا بخار دوبارہ شدت اختیار کر گیا۔ جوزفین اسکول سے واپس آنے کے بعد زیادہ تر وقت وہیں گزارتی تھی۔ آج کل اسکول میں کرسمس کے سلسلے میں چھٹیاں دے دی گئی تھیں اس لیے اس کا سارا وقت ہی وہیں گزر رہا تھا۔ وہ اپنے گھر کے کام کاج کے ساتھ جوزف کے گھر کا سارا کام بھی نمٹا دیتی تھی اور جواب میں خوب دعائیں سمیٹتی تھی۔ ''آج جوزف گھر تو آئے، چھوڑوں گی نہیں اسے۔'' پانی کی پٹیاں رکھنے کے عمل کو جاری رکھتے ہوئے اس نے اپنے دل میں عزم کیا۔ پٹیاں رکھتے رہنے کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا اور بخار کی شدت میں آہستہ آہستہ کمی آتی چلی گئی۔ بخار کم ہوا تو اس نے آنٹی کو دلیا کھلایا۔ دلیا کھانے کے بعد وہ سو گئی۔ جوزفین کھانے کے برتن دھو کر رکھ رہی تھی کہ دروازے پر آہٹ ہوئی۔ اس نے چھوٹے سے آنگن میں آ کر دیکھا۔ حسبِ توقع جوزف تھا جو کھلے دروازے سے اندر آ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کپڑے کا ایک تھیلا موجود تھا اور وہ خاصا خوش نظر آ رہا تھا۔

''گڈ گاڈ تو ادھر ہی ہے۔ اپن تیرے بارے میں ہی سوچتا ہوا آ رہا تھا۔'' دبلے پتلے سانولے سے جوزف کی مسیں بھیگنے لگی تھیں۔ لڑکپن کی حدوں کو چھوڑتے جوزف کی آنکھوں کے رنگ بھی بدلنے لگے تھے اور جب وہ جوزفین کو دیکھتا تھا تو اس کی آنکھوں کی چمک میں اضافہ ہو جاتا تھا۔

''کدھر تھے تم۔ سارا دن آوارہ گردی کرتے رہتے ہو۔ کسی کا نہیں تو اپنی ماں کا تو خیال کرو۔ وہ بے چاری بیمار ہے اور تم باپ بیٹے کو اتنی فرصت نہیں کہ اسے دوا ہی لا کر دے دو۔'' جوزف کے پرجوش اور مسرت بھرے انداز کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ اس پر بگڑی۔ اس کے غصیلے انداز پر جوزف کا چہرہ پھیکا پڑ گیا اور وہ خاموشی سے سر جھکا کر اندر کی طرف بڑھا۔ ''کہاں جا رہے ہو؟ میں نے تم سے کچھ کہا ہے۔'' جوزفین کڑے تیوروں کے ساتھ اس کے پیچھے لپکی۔ جوزف رکے بغیر کمرے میں داخل ہو گیا اور ماں کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر اس کا بخار چیک کیا۔ پھر تھیلے میں ہاتھ ڈال کر دوا کی بوتل اور چند گولیاں باہر نکالیں۔

''ماں کی دوا ہے۔ جاگ جائے تو اسے پلا دینا۔'' دونوں چیزوں کو میز پر رکھ کر وہ باہر نکل گیا۔ جوزفین کو احساس ہوا کہ اس کا رویہ کچھ زیادہ ہی سخت تھا اور جوزف کو اس سے اتنے سخت رویے کی امید نہیں ہو سکتی تھی اس لیے اتنا زیادہ اداس ہو گیا ہے۔ اپنے رویے کی تلافی کے لیے وہ بھی جوزف کے پیچھے کمرے سے باہر نکلی۔ وہ چھوٹے سے آنگن کے ایک کونے میں بنی چبوترے نما جگہ پر بیٹھ کر ہاتھ منہ دھو رہا تھا۔ جوزفین نے پہلی بار نوٹ کیا کہ اس کا حلیہ بہت میلا ہو رہا ہے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ شہر بھر کی سڑکوں کی خاک چھان کر آیا ہو۔

''یہ تم اتنا ڈرٹی کیوں ہو رہا ہے؟ بتاتا کیوں نہیں کہ کدھر گیا تھا؟'' جوزفین اس کے قریب ہی جا کھڑی ہوئی اور اس سے دریافت کیا۔ وہ کوئی جواب دیے بغیر منہ پر پانی کے چھپکے مارتا رہا۔ منہ ہاتھ دھونے سے فارغ ہونے کے بعد وہ کمرے کے دروازے کے ساتھ دیوار پر لگی کیل پر ٹنگے اپنے کپڑے کے تھیلے تک گیا۔ کمرے سے نکل کر اس نے تھیلا اس کیل پر لٹکا دیا تھا۔ لٹکے ہوئے تھیلے کو اتار کر اس نے اس میں سے چمکیلے کاغذ میں لپٹی کوئی شے نکالی اور خاموشی سے جوزفین کی طرف بڑھا دی۔ جوزفین نے عالمِ حیرت میں اسے تھام لیا۔

''یہ کیا ہے؟'' اس کے مختصر سوال میں بھی حیرت تھی۔

''اپن تیرے لیے کرسمس کا گفٹ لایا ہے۔'' جوزف نے سنجیدگی کے ساتھ اسے بتایا تو وہ حیرت اور شوق کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ چمکیلے کاغذ میں لپٹے تحفے کو کھولنے لگی۔ کاغذ اتارنے پر اندر سے ایک خوب صورت لانگ اسکرٹ اور بلاؤز نمودار ہوا۔

''ویری بیوٹی فل۔'' جوزفین نے بہت شوق سے اس لباس کو اپنے ساتھ لگا کر دیکھا۔ وہ بہت زیادہ مہنگا لباس نہیں تھا لیکن خوش نما ضرور تھا اور جوزفین کے ساتھ لگ کر تو اور بھی خوب صورت لگ رہا تھا۔

ناراضی اور سنجیدگی کا اظہار کرتے جوزف کی آنکھوں میں بھی چمک سی لہرا گئی لیکن دانستہ اس نے جوزفین کے

سامنے کوئی ردعمل ظاہر نہیں ہونے دیا اور باورچی خانے میں جا کر چولہے پر رکھی پتیلی کا ڈھکن اٹھا کر دیکھا۔ دال پکی ہوئی تھی۔ اس نے پلیٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن اس کے پیچھے ہی باورچی خانے میں آجانے والی جوزفین نے اس سے پہلے ہی پلیٹ اٹھالی اور قدرے رعب سے بولی۔

''پیچھے ہٹو۔ میں کھانا نکال کر دیتی ہوں۔''

جوزف نے کوئی مزاحمت نہیں کی اور پیچھے ہٹ گیا۔ جوزفین نے اس کے لیے پلیٹ میں دال نکالی اور دوسری پلیٹ میں کپڑے میں لپٹی ہوئی روٹیاں رکھنے کے بعد دونوں پلیٹوں کو سلور کی ایک پرانی سی پلیٹ میں رکھ کر ساتھ ہی ایلومینیم کے گلاس میں پانی بھر کر رکھ دیا۔ اسے کھانا نکالتے دیکھ کر جوزف اندر کمرے میں جا بیٹھا تھا۔ اس کمرے کے فرش پر ایک پھٹی ہوئی دری بچھی تھی۔ دری سمیت گھر میں موجود ہر شے کی خستگی سے ظاہر تھا کہ یہاں غربت و افلاس کے ڈیرے ہیں اور گھر کے مکین بمشکل زندگی کی گاڑی کو کھینچ رہے ہیں۔ جوزفین نے کھانے کی ٹرے اس کے سامنے لا کر رکھ دی پھر خود بھی مقابل بیٹھ گئی اور آہستہ سے بولی۔

''آئی ایم ویری سوری جوزف۔ میں تم سے زیادہ ہی سخت بول گئی۔ انکولی آنٹی کو بہت تیز بخار تھا تو میں پریشان ہوگئی تھی۔''

''دال تو تے پکائی ہے نا۔ بہت ٹیسٹی ہے۔'' جوزف نے اس کی بات کے جواب میں کچھ کہنے کے بجائے منہ میں جانے والے پہلے لقمے کے ساتھ ہی تعریفی تبصرہ کیا۔

''تم مجھ سے ناراض تو نہیں ہونا جوزف؟'' وہ خود موضوع بدلنے کو تیار نہیں تھی۔

''اپن پہلے بھی تجھ سے ناراض ہوا ہے کیا۔ بس تھوڑا سا سیڈ ہوگیا تھا۔'' جوزف نے کھانے کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے بے نیازی سے اس کی بات کا جواب دیا۔

''تمہیں سیڈ کیا، اسی کے لیے تو سوری کر رہی ہوں۔''

اس نے معصومیت سے کہا تو جوزف مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا اور اپنے ہاتھ سے نوالہ بنا کر اس کے منہ میں ڈالتے ہوئے پوچھا۔ ''تجھے اپنا گفٹ کیسا لگا؟''

''بتایا تو ہے ویری بیوٹی فل۔'' اس نے نوالہ چبا کر حلق سے نیچے اتارتے ہوئے اسے جواب دیا پھر قدرے جھجکتے ہوئے بولی۔

''اتنا خوب صورت ڈریس تو خاصا کوسٹلی ہوگا نا جوزف۔ تیرے پاس اس کے لیے پیسے کہاں سے آئے؟''

''فکر مت کر۔ اپن نے چوری نہیں کی ہے۔'' جوزف نے اسے جواب دیا۔

''میں نے یہ کب کہا ہے۔ مجھے معلوم ہے میرا جوزف کبھی غلط کام نہیں کرتا ہے لیکن مجھے پتا تو ہونا چاہیے نا کہ تو نے میرے لیے کیسے گفٹ خریدا ہے؟'' اس کے لیے اپنے سوال کا جواب ضروری تھا۔ وہ دونوں ہی جس طبقے سے تعلق رکھتے تھے، وہاں ایسی عیاشی کی گنجائش نہیں نکلتی تھی۔ ایک دوسرے کو ایسے تحائف دینا تو دور کی بات، انہیں تو تن ڈھانپنے کے لیے بھی مہینوں کے استعمال کے بعد جسم پر گل پھٹ جانے والے پیوند زدہ لباس کی جگہ بڑی مشکل سے دوسرا لباس میسر آتا تھا۔

''ادھر بیچ کے پاس ایک بہت بڑی بلڈنگ بن رہی ہے۔ ادھر ہر وقت لیبر کی ضرورت رہتی ہے۔ اپن بہت دنوں سے ادھر کام کر رہا تھا۔ آج پے منٹ ملا تو ماں کے لیے دوا اور تیرے لیے یہ گفٹ خرید لیا۔'' اس بار جوزف نے نہایت سادگی سے اسے بتا دیا۔ اس کا جواب سن کر جوزفین جو کہ اس وقت اس کے نوالہ بناتے ہوئے ہاتھ کو ہی دیکھ رہی تھی جان گئی کہ جوزف کی انگلیوں پر موٹی موٹی گانٹھیں سی کیوں بن گئی ہیں اور وہ شام ڈھلے خاک آلود لباس اور جسم کے ساتھ گھر کیوں لوٹتا ہے۔

''تم نے میرا کرسمس کا گفٹ خریدنے کے لیے اتنی محنت کی؟'' اس کے ایثار کا سوچ کر جوزفین کی پلکیں بھیگ گئیں اور اس نے جوزف کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ قریب سے دیکھنے پر اس کے ہاتھوں پر سخت گانٹھوں کے ساتھ چند پھٹ جانے والے چھالے بھی نظر آرہے تھے۔

''کیا ضرورت تھی تمہیں اتنی محنت کرنے کی؟ میں وہ کپڑے پہنوں گی تو تمہارے ہاتھوں کے چھالے یاد کر کے رونا آجائے گا۔''

''تو اپنا لایا ہوا ڈریس پہنے گی تو تجھے اس ڈریس میں دیکھ کر اپنے زخموں کا درد خود ہی ٹائیں ٹائیں فش ہوجائے گا۔'' جوزف نے ہنس کر اس کی بات کا جواب دیا۔

''تم بہت برے ہو جوزف۔'' جوزفین نے اس انداز میں یہ جملہ کہا جیسے کہنا چاہ رہی ہو کہ تم سے زیادہ کوئی اچھا نہیں ہے۔ جوزف نے اس کی بات سن کر قہقہہ لگایا اور بولا۔

''اپن برا ہی ٹھیک ہوں۔ تو اچھی ہے اپن کے لیے اتنا کافی ہے۔'' جوزفین نے اس کی بات سن کر اس کی ہنسی میں ساتھ دینا چاہا لیکن آنکھوں سے برستے آنسوؤں کو نہ

روک سکی۔ آنسو جولیٹ کے بھی نہیں رک رہے تھے۔ ماں کی ہدایت پر تصور کی آنکھ سے اس ڈائری کو پڑھتی وہ گویا ہر منظر کا حصہ تھی۔ جب ہی تو محسوس کر سکتی تھی کہ دو ازل سے ایک دوسرے کی محبت میں مبتلا افراد پر جدائی کی گھڑیاں کتنی بھاری رہی ہوں گی جب ہی تو اس کے باپ نے جوزفین کے جاتے ہی خود بھی بہت جلد رخت سفر باندھ لیا تھا۔

☆☆☆

وہ حسب عادت صبح سویرے جاگ گیا۔ معمول کے مطابق ہلکی پھلکی ورزش بھی کرلی اور غسل سے بھی فارغ ہو گیا۔ گولوا گرچہ صبح جلدی جاگنے کا عادی تھا لیکن آج اس کی آنکھ نہیں کھلی تھی۔ رات وہ دیر تک کیتھرائن کے ساتھ لوڈو کھیلتا رہا تھا شاید یہ اسی کا نتیجہ تھا۔ کیتھرائن اور اس کے بیچ اچھی دوستی ہو گئی تھی۔ کیتھرائن اس کے ساتھ بالکل چھوٹے بھائی کی طرح پیش آتی تھی۔ وہ خود بھی کیتھرائن کو پسند کرنے لگا تھا اور اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ کیتھرائن فاروق کا خیال رکھتی تھی۔ ابتدا میں شاید اس نے کیتھرائن کو رقیب کے طور پر بھی لیا تھا لیکن اس کی طرف سے کوئی منفی ردعمل نہ آنے کی وجہ سے آہستہ آہستہ اسے قبول کرتا جا رہا تھا جس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ اس نے جان لیا تھا کہ وہ چاہے فاروق کا کتنا بھی خیال رکھ لے کیتھرائن کی طرح پیشہ ورانہ طریقے سے دیکھ بھال نہیں کر سکتا اور اس کا وجود فاروق کی بہتری کے لیے ناگزیر ہے۔ بہرحال اب ان کی اچھی نبھ رہی تھی اور دونوں اپنا مشترکہ مشن (فاروق کا خیال رکھنا) انجام دینے کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے سے بھی گھل مل گئے تھے۔ فاروق غسل سے فارغ ہونے کے بعد اپنے کمرے سے باہر نکل گیا۔ کیتھرائن کے کمرے کا دروازہ بھی ابھی تک بند تھا۔ صبح ان کی ملاقات ناشتے کی میز پر ہی ہوتی تھی۔ ناشتے کے بعد کیتھرائن اس کا معائنہ کرنے کے بعد دوائیں کھلانے کا فریضہ انجام دیتی تھی۔ ابھی ناشتے میں کچھ وقت باقی تھا۔ اس نے تازہ ہوا میں سانس لینے کے ارادے سے اوپری منزل کی طرف جانے والی سیڑھیوں کا رخ کیا۔

''کوئی خدمت سر۔'' راستے میں اسے ملازم مل گیا۔

''میں اوپر ٹیرس پر جا رہا ہوں۔ وہیں ایک پیالی چائے لے آؤ۔'' اس نے ملازم کو ہدایت دی اور خود سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ کشادہ ٹیرس پر سرخ گملوں میں قسم قسم کے پودے لگے ہوئے تھے۔ بالکل کنارے پر ریلنگ کے ساتھ رکھے بڑے سے گملے میں کوئی بیل لگی ہوئی تھی۔ یہ بیل اتنی پھیل گئی تھی کہ اسے پوری ریلنگ پر پھیلا دیا گیا تھا۔

بیل میں ننھے ننھے سرخ و سفید پھول لگے ہوئے تھے جن کی وجہ سے ترچھی سرخ چھتوں والا یہ بنگلا دیکھنے والوں کو اور بھی مسحور کن لگتا تھا۔ فاروق آہستہ قدموں سے چلتا ہوا ریلنگ کے پاس جا کھڑا ہوا۔ شملہ کی صبح کی تازہ ہوا میں عجیب سی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ آنکھیں دور تک جو بھی منظر دیکھ پاتی تھیں، ان میں سب سے نمایاں شے ہریالی تھی۔ اس نے اپنی زندگی میں اس سے خوب صورت منظر کبھی نہیں دیکھا تھا لیکن عجیب بات یہ تھی کہ اتنے خوب صورت منظر کا حصہ ہوتے ہوئے بھی اس کا ذہن بمبئی کی اس ٹیڑھی میڑھی بدوضع مکانوں والی بند گلی کے خیال میں ڈوبا ہوا تھا جس کے ایک چھوٹے سے مکان سے جولیٹ برآمد ہوتی تھی اور وہ اسے اس وقت تک دیکھتا رہتا تھا جب تک وہ اڈے کے سامنے سے گزر کر بس اسٹاپ کی طرف جاتے ہوئے نظروں سے اوجھل نہیں ہو جاتی تھی۔ وہ چند لمحوں کی دید اس کے پورے دن کو خوشگوار بنا دیتی تھی۔ یہاں اس کے اردگرد اتنی خوب صورتی بکھری ہوئی تھی لیکن پھر بھی وہ اس ایک لمحے کی دید کو یاد کرتا تھا جو اس کے دن کو خوب صورت بنا دیتی تھی اور دل خود بخود ہی یہ خواہش کرنے لگتا تھا کہ کاش اس کے ساتھ جولیٹ بھی یہاں ہوتی تو شملہ کی خوب صورتی مکمل ہو جاتی۔

اپنی اسی خواہش کے زیر اثر وہ بنگلے کی طرف آنے والے راستے پر نظریں جمائے ہوئے تھا کہ اس نے ایک سرخ رنگ کی گاڑی کو اس طرف آتے دیکھا۔ گاڑی دور تھی لیکن اس کا رخ بنگلے کی طرف ہی تھا۔ فاروق کو حیرت ہوئی کہ اتنی صبح کون آ رہا ہے۔ وہ بے ساختہ ہی سیڑھیاں اتر کر نیچے پہنچ گیا اور دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ عین اسی وقت بنگلے کے سامنے رکنے والی گاڑی کا دروازہ بھی کھلا اور اس میں سے ایک لڑکی برآمد ہوئی۔ پینٹ شرٹ میں ملبوس خود گاڑی چلا کر آنے والی لڑکی نے فاروق کی طرف دیکھ کر بھویں اچکائیں اور قدم قدم چلتی اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

''آپ کی تعریف؟'' بے ساختہ ہی فاروق کے لبوں سے سوال پھسلا۔

''یہ تو مجھے آپ سے پوچھنا چاہیے تھا۔ کون ہیں آپ اور یہاں کیا کر رہے ہیں؟'' اس نے بے حد کڑے تیوروں کے ساتھ یہ سوال کر کے فاروق کو حیران کر دیا۔

زندگی کے تلخ و ترش حقائق اور
محبت کی فریب کاریوں کا مزید
احوال اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

کارنامہ

تنویر ریاض

سراغ رسانی اس کا روزگار تھا اور بال کی کھال نکالنا اس کی فطرت... اور یہی خوبی اس کے کاروبار کو چمکا رہی تھی مگر بعض اوقات ناکامی بھی انسان کو ایک جنوں خیزی عطا کرتی ہے جس کے ذریعے وہ کامیابی کی منزل کو چھو لیتا ہے۔ ایسا ہی کچھ اس کے ساتھ بھی ہوا جب کیس اس کے ہاتھ سے نکلنے لگا تو جاتے جاتے اس نے ایک ایسا وار کھیلا کہ بازی یکدم پلٹ گئی۔

جھوٹا بھرم قائم رکھنے والے ایک سراغ رساں کا کارنامہ

ڈیمیٹری نے فون کر کے ایک نیا کام سونپ دیا تھا۔ اس نے تفصیل تو نہیں بتائی بس اتنا کہا کہ اس کا ایک گاہک اپنے اپارٹمنٹ کے لیونگ روم میں ایک مردہ طوائف کے ساتھ موجود ہے۔ مجھے وہاں پہنچ کر اس بات کو یقینی بنانا ہے کہ پولیس اس کے لیے کوئی مسئلہ نہ کھڑا کر دے۔ یہ ایک بہت مشکل اور پیچیدہ صورتِ حال تھی۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کسی شخص کے اپارٹمنٹ میں لاش موجود ہو اور پولیس اس پر شک نہ کرے لیکن ڈیمیٹری کو یہ بات سمجھانا بہت مشکل

ہے۔ اسے صرف حکم دینا آتا تھا۔ یہ ہمارا دردِ سر تھا کہ اس کی تعمیل کیسے کی جائے پھر میں کہے بغیر نہ رہ سکا۔

"پولیس والے اپنی کارروائی تو ضرور کریں گے۔"

"اس کی موت نشے کی زیادتی کی وجہ سے ہوئی ہے۔ فرینک اس وقت وہاں موجود نہیں تھا جب یہ واقعہ پیش آیا لیکن فرینک کا گزشتہ ریکارڈ کچھ زیادہ اچھا نہیں۔ اس لیے پولیس اس کے ساتھ کچھ بھی کر سکتی ہے۔"

"اس کا پورا نام کیا ہے؟"

"فرینک میٹنٹ ......"

"میں نے کبھی یہ نام نہیں سنا۔"

"وہ کوئی بڑی مچھلی نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ شاید وہ خود کو ایسا سمجھتا ہو۔ وہ چھوٹے موٹے فراڈ کرتا رہتا ہے لیکن کبھی پکڑا نہیں گیا۔"

"وہ سمجھتا ہے کہ پولیس اسے اس قتل کے الزام میں گرفتار کرے گی۔"

"فرینک کی باتوں سے تو یہی لگتا ہے کہ ساری پولیس فورس اسے اس قتل کے الزام میں پھانسنے پر تلی ہوئی ہے۔ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ اس پر زیادہ توجہ نہیں دیں گے۔"

"اور ہمارے لیے گاہک کی ہر بات حکم کا درجہ رکھتی ہے کیونکہ وہ ہمیشہ صحیح کہتا ہے۔ جب اس عورت کی موت واقع ہوئی تو اس وقت وہ وہاں اکیلی تھی؟"

"ہاں لیکن میری اس سے صرف دو منٹ ہی بات ہوسکی اس لیے میں اس بارے میں زیادہ نہیں جانتا۔ وہ اور اس کے کچھ دوست گزشتہ شب اس عورت کو سنیڈر بنگھم والے گھر میں لے کر آئے تھے۔ آج وہ اسے وہیں چھوڑ کر لنچ کے لیے چلے گئے۔ واپس آئے تو دیکھا کہ وہ فرش پر مردہ حالت میں پڑی ہوئی تھی۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ اس کے پاس کوئی نشہ آور شے ہوگی۔"

"فرینک کو کس بات کا ڈر ہے؟"

"وہ صرف یہ سوچ کر پریشان ہو رہا ہے کہ پولیس والے اس کے ساتھ کوئی غیر اخلاقی حرکت نہ کریں۔ اسے اس عورت سے کوئی عداوت نہیں تھی اور نہ ہی اس کی جانب سے کسی بے پروائی کا مظاہرہ کیا گیا۔ فرینک کے خیال میں یہ محض ایک حادثہ ہے۔"

"گویا میں وہاں جا کر پولیس کو اس سے دور رکھنے کی کوشش کروں۔ یہ کام خاصا مشکل نظر آتا ہے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ وہ تمہارے پہنچنے سے پہلے پولیس کو فون نہیں کریں گے۔ اگر فرینک کوئی گڑبڑ کرے تو مجھے فون کر دینا لیکن امید نہیں کہ وہ مسئلہ بنے گا۔ وہ ہیروئن استعمال نہیں کرتا اور نہ ہی اس نے طوائف کو مارا ہے۔ یہ محض اس کی بدقسمتی ہے کہ یہ واقعہ اس کے گھر میں پیش آیا۔"

"بے چارہ فرینک۔ یہ حادثہ بھی اسی وقت ہونا تھا جب اس کا کاروبار ترقی کر رہا تھا۔"

"جان! تم اس کی ہاں میں ہاں ملانا۔ سونے کا انڈا دینے والی مرغی کو ذبح کرنے کی کوشش مت کرنا۔"

☆☆☆

مکان کے باہر کا منظر بڑا دل آویز تھا۔ بڑی سڑک سے صدر دروازے تک سرخ بجری کا راستہ بنا ہوا تھا جس کے دونوں اطراف سرسبز پودے لہلہا رہے تھے۔ باہر ایک خوب صورت لان موجود تھا جس کے درمیان ایک فوارہ بنا ہوا تھا۔ صدر دروازے پر جلی حروف میں لی شیک کے الفاظ کندہ تھے۔ دروازہ کھولنے والا فرینک ہی تھا۔ اس نے ایک زرد گاؤن کے علاوہ کچھ بھی نہیں پہنا ہوا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ بولا۔ "وقت بالکل نہیں ہے۔ ہمیں جلد از جلد کوئی بندوبست کرنا ہوگا۔"

اس کے بولنے سے ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ لندن کا رہنے والا ہے لیکن اب اس کے لہجے میں خاصی تبدیلی آچکی تھی۔ وہ لیونگ روم کی طرف بڑھا تو میں بھی اس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ اس کی عمر پچاس کے لگ بھگ ہوگی۔ لیونگ روم میں اس کے دو مہمان بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے فخریہ انداز میں ان کا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ "ان سے ملو۔ یہ ہیں میرے وکیل مسٹر ویرون۔"

"اگر یہ تمہارا وکیل ہے تو پھر تم نے ڈیمیٹری کو فون کیوں کیا تھا؟"

فرینک کھسیانے انداز میں بولا۔ "ویرون اس قسم کے معاملات میں ہاتھ نہیں ڈالتا۔"

میرا اندازہ تھا کہ کمرے میں موجود عورت ویرون کی بیوی ہوگی۔ فرینک نے اس کا نام ربیکا بتایا تھا لیکن تعارف کروانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ وہ ویرون سے کم از کم دس سال چھوٹی لگ رہی تھی۔ اس نے بے پروائی سے... میری طرف دیکھا اور دوبارہ اپنی نظریں کھڑکی سے باہر جمادیں۔ وہ ایک چمکیلی دوپہر تھی اور کھڑکی سے ہلکی ہلکی ہوا کمرے میں آرہی تھی پھر میری نظر کاؤچ پر پڑی لڑکی کی لاش پر گئی۔

وہ آڑی ترچھی لیٹی ہوئی تھی۔ اس کا ایک بازو گردن

کے نیچے اور دوسرا سینے کے آگے پھیلا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ زرد تھا اور یوں لگ رہا تھا جیسے وہ مری نہیں بلکہ گہری نیند سو رہی ہے۔

فرینک بولا۔ ''ڈیمیٹری نے تمہیں بتا دیا ہوگا کہ مجھے تمہاری ضرورت کیوں پیش آگئی ہے؟''

''ہاں۔ مجھے پولیس پر نظر رکھنی ہے۔''

''بالکل ٹھیک...... اس لاش کی یہاں موجودگی کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہونا چاہیے کہ پولیس والے اس جگہ کو کھیل کا میدان سمجھ کر یہاں دندناتے پھریں۔ وہ ایک دفعہ پہلے بھی مجھے گھیر چکے ہیں۔ ان تک یہ پیغام پہنچنا چاہیے کہ وہ مجھے قابو نہیں کر سکتے کیا تم اس کے لیے تیار ہو؟''

میں کوئی جواب دینے کے بجائے اس لڑکی پر جھک گیا۔

''کیا تم اس کے لیے تیار ہو؟'' فرینک نے اپنی بات دہرائی۔

لڑکی نے مختصر سا لباس پہن رکھا تھا جس کی وجہ سے اس کے جسم کے کئی حصے عریاں نظر آرہے تھے جس سے مجھے یہ اندازہ لگانے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی کہ وہ اپنے پیشے میں ماہر تھی اور اس کا نرخ عام طوائفوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہوگا۔

''جان! میں تم سے کچھ کہہ رہا ہوں۔'' فرینک نے جھلاتے ہوئے کہا۔

''اس نے اپنا نام کیا بتایا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہیری۔'' فرینک نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

لڑکی کی لاش کے برابر میں ہی کافی کی میز پر ایک استعمال شدہ ایش ٹرے رکھی ہوئی تھی جس میں ایک سرنج پڑی ہوئی تھی جبکہ اس کی سوئی نیچے فرش پر گر گئی تھی۔

''کیا تمہیں معلوم ہے کہ اس نے یہ ہیروئن کہاں سے حاصل کی؟''

''نہیں۔''

''کیا تم اس وقت اس کے ساتھ نہیں تھے جب اس نے یہ خریدی تھی؟''

''اوہ میرے خدا۔'' اس نے اپنا سر پکڑتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اس کے پاس ایسی کوئی چیز ہے۔''

''فرینک کا منشیات سے کبھی کوئی واسطہ نہیں رہا۔ میں اس کی تصدیق کر سکتا ہوں۔'' ویرون نے میگزین پر سے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔

مجھے اس کی مداخلت پسند نہیں آئی تاہم میں نے اسے نظرانداز کرتے ہوئے فرینک کو مخاطب کیا۔ ''تم اس وقت یہاں نہیں تھے جب یہ واقعہ پیش آیا؟''

''نہیں۔ جب ہم گھر سے باہر گئے اس وقت وہ ٹی وی ...دیکھ رہی تھی۔''

''واپس آنے کے بعد تم نے کسی چیز کو ہاتھ تو نہیں لگایا؟''

''ہم نے صرف ٹی وی بند کیا تھا۔''

''تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ یہ مرچکی ہے؟''

فرینک طنزیہ انداز میں بولا۔ ''لوگ عام طور پر سوتے وقت اپنی آنکھیں کھلی نہیں رکھتے۔''

''میں نے اس کی نبض دیکھنے کی کوشش کی تھی۔'' ویرون میگزین کا صفحہ پلٹتے ہوئے بولا۔ ''لیکن وہ مرچکی تھی۔''

''تم اس وقت کہاں تھے جب اس کی موت واقع ہوئی؟''

''ہم اپنے دوستوں کے ساتھ لنچ پر تھے۔''

''کہاں؟''

''سلیویو میں۔'' اس نے ایک مشہور ریستوران کا نام بتایا۔

''تم اس لباس میں سلیویو گئے تھے۔'' میں نے اس کے زرد گاؤن پر نظر ڈالتے ہوئے کہا جس کے نیچے اس نے کچھ بھی نہیں پہن رکھا تھا۔

''نہیں۔ میں دھوپ سینکنے چھت پر چلا گیا تھا۔ مجھے تمہارے انتظار میں وقت تو گزارنا ہی تھا۔ جانتے ہو میں نے ڈیمیٹری کو ایک گھنٹا پہلے فون کیا تھا۔''

''تمہاری وہاں کس سے ملاقات ہوئی تھی؟''

''وہ ایک بزنس میٹنگ تھی۔'' اس نے آنکھیں بند کر کے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''وہ میرے ساتھ مل کر کوئی کام کرنا چاہتے ہیں۔''

''کمال ہے۔ تم اپنے گھر پر ایک طوائف کو چھوڑ کر دوستوں سے ملنے چلے گئے۔''

''وہ کوئی اٹھائی گیری عورت نہیں تھی جو یہاں سے کچھ لے کر چلی جاتی۔ اس کا معاوضہ بہت زیادہ ہے اور میں اس کے لیے ایک تگڑی اسامی تھا۔ اس کے علاوہ ہم نے ابھی اسے ادائیگی بھی نہیں کی تھی اور جانتا تھا کہ ہمارے واپس آنے تک وہ یہیں ہوگی۔''

''کیا یہ پرس اسی کا ہے؟''

''ہاں۔''

''تم نے اسے کھول کر تو دیکھا ہوگا؟''

''میں ایسا کیوں کرتا۔'' فرینک نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ ''مجھے اس کا پرس کھول کر دیکھنے کی کیا ضرورت تھی۔''

فرینک کے بجائے یہ فریضہ مجھے انجام دینا پڑا۔ پرس میں کچھ زیادہ چیزیں نہیں تھیں۔ ماسوائے ایک پچاس ڈالر

کے کوٹ اور ڈرائیونگ لائسنس کے جس پر اس کا نام انجیلا کرزن لکھا ہوا تھا۔
''اس کا اصل نام انجیلا ہے۔'' میں نے لائسنس پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔
''یہ میرے لیے ایک اطلاع ہے۔''
''اب تم پولیس کو فون کر سکتے ہو۔''
فرینک نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور فون کی طرف بڑھ گیا۔
جب وہ فون پر تفصیل بتانے لگا تو میں ربیکا کے برابر رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ میری طرف مڑی تو میں نے دیکھا کہ اس نے کوٹ کے نیچے نہانے کا لباس پہن رکھا تھا۔
''گویا تم بھی سن باتھ لے رہی تھیں۔'' میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔
اس نے میری طرف اس طرح دیکھا جیسے یقین نہ ہو کہ میں نے اس سے کچھ کہا ہے۔ ''نہیں......'' یہ کہہ کر اس نے اپنا منہ دوسری جانب پھیر لیا۔
فرینک ریسیور رکھتے ہوئے بولا۔ ''وہ لوگ راستے میں ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ ویرون کے آگے سے گزرا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے وقت گزاری کے لیے کمرے کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ ویرون نے میگزین فرش پر پٹخا اور بولا۔
''کیا آج کا بقیہ دن اسی کارروائی کی نذر ہو جائے گا؟''
میں نے کہا۔ ''شاید...... وہ پورے گھر کی تلاشی لیں گے۔ تم سب لوگوں کا بیان بھی لیا جائے گا اور ظاہر ہے کہ وہ یہ سب کام اطمینان سے ہی کریں گے۔ انہیں کوئی جلدی تو ہے نہیں۔''
ویرون نے ناک پھلاتے ہوئے اپنا منہ دوسری جانب موڑ لیا پھر اسے کچھ خیال آیا اور وہ بولا۔
''کیا وہ پورے گھر کی تلاشی لیں گے؟''
''شاید...... صرف تلاشی ہی نہیں بلکہ تصویریں بھی اتاریں گے۔''
''کیا وہ ہماری تلاشی بھی لیں گے؟ میرا مطلب ہے، ہماری ذاتی اشیا بھی......''
فرینک نے بے جان سا قہقہہ لگایا اور بولا۔ ''ہم پولیس کے کام میں مداخلت نہیں کر سکتے ویرون۔ وہ جو چاہیں کریں۔ تم کیا سمجھتے ہو، جان یہاں کیوں آیا ہے۔''
ویرون کی آنکھوں سے خوف جھلک رہا تھا جس کی جانب فرینک نے ابھی تک توجہ نہیں دی تھی۔ اس نے ہچکچاتے انداز میں کہا۔ ''کیا وہ میری چیزوں کی بھی تلاشی لیں گے؟''
میں نے کہا۔ ''یقیناً۔''
فرینک اب بھی ہنس رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''بہتر ہوگا کہ تمہارے بریف کیس میں سے کوک کی بوتل برآمد نہ ہو۔''
''نہیں فرینک۔ یہ مذاق کی بات نہیں ہے۔''
فرینک اس کی جانب جھکا اور بولا۔ ''کیا مسئلہ ہے ویرون؟''
ویرون بڑبڑایا۔ ''بریف کیس میں......''
''تم کس بارے میں بات کر رہے ہو؟'' فرینک الجھتے ہوئے بولا۔
ویرون نے کہا۔ ''تمہیں معلوم ہے کہ جیسن نے تمہیں لنچ کے دوران کیا دیا تھا؟''
فرینک مذاق اڑانے کے انداز میں بولا۔ ''وہ ایک معاہدہ ہی ہے۔ کوئی بم تو نہیں۔''
''اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہم اس کی ٹیکس اسکیم کو پروموٹ کر رہے ہیں۔''
''پھر؟''
''اور اگر اس اسکیم میں کوئی گھپلا ہوا تو......''
فرینک اب بھی اس کا مطلب نہیں سمجھا اور سوالیہ انداز میں اس کی جانب دیکھنے لگا۔
''ایسی صورت میں تم پر بھاری جرمانہ ہوگا اور تم دوالیا ہو جاؤ گے۔''
فرینک کی آنکھیں بند ہو گئیں اور اس کے حلق سے ایک چیخ نکلی۔ ''نہیں۔ نہیں۔''
ویرون بولا۔ ''میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ یہی سچ ہے۔''
''ہمیں اس سے پیچھا چھڑا لینا چاہیے۔'' فرینک بولا۔
''ہم ایسا نہیں کر سکتے۔''
''پولیس کے آنے سے پہلے ہمیں اسے جلا دینا ہوگا۔''
''ہم ایسا نہیں کر سکتے۔ ہمیں اس کی ضرورت ہوگی۔''
''ہم جیسن سے اس کی دوسری نقل لے سکتے ہیں۔''
''اس لڑکی کی موت کے بعد تمہاری پوزیشن بہت نازک ہو چکی ہے۔ اگر ہم نے یہ معاہدہ ضائع کر دیا تو جیسن یہ سودا منسوخ بھی کر سکتا ہے۔''
دونوں ہی پریشان نظر آ رہے تھے لیکن میں ان کی پوری گفتگو نہیں سن سکا۔ مجھے لگا کہ وہ اوورایکٹنگ کر رہے ہیں۔ فرینک بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگا پھر ہاتھ ملتے ہوئے بولا۔

''ہم اسے کسی ایسی جگہ چھپا دیتے ہیں جہاں ان کی نظر اس پر نہ جائے۔''

ویرون اب قدرے پُرسکون ہو چکا تھا۔ اس نے فرینک کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ اس کی ضرورت نہیں۔ یہ کاغذ ان کے کسی کام کا نہیں۔ ہاں اگر ٹیکس والے تلاشی لے رہے ہوتے تو یہ کاغذ ضرور قبضے میں لے لیا جاتا۔''

''پولیس کے بارے میں کوئی بات بھی یقین سے نہیں کہی جا سکتی۔'' فرینک مضطربانہ انداز میں بولا۔

ویرون نے بریف کیس اٹھایا اور اس میں سے ایک سرخ رنگ کی فائل نکال کر اپنے زانو پر رکھتے ہوئے بولا۔ ''میں اسے لے کر فوراً ہی یہاں سے نکل جاتا ہوں۔''

ابھی اس کا جملہ پورا بھی نہیں ہوا تھا کہ کسی گاڑی کا انجن بند ہونے کی آواز آئی۔ ربیکا نے کھڑکی میں سے جھانکا اور بولی۔ ''وہ آ گئے۔''

فرینک تیزی سے میری جانب بڑھتے ہوئے بولا۔ ''جان! تمہیں اسی لیے بلایا گیا تھا۔ تم ہی بتا سکتے ہو کہ اسے کہاں رکھا جائے کہ اس پر ان کی نظر نہ پڑ سکے۔''

''میں تمہیں یہ مشورہ نہیں دے سکتا کہ کس طرح پولیس کو دھوکا دیا جائے۔''

''یہ محض ایک معاہدہ ہے کوئی خون آلود چاقو نہیں۔ تم وہی کرو جس کا تمہیں معاوضہ دیا جائے گا۔''

''میں اس کام کے لیے نہیں آیا ہوں اور تمہیں صرف یہی مشورہ دے سکتا ہوں کہ پولیس کے ساتھ تعاون کرو۔''

فرینک نے گہری سانس لی اور ویرون کی طرف مڑتے ہوئے بولا۔ ''میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کوئی پرائیویٹ سراغ رساں ایسی بات کہہ سکتا ہے۔''

یہ کہہ کر اس نے ویرون سے سرخ فائل لے لی۔ اسی وقت دروازے پر دستک سنائی دی۔

''ٹھیک ہے مسٹر۔'' فرینک میری جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''تم یہاں اس لیے آئے تھے کہ پولیس سے نمٹ سکو تو جاؤ اپنا کام کرو۔ میں اسے سنبھال لوں گا۔''

یہ کہہ کر وہ فائل سمیت لیونگ روم سے چلا گیا۔ میں نے کارنس پر سے چابی اٹھائی اور مرکزی دروازہ کھول دیا۔

☆☆☆

آنے والوں میں ایک سادہ لباس اور دو یونیفارم میں ملبوس تھے۔ میں نے سیڑھیوں پر قدم رکھتے ہی اپنے عقب میں دروازہ لاک کر دیا اور سراغ رساں کی طرف

خوشی

ایک خاتون کا شوہر ایک حادثے میں ہلاک ہو گیا۔ شوہر کی موت کی خبر لے کر اس کا دوست اس کے گھر گیا۔ ''شکر ہے، خدایا!'' بیوی نے کہا۔

''آپ اپنے شوہر کی موت پر شکر ادا کر رہی ہیں؟'' دوست نے حیرت سے پوچھا۔

''وہ اس لیے کہ کم از کم آج سے مجھے پتا ہوگا کہ وہ کہاں ہے۔''

برجستہ

مسافر، اسٹیشن ماسٹر سے۔ ''اگر سب گاڑیاں لیٹ ہیں تو اس ٹائم ٹیبل کا کیا فائدہ ہے؟''

اسٹیشن ماسٹر۔ ''ہر چیز کا ایک جواز ہے۔ اگر گاڑیاں وقت پر آنے لگیں تو آپ یہ پوچھیں گے کہ اس ویٹنگ روم کا کیا فائدہ۔''

☆☆☆

سنگھار میز

ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر میاں بیوی کھڑے تھے۔ ان کے ساتھ قلی تھا جس کے سر پر اور ہاتھوں میں سوٹ کیس اور صندوق تھے۔ اچانک میاں نے بیوی سے کہا۔ ''تم اپنی سنگھار میز بھی لے آتیں تو اچھا تھا کیونکہ ٹکٹ تو اس کے اوپر ہی رہ گئے ہیں۔''

مرسلہ۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔

''کیا تم مجھے اپنا شناختی کارڈ دکھانا پسند کرو گے؟''

اس نے میری طرف کارڈ بڑھایا اور بولا۔ ''کیا تم فرینک کے وکیل ہو؟''

میں نے اس کی بات کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ ''سراغ رساں اسٹیون کارنی! ابھی تک کسی نے اس کی موت کی تصدیق نہیں کی پھر تم یہاں کیوں دوڑے چلے آئے؟''

یونیفارم والوں کی تعداد اب چھ ہو چکی تھی اور وہ سب مجھے دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ کارنی نے کہا۔ ''کیا ہم اندر جا سکتے ہیں؟''

وہ دروازے کی طرف بڑھا ہی تھا کہ میں اس کے

راستے میں آگیا اور بولا۔ ''میرا نام جان آرک ہے اور میں مسٹر ڈیمیٹری کی نمائندگی کررہا ہوں جو مسٹر فرینک کے وکیل ہیں۔ مسٹر فرینک کو خدشہ ہے کہ گھر کی تلاشی لینے کی صورت میں ان کی پرائیویسی متاثر ہوسکتی ہے۔ وہ صرف اسی صورت میں تلاشی دینے پر آمادہ ہوسکتے ہیں کہ تمام پولیس والے گھر میں داخل ہونے سے پہلے اپنے آپ کو تلاشی کے لیے پیش کریں۔''

وہ سب حیرانی سے ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔

کارنی کی بھویں بھی تن گئیں اور وہ تیز لہجے میں بولا۔

''ضرورت پڑنے پر ہم دروازہ توڑ بھی سکتے ہیں۔ بہتر ہوگا کہ ہمارے راستے سے ہٹ جاؤ۔''

''تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ ذاتی رہائش گاہ ہے اور مسٹر فرینک کا کہنا ہے کہ انجیلا کے ساتھ جو کچھ ہوا، اس سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ تم اپنا کام ہوشیاری اور مستعدی سے کرو لیکن اگر تم نے گدھے کی پیٹھ پر سوئی چبھونے کی کوشش کی تو تمہیں سڑک کے اس پار پھینک دیا جائے گا اور اس کے سنگین نتائج برآمد ہوں گے۔''

''بہتر ہوگا کہ تم......''

''جانتا ہوں کہ عام طور پر ایسا نہیں ہوتا۔'' میں نے آواز نیچی کرتے ہوئے کہا۔ ''میں کوئی بڑا مطالبہ نہیں کررہا۔ کم از کم یہ اس سے تو بہت کم ہے جو تم لوگ پچھلے دنوں کرتے رہے ہو۔''

یہ اچھا ہی ہوا کہ وہ مجھے وکیل سمجھ رہے تھے کیونکہ وکیلوں نے ہی اس اسکینڈل کا پردہ چاک کیا تھا جس کی طرف میں اشارہ کررہا تھا۔ تاہم میں نے جو چال چلی تھی، اس کا انحصار کارنی کے ردعمل پر تھا۔ ممکن ہے کہ اس کی انا یہ گوارا نہ کرتی اور اس کے ایک اشارے پر پولیس والے دروازہ توڑ کر گھر کے اندر داخل ہوجاتے۔

کارنی نے اپنا سر ہلایا۔ اس کی آنکھوں میں لمحہ بھر کے لیے چمک ابھری جبکہ دوسرے سپاہی بے چینی سے اپنی جگہ پر کھڑے پہلو بدل رہے تھے۔ لگتا تھا کہ ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوچکا ہے اور وہ دروازہ توڑنے کے لیے کارنی کے اشارے کے منتظر ہیں پھر کارنی نے اپنا چہرہ گھمایا اور کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے بولا۔ ''مجھے امید ہے کہ کسی وکیل کے تلاشی لینے سے ہماری صحت پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔''

میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا اور ایک ایک سپاہی کی تلاشی لینے لگا۔ ان کے پاس کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس سے فرینک کو نقصان پہنچتا۔ ڈیمیٹری نے ٹھیک ہی کہا تھا، وہ فرینک کو پھانسنے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔

ان میں سے ایک میری نظروں میں آگیا جیسے مجھے اسی کی تلاش تھی۔ اس کے سینے پر کانسٹیبل راجندر کا بیج آویزاں تھا اور انگلی میں سونے کی انگوٹھی چمک رہی تھی۔ وہ دوسرے سپاہیوں کے مقابلے میں دو تین سال چھوٹا تھا۔ اس نے مجھے غور سے دیکھا اور میرے پاس سے گزرتا ہوا اندر چلا گیا۔

☆☆☆

پولیس والوں کو دیکھ کر فرینک نے قمیص پہن لی تھی اور اب کارنی کے سوالوں کے جواب دے رہا تھا۔ وہ اپنے ساتھ فوٹو گرافر کو بھی لائے تھے جو مختلف زاویوں سے انجیلا کی تصویریں بنانے میں مصروف تھا۔ اس کی دونوں کلائیوں پر پلاسٹک کی تھیلیاں چڑھادی گئی تھیں تاکہ اس کے ہاتھوں اور ناخنوں پر اگر کوئی ثبوت ہو تو اسے محفوظ کیا جاسکے۔ میں نے فرینک کو کہتے ہوئے سنا۔ ''ایسا لگتا ہے کہ فرش پر پڑی ہوئی سوئی ہی اس کی موت کا سبب بنی۔''

لیونگ روم کے ایک کونے میں ویرون اور ربیکا دو پولیس افسروں کے گھیرے میں تھے جو اپنی نوٹ بک کھولے ان سے پوچھ گچھ میں مصروف تھے۔ ربیکا نے اپنا دھوپ کا چشمہ اتار دیا تھا اور اب میں اس کی آنکھیں واضح طور پر دیکھ سکتا تھا۔

میں نے فرینک کو کہتے ہوئے سنا۔ ''کیونکہ لوگ عام طور پر اپنی آنکھیں کھلی رکھ کر نہیں سوتے۔'' اچانک میری نظر راجندر پر گئی۔ وہ کاؤچ کے قریب کھڑا انجیلا پر جھکا ہوا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ میں اسے دیکھ رہا ہوں۔ اس نے لڑکی کو غور سے دیکھا اور ایک قدم آگے بڑھا۔ ایسا نہیں تھا کہ اس نے زندگی میں پہلی مرتبہ کوئی لاش دیکھی ہو البتہ اتنی خوب صورت لڑکی کی لاش دیکھنے کا اتفاق پہلی بار ہوا ہوگا۔

فرینک کہہ رہا تھا۔ ''میرا خیال ہے کہ میں تمہارے مقابلے میں لوگوں پر زیادہ بھروسا کرتا ہوں۔''

سراغ رساں کارنی کو اس کی یہ صاف گوئی پسند نہیں آئی۔ راجندر ابھی تک لاش پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ کارنی اس کی طرف مڑا اور سپاہیوں سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''تم سب لوگ مکان کی تلاشی لو۔''

ان کے جانے کے بعد اسپتال کا عملہ کمرے میں داخل ہوا۔ انہوں نے انجیلا کی لاش کو اسٹریچر پر منتقل کیا اور ایک نیلی چادر سے اس کا چہرہ اور جسم ڈھانپ کر کمرے سے باہر لے گئے۔ فرینک نے جھک کر کاؤچ کا معائنہ کیا اور اسے یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ وہاں کوئی دھبا یا سلوٹ نہیں

تھی۔ ریبکا کمرے کا جائزہ لے رہی تھی۔ اس نے پولیس آفیسر کے سوالوں سے اکتا کر ایک جماہی لی۔ ویرون نے اس کی طرف دیکھا پھر یوں منہ بنایا جیسے وہ بھی اس سوال جواب سے بیزار ہوگیا ہو۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ پولیس آفیسر نے ایک اور سوال داغ دیا۔ اب میرے وہاں رکنے کا کوئی جواز نہیں تھا اس لیے میں بھی کمرے سے نکل کر باہر آگیا۔

☆☆☆

اس گھر میں کئی کمرے اور باتھ رومز کے علاوہ ایک عقبی گیلری بھی تھی جہاں سے ساحلِ سمندر کا نظارہ کیا جاسکتا تھا۔ تمام دروازوں کی چوکھٹیں محراب نما تھیں اور دیواروں پر سفید رنگ کیا گیا تھا اور چھت پر جابجا پنکھے لگے ہوئے تھے۔ مجھے اسٹڈی کے دروازے پر گریس کا دھبا نظر آیا۔ ابھی میں اس جانب دیکھ ہی رہا تھا کہ راجندر ہال کے آخری سرے پر واقع باتھ روم سے باہر آیا اور مجھے نظرانداز کرتا ہوا اسٹڈی میں داخل ہوگیا۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے اندر آگیا اور دروازہ بند کردیا۔

اس نے میری طرف دیکھے بغیر لکھنے کی میز کی دراز کھولی اور اس کی تلاشی لینے لگا۔ اس کے عقب میں کھڑکیوں سے باغ کا منظر واضح طور پر نظر آرہا تھا جبکہ بائیں جانب چھت سے فرش تک دیوار گیر الماری میں مختلف رنگوں کی فائلیں رکھی ہوئی تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ فریک کی زندگی ان کاغذات میں بند ہے۔

میں نے ایک نظر ان فائلوں پر ڈالی اور راجندر سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ”گویا تم ہیری کو جانتے ہو؟“

راجندر نے میری طرف دیکھا اور نہ ہی کوئی ردِعمل ظاہر کیا۔ میں نے تیز لہجے میں اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”کانسٹیبل! میں نے تم سے کچھ پوچھا ہے۔“

”کیا؟“ وہ انجان بنتے ہوئے بولا۔

”تم پہلے بھی ہیری سے مل چکے ہو؟“

اس نے اب بھی میری طرف نہیں دیکھا بلکہ دراز میں جھانکتے ہوئے بولا۔ ”میں اسے نہیں جانتا۔“

”پھر اس پر نظر پڑتے ہی چونک کیوں گئے تھے؟ لگتا ہے جیسے تم نے اسے پہچان لیا ہو۔“

”تم جو چاہو سمجھ لو۔“ اس نے بے پروائی سے کہا۔

اس کی ڈھٹائی مجھ سے برداشت نہ ہوسکی اور میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”اس کا اصل نام انجیلا کرزن ہے لیکن تم اس نام سے اسے نہیں جانتے ورنہ اسے دیکھ کر حیران نہ ہوتے۔ تم اسے ہیری کے نام سے پہچانتے ہو۔“

”ہاں۔“ اس نے اپنی گردن گھماتے ہوئے کہا۔

”تم اسے کس طرح جانتے تھے؟“

”میں نہیں جانتا کہ تم کس کے بارے میں بات کر رہے ہو۔ میں تو صرف تم سے مذاق کر رہا تھا۔“

”میں ایسا نہیں سمجھتا۔ میرا خیال ہے کہ تم اسے ہیری کے نام سے اس لیے جانتے ہو کہ وہ اپنے گاہکوں میں اسی نام سے پہچانی جاتی تھی۔“

اس نے ایک بار پھر کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا اور بدستور اپنی گردن گھماتا رہا۔ میں اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”میں سمجھتا ہوں کہ وہ میری تمہاری پہنچ سے باہر تھی۔ تمہاری اتنی حیثیت نہیں کہ کسی لڑکی پر ایک ہزار ڈالرز خرچ کرسکو۔ میرا خیال ہے کہ اس نے تمہاری خدمات کے عوض تم پر خصوصی عنایت کی ہوگی۔ اس قسم کی لڑکیاں اپنے دھندے میں پولیس کی مداخلت برداشت نہیں کرتیں اور تم اپنی ڈیوٹی کے دوران اس سے تعاون کرتے رہے۔“

”یہ کیا بکواس لگا رکھی ہے۔“ وہ جھنجلاتے ہوئے بولا۔

”تمہیں کچھ بتانے کی ضرورت نہیں، پولیس ریکارڈ سے پتا چل جائے گا کہ تمہاری ڈیوٹی کن اوقات میں اس کے علاقے میں لگتی رہی ہے۔ یہ مت سمجھنا کہ میری اس ریکارڈ تک رسائی نہیں ہوسکتی۔“

وہ اپنی گردن گھمانا بھول گیا اور چہرے پر مسکراہٹ کی جگہ فکرمندی نظر آنے لگی۔ اس نے ایک دفعہ پورے کمرے کا جائزہ لیا پھر اس کی نظریں مجھ پر جم کر رہ گئیں۔

”تم مجھے دھمکی دے رہے ہو؟“ وہ غرایا۔

”تمہیں زیادہ غصہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم آرام سے بھی بات کرسکتے ہیں۔“

اس نے یوں سر ہلایا جیسے وہ میری بات سے متفق ہو۔ پھر اس نے آخری دراز بھی بند کردی۔ یہ گویا اشارہ تھا کہ وہ اپنا کام ختم کرچکا ہے۔ میں اس الماری کی طرف گھوما جہاں فائلیں رکھی ہوئی تھیں پھر میری نظریں تیسرے خانے میں رکھی ایک سرخ فائل پر جم گئیں۔ یہ وہی فائل تھی جو ویرون نے بریف کیس سے نکالی تھی اور اسے بڑی ہوشیاری سے یہاں چھپادیا تھا۔

میں نے راجندر سے کہا۔ ”کیا تمہیں یہ سرخ فائل نظر آرہی ہے؟“

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں انتظار کرتا رہا لیکن اس نے پیچھے مڑ کر دیکھنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی۔

میں نے کہا۔ ''یہ بہت اہم فائل ہے۔ تم یقیناً اسے دیکھنا چاہو گے۔''

راجندر زبردستی مسکرا دیا جیسے اپنے آپ کو نارمل رکھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ میں نے لوہا گرم دیکھ کر چوٹ لگائی۔

''تم یہ فائل دیکھ رہے ہونا؟''

''ہاں۔'' اس نے دھیرے سے جواب دیا۔

''اسے باہر نکالو۔''

''کیوں؟'' وہ حیران ہوتے ہوئے بولا۔

''کیونکہ تمہیں یہ فائل اپنے ساتھ لے کر جانی ہے۔''

''تم خود یہ کام کیوں نہیں کر لیتے؟''

''میں نہیں چاہتا کہ اس پر میری انگلیوں کے نشانات آجائیں۔''

''اس فائل میں ایسی کیا خاص بات ہے؟''

''میں نہیں جانتا۔''

''تم جھوٹ بول رہے ہو۔'' اس نے بے یقینی سے کہا۔

''یہ انکم ٹیکس کی فائل ہے۔ میں اسے کھول کر پڑھ تو سکتا ہوں لیکن اس کی عبارت میری سمجھ میں نہیں آئے گی۔ تم فرینک کو نہیں جانتے لیکن ٹیکس والے ان ہتھکنڈوں کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ تم یہ کہہ سکتے ہو کہ یہ فائل تم نے کیس کی تفتیش کے سلسلے میں اٹھائی تھی۔''

میری بات سن کر وہ الجھن میں پڑ گیا اور بولا۔ ''تم خود یہ فائل کیوں نہیں لے جاتے؟''

''اگر میں ایسا کروں گا تو یہ چوری کہلائے گی۔''

''میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔ تم اپنے ہی کلائنٹ کو پھانسنے کی کوشش کر رہے ہو۔''

میں نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''تم اس فائل کو اپنی جیکٹ میں چھپا کر لے جاؤ گے۔ اگر فرینک نے دیکھ بھی لیا تو کہہ سکتے ہو کہ تمہیں اس پر کچھ سفید ذرات نظر آئے تھے جو کوکین بھی ہو سکتی ہے۔ تم پولیس والے ہو اور مجھے سمجھانے کی ضرورت نہیں کہ ایسی صورت میں تمہیں کیا کہنا ہوگا۔ اس دوران تم فائل کا مطالعہ کرو گے اور اس کے مندرجات دیکھ کر اسے انکم ٹیکس والوں کو بھیج دو گے۔''

''مجھے اس سارے معاملے سے کوئی دلچسپی نہیں۔'' وہ منہ بناتے ہوئے بولا۔

''کیا مجھے ایک بار پھر پوری گفتگو دہرانا پڑے گی؟''

''میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔''

''اگر تم نے یہ کام نہیں کیا یا اس میں کسی طرح سے بھی میرا نام آیا تو مجھے مجبوراً تمہاری بیوی سے ملنا ہوگا۔ وہ ضرور جاننا چاہے گی کہ ہیری کے ساتھ تمہارے کس قسم کے تعلقات تھے۔''

راجندر نے کچھ نہیں کہا۔ اس کی نظریں سرخ فائل پر جم کر رہ گئیں۔ میں نے غور سے اسے دیکھا اور اسٹڈی سے باہر آگیا۔

☆☆☆

لیونگ روم کے ایک کونے میں کارنی اور ویرون باتیں کر رہے تھے۔ فرینک کاؤچ پر بیٹھا وہی میگزین پڑھ رہا تھا جو پہلے ویرون کے ہاتھ میں تھا۔ میں دروازے کے پاس رکھے اسٹول پر بیٹھ گیا۔ فرینک نے مجھے دیکھا اور سر ہلا دیا۔ اس کی آنکھوں میں فاتحانہ چمک تھی۔ لگتا تھا کہ وہ کارنی کو قائل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ ریکا ابھی تک اسی کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے دوبارہ اپنی آنکھوں پر چشمہ چڑھا لیا تھا۔

راجندر اسٹڈی روم سے باہر آیا اور سیدھا مرکزی دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ فائل اس کی جیکٹ کے نیچے تھی یا نہیں۔ میرے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے بھی فرینک کی طرح سر ہلایا لیکن میں نے جواب میں کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔ راجندر نے اپنے آپ کو بچانے کے لیے وہی کیا ہوگا جو اس صورتِ حال میں اسے کرنا چاہیے تھا۔ اب میں سوچ رہا تھا کہ فرینک اور ویرون اس فائل کے غائب ہو جانے پر کیا ردِعمل ظاہر کرتے ہیں البتہ مجھے یہ اطمینان ضرور تھا کہ جب فرینک کسی بڑی مشکل میں گرفتار ہو تو ڈیمیٹری بھی اسی حساب سے زیادہ معاوضہ طلب کرتا ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ مجھے پہلی بار اپنے کسی کلائنٹ سے دھوکا کرنا پڑا۔ اگر میں یہ حرکت نہ کرتا تو مجھے خالی ہاتھ واپس جانا پڑتا کیونکہ میں نے یہاں آنے کے فوراً بعد ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ فرینک بلاوجہ ہی گھبرا رہا تھا۔ اس بار پولیس اسے تنگ نہیں کر سکے گی۔ انجیلا کی موت سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ البتہ اس نے میرے سامنے انکم ٹیکس کی فائل کا ذکر کر کے ایک نئی پریشانی مول لے لی تھی اور اس کے حل کے لیے وہ لازماً ڈیمیٹری سے رابطہ کرے گا۔ اس لیے ضروری تھا کہ میں اس سے پہلے ہی ڈیمیٹری کو نئی صورتِ حال سے آگاہ کر دوں۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا اور چپکے سے دروازہ کھول کر باہر آگیا۔ مجھے یقین تھا کہ اس کارنامے کے عوض ڈیمیٹری میرے کمیشن میں معقول اضافہ کر دے گا۔

فریبی رشتوں میں الجھی ایک مظلوم زندگی کی داستان

بدطینت

مرزا امجد بیگ

جب کوئی رشتہ دنیا میں اترتا ہے تو بے شمار رشتوں اور احساسات کو اپنے ساتھ جوڑ لیتا ہے لیکن... کبھی کبھی ناسمجھی میں انسان بڑی سمجھ داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان رشتوں میں ایسے جوڑ توڑ کرلیتا ہے کہ گرہ در گرہ وہ رشتے بدگمانی اور شرانگیزی کے بوجھ تلے دبتے چلے جاتے ہیں۔ ان حالات میں کوئی کیسے کسی پر اعتبار کرے جب سایا کرنے والے ہی سر سے چادر کھینچ لیں، لرزتے قدموں کو سہارا دینے والے زمین ہی پیروں تلے سے نکال دیں تو کیوں نہ اپنے سائے سے بھی لوگ ڈرنے لگیں۔ وہ بھی ایسے ہی خوف میں مبتلا اپنوں سے ڈسی ہوئی زندہ تو تھی مگر زندگی کی رونقوں سے دور تھی۔ جب رات زیادہ گہری ہوجاتی ہے تو کہتے ہیں اجالا قریب ہی کہیں چھپا ہوتا ہے۔ اسے بھی مرزا امجد بیگ کی صورت میں روشنی کی کرن مل گئی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ہر چیز روشنی میں نہا گئی۔

ایک روز میں دفتر جانے کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے ٹائی کی گرہ لگانے کے بعد کال ریسیو کی اور ماؤتھ پیس میں کہا۔ ”ہیلو......!“

”ہیلو بیگ صاحب! السلام علیکم......!“ ایک مانوس آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

عابد نوید صاحب کی آواز کو پہچانتے ہی میں نے ان کے سلام کا جواب دیا۔ ”وعلیکم السلام عابد صاحب! آپ کیسے ہیں؟“

”میں تو ٹھیک ہی ہوں۔ آپ سنائیں......“ وہ اپنے مخصوص لہجے میں بولے۔ ”کیا ہو رہا ہے؟“

”ہونا کیا ہے جناب! دفتر کے لیے نکلنے ہی والا ہوں۔“ میں نے سرسری انداز میں جواب دیا۔ ”صبح ہی صبح کیسے یاد فرمایا عابد صاحب؟“

”ایک کیس آپ کے حوالے کرنا چاہتا ہوں......“ عابد صاحب نے بتایا۔

میں نے پوچھا۔ ”کیس کی نوعیت کیا ہے؟“

عابد نوید صاحب ایک سماجی، فلاحی تنظیم چلاتے تھے اور مجھ سے ان کے کافی دیرینہ مراسم تھے۔ وہ گاہے بہ گاہے، کوئی نہ کوئی کیس بھی میرے حوالے کرتے رہتے تھے۔ ظاہر ہے، یہ کیسز معاشرے کے پسے اور ستائے ہوئے لوگوں کے ہوتے تھے جن کے سلسلے میں عابد صاحب مجھ سے فیس میں بھی رعایت کرایا کرتے تھے کیونکہ ان کے کیسز کے تمام تر عدالتی اخراجات عابد صاحب کی تنظیم کو اٹھانا پڑتے تھے اس لیے عابد صاحب جیسے ہی مجھ سے کسی کیس کا ذکر کرتے تو فوراً میرے کان کھڑے ہوجاتے تھے کہ میری فیس میں ڈنڈی ماری جانے والی ہے لہٰذا میں ہوشیار ہوجاتا تھا۔

”کیس کی نوعیت کچھ خاص نہیں ہے بیگ صاحب!“ عابد صاحب نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بتایا۔ ”یہ مالک مکان اور کرائے دار کے جھگڑے کا کیس ہے۔“

''مجھے کس کی وکالت کرنا ہے۔'' میں نے محتاط انداز میں استفسار کیا۔ ''مالکِ مکان کی یا کرائے دار کی؟''

''مظلوم کی۔''

میں عابد صاحب کی بات کی تہ میں تو پہنچ گیا تھا تاہم پھر بھی پوچھ لیا۔ ''آپ کی نظر میں ان دونوں میں ظالم کون ہے اور مظلوم کون؟''

''میں کرائے دار کو مظلوم سمجھتا ہوں بیگ صاحب۔'' انہوں نے ٹھوس انداز میں کہا۔ ''اور آپ کو اسی کی وکالت کرنا ہے۔''

''تفصیلات کیا ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''میرا خیال ہے، آپ یاسمین سے ایک ملاقات کرلیں۔'' عابد صاحب نے کہا۔ ''وہ آپ کو تفصیلات سے آگاہ کردے گی۔''

''اور یہ یاسمین کون ہے؟'' میں نے چونکتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

''بھئی! یہی وہ مظلوم کرائے دار ہے، میں جس کا کیس آپ کے سپرد کررہا ہوں۔'' وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولے۔ ''مالکِ مکان نے اسے گھر خالی کرنے کا نوٹس دے دیا ہے۔ مالکِ مکان اس گھر کو فروخت کرنا چاہتا ہے۔ یاسمین اپنی بیٹی کے ساتھ اس گھر میں رہتی ہے۔ بس یہ دو افراد کی فیملی ہے۔ یاسمین کسی پرائیویٹ آفس میں جاب کرتی ہے اور اپنے اس مختصر سے کنبے کی واحد کفیل ہے......''

''اور یاسمین کا شوہر کہاں ہے؟'' میں نے ان کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی پوچھ لیا۔

''جیل میں......!'' انہوں نے بتایا۔

''جیل میں۔'' میں نے حیرت بھرے لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ''کس جرم میں؟''

''شوکت قتل کے الزام میں جیل گیا تھا۔''

''اوہ...... کیا وہ جوڈیشل ریمانڈ پر جیل گیا ہے یا عدالت سے سزا سننے کے بعد؟'' میں نے پوچھا۔ ''آپ کی بات سے تو یہی لگتا ہے کہ کیس کسی عدالت میں زیرِ سماعت ہے اور یاسمین کا شوہر جوڈیشل ریمانڈ پر جیل کسٹڈی میں ہے۔''

''آپ آج کسی وقت جا کر یاسمین سے اس کے گھر پر مل لیں۔'' عابد صاحب نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا۔ ''وہ آپ کو تفصیلات سے آگاہ کردے گی۔''

''آپ یاسمین کو میرے آفس بھیج دیتے تو زیادہ اچھا تھا۔'' میں نے اس کیس میں عدم دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ کو پتا ہے کہ میں کس قدر مصروف ہوتا ہوں۔''

''مجھے آپ کی مصروفیت کا بہ خوبی اندازہ ہے بیگ صاحب۔'' وہ جلدی سے بولے۔ ''اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ آپ اس دکھی عورت سے ملاقات کے لیے ضرور وقت نکال لیں گے۔''

میں اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکا۔ عابد صاحب نے مجھے یاسمین کے گھر کا ایڈریس نوٹ کرادیا اور شکریہ ادا کرنے کے بعد ''خدا حافظ'' کہہ کر ٹیلی فونک سلسلہ موقوف کردیا۔

سچی بات تو یہ ہے کہ عابد نوید صاحب نے جس انداز میں مجھے یاسمین کے حالات کے بارے میں بتایا تھا، اس کی روشنی میں، میں ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کرپایا تھا کہ یاسمین کو کس حوالے سے میری وکالت کی ضرورت تھی۔ مالکِ مکان کے نوٹس کے سلسلے میں یا اپنے شوہر کی رہائی کے معاملے میں۔ ٹیلی فون پر تفصیلی بات ہوسکتی تھی اور نہ ہی میرے پاس اتنا ٹائم تھا لہٰذا میں تیار ہوکر دفتر روانہ ہوگیا۔ سردست میں نے یاسمین کے خیال کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا تھا۔

☆☆☆

میرا آفس، سٹی کورٹ سے چند قدموں کی دوری پر ایک کثیر المنزلہ عمارت میں واقع تھا۔ اس بلڈنگ میں زیادہ تر وکلا حضرات اور مشیرانِ قانون کے دفاتر قائم ہیں۔ میں روزانہ کورٹ جانے سے پہلے اپنے آفس کو ضرور ٹچ کرتا ہوں۔ بعض کیسز کی فائلز آفس ہی میں رکھی ہوتی ہیں جو مجھے لینا ہوتی ہیں۔ علاوہ ازیں جس روز کورٹ میں میرا کوئی کیس نہ ہو، میں اپنے آفس ہی میں جم کر بیٹھ جاتا ہوں تاکہ پینڈنگ کے کام نمٹا سکوں۔

اس دن عدالت میں صرف دو کیسز کی پیشیاں تھیں لہٰذا میں دوپہر سے پہلے ہی فارغ ہوگیا۔ میں نے اپنے پسندیدہ ریسٹورنٹ میں اپنے چند وکیل دوستوں کے ساتھ لنچ کیا اور پھر اپنے آفس آگیا۔

مجھے اپنے چیمبر میں بیٹھے لگ بھگ ایک گھنٹا گزرا تھا کہ عابد صاحب کا فون آگیا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد انہوں نے کہا۔

''بیگ صاحب! مائنڈ نہیں کیجیے گا۔ میں نے دراصل ری مائنڈ کرانے کے لیے فون کیا تھا......''

''میں نے اپنی میموری کو ری وائنڈ کرلیا ہے عابد صاحب!'' میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''اور مجھے یاد آگیا ہے کہ آج آفس سے اٹھنے کے بعد

مجھے مسز یاسمین شوکت سے ملاقات کرنا ہے...... ان کے گھر جا کر۔"

"ویری گڈ۔" وہ سراہنے والے انداز میں بولے۔ "بس اب میں مطمئن ہو گیا۔ اصل میں بیگم یاسمین بہت ہی مصیبت زدہ خاتون ہے۔ میں چاہتا ہوں، آپ کے توسط سے جلد از جلد اس کا مسئلہ حل ہو جائے۔"

میں نے اپنے اطمینان کے لیے برسبیل احتیاط پوچھ لیا۔ "عابد صاحب! میری فیس آپ کی فلاحی تنظیم کے ذمے ہے یا مسز یاسمین کے......؟"

درحقیقت، کسی بھی پیشہ ور شخص کے لیے اس کی فراہم کردہ سروس کا معاوضہ یعنی اس کی فیس بہت اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ میں بھی اسی لیے اپنی فیس کے معاملے کو سب سے آگے رکھتا ہوں۔ جب کسی بھی کام کا طے شدہ معاوضہ ایڈوانس میں وصول ہو جائے تو پھر ہی کام کرنے کا مزہ آتا ہے۔ انسان پورے ارتکاز اور دل جمعی کے ساتھ اپنے کام پر توجہ دے سکتا ہے۔ بعض لوگ اس سلسلے میں مجھے بہت بدلحاظ بھی کہتے ہیں کہ نہ تو میں اپنی فیس میں کمی کرتا ہوں اور نہ ہی فیس بعد میں لینے کی کوئی گنجائش چھوڑتا ہوں۔ جب تک میری فیس ایڈوانس میں ادا نہ کر دی جائے، میں کیس کو ہاتھ نہیں لگاتا۔

کچی اور دل کو لگتی ہوئی بات یہ ہے کہ میں بہت سوچ سمجھ کر کسی کیس میں ہاتھ ڈالتا ہوں۔ نقلی اور بوگس کیس میں پکڑتا ہی نہیں۔ مجھے بڑے افسوس کے ساتھ اپنی وکلاء برادری کے حوالے سے یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ اس "خاندان" میں ایسے افراد کی کمی نہیں جو بغیر سوچے سمجھے اور بنا دیکھے بھالے ہر کیس کو نہ صرف پکڑ لیتے ہیں بلکہ اپنے موکل کو یقینی کامیابی کا خواب بھی دکھا دیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو صرف اپنی فیس سے غرض ہوتی ہے۔ موکل جائے جہنم میں۔ جب کچھ عرصے کے بعد موکل، اپنے وکیل کی خراب کارکردگی سے مایوس ہو جاتا ہے تو وہ پہلے کو چھوڑ کر کوئی دوسرا وکیل پکڑ لیتا ہے۔ اس سلسلے میں، میں زیادہ کچھ نہیں کہوں گا سوائے اس کے کہ...... اللہ ہر موکل کو کسی معقول وکیل تک رسائی حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہر وکیل کو اپنے موکل کے ساتھ دیانت داری برتنے کی ہدایت دے۔

"پریشان نہ ہوں بیگ صاحب!" وہ جلدی سے بولے۔ "میں جانتا ہوں، آپ اپنی فیس کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں، اور اس میں کٹوتی یا کمی فوراً آپ کو تشویش میں مبتلا کر دیتی ہے۔"

"اپنے حق میں کٹوتی یا کمی کے لیے ہر شخص کو پریشان ہونا چاہیے۔" میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "جو لوگ ایسا نہیں کرتے وہ اپنے اور اپنی فیملی کے ساتھ زیادتی کا ارتکاب کرتے ہیں۔"

"میں آپ کی بات سے مکمل اتفاق کرتا ہوں۔" عابد صاحب نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا پھر وضاحت کرتے ہوئے بولے...... "آپ کی فیس کا آدھا بوجھ میری تنظیم اٹھائے گی اور آدھا بوجھ یاسمین صاحبہ کی جیب پر پڑے گا۔ اگر کوئی انیس بیس کی کسر باقی رہ گئی تو وہ آپ کو برداشت کرنا ہوگی۔"

"تھوڑا بہت نرم گرم تو چلتا ہے عابد صاحب......!" میں نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا۔

"تو ٹھیک ہے۔" اس نے کہا۔ "آج آپ یاسمین کے گھر جا کر اس سے تفصیلی ملاقات کر لیں۔"

"ویٹس رائٹ!" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

اختتامیہ رسمی کلمات کے بعد ہمارے درمیان ٹیلی فونک گفتگو کا سلسلہ موقوف ہو گیا۔

عابد نوید صاحب نے مجھے یاسمین کے گھر کا جو ایڈریس نوٹ کرایا تھا، اس کے مطابق وہ خاتون گارڈن ویسٹ کے علاقے میں، ایک اپارٹمنٹس بلڈنگ کے تھرڈ فلور پر رہائش پذیر تھی۔ آپ کی آسانی کے لیے اس بلڈنگ کا نام "فاطمہ اپارٹمنٹس" تصور کر لیں۔ اتفاق سے یہ علاقہ میرے گھر کے راستے میں پڑتا تھا لہٰذا اس رات میں آفس سے فارغ ہونے کے بعد مسز یاسمین کی طرف چلا گیا۔

"فاطمہ اپارٹمنٹس" الیلا اور لسبیلہ کے درمیان واقع تھا جس میں دو بلاکس اے اور بی تھے اور کل فلیٹس کی تعداد ساٹھ تھی یعنی تیس فلیٹس بلاک اے میں اور تیس ہی بلاک بی میں۔ یہ بلڈنگ گراؤنڈ پلس فور بنی ہوئی تھی جس کے ہر فلور پر چھ فلیٹس آباد تھے۔ مجھے اے تین سو پانچ میں جانا تھا یعنی بلاک اے کے تھرڈ فلور پر واقع فلیٹ نمبر پانچ میں۔ کچھ دیر بعد میں اپنے مطلوبہ فلیٹ کی گھنٹی بجا رہا تھا۔

گھنٹی کے جواب میں تھوڑی دیر کے بعد ایک گول مٹول لڑکی نے دروازہ کھولا اس کی عمر پندرہ سولہ سال رہی ہوگی۔ میری معلومات کے مطابق اس گھر میں صرف دو افراد رہتے تھے یعنی مسز یاسمین اور اس کی جوان بیٹی۔ میرے فوری اندازے کے مطابق وہ لڑکی یاسمین کی بیٹی ہو سکتی تھی۔

"جی......!" اس پستہ قامت صحت مند لڑکی نے

سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

"بیٹا! امی گھر پر ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"جی نہیں۔" وہ بڑی شدت سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ "امی تو گھر میں نہیں ہیں۔"

"وہ کہاں گئی ہیں؟" میں نے پوچھا۔ "اور کب تک آئیں گی؟"

"وہ مچھی مارکیٹ تک گئی ہیں۔" اس نے جواب دیا۔ "اور میں ٹھیک سے نہیں بتا سکتی کہ وہ کب آئیں گی۔"

"مچھی مارکیٹ" پٹیل پاڑا کے ساتھ واقع تھی جو اس بلڈنگ سے زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ کے پیدل کے راستے پر تھی۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ یاسمین کی واپسی کا انتظار کروں یا واپسی کی راہ پکڑوں۔

"آپ کو امی سے کیا کام ہے؟" اس گول مٹول لڑکی نے مجھ سے پوچھا۔

اس دوران میں، میں نے ایک بات خاص طور پر نوٹ کی تھی اور وہ یہ کہ پستہ قامت لڑکی نے مجھ سے بات کرتے ہوئے ایک دوبار پلٹ کر گھر کے اندر بھی دیکھا تھا جیسے اس کے عقب میں کوئی موجود ہو۔ اس بات نے لاشعوری طور پر مجھے تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ اگر اس کی امی مچھی مارکیٹ گئی ہوئی تھی تو پھر گھر کے اندر کون موجود تھا؟ ایک لمحے کے لیے میرے ذہن میں یہ بھی خیال آیا کہ کہیں میں نے غلط دروازے کی گھنٹی تو نہیں بجادی۔

"یہ فلیٹ نمبر اے تین سو پانچ ہی ہے نا؟" میں نے تصدیقی انداز میں پوچھا۔

"جی بالکل...... آپ ٹھیک جگہ پر کھڑے ہیں۔" اس نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

میں نے استفسار کے سلسلے کو آگے بڑھایا۔ "اور اس گھر میں مسز یاسمین اپنی بیٹی کے ساتھ رہتی ہیں؟"

"جی ہاں...... میں...... میرا مطلب ہے، یاسمین میری امی ہیں۔" وہ جلدی سے وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ "لیکن ابھی تک آپ نے یہ نہیں بتایا کہ آپ کو میری امی سے کیا کام ہے؟"

"بیٹا! کام تو مجھے مسز یاسمین ہی سے تھا اس لیے تمہیں کیا بتاؤں۔" میں نے اپنی جیب میں سے وزیٹنگ کارڈ نکال کر اس لڑکی کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ "میرا نام مرزا امجد بیگ ہے اور میں ایک وکیل ہوں۔ عابد نوید صاحب نے مجھے تمہاری امی سے ملنے کے لیے کہا تھا۔ اس کارڈ پر میرے آفس کا ایڈریس درج ہے۔ امی آئیں تو تم انہیں یہ کارڈ دے دینا اور کہنا، کسی وقت دفتر آ کر مجھ سے ملاقات کر لیں۔"

وہ کارڈ تھامتے ہوئے بولی۔ "جی...... بہت اچھا۔"

میں واپسی کے لیے پلٹ گیا۔ میں ابھی زینے تک پہنچا تھا کہ اپنی پشت پر ابھرنے والی ایک آواز نے مجھے چونکا دیا اور میں پلٹ کر دیکھنے پر مجبور ہو گیا۔

"انکل وکیل...... ایک منٹ!"

میں نے گھوم کر دیکھا تو وہی گول مٹول لڑکی مجھے اشارے سے اپنی طرف بلا رہی تھی۔ میں اس کے پاس پہنچ گیا تو میری سوالیہ نظر کے جواب میں وہ خفت بھرے انداز میں بولی۔

"امی آ گئی ہیں......"

"اتنی جلدی......؟" میں نے الجھن بھری نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

"جی......" اس نے لفظ "جی" پر رازدارانہ انداز میں ضرورت سے زیادہ زور ڈالا اور بولی۔ "آپ اندر آ جائیں۔"

میں کسی فرماں بردار بچے کے مانند فلیٹ نمبر اے تین سو پانچ کے اندر داخل ہو گیا۔ وہ دو کمروں پر مشتمل ایک چھوٹا سا فلیٹ تھا۔ ایک بیڈ روم اور ایک ڈرائنگ روم، کامن کے نام پر ایک مختصر سی گزرگاہ اور بس...... میرے محتاط اندازے کے مطابق اس فلیٹ کا رقبہ لگ بھگ پانچ سو اسکوائر فٹ رہا ہو گا۔ لڑکی نے مجھے "ڈرائنگ روم" نامی کمرے میں بٹھایا اور بولی۔

"میں امی کو بھیجتی ہوں۔"

"امی کو تم ضرور بھیجنا لیکن اس سے پہلے ایک بات بتاتی جاؤ۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "تمہاری امی تو مچھی مارکیٹ گئی ہوئی تھیں۔ وہ کب اور کس راستے سے فلیٹ کے اندر پہنچی ہیں؟ میں نے تو انہیں آتے ہوئے نہیں دیکھا حالانکہ میں تو زینے ہی پر کھڑا تھا......؟"

وہ یہ کہتے ہوئے ڈرائنگ روم سے نکل گئی۔ "وہ تو میں نے جھوٹ بولا تھا آپ سے۔"

اس گول مٹول لڑکی کے اس بے باک سچ نے پچھلے جھوٹ کو دھو ڈالا تھا، یقیناً وہ جھوٹ اس نے اپنی ماں کی ہدایت پر ہی بولا ہو گا۔ میں اس ماں بیٹی کے خیال کو سردست دماغ کے ایک کونے میں ڈال کر ڈرائنگ روم کا تنقیدی جائزہ لینے لگا۔

کسی بھی گھر کے مکینوں کی مالی حالت اور ذوق کا

اندازہ عموماً تین چیزوں سے لگایا جاسکتا ہے۔ نمبر ایک...... اس گھر کے ڈرائنگ روم کے فرنیچر اور دیگر آرائش سے۔ نمبر دو......اس گھر کے کچن کی نفاست سے۔ نمبر تین......اس گھر کے واش روم کی صفائی سے۔

میں اس وقت گھر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا اور وہاں موجود سستے قسم کے فرنیچر اور سونی سونی دیواروں کو دیکھ کر میں بڑے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا تھا کہ ان ماں بیٹی کی حالت خاصی مخدوش تھی۔ بس، وہ جیسے تیسے گزارہ کر رہی تھیں۔ اس ڈرائنگ روم کی ہر شے سے ویرانی اور بیابانی ٹپکتی تھی۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد ایک دبلی پتلی دراز قد عورت ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی اور مجھے سلام کر کے سامنے والے صوفے پر بیٹھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے بولی۔

''وکیل صاحب! میں یاسمین ہوں۔''

اس گول مٹول لڑکی کی بات سے یہ تو کھل گیا تھا کہ اس کی امی یعنی مسز یاسمین گھر کے اندر ہی موجود تھی۔ میں نے اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

''مسز یاسمین! جب آپ گھر کے اندر موجود تھیں تو پھر آپ کی بیٹی نے جھوٹ کیوں بولا تھا؟''

میرے چہرے پر ابھرنے والے ناخوشگوار تاثرات سے اس نے فوراً یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ اس کی یہ حرکت مجھے قطعی پسند نہیں آئی تھی جبھی وہ خفت بھرے لہجے میں بولی۔

''اس قسم کے جھوٹ بولنا ہماری مجبوری بن گئی ہے وکیل صاحب۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''میں اس بات کے لیے بہت معذرت خواہ ہوں۔''

اس کی عمر چالیس سے متجاوز تھی۔ وہ چہرے سے ایک افسردہ اور لاچار عورت نظر آتی تھی۔ ایک بات نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا کہ وہ چہرے مہرے، خدوخال اور قد کاٹھ میں اپنی بیٹی کی ضد تھی یعنی اس کے بالکل برعکس۔ کوئی بھی شخص انہیں ایک ساتھ دیکھ کر یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ ماں بیٹی ہیں۔

''ایسی کیا مجبوری ہے مسز یاسمین؟'' میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''ہم شاہ جی کی وجہ سے خاصے پریشان ہیں۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''یہ شخص ہمارے گھر میں آنے والے ہر آدمی پر گہری نظر رکھتا ہے۔''

''یہ شاہ جی کون ہے اور اسے آپ پر نظر رکھنے کا مرض کیوں لاحق ہے؟'' میں نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

''آپ کی بات سے تو یہی اندازہ ہو رہا ہے کہ یہ شاہ جی آپ کے آس پاس ہی کہیں رہتا ہے جبھی تو وہ آپ پر نظر رکھے ہوئے ہے؟''

''شاہ جی کا اصل نام اجمل شاہ ہے لیکن وہ شاہ جی کے نام ہی سے مشہور ہے۔'' مسز یاسمین نے میرے متعدد سوالات کے جواب میں بتایا۔ ''آپ کا اندازہ بالکل درست ہے۔ یہ شخص ہمارے پڑوس میں یعنی فلیٹ نمبر تین سو چھ میں رہتا ہے۔ ہم اس کے کرائے دار ہیں......''

''اوہ......'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔ ''عابد صاحب نے مجھے بتایا تھا کہ آپ کے مالک مکان نے آپ کو گھر خالی کرنے کا نوٹس دے رکھا ہے جس کی وجہ سے آپ سخت پریشان ہیں۔''

''پریشانی کی ایک وجہ یہ گھر خالی کرنے کا نوٹس بھی ہے۔'' وہ ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ''عابد نوید صاحب بہت ہی ہمدرد اور خدا ترس انسان ہیں۔ اللہ ان کا بھلا کرے......'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔

''شاہ جی نے ہمارا جینا حرام کر رکھا ہے۔ پہلے تو زبانی کلامی وہ فلیٹ خالی کرنے کی دھمکی دیتے رہے پھر انہوں نے باقاعدہ قانونی نوٹس بھی بھیج دیا ہے حالانکہ پہلے کوئی اور بات ہوئی تھی۔''

اس کے آخری جملے نے مجھے چونکا دیا۔ ''کیا مطلب......!'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''پہلے کیا بات ہوئی تھی؟''

یاسمین نے جواب دینے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ اسی لمحے گول مٹول لڑکی ایک ٹرے اٹھائے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ یاسمین اپنی بیٹی کو دیکھ کر خاموش ہو گئی تھی۔ لڑکی نے چائے والی ٹرے میز پر رکھی اور واپس چلی گئی۔

ٹرے میں ایک کپ چائے اور بسکٹ والی ایک پلیٹ کے علاوہ پانی کا بھرا ہوا ایک گلاس بھی رکھا تھا۔ لڑکی ٹرے کو میز پر سجانے کے بعد واپس چلی گئی تو یاسمین نے مجھ سے کہا۔

''وکیل صاحب! چائے لیں......''

میں نے اس گھر کے معاشی حالات کے حوالے سے جو اندازہ قائم کیا تھا وہ اس اکلوتی چائے کی پیالی کو دیکھ کر درست ثابت ہوا تھا۔

''یاسمین صاحبہ! آپ نے خوامخواہ چائے کا یہ تکلف

کرلیا۔'' میں نے سرسری لہجے میں کہا۔'' میں ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی اپنے آفس سے پی کر نکلا تھا۔''

''اب تو تکلف ہو چکا۔'' وہ عجیب سی بے چارگی سے بولی۔'' میں نے کچھ نہیں کیا۔ یہ سب لیلیٰ کا کیا دھرا ہے۔''

''لیلیٰ غالباً آپ کی اکلوتی بیٹی کا نام ہے۔'' میں نے کہا۔'' گول مٹول، معصوم اور بھولی بھالی سی؟''

''جی ہاں۔ لیلیٰ میری اکلوتی بیٹی ہے۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔'' اس کے بعد لڑکے پیدا ہوئے لیکن ان کی زندگی بہت مختصر تھی۔ پیدائش کے فوراً بعد ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ لیلیٰ اپنے باپ پر گئی ہے......''

اتنا کہہ کر اس نے ایک افسردہ سی سانس خارج کی اور خاموش ہو گئی۔

عابد نوید کی زبانی مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ یاسمین کا شوہر شوکت علی کسی ناکردہ جرم کی پاداش میں جیل میں تھا جبھی وہ لیلیٰ کے باپ، اپنے شوہر کے ذکر پر غمگین ہو گئی تھی۔ میں اسے اصل موضوع کی طرف لے آیا۔

''آپ کچھ بتانے والی تھیں کہ لیلیٰ چائے لے کر آگئی۔'' میں نے کہا۔'' وہ...... آپ اپنے مالکِ مکان کے بارے میں کیا کہہ رہی تھیں...... وہ پہلے کیا بات ہوئی تھی؟''

''یہ بڑی دکھ بھری کہانی ہے وکیل صاحب۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔'' پتا نہیں، آپ کو میری بات کا یقین آئے گا یا نہیں......''

''آپ بولتی جائیں۔'' میں نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہا۔'' پوری کہانی سننے کے بعد ہی میں کوئی فیصلہ کر پاؤں گا۔''

''دراصل، یہ فلیٹ پہلے ہماری ہی ملکیت تھا جس میں ہم اس وقت کرائے دار کی حیثیت سے رہ رہے ہیں۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتانے لگی۔

''ایک منٹ......'' مجھے مداخلت کرنا پڑی۔'' آپ نے پہلے مجھے یہ بتایا کہ آپ اجمل شاہ کے فلیٹ میں کرائے دار کی حیثیت سے رہ رہی ہیں اور اس شخص نے آپ کو فلیٹ خالی کرنے کا نوٹس بھی دے رکھا ہے اور اب آپ کا بیان یہ ہے کہ پہلے یہ فلیٹ آپ کی ملکیت تھا تو...... اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ نے یہ فلیٹ شاہ جی کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا؟''

''جی ہاں، اس کا یہی مطلب ہے۔'' وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولی۔'' شاہ جی میرے شوہر کے بڑے بھائی ہیں......''

''کیا؟'' اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی میں بول پڑا۔'' ایک بھائی اپنے چھوٹے بھائی کی بیوی اور بیٹی کے ساتھ یہ سلوک کر رہا ہے۔ واقعی، بزرگ سچ کہتے ہیں۔ زمانہ ہی بدل گیا ہے۔ انسان بہت تیزی سے تباہی کی طرف جا رہا ہے۔''

''وہ بات دراصل یہ ہے جناب کہ شاہ جی، میرے شوہر کا سوتیلا بھائی ہے۔'' وہ جلدی سے وضاحت کرتے ہوئے بولی۔'' میرے سسر اشفاق حسین نے دو شادیاں کی تھیں۔ اجمل شاہ کی ماں کا نام مسرت جبیں اور میرے شوہر کی ماں کا نام عالیہ بیگم تھا۔ خیر، اب تو یہ تینوں افراد اس دنیا میں نہیں ہیں۔ کافی عرصہ پہلے میرے سسر اور دونوں ساسوں کا انتقال ہو چکا ہے۔''

''سوتیلا بھائی ہی سہی لیکن پھر بھی میں سمجھتا ہوں، شاہ جی آپ لوگوں کے ساتھ زیادتی کر رہا ہے۔'' میں نے افسوس ناک انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔'' خاص طور پر اس صورت میں کہ آپ کا شوہر بھی اس وقت جیل میں ہے۔''

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور جھرجھراتی ہوئی آواز میں بولی۔'' تو عابد صاحب نے آپ کو لیلیٰ کے باپ کے بارے میں بھی بتا دیا ہے؟''

''بس سرسری سا......'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔'' تفصیل تو آپ بتائیں گی۔''

''جی......!'' وہ پلکیں جھپکاتے ہوئے بولی۔'' کچھ عرصہ پہلے ہمیں ایک مجبوری کے تحت یہ فلیٹ اجمل شاہ کے ہاتھ فروخت کرنا پڑ گیا تھا چونکہ ہمیں پیسوں کی فوری ضرورت تھی اس لیے ہم نے فلیٹ کی مارکیٹ ویلیو سے کافی کم قیمت میں یہ فلیٹ بیچ ڈالا تھا۔ اس نازک موقع پر شاہ جی نے قسمیں کھا کر ہمیں یقین دلایا تھا کہ وہ کبھی ہمیں اس فلیٹ کو چھوڑنے کے لیے نہیں کہے گا لیکن وکیل صاحب! آج کل کوئی کسی کا نہیں ہے۔ ہمیں مشکل میں دیکھ کر شاہ جی نے آنکھیں پھیر لی ہیں اور اپنے سارے وعدے بھول گیا ہے۔ ابتدا میں تو یہ بھی طے ہوا تھا کہ وہ ہم سے کرایہ نہیں لے گا اور اب ایسا وقت آ گیا ہے کہ وہ ہمیں اس فلیٹ سے بے دخل کرنے کے لیے قانونی چارہ جوئی پر تلا بیٹھا ہے۔''

''اوہ......'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور پوچھا۔'' کیا وہ شروع میں واقعی آپ لوگوں سے کرایہ نہیں لیتا رہا؟''

''جی ہاں۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔'' چند ماہ شاہ جی کا رویہ ہمارے ساتھ بہت مہربان رہا اور اس نے ہم سے کرایہ بھی نہیں لیا۔ یہی

نہیں بلکہ وہ ہماری ہر ضرورت کا خیال بھی رکھتا تھا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے انداز میں تبدیلی آتی گئی اور ہم سے کرائے کا مطالبہ شروع کردیا۔ ہم نے اپنی مجبوری کے پیشِ نظر اسے کرایہ دینا شروع کردیا۔ وہ ایک قدم اور آگے بڑھا اور ہم سے فلیٹ خالی کرنے کی باتیں کرنے لگا اور اب تو نوبت یہاں تک آپہنچی ہے کہ......" وہ سانس ہموار کرنے کے لیے رکی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

"اس کمبخت نے وکیل کے ذریعے ہمیں یہ فلیٹ خالی کرنے کا نوٹس بھیج دیا ہے۔"

"جب آپ لوگوں نے اجمل شاہ سے یہ فلیٹ کرائے پر حاصل کیا تھا تو باقاعدہ اسٹیمپ پیپر پر کوئی کرایہ نامہ تو تیار ہوا ہوگا۔" میں نے پوچھا۔ "اور اس ایگریمنٹ کی ایک کاپی آپ کے پاس بھی ہونا چاہیے۔"

"ایسا کوئی قانونی پیپر تیار نہیں کیا گیا تھا۔" وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔ "ہم نے اجمل شاہ کی زبان پر اعتبار کرلیا تھا اور میں سمجھتی ہوں یہ ہماری غلطی تھی جس کا خمیازہ اب بھگتنا پڑ رہا ہے۔"

"کیا میں یہ جان سکتا ہوں کہ آپ لوگوں نے کس مجبوری کے تحت اپنا یہ فلیٹ اجمل شاہ کے ہاتھ کم قیمت پر فروخت کردیا تھا؟" میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

"یہ ایک طویل داستان ہے وکیل صاحب۔" وہ ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔

"میں پوری توجہ سے سن رہا ہوں۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "آپ بیان جاری رکھیں۔"

مسز یاسمین نے آئندہ آدھے گھنٹے میں اپنے حالات سے مجھے جو آگاہی دی، وہ نہایت ہی سنسنی خیز اور عبرت اثر تھی۔ میں اس داستان میں سے غیر ضروری باتوں کو حذف کرکے خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں تاکہ آپ اس کیس کے پس منظر سے اچھی طرح آگاہ ہوجائیں اور دورانِ عدالتی کارروائی میں آپ کا ذہن کسی الجھن کا شکار نہ ہو۔

ایک بات کی وضاحت کرتا چلوں کہ اس میں سے بہت سی باتیں مجھے بعد میں دوسرے ذرائع سے معلوم ہوئی تھیں لیکن یہ سوچ کر کہ واقعات کا تسلسل قائم رہے، میں نے انہیں ایک ترتیب میں پرودیا ہے۔

☆☆☆

یاسمین کا شوہر شوکت علی ایک کار ڈیلر کے پاس ملازم تھا۔ اس کار ڈیلر کا نام کفیل یزدانی تھا اور اس کا شوروم جمشید روڈ پر واقع تھا۔ شوکت ایک طویل عرصے سے اس کے شوروم پر ملازم تھا اور یزدانی کے بھروسے کا آدمی تھا۔ جب سے شوکت قتل کے مقدمے میں جیل گیا تھا، یاسمین اور اس کی بیٹی پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ شوکت اپنی اس مختصر سی فیملی کا واحد کفیل تھا اور زندگی بھر کی جمع پونجی سے اس نے یہ دو کمروں کا فلیٹ خریدا تھا جو اب ان کا نہیں رہا تھا۔ یاسمین اور اس کی بیٹی لیلیٰ کرائے دار کی حیثیت سے اس فلیٹ میں رہ رہی تھیں۔ رہ کیا رہی تھیں اب تو اجمل شاہ نے انہیں فلیٹ خالی کرنے کا لیگل نوٹس بھی بھجوا دیا تھا۔ میں نے مذکورہ نوٹس بھی دیکھا تھا جس میں شاہ جی نے یاسمین سے فلیٹ خالی کرانے کی وجہ یہ بیان کی تھی کہ اسے ایک ذاتی ضرورت کی خاطر مجبوراً وہ فلیٹ بیچنا پڑ رہا ہے۔ یاسمین کی زبانی مجھے یہ بھی پتا چلا کہ ان کا کوئی قریبی رشتے دار یا خیر خواہ بھی ایسا نہیں تھا جو اس مشکل گھڑی میں ان کے ساتھ کھڑا ہوتا۔

یاسمین کی فراہم کردہ تفصیلات کے مطابق جب اس کا شوہر شوکت علی قتل کے جرم میں جیل چلا گیا تو ابتدا میں اس نے شوہر کی بریت کے لیے بہت دوڑ دھوپ کی۔ اس موقع پر اجمل شاہ نے اس کا بھرپور ساتھ دیا تھا اور اپنی جیب سے پیسے بھی خرچ کیے تھے۔ ابتدائی چھ ماہ میں یاسمین کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ وہ ماں بیٹی بیٹھے بٹھائے کس عذاب میں مبتلا ہو گئی ہیں اور جب کچھ سمجھ میں آیا تو اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ ایک روز شاہ جی نے اسے یہ کہہ کر حیران بلکہ پریشان کر دیا کہ وہ شوکت علی کے کیس کے سلسلے میں مختلف نوعیت کی قانونی کارروائیوں اور وکیل وغیرہ پر لگ بھگ تین لاکھ خرچ کر چکا ہے۔

”تین لاکھ......“ یاسمین کا تو دماغ ہی گھوم کر رہ گیا۔

”شاہ جی!“ اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ”اتنی بڑی رقم آپ نے کہاں خرچ کر دی؟“

”بھابی! اتنی بڑی رقم کسی ایک جگہ یکمشت خرچ نہیں ہوئی۔“ اجمل شاہ سمجھانے والے انداز میں بولا۔ ”پچھلے چھ سات ماہ میں، میں نے شوکت کے کیس کے سلسلے میں پیسا پانی کی طرح بہایا ہے۔ قتل کا کیس کوئی معمولی بات نہیں ہوتی بھابی......“

”ہاں...... وہ تو میں بھی سمجھ رہی ہوں۔“ یاسمین نے اضطراری لہجے میں کہا۔ ”لیکن تین لاکھ تو خاصی تگڑی رقم ہے۔ اس کے......“

”پچاس ہزار روپے تو صرف وکیل نے اس کیس کو ہاتھ لگانے کے لیے ہیں۔“ شاہ جی اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی شاطرانہ انداز میں بولا۔ ”مختلف شعبوں میں دی جانے والی رشوت اور دو گواہوں کو تیار کرنے کے اخراجات الگ ہیں۔ آپ کو یہ سن کر یقین نہیں آئے گا کہ......“ اس نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”بیس ہزار تو میں نے صرف تھانے والوں کو کھلائے ہیں۔“

”تھانے والوں کو......!“ یاسمین نے واقعتاً بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔ ”آپ نے اتنی بڑی رقم پولیس والوں کو کس سلسلے میں دے دی؟“

”تاکہ وہ شوکت پر کسی قسم کا تشدد نہ کر سکیں۔“ شاہ جی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔ ”آپ کو پتا نہیں ہے کہ جب کوئی شخص ریمانڈ پر پولیس کی تحویل میں ہوتا ہے تو یہ کس طرح اس کے ساتھ وحشیانہ برتاؤ کرتے ہیں۔ تفتیش کے نام پر یہ لوگ ملزم کی کھال ادھیڑنے کے علاوہ اس کی ہڈیوں کا بھی سرمہ بنانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے مگر مجال ہے کہ کسی بھی اہلکار نے شوکت کو انگلی بھی لگائی ہو۔ پیسا تو ہاتھ کا میل ہے بھابی۔ انسان کی جان سب سے زیادہ قیمتی ہوتی ہے۔“

”ہاں...... یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں اجمل بھائی۔“ یاسمین اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔

”بھابی! اصل میں آپ کو ان معاملات کا تجربہ نہیں ہے نا اس لیے آپ کا ذہن الجھ رہا ہے۔“ شاہ جی بڑی مکاری سے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”پولیس کی مٹھی گرم کرنے کا دہرا فائدہ ہوا ہے۔ ایک طرف تو شوکت ان کے ظالمانہ تشدد سے محفوظ رہا ہے اور دوسری جانب ریمانڈ کی مدت کے دوران میں اسے حوالات کے اندر صاف ستھرا فرشی بستر اور صحت بخش کھانا بھی پیٹ بھر کر ملتا رہا ہے اور...... یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے......“ وہ لمحاتی توقف کے بعد بدلے ہوئے لہجے میں بولا۔

”بھابی! اگر آپ کو میری بات کا یقین نہیں آ رہا تو میں......“

”نہیں نہیں!“ یاسمین جلدی سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ”بات یقین نہ کرنے کی نہیں ہے اجمل بھائی۔ میں تو یہ سوچ سوچ کر مری جا رہی ہوں کہ اتنی بڑی رقم کہاں

سے آئے گی اور کب ہم آپ کا یہ قرض اتار سکیں گے؟''

''یہ آپ اپنے پاس رکھ لیں۔'' شاہ جی نے ایک پرچہ اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

یاسمین نے ڈرتے ڈرتے مذکورہ پرچے کی جانب ہاتھ بڑھایا اور پوچھا۔''یہ کیا ہے؟''

''ان تین لاکھ کے حساب کی تفصیل ہے جن کا ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے ذکر کیا تھا۔'' وہ بڑی ہوشیاری کے ساتھ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔''رشوت کی مد میں خرچ کی جانے والی چھوٹی اور بڑی رقموں کی کوئی رسید نہیں البتہ، وکیل کی فیس کی وصولی کی رسید اس حساب کے ساتھ ہی منسلک ہے۔''

یاسمین نے وہ پرچہ لے کر اس پر درج اخراجات کی تفصیل کا جائزہ لیا۔کل تخمینہ تو تین لاکھ ہی بن رہا تھا لیکن وہ وثوق کے ساتھ کچھ بھی کہنے کی پوزیشن میں نہیں تھی کہ شاہ جی نے کہاں کہاں ڈنڈی مارتے ہوئے دگنے تگنے پیسے لکھے ہوں گے۔ اس کی ناواقفیت اس کی مجبوری بن گئی تھی۔ وہ روہانسی آواز میں بولی۔

''شاہ جی! میں یہ نہیں کہہ رہی کہ آپ جھوٹ بول رہے ہیں مگر یہ پیسے تو کافی زیادہ ہیں۔ اتنے پیسے خرچ کرنے کے باوجود بھی کوئی کام تو ہوا نہیں۔شوکت کی ضمانت ہی ہو جاتی تو میں سکھ کی سانس لیتی۔''

''میں تو اس خوش فہمی میں تھا بھابی کہ آپ میرا شکریہ ادا کریں گی۔'' وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔''آپ تو الٹا میری ہی نیت پر شک کر رہی ہیں کہ میں نے اتنے زیادہ پیسے پتا نہیں، کہاں لگا دیے ہیں۔''

شاہ جی کو بگڑتا ہوا دیکھ کر یاسمین نے جلدی سے کہا۔''آپ ناراض نہ ہوں بھائی صاحب۔ میں شاید بہت زیادہ پریشان ہوں اس لیے پتا نہیں، کیا کیا بولے جا رہی ہوں۔ میں تو آپ کی وجہ سے بہت مطمئن تھی۔''

''میں بھی آپ کو اپنا سمجھ کر یہ ساری بھاگ دوڑ کر رہا تھا۔'' وہ بہ دستور خفگی آمیز لہجے میں بولا۔''بہرحال...... آئندہ میں پیسے کے معاملے میں احتیاط برتوں گا۔آپ کی منظوری کے بغیر ایک پیسا بھی کہیں خرچ نہیں کروں گا۔بس، آپ مجھ پر ایک مہربانی کر دیں۔''

''کیسی مہربانی بھائی صاحب؟'' یاسمین نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''آپ شوکت کی وجہ سے بہت زیادہ پریشان تھیں اس لیے میں نے یہ بات آپ کو بتانا مناسب نہیں سمجھی تھی۔''

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔''میں نے آپ کے شوہر کے کیس کے سلسلے میں جو یہ تین لاکھ روپے خرچ کیے ہیں، یہ رقم میری نہیں تھی۔''

''تو......؟'' یاسمین کی الجھن دوچند ہو گئی۔

''یہ رقم میں نے اپنے ایک جاننے والے سے ادھار لی تھی۔'' شاہ جی نے بتایا۔

''اوہ......'' یاسمین ایک افسردہ سی سانس خارج کر کے رہ گئی۔

''میں نے تو جو کچھ بھی کیا وہ خلوص نیت سے آپ لوگوں کی ہمدردی میں کیا تھا۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔''لیکن اب محسوس ہو رہا ہے کہ یہ ہمدردی مجھے خاصی مہنگی پڑ رہی ہے۔''

''کیا مطلب ہے آپ کا بھائی صاحب؟'' یاسمین نے پوچھا۔

''مطلب بہت ہی سیدھا اور واضح ہے۔'' وہ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت وضاحت کرتے ہوئے بولا۔''میں ایک نیکی سمجھ کر یہ سب کر رہا تھا مگر کسی نے سچ کہا ہے کہ...... بھلائی کا تو زمانہ ہی نہیں۔ایک طرف آپ کو میرے خلوص پر شک ہے تو دوسری جانب وہ بندہ جس سے میں نے قرض لے رکھا ہے، اس نے میرا جینا عذاب کر دیا ہے۔''

''کک...... کیا ہوا......'' یاسمین متوحش نظر سے اپنے شوہر کے سوتیلے بھائی اور اپنے سوتیلے جیٹھ کو دیکھنے لگی۔''اس بندے نے آپ کا جینا کیوں عذاب کر رکھا ہے؟''

''بھابی! پیسا بہت بری شے ہے۔'' اجمل شاہ نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔''ہمارے درمیان بہت اچھے تعلقات تھے لیکن جب سے میں نے اس بندے سے تین لاکھ روپے قرض اٹھایا ہے، تعلقات میں وہ پہلے والی بات نہیں رہی۔خیر...... پچھلے چھ ماہ سے تو جیسے تیسے چل ہی رہا تھا لیکن اب تو اس نے رقم کی واپسی کا مطالبہ بھی کر دیا ہے۔''

''کیا......!'' یاسمین کے سر پر گویا کوئی بم پھٹا ہو۔''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں بھائی صاحب؟''

''میں اپنی طرف سے کچھ نہیں کہہ رہا ہوں۔'' شاہ جی رکھائی سے بولا۔''جو اس بندے نے مجھ سے کہا، وہی بیان کر رہا ہوں اور وہ بھی کوئی غلط بات تو نہیں کر رہا تھا......'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر اپنے ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

''اس نے کسی مشکل پریشانی میں اگر مجھے تین لاکھ رقم ادھار دی ہے تو اس کی واپسی کے مطالبے کا حق رکھتا

ہے۔ آج میں اسی سلسلے میں آپ کے پاس آیا تھا۔ جتنی جلدی ممکن ہوجائے، رقم کا بندوبست کردیں تاکہ میری عزت رہ جائے۔"

"لیکن فوری طور پر رقم کا بندوبست کیسے ہوسکتا ہے بھائی صاحب!" یاسمین کی پریشانی ساتویں آسمان کو چھونے لگی۔ "آپ دیکھ ہی رہے ہیں، ہمارے گھر کے حالات کس انداز میں چل رہے ہیں۔ مجبوراً مجھے نوکری کے لیے گھر سے نکلنا پڑا ہے۔ آپ اس بندے سے کہیں کہ کچھ دن ٹھہر جائے۔ شوکت رہا ہوکر آجائیں تو پھر ہی کچھ ہوسکتا ہے۔"

"شوکت کا کیس تو صحیح معنوں میں ابھی شروع ہوا ہے بھابی۔" وہ بددلی سے بولا۔ "قتل کے مقدمات تو سالہا سال چلتے رہتے ہیں پھر استغاثہ نے اس کے خلاف خاصا مضبوط کیس بنایا ہوا ہے۔ دو عینی گواہوں نے بھی شوکت کے خلاف گواہی دی ہے۔ میں کل ہی وکیل سے ملا ہوں۔ اس نے مجھے یقین دلانے کی کوشش کی ہے کہ وہ شوکت کی سزا کم سے کم کرانے کی کوشش کرے گا لیکن میں سمجھ رہا ہوں کہ اس نے یہ بات کیوں کی ہے......"

"کیوں کی ہے؟" یاسمین نے پوچھا۔ "وکیل کو تو اصولی طور پر یہ کہنا چاہیے تھا کہ وہ جلد از جلد شوکت کو باعزت بری کرانے کی کوشش کرے گا۔"

"بھابی! آپ ایک سمجھدار خاتون ہیں۔" شاہ جی، یاسمین کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ "آپ اس حقیقت تک پہنچ گئی ہیں جو میرے ذہن میں ہے۔ یہ سچ ہے کہ شوکت کے وکیل کو یہی کہنا چاہیے تھا جو آپ نے فرمایا ہے مگر کیا کریں کہ اس ملک کے ہر ادارے میں کام کرنے والے لوگ گاڑی کے انجن کی طرح چلتے ہیں۔ پیٹرول ڈالو تو اسٹارٹ اور پیٹرول ختم ہوا تو اسٹاپ......" تھوڑی دیر کو رک کر اس نے معنی خیز انداز میں یاسمین کی طرف دیکھا اور اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"میں سمجھتا ہوں کہ وکیل نامی اس مشین کے انجن کی جیب میں نوٹوں کا تھوڑا پیٹرول ڈالنا پڑے گا تو سب ٹھیک ہوجائے گا۔ وہ پوری دلجمعی سے شوکت کا کیس لڑے گا اور ایک دن انشاء اللہ اسے بری بھی کرالے گا۔"

اجمل شاہ نے "ایک دن" کے الفاظ پر اچھا خاصا زور ڈالا تھا جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کی سوچ کے مطابق شوکت کی بریت مستقبل قریب میں تو ہونے والی نہیں تھی۔ اس صورتِ حال نے یاسمین کو گہری فکر میں ڈال دیا۔ وہ بے حد پریشان لہجے میں بولی۔

"میں فوری طور پر تو کچھ بھی نہیں کرسکتی۔"

"کرنا تو آپ ہی کو ہے بھابی۔" وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ "فوری طور پر کریں یا چند دن ٹھہر کر۔ ہاں...... میں اتنا کرسکتا ہوں کہ اس بندے سے تھوڑی مہلت لے لوں۔"

"اگر میں فوری طور پر تھوڑی رقم کا بندوبست کردوں تو کیسا رہے گا۔" یاسمین نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "آپ اس بندے سے چند ماہ کی مہلت لے لیں۔ پھر میں اس کی باقی رقم بھی ادا کردوں گی۔"

"مہلت کی بات تو میں اس بندے سے ضرور کروں گا۔" شاہ جی نے کہا۔ "وہ کتنی مہلت دیتا ہے، اس کا انحصار تو اسی پر ہے یا پھر اس بات پر کہ آپ فوری طور پر کیا بندوبست کرنے والی ہیں۔"

"یہ میں آپ کو ایک دو دن کے بعد بتاؤں گی۔" یاسمین نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔

شاہ جی "ٹھیک ہے" کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ "پھر میں ایک دن کے بعد ہی اس بندے سے بات کروں گا۔"

اگلے روز یاسمین نے اپنے آفس میں قرض لینے کے حوالے سے بات کی۔ اس پر ٹوٹنے والی قیامت سے وہ لوگ واقف تھے۔ یاسمین کے باس نے ازراہِ ہمدردی اسے بیس ہزار روپے ادھار کی مد میں دے دیے اور یہ بھی کہہ دیا کہ جب اسے سہولت ہو، وہ آسان قسطوں میں یہ قرض ادا کردے۔

اسی روز یاسمین نے اپنے تمام تر زیورات بھی فروخت کردیے جن سے لگ بھگ پچاس ہزار روپے حاصل ہوئے۔ یہ کل ملا کر ستر ہزار روپے ہوگئے۔ عموماً کسی بھی عورت کے لیے سب سے مشکل مرحلہ زیورات کی فروخت کا ہوتا ہے لیکن یاسمین نے اپنے شوہر کی خاطر یہ کڑوا گھونٹ بھی خوشی خوشی پی لیا تھا۔ وہ اپنے شوہر کو ہر قیمت پر بچانا چاہتی تھی۔

اگلے روز یاسمین نے وہ ستر ہزار روپے شاہ جی کے حوالے کردیے۔

یاسمین تو یہی سمجھی تھی کہ اب چند ماہ تک قرض خواہ کی طرف سے رقم کی واپسی کا مطالبہ سننے کو نہیں ملے گا۔ ستر ہزار اس نے ادا کردیے تھے۔ دو لاکھ تیس ہزار باقی تھے۔ اگر شوکت باعزت بری ہوکر گھر آجاتا تو قرض کی باقی ادائیگی کی بھی کوئی سبیل بن سکتی تھی لیکن اس وقت یاسمین کا سارا

اطمینان غارت ہوگیا جب ایک ہفتے کے بعد ہی اجمل شاہ دوبارہ اس کے گھر میں موجود تھا۔ اس مرتبہ اس کے ساتھ ایک اور شخص بھی تھا۔

”بھابی! یہ فرید خان ہے۔“ اجمل شاہ نے اس شخص کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ”میرا وہی دوست جس سے میں نے رقم ادھار لی تھی۔“

”لیکن میں اس رقم میں سے ستر ہزار روپے تو واپس لوٹا چکی ہوں۔“ یاسمین نے باری باری سوالیہ نظر سے ان دونوں کی طرف دیکھا۔ ”باقی کے دو لاکھ تیس ہزار بھی چند ماہ میں واپس کردوں گی۔“

”دیکھیں بی بی!“ فرید خان براہ راست یاسمین سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ”میں نے کب انکار کیا ہے کہ آپ نے ستر ہزار روپے مجھے واپس کردیے ہیں لیکن بات یہ ہے کہ مجھے باقی رقم کی اشد ضرورت ہے۔ آپ مہربانی فرما کر ہفتے دس دن میں رقم کا انتظام کردیں۔“

”بھائی صاحب!“ یاسمین نے اس شخص سے منت کی۔ ”آپ کو تو پتا ہی ہوگا کہ میرا شوہر قتل کے الزام میں جیل میں بند ہے۔ ہمارے گھر کے حالات بھی آپ کے سامنے ہی ہیں۔ میں ہفتہ دس دن میں اتنی بڑی رقم کا بندوبست نہیں کرسکتی۔ آپ مجھے چند ماہ کی مہلت دے دیں۔ میں آپ کی ایک ایک پائی ادا کردوں گی۔“

”بی بی!“ فرید خان گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”شاہ جی سے میرے پرانے مراسم ہیں۔ میں ان تعلقات کو خراب نہیں کرنا چاہتا۔ انہوں نے ایک ماہ کے وعدے پر مجھ سے وہ رقم لی تھی اور اب چھ ماہ سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اس سے زیادہ میں کیا مہلت دوں۔“

”میرا اندازہ تھا کہ ایک دو ماہ میں کیس کی کوئی ایسی شکل نکل آئے گی کہ ہمیں کچھ تسلی ہوجائے۔“ اجمل شاہ نے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔ ”لیکن بدقسمتی سے ایسا ہو نہیں سکا۔ اس دوران میں، میں نے اپنے طور پر بھی ادھر ادھر سے ادھار حاصل کرنے کی کوشش کی تاکہ خان صاحب کی رقم واپس کرسکوں مگر مجھے کامیابی نہیں ہوئی۔ مجبوراً میں خان صاحب کو آپ کے پاس لے آیا ہوں۔“

”میں ایک کاروباری آدمی ہوں۔“ اجمل شاہ کے خاموش ہونے پر فرید خان نے یاسمین سے کہا۔ ”میں نے اپنے بزنس میں سے تین لاکھ نکال کر شاہ جی کو دیے تھے۔ اس امید کے ساتھ کہ ایک آدھ ماہ میں مجھے یہ رقم واپس مل جائے گی تو دوبارہ کاروبار میں لگا دوں گا۔ میں ایک ڈیڑھ ماہ کا جھٹکا تو برداشت کرسکتا ہوں مگر سال چھ مہینے کا نہیں۔ رقم کی کمی کے باعث میرا کاروبار بری طرح متاثر ہو رہا ہے۔ میں آپ سے زیادہ مجبور ہوں۔ بس، آپ آٹھ دس دن میں میری رقم لوٹا دیں تو آپ کا یہ مجھ پر بہت بڑا احسان ہوگا۔“

”آپ میری بات کو سمجھنے کی کوشش کریں بھائی صاحب۔“ یاسمین نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”میں اس وقت بہت مجبور ہوں۔“

”آپ کی مجبوری اپنی جگہ لیکن میں اپنی مجبوری کو نہیں دیکھوں گا تو میرا کاروبار تباہ ہوجائے گا۔ میں نے تعلقات کی بنا پر شاہ جی سے کوئی رسید بھی نہیں لکھوائی تھی۔ میرے پاس ایسا کوئی ثبوت بھی نہیں ہے کہ میں اپنی رقم کی واپسی کا دعویٰ کرسکوں۔ اگر کل کلاں شاہ جی اس رقم سے صاف انکار کردیں یا خدانخواستہ انہیں کوئی حادثہ پیش آجائے یا...... مجھے ہی کچھ ہوجائے تو میری رقم تو گئی نا کھوکھاتے......!“

”یار فرید خان! آپ بھی کیسی باتیں کررہے ہیں۔“ اجمل شاہ نے برا سامنہ بناتے ہوئے کہا۔ ”اللہ خیر کرے گا۔ کسی کو کچھ نہیں ہوگا۔“

”آپ نے ہمیں بے ایمان کیوں سمجھ لیا بھائی صاحب!“ یاسمین، فرید خان کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”پہلے اگر آپ نے رقم کے سلسلے میں کوئی رسید نہیں لکھوائی تھی تو اب لکھوالیں۔ شاہ جی کو چھوڑیں۔ اگر آپ کہیں تو میں آپ کو دو لاکھ تیس ہزار کی رسید لکھ دیتی ہوں۔“

”ٹھیک ہے بھابی! یہ آپ نے بہت عقل مندی کا فیصلہ کیا ہے۔“ اجمل شاہ جلدی سے بولا۔ ”آگے کے معاملات آپ دونوں آپس میں طے کرلیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔ آپ نے پیسے دینے ہیں اور خان صاحب نے لینے ہیں۔“

وہ دونوں شاطر آدمی ملی بھگت سے وہاں آئے تھے اور ایک مصیبت زدہ، بے سہارا عورت کو بے وقوف بنانے کے لیے اپنے پینترے کھیل رہے تھے۔ شاہ جی کے اعلانِ لاتعلقی پر یاسمین نے فرید خان سے کہا۔

”میں آپ کو ایک کاغذ پر اپنے دستخط کے ساتھ دو لاکھ تیس ہزار روپے کی وصولی کی ایک رسید لکھ دیتی ہوں لیکن آپ وعدہ کریں کہ کم از کم تین ماہ تک رقم کی واپسی کا مطالبہ نہیں کریں گے۔ اس دوران میں، میں کہیں نہ کہیں سے رقم کا بندوبست کرکے آپ کا ادھار چکادوں گی۔“

”پہلی بات تو یہ کہ میں اپنی رقم کی واپسی کے لیے تین ماہ تک انتظار نہیں کرسکتا۔“ فرید خان نے دو ٹوک انداز میں کہا۔ ”دوسری بات یہ کہ میں نے وہ رقم اجمل شاہ

کو ادھار دی تھی، اس کی وصولی کی رسید آپ کو نہیں بلکہ شاہ جی کو دینا چاہیے۔"

خان بہادر کی اس ترش روئی پر اجمل نے یاسمین کی مصنوعی حمایت کرتے ہوئے کہا۔ "خان صاحب! آپ مجھے برسوں سے جانتے ہیں۔ اب میں اتنا بھی گیا گزرا نہیں ہوں کہ دو تین لاکھ روپے کے لیے اپنا ایمان خراب کروں گا۔ یہ حقیقت آپ کے سامنے آشکار ہو چکی ہے کہ میں نے وہ رقم یاسمین بھابی کی مجبوری کی خاطر لی تھی۔ اگر یہ آپ کو رسید لکھ کر دینے کو تیار ہیں تو آپ کو کیا اعتراض ہے۔ ہاں، میں بطور گواہ اس رسید پر اپنے دستخط کر دیتا ہوں تاکہ سند رہے اور بہ وقت ضرورت کام آئے۔"

یاسمین جس نوعیت کے حالات میں گھری ہوئی تھی اس نے یاسمین کی سمجھ بوجھ اور عقل سب کی ایسی کم تیسی کر رکھی تھی۔ اگر کوئی اور وقت ہوتا تو اس کا ذہن ان عیاروں کی سازش کی بو یقیناً سونگھ لیتا مگر اس وقت تو اس کی مت ماری گئی تھی۔ ان نامساعد حالات سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ اسے سجھائی نہیں دے رہا تھا۔

شاہ جی کی تجویز پر فرید خان نے ایک لمحہ غور کیا پھر خاصی تلخی سے بولا۔ "شاہ جی! صرف آپ کے بطور گواہ دستخط کرنے سے کام نہیں چلے گا۔ میں کوئی رسک لینے کو تیار نہیں۔"

"کیسا رسک؟" یاسمین نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

شاہ جی نے پوچھا۔ "خان صاحب! آپ کیا چاہ رہے ہیں؟"

"خالی رسید سے کام نہیں چلے گا۔" فرید خان ٹھہرے ہوئے لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "آج کل شرافت اور بھلائی کا زمانہ نہیں رہا۔"

"رسید کے علاوہ آپ اور کیا چاہتے ہیں؟" یاسمین نے استفسار کیا۔

"ضمانت......!" وہ ٹھوس انداز میں بولا۔

"کیسی ضمانت؟" اجمل شاہ نے پوچھا۔ "میں ایک ضامن کی حیثیت سے رسید پر دستخط کر تو رہا ہوں۔"

"میں نے آپ پر بھروسا کرتے ہوئے تو وہ رقم دی تھی اور آپ نے مجھے بیچ میں لٹکا دیا ہے شاہ جی۔" فرید خان نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ "اس مرتبہ مجھے کوئی ٹھوس ضمانت چاہیے ہوگی۔"

یاسمین، فرید خان سے پوچھنا چاہ رہی تھی کہ ٹھوس ضمانت سے اس کی مراد کیا ہے لیکن اس سے پہلے ہی اجمل شاہ بول اٹھا۔

"خان صاحب! یہ فلیٹ یاسمین کا اپنا ہے۔ آپ خوامخواہ ناراض نہ ہوں۔ آپ کی تسلی کی خاطر یہ فلیٹ کو ضمانت کے طور پر اس رسید میں لکھ دیتی ہیں لیکن اس کے بدلے میں آپ کو بھی ایک بات ماننا ہوگی۔"

"کون سی بات؟" فرید خان نے الجھن زدہ انداز میں باری باری ان دونوں کی طرف دیکھا۔

اجمل شاہ نے کہا۔ "آپ کو اس رسید کی رو سے یہ وعدہ کرنا ہوگا کہ آپ یاسمین کو رقم کی واپسی کے لیے تین ماہ کا وقت دیں گے۔"

ایک لمحہ سوچنے کے بعد فرید خان نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "مجھے منظور ہے۔"

"ٹھیک ہے، میں کاغذ قلم لے کر آتی ہوں۔" یاسمین جلدی سے بولی۔

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔" فرید خان نے کہا۔ "میں کچے کاغذ پر رسید نہیں لوں گا۔"

"پھر......؟" یاسمین نے حیرت بھری نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

"یہ کام کل پر چھوڑ دیتے ہیں۔" فرید خان وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "میں اسٹیمپ پیپر تیار کروا لیتا ہوں اس سلسلے میں۔"

فرید خان نے یاسمین کے لیے بحث کا کوئی دروازہ کھلا نہیں چھوڑا تھا لہٰذا وہ اس موقع پر کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ انسان کی بے بسی اور مجبوری اس کی زبان پر اسی قسم کے تالے ڈال دیتی ہیں۔

اگلے روز فرید خان اسٹیمپ پیپر تیار کروا کر لے آیا۔ یاسمین نے بڑے غور سے اسٹیمپ پیپر کی تحریر کو دو تین مرتبہ پڑھا۔ اس میں فرید خان نے ایسی کوئی شق نہیں ڈالی تھی جس پر یاسمین کو کسی قسم کا کوئی اعتراض ہوتا۔ یہ ساری وہی باتیں تھیں جو گزشتہ روز ان کے بیچ طے ہو گئی تھیں۔ یعنی مذکورہ اسٹیمپ پیپر کی تحریر کے مطابق یاسمین، فرید خان کی مبلغ دو لاکھ اور تیس ہزار کی مقروض تھی۔ یہ رقم اس نے تین ماہ کے اندر فرید خان کو ادا کرنا تھی اور ضمانت کے طور پر اس کا فلیٹ اسٹیمپ پیپر میں درج کر دیا گیا تھا، صرف الفاظ کی صورت میں۔ فلیٹ کے ڈاکومینٹس وغیرہ یاسمین کے پاس ہی رہے تھے۔ مذکورہ اسٹیمپ پیپر پر فرید خان نے یاسمین کے دستخط کرائے اور خوشی خوشی رخصت ہو گیا۔

اس کے جانے کے بعد اجمل شاہ نے یاسمین سے پوچھا۔ "بھابی! آپ مجھ سے ناراض تو نہیں ہیں نا؟"

"میں ناراض ہو کر کیا کروں گی۔" وہ افسردہ لہجے میں بولی۔

"یہ اسٹیمپ پیپر والی تحریر میں نے انتہائی مجبوری میں لکھوائی ہے۔" وہ چالاکی سے بولا۔ "ورنہ فرید خان کبھی بھی اپنی رقم کی واپسی کے لیے تین ماہ کی مہلت دینے کو تیار نہیں ہوتا۔"

"سب اپنی اپنی جگہ پر مجبور ہیں بھائی صاحب۔" یاسمین نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ "آپ نے جو کیا وہ ٹھیک ہی ہے۔ ویسے اس ساری کارروائی سے ایک بات تو ثابت ہو گئی......"

"کون سی بات بھابی؟" اجمل شاہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"آپ دونوں کی دوستی میں کوئی دم نہیں۔" یاسمین نے نہ چاہتے ہوئے بھی کڑوی بات کہہ ہی ڈالی۔ "ورنہ اس تحریر کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔ فرید خان آپ کی زبان پر بھروسا کر کے تین ماہ کی مہلت دے دیتا۔"

"بھابی! میں نے اسے منانے کی بہت کوشش کی تھی۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "لیکن آپ کے گھر کے حالات نے اسے بدکا دیا تھا۔"

"مطلب؟" یاسمین نے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا۔

"اب دیکھیں نا بھابی......" وہ حد درجہ اپنے لہجے کو نرم رکھتے ہوئے بولا۔ "شوکت قتل کے مقدمے میں پھنسا ہوا ہے۔ آپ کے ہاتھ میں جو کچھ تھا، وہ اس مقدمے میں جھونکا جا چکا ہے بلکہ دو ڈھائی لاکھ کی مقروض بھی ہو چکی ہیں اور اس گھر کی کوئی مستقل آمدنی بھی نہیں ہے۔ ان تمام تر حالات کو دیکھتے ہوئے فرید خان کسی بھی طور پر یقین کرنے کو تیار نہیں تھا کہ آپ اس کے قرض کی رقم تین ماہ کے بعد بھی ادا کر پائیں گی۔ اس نے اپنی سیفٹی کے لیے آپ کے فلیٹ کو ضمانت کے طور پر اسٹیمپ پیپر میں لکھوا لیا ہے۔ سچی بات یہ ہے بھابی کہ......" لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"آج کل کوئی کسی پر بھروسا کرنے کو تیار نہیں۔ اگر میرے پاس ذاتی پیسے ہوتے تو میں کبھی آپ کے فلیٹ کو ضمانت کے طور پر اسٹیمپ پیپر پر نہیں لکھنے دیتا۔"

"کوئی بات نہیں بھائی صاحب! آپ ٹینشن نہ لیں۔" یاسمین نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ اب یہ دعا کریں کہ تین ماہ کی مدت ختم ہونے سے پہلے کسی نہ کسی طرح رقم کا بندوبست ہو جائے۔"

"انشاء اللہ! ضرور۔ میں دعا کروں گا اور کوشش بھی۔" اجمل شاہ نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"کوشش...... کیسی کوشش بھائی صاحب؟" یاسمین نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"کہیں سے یہ رقم ارینج کرنے کی۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ "تاکہ فرید خان کے منہ پر اس کے پیسے مار کر وہ اسٹیمپ پیپر واپس لیا جائے۔ ویسے مجھے امید ہے کہ ایک آدھ ماہ میں شوکت علی کی ضمانت ہو جائے گی۔"

"اگر شوکت گھر آ جائے تو میں جی اٹھوں گی۔" یاسمین نے جذباتی لہجے میں کہا۔ "وہ ضمانت پر رہا ہو جائے تو پھر کہیں نہ کہیں سے پیسوں کا بھی انتظام ہو ہی جائے گا۔ ویسے یہ بات آپ نے کس بنا پر کی ہے کہ ایک آدھ ماہ میں شوکت کی ضمانت ہو جائے گی؟"

"یہ بات اس کے وکیل نے دو روز پہلے مجھے بتائی تھی۔" وہ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اس کو تسلی دینے لگا۔ "وکیل نے بڑے وثوق سے کہا ہے کہ ایک یا زیادہ سے زیادہ دو پیشیوں میں وہ شوکت کی ضمانت کرانے میں کامیاب ہو جائے گا مگر......"

اجمل شاہ نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو یاسمین نے پوچھا۔ "مگر کیا بھائی صاحب؟"

"مگر یہ بھابی کہ......" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "اس کام کے لیے کچھ خرچہ کرنا پڑے گا۔"

"خرچہ......" یاسمین نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ "کتنا خرچہ؟"

"پچاس ہزار روپے۔" شاہ جی نے انکشاف انگیز لہجے میں بتایا۔

"وہ......وہ کس لیے؟"

"وکیل نے پیش کار کی مدد سے شوکت کی ضمانت والی بات جج صاحب تک پہنچائی ہے۔" وہ رازدارانہ انداز میں بتانے لگا۔ "یہ رقم سیدھی جج تک پہنچائی جائے گی اور ایک آدھ پیشی میں شوکت ضمانت پر رہا ہو کر گھر آ جائے گا۔"

یاسمین دل ہی دل میں خوش ہو گئی تاہم زبان سے اس نے پوچھ لیا۔ "کیا جج صاحب بھی رشوت لیتے ہیں؟"

"بھابی! آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔" اجمل شاہ چہرے پر ناگواری کے تاثرات سجاتے ہوئے بولا۔ "آپ کیا سمجھتی ہیں، ہمارے ملک کی عدالتوں میں سچائی اور انصاف کی بنیاد پر فیصلے کیے جاتے ہیں......؟"

"ہاں، ہاں...... میں تو یہی سمجھتی ہوں۔" وہ اثبات

میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔

''اگر آپ ایسا سمجھتی ہیں تو سراسر غلط فہمی میں ہیں۔''

اجمل شاہ نے کہا۔ ''ہماری عدالتوں میں انصاف فروخت ہوتا ہے۔ آپ رقم خرچ کرکے اپنی مرضی کے فیصلے خرید سکتے ہیں۔''

''اگر ایسا ہوتا ہے تو بہت ہی غلط ہوتا ہے۔'' وہ افسوسناک انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔

''آپ جو بھی کہیں مگر جو حقیقت ہے وہ میں نے آپ کو بتادی ہے۔'' وہ معنی خیز انداز میں بولا۔ ''خیر، آپ فکر نہ کریں۔'' اس نے ہمدردی بھرے لہجے میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں دو چار دن میں کہیں سے پچاس ہزار روپے کا بندوبست کرتا ہوں تاکہ وکیل اور پیش کار کے ذریعے جج تک پہنچا کر شوکت کی ضمانت پر رہائی کا انتظام تو کیا جائے۔ آگے اللہ مالک ہے۔''

یاسمین تشکر آمیز انداز میں اپنے ''محسن'' اجمل شاہ عرف شاہ جی کو دیکھنے لگی۔ شاہ جی کی شکل میں اس سادہ دل بہ الفاظِ دیگر احمق عورت کو امید کی ایک کرن نظر آنے لگی تھی۔

انسان کے حالات اس کی سوچ کے زاویے کا تعین کرتے ہیں۔ وہ جس نوعیت کے حالات میں گھری ہوئی تھی، ان میں بے بسی اور لاچاری اسے ایسا سوچنے پر مجبور کر رہی تھی۔ جب سے اس کا شوہر قتل کے الزام میں گرفتار ہوا تھا اور جیل گیا تھا، علاقے میں اس کی پوزیشن خاصی خراب ہوگئی تھی۔ لوگوں نے اسے اور اس کی بیٹی لیلیٰ کو ناپسندیدہ نگاہوں سے دیکھنا شروع کردیا تھا حالانکہ اصولی طور پر تو انہیں ماں بیٹی سے ہمدردی ہونا چاہیے تھی مگر ہمارے معاشرے کا بھی عجیب چلن ہے۔ یہ ہمیشہ الٹی چال ہی چلتا ہے۔ فرید خان کی بات بھی اس نے اسی لیے مان لی تھی کہ وہ بار بار گھر کے دروازے پر نہ آئے۔ قرض خواہ کی آئے دن کی آمد اور شور وغل بھی انسان کو معاشرے میں دو کوڑی کا کرکے رکھ دیتا ہے۔

تین ماہ پر لگا کر اڑ گئے۔ اس دوران میں وہ ستر ہزار کی مزید مقروض ہوگئی یعنی پچاس ہزار جو جج کو پہنچائے گئے تھے اور لگ بھگ بیس ہزار ادھر ادھر کے اخراجات پر اٹھ گئے۔ یہ ستر ہزار اسے اجمل شاہ نے مہیا کیے تھے لیکن اس معاملے کا افسوس ناک پہلو یہ تھا کہ شوکت علی ہنوز جیل میں بند تھا۔ اس کی ضمانت پر رہائی ممکن نہیں ہوسکی اور شاہ جی اسے تسلی پر تسلی دیے جارہا تھا کہ شوکت اب باہر آرہا ہے اور تب باہر آرہا ہے۔

تین ماہ کے بعد فرید خان نے یاسمین کے دروازے پر آمد و رفت شروع کردی۔ ان کے درمیان یہی طے ہوا تھا کہ تین ماہ کے دوران میں یاسمین فرید خان کے دو لاکھ تیس ہزار روپے ادا کرنے کے بعد وہ قانونی دستاویز (اسٹیمپ پیپر) اس سے واپس لے لے گی لیکن موجودہ صورتِ حال میں تو وہ ایک ہزار تک ادا کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔

ایک دن اس نے اجمل شاہ سے کہا۔ ''بھائی صاحب! میں یہ فلیٹ بیچنا چاہتی ہوں۔''

یہ یاسمین کی بے بسی کی انتہا تھی۔ اس کا شوہر جیل میں تھا اور اس کے مقدمے پر باقاعدہ پیسے خرچ ہورہے تھے۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ یہ فلیٹ فروخت کرکے سارا قرضہ ادا کرے گی اور اپنی بیٹی کے ساتھ کرائے کے کسی گھر میں منتقل ہوجائے گی۔ اس کے بعد جو بھی ہو، اللہ مالک ہے۔

''بھابی! آپ فرید خان کی اجازت...... میرا مطلب ہے، اس کے علم میں لائے بغیر یہ فلیٹ فروخت نہیں کرسکتیں۔'' شاہ جی نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''آپ نے وہ اسٹیمپ پیپر غور سے پڑھا تھا نا...... اس میں واضح طور پر درج ہے کہ آپ فرید خان کا قرض ادا کرنے کے بعد ہی اس فلیٹ کو بیچ سکتی ہیں۔''

''مجھے اس ایگری منٹ کی یہ شرط اچھی طرح یاد ہے۔'' یاسمین نے زہر خند لہجے میں کہا۔ ''اور میں نے اس فلیٹ کو بیچنے کا فیصلہ اسی مقصد سے کیا ہے کہ فرید خان کا قرض ادا کرسکوں۔ اس کا روز روز دروازے پر آنا مجھے اچھا نہیں لگتا۔''

''ہوں......!'' اجمل شاہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ چند لمحات کی خاموشی کے بعد اس نے کہا۔ ''میرا ایک بہت ہی قریبی دوست پراپرٹی کی سیلز پرچیز کا بزنس کرتا ہے۔ اگر آپ کہیں تو میں اس سے بات کرتا ہوں؟''

''میں نے یہ ذکر آپ سے اسی لیے تو کیا ہے۔'' وہ سادہ دل عورت امید بھری نظر سے شاہ جی کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ''اس نازک موقع پر آپ ہی میری مدد کرسکتے ہیں۔''

''آپ بالکل بے فکر ہوجائیں۔'' وہ کمال ہوشیاری سے بولا۔ ''میں چند دن میں کچھ نہ کچھ کرتا ہوں۔''

''اس کے ساتھ ہی آپ مجھ پر ایک اور احسان بھی کریں گے......'' یاسمین نے کہا۔

وہ سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''کیسا احسان؟''

''جب تک آپ اس فلیٹ کو فروخت کرنے میں کامیاب نہیں ہوجاتے، اپنے اس دوست فرید خان سے کہہ دیں کہ میرے دروازے پر دستک نہ دے۔''

”یہ میں کرلوں گا۔“ وہ تسلی بھرے لہجے میں بولا۔ ”اور مجھے امید ہے کہ میرا وہ پراپرٹی ڈیلر دوست ایک ہفتے کے اندر اندر اس فلیٹ کو بکوا بھی دے گا۔“

”ٹھیک ہے!“ یہ کہتے ہوئے یاسمین نے گفتگو ختم کردی۔

اگلے روز سے شاہ جی کے دوست نے فلیٹ کے لیے پارٹیاں لانا شروع کردیں۔ ایک عام سروے کے مطابق اس فلیٹ کی مارکیٹ ویلیو پانچ لاکھ کے اریب قریب تھی لیکن کریم بھائی پراپرٹی ڈیلر جو بھی پارٹی لے کر آتا، وہ ساڑھے تین یا پونے چار لاکھ سے زیادہ نہیں لگا رہی تھی۔ کریم بھائی بھی اسے یہ سمجھانے کی کوشش میں تھا کہ اس وقت پونے چار لاکھ سے زیادہ کوئی نہیں دے گا۔ مارکیٹ بہت ڈاؤن جارہی ہے۔

اپ اینڈ ڈاؤن ہر کاروبار کا حصہ ہے لیکن اسٹیٹ کے بزنس میں یہ اپ اینڈ ڈاؤن بعض اوقات بہت ہی مضحکہ خیز ہوجاتا ہے۔ مطلب یہ کہ اگر آپ کو کچھ خریدنا ہو تو مارکیٹ بہت چڑھی ہوئی بتائی جاتی ہے اور اگر کچھ فروخت کرنے کا ارادہ ہو تو مارکیٹ ایک دم ڈاؤن ہوجاتی ہے۔ اللہ غلط بیانی کرنے والے اسٹیٹ ایجنٹس کو ہدایت دے۔ آمین۔

تین دن کے بعد شاہ جی ایک خوش خبری لے کر یاسمین کے پاس آیا اور مسرت بھرے لہجے میں بولا۔

”بھابی! سمجھیں کہ بس آپ کا کام ہوگیا۔“

”میں تو کچھ بھی نہیں سمجھی؟“ یاسمین سوالیہ نظر سے اسے تکنے لگی۔

”کریم بھائی نے ایک تجویز دی ہے جس کے دو پہلو ہیں۔“ شاہ جی نے بتایا۔ ”اور یہ دونوں پہلو آپ کے فائدے کے ہیں۔“

”ان پہلوؤں کی تفصیل کیا ہے؟“

”اصل میں بھابی...... کریم بھائی کو میں نے آپ کے حالات سے تفصیلاً آگاہ کردیا ہے۔“ اجمل شاہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”وہ آپ سے کافی ہمدردی کا اظہار کررہا تھا اسی لیے اس نے آپ کے فلیٹ کے حوالے سے ایک تجویز دی ہے۔“

شاہ جی نے توقف کیا تو یاسمین الجھن زدہ نظر سے اسے دیکھتی چلی گئی۔ وہ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”کریم بھائی نے مجھ سے کہا ہے کہ وہ چار لاکھ میں خود یہ فلیٹ خریدنے کو تیار ہے، جب بھی پراپرٹی کے دام بڑھیں گے تو پھر وہ اس فلیٹ کو فروخت کردے گا اور دوسرا پہلو یہ ہے کہ وہ فوری طور پر آپ کو فلیٹ سے بے دخل نہیں کرے گا۔ آپ جب تک چاہیں، ایک کرائے دار کی حیثیت سے اس فلیٹ میں رہ سکتی ہیں۔“

”اب یہ وقت آگیا ہے کہ اپنے ہی گھر میں کرائے دار کی حیثیت سے رہنا پڑے گا۔“ وہ ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ”واہ ری قسمت......!“

”کریم بھائی نے کہا ہے کہ اگر آپ چند ماہ یہاں رہنا چاہتی ہیں تو وہ آپ سے فلیٹ کا کرایہ بھی نہیں لے گا۔“ شاہ جی نے مزید بتایا۔ ”اگر آپ کریم بھائی کو یہ فلیٹ چار لاکھ میں فروخت کرنے کے لیے راضی ہیں تو مجھے بتادیں۔ میں انہیں کنفرم کردیتا ہوں......؟“

یاسمین جس نوعیت کے حالات سے گزر رہی تھی، ان میں کریم بھائی کی پیشکش اس کے لیے نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں تھی۔ وہ فوراً فلیٹ کی فروخت کے لیے تیار ہوگئی۔ اس فروخت کے سلسلے میں سب سے بڑا قانونی مسئلہ یہ تھا کہ مذکورہ فلیٹ شوکت علی کے نام پر تھا اور وہ خود قتل کے ایک مقدمے کے سلسلے میں جیل میں بند تھا۔ یاسمین اپنے شوہر کی مرضی کے بغیر یہ فلیٹ فروخت کرنے کی مجاز نہیں تھی۔ جب اس نے شاہ جی کی موجودگی میں کریم بھائی سے یہ کہا کہ اب تو اسے اپنے شوہر سے کھل کر بات کرنا ہی ہوگی تو وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے جلدی سے بولا۔

”نہیں بھابی! ایسی غلطی کبھی بھول کر بھی نہیں کرنا......!“

”کیا مطلب؟“ یاسمین نے تعجب بھری نظر سے اسے دیکھا۔ ”اس میں غلطی والی کون سی بات ہے؟“

”آپ جانتی ہیں نا، شوکت ادھر جیل میں کس قدر پریشان ہے۔“ وہ رازدارانہ انداز میں بولا۔ ”آپ نے ابھی تک اپنے مسائل اس سے اسی لیے چھپا رکھے ہیں تاکہ اس کی پریشانی میں اضافہ نہ ہو۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

”نہیں...... آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ وہ گمبھیر انداز میں بولی۔ ”میری خواہش تو یہی ہے کہ سارے دکھ درد میں اکیلے ہی جھیل لوں اور شوکت کے غم میں کسی قسم کا اضافہ نہ ہو۔“

”بس...... تو اب بھی آپ اپنی اس پالیسی کو اپنائے رہیں بھابی جی۔“ شاہ جی نے شاطرانہ انداز میں کہا۔ ”اگر ادھر جیل میں، شوکت کو یہ خبر ہوئی کہ اس کی بیوی اور بیٹی کسمپرسی کے اس درجے پر پہنچ گئی ہیں تو وہ پل بھر میں دم توڑ دے گا۔“

''یا اللہ خیر......'' یاسمین کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''بلکہ آپ شوکت کو یہ بھی نہیں بتائیں گی کہ آپ نے کریم بھائی کے ہاتھ یہ فلیٹ فروخت کر دیا ہے۔'' شاہ جی نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

''پھر میں یہ فلیٹ کیسے فروخت کر سکوں گی؟'' وہ پریشانی سے ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''یہ فلیٹ شوکت کے نام پر ہے۔ اس کے علم میں لائے بغیر یہ کام کس طرح پایۂ تکمیل تک پہنچے گا؟''

''سب ہو جائے گا۔'' پراپرٹی ایجنٹ کریم بھائی کے نمائندے اجمل شاہ عرف شاہ جی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں نے یہ نکتہ بھی کریم بھائی سے ڈسکس کیا ہے۔ انہوں نے مجھے ایک قیمتی مشورہ دیا ہے۔''

''کیسا مشورہ؟'' یاسمین نے سوالیہ نظر سے شاہ جی کو دیکھا۔

یاسمین بے چاری بیک وقت چاروں طرف سے خبیث انسانوں کے چنگل میں پھنس گئی تھی جن کا سرغنہ اجمل شاہ تھا۔ اب تک شوکت کی رہائی کے سلسلے میں اس کے کیس پر جتنی بھی رقم خرچ ہو چکی تھی، وہ اسی شاہ جی کے ذریعے ہوئی تھی۔ یاسمین وثوق سے نہیں کہہ سکتی تھی کہ آیا واقعی اتنے پیسے خرچ بھی ہوئے تھے یا شاہ جی ڈنڈی مار رہا تھا۔ پھر فرید خان والا معاملہ بھی مشکوک تھا۔ اس بات کا بھی یاسمین کے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا کہ شاہ جی نے فرید خان سے رقم ادھار لی تھی یا وہ لوگ اسے الو بنا رہے تھے اور اب یہ کریم بھائی......!

یہ تینوں بدمعاش مل کر ایک مجبور اور لاچار عورت کی بے بسی سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہے تھے اور وہ ان کی سازش کو سمجھ نہیں پا رہی تھی یا اگر کسی حد تک سمجھ بھی رہی تھی تو کچھ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ یاسمین کے سوال کے جواب میں شاہ جی نے کہا۔

''کریم بھائی نے کہا ہے کہ فی الحال وہ آپ کو تین لاکھ روپے ادا کر کے اسٹیمپ پیپر پر آپ کے دستخط لے لیتے ہیں۔ یہ ایک طرح سے آپ کی طرف سے چار لاکھ کی ادائیگی کی رسید ہوگی۔ اسٹیمپ پیپر کی تحریر میں یہ بات واضح کر دی جائے گی کہ آپ نے چار لاکھ کے عوض یہ فلیٹ فروخت کر دیا ہے اور......''

''ایک منٹ......'' یاسمین اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھی۔ ''جب کریم بھائی مجھے تین لاکھ کی پیمنٹ کریں گے تو میں رسید چار لاکھ کی وصولی کی کیوں دوں گی؟''

''آپ سمجھی نہیں ہیں۔'' وہ جلدی سے وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''الگ سے آپ کو کوئی رسید لکھ کر نہیں دینا۔ وہ اسٹیمپ پیپر ہی ایک رسید کی طرح ہوگا جس کی تحریر کے مطابق آپ یہ فلیٹ چار لاکھ میں فروخت کر رہی ہیں۔''

''اور چوتھا لاکھ کریم بھائی مجھے کب دیں گے؟'' یاسمین نے ایک نہایت ہی اہم سوال کیا۔

''یہ پوچھی ہے نا آپ نے عقل مندی کی بات۔'' شاہ جی نے سراہنے والی نظر سے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''کریم بھائی کا کہنا یہ ہے کہ وہ یہ ایک لاکھ اس وقت ادا کریں گے جب فلیٹ کی رجسٹری ان کے نام ہو جائے گی اور یہ کام اسی وقت ہو سکتا ہے جب شوکت علی رہا ہو کر جیل سے باہر آ جائے کیونکہ رجسٹری کے کاغذات پر جابہ جا اس کے دستخط ہوں گے۔ یہ فلیٹ اسی کے نام ہے......'' لمحاتی توقف کر کے اس نے گہری سانس لی پھر رازدارانہ انداز میں اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''کریم بھائی آپ کے ساتھ دلی ہمدردی کا اظہار کر رہے ہیں۔ اس ڈیل کے بدلے وہ آپ سے فلیٹ کے کاغذات بھی نہیں مانگ رہے۔ وہ کاغذ کے ایک پرزے (اسٹیمپ پیپر) کے بدلے آپ کو تین لاکھ روپے دے رہے ہیں۔ آپ کو بھی ان پر بھروسا کرنا ہوگا۔''

اجمل شاہ کی بات یاسمین کی سمجھ میں آ گئی اور دل ہی دل میں وہ خود کو لعن طعن بھی کرنے لگی کہ وہ شاہ جی اور کریم بھائی کی نیت پر شک کیوں کر رہی تھی۔ شاہ جی جاتے ہوئے یاسمین کو یقین دلا گیا تھا کہ اگلے روز وہ شام میں ٹھیک چھ بجے کریم بھائی کو لے کر آئے گا۔

اگلے روز دوپہر سے پہلے فرید خان آ دھمکا اور دھمکی دینے والے انداز میں اپنی رقم کا مطالبہ کرنے لگا۔ یاسمین نے اس سے کہا۔

''خان صاحب! آپ شام میں چھ بجے آ جائیں۔ آپ کی رقم آپ کو مل جائے گی۔''

''چھ بجے کا مطلب چھ بجے ہی ہے بی بی!'' فرید خان نے خفگی آمیز انداز میں کہا۔ ''میں ایک منٹ بھی انتظار نہیں کروں گا۔''

''اچھا ایسا کریں، آپ ساڑھے چھ بجے آ جائیں۔'' وہ حفظِ ماتقدم کے طور پر بولی۔ ''آپ کی رقم تیار رکھی ہوگی۔''

''ٹھیک ہے......'' یہ کہتے ہوئے فرید خان وہاں سے چلا گیا۔

یہ تینوں شیطان صفت انسان ملی بھگت کے ذریعے

ایک مصیبت زدہ عورت کو مختلف زاویوں سے الو بنا کر لوٹنے کی کوشش کر رہے تھے۔ شاہ جی نے ٹھیک چھ بجے کریم بھائی کے ساتھ آنے کو کہا تھا۔ چھ بجے شاہ جی تو آ گیا مگر کریم بھائی اس کے ساتھ نہیں تھا۔

''کریم بھائی کہاں ہیں؟'' یاسمین نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔

''وہ ابھی تھوڑی دیر میں پہنچنے ہی والے ہیں۔'' اجمل شاہ نے جواب دیا۔

یاسمین نے مختصر الفاظ میں اسے حقیقتِ حال سے آگاہ کرنے کے بعد بتایا۔ ''ٹھیک چھ بجے فرید خان میرے دروازے پر دستک دے گا۔ اس سے پہلے کریم بھائی کو آ جانا چاہیے۔''

''یہ فرید تو کچھ زیادہ ہی کمینگی اور بدلحاظی پر اتر آیا ہے۔'' شاہ جی نے نفرت آمیز لہجے میں کہا۔ ''اس نے پیسے کو اپنا دین ایمان بنا لیا ہے۔ شاید آپ کو ایک بات کا علم نہیں بھابی......'' بات روک کر اس نے سوالیہ نظر سے یاسمین کی طرف دیکھا تو وہ پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

''کون سی بات؟''

وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''میں نے فرید خان سے دوستی ختم کر دی ہے۔''

''کس بات پر؟''

''اسی...... آپ کے معاملے پر۔'' وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''میں اس سے زیادہ مہلت دینے کو کہہ رہا تھا اور وہ اس بات پر تیار نہیں ہو رہا تھا۔ جب میں نے زیادہ ضد کی تو اس نے ایک ایسی بات کی کہ میرے تن بدن میں آگ سی بھڑک اٹھی۔ جانتی ہیں، اس مردود نے کیا کہا تھا......؟''

''نہیں جانتی۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی پھر پوچھا۔ ''کیا کہا تھا؟''

''اس نے آپ کو گالی دی تھی......!'' وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔

''مجھے گالی دی تھی...... مگر کیوں؟''

''کہہ رہا تھا کہ میں آپ کی حمایت میں اتنا بڑھ چڑھ کر کیوں بول رہا ہوں۔'' اجمل شاہ نے گہری سنجیدگی سے بتایا۔ ''کہیں...... شوکت کے جیل چلے جانے کے بعد...... میں نے آپ کے ساتھ...... اور کوئی تعلق تو قائم نہیں کر لیا......''

''خدا غارت کرے اس شیطان کی اولاد کو۔'' یاسمین نے پھنکار سے مشابہ انداز میں کہا۔ ''آج میں اس کے دو لاکھ تیس ہزار اس کے منہ پر مار دوں گی۔ مجھے امید نہیں تھی کہ وہ اتنا گھٹیا بھی ہو سکتا ہے......''

''لعنت بھیجیں اس پر۔'' شاہ جی نے معتدل انداز میں کہا۔ ''آپ خوامخواہ اپنا دماغ گرم نہ کریں۔ آج اس خبیث سے آپ کی جان ہمیشہ کے لیے چھوٹ جائے گی......''

ادھر اجمل شاہ کی بات ختم ہوئی، ادھر دروازے پر دستک کی آواز سنائی دی۔ یاسمین نے نگاہ اٹھا کر دیوار گیر کلاک کی طرف دیکھا۔ ساڑھے چھ بجنے میں پانچ منٹ باقی تھے۔

''اللہ کرے، یہ کریم بھائی ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ''میں جا کر دیکھتی ہوں......''

یاسمین نے دروازہ کھولا تو فرید خان کی صورت نظر آئی۔ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مستفسر ہوئی۔

''تم پانچ منٹ پہلے کیوں آ گئے؟''

''اس خیال سے کہ کہیں میں لیٹ نہ ہو جاؤں۔'' وہ ادھر ادھر نگاہ دوڑاتے ہوئے بولا۔ ''کوئی بات نہیں، میں ادھر زینے میں پانچ منٹ انتظار کر لیتا ہوں......''

پھر اس نے یاسمین کا جواب سنے بغیر زینے کی جانب قدم بڑھا دیے۔ یاسمین واپس ڈرائنگ روم میں پہنچی اور اجمل شاہ کو تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کیا۔ اگلے ہی لمحے دروازے کی ڈور بیل بج اٹھی۔

''آپ بیٹھیں بھابی!'' شاہ جی نے جلدی سے کہا۔ ''میں جا کر دیکھتا ہوں۔ میرا خیال ہے، یہ کریم بھائی ہوں گے......''

اب کی بار شاہ جی یاسمین کا جواب سنے بغیر بیرونی دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ یوں محسوس ہوتا تھا، شاہ جی نے اسی اسکرپٹ پر عمل کیا ہو جس پر چند سیکنڈ پہلے فرید خان پر فارم کر چکا تھا۔

یاسمین صوفے پر بیٹھی ہی تھی کہ اجمل شاہ، کریم بھائی کے ساتھ ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ وہ دونوں آپس میں باتیں بھی کر رہے تھے۔ شاہ جی نے کہا۔

''کریم بھائی! باقی باتیں ہم بعد میں بیٹھ کر اطمینان سے کرتے رہیں گے۔ آپ فوری طور پر رقم یاسمین بھابی کے حوالے کریں تاکہ یہ اس شیطان سے نجات حاصل کریں جو باہر سیڑھیوں میں دھرنا دیے بیٹھا ہے......''

''رقم میں ساتھ لے کر آیا ہوں مگر......'' کریم

بھائی نے تذبذب بھری نظر سے باری باری ان دونوں کی طرف دیکھا۔

"مگر کیا کریم بھائی؟" اجمل شاہ نے پوچھا۔

"کاغذات پر دستخط بھی تو ہونا ہیں نا۔"

"ہاں، ہاں...... دستخط بھی ہونا ہیں۔" اجمل شاہ نے سرسری انداز میں کہا۔ "نکالیں وہ اسٹیمپ پیپر۔ پہلے دستخط ہی کر لیتے ہیں۔"

اس کے بعد سب کچھ آن واحد میں ہو گیا۔ کریم بھائی نے مذکورہ تیار ٹائپ شدہ اسٹیمپ پیپر نکالا اور جلدی جلدی یاسمین کے دستخط لے لیے۔ یاسمین اس وقت جس قسم کے حالات کا شکار تھی، اس میں اس نے اسٹیمپ پیپر کی تحریر پر نظر ڈالنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی۔ ان لحات میں اس کی پہلی ترجیح یہ تھی کہ پہلی فرصت میں تین لاکھ کی رقم اس کے ہاتھ میں آئے اور دوسری فرصت میں وہ فرید خان کے دو لاکھ تیس ہزار اس کے حوالے کر کے سکھ کی ایک طویل سانس لے اور...... اس نے ایسا ہی کیا بھی!

کریم بھائی نے اسٹیمپ پیپر پر یاسمین کے دستخط کرانے کے بعد اس دستاویز کو ایک ہاتھ سے اپنے بیگ میں رکھا اور دوسرے ہاتھ سے، اسی بیگ میں سے ہزار ہزار والے نوٹوں کی تین گڈیاں یعنی تین لاکھ روپے نکال کر یاسمین کے حوالے کر دیے۔ وہ نوٹوں کی گڈیاں سیل بند تھیں اور ان پر بینک کی مہر بھی لگی ہوئی تھی لہٰذا انہیں گننے کی ضرورت نہیں تھی اور نہ ہی یاسمین کے پاس اتنا وقت تھا۔

اس نے جلدی میں ایک گڈی کو کھول کر اس میں سے تیس ہزار الگ کیے۔ ان کھلے تیس ہزار روپوں کو دو لاکھ والی مہر بند گڈیوں کے ساتھ رکھا اور اجمل شاہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"شاہ جی! میں اس منحوس فرید خان کو اندر بلا رہی ہوں۔ آپ لوگوں کی موجودگی میں اس کی رقم لوٹاؤں گی تاکہ بعد میں کوئی فتنہ یا فساد کھڑا نہ ہو۔"

"بالکل...... آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔" اجمل شاہ جلدی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "میں تو اس سے بات کروں گا نہیں مگر یہ ٹھیک ہے کہ جب آپ ہماری موجودگی میں اس کی رقم واپس کریں گی تو ہم اس بات کے گواہ ہوں گے کہ آپ نے قرض لوٹا دیا ہے اور...... اس مردود سے وہ اسٹیمپ پیپر بھی تو واپس لینا ہے جس میں اس فلیٹ کو ضمانت کے طور پر لکھا گیا تھا......"

"شاہ جی! یہ آپ نے نکتے کی بات اٹھائی ہے۔"

ماں

▪ انسانی معاشرے کا باہمی ربط و ضبط صرف ماں ہی کے طفیل ہے۔

▪ ماں کی آنکھ سے چھلکا ہوا آنسو بحراوقیانوس سے گہرا ہوتا ہے۔

▪ ٹوٹتے ہوئے پسماندہ معاشرے پوچھتے ہیں کہ جو حاکم سزا دیتے ہیں، وہ ماں کی دعا کیوں نہیں دے سکتے؟ ماں نے تھپڑ مارا بچہ ماں سے لپٹ گیا۔ ماں نے اٹھایا اور چوم لیا جبکہ حاکم نے سزا دی تو رعایا باغی ہو گئی۔

▪ باپ کی جائداد کی وجہ سے آپس میں تنازعہ اور نفرت پیدا نہ کرو اور ماں کے پیار و محبت کے وارث بن جاؤ، انسانیت سکھی ہو جائے گی۔

▪ ماں بچوں کے لیے توحید کا سمبل ہے۔ بہت سے بچوں کی ایک ماں ہو یا پھر ایک ماں کے بہت سے بچے ہوں، ماں تو ایک ہی رہے گی۔

▪ جو ماں کو نہ سمجھ سکا وہ مقام توحید کو نہ سمجھ سکا۔

▪ جو ماں کا نافرمان ہو جاتا ہے وہ آہستہ آہستہ اللہ رب العزت کا نافرمان ہو جاتا ہے۔

▪ ماں اور اولاد کا رشتہ ہی ہے کہ تمام مائیں خوب صورت نہیں ہوتیں مگر ہر ایک کو اپنی ماں خوب صورت نظر آتی ہے۔

▪ ماں بہشت بریں کا مہکتا پھول ہے۔

ماں تجھے سلام۔

مرسلہ۔ رضوان تنولی کریزوی،
اورنگی ٹاؤن، کراچی

کریم بھائی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "یاسمین بہن یہ فلیٹ اب مجھے فروخت کر چکی ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ اس فلیٹ کے حوالے سے کوئی قانونی تحریر کسی اور شخص کے پاس بھی ہو۔"

اگلے دس منٹ کے اندر یہ مرحلہ بھی نمٹ ہی گیا۔ یاسمین نے فرید خان کو فلیٹ کے اندر بلا لیا۔ دو لاکھ تیس ہزار روپے، دو گواہوں کی موجودگی میں اس کے حوالے کیے اور فرید خان نے انہی دو گواہان کے سامنے وہ رقم گن کر اپنی جیب میں ڈالی اور تحریر شدہ یاسمین کے دستخط والا اسٹیمپ پیپر اس کی طرف بڑھا دیا پھر وہ وہاں سے رخصت ہو گیا۔

فرید خان کے جانے کے بعد کریم بھائی نے ہاتھ

آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''یاسمین بہن! فرید خان والا اسٹیمپ پیپر یا تو مجھے دے دیں یا پھر اسے میری آنکھوں کے سامنے پھاڑ کر پھینک دیں تاکہ میرا دل مطمئن ہوجائے۔''

''بھابی! کریم بھائی بالکل اصول کی بات کر رہے ہیں۔'' شاہ جی بھی تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''یہ آپ کو تین لاکھ روپے ادا کرچکے ہیں اور ایک لاکھ باقی ہیں۔ یہ ایک لاکھ دے کر کریم بھائی اس فلیٹ کی رجسٹری اپنے نام کروالیں گے۔ اصولی طور پر اب یہی اس فلیٹ کے مالک ہیں۔ ان کی یہی مہربانی کیا کم ہے کہ یہ آپ کو اس فلیٹ میں رہنے کی اجازت دے رہے ہیں......''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں شاہ جی۔'' یاسمین ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے بولی پھر وہ اسٹیمپ پیپر کریم بھائی کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ آپ ہی رکھ لیں۔ میں کیا اس کا اچار ڈالوں گی۔''

تھوڑی دیر کے بعد کریم بھائی رخصت ہوگیا۔ کریم بھائی نے یاسمین کو جو تین لاکھ روپے دیے تھے، ان میں سے دو لاکھ تیس ہزار تو ہاتھ کے ہاتھ فرید خان لے گیا تھا اور ستر ہزار باقی بچے تھے۔ پچھلے دنوں شاہ جی نے پیش کار کے توسط سے جج کو اور وکیل صفائی کو بھی کچھ رقم دی تھی جو لگ بھگ ستر ہزار ہی بنتی تھی۔ اگرچہ شاہ جی کی اس ایفی شینسی سے شوکت علی کی ضمانت ہوئی تھی اور نہ ہی کیس میں کوئی بہتری آئی تھی۔ ہاں...... البتہ یاسمین، اجمل شاہ کی ستر ہزار کی مقروض ضرور ہوگئی تھی۔

''اجمل بھائی! یہ آپ رکھ لیں۔'' یاسمین نے مذکورہ ستر ہزار کی رقم اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''آپ کا حساب بھی صاف ہوجائے تو اچھا ہے۔ بس، ایک احسان آپ مجھ پر اور کردیں۔''

شاہ جی نے ستر ہزار کے نوٹ گنے بغیر اپنی جیب میں ٹھونسے اور کراری آواز میں پوچھا۔ ''کون سا احسان بھابی؟''

''کریم بھائی کی طرف ایک لاکھ بچے ہیں۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''میں چاہتی ہوں، اسی رقم کے اندر اندر شوکت باعزت بری ہوکر باہر آجائے۔ آگے جو ہماری قسمت...... اللہ مالک ہے۔''

''جی...... میں پوری کوشش کروں گا انشاء اللہ!'' وہ بڑے وثوق سے بولا۔ ''آپ بالکل بے فکر ہوجائیں۔''

یاسمین ''بے فکر'' ہوگئی اور شاہ جی نے ''پوری کوشش'' شروع کردی۔ اس کوشش کے خاصے سنسنی خیز نتائج برآمد ہوئے۔ دو ماہ یاسمین بغیر کرایہ ادا کیے اس فلیٹ میں رہی۔ تیسرے ماہ شاہ جی نے کرائے کا مطالبہ کردیا...... اور وہ بھی کھرے لہجے میں۔

''مگر کریم بھائی نے تو کہا تھا کہ وہ مجھ سے کرایہ نہیں لیا کریں گے؟'' یاسمین نے الجھن زدہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''کون کریم بھائی؟'' وہ تیوری چڑھا کر بولا۔

''اجمل بھائی! آپ کو کیا ہوگیا ہے......'' یاسمین کی حیرت ساتویں آسمان کو چھونے لگی۔ ''میں اس کریم بھائی کی بات کر رہی ہوں جس نے میرا یہ فلیٹ چار لاکھ میں خریدا تھا۔''

''مجھے کچھ نہیں ہوا بلکہ لگتا ہے، آپ کا دماغ خراب ہوگیا ہے۔'' اجمل شاہ بے مروتی سے بولا۔ ''یہ فلیٹ تو آپ نے میرے ہاتھ فروخت کیا ہے اور وہ بھی تین لاکھ میں۔ میں آپ کو تین لاکھ ادا کرچکا ہوں۔ یہ تو میری شرافت ہے کہ میں نے رجسٹری سے پہلے آپ کو فلیٹ کی پوری قیمت ادا کردی اور آپ اب مجھے کسی کریم بھائی کی کہانی سنا رہی ہیں......'' لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات کو اسی جارحانہ انداز میں مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''اگر آپ کی نیت خراب ہوگئی ہے تو ایک بات ذہن میں رکھیں کہ آپ کے دستخط والا وہ اسٹیمپ پیپر میرے پاس رکھا ہوا ہے جس کی تحریر کے مطابق آپ نے تین لاکھ کی رقم وصول کرکے یہ فلیٹ میرے ہاتھ فروخت کردیا ہے۔ رجسٹری کے لیے آپ نے مجھ سے کچھ مہلت مانگی تھی اور میں نے مہلت دے بھی دی۔ اس خیال سے آپ کا شوہر جیل میں ہے لیکن میں اس کی رہائی کے انتظار میں ساری عمر تو بیٹھا نہیں رہ سکتا۔ مجھے یہ فلیٹ فروخت کرنا ہے لہٰذا جتنی جلدی ممکن ہو اسے خالی کردیں۔''

''نیت میری نہیں آپ کی خراب ہوگئی ہے۔'' یاسمین نے زہر خند لہجے میں کہا۔ ''وہ اسٹیمپ پیپر دکھائیں مجھے!''

اجمل شاہ نے مذکورہ اسٹیمپ پیپر کی فوٹو کاپی نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اصل میں نے سنبھال کر اپنے پاس رکھا ہوا ہے تاکہ بوقت ضرورت کام آئے۔ آپ اس نقل کو دیکھ کر اپنی تسلی کرلیں۔''

یاسمین نے وہ نقل لے کر بغور اس کے مندرجات کا جائزہ لیا۔ وہ اصل اسٹیمپ پیپر ہی کی کاپی تھی اور اس کے مندرجات اجمل شاہ کے دعوے کی تصدیق کرتے تھے۔ اس

اسٹیمپ پیپر کی تحریر کے مطابق یاسمین نے تین لاکھ کی رقم وصول کر کے اپنا فلیٹ اجمل شاہ کے ہاتھ فروخت کیا تھا۔ تحریر میں یہ بات بھی شامل تھی کہ وہ دو ماہ کے بعد فلیٹ کی رجسٹری اجمل شاہ کے نام کرا دے گی۔ اجمل شاہ نے یہ مہلت اسے شوکت علی کے جیل میں ہونے کی وجہ سے دی تھی۔

"میرے ساتھ دھوکا ہوا ہے...... ایک خطرناک دھوکا۔" وہ حقیقت کی تہ میں اترنے کے بعد سرسراتی ہوئی آواز میں بولی۔ "یہ تو زیادتی ہے۔"

جب شاہ جی اور کریم بھائی اس کے گھر آئے تھے اور کریم بھائی نے اسے تین لاکھ روپے ادا کیے تھے تو ان لمحات میں یاسمین بہت زیادہ پریشان تھی اور یہ پریشانی فرید خان کی وجہ سے تھی۔ جب کریم بھائی نے اسٹیمپ پیپر پر دستخط کرانے کے بعد تین لاکھ روپے اس کے حوالے کیے تھے تو اس نے سکھ کی سانس لی تھی۔ اسٹیمپ پیپر کی تحریر پڑھنے کی طرف ایک لمحے کے لیے بھی اس کا دھیان نہیں گیا تھا تو گویا...... یہ دھوکا ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت کیا گیا تھا۔ اجمل شاہ اور کریم بھائی آپس میں ملے ہوئے تھے بلکہ...... فرید خان بھی انہی کا ساتھی تھا اور...... اس فراڈ یا گروپ کا سرغنہ تھا...... اجمل شاہ المعروف شاہ جی......!

"کسی نے کسی کے ساتھ کوئی دھوکا نہیں کیا۔" شاہ جی نے خفگی آمیز انداز میں کہا۔ "کیا تم نے اسٹیمپ پیپر میں درج فلاں تاریخ کو تین لاکھ روپے وصول نہیں کیے تھے؟"

اپنی ناراضی کے اظہار کے ساتھ ہی وہ کمبخت "آپ" سے "تم" پر بھی آ گیا تھا۔ یاسمین چونکہ شاہ جی کی چالبازی کو سمجھ گئی تھی لہٰذا اس نے صورتِ حال کے پیشِ نظر اس سے کہا۔

"شاہ جی! یہ فلیٹ آپ نے خریدا ہے یا کریم بھائی نے، اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" اس کے انداز میں مصلحت پائی جاتی تھی۔ "بہر حال، میں نے تو یہ فلیٹ فروخت کیا ہے۔ آپ جو کہہ رہے ہیں وہی درست ہوگا لیکن براہ کرم میرے دو کام کر دیں۔"

"کون سے دو کام......؟" وہ برہمی سے بولا۔

"بڑے شوق سے یہ فلیٹ آپ ہی خریدیں مگر ایک لاکھ مجھے اور ادا کر دیں۔" یاسمین نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ "اور جب تک آپ مجھے یہ رقم ادا نہیں کرتے، مجھے اسی فلیٹ میں رہنے دیں اور چاہیں تو مجھ سے کرایہ وصول کر لیں۔"

"جب میں نے تم سے یہ فلیٹ تین لاکھ میں خریدا ہے تو ایک لاکھ زیادہ کس بات کا دوں...... اس کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہاں، البتہ......" وہ پُرسوچ انداز میں یاسمین کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ "میں تمہیں کچھ عرصے تک ایک کرائے دار کی حیثیت سے اس فلیٹ میں رہنے کی اجازت دے سکتا ہوں۔"

یاسمین نے حالات کے تقاضے کے پیشِ نظر اس کی بات مان لی۔ اب اس امر میں کسی شک وشبے کی گنجائش باقی نہیں بچی تھی کہ اجمل شاہ نے کسی ماہر شکاری کی طرح پہلے یاسمین کو اپنے جال میں پھنسایا تھا پھر رفتہ رفتہ جال کو سمیٹتے ہوئے وہ پوری طرح اسے اپنی جکڑ میں لے چکا تھا۔ اب تک شاہ جی نے اس کے ساتھ مسلسل جھوٹ بولے تھے اور مختلف حیلوں بہانوں، حربوں اور ضربوں سے اس نے اپنی جیب گرم کی تھی۔ اس نے کبھی شوکت علی کی رہائی کے لیے کوئی سنجیدہ کوشش کی ہی نہیں تھی بلکہ جو تین لاکھ اس نے مختلف مدوں میں یاسمین سے بٹورے تھے وہ یکمشت اسے ادا کر کے نہ صرف یہ کہ اس فلیٹ کا مالک بن بیٹھا تھا بلکہ تین لاکھ کی اس رقم میں سے بھی وہ ستر ہزار سمیٹ کر لے گیا تھا۔ گویا، یہ فلیٹ اسے صرف دو لاکھ تیس ہزار میں پڑا تھا اور یہ دو لاکھ تیس ہزار بھی اسی بدنصیب مجبور عورت کے تھے جس سے اس کا فلیٹ خریدا گیا تھا۔ یہ تو سیدھی سیدھی وہی بات تھی کہ...... جس کا جوتا، اسی کا سر!

خیر...... پہلے تو شاہ جی نے یاسمین سے کرایہ وصول کرنا شروع کیا پھر کچھ ہی عرصے کے بعد اس نے فلیٹ خالی کرنے کو کہہ دیا اور آخر کار اس نے کسی وکیل کے توسط سے فلیٹ خالی کرنے کا نوٹس بھی بھجوا دیا تھا۔ یاسمین کی قسمت اچھی تھی کہ تباہی کے دہانے تک پہنچنے کے بعد اس نے فلیٹ خالی کرنے کے بجائے کسی طرح عابد نوید سے رابطہ کیا تھا اور اس طرح یہ کیس میرے ہاتھ میں آ گیا تھا۔

میں نے جس تفصیل کے ساتھ یاسمین کی بپتا آپ کی خدمت میں پیش کی ہے، اس سے آپ شاہ جی کی شیطانی چالوں کو تو اچھی طرح سمجھ گئے ہوں گے۔ تاہم اب بھی کچھ نہیں بگڑا تھا۔ میں اس سادہ دل بہ الفاظِ دیگر بے وقوف خاتون کو برباد ہونے سے بچا سکتا تھا۔ جو تکلیف وہ اٹھا چکی تھی، اس ذہنی اور جسمانی اذیت کا ازالہ اسی صورت میں ممکن تھا جب میں اس اللہ کی بندی کو شاہ جی کے فریب سے باہر نکال لاتا اور اس کے بے گناہ شوہر کی رہائی کے لیے بھی چارہ جوئی کرتا۔ ساری داستان سننے کے بعد میرے ذہن میں یہ خدشہ بھی جاگا تھا کہ کہیں...... شوکت علی، اجمل شاہ کی

کسی گہری چال کے نتیجے میں تو قتل کے مقدمے میں ملوث ہو کر جیل نہیں چلا گیا۔ یہ ناممکن تو نہیں تھا۔

''آپ بہت بھولی ہیں۔'' اس کے خاموش ہونے پر میں نے کہا۔

میں چونکہ براہِ راست اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا اس لیے وہ میرے جملے کے جواب میں جز بز ہو کر رہ گئی۔ پہلو بدلتے ہوئے جلدی سے بولی۔ ''میں نے کیا کیا ہے؟''

''یہ سب کچھ آپ ہی نے کیا ہے۔'' میں نے بہ دستور اس کے چہرے پر نگاہ جمائے ہوئے کہا۔ ''بلکہ میں یہ کہوں گا کہ یہ سب آپ کی سادگی کا کیا دھرا ہے۔ وہ مکار شاہ جی شروع سے آخر تک اپنے نت نئے پینتروں سے آپ کو بے وقوف بناتا رہا اور آپ کو اس کی شیطانی چالوں کا ذرا بھی احساس نہیں ہوا اور اپنی مرضی سے قدم قدم چلتے ہوئے آپ تباہی اور بربادی کے قریب پہنچ گئی ہیں۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں وکیل صاحب۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ''مجھے بہت بعد میں اس حقیقت کا احساس ہوا کہ اجمل شاہ میرے ساتھ دھوکا کر رہا تھا مگر اب کیا ہو سکتا ہے۔''

آخری جملہ ادا کرنے کے بعد اس نے عجیب سی نظر سے مجھے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں مجھے ناکامیابی اور مایوسی کے سائے سے لہراتے نظر آئے۔ میں نے تسلی بھرے انداز میں پوچھا۔

''کیوں بھئی...... اب کچھ کیوں نہیں ہو سکتا؟''

''میرا مطلب ہے چاہے دھوکے اور فریب کا شکار ہو کر ہی سہی، میں نے اپنا یہ فلیٹ تو فروخت کر دیا ہے۔'' وہ زخمی لہجے میں بولی۔ ''آپ کسی طرح مہربانی کر کے اجمل شاہ کو اس وقت تک فلیٹ خالی کرانے سے باز رکھنے کا بندوبست کر دیں جب تک میرا شوہر جیل سے رہا ہو کر واپس نہیں آجاتا۔''

''یہ آپ کی غلط فہمی ہے یاسمین بیگم!'' میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''جی...... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' وہ ہکا بکا ہو کر مجھے تکنے لگی۔

دراصل، اس حیرت بھری الجھن کے اظہار میں اس کا کوئی قصور نہیں تھا۔ میرا جملہ ''یہ آپ کی غلط فہمی ہے یاسمین بیگم!'' اپنے اندر کئی زاویے سمیٹے ہوئے تھا جبھی وہ متامِلانہ انداز میں مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے بڑی رسان سے اپنی بات کی وضاحت کر دی۔

''آپ کو یہ غلط فہمی نہیں ہے کہ آپ کا شوہر جیل سے رہا ہو کر باعزت گھر آئے گا۔ یقین کریں کہ اگر وہ گناہ گار نہیں تو ان شاء اللہ! بہت جلد وہ آپ لوگوں کے درمیان موجود ہوگا۔ آپ کو یہ غلط فہمی بھی نہیں ہے کہ شاہ جی کو کسی قانونی چارہ جوئی کے ذریعے آپ کو تنگ کرنے سے روکا جا سکتا ہے۔ میں اس شیطان صفت انسان کے ایسی نکیل ڈالوں گا کہ اس کی آنے والی آٹھ دس نسلیں بھی نکیل کے ساتھ ہی جنم لیں گی۔ ہاں البتہ......'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک آسودہ سانس خارج کی پھر اپنی بات کو ڈرامائی انداز میں مکمل کر دیا۔

''ایک سلسلے میں آپ کو شدید نوعیت کی غلط فہمی ضرور ہے۔'' وہ بھونچکا رہ گئی۔ ''کس سلسلے میں؟''

''کہ...... آپ نے ...... اپنا یہ فلیٹ ...... فروخت کر دیا ہے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب ہے آپ کا؟'' وہ اچھل پڑی۔ ''میں نے رقم وصول کی ہے اور اسٹیمپ پیپر پر باقاعدہ لکھ کر دیا ہے۔''

''اس طرح اگر پراپرٹی کی خرید و فروخت ممکن ہوتی تو میں یہ پوری بلڈنگ کسی کے بھی ہاتھ فروخت کر ڈالتا جس کے ایک فلیٹ میں اس وقت آپ رہ رہی ہیں۔'' میں نے دوٹوک انداز میں اس پر واضح کر دیا۔ ''آپ نے اسٹیمپ پیپر پر جو کچھ بھی لکھ کر دیا ہے یا جس بھی لکھی ہوئی تحریر پر آپ نے دستخط کیے ہیں، اس کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہے۔''

''یہ آپ عجیب بات کر رہے ہیں وکیل صاحب!'' اس کی الجھن میں خاطر خواہ اضافہ ہو گیا۔

''آپ کی بلڈنگ کے باہر دیوار کے ساتھ میری کار کھڑی ہے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''کیا آپ اس کار کو کسی کے ہاتھ فروخت کر سکتی ہیں؟''

''م...... میں آپ کی گاڑی کو کیسے فروخت کر سکتی ہوں۔'' میرے سوال نے اسے گڑبڑا کر رکھ دیا۔ ''وہ کار تو آپ کی ملکیت ہے۔''

''میں یہی نکتہ آپ کے ذہن میں بٹھانا چاہتا ہوں۔'' میں نے تاکیدی انداز میں کہا۔ ''جب آپ کسی ایسی گاڑی کو فروخت نہیں کر سکتیں جو آپ کی ملکیت نہیں ہے تو پھر آپ کسی فلیٹ کو کیسے بیچ سکتی ہیں جو آپ کی ملکیت نہیں۔ یہ فلیٹ تو آپ کے شوہر کے نام پر ہے نا؟''

''جی ہاں۔ یہ فلیٹ شوکت علی کے نام پر ہے۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''لیکن خواہ مخواہ کا جھگڑا پیدا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں نے فلیٹ کی

قیمت وصول کی ہے۔ آپ بس یہ دعا کریں کہ شوکت جلدازجلد گھر آجائے۔ میں شوکت کی وجہ سے بہت پریشان تھی۔ میں نے جو کچھ بھی کیا وہ مجبوری میں کیا۔ میرے پاس اور کوئی راستہ نہیں تھا۔''

''لیکن اب بہت سے راستے کھل گئے ہیں۔'' میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ''آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس فلیٹ کی ملکیت کے حوالے سے جو بھی لیگل ڈاکیومینٹس ہیں ان کی فائل میرے حوالے کردیں۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اس کے علاوہ اور بھی جو کاغذات ہوں وہ بھی مجھے دے دیں اور یہ بھی بتائیں کہ آپ کے شوہر کی اگلی پیشی کب ہے؟''

وہ سراسیمہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''تو کیا آپ اب فلیٹ کی فروخت والا قصہ شوکت کو بھی سنائیں گے؟''

''ہاں!'' میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''اس میں خرابی کیا ہے؟''

''دیکھیں وکیل صاحب......'' وہ متوحش لہجے میں بولی۔ ''اگر شوکت کو پتا چلا کہ میں نے اس کے علم میں لائے بغیر فلیٹ فروخت کردیا ہے تو اسے دلی صدمہ ہوگا۔ وہ پہلے ہی جیل میں بہت زیادہ پریشان ہے اور میں تو کہتی ہوں......''

''کچھ بھی نہیں ہوگا۔'' میں نے قدرے تیز آواز میں کہا۔ ''ایسا کچھ نہیں ہوگا جس کے خدشات نے آپ کے دل ودماغ کو اپنے گھیرے میں لے رکھا ہے۔ یہ خبر سن کر شوکت کو دل کا دورہ نہیں پڑے گا کیونکہ سچی بات یہ ہے کہ آپ نے یہ فلیٹ بیچا ہی نہیں۔ شوکت علی ابھی تک اس فلیٹ کا اصل مالک ہے۔''

''اور وہ جو میں نے تین لاکھ کی رقم وصول کی ہے......؟''

''فی الحال آپ ان تین لاکھ کو بھول جائیں۔'' میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''یہ سوچیں کہ آپ نے ایک پیسا بھی وصول نہیں کیا۔''

''مگر......'' وہ میری بات مکمل ہونے سے پہلی ہی بول اٹھی۔ ''یہ حقیقت ہے کہ میں نے کریم بھائی سے تین لاکھ وصول کیے تھے۔''

''اس سے بڑی بھی ایک حقیقت آپ کے آس پاس موجود ہے......'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''لیکن وہ آپ کو نظر نہیں آرہی۔''

''کون سی حقیقت؟'' وہ جلدی سے اپنے گردوپیش میں نگاہ دوڑاتے ہوئے بولی۔

''کیا یہ سچ نہیں ہے کہ اجمل شاہ عرف شاہ جی نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت آپ کو الو بنا کر لوٹنے کی کوشش کی ہے؟'' میں نے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے انداز میں سوال کیا۔ ''اس کی اس گھناؤنی سازش میں فرید خان اور کریم بھائی نے بھی حسبِ ذلالت اپنا اپنا کردار ادا کیا ہے اور یہ دونوں شیطان اب منظر سے اس طرح غائب ہوچکے ہیں جیسے گدھے کے سر سے سینگ...... کیا میں غلط کہہ رہا ہوں......؟''

''نہیں......'' وہ بڑی شدت سے نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولی۔ ''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میرے ساتھ ایک منظم دھوکا ہوا ہے۔''

''اور یہ بھی درست ہے کہ اب تک آپ کے شوہر کے کیس پر جو رقم خرچ ہوچکی ہے اس کا تخمینہ کم وبیش ساڑھے تین لاکھ تک پہنچتا ہے اور یہ رقم آپ نے خود اپنے ہاتھ سے کسی کو بھی نہیں دی بلکہ شاہ جی کے توسط سے ساری پےمنٹس ہوتی رہی ہیں؟''

''جی ہاں...... یہی حقیقت ہے۔'' وہ متذبذب نظر سے مجھے تکنے لگی۔

''مجھے یہ شک...... بلکہ یقین ہے کہ......'' میں نے اس کی الجھن دور کرنے کی غرض سے کہا۔ ''کہ......شاہ جی نے کہیں بھی پراپر پےمنٹ نہیں کی۔ اگر ڈھنگ سے اتنی رقم خرچ کی گئی ہوتی تو کمزور سے کمزور وکیل بھی اب تک آپ کے شوہر کی ضمانت کرواچکا ہوتا......''

وہ مجھے ایسی نظر سے دیکھنے لگی جیسے میری بات اس کی سمجھ میں آرہی ہو۔ میں نے اپنی وضاحت کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''شاہ جی بہت ہی شاطر اور کمینہ خصلت شخص ہے۔ اس نے آپ کو ایک مجبور اور بے بس عورت دیکھ کر ہر زاویے سے لوٹنے کی کوشش کی ہے۔ وہ بظاہر آپ کا ہمدرد بنا رہا اور آپ کے شوہر کے کیس کی مد میں مختلف مراحل پر آپ سے چھوٹی بڑی رقمیں بٹورتا رہا۔ آپ اس کی ممنونِ احسان بھی رہیں اور غیر محسوس طور پر اس کی مقروض بھی ہوتی چلی گئیں۔ پھر یہ قرض چکانے کے لیے آپ نے اپنی دانست میں یہ فلیٹ بھی فروخت کر ڈالا۔ یعنی پیسے بھی گئے...... یہ فلیٹ بھی گیا اور...... آپ کا شوہر بھی ابھی تک جیل میں بند ہے...... آپ کی سادگی قابلِ صد افسوس ہے یاسمین بیگم......!''

''پھر......'' میرے خاموش ہونے پر اس نے سرسراتی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔ ''اب مجھے کیا کرنا

چاہیے؟''

''جو میں نے کہا ہے وہی کرنا چاہیے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''آپ اپنے ذہن میں چند باتیں نقش کرلیں۔''

وہ ہمہ تن گوش سنجیدگی سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے کہا۔

''نمبر ایک...... آپ نے اس فلیٹ کی فروخت کے سلسلے میں کسی قانونی یا غیر قانونی دستاویز پر دستخط نہیں کیے۔ نمبر دو...... جب آپ نے ایسا کچھ نہیں کیا تو اس کا یہ مطلب ہوا، آپ نے کسی سے کوئی رقم وغیرہ بھی وصول نہیں کی۔ اجمل شاہ کے پاس جو بھی اسٹیمپ پیپرز وغیرہ ہیں، وہ اس نے خود ہی تیار کر کے آپ کے جعلی دستخط کیے ہیں۔ نمبر تین...... آج سے میں آپ کے شوہر کا وکیل ہوں اور اس کی باعزت بریت کے لیے یہ کیس میں لڑوں گا۔ آپ کو کسی قسم کی فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اطمینان سے اپنے گھر میں بیٹھی رہیں اور دیکھتی رہیں، اللہ کیا کرتا ہے۔''

''اور وہ جو اجمل شاہ نے فلیٹ خالی کرنے کا نوٹس دے رکھا ہے......''

''اس کو بھی فراموش کردیں۔'' میں نے متحمل انداز میں کہا۔ ''جب وہ کسی بھی حوالے سے اس فلیٹ کا مالک ہی نہیں ہے تو اسے کسی قسم کا نوٹس بھیجنے کا بھی اختیار حاصل نہیں ہے۔''

''اگر اس مردود نے مجھے ڈرانے دھمکانے یا تنگ کرنے کی کوشش کی تو......؟'' اس نے سراسیمہ انداز میں پوچھا۔

''وہ ایسا کچھ نہیں کرے گا، مجھے اس بات کا پکا یقین ہے۔'' میں نے تسلی بھرے انداز میں کہا۔ ''اور اگر غلطی سے اس نے ایسا کوئی قدم اٹھانے کی کوشش کی تو میں اسے بہت بڑی مصیبت میں مبتلا کردوں گا۔ میں سمجھ رہا ہوں، وہ محض آپ کی مجبوری اور بے بسی سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کررہا ہے۔ آپ اپنے اندر ہمت کو بیدار کریں اور ثابت قدمی سے اس محاذ پر ڈٹ جائیں۔ میں آپ کے ساتھ ہوں اور یقین دلاتا ہوں کہ آپ کا شوہر بہت جلد اس گھر میں آپ کی نظر کے سامنے ہوگا۔''

میری بات اس کی سمجھ میں آگئی۔

☆☆☆

آئندہ روز میں نے عابد نوید صاحب کو فون کیا اور انہیں تفصیلات سے آگاہ کیا پھر اپنے بیان کے اختتام پر کہا۔ ''اجمل شاہ بہت ہی کمینہ اور دغاباز شخص ہے۔ اس نے دھوکے سے بعض کاغذات پر یاسمین سے دستخط کرالیے ہیں اور اس کے فلیٹ کا مالک بن بیٹھا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں، یہ اس کی غلط فہمی ہے۔ فلیٹ کا اصل مالک یاسمین کا شوہر شوکت علی ہی ہے۔''

''اور شوکت علی قتل کے مقدمے میں الجھ کر جیل کی سنگلاخ دیواروں کے پیچھے جاچکا ہے۔'' عابد صاحب نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ہاں، یہ بھی ایک حقیقت ہے۔'' میں نے تائیدی انداز میں کہا۔ ''اور اس سے بڑی ایک اور بھی تلخ اور سنگین حقیقت ہے جس کو نظرانداز کرنا عقل مندی کے منافی ہوگا۔''

''کون سی حقیقت؟'' عابد صاحب نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔

''اجمل شاہ، یاسمین کا پڑوسی ہے۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''اور وہ خاتون اس شیطان سے خاصی ڈری سہمی ہوئی بھی ہے۔ فی الحال تو میں اسے خاصی تسلی تشفی دے آیا ہوں لیکن اگر کسی وقت شاہ جی بدمعاشی اور غنڈا گردی کے زور پر انہیں اس فلیٹ سے بے دخل کر کے خود قابض ہوگیا تو پھر مسئلہ پیدا ہوسکتا ہے۔ سچ اور جھوٹ کا فیصلہ ہونے میں جتنا وقت لگے گا، اس دوران میں یاسمین اور اس کی بیٹی کا جلوس بلکہ جوس نکل جائے گا۔ وہ آپ نے بھی سن رکھا ہوگا کہ...... قبضہ سچا، دعویٰ جھوٹا!''

''ہاں، میں نے سن رکھا ہے اور یہ ایک سفاک حقیقت بھی ہے۔'' وہ گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولے پھر مجھ سے سوال کیا۔ ''اس صورت حال میں کیا کیا جائے؟''

''اگر آپ واقعی اس مظلوم عورت کی مدد کرنا چاہتے ہیں تو پھر اس کے شوہر والا کیس بھی میرے حوالے کرنا ہوگا۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''کیونکہ یہ دونوں معاملے اندر سے آپس میں جڑے ہوئے ہیں۔ کوئی ایک شخص ہی اس الجھن کو مناسب انداز میں سلجھا سکتا ہے......''

لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک بوجھل سانس خارج کی اور کہا۔ ''آپ چاہیں تو یہ دونوں کیس کسی اور کے سپرد بھی کرسکتے ہیں مگر اس وکیل کے سپرد نہیں جو اس وقت یاسمین کے شوہر کا کیس لڑ رہا ہے۔''

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا بیگ صاحب۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولے۔ ''اس کمبخت وکیل نے پہلے کون سا کارنامہ انجام دیا ہے جو آئندہ کے لیے اس پر بھروسا کیا جائے اور کسی دوسرے وکیل کے بھی کیوں حوالے کریں۔ مجھے صرف آپ پر ہی اندھا اعتماد ہے۔ یاسمین کے من جملہ معاملات کو آپ ہی ڈیل کریں گے۔''

''تو ٹھیک ہے۔'' میں نے اپنی رضامندی ظاہر

کرتے ہوئے کہا۔ ''اس سلسلے میں آپ کو بھی میرا خیال کرنا ہوگا۔ میں پہلے ہی اپنی فیس میں کافی رعایت کرچکا ہوں اور یہ ڈبل کیس بھی ہے۔''

''ٹھیک ہے...... ٹھیک ہے...... آپ کا بھلا کیوں نہیں خیال کریں گے۔'' وہ جلدی سے بولے۔ ''میں آج ہی یاسمین سے اس سلسلے میں بات کرتا ہوں۔''

''اس دکھوں کی ماری عورت کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میرا سارا بوجھ آپ ہی کی تنظیم کو برداشت کرنا ہوگا۔''

''آپ اس سلسلے میں بے فکر ہوجائیں بیگ صاحب۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔ ''میں مینیج کرلوں گا۔ آپ کو کوئی شکایت نہیں ہوگی۔''

''ٹھیک ہے، میں بے فکر ہوگیا۔'' میں نے کہا۔ ''ایک دو اور معاملات میں بھی مجھے آپ کے تعاون کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔''

''مثلاً...... کن معاملات میں؟'' انہوں نے پوچھا۔

''یاسمین کی زبانی مجھے پتا چلا ہے کہ اس کا شوہر جس کار ڈیلر کے پاس کام کرتا تھا، وہ شوکت علی پر بے پناہ اعتماد کرتا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''اس کار ڈیلر کا نام کفیل یزدانی ہے۔ ادھر جمشید روڈ پر اس کا کاروں کا شوروم ہے۔ اس کیس میں اس کار ڈیلر کی بھی مدد لی جاسکتی ہے۔''

''ٹھیک ہے، آپ جو چاہتے ہیں مجھے گائڈ کردیجیے گا۔'' انہوں نے کہا۔ ''میں کفیل یزدانی سے بھی ملاقات کرلوں گا۔''

رسمی اختتامیہ کلمات کے بعد ہمارے بیچ ٹیلی فونک رابطہ موقوف ہوگیا۔ اس سے اگلے روز درمیانے قد کا ایک شخص میرے دفتر میں مجھ سے ملنے آیا۔ اس کی رنگت گہری سانولی اور عمر پچاس کے قریب رہی ہوگی۔ جسم بھاری بھرکم اور سر کے بال خضاب سے رنگے ہوئے تھے۔ اس کی شخصیت سے ایک عجیب سا تاثر ابھرتا تھا جسے بہرحال مثبت نہیں کہا جاسکتا تھا۔

میں نے رسمی علیک سلیک کے بعد اس کی طرف پیشہ ورانہ مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا اور کہا۔ ''جی فرمائیں۔ میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟''

''جناب! میں نے بڑی مشکل سے آپ کو تلاش کیا ہے۔'' وہ خوشی کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔ ''اس دن آپ جلدی میں نکل گئے ورنہ اسی وقت آپ سے ملاقات ہوجاتی۔''

ایک تو وہ خود عجیب سا تھا۔ اس پر وہ بات بھی انتہائی بے تکی کررہا تھا۔ میں نے قدرے بیزاری سے پوچھا۔

''کیا میں کہیں گم ہوگیا تھا جو مجھے تلاش کرنے میں آپ کو اتنی وقت اٹھانا پڑی اور لگے ہاتھوں یہ بھی بتادیں کہ اس دن میں جلدی میں کہاں سے نکل گیا تھا جو آپ کو مجھے پکڑنے کا موقع نہیں مل سکا؟''

''جناب! میرا نام اجمل شاہ ہے۔'' وہ اپنا تعارف کراتے ہوئے بولا۔ ''میں اس فلیٹ کا مالک ہوں جہاں پر آپ دو روز پہلے گئے تھے۔ یاسمین نامی وہ عورت میری کرائے دار ہے۔'' وہ اپنا تعارف کراتے ہوئے بولا۔ ''اگر آپ اس رات مجھے مل جاتے تو میں وہیں آپ سے بات کرلیتا۔ بہرحال، میں نے کسی نہ کسی طرح آپ کا سراغ لگا ہی لیا اور اب آپ کے سامنے بیٹھا ہوں۔''

یہ جانے بغیر ہی کہ وہ اجمل شاہ ہے، اس کی شخصیت کے بارے میں میرا تاثر خاصا خراب ہوچکا تھا۔ اس تعارف کے بعد تو یہ تاثر ناگواریت کی حدود میں داخل ہوگیا تھا تاہم میں نے اپنی اندرونی کیفیت کو اس پر ظاہر نہیں ہونے دیا اور پیشہ ورانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''اس کامیابی پر میری طرف سے مبارکباد وصول کریں کہ آپ مجھے تلاش کرنے میں سرخرو ہوچکے۔ اب ذرا یہ بھی فرما دیجیے کہ آپ مجھے کس سلسلے میں تلاش کررہے تھے؟ مطلب یہ کہ میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟''

''خدمت کا موقع تو آپ مجھے دیں حضرت!'' وہ عقیدت بھرے لہجے میں بولا۔

میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں کچھ سمجھا نہیں اجمل شاہ؟''

''میں سمجھاتا ہوں۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے اپنی جس کرائے دار عورت کا ذکر کیا ہے نا، اس نے میرا ناک میں دم کررکھا ہے۔ نیکی اور بھلائی کا تو کوئی زمانہ ہی نہیں۔''

''آخر ہوا کیا ہے؟'' میں دھیرے دھیرے اسے گھیرنے کی کوشش کرنے لگا۔ ''اس عورت نے مجھے ایک قانونی مشورے کے لیے بلایا تھا۔ میں نے......''

''وہ اسی فلیٹ کے بارے میں مشورہ کرنا چاہ رہی ہوگی جس میں وہ میری کرائے دار کی حیثیت سے اس وقت رہ رہی ہے۔'' وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔ ''اور مجھے یقین ہے کہ اس نے آپ کو اصل بات نہیں بتائی ہوگی۔''

''اس بات کا فیصلہ تو میں اسی وقت کر سکتا ہوں جب آپ کا بیان بھی سامنے آجائے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ابھی تک تو میں نے کرائے دار سے ملاقات کی ہے۔ اب ذرا مالک مکان بھی اپنا احوال سنا ڈالیں؟''

میں نے بات ختم کر کے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا تو وہ توصیفی لہجے میں بولا۔ ''آپ ایک قابل اور سمجھ دار وکیل ہیں۔ آپ جیسے تجربہ کار شخص کے ساتھ میری خوب بنے گی۔''

میں چونکہ غیر محسوس طریقے سے اسے اپنے جال میں پھانسنا چاہتا تھا لہٰذا اسی کی پسند کی باتیں کرنے لگا۔ کسی دغا باز کو مکر اور فریب کے ہتھیار ہی سے چت کیا جا سکتا ہے۔ وہ ہمہ تن گوش تھا۔

''اجمل صاحب!'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''یاسمین نے مجھے بتایا ہے کہ آپ زبردستی اس سے گھر خالی کرانا چاہتے ہیں اور اس سلسلے میں آپ نے اسے کوئی قانونی نوٹس وغیرہ بھی دے رکھا ہے۔''

''وہ نوٹس تو میں نے انتہائی مجبوری کی حالت میں بھجوایا تھا وکیل صاحب۔'' وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''کئی ماہ کا کرایہ چڑھا ہوا ہے۔ جب بھی تقاضا کروں تو یہی جواب ملتا ہے کہ بس اگلے مہینے حساب صاف کر دوں گی۔ اگر اس کا گھر والا جیل میں ہے تو اس میں بھلا میں کیا کر سکتا ہوں۔ میں جتنی رعایت دے سکتا تھا، وہ دے چکا۔ میں نے ساری عمر کا کوئی ٹھیکا تھوڑی لے رکھا ہے۔''

''یہ آپ بڑی عجیب بات بتا رہے ہیں کہ یاسمین کا شوہر جیل میں ہے۔'' میں نے مصنوعی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ بات اس نے تو مجھے نہیں بتائی......''

''میں نے کہا ہے نا جناب...... وہ بہت ہی مکار اور عیار عورت ہے۔'' وہ بڑے فخر سے بتانے لگا۔ ''اس نے اپنے شوہر والے معاملے کو چھپا رکھا ہے۔ اس کے شوہر نے پیسوں کے لالچ میں ایک آدمی کو قتل کر دیا تھا۔ محلے میں کوئی اسے منہ نہیں لگاتا۔ ایک سفاک قاتل کی بیوی اور بیٹی کو کون منہ لگائے گا۔ میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ اس عورت نے سراسر آپ کا وقت برباد کیا ہوگا۔ آپ ماشاءاللہ خاصے اونچے وکیل ہیں۔ آپ کے دفتر کے ٹھاٹھ باٹ دیکھ کر مجھے بخوبی اندازہ ہو گیا ہے کہ یاسمین آپ کی فیس کا بوجھ اٹھانے کی متحمل نہیں ہو سکتی۔''

میں نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ ''یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔''

''ایک تو اس عورت نے کئی ماہ سے کرایہ نہیں دیا، اوپر سے لوگ مجھ سے کہتے ہیں کہ ایک قاتل کی فیملی کو میں نے اپنا فلیٹ کرائے پر کیوں دے رکھا ہے۔'' وہ مجھے اپنے حق میں ہموار کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ ''انسان پراپرٹی اس لیے تو نہیں بناتا کہ اسے دوسروں کے استعمال میں دے دے اور وہ بھی کسی قاتل کے بیوی بچوں کو......'' لمحاتی توقف کر کے اس نے گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''تنگ آکر میں نے ایک وکیل سے مشورہ کیا۔ اس نے ساری بات سننے کے بعد مجھ سے کہا کہ پہلی فرصت میں، میں اس عورت سے اپنا فلیٹ خالی کرا لوں۔ جب تک وہ فلیٹ کے اندر بیٹھی رہے گی، میری ملکیت مشکوک رہے گی۔''

''ان وکیل صاحب نے آپ کو مشورہ تو بالکل درست دیا ہے اجمل صاحب!'' میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''عام طور پر قانون کی زبان میں اسے...... ''قبضہ سچا، دعویٰ جھوٹا'' کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔''

''جی بالکل...... بالکل۔'' وہ بڑی شدت سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اللہ آپ کا بھلا کرے۔ میں نے اسی ''قبضہ سچا'' کے خدشے کے پیش نظر یاسمین کو فلیٹ خالی کرنے کا نوٹس بھجوایا ہے تاکہ آگے چل کر میرا ''دعویٰ جھوٹا'' نہ پڑ جائے۔''

''یہ آپ نے عقل مندی کا کام کیا ہے اجمل صاحب۔'' میں نے اسے بانس پر چڑھاتے ہوئے کہا۔ پھر سوچنے کی اداکاری کرتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔ ''مگر...... ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی......!''

''کون سی بات وکیل صاحب؟'' وہ جلدی سے مستفسر ہوا۔

''یاسمین نے مجھے بتایا ہے کہ......'' میں نے اجمل شاہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''وہ جس فلیٹ میں رہ رہی ہے، وہ اسی کا تھا؟''

''شکر ہے، اس نے لفظ ''تھا'' کا استعمال کیا ہے۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ ''یہ نہیں کہا کہ وہ فلیٹ اس کا ہے۔ وکیل صاحب......'' وہ تھوڑی دیر کے لیے رکا پھر ٹھہرے ہوئے انداز میں مجھے بتانے لگا۔

''کسی زمانے میں وہ فلیٹ اس کا تھا لیکن پھر میں نے اس سے خرید لیا۔ اب میں ہی اس فلیٹ کا قانونی مالک ہوں۔''

''اچھا...... تو یہ بات ہے۔'' میں نے پُرخیال انداز

میں کہا۔ ''جب آپ نے یاسمین سے وہ فلیٹ خرید لیا تھا تو پھر اسی کو کرائے پر دینے کی کیا ضرورت تھی۔ آپ نے پوری قیمت دے کر فلیٹ خریدا تھا تو اس کا مکمل قبضہ بھی حاصل کرنا چاہیے تھا۔''

میں جان بوجھ کر ایسی باتیں کر رہا تھا جو اس کی موافقت میں جاتی تھیں تاکہ اسے یہ یقین ہو جائے کہ میری تمام تر ہمدردیاں اسی کے ساتھ ہیں اور اجمل شاہ کے چہرے پر بجے تاثرات سے بھی اندازہ ہوتا تھا کہ مجھے اپنے اس مقصد میں خاطر خواہ کامیابی حاصل ہو چکی تھی۔

''بس جناب! یہیں پر مجھ سے غلطی ہو گئی۔'' وہ تیز آواز میں بولا۔ ''میں اس عورت سے ہمدردی کر کے بری طرح پچھتا رہا ہوں اور آپ کے پاس آنے کا بھی یہی مقصد ہے......!''

''کیا مطلب ہے آپ کا؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا۔ ''آپ کس مقصد سے میرے پاس آئے ہیں؟''

''جناب! میں چاہتا ہوں کہ صلح صفائی سے کوئی ایسی راہ نکل آئے کہ یاسمین کو عدالتوں کے دھکے نہ کھانا پڑیں۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اور ایسی کوئی ترکیب آپ ہی کر سکتے ہیں۔''

''ہوں......'' میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''مگر میں فیس وصول کیے بغیر کوئی مشورہ نہیں دے سکتا۔''

''جناب! میں آپ سے یہی بات کرنے والا تھا۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''اچھا ہوا، آپ نے خود ہی کہہ دیا۔ میں آپ کی منہ مانگی فیس دوں گا مگر میرا کام پکا ہونا چاہیے۔''

''ابھی تک آپ نے اپنے کام کی تفصیل نہیں بتائی؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''آپ ایک ذہین اور سمجھدار وکیل ہیں۔'' وہ مجھ پر مکھن کاری کرتے ہوئے بولا۔ ''میں چاہتا ہوں، آپ میرے اور یاسمین کے درمیان ایک ثالث کا کردار ادا کرتے ہوئے اس مسئلے کو نمٹا دیں۔ آپ کی فیس میں ادا کر دوں گا اور یاسمین کو عدالت کا منہ نہیں دیکھنا پڑے گا۔ وہ پہلے ہی شوہر کی وجہ سے بہت پریشان ہے۔''

''آپ کی بات میں وزن ہے اجمل صاحب۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''عدالتوں میں دھکے کھانے سے ویسے بھی کسی کو کچھ نہیں ملا۔ مصالحت کا راستہ اختیار کرنا ہی عقل مندی ہے لیکن......''

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ جلدی سے مستفسر ہوا۔ ''لیکن کیا وکیل صاحب؟''

معلومات عامہ

جابر بن حیان (ابوموسیٰ) بابائے کیمیا۔ Master Of Chmistry

722ء۔ علاقہ کوفا۔ شاگرد امام جعفر صادق

ایجادات: گندھک اور شورے کا تیزاب، چمڑا رنگنے اور خضاب کی ایجاد۔ میگنائز ڈائی آکسائیڈ جس سے شیشہ سازی کا عمل ہوا۔ سونا پگھلانے کا آلہ اور فلٹرائزیشن کا آلہ۔

اسپرٹ، کافور، سنکھیا، نوشادر چونکہ دھاتوں میں گندھک اور پارہ ہوتا ہے، ان کی اجزائے ترکیبی سے مختلف دھاتیں وجود میں آئیں۔ ایک مسلمان کی ایجادات جس سے پوری دنیا آج تک فائدہ اٹھا رہی ہے اور ہزاروں کارخانے قائم و دائم ہیں۔

مرسلہ۔ محمد خواجہ، کورنگی، کراچی

حکایتیں

☆ دنیا میں جتنے بھی بڑے لوگ گزرے ہیں، ان میں بیشتر کو ناساعد حالات کا سامنا رہا ہے۔ لیکن جب انسان کے دل میں سچی لگن ہو۔ خداداد ذہانت ہو تو کامیابی کے لیے سہاروں سے محتاج نہیں ہوتے۔

☆ جب اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں تمہاری دعائیں قبول نہ ہوں تو دو چیزوں کا احتساب کرو، اپنی غذا اور اپنی گفتگو کا۔

☆ انسان اپنی توہین معاف کر سکتا ہے، بھول نہیں سکتا۔

مرسلہ۔ محمد خواجہ، کورنگی، کراچی

بہترین دوا

حکیم لقمان کہتے ہیں...... ''میں نے زندگی میں مختلف دواؤں سے لوگوں کا علاج کیا ہے مگر اس طویل تجربے سے میں نے سیکھا ہے انسان کے لیے بہترین دوا محبت اور عزت ہے۔''

کسی نے پوچھا۔ ''اگر یہ اثر نہ کرے تو......''

حکیم لقمان مسکرا کر گویا ہوئے۔ ''تو پھر دوا کی مقدار بڑھا دو۔''

مرسلہ۔ مرحا گل، ورابن کلاں

”لیکن یہ کہ......“ میں نے کہا۔ ”اس سلسلے میں مجھے یاسمین سے بات کرنا ہوگی۔ ثالثی کے لیے دونوں فریقوں کا ثالث پر اعتماد ہونا بہت ضروری ہے۔“

”آپ یاسمین کو راضی کرنے کی کوشش کریں گے تو وہ مان جائے گی۔“ وہ ایک آنکھ دبا کر رازدارانہ انداز میں بولا۔ ”میں چاہوں تو اس کا سامان اٹھا کر بلڈنگ سے باہر پھنکوا سکتا ہوں مگر میں اس پریشان حال عورت کو مزید پریشان نہیں کرنا چاہتا۔“

”آپ بہت ہی ہمدرد اور نیک دل انسان ہیں۔“ میں نے اس کی تعریف کرتے ہوئے کہا پھر سرسری انداز میں سوال کیا۔ ”یہ قتل والا معاملہ کیا ہے؟“

”قتل......کون سا قتل؟“ وہ بدکے ہوئے لہجے میں بولا۔

”میں اس قتل کی بات کر رہا ہوں جس کے الزام میں یاسمین کا شوہر شوکت علی پھنسا ہوا ہے۔“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

”اچھا وہ......“ وہ سنبھلتے ہوئے بولا۔ ”یہ سارا معاملہ ہوشیاری اور ہوس کا ہے جناب۔“

”میں سمجھا نہیں۔“ میں نے الجھن زدہ لہجے میں کہا۔ ”کیسی ہوشیاری......کس قسم کی ہوس؟“

”آپ کو یہ تو معلوم ہی ہوگا کہ یاسمین کا شوہر کسی کار ڈیلر کے پاس کام کرتا تھا۔“ وہ مجھے بتانے لگا۔ ”کسی کار کے سودے کے نتیجے میں پارٹی نے ایک ایسے دن پیمنٹ کی تاریخ رکھی جس روز عام تعطیل تھی۔ پارٹی کے ساتھ کوئی ایسی مجبوری لگی ہوئی تھی کہ وہ ایک دن پہلے یا ایک دن بعد پیمنٹ نہیں کر سکتی تھی لہٰذا کار ڈیلر چھٹی کے روز شوروم کھولنے پر مجبور ہوگیا۔ وہ کار ڈیلر یاسمین کے شوہر پر بہت بھروسا کرتا تھا لہٰذا اس نے شوکت کی ڈیوٹی لگا دی کہ وہ پارٹی کی آمد سے ایک گھنٹا پہلے شوروم کھولے تاکہ پارٹی کے لیے کسی قسم کی دقت نہ ہو۔ مذکورہ پارٹی دو لاکھ کیش کی پیمنٹ کرنے والی تھی۔ آپ جانتے ہیں کہ دو لاکھ کوئی معمولی رقم نہیں ہوتی۔ بس، شوکت کے دل میں بھی لالچ آگیا۔ اس نے حسب پروگرام شوروم کھولا اور تھوڑی ہی دیر کے بعد اپنے مالک کفیل یزدانی کو فون کیا کہ پارٹی نے آنے کا پروگرام کینسل کر دیا ہے۔ اب وہ کل صبح آئے گی اس لیے یزدانی شوروم نہ آئے۔ یزدانی نے کہا، ٹھیک ہے۔ تم شوروم بند کر کے گھر چلے جاؤ۔ چھٹی کے دن دکان کھول کر بیٹھے رہنا مناسب نہیں ہے۔ یزدانی کو فون پر الو بنانے کے بعد وہ بڑی بے تابی سے پارٹی کا انتظار کرنے لگا۔ پارٹی وقت مقررہ پر شوروم پہنچی تو یزدانی وہاں موجود نہیں تھا۔ پارٹی نے شوروم کے مالک کے بارے میں شوکت سے پوچھا تو جواب میں اس نے پسٹل نکال لیا اور گن کے بل پر دو لاکھ کیش والی پارٹی کو لوٹنے کی کوشش کی۔ پارٹی دو لاکھ کے نوٹ ایک بریف کیس میں رکھ کر لائی تھی۔ اس صورت حال نے پارٹی کو ہکا بکا کر کے رکھ دیا اور اسی افراتفری میں اس احمق خریدار نے بریف کیس کو ڈھال بنا کر وہاں سے بھاگنے کی کوشش کی۔ جرم کھل جانے کے خوف سے شوکت نے پارٹی پر یکے بعد دیگرے دو فائر کیے۔ دونوں گولیاں پارٹی کی کھوپڑی کے عقبی حصے میں لگیں اور وہ موقع پر ہی ختم ہوگیا۔ اس صورت حال نے شوکت کو بوکھلا کر رکھ دیا اور وہ جائے وقوعہ سے فرار کی کوشش میں پکڑا گیا۔“

اجمل شاہ نے جتنی تفصیل سے مجھے وہ کہانی سنائی تھی، اس سے تو ایسا تاثر ابھرتا تھا کہ ان لمحات میں وہ جائے واردات پر موجود تھا اور اس نے یہ اندوہناک واقعہ خود اپنی آنکھوں سے ہوتے دیکھا تھا۔

بہرحال، میں نے اس کے بیان پر کسی قسم کی جرح نہیں کی اور تسلی بھرے لہجے میں کہا۔ ”ٹھیک ہے اجمل صاحب! میں یاسمین کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ مجھے امید ہے، اگر اس میں ذرا سی بھی عقل ہے تو وہ مان جائے گی۔“

”جناب! آپ سمجھائیں گے تو وہ کیسے نہیں مانے گی۔“ اجمل شاہ نے پُرجوش انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ”میں کب حاضر ہو جاؤں؟“

”دو روز کے بعد آپ یہیں آفس میں آکر مجھ سے ملیں۔“ میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”لیکن اس سلسلے میں آپ کو مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہوگا!“

”کیسا وعدہ وکیل صاحب؟“ وہ حیرت بھرے انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔

”میں آپ کے معاملے کو سیٹل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں لہٰذا آپ کو کسی قسم کی اینٹی شیفٹی دکھانے کی ضرورت نہیں ہے۔“ میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ”اس سلسلے میں آپ یاسمین سے کوئی بات نہیں کریں گے اور نہ ہی کسی غیر محسوس انداز میں اس پر کسی قسم کا دباؤ ڈالنے کی کوشش کریں گے۔“

”مجھے منظور ہے۔“ وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر مضبوط لہجے میں بولا۔

میں نے ضروری ہدایات کے بعد اسے رخصت کردیا۔

☆☆☆

اگلے روز میں نے اجمل شاہ کے نام ایک دھانسو قسم کا نوٹس روانہ کردیا۔ یہ نوٹس میری وکالت میں یاسمین کی جانب سے تھا جس میں اس امر کی تفصیل درج تھی کہ اجمل شاہ نے کس طرح دھوکا دہی سے یاسمین کا فلیٹ ہتھیانے کی کوشش کی تھی اور اسے پوری رقم بھی ادا نہیں کی تھی بلکہ ایک بوگس ملکیت کے بل بوتے پر وہ یاسمین سے فلیٹ خالی کرانے کے لیے غنڈا گردی اور نیچ ہتھکنڈے آزمارہا تھا وغیرہ وغیرہ...!

یہ نوٹس رجسٹرڈ ڈاک سے روانہ کیا گیا تھا اور مجھے یقین تھا کہ دوروز کے اندر اسے مل جائے گا۔ میں نے اجمل شاہ کو دو دن بعد آنے کے لیے کہا تھا یعنی وہ آئندہ روز میرے پاس آنے والا تھا، نوٹس ملنے سے پہلے۔

اسی روز میں نے عابد نوید صاحب سے بھی بات کی۔ انہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ میں اس کیس کو مرحلہ وار دو حصوں میں نمٹاؤں۔ یعنی اجمل شاہ کا فلیٹ کی خریداری کے سلسلے میں یاسمین سے فراڈ کرنا پہلے مرحلے میں اور شوکت علی کا بے گناہ کسی قتل کے کیس میں پھنس جانا دوسرے مرحلے میں۔ اگرچہ عابد صاحب کا مشورہ میری اپنی سوچ اور ترتیب سے لگا نہیں کھاتا تھا لیکن اس کے باوجود بھی میں نے ان کی بات مانتے ہوئے اجمل شاہ کی دیدہ دلیری اور بدمعاشی پر اپنا ذہن فوکس کرلیا اور شوکت علی کی رہائی والے معاملے کو پس پشت ڈال دیا۔ بعض اوقات کلائنٹ کی رائے کو بھی اپنی سوچ پر فوقیت دینا پڑتی ہے۔ ویسے میں اپنے طور پر کلی مطمئن تھا کہ میں نے عابد صاحب کو موجودہ صورتِ حال سے اچھی طرح آگاہ کردیا تھا۔

آئندہ روز اجمل شاہ میرے پاس آیا اور میں نے اسے تسلی دے دی کہ یاسمین مصالحت کے لیے رضامند ہوگئی ہے۔ وہ خوشی خوشی واپس چلا گیا تاہم اس کی یہ خوشی ایک دوروز سے زیادہ نہ چل سکی۔

میری جانب سے جاری کردہ نوٹس کی ترسیل کے فوراً بعد اجمل شاہ میرے آفس آیا اور نوٹس والا لفافہ میرے سامنے پھینکتے ہوئے غصے سے بولا۔ ''یہ حرکت آپ نے کی ہے؟''

میں نے بڑے میٹھے انداز میں اسے بیٹھنے کے لیے کہا پھر لفافے کی طرف دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے اضافہ کیا۔ ''یہ لفافہ میرے ہی دفتر سے بھیجا گیا محسوس ہوتا ہے۔ اس کے اندر کیا ہے...؟''

''آپ کو اچھی طرح پتا ہے کہ اس لفافے کے اندر کس قسم کا نوٹس ہے۔'' وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے خفگی آمیز انداز میں بولا۔ ''مجھے لگتا ہے، آپ یاسمین کے ساتھ مل گئے ہیں حالانکہ میں نے آپ پر واضح کردیا تھا کہ میں وہ فلیٹ یاسمین سے خرید چکا ہوں۔ پھر اس ڈرامے بازی کی کیا ضرورت تھی......؟''

''اجمل صاحب!'' میں نے اس کے کان کے کیڑے جھاڑنے کی غرض سے کہا۔ ''نمبر ایک...... میں نے یاسمین کو راضی کرنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ نہیں مانی۔ میں اس کے ساتھ کسی قسم کی زبردستی نہیں کرسکتا۔ نمبر دو...... میں یاسمین کے ساتھ ملا ہوں اور نہ ہی آپ کو چھوڑا ہے۔ میں جو کچھ بھی کررہا ہوں وہ میرے پیشے کا تقاضا ہے۔ نمبر تین...... آپ نے مجھے یہ تو بتایا تھا کہ آپ نے وہ فلیٹ یاسمین سے خرید لیا ہے لیکن آپ نے اس سلسلے میں مجھے کوئی دستاویز نہیں دکھائی تھی۔ نمبر چار...... مجھے ڈرامے کرنے کا شوق ہے اور نہ ہی ایسے کاموں کے لیے میرے پاس فالتو وقت ہوتا ہے لہٰذا آپ کو جو بھی کہنا ہے، جوابی نوٹس کے ذریعے کہہ دیں۔ آپ کا وہ تحریری جواب میں اپنے موکل تک پہنچادوں گا۔ آگے جو اللہ کو منظور!''

میرے اٹل اور ترش انداز کو دیکھ کر اس کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ جرائم پیشہ شخص باہر سے چاہے کتنا بھی مضبوط اور بدمعاش نظر آنے کی کوشش کررہا ہو مگر اس کے اندر ایک ڈرپوک مجرم چھپا بیٹھا ہوتا ہے۔ بس، ذرا طریقے سلیقے سے اس اندرونی مجرم تک رسائی حاصل کرکے اس کی مجبوریوں سے کھیلنے کی ضرورت ہوتی ہے اور میں اس مقصد میں خاطر خواہ کامیاب رہا تھا۔

''میں سمجھتا ہوں، یاسمین نے میرے نوٹس سے گھبرا کر یہ جوابی نوٹس بھیجا ہے۔'' وہ اضطراری لہجے میں بولا۔ ''ایسا کرتے ہیں کہ میں وہ نوٹس واپس لے لیتا ہوں۔ آپ یاسمین سے کہہ دیں کہ جب تک اس کے شوہر کے کیس کا کوئی فیصلہ نہیں ہوجاتا، وہ اطمینان سے اسی فلیٹ میں رہے۔ میں اس سے کرایہ بھی نہیں لوں گا۔''

میرے تیور دیکھ کر وہ اچھا خاصا گھبرا گیا تھا۔ میں نے اس کی پریشانی میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے، آپ نے نوٹس کو اچھی طرح پڑھا ہی نہیں......''

''جی...... کیا مطلب؟'' وہ سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

''یہ نوٹس یاسمین نے نہیں بلکہ اس کے شوہر شوکت علی کی طرف سے ہے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے نوٹس کے آخری حصے کو غور سے نہیں پڑھا۔''

''شوکت علی......'' وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔

''مم......مگر......وہ تو جیل میں ہے......''

''تم اس کے جیل میں ہونے کا ذکر تو اس طرح کر رہے ہو جیسے وہ اس دنیا سے اس دنیا میں منتقل ہو چکا ہو۔'' میں نے ''آپ'' سے ''تم'' پر آتے ہوئے گھور کر اسے دیکھا۔ ''میں جیل میں جا کر اس سے ملاقات کر چکا ہوں۔ وہ اس بات پر سخت خفا ہے کہ سوتیلے بھائی نے اس کے جیل جاتے ہی ہیرا پھیری سے، اس کی مجبوری سے فلیٹ ہتھیا لیا ہے۔''

''سوتیلا بھائی۔'' اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ ''کون سوتیلا بھائی؟''

''تم......اور کون؟'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''مجھے تم لوگوں کی رشتے داریوں کی ساری تفصیل معلوم ہو چکی ہے۔''

یہ حقیقت تھی کہ میں نے تین چار روز قبل جیل جا کر شوکت علی سے ملاقات کی تھی اور اسے جیل سے باہر کی صورتِ حال سے بھی آگاہ کر دیا تھا۔ شوکت اور اجمل شاہ کی رشتے داری کے بارے میں تو مجھے یاسمین کی زبانی بھی بہت کچھ پتا چل چکا تھا۔ شوکت علی جیل کے اندر بہت افسردہ اور ناامید دکھائی دیتا تھا۔ میں نے اسے یقین دلایا تھا کہ فلیٹ والا معاملہ نمٹانے کے بعد میں اس کا کیس بھی اپنے ہاتھ میں لے لوں گا اور انشاء اللہ بہت جلد اسے باعزت بری کرا لوں گا۔ شوکت سے جیل جا کر ملنا اس لیے ضروری تھا کہ وکالت نامے پر اس کے دستخط لے سکوں اور اس کے وکیل کے بارے میں بھی جان سکوں جو ابھی تک ہوا میں لٹھ گھما رہا تھا۔ مجھے پتا چلا کہ وہ ایک جونیئر اور ناتجربہ کار وکیل تھا۔ مجھ سے ملاقات پر اس نے خاصے حیرت انگیز انکشافات کیے تھے جو سراسر اجمل شاہ کے خلاف جاتے تھے۔ اس نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اجمل شاہ کو ملزم شوکت علی کی بریت سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے بلکہ اسے یقین ہے کہ شوکت کو موت کی سزا ہو جائے گی کیونکہ اجمل شاہ کے خیال میں شوکت علی نے دولت کے لالچ میں واقعی قتل کیا ہے۔ میں نے اس جونیئر وکیل کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ بوقتِ ضرورت اگر کسی مرحلے پر اس کی سچی گواہی کی ضرورت پیش آئی تو وہ مجھ سے تعاون کرے گا۔

''اوہ......!'' میرے رشتے داریوں والے انکشاف پر اجمل شاہ نے ایک تشویش بھری سانس خارج کی اور بولا۔ ''جناب! آپ کو شاید شوکت علی کے کیس کی حقیقت کا علم نہیں ہے۔ اس کا بچنا بہت مشکل ہے۔ استغاثہ کی جانب سے عینی شاہدین نے جو بیانات دیے ہیں ان کی روشنی میں اس کو بہت لمبی سزا ہونے والی ہے۔ اب شاید شوکت کی لاش ہی جیل سے باہر آئے گی......''

ان لمحات میں اجمل شاہ کے لیے میرے دل میں کراہیت کا احساس جاگا۔ وہ کمینگی کی آخری حدود کو چھونے والا انسان تھا۔ یقین نہیں آتا تھا کہ دنیا میں ایسے رشتے دار بھی پائے جاتے ہیں جو کردار میں گدھوں سے بھی چار ہاتھ آگے ہوتے ہیں۔

''کس کی لاش جیل سے باہر آتی ہے اور کون باہر سے عمر بھر کے لیے جیل چلا جاتا ہے، اس کا فیصلہ تو آنے والا وقت ہی کرے گا۔'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے لیے بہتر یہی ہوگا کہ اس نوٹس کا تحریری جواب دے دو۔ اس کے بعد تمہاری کسی تجویز پر بھی غور کیا جا سکتا ہے......'' ایک لمحے کو رک کر میں نے گہری سانس لی پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں اضافہ کیا۔

''میں ابھی تک اپنی بات پر قائم ہوں کہ اگر دونوں طرف سے معقولیت کا مظاہرہ کیا گیا تو میں آپ لوگوں کے بیچ مصالحت کرانے کی پوری کوشش کروں گا۔''

وہ اٹھا اور بغیر ''خدا حافظ'' کہے میرے دفتر سے نکل گیا۔

تین روز بعد اجمل شاہ کا تحریری بیان مجھے موصول ہو گیا جس کے مطابق وہ فلیٹ پر اپنی ملکیت جتانے کے موقف پر ڈٹا ہوا نظر آتا تھا۔ اس نے بڑی تفصیل کے ساتھ اپنے احسانات کا بھی ذکر کیا تھا جو شوکت علی کے جیل چلے جانے پر اس نے یاسمین پر کیے تھے۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھیں کہ اس نے مجھے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانے کے لیے راستہ دے دیا تھا۔ میں نے یاسمین سے اس موضوع پر ایک تفصیلی ملاقات کی اور دو روز کے بعد مکمل تیاری کے ساتھ اجمل شاہ کے خلاف فراڈ اور کھلم کھلا بدمعاشی کا مقدمہ دائر کر دیا تاکہ اسے کاسٹک سوڈا کے ساتھ دھویا جا سکے۔

☆☆☆

ابتدائی کارروائی مکمل ہونے کے بعد عدالت نے اجمل شاہ کو جرح کے لیے طلب کر لیا۔

اجمل شاہ نے جوابِ دعویٰ میں یہ موقف اختیار کیا تھا کہ شوکت علی قتل کے ایک سنگین مقدمے میں ملوث تھا۔ اس

برے وقت میں ایک پڑوسی ہونے کے ناتے اس نے شوکت اور اس کی فیملی کی جس حد تک ممکن تھا، عملی مدد بھی کی اور اس کیس کے سلسلے میں اپنی جیب سے رقم بھی خرچ کی مگر کسی نے اس کے خلوص کی قدر نہیں کی۔

جج کی اجازت حاصل کرنے کے بعد میں نے جرح کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ ''اجمل صاحب! کیا یہ درست ہے کہ آپ ''شاہ جی'' کے نام سے زیادہ مشہور ہیں؟''

وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''جی ہاں...... یہ درست ہے۔''

''گویا...... اگر میں بھی آپ کو شاہ جی کہوں تو اس میں اعتراض والی کوئی بات نہیں ہوگی؟'' میں نے بہ دستور گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

''جی...... آپ بھی کہہ لیں۔'' وہ کھا جانے والی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

اس کی خفگی اور بیزاری کا سبب مجھے اچھی طرح معلوم تھا لیکن افسوس کہ میں اس کی مکروہ خواہش پوری نہیں کرسکتا تھا۔ میں نے اپنی جرح کو دھیمے انداز میں آگے بڑھاتے ہوئے سوال کیا۔

''شاہ جی! اگر میں غلطی پر نہیں تو آپ شوکت علی کے پڑوسی ہیں؟''

اس نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

''آپ کے فلیٹ کا نمبر تین سو چھ ہے جبکہ شوکت علی اپنی فیملی کے ساتھ فلیٹ نمبر تین سو پانچ میں رہتا تھا اور یہ دونوں فلیٹس ''فاطمہ اپارٹمنٹس'' کے بلاک اے میں تھرڈ فلور پر واقع ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن افسوس کہ شوکت علی قتل کے ایک مقدمے میں ملوث ہوکر جیل جا چکا ہے۔''

''آپ نے تو ''فاطمہ اپارٹمنٹس'' کے بارے میں اچھی خاصی ریسرچ کر رکھی ہے۔'' وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''لگتا ہے، آپ کا وہاں آنا جانا رہا ہے......''

''میں اپارٹمنٹس بلڈنگز سے زیادہ انسانوں پر ریسرچ کرتا ہوں شاہ جی۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔ ''اور میری تازہ ترین ریسرچ یہ کہتی ہے کہ آپ کوئی شپنگ کمپنی چلاتے ہیں؟''

''آپ کی تازہ ترین ریسرچ ایک دم بوگس ہے۔'' وہ بڑے فخریہ انداز میں بولا۔ ''میں کسی شپنگ کمپنی کا مالک نہیں بلکہ اسی ایک کمپنی میں کام کرنے والا ادنیٰ سا ملازم ہوں۔''

''ادنیٰ سا ملازم۔'' میں نے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں۔ ''مگر آپ کے ٹھاٹ باٹ تو ملازموں والے نہیں ہیں......؟''

''آپ کو کوئی غلط فہمی ہوگئی ہے وکیل صاحب۔'' وہ مجھ پر ایک گہری چوٹ کرتے ہوئے بولا۔ ''میں اس شپنگ کمپنی میں ایک کلرک کی حیثیت سے کام کرتا ہوں اور میری ماہانہ تنخواہ صرف تین ہزار روپے ہے۔''

''تین ہزار روپے......'' میں نے اسی کے الفاظ کو زیرِلب دہرایا پھر پوچھا۔ ''ان تین ہزار کے علاوہ آپ کی آمدنی کے اور کون کون سے ذرائع ہیں؟''

''کوئی نہیں۔'' وہ قطعی انداز میں بولا۔ ''انہی تین ہزار میں اللہ گزارہ کر دیتا ہے۔''

یہ جس زمانے کا ذکر ہے اس وقت تین ہزار روپے اچھی خاصی معقول تنخواہ ہوا کرتی تھی۔ آج کل کے حساب سے اسے بیس سے تیس ہزار سمجھ لیں اور جس فلیٹ کی مارکیٹ ویلیو اس زمانے میں پانچ لاکھ تھی۔ وہ اب بیس لاکھ سے اوپر کا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ہر شے کی قیمت میں اضافہ ہی ہوتا ہے سوائے...... انسان کے!

''شاہ جی......!'' میں نے اپنی جرح میں ایک دم تیزی لاتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے اپنے جواب دعوٰی میں یہ دعوٰی کیا ہے کہ آپ نے شوکت علی کا فلیٹ تین لاکھ روپے میں خرید لیا ہے لہٰذا آپ اس فلیٹ کی ملکیت کا حق رکھتے ہیں؟''

''جی ہاں۔ میں نے کچھ بھی غلط نہیں کہا ہے۔'' وہ معتدل انداز میں بولا۔ ''جو حقیقت ہے، وہی بیان کی ہے۔ شوکت علی کی بیوی یاسمین تین لاکھ روپے کی وصولی سے انکار نہیں کرسکتی۔''

''تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ نے فلیٹ کے سلسلے میں شوکت علی کی بیوی کو ادائیگی کی تھی؟'' میں نے سرسری انداز میں پوچھا۔

''جی ظاہر ہے۔'' وہ جلدی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں نے جس سے فلیٹ خریدا، ادائیگی بھی اسی کو کی تھی۔''

''شاہ جی! مالکِ مکان یعنی شوکت علی نے عرضی دعوٰی میں، اپنے فلیٹ کی فروخت سے مکمل لاعلمی کا اظہار کیا ہے اور......''

''تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔'' وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔ ''اگر یاسمین نے اپنے شوہر کو فلیٹ کی فروخت کے بارے میں نہیں بتایا تو میں کیا کروں۔ میں نے تو تین لاکھ دے کر وہ فلیٹ خریدا ہے نا؟''

''آپ کی تمام تر توجہ تین لاکھ پر مرکوز ہے شاہ جی۔''

میں نے برہمی سے کہا۔ ''اور ایک نہایت ہی اہم نکتہ آپ فراموش کیسے بیٹھے ہیں۔''

''کون سا نکتہ؟'' وہ چونکنا نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

''آپ جس فلیٹ کو خریدنے کا دعویٰ کر رہے ہیں اس کا اصل مالک شوکت علی ہے۔'' میں نے بہ آواز بلند کہا۔ ''یاسمین صرف اسی صورت میں اس فلیٹ کو فروخت کرنے کا قانونی اختیار رکھتی ہے جب اس کے پاس شوکت علی کی جانب سے جاری کردہ کوئی اجازت نامہ ہو۔ قانونی زبان میں اس اجازت نامے کو پاور آف اٹارنی یا مختارنامہ کہا جاتا ہے۔ کیا یاسمین کے پاس ایسی کوئی قانونی دستاویز تھی؟''

''میں نے تو اس کے پاس ایسی کوئی چیز نہیں دیکھی۔''

وہ بوکھلاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔ ''میرا مطلب ہے، مجھے کیا پتا کہ اس کے پاس پاور آف اٹارنی ہے یا نہیں......''

''آپ ایک شپنگ کمپنی میں کلرک کی حیثیت سے کام کرتے ہیں لہٰذا مختلف نوعیت کے ڈاکیومینٹس سے آپ کا واسطہ پڑتا رہتا ہوگا۔'' میں نے کہا۔ ''یہ تو ممکن نہیں کہ آپ کو ایسے معاملات کی اہمیت کا اندازہ نہ ہو پھر بھی...... پھر بھی آپ نے یہ تصدیق کیے بغیر کہ یاسمین فلیٹ بیچنے کا اختیار رکھتی ہے یا نہیں، اسے تین لاکھ روپے تھما دیے۔ آپ جیسے پڑھے لکھے انسان سے ایسی حماقت کی توقع تو نہیں کی جاسکتی۔''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ پینترا بدلتے ہوئے جذباتی لہجے میں بولا۔ ''جناب! اصل بات یہ ہے کہ شوکت علی قتل کے ایک کیس میں ملوث ہو کر جیل چلا گیا تھا۔ یہ بھی سچ ہے کہ وہ رشتے میں میرا سوتیلا بھائی لگتا ہے اسی لیے میں نے اس کی رہائی کے سلسلے میں بھاگ دوڑ بھی کی۔ اس کے سارے قانونی معاملات میں نے ہی سنبھال رکھے تھے اور ان عدالتی کارروائیوں پر پیسا پانی کی طرح بہہ رہا تھا جس میں وکیلوں کی بھاری فیسیں بھی شامل تھیں......''

''آپ کے پاس اتنا پیسا کہاں سے آگیا جسے آپ پانی کی طرح بہا رہے تھے؟'' میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ تو تین ہزار روپے ماہوار تنخواہ پانے والے ملازم ہیں۔ اس کے علاوہ آپ کی اور کوئی آمدنی بھی نہیں ہے۔''

''آبجیکشن یور آنر......!'' شاہ جی کے وکیل نے بہ آواز بلند کہا۔ ''وکیل استغاثہ حد سے تجاوز کر رہے ہیں۔ اجمل شاہ صاحب کی بات پوری نہیں ہوئی اور یہ بول ......ہوں، شاہ جی اسی بات کی وضاحت کر رہے

تھے کہ انہوں نے کس طرح لوگوں کی منت خوشامد کر کے اپنے پڑوسی کی مدد کرنے کی کوشش کی تھی مگر ان کی نیکی کو کھو کھاتے میں ڈال دیا گیا۔''

گویا وکیل صفائی نے اپنے مؤکل کو ایک ''کلیو'' دے دیا تھا جسے ''فالو'' کر کے وہ اپنی جان بچا سکتا تھا۔ شاطر اجمل شاہ بھلا اس موقع سے کیسے فائدہ نہ اٹھاتا۔ وہ مسکین سی صورت بنا کر جلدی سے بولا۔

''یہ سچ ہے کہ میں نے شوکت علی کی مدد کرنے کے لیے ادھر ادھر سے ادھار پکڑا تھا لیکن یہاں سے تو واپسی کی کوئی امید ہی نظر نہیں آرہی تھی۔ لوگوں نے مجھ سے رقم کے تقاضے کرنا شروع کیے تو میں پریشان ہو گیا۔ میں نے اپنی پریشانی کا جب یاسمین سے ذکر کیا تو وہ فلیٹ فروخت کرنے کے لیے تیار ہو گئی......''

''اور آپ نے تین لاکھ میں وہ فلیٹ خرید لیا جس کی مارکیٹ ویلیو اس وقت پانچ لاکھ تھی......'' میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

''مارکیٹ ویلیو کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی جناب۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ ''انسان کی ضرورت سب سے زیادہ اہم ہوتی ہے۔ اگر وہ فلیٹ پانچ لاکھ میں فروخت ہو سکتا تو یاسمین مجھے تین لاکھ میں کیوں دے دیتی۔''

''آپ نے تین لاکھ کیش یاسمین کو ادا کیے تھے؟'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

وہ کائیاں شخص فوراً میری بات کی تہ میں پہنچ گیا۔ وہ سمجھ گیا کہ اگلا سوال میں یہ کروں گا کہ تین ہزار ماہانہ کمانے والے آدمی کے پاس یکمشت تین لاکھ روپے کہاں سے آگئے لہٰذا اس نے بہت سوچ سمجھ کر جواب دیا۔

''آپ بھی کیسی باتیں کر رہے ہیں وکیل صاحب۔ اگر میرے پاس تین لاکھ کیش ہوتے تو میں وہ مختلف قرض خواہوں کو ادا کر کے اس معاملے کو صاف نہ کر دیتا۔ میں نے شوکت کے کیس کے سلسلے میں وکیلوں اور دیگر قانونی اخراجات کی مد میں جو چھوٹی بڑی رقمیں خرچ کی تھیں، ان کا تخمینہ تین لاکھ بنتا تھا۔ میں نے یاسمین کی بات سن کر کہا کہ اگر وہ فلیٹ فروخت کرنے کا فیصلہ کر ہی چکی ہے تو اسے میرے ہاتھ بیچ دے۔ اس طرح قرض کی کل رقم بھی ایڈجسٹ ہو جائے گی اور وہ تیار ہو گئی۔ میں نے اس سلسلے میں اسٹیمپ پیپر پر قانونی دستاویز بھی تیار کروائی جس کے مطابق یاسمین نے تین لاکھ روپے وصول کرنے کے بعد وہ فلیٹ میرے ہاتھ فروخت کر دیا تھا۔ اس اسٹیمپ پیپر کی فوٹو

کاپی جواب دعوئی کے ساتھ منسلک ہے۔"

وہ جس اسٹیمپ پیپر کا ذکر کررہا تھا، اس کی کہانی ہر مرحلے پر تبدیل ہوتی رہی تھی۔ جب پہلی مرتبہ وہ یاسمین کے سامنے آیا تو کریم بھائی اسٹیٹ ایجنٹ نے تین لاکھ کیش ادا کر کے اس اسٹیمپ پیپر پر یاسمین سے دستخط کرا لیے تھے۔ اس وقت تک یاسمین یہی سمجھ رہی تھی کہ اس نے مبلغ چار لاکھ روپے میں اپنا فلیٹ کریم بھائی کے ہاتھ فروخت کردیا ہے۔ تین لاکھ ڈاؤن پیمنٹ اور ایک لاکھ رجسٹری کے وقت اسے ملیں گے پھر کچھ عرصے کے بعد یاسمین پر اس اسٹیمپ پیپر کی حقیقت کچھ اس طرح کھلی کہ وہ فلیٹ یاسمین سے اجمل شاہ نے خریدا تھا اور یہی اجمل شاہ اب ایک ہی بات کررہا تھا۔ اس جیسے دھوکے باز کو دھوکے اور فریب ہی سے چت کیا جاسکتا تھا۔

"شاہ جی!" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "آپ نے یکمشت تین لاکھ کی رقم یاسمین کے ہاتھ میں رکھی یا مختلف نوعیت کے اخراجات کو اس اماؤنٹ میں ایڈجسٹ کیا، ہم اس بحث میں پڑ کر عدالت کا قیمتی وقت برباد نہیں کریں گے۔ آپ بس میرے ایک سوال کا جواب دیں۔"

وہ ٹٹولتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے کہا۔

"شاہ جی! آپ نے بڑے رقت آمیز انداز میں اپنے پڑوسی کم سوتیلے بھائی کی بدحالی کا نقشہ کھینچا ہے۔ آپ شوکت علی کی رہائی کی خاطر ادھر ادھر سے قرض مانگ کر رقمیں لاتے رہے اور خود بھی مارے مارے مختلف وکیلوں اور عدالتوں میں پھرتے رہے۔ آپ کی یہ بھاگ دوڑ قابلِ تحسین ہے۔ آپ نے لگ بھگ نو ماہ کے عرصے میں اپنی کوششوں سے شوکت علی کے کیس میں کم و بیش تین لاکھ جھونک دیے، یہ بات الگ ہے کہ بعدازاں آپ نے اس رقم کو فلیٹ کی قیمت میں ایڈجسٹ کرلیا۔ آپ سے میرا سوال یہ ہے کہ آپ نے اب تک شوکت علی کے کیس کے سلسلے میں کتنے وکیلوں کی خدمات حاصل کی ہیں؟"

"تین چار تو ہوں گے جناب......" وہ ایسے ہی بغیر سوچے سمجھے بول گیا۔

"تین چار......" میں نے گہری نظر سے اسے گھورا۔ "ان کے نام بتاسکتے ہیں؟"

"نن...... نام تو اب مجھے...... یاد نہیں آرہے......" وہ گڑبڑا گیا۔

"تین چار بہت بڑی تعداد ہوتی ہے شاہ جی......" میں نے اس پر طنز کے زہریلے تیر برساتے ہوئے کہا۔ "اتنی بڑی تعداد کو یاد رکھنا ہما شما کے بس کی بات نہیں۔ آپ معزز عدالت کو کسی ایک وکیل کا نام بتادیں تو آپ کی بہت مہربانی ہوگی۔"

"ہاں...... ایک وکیل کا نام ہے...... جاوید صادق......" وہ سوچنے کی اداکاری کرتے ہوئے بولا۔

یہ وہی جونیئر وکیل تھا جس سے میں ایک تفصیلی ملاقات کرچکا تھا۔ جاوید صادق ہی شوکت علی کا کیس لڑرہا تھا اور اجمل شاہ سے خاصا نالاں بھی دکھائی دیتا تھا۔

میں نے اپنی فائل میں سے ایک رسید نکال کر جج کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ "جناب عالی! یہ پچاس ہزار روپے کی وصولی کی رسید ہے جو جاوید صادق نامی ایک وکیل کی جانب سے اپنی فیس کی وصولی کی مد میں جاری کی گئی ہے......" پھر میں نے روئے سخن اجمل شاہ کی جانب موڑا اور استفسار کیا۔

"شاہ جی...... آپ انہی وکیل صاحب کا ذکر کررہے ہیں نا......؟"

"جی ہاں، بالکل......" وہ جلدی سے بولا۔ "اس وقت شوکت علی کا کیس انہی کے ہاتھ میں ہے۔ یہ رسید میں نے ہی یاسمین کو دی تھی۔"

"آپ نے وکیل کی فیس کی اس رسید کے علاوہ بھی یاسمین کو مختلف نوعیت کے حسابات دکھائے تھے جن کا تخمینہ تین لاکھ کے قریب بنتا تھا اور اسی رقم میں آپ نے اس کا فلیٹ ہتھیانے کی کوشش کی ہے۔"

"یہ بات پہلے بھی آپ دو تین مرتبہ دہرا چکے ہیں۔" وکیلِ صفائی نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "کچھ نیا ہو تو پیش کریں۔"

جج نے مجھ سے پوچھا۔ "بیگ صاحب! اس رسید کو پیش کرنے کا مقصد کیا ہے؟"

"جناب عالی! یہ رسید جعلی ہے۔" میں نے انکشاف انگیز لہجے میں کہا۔

"جعلی رسید...... کیا مطلب ہے آپ کا؟" جج کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

"جناب عالی!" میں نے بڑے بھرپور انداز میں وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "اجمل شاہ نے ابھی جن وکیل صاحب کا ذکر کیا ہے وہ شوکت علی کا کیس لڑرہے ہیں۔ میری ان سے تفصیلی ملاقات ہوچکی ہے۔ جاوید صادق ایک جونیئر وکیل ہیں اور ان کی فیس پچاس ہزار ہو ہی نہیں سکتی جبکہ یہ رسید پچاس ہزار کی ہے۔ جاوید صادق پچاس ہزار فیس کی

وصولی سے انکاری ہیں اور ان کا دعویٰ ہے کہ شاہ جی نے نقلی رسید بک چھپوا کر یہ رسید تیار کی ہے اور جاوید صادق کے نقلی دستخط بھی کیے ہیں۔ جاوید صادق اس ضمن میں شاہ جی پر کیس کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔"

رسید کو دیکھ کر اور...... اس کے حوالے سے میری بیان کردہ تفصیل کو سن کر اجمل شاہ کی سٹی گم ہوگئی۔ وہ ہاتھ کی پشت سے پیشانی پر نمودار ہونے والے پسینے کو پونچھتے ہوئے جلدی سے بولا۔

"جناب عالی! اگر عدالت کی نظر میں، میں نے یاسمین والے فلیٹ کا سودا قانونی تقاضوں کے مطابق نہیں کیا تو میں اس فلیٹ کے حصول پر اصرار نہیں کروں گا۔ بس، میرے تین لاکھ مجھے واپس کر دیے جائیں۔"

"تین لاکھ تو اب تمہیں جیل کی سنگلاخ دیواروں کے پیچھے پہنچنے کے بعد خواب و خیال ہی میں ملیں گے۔" میں نے اجمل شاہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے زہر خند لہجے میں کہا۔ "تم نے دو افراد جاوید صادق اور یاسمین کے ساتھ کھلم کھلا فراڈ کیا ہے۔ اس سلسلے میں تمہیں کم از کم سات سال تک جیل کی ہوا کھانا پڑے گی۔"

وکیلِ صفائی نے اس موقع پر اپنے موکل کی مدد کرنا چاہی۔ "جناب عالی! یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ جاوید صادق نے انکم ٹیکس کے جھمیلے کی وجہ سے اس رسید کی صحت سے انکار کیا ہو۔"

"مطلب؟" میں نے وکیلِ صفائی کو آڑے ہاتھوں لیا۔

"مطلب یہ کہ......" وہ لنگڑی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "وکیل صاحب نے پچاس ہزار روپے وصول کر کے رسید تو جاری کر دی ہو اور اب اسی خیال سے انکار کر رہے ہوں کہ کہیں انکم ٹیکس والے ان کے پیچھے نہ پڑ جائیں......"

"آپ بھی الٹی گنگا بہانے کی کوشش کر رہے ہیں میرے فاضل دوست۔" میں نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔ "انکم ٹیکس والوں سے اپنی آمدنی چھپانے کے لیے کم رقم کی رسید تو دی جاسکتی ہے لیکن رسید جاری کرنے کے بعد اس کی صحت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ کم از کم قانون کے شعبے سے تعلق رکھنے والا کوئی شخص تو ایسی سنگین غلطی کر ہی نہیں سکتا۔"

"اجمل شاہ! آپ اس رسید کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟" جج نے گھور کر شاہ جی کی طرف دیکھا۔ "کیا آپ کو یقین ہے کہ یہ رسید جاوید صادق نامی وکیل ہی نے جاری کی ہے؟"

"جناب! میں تو یہ معاملہ ہی ختم کرنا چاہتا ہوں......"

"معاملہ ختم کرنے کا اختیار آپ کو حاصل نہیں ہے۔" جج نے ناگواری سے کہا پھر مجھ سے پوچھا۔ "بیگ صاحب! آپ جاوید صادق کو اس معاملے کی تصدیق کے لیے عدالت میں بلا سکتے ہیں؟"

"جناب عالی! وکیل صاحب اس وقت عدالت سے باہر راہداری میں موجود ہیں۔"

آئندہ دس منٹ کے اندر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہوگیا۔ جاوید صادق نے کٹہرے میں کھڑے ہو کر اجمل شاہ کا کچا چٹھا کھول دیا۔ بہت سی دیگر باتوں کے علاوہ یہ انکشاف بھی ہوا کہ جاوید صادق کی فیس پچیس ہزار طے ہوئی تھی مگر اجمل شاہ نے اسے محض دس ہزار ادا کیے تھے اور پندرہ ہزار ادھار کر لیے تھے جو ابھی تک ادھار ہی تھے۔ جاوید صادق کا بیان مکمل ہوا تو میں نے کراری آواز میں کہا۔

"جناب عالی! اجمل شاہ کی دھوکا دہی صرف اس جعلی رسید تک ہی محدود نہیں بلکہ اس شخص نے متعدد مقامات پر دروغ گوئی کا سہارا لے کر یاسمین کو بے وقوف بنانے کی کوشش کی ہے۔ ایک طرف یہ نہایت چالاکی کے ساتھ یاسمین سے اس کے شوہر کے کیس کے سلسلے میں چھوٹی بڑی رقمیں وصول کرتا رہا اور دوسری جانب اسی مجبور اور بے بس عورت کو تین لاکھ کا مقروض بھی بنا دیا پھر اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان لوگوں کا فلیٹ بھی ہتھیانے کی کوشش کر ڈالی......" لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"میں معزز عدالت سے استدعا کرتا ہوں کہ سنگین دھوکا دہی کے ضمن میں اجمل شاہ کو قرار واقعی سزا ملنا چاہیے...... دیٹس آل!"

میرے جاندار اور ٹھوس دلائل نے اجمل شاہ کے مذموم کردار کو بڑی وضاحت کے ساتھ عدالت کے سامنے پیش کر دیا تھا۔ وکیلِ صفائی نے اس صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے اپنے موکل کی حمایت میں کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا۔ اس پر یہ حقیقت واضح ہو چکی تھی کہ اس کے موکل نے صریحاً فراڈ کیا ہے۔

جج نے تمام حالات و واقعات کی روشنی میں یاسمین اور شوکت علی کے حق میں فیصلہ سنا دیا۔ اس طرح یہ خاندان اجمل شاہ جیسے بدطینت شخص کے شر سے ہمیشہ کے لیے محفوظ ہوگیا۔

(تحریر: حسام بٹ)

سخت سردی پڑ رہی تھی۔ اس بوڑھی عورت نے اپنے کان کنٹوپ سے ڈھانپے ہوئے تھے۔ وہ گھسٹتی ہوئی چال کے ساتھ اس پولیس کار کے پاس سے گزر رہی تھی جو وہاں پارک تھی اور اس کی روشنیاں فلیش کر رہی تھیں۔
اس بوڑھی عورت نے اپنے شکستہ سے اونی کوٹ کی جیب میں سے چند ٹشو نکال کر اپنے منہ میں رکھے اور انہیں چبانے لگی۔ وہ تماشائیوں کے درمیان سے اپنی ہاتھ گاڑی دھکیلتے ہوئے آگے بڑھنے لگی۔ حسبِ معمول کسی نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی۔
"کیا کسی نے دیکھا کہ کیا واقعہ پیش آیا تھا؟" ایک پولیس

چلتر

سلیم انور

بعض اوقات پیاز کے مانند عورت کی شخصیت تہ در تہ اتنی نفاست سے چھپی ہوتی ہے کہ کسی کو اصلیت کا احساس تک نہیں ہوتا... ایسی شخصیت کو اکثر عقلمند چلتر کا نام دیتے ہیں... اس کا کارنامہ دیکھ کر اسے بھی چلتر کا نام دیا جائے تو کچھ غلط نہ ہوگا۔

فقط ایک دولت کی خاطر ہزاروں روپ بدلنے والوں کا قصہ

افسر نے سوال کیا۔ اس کی توجہ کا مرکز کوئی خاص فرد نہیں تھا۔
کچھ لوگوں نے نفی میں سر ہلا دیے۔ کچھ اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ چند ایک نے اپنی اپنی ناک سکیڑ لی۔ پولیس افسر کا ساتھی ایک بھکاری سے سوالات کر رہا تھا جو ایک دیوار کا سہارا لیے کھڑا تھا۔ پولیس افسر نے اپنے ساتھی کی بات کاٹتے ہوئے اسے اپنی جانب متوجہ کیا۔ ''ذرا تصور کرو۔'' اس نے کہا۔ ''کسی نے کچھ نہیں دیکھا...... کسی نے کچھ نہیں سنا...... سب کے سب اندھے، گونگے، بہرے بنے ہوئے ہیں۔''

''دکان کے مالک نے بھی کچھ نہیں دیکھا!'' پولیس افسر کے ساتھی نے کہا۔ ''اس کا کہنا ہے کہ جب وہ دکان کے اسٹور روم میں تھا تو اس کے خیال کے مطابق اس نے کوئی آواز سنی۔ جب وہ باہر دکان میں آیا تو دیکھا کہ تمام رقم غائب تھی۔''

جب وہ بوڑھی عورت مجمع کے کنارے پہنچی تو پولیس افسر عین اسی لمحے گھوم گیا۔ اس کی نظر بے ساختہ بوڑھی عورت پر پڑی تو وہ پکارا تھا۔ ''ہے، لیڈی! وہیں رک جاؤ۔''
بوڑھی عورت رک گئی اور آواز کی سمت پلٹتے ہوئے بولی۔ ''کیا میں رفتار کی حد سے تیز گزر رہی تھی، آفیسر؟''
پولیس افسر کا منہ بن گیا۔ ''نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ کیا تم نے دیکھا کہ یہاں کیا ہوا تھا؟'' اس نے نرم لہجے میں پوچھا۔

''مجھے اس بارے میں کچھ یقین نہیں، آفیسر......؟''

''راڈرگز۔'' پولیس افسر نے اپنا نام بتاتے ہوئے کہا۔ ''کسی نے اس اسٹور سے رقم لوٹی ہے۔ کیا تم نے کسی کو اسٹور سے نکل کر بھاگتے ہوئے دیکھا ہے؟ یا کسی کی حرکات وسکنات عجیب سی لگی ہوں؟''

''یہاں پر تو سب ہی کی حرکات وسکنات عجیب سی ہوتی ہیں، آفیسر۔'' اس بوڑھی خاتون نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر ان لوگوں کی طرف دیکھنے لگی جو وہاں تھے...... تین خانہ بدوش آدمی ایک گھر کے دروازے کی آڑ میں پناہ لیے ہوئے تھے اور کوشش کر رہے تھے کہ دکھائی نہ دیں۔ دو بدقماش عورتیں خود کو سردی سے بچانے کے لیے اچھل کود کر رہی تھیں۔ مختلف قومیت کے پانچ بچے ایک طرف سہمے ہوئے کھڑے تھے۔ قریب ہی موجود...... درخت پر ایک تیتر بیٹھا ہوا آوازیں نکال رہا تھا۔
''نہیں آفیسر! میں نے کسی کو بھی اسٹور سے نکل کر بھاگتے ہوئے نہیں دیکھا۔'' بوڑھی عورت نے کہا۔

''اسٹور کے مالک مسٹر الواریز تو خیریت سے ہیں نا؟ وہ نہایت عمدہ شخص ہیں۔ مجھے ہمیشہ اپنا باتھ روم استعمال کرنے کی اجازت دے دیتے ہیں۔''
پولیس افسر یہ سن کر قدرے جھینپ سا گیا۔
''سر! ہمیں چلنا ہوگا۔'' اس کے ساتھی نے پولیس پٹرول کار کی جانب ہاتھ لہراتے ہوئے کہا۔ ''ہمارے لیے ایک اور کال آگئی ہے۔''

''سوری، میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکی، آفیسر راڈرگز!'' بوڑھی عورت نے ان کے پیچھے چیختے ہوئے کہا۔ ''اگلی مرتبہ میں زیادہ دھیان دوں گی۔''
بوڑھی عورت تیزی سے فرینکلن کی جانب جاتی ہوئی پولیس کار کو دیکھتی رہی۔ پھر جب وہ کار نظروں سے اوجھل ہوگئی تو وہ پلٹ گئی۔
مجمع پولیس کار کے جانے کے بعد چھٹ چکا تھا۔
وہ بوڑھی عورت اپنی ہاتھ گاڑی دھکیلتے ہوئے آہستہ قدموں سے گلی کے کونے تک آگئی۔ اس نے وہاں رک کر اطراف کا جائزہ لیا کہ کہیں کوئی اسے دیکھ تو نہیں رہا۔ پھر وہ اپنی ہاتھ گاڑی اندھیرے میں ایک کوڑے دان کی آڑ میں لے آئی۔
اس نے اپنا شکستہ اونی کوٹ اتارتے ہوئے ایک اچٹتی نگاہ سڑک کی جانب ڈالی۔ پھر وہ کوٹ ہاتھ گاڑی میں رکھ دیا۔ ساتھ ہی کنٹوپ بھی اتار دیا۔ پھر سر پر سے سفید بالوں کی وگ، لیٹیکس ماسک اور بدرنگ نیلا ڈریس بھی اتار دیا۔ اس کی جگہ اس نے مصنوعی فر کا کوٹ پہن لیا اور اپنے سرخی مائل بھورے بالوں کو درست کرنے لگی۔ اس نے اپنے نرم تلے کے جوتوں کی جگہ تین انچ اونچی ہیل کے سرخ رنگ کے سینڈل پہن لیے۔ پھر اپنے چمڑے کے منی ڈریس کی شکنیں درست کرنے لگی۔
اس نے اپنے چمڑے کے پرس میں سے ایک دستی آئینہ نکالا اور اس میں اپنے عکس کا جائزہ لیتے ہوئے چہرے پر سے لیٹیکس کے بقیہ ٹکڑے نوچنے لگی۔ پھر اس نے اپنا میک اپ درست کیا اور آئینہ دوبارہ پرس میں رکھ لیا۔ اب وہ ایک عام سی ملازمت پیشہ لڑکی دکھائی دے رہی تھی۔
باقی تمام فالتو چیزیں اس نے ہاتھ گاڑی میں وہیں چھوڑ دیں۔ پھر پرس کھول کر اس میں اسٹور سے لوٹی ہوئی رقم کی موجودگی کا اطمینان کرنے کے بعد پرس اپنے شانے پر لٹکا لیا اور سیٹی بجاتی ہوئی گلی سے نکل کر سڑک پر چلتے پھرتے لوگوں کی بھیڑ میں شامل ہوگئی۔

روٹیاں

منظر امام

بھوکے پیٹ آنکھوں میں خواب نہیں بلکہ... خوابوں کی جگہ حسرتیں جگہ بناتی ہیں... گیہوں کے دانے نے آدم کو جنت سے نکلوا دیا اور زمین پر اس روٹی نے انسان کو انسانیت سے گرادیا۔ اس روٹی کے آگے ہر احساس، ہر رشتہ اپنی اہمیت کھو دیتا ہے جیسے کہ یہاں... ان ننھے ننھے ہاتھوں میں کھلونے ہونے چاہیے تھے مگر تقدیر نے آٹے دال کے گھن چکر میں ایسا جکڑا کہ سانس کا پنچھی ہی ساتھ چھوڑ گیا۔

اپنوں کے ہاتھوں اپنوں کی ناقدری کا عبرت اثر ماجرا

کوئی بہت ہی باذوق قسم کا فقیر تھا جو نظیر اکبر آبادی کی نظم کا ایک حصہ بہت ہی خوب صورت ترنم میں گاتا ہوا گزرا تھا۔ ”دیوانہ آدمی کو بناتی ہیں روٹیاں۔ خود ناچتی ہیں سب کو نچاتی ہیں روٹیاں۔“

اور اس فقیر سے کچھ فاصلے پر ایک ہوٹل تھا جس کے تنور کی روٹیاں بہت مشہور تھیں۔ کئی آدمی روٹیوں کے لیے لائن [illegible] تھے۔ ”دو روٹیاں۔ چھ روٹیاں۔ مجھے بارہ روٹیاں دے دینا۔“

پچاس روٹیاں...... پچاس روٹیاں مانگنے والا ایک کھاتا پیتا آدمی دکھائی دے رہا تھا جس کی گاڑی ہوٹل کے پاس کھڑی تھی۔ شاید اس کے گھر میں کوئی تقریب ہوگی اس لیے اس نے پچاس روٹیوں کا آرڈر دیا تھا۔

ایک بچہ اس کے پاس آکر کھڑا ہوگیا۔ دس گیارہ برس کا ہوگا جس کے کپڑے بوسیدہ ہورہے تھے اور جس کی نہ صرف

آنکھوں میں بھوک تھی بلکہ پورے وجود میں بھوک تھی۔ اس نے پچاس روٹیوں والے کا دامن تھام لیا۔

"کیا ہے؟" اس آدمی نے اسے جھڑک دیا۔ "ہاتھ ہٹاؤ۔"

"دو روٹیاں دلا دو۔ صبح سے کچھ نہیں کھایا ہے۔" بچہ گڑگڑا کر بولا۔

"ہٹو یہاں سے۔ تم لوگوں نے تنگ کر کے رکھا ہوا ہے۔"

بچہ جھڑکیاں کھا کر ایک طرف ہٹ گیا۔ دوسرے لوگ بے نیازی سے کھڑے رہے۔ سب کے لیے یہ روز کا معمول تھا۔ ہر دن اس قسم کے مناظر دیکھنے کو ملتے تھے۔ اس لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔

برابر میں کھڑے ہوئے ایک اور آدمی نے بھی پچاس روٹیوں والے کی تائید کی۔ "ہاں صاحب! ہر طرف بھکاری ہی بھکاری ہو گئے ہیں۔ نہ جانے کہاں سے چلے آتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے پوری قوم بھکاری ہو گئی ہے۔"

روٹیاں مانگنے والا بچہ آہستہ آہستہ ایک طرف چل پڑا۔ اس کے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے۔ اس کی حالت بتا رہی تھی کہ اس نے صبح سے کچھ نہیں کھایا ہوگا۔ دور سے فقیر کے گانے کی آواز آ رہی تھی۔ "دیوانہ آدمی کو بناتی ہیں روٹیاں۔"

"اے چھوٹے۔" کسی نے اس بچے کو آواز دی۔ آواز دینے والے کے ہاتھ میں چار پانچ روٹیاں تھیں اور ایک شاپر میں دال بھری ہوئی تھی۔ وہ بھی زیادہ عمر کا نہیں تھا۔ بارہ تیرہ برس کا ہوگا۔

یہ بچہ جلدی سے اس کے پاس پہنچ گیا۔ اس کی نگاہیں روٹیوں پر جمی ہوئی تھیں۔

"کیا ہوا، کچھ نہیں ملا؟" آواز دینے والے نے پوچھا۔

"نہیں یار، صبح سے کچھ نہیں ملا۔"

"چل کہیں بیٹھ کر کھاتے ہیں۔" آواز دینے والے نے کہا۔ "میں روٹیاں اور دال لے آیا ہوں۔"

دونوں ایک طرف چل دیے۔ ان دونوں سے کچھ فاصلے پر ایک بائیک کھڑی ہوئی تھی۔ ایک طرح دار سی عورت اس بائیک کے پاس کھڑی ہوئی اس مرد کا انتظار کر رہی تھی جو روٹیاں لینے کے لیے سامنے والے ہوٹل میں گیا ہوا تھا۔

اس عورت نے بہت ہی بے ڈھنگے پن سے میک اپ کر رکھا تھا۔ ہونٹوں پر گہری سرخی لگی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں عجیب قسم کی بے چینی تھی۔

مرد کچھ دیر میں روٹیوں کا شاپر لے کر اس کے پاس آ گیا۔ "چلو جانِ من...... روٹیاں لے آیا ہوں۔"

"گھر میں سالن رکھا ہوا ہے۔" عورت نے بتایا۔

"ہاں اسی لیے میں نے سالن نہیں لیا۔" مرد نے بائیک اسٹارٹ کر دی تھی۔

دونوں ایک طرف روانہ ہو گئے۔ وہ ایک خستہ حال سی بلڈنگ کے ایک خستہ حال سے فلیٹ میں داخل ہوئے تھے۔ وہ فلیٹ شاید اسی عورت کا تھا۔ اس نے اپنے بیگ سے چابی نکال کر دروازہ کھولا تھا۔ اس چھوٹے سے گھٹے ہوئے فلیٹ کا فرنیچر بھی بہت خستہ تھا۔ یہاں سورج کی روشنی نہیں آتی تھی۔ عورت نے کمرے کا بلب جلا دیا تھا۔ کمرے میں ایک بڑی سی مسہری کے علاوہ ایک سنگار دان اور دو کرسیاں تھیں۔ ایک طرف ایک الماری بھی تھی جس کے پٹ کھلے ہوئے تھے اور بہت بے ترتیبی سے ٹھنسے ہوئے کپڑے دکھائی دے رہے تھے۔

مرد بہت بے تکلفی سے مسہری پر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے جوتے اتارنے شروع کر دیے پھر جیسے اسے کچھ یاد آ گیا۔ اس نے عورت سے پوچھا۔ "تم نے بتایا تھا کہ تم انٹر کر چکی ہو۔"

"ہاں۔ یہ تو بہت پرانی بات ہو گئی ہے۔" عورت نے جواب دیا۔

"میں اپنی فیکٹری میں تمہارے لیے نوکری کی بات کروں؟" اس نے پوچھا۔

"ارے نہیں۔" عورت نے انکار میں گردن ہلا دی۔ "کیا فائدہ؟ مہینے بھر محنت کرتے رہو۔ آخر میں چند سو روپے ہاتھ پر رکھ دیتے ہیں۔"

"اس کام سے تو اچھا ہے نا۔"

"خاک اچھا ہے۔ تم جیسے چار پانچ مہربان مہینے میں آ جاتے ہیں۔ میری روزی روٹی آسانی سے چل جاتی ہے۔"

مرد ہنس پڑا۔ اس کی ہنسی کی آواز اس کمرے سے باہر کوریڈور تک پھیل گئی۔ کوریڈور کے اختتام پر ایک تنگ سا زینہ تھا۔ اس زینے سے اترنے کے بعد ایک چھوٹی سڑک آتی تھی۔ وہ سڑک آگے جا کر ایک بڑی سڑک سے مل جاتی تھی۔

اس وقت اس بڑی سڑک پر ایک قیمتی گاڑی گزر رہی تھی۔ آگے ایک ڈرائیور بیٹھا تھا۔ پچھلی سیٹ پر ایک موٹا آدمی تھا۔ اس آدمی کا لباس بہت قیمتی تھا۔ اس کے گلے میں سونے کی چین تھی اور کلائی پر ایک بہت قیمتی گھڑی بندھی ہوئی تھی۔

گاڑی سفر کرتی ہوئی کسی دفتر کی شاندار سی بلڈنگ کے پاس آ کر رک گئی۔ وہ آدمی ایک شان کے ساتھ گاڑی سے اترا اور دفتر کی طرف چل دیا۔ دروازے پر کھڑے ہوئے گارڈ نے مستعدی سے اسے سیلیوٹ کرتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔

اندر ایک ہال تھا۔ بہت سے مرد، عورتیں اور لڑکیاں سب اپنی اپنی ڈیسک پر کام کر رہے تھے۔ سب اسے دیکھ کر الرٹ

ہو گئے تھے۔ وہ اشارے سے سلام کے جواب دیتا ہوا اپنے شاندار سے کمرے میں داخل ہو گیا۔ یہاں ایک آدمی پہلے سے اس کے انتظار میں تھا۔ وہ آدمی بھی اسی کی حیثیت کا معلوم ہوتا تھا بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ۔ اس لیے وہ آنے والے کو دیکھ کر کھڑا نہیں ہوا تھا بلکہ خود آنے والا اسے اپنے دفتر میں بیٹھے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ''ارے سیٹھ صاحب! آپ کب آئے؟''

''ابھی آیا ہوں۔ تم نہیں تھے۔ میں نے سوچا پانچ دس منٹ انتظار کرلوں۔''

''بڑی مہربانی سیٹھ۔ مجھے بتایا ہوتا، میں خود آجاتا۔''

''نہیں، اتنا وقت نہیں تھا۔ میں تم سے وہی دو لاکھ ٹن گندم کے سودے کی بات کرنے آیا ہوں۔''

''سیٹھ! آپ جو دام لگا رہے ہو نا، اس میں بہت کم بچ رہا ہے۔ آخر میرے بھی بچے ہیں سیٹھ۔ ان کو بھی روٹیاں کھانی ہیں۔''

''کتنی روٹیاں کھاؤ گے۔ پورے ساڑھے چھ کروڑ مل رہے ہیں تم کو۔''

آنے والا ڈھٹائی اور شرمندگی سے ہنس پڑا۔

اس کمرے سے باہر ہال کے کیبن میں ہر آدمی کمپیوٹر پر کسی نہ کسی حساب کتاب میں مصروف تھا۔ ایک کیبن میں ایک لڑکی دوسرے کو بتا رہی تھی۔ ''یار! آج میں جلدی چلی جاؤں گی۔''

''وہ کیوں؟''

''امی کے دانت بنوانے ہیں۔ بے چاری نے کئی دنوں سے روٹی نہیں کھائی۔''

اسی دفتر کی بلڈنگ کے نیچے سڑک پر ایک طرف ایک کچرا کنڈی تھی۔ اس کچرا کنڈی پر دو کتے ایک روٹی کے لیے ایک دوسرے پر غرا رہے تھے۔ دونوں کی یہی کوشش تھی کہ وہ سامنے پڑی ہوئی روٹی کو پہلے جھپٹ لیں اور اس کچرا کنڈی سے ملحق جو شاندار رہائشی عمارت تھی، وہاں کچھ اور ہی ہو رہا تھا۔

نبیلہ نام تھا اس لڑکی کا جو اس گھر میں بہو بن کر آئی تھی۔ نبیلہ کا تعلق خود بھی ایک امیر گھرانے سے تھا۔ لہٰذا اس کی شادی بھی ایک امیر گھرانے میں ہوئی تھی۔ شادی کو تین چار مہینے ہو چکے تھے۔ ان تین چار مہینوں میں اس گھر کے کسی فرد کو فرصت ہی نہیں مل سکی تھی۔ روزانہ کہیں نہ کہیں دعوت، تقریب، سیر، شاپنگ اور نہ جانے کیا کیا۔ انہیں گھر میں کچھ کھانے کا موقع ہی نہیں ملتا تھا۔ سوائے بریک فاسٹ کے۔ گھر میں دو دو کک تھے۔ وہ بھی ان تین چار مہینوں سے عیش کر رہے تھے۔

آج جب سب گھر والے تھوڑی فراغت سے بیٹھے تو نبیلہ نے ایک آفر کر دی۔ ''آنٹی! آج روٹیاں میں بناؤں گی۔''

''تم کیوں بناؤ گی؟ گھر میں دو دو کک ہیں۔''

''وہ تو ٹھیک ہے آنٹی لیکن میں نے سنا ہے کہ بہت سے گھروں میں جب بہو جاتی ہے تو اس سے جب پہلی بار کچن کا کام لیا جاتا ہے تو پھر ایک پارٹی ڈیو ہو جاتی ہے۔''

''تمہیں روٹیاں بنانی آتی ہیں؟'' نبیلہ کے شوہر نے حیرت سے پوچھا۔

''کم از کم ٹرائی تو کر سکتی ہوں نا۔''

اور جب نبیلہ کی ٹرائی سامنے آئی تو سب ہنس ہنس کر بے حال ہو گئے تھے۔ روٹیوں کی شکلیں بہت عجیب سی تھیں۔ نوکیلے کناروں والی، بے ڈھنگی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی بچے نے روٹیاں بنائی ہوں۔

''کوئی بات نہیں۔'' نبیلہ کے سسر نے پانچ ہزار کا ایک نوٹ نبیلہ کی طرف بڑھا دیا۔ ''یہ لو اپنا انعام۔''

''کیسا انعام ابو۔'' نبیلہ نے شرمندہ ہو کر کہا۔ ''روٹیاں تو اتنی بے ڈھنگی بنی ہیں۔''

''تو کیا ہوا۔ ہمارے لیے تو یہی بہت ہے کہ تم نے کوشش کی ہے۔''

اور اس گھر سے بہت فاصلے پر ایک بہت معمولی سے گھر میں دس گیارہ برس کی ایک بچی اپنے باپ اور بھائی کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑی تھی۔

''نہیں بابا! مجھے نہیں مارو۔ مجھ سے گول روٹیاں نہیں بنتیں۔''

''کیوں نہیں بنتیں۔'' بھائی نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا ڈنڈا اس کی ننھی سی نازک سی کمر پر رسید کر دیا۔

''نہیں بھائی، مت مارو۔'' اس نے بھائی کے پاؤں پکڑ لیے۔ وہ بری طرح رو رہی تھی۔

اسی وقت باپ نے بھی ایک ڈنڈا اس کے سر پر دے مارا۔ اس بار وہ تڑپ کر رہ گئی تھی۔ اس نے آواز نکالی۔ ''ہائے بابا۔''

پھر وہ زمین پر گر کر جھٹکے لینے لگی۔ اس کا باپ اور اس کا بھائی اس کے پاس کھڑے ہوئے اسے دیکھتے رہے۔

دو چار جھٹکوں کے بعد اس نے تڑپنا بند کر دیا تھا۔ وہ سو چکی تھی۔ اس کی نرم انگلیوں کے درمیان وہ روٹی دبی ہوئی تھی جو وہ اپنے باپ اور بھائی کے لیے پکا کر لائی تھی۔

(یہ کوئی کہانی نہیں ہے۔ ایسا واقعہ پچھلے ہی دنوں ہمارے ملک میں ہو چکا ہے) جس وقت وہ ننھی سی جان روٹی گول نہ بنا سکنے کے سنگین جرم کی سزا پا کر دم توڑ رہی تھی، اس وقت وہی فقیر نظیر اکبرآبادی کو گاتا ہوا گزر رہا تھا۔ ''دیوانہ آدمی کو بناتی ہیں روٹیاں۔ خود ناچتی ہیں، سب کو نچاتی ہیں روٹیاں۔''

محفلِ شعر و سخن

❁ جنید احمد ملک.....گلستان جوہر، کراچی

کوئی نہ اپنا ساتھی ہو تو سنگت کس سے ہم جوڑیں
چاروں سمت ہو ویرانی تو راہ کو اپنی کیا موڑیں

❁ ظفر اقبال ظفر.....کامرہ شرقی

یہ چاہتیں یہ پذیرائیاں بھی جھوٹی ہیں
یہ عمر بھر کی شناسائیاں بھی جھوٹی ہیں
تمام الفاظ ومعانی بھی جھوٹ ہیں امجد
ہمارے وقت کی سچائیاں بھی جھوٹی ہیں

❁ انعم کمال.....کراچی

وہ خوش جمال کتنا، رہتا تھا بدگماں سا
باتوں میں کچھ جلن سی، آنکھوں میں کچھ دھواں سا

❁ محمد کمال انور.....اورنگی ٹاؤن، کراچی

فصلِ گرما میں جو ہوتی ہے مسافت درپیش
سر پہ جب دھوپ کی چادر سی تنی ہوتی ہے
راہ کے پیڑ محبت سے بلاتے ہیں مجھے
بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے

❁ ایم عمران قاسم.....سمبل، تحصیل کلر سیداں

میں تو سینے میں لیے بیٹھا ہوں طوفانوں کو
تو میرے دل کے دھڑکنے کا گلہ کرتا ہے؟

❁ محمد خواجہ.....کورنگی، کراچی

تری اس بے وفائی پر فدا ہوتی ہے جاں اپنی
خدا جانے اگر تجھ میں وفا ہوتی تو کیا ہوتا

❁ رانا حبیب الرحمٰن.....سینٹرل جیل لاہور

میں نے کب دعویٰ کیا تھا سربسر باقی ہوں میں
پیش خدمت ہوں تمہارے جس قدر باقی ہوں میں

❁ انور علی.....جیکب آباد

شام تک شام ہی سی رہتی ہے
صبح آتی ہے پر نہیں آتی
بڑھ گیا شہر میں دھواں اتنا
کوئی صورت نظر نہیں آتی

❁ ہادیہ ایمان، ماہا ایمان.....ہارون آباد

ٹوٹا طلسم عہدِ محبت کچھ اس طرح
پھر آرزو کی شمع فروزاں نہ کرسکے

❁ رعنا رضوی.....یو کے

بلند محلوں کو ہوتی ہے آرزو نے چراغ
یہ جھونپڑے ہیں یہاں دل جلائے جاتے ہیں

❁ عاصم خان.....کراچی

ترس رہی ہے توازن کو زندگی اپنی
کسی طرح کا میسر ہمیں قرار نہیں
ابھی درخت بہت کم ہیں اپنے گلشن میں
ابھی حیات کا ماحول سازگار نہیں

❁ رمضان پاشا.....گلشن اقبال، کراچی

جاگ اٹھا ہے اگر سارا جہاں تو کیا ہوا
تم مزے سے اے میرے اہلِ وطن سوتے رہو

❁ سعید عباسی..... بہاولپور
جانے کس راہ سے آجائے وہ آنے والا
میں نے ہر سمت سے دیوار گرا رکھی ہے

❁ مدثر علی..... لاہور
ایک گریہ سنائی دیتا ہے
سارے دریاؤں کی روانی میں
آدمی نے وہ زہر گھولا ہے
مچھلیاں مر رہی ہیں پانی میں

❁ زوہیب احمد ملک..... گلستان جوہر، کراچی
ہم اپنی بے قرینہ کاوشوں سے
خود اپنی رہ میں حائل ہوگئے ہیں
ہمیں قدرت نے بخشے جو وسائل
مسائل در مسائل ہوگئے ہیں

❁ وحید عباسی..... بہاولپور
ملتے ہیں غم بھی نصیب والوں کو
ہر اک کے ہاتھ یہ خزانے کہاں لگتے ہیں

❁ سید محمود علی..... حیدر آباد
کتنے رنگ چھپے ہیں اس میں
یہ جو ننھی سی کونپل ہے
دیکھو نا اک بیج کے اندر
سانسیں لیتا اک جنگل ہے

❁ جبران احمد ملک..... گلشن اقبال، کراچی
پرہول، اضطراب فزا، پرخطر دھواں
پھیلا ہوا ہے چارسو وحشت اثر دھواں
درپیش نخلِ جاں کو ہیں کتنی اذیتیں
اتنی کثافت! اتنا غبار! اس قدر دھواں!

❁ نوید عباسی..... بہاولپور
آنکھوں کی ضمانت بھی جہاں کام نہ آئی
وہ شخص لفظوں کا یقیں کہاں کرے گا

❁ آمنہ رشید سیال..... روہڑی ضلع سکھر
ٹوٹ بھی جائے دل تو محبت نہیں مٹتی
اس راہ میں مٹ کر بھی خسارہ نہیں ہوتا

❁ عتیق الرحمن..... فیصل آباد، سمندری
وہ جن کو دیکھ کر دل میں خدا کی یاد آئے
ہم ان بتوں کا بڑا احترام کرتے ہیں

❁ سید عبادت کاظمی..... ڈیرہ اسماعیل خان
پتھر بنا دیا مجھے رونے نہیں دیا
دامن بھی تیرے غم نے بھگونے نہیں دیا
دل کو تمہاری یاد کے آنسو عزیز تھے
کوئی بھی اور درد سمونے نہیں دیا

❁ امتیاز احمد..... شاہ فیصل کالونی، کراچی
اس وطن کے واسطے دی جتنی قربانی نہ پوچھ
چشم گردوں کی نگر یہ فتنہ سامانی نہ پوچھ
بزمِ خوباں سے چلے آئے لیکن اب تلک
کس قدر ہم نے اٹھائی ہے پریشانی نہ پوچھ

❁ ناہید یوسف..... اسلام آباد
رنگِ شباب نے تمہیں رشکِ بہار کر دیا
شوخیِ طبع یوں بڑھی ظلم شعار کردیا
وصل کی شب گزر گئی ناز و ادا ہی دیکھتے
نقد جو جنس تھی اسے اس نے ادھار کردیا

❁ ادریس احمد خان..... ناظم آباد، کراچی
تمام عمر جسے ہم نے زندگی سمجھا
ملال یہ ہے کہ اس نے اجنبی سمجھا

❁ زرین آفریدی..... پٹھان کالونی، حیدر آباد
آج الفاظ نہیں مل رہے صاحب
درد لکھ دیا ہے محسوس کیجیے گا

❁ عروہ، عالیہ..... حیدر آباد
کوئی آنچ نہ آئے تیری خوشیوں پر کبھی
تو محفوظ رہے سیپ میں بند موتی کی طرح

❁ اطہر حسین..... کراچی
زلف مہکی ہوئی، رنگت ہے گلابوں کی طرح
ہیں ادائیں بھی وہی شوخ شبابوں کی طرح
ہیں عجب تیری ادائیں بھی، جفائیں بھی عجب
جامِ خوش رنگ مگر تلخ شرابوں کی طرح

❁ محمد شہباز اکرم نوئی..... ڈھپئی، پاک پتن شریف
وہ سامنے ہوئے تو عجب سانحہ ہوا دلنشیں
ہر حرفِ شکایت نے خودکشی کرلی

❁ ماہین فاطمہ..... اوکاڑہ
میں نازک برف کا ایک ٹکڑا، وہ رکھ کر بھول گیا مجھ کو
میں قطرہ قطرہ پگھل رہا ہوں، وہ میری اذیت کیا جانے!

❄ اشفاق شاہین......کراچی
سرِ مقتل بھی ترے نام کے چرچے ہوتے
تو نے پوچھی ہی نہیں آخری خواہش میری!

❄ ملائکہ حریم......اوکاڑہ
اس کا غرور میری لگن کے سبب تو نہیں
وہ خود بھی جانتا ہے کہ بے حد حسین ہے

❄ داؤد اشفاق......اوکاڑہ
نہ آپ یوسفؑ ہیں، نہ میں مصر کا کوئی تاجر
اپنی اس بے رخی کے دام، ذرا کم کیجیے!

❄ مصباح کشور......فیصل آباد، سمندری
کانٹوں پہ گزار دیتا ہے گلاب اپنی ساری زندگی
کون کہتا ہے کہ پھولوں کو کوئی غم نہیں ہوتا

❄ محمد قدرت اللہ نیازی......حکیم ٹاؤن، خانیوال
آؤ کچھ دیر تذکرہ کر لیں
ان دنوں کا جب آپ ہمارے تھے

❄ مسٹر اینڈ مسز محمد صفدر معاویہ......خانیوال
محبت اک ڈھونگ ہے گویا
ہر کوئی رچائے پھرتا ہے

❄ مرحا گل، رمنا گل......ورابن کلاں
چاند سا جب کہا تو کہنے لگے
چاند کہیے نا! چاند سا کیا ہے؟

❄ عمران عارف......فیصل آباد، سمندری
اب وہ مجھ سے میری ہر بات کے معنی پوچھے
جو میری سوچ کی تحریر لکھا کرتا تھا

❄ مہتاب احمد......حیدر آباد
انتہا کوئی نہیں ہے انتلاء ہونے کے بعد
عشق کیا ہے جان لوگے مبتلا ہونے کے بعد

❄ احمد حسن عرضی خان......قبولہ شریف
کوئی تعویذ دو ردِ بلا کا
میرے پیچھے محبت پڑ گئی ہے

❄ محمد علی......راولپنڈی
کون پانی کو اڑاتا ہے ہوا کے دوش پر
کس نے بخشی پیڑ کو آتش پذیری سوچیے

❄ محمد جعفر......کوئٹہ
خوشبو کا سونگھنا ہو کہ سبزے کو دیکھنا
کرتا ہے دل سے دور غم و اضطراب کو

❄ طلعت علی......پشاور
درختوں کی نگہبانی کیے جا
یہ محنت منفعت والی بہت ہے

❄ ادریس خواجہ......کراچی
ہم سے ہوائے شہر کی بابت نہ پوچھیے
رگ رگ میں ایک زہر ہے اور ہم ہیں دوستو

❄ محمد عظیم......سرگودھا
اکثر چپ چپ رہ کر میں یہ خود ہی خود سے بولوں
برسے پیار کا ساون تو میں من کے داغ کو دھولوں

❄ مدحت......کراچی
اے کاش کہ ایسا ہو جائے دل اس کے پیار میں کھو جائے
اک رات تو ایسی بھی آئے وہ سکھ کی نیند بھی سو جائے

❄ محمد انجم......میانوالی
تیرا یہ حسین چہرہ، دو دن کی کہانی ہے
جس جسم کی ہے دولت، وہ جسم تو فانی ہے

❄ شازیہ......کراچی
جو اشکوں نے تری آنکھوں سے وہ ہر بات ادھوری ہے
بجھے کیوں پیاس صحرا کی کہ یہ برسات ادھوری ہے

❄ حبیب علی......فیصل آباد
یقین کل کا کیا کریں کہ مل سکیں گے یا نہیں
کہو جو آج دل میں ہے، یہ عجلتوں کا دور ہے

❄ محبوب علی......ملتان
کہیں چہرے، کہیں جلوے کہیں گلفام بھی دیکھے
کہ احساسِ محبت کے بہت سے نام بھی دیکھے

کوپن
اپریل
2016

محفلِ شعر و سخن
نام : ____________________
پتا : ____________________

تحفہ

قمر عباس

دنیا میں خوبصورتی جب جب نظر آتی ہے تو دل چاہتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ وقت اسی کے ساتھ گزارا جائے۔ حسن کے چرچے بھی یونہی نہیں ہوجاتے... جانے کتنے دل اس پر قربان ہوجاتے ہیں لیکن کچھ لوگ قربان ہونے کے بجائے قربانی مانگتے ہیں۔ اس کا بھی کچھ ایسا ہی حال تھا... اسے ہر سال ایک خوبصورت تحفہ چاہیے تھا جسے پانے کے لیے اس نے ایک انوکھا طریقہ اختیار کیا۔

حسن کی داد پانے والی حسینہ کی دلفریبیاں

”تم مجھے قتل کرنے کے لیے یہاں آئے ہو...... ہے نا؟“ شیرائل نے.... بہ ظاہر یوں داخلی دروازے کو کھلا رکھا جیسے کوئی ارجنٹ پوسٹل سروس کے آدمی کو خوش آمدید کہتا ہے۔

اس نے میری گن کو نہیں دیکھا ہوگا جو میں نے اپنی جینز کے پچھلے حصے میں اڑسی ہوئی تھی۔ اس سے قبل کہ میں کوئی جواب دیتا، وہ حویلی میں پلٹ گئی اور اپنے پیچھے دروازہ کھلا [illegible] اس نے بُنائی سے تیار کردہ ایک ٹائٹ ٹاپ اور مختصر سا اسکرٹ پہنا ہوا تھا جس سے اس کی دھوپ میں سنولائی لانبی ٹانگیں لکڑی کے پالش سے چمکتے ہوئے فرش تک چلی گئی تھیں۔

”اندر آجاؤ۔“ اس نے کہا۔ میرے خیال سے کم از کم اس نے یہی کہا تھا۔ میں اس کی لہراتی چال میں کھویا ہوا تھا۔ لگ رہا تھا جیسے اس نے حال ہی میں شاور لیا تھا اور میں آنکھیں بند کرکے اس کے جسم سے شرارے سی چھوڑنے والی مہک کے

تعاقب میں اس کے پیچھے جاسکتا تھا۔
میں نے چند گہری سانسیں لیں اور جلدی جلدی اس کے ساتھ چلنے لگا۔ وہ سیدھی کچن کاؤنٹر تک پہنچ گئی جہاں ایک بڑی سی کھڑکی سے ایک خوب صورت عقبی لان کا نظارہ کیا جاسکتا تھا۔ لان کی گھاس نہایت عمدگی سے تراشیدہ تھی۔ وہ گھوم کر میرے مقابل آگئی اور دونوں ہاتھ باندھ لیے۔

"اوکے۔" اس نے کہا۔ "تم نے کیا کیا ہے؟"

"ایکسکیوزمی؟"

"تم نے ونسنٹ کے ساتھ کچھ کیا ہے اور اب تم اس کی خوشنودی کے مقروض ہو۔ درست؟"

میں نے کچھ نہیں کہا۔

اس نے کچن کی میز کی جانب اشارہ کیا۔ "اگر تم بیٹھ جاؤ تو میں بہتر محسوس کروں گی۔"

اگرچہ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا، تاہم میں بیٹھ گیا۔ مجھے اپنی توجہ مرکوز کرنے کی ضرورت تھی۔ میرے ذہن میں سیکڑوں خیالات گردش کر رہے تھے۔ کیا وہ صرف وقت گزارنا چاہ رہی تھی؟ وہ داخلی دروازے پر ہی فساد کھڑا کرسکتی تھی، لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ اسے کیسے پتا چلا کہ میں وہاں کس لیے آیا ہوں؟

وہ میرے برابر میں بیٹھ گئی اور ٹانگ پر ٹانگ رکھ لی۔ میں نے یہ بات اس لیے نوٹ کی کہ میں اس کی ان دلکش ٹانگوں پر بہت ہی خاص توجہ دے رہا تھا۔

اس کے چہرے کے تاثرات نرم پڑ گئے۔ اس نے اپنی بڑی غزالی آنکھوں کو جھپکایا اور بولی۔ "سو کیا تم نے اس سے پہلے کبھی کسی کو قتل کیا ہے؟"

میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"سو تم اس معاملے میں کنوارے ہو؟"

میں نے شانے اچکا دیے۔

"تم یہ کام کس طرح سرانجام دو گے؟"

"میں...... آں...... میرے پاس ایک گن ہے۔"

"کیا یہ گرجدار قسم کی نہیں ہوگی؟"

"میرا خیال ہے میں نے اس بارے میں غور نہیں کیا۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔"

"تم نے مجھے آج ہی قتل کرنا ہے؟"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"تم اس کے مقروض ہو؟"

میں اثبات میں سر ہلاتا رہا۔

"وہ کتنی رقم ہے؟"

"آٹھ لاکھ!"

اس کے ہونٹوں سے ہلکی سی سیٹی کی آواز نکل گئی۔ "یہ تو اچھا خاصا قرض ہے جو ناقابلِ ادا لگتا ہے۔"

"میں ایک جبری جواری ہوں۔"

"سو اس نے کہا ہے کہ اگر تم مجھے قتل کردو گے تو تم جتنی بھی چیزوں کے مقروض ہو، وہ تمہیں معاف کردے گا؟"

"ہاں۔"

اس نے سرتاپا میرا جائزہ لیا اور بولی۔ "تمہاری عمر کیا ہے؟"

"بتیس سال۔"

"سو تم بتیس برس کے ہو اور تم آٹھ لاکھ ڈالرز کے مقروض ہو؟"

"ہاں۔"

اس نے ایک اچٹتی نگاہ پیچھے کی طرف ڈالی تو میں نے اپنی گن کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔

"اطمینان رکھو۔" اس نے کہا۔ "مرنے سے پہلے میں بس کافی کا آخری کپ پینا چاہتی ہوں۔ تمہیں تو معلوم ہوگا کہ عام طور پر لوگ آخری سگریٹ پینے کی خواہش کرتے ہیں لیکن میں سگریٹ نوش نہیں ہوں۔ کیا یہ ٹھیک ہے؟"

میں اس پر غور کرنے لگا۔

"سنو۔" اس نے کہا۔ "مجھے صرف ایک بٹن کو دبانا ہوگا اور مشین بینز کو گرائنڈ کردے گی اور تین منٹ سے کم وقت میں چند کپ کافی ابل کر تیار ہوجائے گی۔"

"اوکے لیکن صرف ایک کپ!"

"یقیناً۔" وہ اٹھی اور کافی مشین کا ایک بٹن دبا دیا۔ پھر کچن کاؤنٹر کا سہارا لے کر کھڑی ہوگئی۔ "تمہیں معلوم ہے کہ آج اس کی سالگرہ ہے۔"

"ونسنٹ کی؟"

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ "آج وہ چھپن سال کا ہوگیا ہے۔ وہ ہمیشہ اس بات پر خصوصی توجہ دیتا ہے۔ اس تحفے کا منتظر رہتا ہے جو ہر سال میں اسے پیش کرتی ہوں۔"

"تم اسے کیا تحفہ دیتی ہو؟"

"وہی جو ہر سال دیا کرتی ہوں۔ شادی کچھ عرصے بعد ایک روٹین بن جاتی ہے۔ تمہیں ایک روز خود پتا چل جائے گا۔"

"اچھا۔"

وہ میری بے رغبتی کا جائزہ لینے لگی۔ "تم حقیقت میں یہ کام نہیں کرنا چاہتے...... ہے نا؟"

"میرے پاس پسند ناپسند کا کوئی اختیار نہیں ہے مسز ونسنٹ۔"

"پلیز مجھے شیرائل سے مخاطب کرو۔"

"شیرائل! مجھے یہ کام کرنا ہوگا یا پھر میں مرنے کے لیے تیار رہوں۔ اس میں کوئی دوسرا آپشن نہیں ہے۔"

"ہم اپنے آپشن کے بارے میں بعد میں بات کریں گے۔" اس نے الماری میں سے سرامک کے دو کپ نکالتے ہوئے کہا۔ "اس وقت تو میں چاہتی ہوں کہ تم مجھے اپنے بارے میں بتاؤ۔"

جب میں نے کوئی جواب نہیں دیا تو اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ "دیکھو، میں چند منٹ بعد مرنے والی ہوں۔ تم مجھے جو کچھ بتاؤ گے اس سے آخر فرق کیا پڑے گا؟ میں تو بس اس شخص کے بارے میں کچھ جاننا چاہتی ہوں جو میری زندگی کا خاتمہ کرے گا۔"

میں اپنے ذہن میں ایسے بہت سے مناظر کو دہرا چکا تھا کہ ایسا کس طرح سے ہوگا...... میری مراد قتل سے ہے۔ مجھے شیرائل کی جانب سے عاجزی، سرکشی، رونے دھونے حتیٰ کہ کچھ جارحیت کی توقع تھی لیکن میں نے اس حکمت عملی کے بارے میں کبھی نہیں سوچا تھا۔

"میرا نام کرس ہے۔" میں نے کہا۔ "جب میری عمر سولہ برس تھی تو میں نے ریس کورس جانا شروع کردیا تھا اور مجھ میں جوئے کے جراثیم سرایت کر گئے تھے۔ میرا خیال ہے کہ میں پھر بھی اس سے جان چھڑانے میں کامیاب نہ ہوسکا۔ اگلی شرط مجھے ہمیشہ ٹاپ پر لے جاتی تھی اور میں واپس ٹریک پر پہنچ جاتا تھا۔ پرابلم یہ ہے کہ جیتنے کے باوجود میں اسے جاری رکھتا تھا اور آخرکار جیت کی رقم ہوا ہو جاتی تھی۔"

شیرائل نے اپنے کپ میں کچھ کریم انڈیلی اور چمچہ چلاتے ہوئے مجھ سے پوچھا کہ میں اپنی کافی کس طرح کی پسند کرتا ہوں۔

"بلیک۔" میں نے بتایا۔ "اور چینی کے دو چمچ۔"

اس نے ہمارے کپ تیار کیے اور انہیں میز پر لے آئی۔

"شکریہ۔" میں نے کہا۔

وہ بیٹھ گئی اور ایک بار پھر ٹانگ پر ٹانگ رکھ لی۔ بالکل پہلے کی طرح، بائیں ٹانگ پر دائیں ٹانگ۔ یہی انداز میرا پسندیدہ تھا۔

اس نے اپنا ہاتھ اپنی ٹھوڑی کے نیچے رکھ لیا اور مسکراتے ہوئے بولی۔ "آگے بتاؤ۔"

"قماربازی کے بارے میں؟"

"یہ بتاؤ کہ میرے شوہر سے تمہاری ملاقات کس طرح ہوئی تھی؟"

اس کی بھرپور براؤن آنکھیں اس کے گیلے سیاہ بالوں سے حیرت انگیز طریقے سے ہم آہنگ ہو رہی تھیں۔

"کیا میں تم سے ایک سوال پوچھوں؟" میں نے کہا۔

"بے شک۔"

"تمہیں کیسے پتا چلا کہ میں آرہا ہوں؟"

"اوہ! مجھے معلوم تھا کہ آخرکار کوئی نہ کوئی تو آئے گا۔ ونسنٹ ہمیشہ مجھے تنبیہ کیا کرتا تھا کہ اگر میں نے کبھی بھی اپنا وزن بڑھایا تو وہ مجھے مار ڈالنے کے لیے کسی نہ کسی کو بھیج دے گا۔ گزشتہ روز اس نے مجھے بیگ میں سے چپس کھاتے ہوئے پکڑ لیا تھا۔ اس نے جن نظروں سے مجھے دیکھا تھا تو مجھے پیغام مل گیا تھا کہ مجھے محتاط رہنا ہوگا۔"

میں نے یہ سن کر ایک جھٹکے سے سر اٹھایا۔ "اگر تم نے اپنا وزن بڑھایا تو تمہارا اپنا شوہر کسی کو تمہیں قتل کرنے کے لیے بھیج رہا ہے؟ کیا اس کا یہ عمل قدرے جابرانہ نہیں؟"

"ہر وہ کام جو ونسنٹ کرتا ہے، وہ جبر ہوتا ہے۔ یہ تم بھی جانتے ہو۔ وہ لوگوں کو قسیں قرض دیتا ہے۔ پھر اگر وہ وقت پر قرض ادا نہیں کرتے تو وہ ان کے بچوں کو مار ڈالنے کی دھمکیاں دیتا ہے۔ وہ شخص کوئی بھی کام شائستہ نہیں کرتا۔" وہ اپنا ہاتھ سہلاتے ہوئے دوسری طرف دیکھنے لگی۔ "مجھ پر اعتبار کرو، مجھے سب معلوم ہے۔"

میں بھی ونسنٹ کی غیر معمولی بدمزاجی سے بہ خوبی واقف تھا۔ میں خود اسے ایک نادہندہ کی آنکھوں میں کانٹا گھبوتے دیکھ چکا تھا۔ اس کے پاس ہر شے سیاہ و سفید تھی۔ کسی قسم کے شک و شبہے کی گنجائش نہیں تھی۔

اس نے نرم آواز میں پوچھا۔ "کیا تمہارے خیال میں، میں موٹی ہوں؟"

ساتھ ہی اس نے اپنے بازو اوپر اٹھاتے ہوئے اپنے چست بدن کو نمایاں کردیا اور مجھے اپنے جسم کا بے شرمی سے جائزہ لینے کا لطف فراہم کردیا۔ اس کے جسم کا ہر چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی اپنی جگہ بالکل صحیح طور پر فٹ تھا اور بھرپور زیتونی رنگت اس کے بدن کو تمتما رہی تھی۔

مجھے معلوم تھا کہ مجھے اسے قتل کرنا ہے تاکہ اپنی زندگی کو واپس حاصل کرسکوں لیکن اس کی یہ کیفیت مجھے دلفریب لگ رہی تھی۔

"نہیں۔" میں نے کہا۔ "تم موٹی تو نہیں ہو۔"

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا لیکن صاف لگ رہا تھا کہ میرے الفاظ نے اسے دلاسا نہیں دیا تھا۔ وہ پیچھے ہٹی اور اپنا کپ اپنی گود میں رکھ دیا۔ "تمہیں حیرانی نہیں کہ میں ونسنٹ جیسے کسی شخص کے ساتھ کیونکر اور کیسے وابستہ ہوئی تھی؟ تم جاننا نہیں چاہتے؟"

"ہاں۔"

"تم ایک دلکش چاق و چوبند تیس سالہ عورت کو دیکھ رہے ہو اور تم حیران ہو رہے ہو کہ میں اس جال میں کس طرح دام میں آگئی ہوں؟" اس نے کچن میں چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کی نگاہیں اسٹین لیس اسٹیل کے دیو ہیکل ریفریجریٹر اور گرینائٹ کے جگمگاتے کاؤنٹر ٹاپس کا طواف کر رہی تھیں۔

"میں اس وقت صرف اکیس برس کی تھی جب یہ سب کچھ ہوا۔ کالج سے فراغت پاتے ہی گلیمر سے بھرپور طرزِ زندگی نے مجھے نگل لیا۔ راتوں کو لیموزین کی سیر اور مہنگے ترین نائٹ کلبس۔ پرائیویٹ جیٹ میں کورونیڈو آئی لینڈ کی سیر۔ میں اس چکاچوند کر دینے والی زندگی میں اس طرح گم ہو چکی تھی کہ مجھے احساس ہی نہیں تھا کہ میری حیثیت ایک تند و تیز لہر کے بہاؤ میں ایک تنکے کے مانند ہے اور نہ ہی میں نے کبھی سنا تھا کہ آگے آبشار بھی آرہا ہے۔"

وہ اپنے کافی کے کپ کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ واقعی میں افسردہ لگ رہی تھی۔ "میرا خیال ہے کہ میں تم سے زیادہ مختلف نہیں ہوں۔"

ہم ایک منٹ تک خاموش بیٹھے رہے۔ ہم اپنے اپنے طور پر اپنے ذہن میں کچھ سوچ رہے تھے۔ میں نے چاروں طرف اس رئیسانہ ٹھاٹ باٹ کو دیکھا جس نے شیرائل کو محصور کیا ہوا تھا۔

"کیا یہ سب کچھ ہونے کے باوجود تم اس کے دباؤ میں چور چور ہو؟" میں نے پوچھا۔

وہ کچھ الجھن میں مبتلا دکھائی دینے لگی۔

"میری مراد دولت سے ہے۔" میں نے کہا۔ "کیا اس کی اہمیت نہیں؟ میرا مطلب ہے میں ہر روز یہ سوچتے ہوئے گزار دیتا ہوں کہ میں بڑی رقم جیتنے والا ہوں اور اس کا اختتام یہ ہے کہ میں اس مقام پر آگیا ہوں جہاں پانچ کار والے گیراج میں لیمبو گھینیز بھری ہوئی ہیں لیکن اب جب میں تمہیں دیکھ رہا ہوں...... ویل، تم خوش نہیں لگتی ہو۔ تم اپنی قسمت کا فیصلہ قبول کرنے کے لیے تیار نظر آرہی ہو اور تم بغیر کسی جدوجہد کے اپنی زندگی کی بازی ہارنے کے لیے رضامند ہو۔"

"ہر شے کی کوئی نہ کوئی قیمت ہوتی ہے۔" شیرائل نے کہا۔ "ہر چھوٹے سے چھوٹے زیور، جیولری کے ہر پیس کی اپنی ایک قیمت ہے۔ لگتا یوں ہے کہ ہر آسائش کے ساتھ میری روح کا ایک چھوٹا سا حصہ مجھ سے بچھڑ جاتا ہے۔ میں تاریکی سے تھک گئی ہوں۔ میں کچھ عرصے کے لیے باہر جانا چاہتی تھی لیکن......" اس نے دزدیدہ نظروں سے میری طرف دیکھا اور بولی۔ "کیا میں تمہیں کچھ دکھا سکتی ہوں؟"

"بے شک۔"

اس نے اپنا کپ نیچے رکھ دیا اور میز پر پاس رکھے ہوئے اپنے پرس کی جانب ہاتھ بڑھانا چاہا تو میرا ہاتھ ایک بار پھر اپنی گن پر چلا گیا۔ وہ ساکت ہوگئی۔

"اسے اٹھا لو!" اس نے اپنے پرس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

جب میں نے کوئی جنبش نہیں کی تو وہ بولی۔ "آگے بڑھو۔ دیکھو اس کے اندر کیا ہے؟"

اس نے اپنا پرس میری جانب کھسکا دیا۔ میں پرس کھول کر اس کا جائزہ لینے لگا۔ سب سے اوپر ایک لفافہ رکھا ہوا تھا۔ میں نے لفافہ اٹھا کر اس کی جانب لہراتے ہوئے پوچھا۔ "یہ؟"

"اسے کھولو۔"

وہ ہیتھرو ائرپورٹ، لندن کے لیے ہوائی جہاز کا ایک ٹکٹ تھا۔ ٹکٹ یک طرفہ تھا اور اس پر شیرائل کا نام لکھا ہوا تھا۔

"تم جانے والی تھیں؟" میں نے پوچھا۔

"تاریخ چیک کرلو۔"

میں نے اپنی دستی گھڑی کی طرف دیکھا۔ "یہ فلائٹ تو آج سہ پہر کو روانہ ہو رہی ہے۔"

"تم اوپری منزل پر جا کر میرا پیک شدہ سوٹ کیس دیکھنا چاہتے ہو؟" شیرائل نے کہا۔

"کیا ونسنٹ کو معلوم ہے؟"

"نہیں۔ میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ مجھے معلوم تھا میری زندگی کے دن گنے جا چکے ہیں۔" اس کی آنکھیں دور خلا میں کہیں مرکوز تھیں اور ان میں مایوسی کی جھلک نمایاں تھی۔ "مجھے ایک نئی زندگی کے آغاز کی ضرورت ہے۔"

میں بھی بالکل یہی محسوس کر رہا تھا لیکن میری نئی زندگی کا آغاز صرف اس صورت میں ہو سکتا تھا جب شیرائل کا جسم کام کرنا چھوڑ دے۔

"میں گزشتہ دس سال سے الگ رقم جمع کرتی چلی آئی ہوں۔" شیرائل نے کہا۔ "وہ اتنا متکبر اور سست رو ہے کہ کبھی حساب کتاب نہیں رکھتا۔ حال ہی میں میری جمع پونجی بیس لاکھ ڈالرز کا ہندسہ کراس کر چکی ہے۔" اس نے اپنی بڑی غزالی

آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ ”میرا خیال ہے کہ میری ٹائمنگ میں صرف ہلکی سی کسر کا فرق پڑ گیا۔“

”تم تو جانتی ہو، اب اس سے بچ نکلنے کی کوئی راہ نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ”میں تمہیں دگنی رقم کی پیشکش کر سکتی ہوں اور وہ اسے قبول نہیں کرے گا۔“

مجھے اس بات کا جواب دینے کی ضرورت نہیں تھی۔ ہم دونوں ہی اس شخص کو خوب بہتر طور پر جانتے تھے۔

”جب وہ کوئی فیصلہ کر لیتا ہے تو اس سے کبھی بھی پیچھے نہیں ہٹتا۔“ شیرائل نے کہا۔ ”اس کی شخصیت کے اس پہلو کی میں واقعی داد دیتی ہوں۔“

”واقعی؟“

”تقریباً۔“

میں ائرلائن کے ٹکٹ کو دیکھنے لگا جبکہ اس دوران میں میری کافی ٹھنڈی ہو گئی۔ میں اس معاملے سے چھٹکارا حاصل کرنے کی امید میں تھا لیکن اگر اس کی سانسیں بحال رہ جاتیں تو میں ایک دن بھی زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔

اسے جیسے میرے خیالات کا احساس ہو رہا تھا۔ اس نے میرا ہاتھ چھو لیا۔ ”اٹ از آل رائٹ!“ اس نے کہا۔ ”میں سمجھ رہی ہوں۔ میرے مقابلے میں بہرصورت تمہیں زندہ رہنے کی زیادہ ضرورت ہے۔“

ہم پورے ایک منٹ تک ایک دوسرے کو تکتے رہے۔ ہمارے مشترکہ ذہنوں میں...... ”کیا اور اگر“ ...... کے جملوں کا ایک طوفان برپا تھا۔

بالآخر اس نے میرا ہاتھ دبایا اور مسکراتے ہوئے بولی۔ ”ہم دونوں ہی اپنی اپنی نئی زندگی کا آغاز کر سکتے ہیں۔ میرے پاس اتنا کچھ ہے جو ہم دونوں کے لیے کافی ہوگا۔ میرے ساتھ یورپ چلے چلو۔ وہ ہمیں کبھی تلاش نہیں کر پائے گا۔“

میں اس کی اس دلفریب مسکراہٹ کے سحر میں کھو سا گیا اور اس کی پیشکش کو تصور میں دیکھنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ میں اسپین کے ساحل پر کاک ٹیل کے گھونٹ لے رہا ہوں۔

میرا یہ تصور کرنا جیسے شیرائل کے لیے ایک اشارہ تھا۔ وہ فوراً ہی بول پڑی۔ ”میں بکنی میں بہت زبردست لگتی ہوں۔“

میں قدرے ہچکچایا، پھر اپنا سر نفی میں ہلا دیا۔ ”مجھے اپنی ماں اور بہن کا بھی خیال ہے۔ وہ میرے فرار ہونے پر جھنجلاہٹ میں ان دونوں کو قتل کر دے گا۔“

شیرائل نے ایک گہرا سانس لیا۔

”اور اگر میں چلی جاؤں تو پھر؟ میرا مطلب ہے کہ میں یہاں سے نکل جاؤں اور کبھی واپس لوٹ کر نہ آؤں؟ اسے کبھی معلوم نہیں ہو سکے گا کہ میں مری نہیں ہوں۔ درست؟“

میرے بس میں ہوتا تو میں یقیناً ہامی بھر لیتا لیکن ونسنٹ کوئی احمق نہیں تھا۔ اس نے کسی بھی ممکنہ حیلے بہانے کو ختم کرنے کے اقدامات پہلے سے کر رکھے تھے۔

”اس طرح بھی بات نہیں بنے گی۔“ میں نے کہا۔

”کیوں نہیں بنے گی؟“

”اس لیے کہ مجھے اس کے پاس کوئی ایسی چیز لے جانی ہوگی جو اس پر یہ ظاہر کر سکے کہ میں نے حقیقت میں تمہیں قتل کر دیا ہے۔“ میں نے بتایا۔

”جیسے کہ کیا؟“

”تمہاری چھنگلی!“

یہ سن کر شیرائل نے تیوریاں چڑھا لیں۔ ”تمہیں یہ ثابت کرنے کے لیے کہ تم نے مجھے قتل کر دیا ہے، اس حرامزادے کے پاس میری چھنگلی لے جانی ہوگی؟“

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

یہ سن کر وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور ایک کیبنٹ کا دروازہ کھول لیا۔ اس مرتبہ میں نے اپنی گن کی جانب ہاتھ بڑھانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ شیرائل نے کیبنٹ میں سے ایک کٹنگ بورڈ باہر نکالا پھر ایک دراز کھولنے لگی۔ جب وہ پلٹی تو اس کے ہاتھ میں قصابوں والا ایک بڑا سا چاقو تھا۔

اس نے وہ چاقو مجھے تھما دیا، پھر اپنا ہاتھ کھول کر کٹنگ بورڈ پر رکھ دیا۔ ”آگے بڑھو، سویٹی۔“ اس نے کہا۔ ”اسے کاٹ ڈالو۔ پھر اسے ونسنٹ کے پاس لے جاؤ اور بتا دو کہ تم نے اپنا کام مکمل کر دیا ہے۔ تمہیں ایک نئی زندگی مل جائے گی اور میں سوئٹزرلینڈ کی ایلپس کی پہاڑیوں میں کہیں غائب ہو جاؤں گی۔ ہم دونوں کو وہ مل جائے گا جو ہم چاہتے ہیں...... صرف تمہیں مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہوگا۔“

”وہ کیا؟“ میں نے پوچھا۔

وہ الفت بھری نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے مسکرائی اور اپنا دوسرا ہاتھ میرے بازو پر رکھ دیا۔ ”تمہیں بھی آنا ہوگا اور مجھ سے ملنا ہوگا۔ میں تمہیں اس ہوٹل کا پتا دے دوں گی جہاں میں ٹھہروں گی۔ یہاں سے نکلنے کے لیے کم از کم ایک ہفتہ انتظار کرنا۔ اس لیے کہ احتیاط ضروری ہے۔“

میں اس منظر کو اپنے ذہن کے پردے پر دوڑانے لگا۔

یہ بات بن سکتی تھی۔ حقیقت میں بات بن سکتی تھی۔

میں نے شیرائل کی طرف دیکھا۔ وہ کھڑی تھی اور بہادر بننے کی کوشش کر رہی تھی۔ مجھے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا چاقو وزنی

محسوس ہو رہا تھا۔ وہ پیچھے کی جانب جھکی اور اپنا بازو پوری لمبائی سے آگے پھیلا دیا۔ وہ عضو کاٹنے کے اس عمل سے زیادہ سے زیادہ دور رہنا چاہتی تھی۔

"کاٹ ڈالو!" اس نے اپنا منہ پھیرتے ہوئے کہا۔ "اور تیزی دکھانا۔"

میں نے اس کے ہاتھ کی بقیہ انگلیوں سے چھنگلی کو الگ کھینچ لیا۔ اس کی انگلیاں اتنی ملائم تھیں جیسے مکھن کی نرم اسٹکس ہوں اور اگر میں انہیں دیر تک تھامے رہتا تو وہ پگھل جائیں گی۔

عین اس وقت جب میں نے اپنا چاقو والا بازو بلند کیا تو وہ میری جانب گھوم گئی اور بولی۔ "ایک اور آپشن بھی ہے۔"

☆☆☆

ونسنٹ کا ایک دفتر اس اسپورٹس بار کے عقب میں تھا جہاں آف ٹریک شرطیں لگانے کی سہولت مہیا تھی۔ اگر آپ اسمارٹ ہیں تو بیرونی ہاؤس میں گھوڑوں پر شرطیں لگا سکتے ہیں اور اگر آپ کنگال ہو چکے ہیں اور پھر بھی شرط لگانے کی ضرورت محسوس کر رہے ہیں تو پھر آپ کو ونسنٹ سے اس کے عقبی دفتر میں ملاقات کرنا ہوگی۔

بلاشبہ یہ قمار بازوں کے لیے ایک جنت تھی۔ لیکن اس وقت تک آپ ادائیگی کر سکتے ہیں۔

میں جب وہاں پہنچا تو ونسنٹ فون پر کسی سے بات کر رہا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھ کر ہاتھ لہرایا اور مسکرا دیا۔ میں بیٹھ گیا۔ وہ اپنی سیاہ چمڑے کی کرسی سے پشت لگائے ہوئے تھا۔

"سنو" اس نے فون کے ریسیور میں کہا۔ "میں اب مزید بات نہیں کر سکتا۔ میری سالگرہ کا تحفہ ابھی ابھی پہنچا ہے۔"

ونسنٹ نے فون بند کر دیا اور میرے ہاتھ میں موجود لفافے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "میرا خیال ہے میری سالگرہ کا تحفہ اسی میں ہے...... ہے نا؟"

میرا ہاتھ کپکپا رہا تھا، سو میں اسے اپنی گود ہی میں رکھے رہا۔ "ہاں۔" میں نے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

"تم کچھ پریشان سے دکھائی دے رہے ہو؟"

"جو کچھ میں نے کیا ہے اگر وہی کچھ تم نے کیا ہوتا تو تم بھی اسی طرح قدرے پریشان ہوتے۔"

وہ متفکر سا ہو گیا۔ اس نے پہلے لفافے کی جانب اور پھر میری طرف دیکھا۔ "سو تم نے واقعی یہ کام کر دیا؟"

"میں احمق نہیں ہوں، مسٹر ونسنٹ۔ میں جانتا ہوں کہ اگر میں نے حکم کی تعمیل نہیں کی تو میرا کیا انجام ہوگا۔"

اس کی چمڑے کی کرسی چرچرائی، جب وہ پیچھے کی جانب جھکا اور اس نے اپنے ہاتھ اپنے سر کے پیچھے باندھ لیے۔

"مجھے ایک بات بتاؤ۔" اس نے کہا۔ "تم نے لاش کا کیا، کیا؟"

"میں نے وہ صحرا میں دفن کر دی ہے۔ اسے کبھی بھی تلاش نہیں کیا جا سکے گا۔"

وہ اس جواب سے مطمئن دکھائی دینے لگا۔

"وہ خاصے دلکش جسم کی مالک تھی...... ہوں؟" اس نے سازشی لہجے میں کہا۔

"یس سر!"

"میرا مطلب ہے وہ ٹانگیں اب ہمیشہ کے لیے چلی گئی ہیں...... ہوں؟"

"یس سر! وہ واقعی بے حد دلکش ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے وہ واقعی بے حد دلکش تھی؟"

"بے شک۔"

ونسنٹ آگے کی جانب جھکا اور اپنی کہنیاں میز پر ٹکا دیں۔ "تم سمجھتے ہو کہ میں حقیقت میں ولدالحرام ہوں۔ یہی بات ہے نا؟"

"نہیں سر!"

وہ زبردستی مسکرا دیا پھر اٹھ کھڑا ہوا اور اپنی میز کے پیچھے ٹہلنے لگا۔ "تم نے دیکھا ہے کہ جو لوگ میرے لیے کام کرتے ہیں، وہ سب کے سب جسمانی طور پر فٹ ہیں۔ ان میں سے ہر ایک۔" اس نے اپنے ہموار پیٹ پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "آج میں چھپن سال کا ہو گیا ہوں اور میں شرط لگا سکتا ہوں کہ تم اوندھا لیٹ کر جتنے ڈنڈ لگاؤ گے، میں اس سے دگنے ڈنڈ لگا سکتا ہوں اور چت لیٹنے کی حالت سے بازوؤں کا سہارا لیے بغیر بیٹھنے کی ورزش تم سے دس گنا زیادہ کر سکتا ہوں۔"

مجھے جواب دینے کی ضرورت نہیں تھی۔

"میں اپنی ٹیم کے ہر فرد سے بالکل یہی چاہتا ہوں۔" اس نے اپنی کنپٹی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ایک فٹ باڈی ایک فٹ ذہن ہوتا ہے لہٰذا اگر میں اپنی بیوی کو توند کے ساتھ چلنے پھرنے کی اجازت دوں تو تمہارے خیال میں کیا ہوگا؟"

اس نے اپنی بھویں اس طرح اچکائیں جیسے حقیقت میں مجھ سے اس سوال کا جواب چاہتا ہو۔

"تم اپنی عزت کھو دو گے؟"

اس نے اپنا بازو بڑھایا اور اپنی شہادت کی انگلی سے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "بالکل درست! میں اپنے آدمیوں میں اپنی عزت کھو دوں گا اور میں ایسا ہونے کی

اجازت ہرگز نہیں دے سکتا۔ تم نے یہ بات سمجھ لی...... ٹھیک؟"
"بالکل ٹھیک!" میں بھلا اس کے سوا اور کیا کہہ سکتا تھا؟
وہ اس بات پر مسکرانے لگا لیکن اس کی مسکراہٹ سے میرے ہاتھ کی کپکپاہٹ دور نہیں ہوئی۔
اس نے اپنے ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی پر چٹخایا اور لفافے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔
"اگر تم برا نہ مانو تو میں یہ لے رہا ہوں۔"
میرا حلق اتنا تر نہیں تھا کہ میں اسے کوئی جواب دے سکتا۔ میں نے اپنی کپکپاہٹ کو چھپانے کے لیے لفافہ فوراً ہی اسے تھمادیا۔ وہ لفافے کو اپنے ہاتھ میں لیے رہا اور میز کے پیچھے بیضوی انداز میں اپنا ٹہلنا جاری رکھا۔
"تمہیں معلوم ہے کہ میری بیوی میری نمائندہ ہے۔ وہ جب شاپنگ کے لیے جاتی ہے اور میرے کسی شناسا سے اس کا سامنا ہوتا ہے تو اس وقت میری بیوی کا اپنی بہترین فارم میں دکھائی دینا ضروری ہوتا ہے۔ وہ میری عکاسی کرتی ہے۔ میں یہ ہرگز برداشت نہیں کرسکتا کہ میں کسی کو برا دکھائی دوں۔"
اپنی تمام تر کوشش کے باوجود میں اس لفافے پر سے اپنی نظریں نہیں ہٹاسکا۔
"لہٰذا ہر سال اپنی سالگرہ کے دن میں کسی نہ کسی کو اسے قتل کرنے کے لیے اپنے گھر بھیج دیتا ہوں۔"
اس نے ابھی یہ کہا؟
"اور گزشتہ دس برسوں سے ہر سال وہ بچ نکلنے کا راستہ ڈھونڈ نکالتی ہے۔"
اب کپکپاہٹ میرے ہاتھوں سے میرے شانوں تک آگئی تھی۔
"اوہ، میں کسی پیشہ ور قاتل کو وہاں نہیں بھیجتا۔ اس سے کام نہیں بن سکتا۔ وہ اس کی پیشکش قبول کرکے اس کے ساتھ بھاگ نکلنے کی ہامی بھر سکتے ہیں لیکن فرار ہونے کے بعد شیرائل کی موت لازمی ہے۔ نہیں، یہ صحیح نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا میں کسی ایسے بدقسمت اور کم ذہانت والے فرد کو وہاں بھیجتا ہوں جو میرا قرض دار ہو اور اپنی جان بھی بچانا چاہتا ہو۔" اس نے میری جانب سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "کوئی ایسا جس نے کسی بھی کو...... مارنے کے بارے میں بھی کبھی نہ سوچا ہو۔ لیکن حالات نے اسے زبردستی ایسی صورتِ حال سے دوچار کردیا ہو اور شیرائل جب تک اپنے جسم کو بے نقص، بے عیب اور پرفیکٹ رکھے گی تو ہمیشہ اپنے لیے نرم گوشہ ڈھونڈنے میں اور صورتِ حال سے بچ نکلنے کا راستہ تلاش کرنے میں کامیاب رہے گی۔"
پھر وہ گھوم کر میرے عین مقابل آگیا۔ "مجھے بتاؤ، اس نے تم سے بعد میں کہاں ملاقات کرنے کو کہا تھا؟ جزائر کیریبین میں؟ بحیرۂ روم کے کسی ساحلی علاقے میں...... ہوں؟"
میرے ہاتھ پیر سن ہوگئے۔ یہاں سے بھاگ نکلنے کے خیالات ذہن میں دوڑنے لگے۔ سر کے بل اس کی کھڑکی سے چھلانگ مار کر پلٹ کر واپس نہ دیکھنے کے خیالات امڈنے لگے۔
ونسنٹ نے میرے ہاتھوں کی طرف دیکھا اور اس کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ "باکی واوے، ہاتھوں میں دستانے کیوں پہنے ہوئے ہیں؟"
میں اس جواب کی بار بار ریہرسل کرچکا تھا کیونکہ اس کی جانب سے اس سوال کا مجھے یقین تھا۔ "میں اپنے پیچھے انگلیوں کے نشانات نہیں چھوڑنا چاہتا تھا...... تم تو جانتے ہو...... ایں...... صرفِ حفظ ماتقدم کے طور پر۔"
ونسنٹ کا چہرہ چمک اٹھا۔ وہ میرے اعصاب زدہ رویے اور میری کسمساہٹ سے خوش دکھائی دے رہا تھا۔
"برا مت محسوس کرو، لڑکے۔ تم پہلے فرد نہیں ہو۔" اس نے مجھے اپنی میز کی جانب آنے کا اشارہ کیا اور میز کی سب سے اوپری دراز کھول دی۔ دراز کے اندر ایک سگار بکس رکھا ہوا تھا جس کا ڈھکن کٹا ہوا تھا۔ سگار بکس کے اندر شفاف پلاسٹک میں سیل شدہ نو عدد انسانی ہاتھ کی چھنگلیاں موجود تھیں جو گلنے کے مختلف مراحل میں تھیں۔
مجھے بے ساختہ متلی سی ہونے لگی۔ ونسنٹ نے بے ساختہ ایک زوردار قہقہہ بلند کیا جبکہ خوف و دہشت سے میرا سر چکرانے لگا تھا۔
"تم نے دیکھا۔" ونسنٹ نے کہا۔ "کوئی بھی اس کے دلکش جسم کا ایک معمولی سا عضو بھی برباد نہیں کرنا چاہتا۔ سو وہ اپنے قاتل کو اس بات پر قائل کرلیتی ہے کہ اپنی جان بخشی کے لیے وہ اس کی چھنگلی کاٹنے کے بجائے خود اپنی چھنگلی کاٹ لے۔ یہی میری سالگرہ کا تحفہ ہوتا ہے۔ یہ مجھے ہر سال مل رہا ہے۔"
ونسنٹ کے قہقہوں کی آوازیں دروازے کے باہر تک میرا پیچھا کرتی رہیں۔ اس نے میرا قرض بہت جلد بے باق کرنے کے بارے میں کچھ کہا تھا لیکن مجھے کچھ بھی صحیح طور پر سنائی نہیں دے رہا تھا۔
میری بائیں چھنگلی کی جگہ اب درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ یہ کوئی واہمہ نہیں تھا بلکہ حقیقت میں تکلیف محسوس ہورہی تھی۔ اس لیے کہ میری بائیں چھنگلی اس لفافے میں موجود تھی جو میں نے ونسنٹ کے حوالے کیا تھا۔

ختم

ماروی

محی الدین نواب

اٹھائیسویں قسط

اگر کوئی کائنات کے رمز کو سمجھنے کی سعی کرے تو سب سے پہلے اسے انسان کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ خاموش صحرا کی ویرانی ہو یا پُرجوش لہروں کی روانی... سمندر کی گہرائی ہو یا آسمان کی بلندی... چاند ستاروں کا حسن ہو یا قوسِ قزح کے رنگ... تہ در تہ زمین کی پرتیں ہوں یا بلند آسمان کے سات پردے... ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے ہوں یا بادوباراں کی طوفانی گرج۔ کبھی ہلکی ہلکی بوندوں کی پھوار کا ترنم اور کبھی بجلی کی چمک، کہیں پھولوں کی مہک، کہیں کانٹوں کی کسک... اللہ تعالیٰ نے یہ سب چیزیں اس کائنات میں جگہ جگہ بکھیر دیں اور... ہر شے کو ایک مقام بھی عطا کیا، مگر... جب انسان کو بنایا تو اس پوری کائنات کو جیسے اس کے اندر کہیں چپکے سے بسا دیا اور یہ بھی عجب کھیل ہے کہیں نام یکساں ہیں مگر تقدیریں الگ اور کہیں چہرے حیران کن حد تک ایک جیسے ہیں مگر ان کی تقدیر کا لکھا کہیں ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتا۔ اس داستان کی ماروی وہ نہیں جو سندھ کی دھرتی پر عزت و احترام کی ایک علامت کے طور پر جانی جاتی ہے، اسے یہ بھی پتا نہیں کہ اس کا نام ماروی کس نے اور کیوں رکھا... شاید اس کے بڑوں نے سوچا ہو کہ نام کی یکسانیت سے مقدر کی دیوی اس پر بھی مہربان ہو جائے... جدید ماروی بہت عقیدت کے ساتھ اپنی ہم نام پر رشک کرتی ہے... یہ جانتے ہوئے کہ وہ کبھی اس مقام کے قریب بھی نہیں پھٹک سکے گی... ورق ورق، سطر سطر دلچسپی، تحیّر اور لطیف جذبوں میں سموئی ہوئی ایک کہانی جس کے ہر موڑ پر کہیں حسن و عشق کا ملن ہے تو کہیں رقابت کی چلن... آج کے زمانے کے اسی چلن میں رنگین و سنگین لمحات کی لمحہ لمحہ روداد کو سمیٹتے، نئے رنگ و آہنگ کا تحیّر خیز سنگم۔

ایک چہرہ کئی روپ، کبھی چھاؤں کبھی دھوپ، محبت کی عنایتوں، رفاقتوں اور رقابتوں کا ایک دل ربا سلسلہ

نوحۂ بے ثباتی

محی الدین نواب ڈائجسٹ کی دنیا کا ایک ناقابل فراموش نام ...... ماہنامہ سسپنس کے معتبر اور باذوق قارئین انہیں کبھی نہیں بھلا سکتے۔ بلاشبہ وہ پورا ایک عہد تھے۔ اردو زبان میں 33 سال تک ذہن ودل پر راج کرنے والا پراسرار اور دیومالائی سلسلہ ''دیوتا'' اپنی مقبولیت کی اس معراج تک چلا گیا تھا جس کا ریکارڈ آج تک کوئی نہ توڑ سکا۔ اسی طرح جب معاشرتی مسائل پر نشتر زنی کی تو ان کے قلم نے ''کچرا گھر'' تخلیق کرلیا۔ بلاشبہ کمال کا تخیل اور حقائق کا پردہ چاک کرتی تحریر۔ معاشرتی تلخیوں کے بارے میں وہ خود کہتے ہیں۔

''جب ایک ماں کی پہلی چیخ تکلیف کے کرب سے نکلتی ہے اور دوسری چیخ بچے کو نیزے کی انی پر دیکھ کر تھراتی ہے۔ جب انسان، انسان کو مارتا ہے اور تقدیر کو موردالزام ٹھہرا دیتا ہے۔ جب انصاف نہیں ملتا، جب ایک روٹی چرانے والے کے ہاتھ کاٹ دیے جاتے ہیں اور قومی دولت کو لوٹنے والے کو فراخ دلی سے معاف کردیا جاتا ہے اور جب ماں باپ مہنگائی اور فاقوں سے مجبور ہوکر اولاد کو فروخت کرڈالتے ہیں تبھی میرے آنسو قلم کی نوک پر ستارے بنتے ہیں۔''

6 فروری 2016ء کو ایسی حساس فکر رکھنے والا ایک اور قلم کار، معاشرے کا نباض ہم سے رخصت ہوگیا مگر...... ان کی لکھی گئی کہانیاں اور کردار ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گرانمایہ کیا کیے

ماروی کی اقساط پیشگی لکھی گئی تھیں جو تسلسل کے ساتھ پیش کی جاتی رہیں گی۔ اختتام بہرحال تشنۂ تکمیل ہے۔
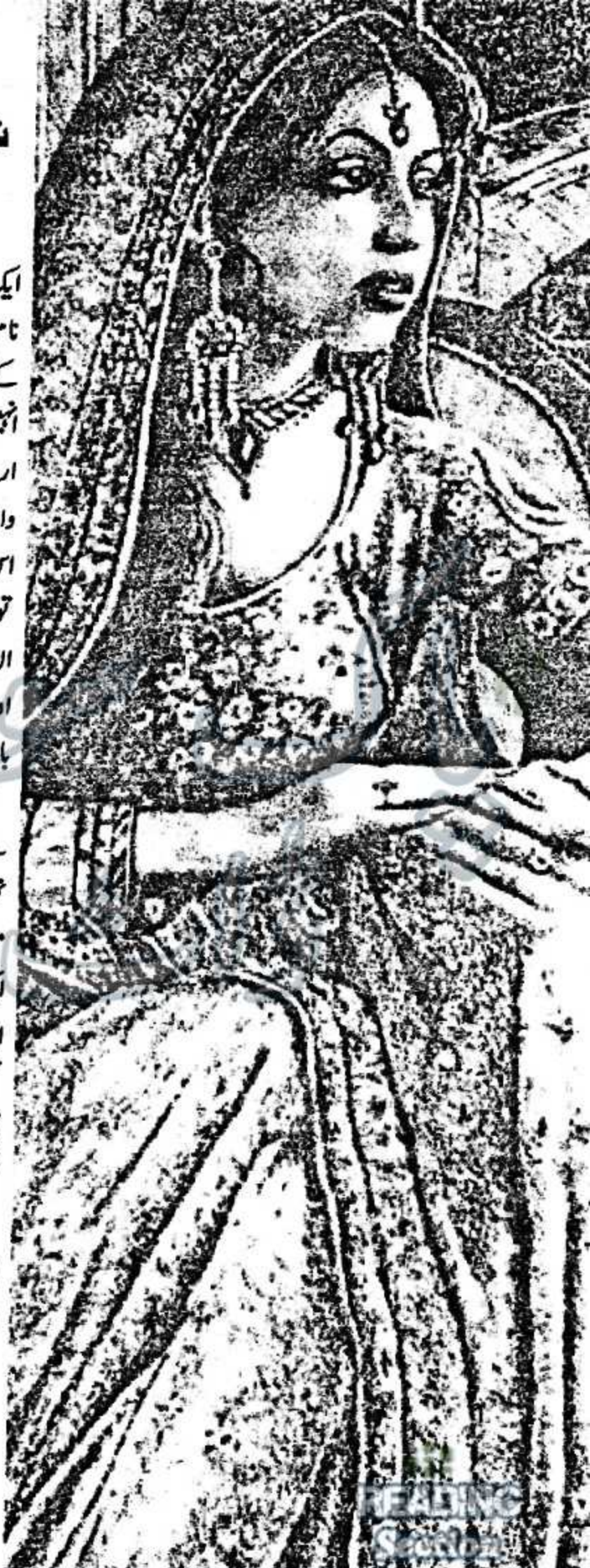
گزشتہ اقساط کا خلاصہ

یہ داستان ہے دورِ جدید کی ماروی اور اس کے عاشق مراد علی منگی کی۔ مراد ایک گدھا گاڑی والا ہے جو اپنے والد اور ماروی، چاچا جمرو اور چاچی بختی کے ساتھ اندرونِ سندھ کے ایک گاؤں میں رہتے تھے۔ گاؤں کا وڈیرا حشمت جلالی ایک بدنیت انسان تھا جس نے ماروی کا رشتہ دس ہزار نقد کے عوض مانگا تھا، چونکہ ماروی مراد کی منگ تھی اور دونوں بچپن ہی سے ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے لہٰذا وہ اس پر راضی نہیں تھی نتیجتاً انہیں گوٹھ چھوڑنا پڑا۔ مراد جو کہ ثانوی تعلیم یافتہ تھا وڈیرا حشمت کی منشی گیری کرتا تھا۔ وڈیرا حشمت جلالی اور اس کے بیٹے روایتی ذہنیت کے مالک تھے اور انہوں نے جائداد بچانے کی خاطر اپنی بیٹی زلیخا کی شادی قرآن سے کروی۔ ماں نے مخالفت کی مگر اس کی ایک نہ چلی۔ زلیخا نے بغاوت کا راستہ اپنایا اور مراد کو مجبور کیا کہ وہ اس کی تنہائیوں کا ساتھی بن جائے۔ مراد تیار نہ ہوا اور ایک رات گزارنے کے بعد اپنے باپ کے ساتھ گاؤں سے غائب ہوگیا۔ گاؤں سے فرار ہو کر یہ دونوں کراچی کے ایک مضافاتی علاقے میمن گوٹھ آ گئے جہاں ماروی اپنے چاچا، چاچی کے ساتھ پہلے ہی آ چکی تھی۔ یہیں مراد کی ملاقات اتفاقاً محبوب علی چانڈیو سے ہوگئی جو کہ ممبر اسمبلی اور بزنس ٹائیکون، لیکن ہو بہو مراد کا ہم شکل تھا۔ بس دونوں کے درمیان صرف قسمت کا فرق تھا۔ محبوب چانڈیو اپنے ہم شکل کو دیکھ کر حیران ہوا پھر اسے یاد آیا کہ حشمت جلالی جو کہ خود بھی ممبر اسمبلی تھا اس کا ذکر اپنی بیٹی کے قاتل کی حیثیت سے کر چکا تھا۔ اس کے استفسار پر مراد نے اپنی بے گناہی کا اعلان کیا۔ ہوا کچھ یوں تھا کہ مراد کے فرار کے بعد زلیخا نے اپنی ماں کے تعاون سے گاؤں کے ایک اور نوجوان جمال سے شادی کرلی اور خاموشی سے فرار ہوگئی۔ وڈیرے اور اس کے بیٹوں کو پتا چلا تو انہوں نے تلاش شروع کرائی۔ ناکامی پر انہوں نے بے عزتی سے بچنے کے لیے ایک نوکرانی جو کہ زلیخا کے ہی قد کاٹھ کی تھی برباد کر کے قتل کر دیا اور اس کا چہرہ تیزاب سے مسخ کر کے اسے اپنی بیٹی ظاہر کر کے الزام مراد پر لگا دیا۔ یہاں شہر میں محبوب جب مراد سے ملا تو اس نے مراد کو اپنے پاس رکھ کر بہترین تربیت دینے کا فیصلہ کیا، ارادہ اسے اپنی جگہ رکھ کر خود گوشہ نشین ہونا تھا۔ محبوب کے سرپرست اس کے والد کے زمانے کے معروف جگی تھے جو اس کے کاروباری معاملات کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ انہی کے مشورے پر ایک ماڈل سمیرا کو سیکریٹری کے طور پر رکھا گیا۔ مراد سے ملاقات کے دوران ماروی کی جھلک دیکھ کر محبوب اس پر دل و جان سے مر مٹا لیکن یہ ایک پاکیزہ جذبہ تھا جس میں کوئی کھوٹ نہ تھا۔ اس نے اپنی مصنوعات کے لیے بطور ماڈل ماروی کو چنا اور مراد کے ذریعے اسے راضی کیا۔ مراد بھی زلیخا کے قاتل کی حیثیت سے گرفتار ہوگیا۔ زلیخا مراد کے بچے کو جنم دے کر دوسرے بچے کی پیدائش کے دوران چل بسی لیکن وڈیرا باپ اور بیٹوں کو خبر نہیں تھی کہ زلیخا کہاں اور کس حال میں ہے۔ ماں رابعہ جانتی تھی لیکن مراد سے نالاں تھی۔ وہ شوہر اور بیٹوں سے بھی ناراض تھی لہٰذا انہیں خبر نہیں کی۔ مراد اس قتل کے مقدمے میں ملوث تھا اور محبوب چانڈیو ماروی کی خاطر اس کے مقدمے کی پیروی کر رہا تھا۔ اسی باعث اس کی وڈیرا حشمت سے دشمنی ہوگئی۔ یوں ماروی کے دشمنوں میں اضافہ ہوگیا۔ اسے اغوا کرنے کی کوشش کی گئی جب وہ اپنی سہیلی کی شادی میں شرکت کے لیے گوٹھ گئی، تاہم محبوب چانڈیو اسے بچا لایا۔ دوسری جانب جاسوس سیکرٹ ایجنٹ برنارڈ کو رہا کرانے کے لیے اسکاٹ لینڈ سے تین ایجنٹ مرینہ بہرام اور دارا اکبر آئے۔ مرینہ مراد کو ایک نظر دیکھ کر دل ہار گئی۔ مراد کو مرینہ جیلر باپ کی مدد سے جیل سے باہر نکال لائی اور محبوب اس کی جگہ بند ہوگیا۔ باہر نکل کر مراد مرینہ کی نیت بھانپ کر اسے جھانسا دیتے ہوئے اس کے شکنجے سے فرار ہوگیا۔ جبکہ دوسری جانب سمیرا اور جگی صاحب محبوب کو تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ مرینہ اپنے باپ کے بل پر بہت شاطرانہ چالیں چل رہی تھی۔ ماروی چاچی اور چاچا مرینہ کے ہاتھ لگ گئے لیکن کسی نہ کسی طرح مراد کو معلوم ہوگیا کہ مرینہ ماروی کو جام تمارو کے چودھری کے پاس لے جا رہی ہے لہٰذا مشکلات سے نبرد آزما ہوتے ہوئے اس نے ماروی کو اس کے چنگل سے آزاد کرا لیا۔ لیکن بدقسمتی سے ماروی کے سر میں چوٹ لگی جس کے باعث اس کی یادداشت چلی گئی۔ مراد شہر پہنچ کر جیل میں محبوب سے ملاقات کر کے اسے رازداری کے ساتھ جیل سے واپس جانے پر آمادہ کر کے خود سلاخوں کے پیچھے بند ہوگیا۔ مرینہ اور مراد میں فساد بڑھتا جا رہا تھا۔ مرینہ کے پالتو غنڈے مراد کو کسی نہ کسی طرح جیل سے نکال کر لے گئے۔ باہر نکل کر ان کے درمیان سخت مقابلہ ہوا جس میں قانون کا خطرناک مجرم برنارڈ مراد کے ہاتھوں مارا گیا..... ماروی کا علاج ہوا مگر ماروی نے محبوب اور مراد دونوں کو نہیں پہچانا۔ مرینہ مراد کو ہندوستان لے آئی تھی۔ مراد مرینہ کی قید سے نکل گیا اور ماسٹر کو بوبو کے ساتھ مل گیا۔ مرینہ کو پتا چل گیا کہ مراد ماسٹر کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ ادھر ماروی کے دوبارہ سر میں چوٹ لگنے سے اس کی یادداشت واپس آ گئی۔ مراد مرینہ کے زیرِ اثر آ چکا تھا۔ ماروی کو پتا چل گیا اور اس نے مراد کو اپنانے سے انکار کر دیا۔ ادھر مرینہ دوبارہ MET آفیسر بن گئی تھی مراد نے سرجری کے ماہر ڈاکٹر ممتی سن سے اپنے چہرے کی پلاسٹک سرجری کروائی۔ ڈاکٹر نے اسے اپنے بچھڑے ہوئے بیٹے ایمان علی کی شکل دے دی۔ وہ ڈاکٹر کے گھر پر ہی رہنے لگا۔ وہاں اس کے ساتھ ایمان کا دوست عبداللہ کبڈی بھی آ گیا۔ ماروی کی یادداشت واپس آ گئی تھی۔ ادھر مرینہ انڈیا پہنچ گئی تھی۔ مراد نے اسے قابو کر کے اس کی سرجری کروا دی اور ایک انجکشن لگوا دیا جس سے اس پر پاگل پن کے دورے پڑنے لگے۔ تاہم اس نے ڈائریکٹر جنرل کو اپنے مرینہ ہونے کا ثبوت دے دیا تھا۔ مراد اسرائیل پہنچ گیا تھا۔ وہاں اس کی ملاقات ڈاکٹر ممتی سن کے بیٹے ایمان سے ہوئی۔ مراد نے ایمان کو اپنی تمام باتیں بتا دیں۔ مرینہ بھی اسرائیل پہنچ گئی اور ایمان، مراد بن کر اسے اپنے پیچھے بھٹکانے لگا۔ مراد کو لندن والی فلائٹ میں میکی براؤن مل گیا۔ مراد کے پیچھے میکی براؤن کی بیٹی لگ گئی۔ ادھر مرینہ نے ایمان کو مراد سمجھ کے اس سے ملنا چاہا تاہم ایمان دشمنوں کی فائرنگ سے زخمی ہو کر اسپتال پہنچ گیا اور مرینہ جان گئی کہ یہ مراد نہیں ہے۔ مراد پاکستان گیا اور ماروی کو لے کر لندن آ گیا مگر مرینہ سے مراد کے تعلقات کے بارے میں جان کر ماروی اس سے دور ہوگئی اور پاکستان آ گئی۔ ادھر مراد دوبارہ اپنا چہرہ تبدیل کر کے انڈیا پہنچ گیا اور میکی براؤن کی بیٹی کے پیچھے لگ گیا اور اسے اغوا کر لیا۔ تاہم بعد میں اسے چھوڑ دیا مگر میڈونا کو مرینہ سے بچانے کے لیے مراد اسے لے کر [illegible] مرینہ نے راستے میں اسے چھاپ لیا۔ ان دونوں میں مقابلہ ہوا۔ مراد اور مرینہ شدید زخمی ہوئے۔ دونوں علاج کے باعث چلنے پھرنے

کے قابل ہوگئے۔ مرینہ اور مراد میں پھر صلح ہوگئی۔ مراد مرینہ سے نکاح پڑھانا چاہتا تھا مگر کوئی نہ کوئی رکاوٹ آرہی تھی۔ ادھر ڈاکٹر نمی سن نے مراد کی ہی شکل جو بنائی تھی، وہ اس کے لیے وبال بن گئی۔ وہ مرینہ سے نکاح پڑھانے کے معاملات طے کرتے گیا تاہم وہاں اسے موجودہ شکل میں دیکھ کر کچھ لوگ اسے اپنا رشتہ دار سمجھنے لگے اور اسے اپنے ساتھ لے گئے۔ وہ مراد کی شادی کرنا چاہتے تھے تاہم وہ شادی نہ ہو سکی۔ ادھر ماروی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر لندن پہنچ گئی اور محبوب اور ماروی نے اپنے چہرے سرجری کے ذریعے تبدیل کر لیے۔ مراد نے ماروی کو طلاق نامہ بھجوا دیا مگر وہ اس کا دیوانہ تھا اور اسے دوبارہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس نے غباروں کے ذریعے ماروی تک اپنا پیغام پہنچانا چاہا اور کئی غباروں میں دو لفافے باندھ کر انہیں اڑا دیا۔ انڈین آرمی نے غباروں کو چیک کر کے انہیں آگے بڑھانے کا منصوبہ بنایا۔ وہ اس کے ذریعے مراد اور ماروی تک پہنچنا چاہتے تھے اب وہ غبارے مغرب کی سمت جا رہے تھے۔ ادھر ماسٹر مراد کو ڈھونڈنے انڈیا پہنچ گیا۔ تمام تنظیموں کے سربراہ ماسٹر کی موجودگی پر الرٹ ہوگئے اور وہاں خون کی ہولی کھیلی جانے لگی۔ درگا نے مراد کو وہاں سے بحفاظت نکال لیا تاہم بشریٰ اور مرینہ کی لڑائی میں مرینہ سخت گھائل ہوگئی اور اس کی کمر کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ مراد لندن جانے کے لیے جس جہاز میں سوار ہوا اسے ہائی جیک کر لیا گیا۔ وہ طیارہ... ریاست باب النساء میں اترتا تاہم مراد نے ... جان پر کھیل کے ہائی جیکرز کو زیر کر لیا۔ مراد ملکہ نگارا کا مہمان بن گیا۔ ملکہ نے مراد کی باتوں سے اندازہ لگا لیا کہ وہ مراد ہی ہے۔ مراد نے بھی قبول کر لیا۔ ادھر مرینہ مراد کے غم میں چل بسی۔ مراد نے ملکہ نگارا سے نکاح پڑھوا لیا اور بشریٰ اور بلے کو اپنی سیکرٹ فورس میں شامل کر لیا۔ ماروی کا بھی محبوب سے نکاح ہوگیا۔ مراد و نگارا میں اختلاف ہوگیا اور یہ اختلاف طلاق پر منتج ہوا۔ مراد پر سرا فتد ارآ گیا۔ بابا اجمیری کی دعاؤں سے مراد کو روحانی طاقت حاصل ہوئی اور وہ ایک سے دو ہوگئے یعنی ایک مراد اور دوسرا اس کا ہمزاد، دونوں جب چاہتے نادیدہ ہو جاتے مراد نے نادیدہ رہ کر دشمنوں کو ناکوں چنے چبوائے ادھر دشمن مراد کو پکڑنے کے لیے محبوب، ماروی کے پیچھے پڑ گئے اور محبوب کو گھیرنے کے لیے منصوبہ بندی کرنے لگے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

ماروی محبوب کو الوداع کہنے کے لیے ائرپورٹ نہیں آئی تھی۔ یہ اندیشہ تھا کہ مراد کے ایک ہم شکل کے ساتھ دیکھ کر دشمن اسے پہچان لیں گے۔

وہ انیس عالم کی فیملی کے ساتھ گھر میں رہی۔ جب تک وہ جہاز میں جا کر نہیں بیٹھا، تب تک اس سے فون پر باتیں کرتی رہی۔ محبوب پہلے دن کی طرح اب بھی اس کا دیوانہ تھا۔ مراد نے شادی کے بعد اس کی قدر نہیں کی تھی۔ محبوب آخری سانسوں تک اس کا قدردان بن کر رہنے والا تھا۔

وہ اس کی اور اپنی بہتری کے لیے ایک نئی پلاننگ پر عمل کرنے کے لیے اس سے عارضی طور پر بچھڑ گیا تھا۔ سفر کے دوران اس کی باتیں اس کی ادائیں یاد کر کے مسکراتا رہا۔

آگے دوسری منتظر تھی۔ سمیرا معروف جٹی کے ساتھ اس کے استقبال کے لیے آئی تھی۔ وہ دونوں لئیج ہال کے دروازے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہاں سے مسافر اپنے سامان کے ساتھ باہر آرہے تھے۔ سمیرا نے کہا۔ "انہوں نے ماروی کے ساتھ رہنے کی خاطر اپنا چہرہ بدل دیا ہے۔ ابھی وہ آئیں گے تو مجھے اپنے محبوب کی صورت نظر نہیں آئے گی۔ وہ مجھے ایک اجنبی لگیں گے۔"

پھر وہ دروازے کی طرف دیکھ کر چونک گئی۔ اسے اپنے ہی محبوب کی صورت نظر آرہی تھی۔ وہ خوشی سے کھل گئی۔ "او گاڈ! یہ تو اپنی اصلی صورت کے ساتھ آئے ہیں۔"

محبوب آ کر معروف کے گلے لگ گیا۔ اس نے کہا۔ "میرا اپنا آخر لوٹ آیا۔ ویلکم ٹو ہوم سویٹ ہوم۔"

محبوب نے کہا۔ "میں آپ کو بہت پریشان کرتا ہوں۔"

"لیکن صبح کا بھولا شام سے پہلے واپس آجاتا ہے۔ میری پریشانیوں کا اتنا ہی خیال ہے تو اپنے بزنس کو سنبھالو۔ اس بوڑھے کے سر سے بوجھ اتارو۔"

"انشاء اللہ...... اب کاروبار پر توجہ دوں گا۔"

سمیرا کا دل مچل رہا تھا۔ وہ بھی بچھڑے ہوئے محبوب کے گلے لگنا چاہتی تھی لیکن وہاں ممکن نہیں تھا۔ وہ اس کے بازو سے آ کر لگ گئی پھر بولی۔ "آپ نے تو حیران کر دیا۔ چہرہ وہی ہے، تبدیل نہیں کیا۔ فون پر تو کہہ رہے تھے کہ......"

وہ بات کاٹ کر بولا۔ "وہ پرانی بات ہوگئی۔ مجھے اپنا بزنس سنبھالنے کے لیے اصلی چہرے کے ساتھ رہنا ہوگا۔"

وہ عمارت سے باہر آ کر کار کی پچھلی سیٹ پر سمیرا کے ساتھ بیٹھ گیا۔ معروف نے کار ڈرائیو کرتے ہوئے پوچھا۔ "تم دو ملکوں میں رہ کر بزنس پر کیسے توجہ دے سکو گے؟"

وہ بولا۔ "میں فی الحال ایک ماہ کے لیے آیا ہوں۔ آئندہ ہر ماہ یہاں پندرہ دنوں تک رہا کروں گا اور وہاں پندرہ دنوں کے لیے جایا کروں گا۔"

سمیرا خوشی سے چیخ پڑی۔ "کیا آپ سچ کہہ رہے ہیں؟ کیا واقعی میرے ساتھ اتنے دن رہا کریں گے؟"

وہ اس کے بازو سے لگ گئی۔ دل مچل رہا تھا۔ تنہائی ہوتی تو قربان ہونے لگتی۔

اس نے کہا۔ "ہاں، یہ فیصلہ ماروی نے کیا ہے۔ اس نے مجھے یہاں زیادہ سے زیادہ رہنے پر مجبور کر دیا

ہے۔ میں اسے ناراض نہیں کرسکتا تھا۔ وہ جو کہتی ہے، میں وہی کرتا ہوں۔''

سمیرا ایک ذرا سی بجھ گئی۔ معروف نے ڈرائیو کرتے ہوئے کہا۔ ''ماروی بہت سمجھ دار ہے۔ اس نے تمہارے کاروبار کی بہتری اور بقا کے لیے یہ دانشمندانہ فیصلہ کیا ہے۔''

محبوب نے کہا۔ ''اور یہ فیصلہ سمیرا کے حق میں بھی ہے۔''

پھر اس نے سمیرا سے کہا۔ ''تمہیں یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ وہ تم پر احسانات کرتی چلی آرہی ہے۔''

اس نے کہا۔ ''میں مانتی ہوں۔ اس نے احسان کیا اور آپ کو حکم دیا تو آپ نے مجھے شریک حیات بنالیا۔ آپ مجھے طلاق دینے والے تھے۔ اس نے حکم دیا تو آپ نے طلاق نہیں دی۔ آپ مجھے چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ اس نے حکم دیا ہے تو آپ واپس آئے ہیں۔ میری اپنی کوئی ویلیو کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ ابھی وہ حکم دے گی کہ میرے پاس ایک دن بھی نہیں رہنا ہے تو آپ ابھی واپس چلے جائیں گے۔ پھر جب تک وہ حکم نہیں دے گی، آپ لوٹ کر نہیں آئیں گے۔''

وہ جواباً کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اچانک ہی جھٹکا کھا کر آگے والی سیٹ سے ٹکرا گیا۔ سمیرا کے حلق سے ہلکی سی چیخ نکلی، وہ دو سیٹوں کے درمیان گر پڑی۔

معروف نے اچانک ہی بریک لگائے تھے۔

اچانک ہی ایک گاڑی نے سامنے آکر راستہ روک دیا تھا۔ دائیں بائیں بھی دو گاڑیاں آگئیں، ایک گاڑی پیچھے بھی تھی۔ ان تمام گاڑیوں سے مسلح افراد نکل کر دوڑتے ہوئے پچھلی سیٹ کی طرف آئے۔ پھر ادھر کا دروازہ کھول کر محبوب کا نشانہ لے کر کہا۔ ''کم وداس۔ کم آن۔''

اس نے فوراً کہا۔ ''تم لوگوں کو مغالطہ ہورہا ہے۔ میں مراد نہیں ہوں، محبوب علی چانڈیو ہوں۔''

ایک گن مین نے کہا۔ ''ہم جانتے ہیں۔ ہمیں مراد کی نہیں، محبوب کی ضرورت ہے۔ فوراً نکلو ورنہ گولی چل جائے گی۔''

دوسرے تین گن مینوں نے ہوائی فائرنگ کی۔ وہ فوراً ہی کار سے باہر آگیا۔ دو شخص اس کے دو بازوؤں کو پکڑ کر تیزی سے چلتے ہوئے سامنے والی کار میں آکر بیٹھ گئے۔ وہ تمام مسلح افراد بڑی پھرتی سے اپنا کام کر رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ تمام گاڑیاں اسے لے کر آگے دوڑتی چلی گئیں۔ سمیرا اور معروف کو پیچھے چھوڑ دیا۔ ان پر سکتہ طاری ہوگیا تھا۔

معروف بے بسی سے ان گاڑیوں کو دیکھتا رہا جو دور جاکر نظروں سے اوجھل ہوگئی تھیں۔ سمیرا رو رہی تھی۔ ایک طویل عرصے کے بعد محبوب ملتے ہی بچھڑ گیا تھا۔ فائرنگ کے باعث لوگ دور بھاگ گئے تھے۔ معروف اپنی کار آگے بڑھاتے ہوئے پولیس اور اسپیشل برانچ کے اعلیٰ افسروں کو فون کے ذریعے اس واردات کی تفصیل بتانے لگا۔ وہ یقین دلانے لگے کہ مجرموں کو پکڑنے کی پوری کوشش کریں گے۔

افسوس صد افسوس پاک وطن کے اعلیٰ حکام سپر پاور کے غلام تھے۔ انہیں پہلے ہی ڈکٹیشن دے دی گئی تھی۔ اس ڈکٹیشن کے مطابق حکام نے پولیس اور انٹیلی جنس والوں کو حکم دیا تھا کہ محبوب علی چانڈیو کے معاملے میں وہ کوئی کارکردگی نہ دکھائیں۔ محبوب کے لواحقین کو لارا لپا دیتے رہیں۔

معروف تجلی اپنے تمام وسیع ذرائع استعمال کررہا تھا۔ سمیرا مراد کو کوس رہی تھی کہ وہ کیوں اس کے محبوب کا ہم شکل ہوگیا ہے؟ ماروی اور مراد دونوں ہی اس کی ازدواجی زندگی کے لیے اس کے محبوب کے لیے عذاب بنتے رہتے تھے۔ یوں نفرت اور غصے میں عقل نہیں آرہی تھی کہ مراد سے بہر حال دوستی ہوگئی ہے۔ اسے محبوب کے اغوا ہونے کی اطلاع دینی چاہیے۔ معروف بھی سوچ رہا تھا کہ مراد ہزاروں میل دور ریاست کا حکمران بن گیا ہے، وہ اتنی دور سے کچھ نہیں کرپائے گا۔

ادھر مراد سیاسی اور عسکری معاملات میں الجھا ہوا تھا۔ اسے ماروی اور محبوب کی طرف سے اطمینان تھا کہ وہ عیش و آرام سے ہوں گے۔ جب اسے سکون اور سہولتیں نصیب ہوتیں تب وہ محبوب سے فون پر سلام دعا کرتا۔

ایک محبوب ہی اسے فوراً مدد کے لیے پکار سکتا تھا لیکن اغوا کرنے والوں نے اس سے فون چھین لیا تھا۔ وہ ساحل سمندر پر آکر اسے لے کر ایک اسپیڈ بوٹ میں بیٹھ گئے تھے۔ پھر وہاں سے میلوں دور ایک بحری جہاز میں اسے لے آئے تھے۔ وہ جہاز کراچی کی بندرگاہ میں مال اتارنے کے بعد گہرے پانی میں کھڑا ہوا تھا۔ سپر پاور نے اس پورے جہاز کو کرائے پر حاصل کرلیا تھا۔

اس جہاز میں کوئی مسافر نہیں تھا۔ اسے عارضی طور پر محبوب کے لیے جیل بنا دیا گیا۔ مختلف اسپیڈ بوٹ اور ہیلی کاپٹر کے ذریعے آرمی کے افسران اور سپاہی وہاں پہنچ رہے تھے۔ یہ اندیشہ نہیں تھا کہ مراد کہیں سے اچانک آپہنچے گا۔ چاروں طرف گہرا سمندر تھا۔ وہ ہزار کمالات دکھانے کے

باوجود نظروں میں آئے بغیر بحری جہاز تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔

محبوب کے ساتھ کسی طرح کا ظالمانہ سلوک نہیں کیا جارہا تھا۔ اسے وہاں آزاد چھوڑ دیا گیا تھا۔ اس کا فون چیک کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ کسی نمبر کو بہت زیادہ استعمال کرتا رہا ہے۔ اب سے بارہ گھنٹے پہلے جب وہ لندن کے ائرپورٹ میں تھا تو اس نے ایک گھنٹے تک کسی سے لمبی باتیں کی تھیں۔

آرمی کے ایک افسر نے اس سے پوچھا۔ ''یہ نمرہ کون ہے؟''

محبوب نے پوچھا۔ ''میرے پرسنل معاملات کی کھوج کیوں لگا رہے ہو؟ میں کب سے پوچھتا آرہا ہوں کہ مجھے کیوں اغوا کیا جارہا ہے؟ لیکن کوئی جواب نہیں دے رہا ہے۔''

وہ افسر سخت لہجے میں بولا۔ ''جو سوال کیا جارہا ہے، اس کا جواب دو۔ یہ نمرہ کون ہے؟''

''میری ایک گرل فرینڈ ہے۔''

''اس کا رہائشی ایڈریس بتاؤ۔''

''میں نہیں جانتا۔ اس سے نئی دوستی ہوئی تھی۔''

''جھوٹ بولتے ہو۔ یہ ماروی ہے۔ اس نے نام بدل لیا ہے اور شاید چہرہ بھی بدل چکی ہے۔''

''ماروی سے بھی میری دوستی تھی۔ پھر وہ مجھے چھوڑ کر کہیں چلی گئی ہے۔''

''تم جھوٹ بولتے رہو، ہمارے پاس ماروی کا سیل نمبر آگیا ہے۔ اس نے لندن میں فون کی سم جہاں سے خریدی ہوگی، وہاں سے اس کے ضروری کوائف معلوم ہوجائیں گے۔''

اس افسر نے محبوب سے دور جاکر اسکاٹ لینڈ کے ایک سراغ رساں سے رابطہ کیا۔ وہ سراغ رساں اس ٹیم میں شامل تھا جو لندن میں ماروی کو تلاش کررہی تھی۔ اسے نمرہ کا فون نمبر دیا گیا۔ سراغ رساں نے کہا۔ ''اب تو میں اسے مکھن کے بال کی طرح نکال لاؤں گا۔''

ان کی ایک ٹیم میں ایک ہندوستانی بھی تھا۔ اس نے ریکارڈ روم کی آڈیو کیسٹ سے مراد کی باتیں سنیں۔ اس کی آواز اور لب و لہجے کو گرفت میں لیا۔ پھر اپنے ساتھیوں کے سامنے مراد کی طرح بولنے لگا۔ سب نے اسے اوکے کیا۔ وہ زبردست نقال تھا۔ بالکل اس کی طرح بول رہا تھا۔

تب اس نے نمرہ کے فون پر اسے کال کی۔ رابطہ ہوتے ہی کہا۔ ''ماروی! میں مراد بول رہا ہوں۔ ایک بری خبر سنا رہا ہوں۔ کراچی میں محبوب کو مراد سمجھ کر اغوا کیا گیا ہے۔''

ایک گھبراہٹ میں مبتلا کرنے والی اطلاع تھی کہ وہ اپنی نمرہ کی حیثیت بھول گئی۔ وہ تڑپ کر بولی۔ ''یا میرے اللہ! یہ کب ہوا؟ دشمن انہیں کہاں لے گئے ہیں؟ میں کراچی جاؤں گی۔''

وہ بولا۔ ''عقل سے کام لو۔ تمہارے کراچی جانے سے دشمن اسے تمہاری جھولی میں لاکر نہیں ڈالیں گے۔ تم اپنی فکر کرو۔ وہ تمہیں ٹریپ کرنے والے ہیں۔ محبوب کا فون انہوں نے چھین لیا ہے۔ اس کے فون سے انہیں تمہارا فون نمبر معلوم ہوگیا ہوگا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ محبوب کو ٹارچر کرکے تمہارا رہائشی پتا معلوم کرنے کی کوشش کررہے ہوں۔ تم فوراً وہاں سے نکلو۔ میں لندن میں ہوں۔ تمہیں دوسری پناہ گاہ میں پہنچاؤں گا۔''

وہ پریشان ہوکر بولی۔ ''یا اللہ...! یہ کیا ہو رہا ہے؟ مجھے بتاؤ میں یہاں سے نکل کر کہاں جاؤں؟''

''فوراً پرنسٹن اسٹریٹ میں پب کے سامنے آؤ۔ میں یہاں انتظار کررہا ہوں۔''

''میں اللہ کا نام لے کر ابھی آرہی ہوں۔''

اس نے فون بند کردیا۔ اپنا بیگ اٹھا کر جانے لگی۔ پھر دروازے پر رک گئی۔ پرنسٹن اسٹریٹ میں دو پب تھے۔ اسے پوچھنا تھا کہ مراد کس پب کے سامنے ہوگا؟

اس نے اپنا فون نکالا۔ اس کے نمبر پنچ کرنا چاہتی تھی۔ ایسے وقت دماغ میں بات آئی۔ یہ مراد کا نمبر نہیں ہے۔ اس نے اپنے فون سے رابطہ کیوں نہیں کیا ہے؟ فون تو اس کے پاس ہی رہتا ہوگا۔ مجھے اس کے نمبر پر کال کرنا چاہیے۔

اس نے ریاست کے کوڈ نمبر کے مطابق مراد کے نمبر پنچ کیے، اسے کان سے لگایا۔ ادھر مراد نے ننھی سی اسکرین پر انجانے نمبر دیکھے کیونکہ نمرہ نے پہلے کبھی اسے کال نہیں کی تھی۔

اس نے بٹن دبا کر فون کو کان سے لگا کر پوچھا۔ ''ہیلو کون؟''

جواب میں جو آواز سنائی دی، اسے سنتے ہی دل کی دھڑکنیں پاگل ہوگئیں۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ''تم نے بتایا نہیں، پرنسٹن کے کس پب کے سامنے ملوگے؟ میں ابھی یہ جگہ چھوڑ دوں گی۔''

وہ شدید حیرانی سے بولا۔ ''یہ کیا کہہ رہی ہو؟ تم پرنسٹن کے کسی پب کے سامنے کیوں جاؤ گی؟ محبوب کہاں ہے؟''

ساری باتیں سمجھ میں آگئیں۔ وہ بولی۔ ''یا خدا! کسی نے تمہاری آواز میں ابھی کہا ہے کہ محبوب کو اغوا کیا گیا ہے۔ اس اپارٹمنٹ میں میرے لیے خطرہ ہے۔ تم پرنسٹن اسٹریٹ میں میرا انتظار کررہے ہو۔ مجھے وہاں جانا چاہیے۔''

''تم کہیں نہ جانا۔ یہ صدمہ پہنچانے والی اطلاع ہے کہ

محبوب کو اغوا کیا گیا ہے۔ میں ابھی حقیقت معلوم کرتا ہوں۔ جس شخص نے تمہیں فون کیا ہے، اس کا نمبر send کرو۔"

اس نے نمبر send کر دیے۔ وہ دوسرے ہی لمحے میں پرنسٹن اسٹریٹ کے ایک پب کے سامنے پہنچ گیا۔ وہاں اسکاٹ لینڈ یارڈ کی گاڑی کے پاس تین مسلح شخص کھڑے ہوئے تھے۔

مراد نے اس نامعلوم شخص کے نمبر پنچ کیے تو معلوم ہو گیا۔ اس کے فون سے رنگ ٹون ابھر رہی تھی۔ اس نے اسکرین پر نمبر پڑھے۔ پھر بٹن دبا کر اسے کان سے لگایا۔

مراد نے فون بند کر دیا۔ اس نے ساتھیوں سے کہا۔ "پتا نہیں کون تھا، لائن کٹ گئی۔"

ایک نے اپنے فون پر وقت دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ ماروی کہاں رہ گئی ہے؟ اسے پھر کال کرو۔"

وہ اس کے نمبر پنچ کرنا چاہتا تھا، مراد نے فون چھین کر اسے زمین پر پھینک دیا۔ اس کے دونوں ساتھیوں نے حیرانی سے فون کو زمین پر پڑے دیکھا۔ ایک نے پوچھا۔ "تم نے اسے مضبوطی سے نہیں پکڑا تھا؟"

اس نے کہا۔ "جیسے پکڑتا ہوں ویسے ہی پکڑا تھا۔ مجھے کچھ ایسا ہی لگا کہ کسی نے ہاتھ سے چھین کر اسے پھینکا ہے۔"

وہ دونوں ہنسنے لگے۔ وہ فون کو اٹھانے کے لیے زمین کی طرف جھکا تو مراد نے اس کے منہ پر ایک کک ماری۔ وہ تکلیف سے کراہتا ہوا سیدھا ہوا۔ دونوں ساتھیوں نے حیرانی سے دیکھا۔ اس کی ناک سے خون بہہ رہا تھا۔

ایک نے چیخ کر پوچھا۔ "او مائی گاڈ۔۔۔ یہ تمہاری ناک سے خون کیوں بہہ رہا ہے؟"

وہ سہم گیا تھا۔ تکلیف سے کراہتے ہوئے بولا۔ "کسی نے مجھے ہٹ کیا ہے۔ یہاں کوئی ہے۔ جو نظر نہیں آ رہا ہے۔"

وہ بے یقینی سے ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ ایک ساتھی رومال سے اس کا لہو پونچھ رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ "یہ کیسے ہو گیا؟ یہ سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے۔ فون زمین پر پڑا ہوا تھا۔"

دوسرے ساتھی نے کہا۔ "اسے تو فون کرو۔ وہ کہاں مر گئی ہے؟"

وہ اسے اٹھانے کے لیے زمین کی طرف جھکا تو اس کے منہ پر بھی ٹھوکر پڑی۔ وہ جھکتے جھکتے سیدھا ہوا۔ مراد نے گھوم کر دوسری کک ماری۔ اس کی صرف ناک سے ہی نہیں، باچھوں سے بھی لہو رسنے لگا۔ اس کا سر گھوم گیا تھا۔

تیسرا زخمی نہیں ہوا تھا۔ مراد نے اس کے منہ پر گھونسا مارا۔ وہ بوکھلا گیا۔ پھر تابڑ توڑ کئی گھونسے منہ اور پیٹ پر پڑتے رہے۔ وہ چکرا کر گر پڑا۔ وہ دونوں سہم کر گاڑی سے لگ گئے۔ تیسرا زمین پر گھسٹتا ہوا ان کے قریب آ گیا۔

انہیں آواز سنائی دی۔ "میں ہوں مراد علی منگی۔ تم لوگ ماروی کو ٹریپ کرنے کی جرأت کر رہے ہو۔ چلو ہمت ہے تو اس فون کو زمین سے اٹھاؤ۔"

ایک نے خوف سے لرزتے ہوئے پوچھا۔ "تت...... تم...... تم نظر نہیں آ رہے ہو؟"

مراد نے کہا۔ "ہاں مگر افسوس...... میرا نادیدہ ہونے کا راز کھولنے کے لیے زندہ نہیں رہو گے۔"

اس نے دو فائر کیے۔ دو جاسوس گولیاں کھا کر گر پڑے۔ تیسرا بھاگنے کے لیے فوراً ہی دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر آیا۔ مراد نے گاڑی کی چابی نکال لی پھر کہا۔ "اپنے اعلیٰ افسر کو کال کرو...... اور خبردار! میرے نادیدہ ہونے والی بات بولنا چاہو گے تو اس سے پہلے ہی گولی چل جائے گی۔"

اس نے اعلیٰ افسر کے نمبر پنچ کیے پھر رابطہ ہونے پر بولا۔ "سر! ہم ماروی کو ٹریپ نہیں کر سکیں گے۔ مراد آ گیا ہے۔ اس نے جیکب اور ولسن کو گولی ماری ہے۔ اب میں نشانے پر ہوں۔"

مراد نے اس سے فون لے کر اپنے کان سے لگایا۔ وہ بول رہا تھا۔ "وہ یہاں کیسے آ سکتا ہے؟ وہ تو اپنی ریاست میں ہے۔"

وہ سرد لہجے میں بولا۔ "تم لوگوں کی موت بن کر آ گیا ہوں۔ تم سب شرافت سے امن و امان سے رہنا نہیں چاہتے۔ اللہ تعالیٰ کی امان میں رہنے والی ماروی کا گھر برباد کرنا چاہتے ہو۔ ابھی پندرہ منٹ کے بعد تمہارا گھر برباد ہو گا۔ فوراً اپنے بیوی بچوں کو گھر سے دور جانے کے لیے بولو۔ وہاں آگ لگنے والی ہے۔"

اس اعلیٰ افسر نے کہا۔ "کیا بکواس کر رہے ہو؟ کیا میرے گھر میں گھسنا بچوں کا کھیل ہے؟ ایسی سخت سیکیورٹی ہوتی ہے کہ باہر گیٹ کے سامنے بھی قدم نہیں رکھ سکو گے۔"

"ٹھیک پندرہ منٹ کے بعد دیکھ لو گے۔ ابھی گھڑی دیکھو۔"

اس نے گاڑی میں بیٹھے ہوئے تیسرے شخص کو گولی مار کر کہا۔ "تمہارے تین جونیئر افسر اور جاسوس اس جرم کی سزا پا چکے ہیں کہ انہوں نے ماروی کو ٹریپ کرنے کی کوشش کی تھی۔ میں تمہیں جان سے نہیں ماروں گا لیکن تمہاری زندگی کو عذاب بنا دوں گا۔ تمہیں اپاہج بنا دوں گا۔ تمہارا

انجام دیکھ کر دوسرے افسران ماروی کی طرف جانے سے توبہ کریں گے۔"

اس نے فون بند کر کے اسے پھینک دیا۔ پھر اس اعلیٰ افسر کے پاس پہنچ گیا۔ وہ اپنے فون پر اپنے بنگلے کے سیکیورٹی افسر کے نمبر پنچ کر رہا تھا۔ رابطہ ہونے پر اسے حکم دے رہا تھا کہ وہ پوری طرح چوکنے رہیں۔ وہاں مراد علی منگی آنے والا ہے۔ آگے پیچھے کی احاطے کی دیواروں پر نظر رکھی جائے۔ وہ دیوار پھلانگ کر آسکتا ہے۔ کسی کتے کو بھی مین گیٹ کے سامنے آنے اور وہاں رکنے کی اجازت نہ دی جائے۔

وہ اچھی طرح تاکید کرنے کے بعد اپنے دفتری کمرے سے باہر آیا۔ عمارت کے باہر اپنی کار میں بیٹھ گیا۔ ایسے وقت اس کے فون سے رنگ ٹون ابھر رہی تھی۔ مراد نے پچھلی سیٹ پر بیٹھ کر مخاطب کیا۔ "ہیلو۔ دس منٹ گزر چکے ہیں۔"

وہ اعلیٰ افسر فون کو کان سے لگائے ہوئے تھا۔ اسے یوں لگا جیسے مراد فون سے نہیں بول رہا ہے، قریب ہی بیٹھا ہوا ہے۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ کار کی پچھلی سیٹ پر کوئی نہیں تھا۔

مراد نے کہا۔ "میں جانتا ہوں۔ تمہارا ملک سپر پاور کا اتحادی ہے اور تم اس کی خاطر مجھ سے دشمنی کر رہے ہو۔ میری ماروی کی طرف کیا جاؤ گے، تم تو اپنی گھر والی کو بھی بچانے کے لیے وقت پر پہنچ نہیں سکو گے۔"

وہ حیرانی سے کبھی پچھلی سیٹ کی طرف تک رہا تھا اور کبھی اپنے فون کو تک رہا تھا۔ آواز فون سے آرہی تھی اور بولنے والا بالکل قریب لگ رہا تھا۔

مراد فون بند کر کے بنگلے کے اندر پہنچ گیا۔ اس افسر کی بیوی اور دو بچے بیڈروم میں تھے۔ اس نے کچن میں آکر چولہوں سے گیس پائپ کو علیحدہ کیا۔ وہاں گیس کی بو پھیلنے لگی۔ اس نے کچن سے ذرا دور ہو کر چولہا جلانے کے فائر شوٹر کے ٹریگر کو دبایا تو یکبارگی آگ بھڑک گئی۔

پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ آگ بنگلے کے اندر دوسرے حصوں میں پھیلنے لگی۔ وہ خاتون چیخیں مارتی ہوئی گود کے بچے کو اٹھا کر باہر کی طرف بھاگنے لگی۔ دوسرا بیٹا چھ برس کا تھا۔ وہ کسی دوسرے کمرے میں تھا۔ آگ کے شعلے وہاں تک آگئے تھے۔

وہ ماں ایک بچے کو گود میں لے کر دوسرے بیٹے کو بچانے کے لیے آگ کے شعلوں میں نہیں جاسکتی تھی۔ روتی ہوئی چیختی ہوئی باہر آئی۔ وہاں چھ مسلح گارڈز تھے۔ وہ بھی جلتے ہوئے مکان کے اندر جانے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔

کمرے کے دروازے پر شعلے بھڑک رہے تھے۔ اندر بچہ رو رہا تھا۔ مراد نے وہاں پہنچ کر اسے بازوؤں میں اٹھایا۔ اس نے مراد سے لپٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ دوسرے ہی لمحے میں اسے ٹھنڈی ہوا کے جھونکے محسوس ہوئے۔ اس نے آنکھیں کھولیں تو خود کو باغیچے میں پایا۔ کوئی شخص اسے وہاں چھوڑ کر دوڑتا ہوا مین گیٹ کی طرف جارہا تھا۔ تمام گارڈز اپنی مالکن کے پاس آگئے تھے لیکن ان کے لیے کچھ کر نہیں سکتے تھے۔

اعلیٰ افسر تیزی سے کار ڈرائیو کرتا ہوا آیا۔ مین گیٹ کھولنے کے لیے وہاں کوئی موجود نہیں تھا۔ وہ اپنے جلتے ہوئے مکان کو دیکھتا ہوا کار سے باہر آیا۔ ایسے ہی وقت مراد نے سامنے آکر کہا۔ "جلتے ہوئے مکان کو دیکھو اور سمجھو اگر میں اسے نہ جلاتا تو تم لوگ ماروی کا ہنستا بستا گھر برباد کر دیتے اور کر رہے ہو۔ ماروی کو اس کے شوہر سے جدا کر رہے ہو۔"

یہ کہہ کر اس نے افسر کے ایک گھٹنے پر گولی ماری۔ وہ اپنا اسلحہ نہ نکال سکا۔ لڑکھڑا کر زمین پر گر پڑا۔ مراد نے کہا۔ "آج سے تم اپاہج بن کر زندگی گزارو گے۔"

اس نے دوسرے گھٹنے پر گولی ماری۔ گارڈز فائرنگ کی آواز سن کر دوڑتے ہوئے آرہے تھے۔ مراد بھاگتا ہوا احاطے کی دیوار کے موڑ پر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ دو گارڈز اس افسر کو اٹھا کر اسپتال لے جانے کے لیے ایک گاڑی میں لے آئے۔ باقی دو گارڈز دور تک دوڑتے ہوئے مراد کو تلاش کرنے لگے۔ اس وقت تک فائر بریگیڈ والے آگئے تھے۔

پورے اسکاٹ لینڈ یارڈ میں اور لندن کے پولیس ڈیپارٹمنٹ میں ہلچل مچ گئی۔ تمام سرکاری اداروں کے جاسوس اور جرائم کی دنیا سے تعلق رکھنے والے دشمن اسے تلاش کرنے لگے۔ یہ ان سب کے لیے سنہری موقع تھا۔ ان کے خیال میں مراد ایک مدت کے بعد ریاست سے باہر آیا تھا۔ اسے کسی بھی طرح گھیر کر مارا جاسکتا تھا اور وہ جی جان سے اسے تلاش کر رہے تھے۔

تلاش کرنے کے لیے ماروی کے فون نمبر کا سہارا تھا۔ یہ معلوم کیا جارہا تھا کہ ماروی نے فون کی وہ سم کہاں سے خریدی ہے۔ دشمنوں کو دوسری بات یہ معلوم ہوئی تھی کہ ماروی کا موجودہ نام ثمرہ ہے۔ مراد اسے محبوب کے ذاتی اپارٹمنٹ

میں لے آیا۔ انیس عالم کو سمجھا دیا کہ نمرہ کے بارے میں انکوائری کی گئی تو انہیں مظلوم بن کر کیا جواب دینا ہے۔

جو گورنس ماروی کو تعلیم دینے آتی تھی، اس نے سراغ رسانوں سے کہہ دیا کہ وہ ایک اپارٹمنٹ میں نمرہ نامی ایک حسین عورت کو تعلیم دیتی ہے۔ اس کا بیان سنتے ہی وہ تمام جاسوس انیس عالم پر چڑھ دوڑے۔

انیس عالم نے ان کے سوالات کے جواب میں کہا۔

''مراد نے ہمارے پوتے سرفراز کے لیے تین لاکھ ڈالرز خرچ کیے ہیں۔ ہم ان کے احسان مند ہو گئے ہیں۔ ہم نہیں جانتے تھے کہ وہ مراد علی منگی ہیں اور جس لڑکی کو ہم نے اپنی پوتی نمرہ بنایا ہے، اس کا نام ماروی ہے۔''

افسر نے کہا۔ ''تم نے کسی کو بھی اپنی پوتی نمرہ بنا کر اس کے برتھ سرٹیفکیٹ اور اسکول کے سرٹیفکیٹ کے ذریعے مجرمانہ حرکت کی ہے۔ تم میاں بیوی کو حراست میں لیا جاتا ہے۔''

مراد نے فون پر کہا۔ ''وہ بزرگ ہیں۔ انہوں نے اپنے حالات سے مجبور ہو کر میرا ساتھ دیا تھا۔ انہیں جیل میں ڈالنے کے لیے اس اپارٹمنٹ سے باہر نہ لے جانا۔ تمہارا ایک اعلیٰ افسر دونوں پیروں سے اپاہج بن گیا ہے۔ عبرت حاصل کرو۔ ان بزرگوں کو چھوڑ دو باہر جاؤ اور ماروی کو تلاش کرو۔''

ایک افسر نے پوچھا۔ ''تم نے اس افسر کے بنگلے میں آگ کیسے لگائی تھی جبکہ باہر سخت پہرا تھا۔''

اس نے کہا۔ ''موت اور شامت کو کوئی پہرے دار نہیں روک سکتا۔ یقین نہ ہو تو آزمالو۔ ان بزرگوں کو حراست میں لو گے تو اپارٹمنٹ کے باہر نہیں آسکو گے۔''

وہاں ایک افسر اور تین سپاہی تھے۔ وہ چاروں سوچ میں پڑ گئے۔ اسپتال میں زخمی افسر نے بیان دیا تھا کہ مراد کا چیلنج کبھی قبول نہ کرو۔ وہ کوئی ایسی واردات کر جاتا ہے جو ہماری سوچ سے باہر ہوتی ہے۔

افسر نے اپنے فون کو دیکھا پھر اسے کان سے لگا کر بولا۔ ''مسٹر مراد! اگر ہم انہیں گرفتار کر کے یہاں سے لے جائیں گے تو تم ہمارے خلاف کیا کرو گے؟''

ایک سپاہی کے فون سے رنگ ٹون ابھرنے لگی۔ اس نے ننھی سی اسکرین کو دیکھ کر افسر کی طرف فون بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''سر! آپ کی وائف کال کر رہی ہیں۔''

افسر نے کہا۔ ''تم دیکھ رہے ہو۔ میں کتنی اہم باتیں کر رہا ہوں۔ روزی سے بولو میں مصروف ہوں۔ بعد میں کال کرے۔''

وہ افسر کی وائف روزی سے یہی کہنے لگا۔ ادھر افسر نے پوچھا۔ ''مسٹر مراد! ہمیں بتاؤ کہ ابھی ہمارے خلاف کیا کر سکتے ہو جبکہ اندر اور باہر ہمارے مسلح سپاہی موجود ہیں۔''

مراد نے کہا۔ ''تمہاری وائف بتا رہی ہے۔ اسے سنو۔''

اسی وقت سپاہی نے کہا۔ ''سر! میڈم کہہ رہی ہیں کہ مراد آپ کے گھر میں ہے۔ میڈم اور بچے اس کے نشانے پر ہیں۔''

افسر نے لپک کر اس فون کو لیتے ہوئے پوچھا۔

''روزی! تم بچوں کے ساتھ خیریت سے ہو؟''

دوسری طرف سے روزی قہقہہ لگانے لگی۔ اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ''کیوں ہنس رہی ہو؟''

وہ بولی۔ ''اگر میں یہ نہ کہتی کہ گن پوائنٹ پر ہوں تو تم فون اٹینڈ نہ کرتے۔ او مائی ڈیئر الفریڈ! میں کیا بتاؤں کہ مراد کتنے اچھے انسان ہیں۔ وہ جو مہنگا نیکلس تم خرید نہیں سکے تھے، وہ میرے لیے لے کر آئے ہیں۔ انہوں نے مجھے بہن کہہ کر میری پیشانی کو کس کیا ہے۔ بچوں کے لیے بہت شاندار گفٹس لے کر آئے ہیں اور۔۔۔''

افسر نے پوچھا۔ ''اور......؟''

''اور ان کے ہاتھ میں ریوالور بھی ہے۔ مجھ سے پوچھ رہے ہیں، یہ بھائی بہن کے پیار کا رشتہ اچھا ہے یا بندوق کی گولی اچھی ہے۔ تم کسی غلطی یا جرم کے بغیر ماروی کو گرفتار کرنا چاہتے ہو۔ سوچو کہ یہ دشمنی مجھ کو اور معصوم بچوں کو کتنی مہنگی پڑے گی؟''

وہ افسر جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ مراد نے اس کی بیوی اور بچوں کو پھولوں کی مسند پر بٹھایا تھا اور اس مسند کے نیچے بارود بچھا دی تھی۔ اس کا عمل پوچھ رہا تھا...... تعمیر چاہتے ہو یا تخریب؟ سلامتی چاہتے ہو یا موت؟ وہ فی الحال اس کی بیوی اور بچوں کے پاس محبت سے بیٹھا ہوا تھا اور انہیں مسرتیں دے رہا تھا۔

اس نے ایک گہری سانس لی اور فیصلہ کر لیا۔ اپنے فون پر ایک اعلیٰ افسر سے کہا۔ ''سر! میں نے اپنی سروس کے دوران بڑے کارنامے انجام دیے ہیں۔ ماروی کو گرفتار کرنے کا کارنامہ انجام نہیں دے سکوں گا۔ پلیز آپ میری ڈیوٹی بدل دیں۔''

اعلیٰ افسر نے پوچھا۔ ''ایسی کیا بات ہو گئی ہے؟ کیا مراد علی منگی کی دھونس میں آ گئے ہو؟''

وہ بولا۔ ''سر! یہ جرائم سے پاک محبتوں اور رشتوں کی باتیں ہیں۔ میری باتیں آپ کی سمجھ میں نہیں آئیں گی۔ جس دن مراد سمجھائے گا تو آپ اچھی طرح سمجھ لیں گے۔ سوری

سرا میں ڈیوٹی چھوڑ رہا ہوں۔"

اس نے فون بند کیا پھر صوفے سے اٹھ کر انیس عالم سے مصافحہ کرتے ہوئے بولا۔ "سوری۔ میں نے آپ کو تکلیف دی ہے۔ آپ مراد کے بہت مضبوط قلعے میں ہیں۔ کوئی آپ کو پریشان نہیں کرسکے گا۔"

وہ سپاہیوں کے ساتھ اپارٹمنٹ سے باہر آکر اپنی گاڑی میں بیٹھا تو روزی نے فون پر کہا۔ "بھائی مراد جاچکے ہیں۔ انہوں نے جاتے وقت میرے سر پر ہاتھ رکھا تھا۔"

"میں آرہا ہوں۔" اس نے فون بند کر کے زیرلب کہا۔ "یہ درست ہے مراد کوئی ایسی واردات کرجاتا ہے جو ہماری سوچ سے باہر ہوتی ہے۔ بائی گاڈ...! ایسی پیار بھری واردات کبھی کسی نے نہیں کی ہوگی۔"

وہ گاڑی اسٹارٹ کر کے جانے لگا۔ اس کے آگے پیچھے کئی مسلح سپاہیوں کی گاڑیاں تھیں۔ انہیں توقع تھی کہ وہاں مراد سے مقابلہ ہوگا لیکن ایک بھی گولی نہیں چلی تھی۔

ایک افسر کے توبہ کرنے سے دوسرے تمام دشمن نہ کان پکڑنے والے تھے، نہ دشمنی سے باز آنے والے تھے۔ جو طاقتور ہوتے ہیں' وہ طاقت کی ہی زبان سمجھتے ہیں۔ ڈنڈے پڑتے رہیں، تب ہی وہ توبہ کرتے ہیں۔ یہ ازل سے ہوتا آیا ہے، ابد تک ہوتا رہے گا۔

دوسرا مراد بحری جہاز میں پہنچا ہوا تھا۔ چاروں طرف پانی تھا۔ وہ جہاز گہرے پانی میں ایک جزیرے کی طرح ابھرا ہوا تھا۔ کوئی وسیع و عریض و عمیق سمندر سے گزر کر اس جزیرے تک نہیں آسکتا تھا۔ کوئی بھی کشتی یا موٹر بوٹ یا کوئی اسٹیمر ادھر آتا تو تمام بندوقوں کا رخ اسی سمت میں ہوجاتا۔ آنے والوں کو واپس جانے پر مجبور کردیا جاتا۔

محبوب وہاں آزاد تھا۔ وہ عرشے پر آکر چاروں طرف ٹہلتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ دیکھنے کے لیے حد نظر تک پانی ہی پانی تھا اور چاروں طرف ان پانیوں میں جھکتا ہوا آسمان تھا۔ یہ دیکھ کر وحشت ہوتی تھی کہ رنگ برنگے ملبوسات میں ہنستے بولتے بچے، بوڑھے، حسین عورتیں اور محنت کش جوان نہیں تھے۔ چلتی پھرتی گاڑیاں اور نت نئے تماشے نہیں تھے۔ وہ انسانی آبادی سے محروم ہوگیا تھا۔

جہاز میں خدمات انجام دینے کے لیے حسین عورتیں تھیں۔ وہاں موسیقی تھی۔ پاپ میوزک گونجتا رہتا تھا اور حسین عورتیں فوجی افسران کے ساتھ ناچتی گاتی اور شراب کی مستی میں مست ہوتی رہتی تھیں۔ محبوب کو کبھی کسی عورت سے دلچسپی نہیں رہی۔ اس نے خانہ کعبہ میں توبہ کی تھی کہ نشے کو ہاتھ نہیں لگائے گا اور وہ کبھی توبہ توڑنے والا نہیں تھا۔

وہ ڈائننگ ہال میں ان سب سے دور ایک میز پر کھاتا پیتا تھا۔ دوسری میزوں پر افسران حسیناؤں کے ساتھ پی رہے تھے اور کھا رہے تھے اور کھاتے کھاتے بھی مستیاں فرما رہے تھے۔ ڈائننگ ہال کا دوسرا حصہ سپاہیوں کے لیے وقف تھا۔

ایسے وقت مراد ایک ایک میز کے قریب آرہا تھا اور کھانے کی ڈشوں میں ایک سفوف چھڑکتا جارہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہی ان سب کے پیٹ میں گڑبڑ ہونے لگی۔ وہ ٹوائلٹ کی طرف جانے لگے۔

اس جہاز کے اوپر نیچے کے فلور میں بیس ٹوائلٹ تھے۔ ان تمام ٹوائلٹ کے سامنے قطاریں لگ گئیں۔ جو کھا رہا تھا، وہ قطار میں لگنے آرہا تھا اور دروازے پیٹ رہا تھا کہ جلدی باہر آؤ۔

جہاز کا کپتان اور آرمی کے افسران کچن کے انچارج کو باتیں سنا رہے تھے۔ وہ قسمیں کھا رہا تھا کہ اس نے پکوان میں غلطی نہیں کی ہے لیکن کوئی ماننے کو تیار نہیں تھا۔ وہاں کوئی لیبارٹری نہیں تھی۔ پکوان کی خرابی معلوم نہیں کی جاسکتی تھی۔

وہاں ایک ڈاکٹر، دو نرسیں اور دو کمپاؤنڈر تھے۔ وہ بھی دوسروں کی طرح بار بار ٹوائلٹ یاترا کررہے تھے۔ موشن روکنے کے لیے جو دوائیں رکھی ہوئی تھیں، انہیں کھا رہے تھے اور دوسروں کو کھلا رہے تھے۔

اس روز کچن میں جتنا پکوان ہانڈیوں میں تھا، ان سب کو سمندر میں پھینک دیا گیا تھا۔ رات کو کسی نے ڈنر نہیں کیا، سب کی حالت پتلی تھی۔ پیٹ میں درد رک رک کر ہورہا تھا۔ ڈائننگ ہال کے اسٹیج پر ناچنے گانے والیاں دوسروں کی طرح بیڈ پر پڑی ہوئی تھیں۔ ایسے وقت کہیں سے دشمن فوج حملہ کرتی تو جہاز کی پوری آرمی اپنے بیڈ پر یا ٹوائلٹ میں ماری جاتی۔

محبوب حیرانی سے دیکھ رہا تھا کہ جہاز کے تمام لوگ دوپہر سے رات تک ٹوائلٹ کی طرف جارہے تھے' آرہے تھے۔ صرف وہی ایک محفوظ تھا۔

وہاں کے تمام متاثرین یہ سمجھ رہے تھے کہ محبوب بھی متاثر ہورہا ہے۔ رات کو ڈنر کے وقت کوئی ڈائننگ ہال میں نہیں آیا۔ تمام سپاہی نڈھال ہوکر گراؤنڈ فلور میں پڑے ہوئے تھے۔ افسران میں اتنی سکت نہیں رہی تھی کہ اپنے اپنے کیبن سے باہر آتے۔ انہیں آرام آگیا تھا۔ موشن رک

گئے تھے لیکن ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے تھے۔

محبوب کیبن سے باہر آیا تو پورے جہاز میں ویرانی اور سناٹا تھا۔ اگر وہ فرار ہونا چاہتا تو ایک بھی سپاہی اٹھ کر اسے روکنے نہ آتا۔ ایمرجنسی کے لیے دستور کے مطابق دو موٹربوٹس جہاز کے نچلے حصے میں تھیں۔ اس کے ذہن میں وہاں سے فرار ہونے کی بات آئی لیکن سپاہی اگرچہ چلنے پھرنے کے قابل نہیں تھے تاہم کسی حد تک اٹھنے بیٹھنے کے قابل تو تھے۔ وہ دور سے فائر کرتے ہوئے رکاوٹ بن سکتے تھے۔ پھر یہ کہ حدِ نظر تک پانی ہی پانی تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ کراچی کے ساحل تک جانے کے لیے کس سمت موٹربوٹ کو ڈرائیو کرنا ہوگا۔

ادھر ماروی، محبوب کے اس اپارٹمنٹ میں دشمنوں سے چھپی ہوئی تھی جہاں اس نے کراچی سے آنے کے بعد پہلی بار قیام کیا تھا۔ مراد اس کا محافظ تھا۔ وہ ایک دوسرے کے لیے نامحرم تھے۔ اس لیے وہ اس سے پردہ کررہی تھی۔

مراد اگرچہ نادیدہ ہوکر اس کے بالکل قریب آسکتا تھا۔ اسے جی بھر کے دیکھ سکتا تھا لیکن دل میں خوفِ خدا تھا۔ اس نے بابا اجمیری کے ساتھ نمازیں پڑھتے ہوئے اپنے رب سے وعدہ کیا تھا کہ آئندہ ماروی کا نام بھی اپنی زبان پر نہیں لائے گا۔

فی الحال حالات نے دونوں کو ایک دوسرے کے قریب رہنے پر مجبور کیا تھا۔ دونوں ہی پردے کے پابند تھے۔ مراد کو اس کی حفاظت کرنے اور اس کی تمام ضروریات پوری کرنے کے لیے کبھی بہت ہی قریب ہونا پڑتا تھا۔ اس وقت بھی ماروی نقاب میں رہتی تھی۔ وہ محبوب کے لیے پریشان تھی۔

مراد نے کہا۔ ''اس کی فکر نہ کرو۔ میں محبوب صاحب کو جلد ہی کراچی پہنچادوں گا۔''

وہ بولی۔ ''تم کہتے ہو، انہیں کسی بحری جہاز میں قیدی بنا کر رکھا گیا ہے۔ وہاں گہرے سمندر میں تم کیسے جاسکو گے؟''

''تمہیں جلد ہی معلوم ہوجائے گا کہ وہاں تک کیسے جاتا ہوں اور واپس آتا ہوں۔ وہ بڑے آرام سے ہیں۔ آج تم کسی وقت فون پر ان سے باتیں کرسکوگی۔''

وہ خوش ہوکر بولی۔ ''خدا کا شکر ہے۔ تم بہت اچھے ہو مراد! اللہ تعالیٰ تمہیں نیکیوں کا صلہ دے گا۔''

''آج اس جہاز میں کھانے پینے کا مسئلہ ہے۔ تم محبوب کے لیے ایک وقت کا کھانا پیک کردو۔ آج وہ تمہارے ہاتھ کا پکا ہوا کھائے گا۔''

اس نے بڑے شوق سے بڑے جذبے سے محبوب کی پسندیدہ ڈشیں تیار کیں۔ پھر اس کے نام خط لکھا۔ ''محبوب! آپ کہاں ہیں؟ کیا میرے نصیب میں یہی لکھا ہے کہ میں اپنے چاہنے والوں سے بچھڑتی رہوں؟ ایسے برے وقت میں مراد رحمت کا فرشتہ بن گئے ہیں۔ انہوں نے وعدہ کیا ہے کہ آج آپ سے فون پر باتیں کرائیں گے اور آپ کو جلد ہی قید سے رہائی دلائیں گے۔ میں انتظار کررہی ہوں۔ پلیز اپنی آواز سنائیں۔''

محبوب ابھی بے خبر تھا کہ مراد کیا کرتا پھر رہا ہے۔ وہ جہاز سے فرار ہونے کی تدبیریں سوچ رہا تھا۔ یہ موقع اچھا تھا۔ پوری آرمی ٹوائلٹ یاترا کرتے کرتے نڈھال ہوگئی تھی۔ اگر وہ فائر کرتا ہوا وہاں سے موٹربوٹ لے کر فرار ہوتا تو بہت زیادہ رکاوٹیں پیش نہ آتیں۔ اس کے پیچھے دوڑنے کی سکت کسی میں نہیں رہی تھی۔ پھر بھی حوصلہ نہیں ہورہا تھا۔ اس نے کبھی کسی ایک دشمن کے مقابلے میں بھی گن نہیں چلائی تھی جبکہ وہاں آرمی تھی۔ وہ مراد کی طرح بدلتے ہوئے حالات کے مطابق جنگ لڑنے کی تکنیک نہیں جانتا تھا۔ پھر یہ کہ وہ رات کی تاریکی میں ایسے سمندر کی لہروں پر سفر نہیں کرسکتا تھا، جس کا کنارہ نہیں تھا۔ وہ موٹربوٹ میں بھٹک کر کسی کنارے سے دور بھٹکتا رہتا تو پیٹرول ختم ہوجاتا، وہ بیچ سمندر میں بیٹھا رہ جاتا۔

وہ اپنے کیبن میں بیٹھا ہوا سوچ رہا تھا۔ ایسے ہی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ بیڈ کے سرے سے اٹھ کر دروازے پر آیا۔ پھر اسے کھولتے ہی چونک گیا۔ اس کے سامنے وہ خود کھڑا تھا۔ یعنی اس کا ہم شکل تھا۔ یعنی مراد کھڑا مسکرا رہا تھا۔

اس نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ ''کیا اندر آجاؤں؟''

محبوب اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر کھینچتے ہوئے بولا۔ ''جلدی آؤ۔ کوئی دیکھ لے گا۔ یاخدا! تم اس جہاز میں کیسے آگئے؟''

مراد کے ہاتھ میں ایک بڑا سا ٹفن کیریئر تھا۔ وہ اسے ایک طرف رکھتے ہوئے بولا۔ ''آپ کے لیے کھانا لایا ہوں۔ ماروی نے اپنے ہاتھوں سے پکایا ہے۔''

محبوب دروازے کو اندر سے بند کرکے بولا۔ ''یاخدا... ! تم آئے کیسے؟''

وہ ایک رقعہ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''یہ ماروی کا خط ہے۔ آپ میرے لیے پریشان نہ ہوں۔''

اس نے فوراً ہی اس تہ کیے ہوئے کاغذ کو لپک لیا پھر اسے کھول کر پڑھا۔ اس کے بعد مراد سے پوچھا۔ ''دشمن

ماروی کو پریشان نہیں کررہے نا؟ وہ خیریت سے ہے نا؟"

"جو شیطان صفت ہوتے ہیں، ان کا کام ہی پریشان کرنا ہے۔ وہ اسے بھی ٹریپ کرکے اغوا کرکے کہیں قیدی بنانا چاہتے تھے۔ میں نے ان کی ناپاک کوششوں کو ناکام بنادیا ہے، اسے تمہارے ذاتی اپارٹمنٹ میں پہنچادیا ہے۔ وہ وہاں روپوش رہتی ہے۔ وہاں محفوظ ہے اور آرام سے ہے۔"

"مجھے اندازہ ہے کہ تم نے کس طرح دشمنوں سے مقابلہ کیا ہوگا۔ میں نے یہاں سے فرار ہونے کی تدبیر سوچی ہے لیکن مجھے دشمنوں سے مقابلہ کرنا نہیں آتا۔"

مراد نے کہا۔ "آپ شریف آدمی ہیں۔ بدمعاشوں کے ساتھ بدمعاش نہیں بن سکیں گے۔ میں آپ کو یہاں سے لے جاؤں گا۔ پہلے آرام سے کھانا کھائیں۔"

"کھاؤں گا۔ میری حیرانی دور کرو۔ یہاں بیچ سمندر میں جہاز کے اندر کیسے آگئے؟"

وہ ذرا چپ رہا پھر بولا۔ "اللہ تعالیٰ قوی ہے اور بڑی قدرت والا ہے۔ وہ معبود نمرود کی بھڑکائی ہوئی آگ کو گلزار بنادیتا ہے۔ موسیٰؑ کے عصا کو اژدہا بنا کر فرعون کے غرور کو خاک میں ملادیتا ہے۔ میرا معبود میرا پاک پروردگار میری عبادت گزاری کا صلہ مجھے دے رہا ہے۔ اس معبود نے... مجھے ایک غیر معمولی صلاحیت عطا کی ہے۔"

اس نے چپ ہوکر مسکرا کر محبوب کو دیکھا۔ محبوب کی نظروں میں سوال تھا۔ وہ بولا۔ "آپ آنکھیں بند کریں۔"

محبوب نے پوچھا۔ "کیوں؟ کوئی تماشا دکھاؤ گے کیا؟"

"یہی سمجھیں۔ پلیز ایک سیکنڈ کے لیے آنکھیں بند کرکے کھولیں اور تماشا دیکھیں۔"

اس نے آنکھیں بند کیں پھر دوسرے ہی لمحے میں کھولیں تو حیران رہ گیا۔ مراد نہیں تھا۔ اس نے سر گھما کر دیکھا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ اس نے شدید حیرانی سے پوچھا۔ "مراد! یہ کیا جادو ہے؟ تم کہاں ہو؟"

اسے جواب نہیں ملا۔ اس نے چونک کر دیکھا۔ سامنے چھوٹی سی میز پر رکھا ہوا ٹفن کیریئر کھل رہا تھا۔ ایک ایک ڈش سامنے رکھی جارہی تھی۔ محبوب کی آنکھیں حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں۔ اس نے کہا۔ "مراد! تم یہاں ہو۔ میرے سامنے کھانا رکھ رہے ہو؟"

اس کی آواز سنائی دی۔ "جی ہاں۔ گرم کھانے کا مزہ آئے گا۔ آپ کی ماروی نے اپنے ہاتھوں سے پکایا ہے۔ میں واش روم میں ہاتھ دھونے جارہا ہوں۔ آپ کے ساتھ کھاؤں گا۔"

محبوب نے چند لمحوں بعد واش روم کے دروازے کو دیکھا۔ وہ خود بخود کھل کر پھر بند ہوگیا تھا۔ جو بات ناقابلِ یقین تھی، وہ اس کے سامنے ہورہی تھی۔ اس کی آنکھیں یوں پھیل گئی تھیں جیسے وہ گم ہوجانے والے کو دیکھ لینے کی کوشش کررہا ہو۔

پھر واش روم کا دروازہ کھلا تو وہ نظر آگیا۔ اس کے پاس آکر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "یہ جادو نہیں ہے۔ ایک روحانی صلاحیت ہے۔ میرے رب نے مجھے انعام دیا ہے۔ چلیں، اٹھیں۔ فوراً ہاتھ دھوکر آئیں...... کھانا ٹھنڈا ہورہا ہے۔"

وہ حیرت میں ڈوبا ہوا واش روم میں چلا گیا۔ جلد ہی واپس آکر بولا۔ "ماروی نے لکھا ہے، تم فون پر ہماری باتیں کراؤ گے۔"

"ہاں، کھانے کے بعد۔"

"نہیں مراد! مجھ سے کھایا نہیں جائے گا۔"

"کھانا تو پڑے گا۔ ابھی میرے پاس فون نہیں ہے۔ کھانے کے بعد آئے گا۔ پلیز بسم اللہ کریں۔"

"فون تمہارے پاس ہے۔ تم جھوٹ بول رہے ہو۔"

"آپ سمجھدار ہیں۔ کھانا ٹھنڈا نہ کریں۔"

وہ کھانے لگا۔ مراد نے لقمہ چباتے ہوئے پوچھا۔ "آپ کے پاس پانی کی کتنی بوتلیں ہیں؟"

"فریج میں دو رکھی ہوئی ہیں۔ ایک ہمارے سامنے ہے۔"

"کھانے کے بعد جہاز میں پینے کا جتنا پانی ہے، وہ ناکارہ ہوجائے گا۔ میں ان میں اعصابی کمزوریوں کی دوا ملانے والا ہوں۔"

محبوب نے چونک کر پوچھا۔ "کیا تم نے یہاں کے کھانے میں دوائیں ملائی تھیں؟"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "ہاں سب ہی کو موشن لگ گئے تھے۔ میں یہاں تھا، تماشے دیکھ رہا تھا۔"

محبوب نے کہا۔ "میں حیران ہوکر یہی سوچ رہا تھا کہ صرف میرا ہی پیٹ کیوں ٹھیک ہے۔ پورے جہاز میں صرف میں ہی ایک تماشائی تھا۔ باقی سب تماشا بنے ہوئے تھے۔ اب سب ہی نڈھال ہوگئے ہیں۔ اگر ہم فرار ہونا چاہیں تو..."

وہ بات کاٹ کر بولا۔ "ابھی نہیں۔ یہ لوگ کل تک اعصابی کمزوریوں میں مبتلا ہوجائیں گے۔ پھر ہمارا راستہ روکنے کے قابل نہیں رہیں گے۔ ایک چھوٹی سی گن کو بھی ہاتھوں سے پکڑ نہیں سکیں گے۔ ہم انشاءاللہ کل یہاں سے

نکل جائیں گے۔"

"تم ہمارے معاملات میں الجھے ہوئے ہو۔ ریاست کے معاملات کون سنبھال رہا ہے؟"

"وہاں میرا ہم زاد ہے۔"

محبوب نے کہا۔ "ہم زاد کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ دراصل ہماری زندگی کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک پازیٹو دوسرا نگیٹیو۔ ایک خیر دوسرا شر۔ ایسا ازل سے ہے۔ تمام انسان دہرے کردار کے حامل ہوتے ہیں۔ ہم سب کے اندر صحیح اور غلط، ہاں اور نہ کے درمیان کشمکش جاری رہتی ہے۔"

مراد نے کہا۔ "بے شک، ہم زاد ایک منفی یا مثبت سوچ ہے، وجود نہیں ہے لیکن خدا کی قدرت سے کچھ بعید نہیں ہے۔ میرے اس ہم زاد کو وجود مل گیا ہے۔"

محبوب نے بے یقینی سے پوچھا۔ "کیا کہہ رہے ہو؟ کیا وہ تمہیں اپنے سامنے نظر آتا ہے؟"

"وہ صرف مجھے ہی نہیں ساری دنیا کو نظر آتا ہے۔ ابھی ریاست میں ہے۔ وہاں کے تمام انتظامات سنبھال رہا ہے اور میں یہاں روپوش رہ کر آپ کے اور ماروی کے معاملات سے نمٹ رہا ہوں۔"

"اگر وہ ہم زاد ہے تو منفی سوچ کا حامل ہوگا۔ تم ہمارے ساتھ نیکیاں کر رہے ہو۔ وہ ادھر بدی کا مرتکب ہو رہا ہوگا۔ وہ ریاست میں کچھ گڑبڑ کر رہا ہوگا۔"

مراد نے کہا۔ "یہی ہونا چاہیے۔ ہم زاد کی سوچ ہم سے مختلف ہوتی ہے۔ ہم مشرق کی طرف جاتے ہیں تو وہ مغرب کی سمت لے جانا چاہتا ہے لیکن حضرت صلاح الدین اجمیری کے طفیل ہم زاد ابھی پازیٹو ہے۔ نگیٹیو نہیں ہے۔"

وہ بابا اجمیری کے متعلق تفصیل سے بتانے لگا پھر بولا۔ "وہ میرے مرشد ہیں میں ان کے نقشِ قدم پر چل رہا ہوں۔ میری طرح میرا ہم زاد بھی ان کا مرید ہے۔ اس لیے ان کے زیرِ اثر وہ صحیح راہ پر چل رہا ہے لیکن..."

وہ کہتے کہتے ذرا رک گیا پھر بولا۔ "جیسا کہ میں نے ابھی کہا ہے۔ بابا صاحب میرے ساتھ نمازیں پڑھتے تھے۔ وہ مجھ پر مہربان ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے وسیلے سے مجھ پر رحمتیں اور برکتیں نازل کی ہیں۔ وہ میرے پاس آتے تھے۔ خاموش رہتے تھے۔ میں نے کئی بار ان سے کچھ کہنا چاہا۔ مگر نہ کہہ سکا۔ کچھ کہنا تو دور کی بات ہے، میں سر گھما کر انہیں دیکھ بھی نہیں سکتا تھا۔ کئی دنوں تک ہم نماز کے دوران میں خاموش ہم سفر رہے۔ کل عشا کی نماز کے بعد انہوں نے پہلی بار مجھ سے کہا۔ میں جا رہا ہوں۔ اب نہیں آؤں گا۔ مجھے کہیں تلاش نہ کرنا۔ نماز کبھی نہ چھوڑنا۔ مثبت اور تعمیری اعمال کے حامل رہنا۔ میری عدم موجودگی میں تمہارا ہم زاد مسئلہ بنے گا۔ جب تم صحیح رہو گے تو وہ غلط رہے گا۔ کبھی تم سے غلطی ہوگی تو وہ صحیح ہوگا اور تمہاری اصلاح کرے گا۔ وہ تمہیں نقصان پہنچانے والی دشمنی کبھی نہیں کرے گا۔ تم دونوں کے درمیان نیکی اور بدی کی جنگ جاری رہے گی۔ اللہ تعالیٰ تمہارا حافظ ہے۔ تمہیں نصرت دینے والا ہے۔ وہ خاموش ہو گئے۔ میں نے سر گھما کر دیکھا۔ وہ نہیں تھے، جا چکے تھے۔ یہ کہہ دیا تھا کہ اب نہیں آئیں گے۔ میں انہیں کہیں تلاش نہ کروں۔ مجھے ان کی جدائی کا صدمہ ہے۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ آئندہ کبھی ملاقات ہو سکے گی یا نہیں؟"

وہ دونوں کھانے سے فارغ ہو گئے تھے۔ مراد نے اس کی طرف فون بڑھاتے ہوئے کہا۔ "لو اپنی شریکِ حیات سے باتیں کرو۔ میں پانی میں اعصابی کمزوری کی دوا گھولنے جا رہا ہوں۔"

اس نے اپنی پشت پر سفری بیگ کو رکھا پھر دروازہ کھول کر کیبن سے باہر چلا گیا۔ محبوب نے ماروی کے نمبر پنچ کیے۔ رابطہ ہوتے ہی اس کی آواز سنائی دی۔ "مراد! تم کہاں ہو؟ تم نے کہا تھا، محبوب سے بات کراؤ گے۔"

اس نے کہا۔ "میں محبوب بول رہا ہوں۔"

وہ خوشی سے چیخ پڑی۔ "آپ بول رہے ہیں؟ میں ابھی دعائیں مانگ رہی تھی۔ سجدے میں گڑگڑا رہی تھی کہ آپ کو رہائی ملے۔ آپ آج ہی واپس آجائیں۔ آپ مجھے بتائیں، وہاں آپ کے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟"

"کچھ نہیں ہو رہا ہے۔ کوئی پریشانی نہیں ہے۔ مراد نے کہا ہے، کل تک مجھے یہاں سے نکال کر لے جائے گا۔"

"میں اس کے لیے سلامتی کی دعائیں مانگتی رہتی ہوں۔ وہ طاقتور دشمنوں کو پسپا کر رہا ہے۔ مجھے یہاں تحفظ فراہم کر رہا ہے۔ وہاں آپ کے لیے دشمنوں سے لڑ رہا ہے۔"

محبوب نے کہا۔ "اس پر اللہ تعالیٰ کی رحمتیں نازل ہو رہی ہیں۔ اسے ایسی ناقابلِ یقین صلاحیتیں حاصل ہوئی ہیں کہ تم سنو گی تو حیران رہ جاؤ گی۔ کیا تم یقین کرو گی کہ وہ نادیدہ ہو جاتا ہے۔ سامنے ہوتا ہے مگر دکھائی نہیں دیتا۔"

وہ بے یقینی سے بولی۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"یہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ وہ نادیدہ ہو کر میرے سامنے ٹفن کیریئر کھول رہا تھا اور نظر نہیں آ رہا تھا۔ مجھ سے باتیں کر رہا تھا اور دکھائی نہیں دے رہا تھا۔"

''یہ سن کر یقین نہیں آ رہا ہے۔ لیکن آپ کہہ رہے ہیں تو سچ مان رہی ہوں۔''

''وہ اسی صلاحیت کے ذریعے تمہارا پکایا ہوا کھانا لے کر ہزاروں میل دور چشم زدن میں یہاں آ جاتا ہے۔ گہرا سمندر بھی رکاوٹ نہیں بنتا ہے۔ تم حساب کرو۔ وہ وہاں سے کھانا لے کر یہاں آیا۔ تم سے باتیں کرنے کے لیے اس نے اپنا فون مجھے دیا تب سے اب تک کتنا وقت لگا ہے؟''

وہ بولی۔ ''واقعی ابھی ایک یا ڈیڑھ گھنٹا گزرا ہو گا۔''

''اس نے یہ ڈیڑھ گھنٹا میرے ساتھ گزارے ہیں۔ پہلے اس نے مجھے کھلایا ہے۔ ضروری باتیں کی ہیں۔ وہ چشم زدن میں آیا ہے۔''

''ہاں محبوب! اسے تو بہت بڑی صلاحیت عطا کی گئی ہے۔''

''دوسری ناقابلِ یقین بات یہ ہے کہ اس کا ہم زاد ایک ٹھوس وجود کی صورت میں مجسم ہو گیا ہے۔ یعنی اب ایک نہیں، دو مراد ہیں۔ ایک مراد ہمارے معاملات میں مصروف ہے۔ دوسرا مراد اس وقت ریاستی معاملات کو سنبھال رہا ہے۔''

وہ حیرانی سے سن رہی تھی۔ پھر اس نے بڑی عقیدت سے کہا۔ ''یا اللہ! یہ مراد کیا سے کیا ہو گیا ہے؟ صحیح معنوں میں اللہ تعالیٰ کا نیک بندہ بن گیا ہے۔''

''یہ دیکھو کہ دنیا کے ایک سرے سے دوسرے تک اس کے بے شمار دشمن ہیں۔ وہ سب طاقتور ہیں۔ وسیع ذرائع اور لامحدود اختیارات رکھتے ہیں۔ ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے اسے کرامات سے نوازا ہے۔''

دروازے پر دستک سنائی دی۔ محبوب نے کہا۔ ''مراد آ گیا ہے۔ انشاء اللہ کل یہاں سے رہائی پانے کے بعد تم سے باتیں کروں گا۔ اللہ حافظ۔''

اس نے فون بند کر کے اسے تکیے کے نیچے چھپایا۔ یہ خیال تھا کہ شاید مراد نہ ہو، آرمی کا کوئی سپاہی ہو۔ فون کو کسی کی نظروں میں نہیں آنا چاہیے تھا۔ اس نے دروازہ کھولا تو وہ مراد ہی تھا۔ اس نے اندر آ کر کہا۔ ''اس جہاز میں پینے کا جتنا پانی ذخیرہ کیا گیا تھا، اس میں دوا گھول دی ہے۔ ہر ایک دو گھنٹے کے بعد آ کر یہاں کے حالات دیکھوں گا۔ آپ سے بھی ملتا رہوں گا۔ اب مجھے یہاں سے لندن جا کر دیکھنا ہے کہ ماروی کو تلاش کرنے والے وہاں کیا کر رہے ہیں؟''

وہ اپنا فون اور ٹفن کیریئر لے کر وہاں سے نکلا اور ماروی کے اپارٹمنٹ میں پہنچ گیا۔ فون کے ذریعے اس سے رابطہ کر کے کہا۔ ''میں دروازے پر ہوں۔ یہاں سے ٹفن کیریئر اٹھا کر لے جاؤ اور یہ بتاؤ کسی نے پریشان تو نہیں کیا تھا؟''

''اللہ کا شکر ہے۔ کوئی پریشانی نہیں ہے۔ ابھی کسی دشمن کو شبہ نہیں ہوا ہے کہ میں اس اپارٹمنٹ میں ہوں۔''

''تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہو یا کسی طرح کا اندیشہ ہو تو فوراً مجھے کال کرنا۔ میں جا رہا ہوں۔ دروازے پر آ جاؤ۔''

ماروی فون بند کر کے دروازے کے پاس آئی پھر اسے کھول کر دیکھا۔ مراد نہیں تھا۔ فرش پر ٹفن کیریئر رکھا ہوا تھا۔ ذہن میں یہ بات آئی کہ وہ موجود ہو گا۔ ابھی نادیدہ ہو کر نظروں سے گم ہو کر اسے دیکھ رہا ہے۔

پھر اس نے اس شبہے کو دل سے نکال دیا۔ دل نے کہا۔ ''مجھے ایسا نہیں سوچنا چاہیے۔''

اس نے اعتماد کرتے ہوئے ٹفن کیریئر کو اٹھا کر دروازے کو اندر سے بند کر لیا۔

☆☆☆

وہ ریاست میں آ کر پہلے بشریٰ اور بلّے کے پاس پہنچا۔ رات کے دس بج رہے تھے۔ اس نے فون پر کہا۔ ''میں آیا ہوں۔ دروازہ کھولو۔''

بشریٰ دوڑتی ہوئی آئی پھر اس نے دروازہ کھول دیا۔ مراد کے اندر آنے کے بعد اسے بند کرتے ہوئے کہا۔ ''بھائی! ہمیں کوئی پہچان بتائیں۔ ہم بڑی دیر تک آپ کے ہم زاد سے کسی مسئلے پر بات کرتے ہیں۔ تب اندازہ ہوتا ہے کہ وہ آپ نہیں ہیں۔''

مراد نے پوچھا۔ ''اس سے کس مسئلے پر بات ہوئی تھی؟''

بلّے نے کہا۔ ''اس نے خواتین کے پردے کے متعلق بحث چھیڑ دی تھی۔ کہہ رہا تھا کہ قانون بدلنا چاہیے۔ جو خواتین پردہ کرنا چاہتی ہیں بے شک کریں۔ جو نہیں کرنا چاہتیں، انہیں عبا اور نقاب کے بغیر گھومنے پھرنے کی اجازت دینا چاہیے۔''

بشریٰ نے کہا۔ ''تب میں نے کہا کہ آپ میرے مراد بھائی نہیں ہیں۔ میرے بھائی دینی احکامات کے خلاف کبھی کوئی بات نہیں کرتے ہیں۔''

مراد نے پریشان ہو کر کہا۔ ''بابا اجمیری کہیں چلے گئے ہیں۔ ہم زاد اب اپنی فطرت کے مطابق کبھی کبھی نگیٹیو ہو جایا کرے گا۔ تم دونوں کو محتاط رہنا ہو گا۔ وہ میرے مزاج کے خلاف کبھی بولے گا، کبھی کچھ کر بیٹھے گا لیکن مجھے نقصان نہیں پہنچائے گا۔ میرے دشمنوں کا دشمن رہے

گا۔ اب یہ پردے کی بات چھیڑ کر مجھے نقصان تو نہیں پہنچا رہا ہے لیکن میرے لیے مسئلہ پیدا کر رہا ہے۔ کوئی بات نہیں۔ میں ابھی اس سے نمٹ لوں گا۔''

پھر اس نے کہا۔ ''اپنی پہچان کے لیے کہہ دوں کہ بی سے بشریٰ اور بی ۔۔۔ سے بلا بھی ہوتا ہے۔ آئندہ تم دونوں کے پاس آتے ہی کہوں گا۔ بی بی! میں ہوں مراد۔''

وہ دونوں ہنسنے لگے۔ وہ بولی۔ ''واہ! کیا پہچان پیش کی ہے۔ کیا میں موجود نہیں رہوں گی تو پتے کو کہیں گے کہ بی بی میں ہوں مراد۔۔۔؟''

اس بات پر مراد بھی ہنسنے لگا پھر بولا۔ ''بہر حال میں جا رہا ہوں۔ کسی بھی متنازع مسئلے پر اس سے بھرپور مخالفت کیا کرو۔ اس کے دباؤ میں کبھی نہ آؤ۔''

وہ محل میں آ گیا۔ اس نے تمام کنیزوں کو اور لیڈی سیکیورٹی گارڈز کو محل سے نکال دیا تھا۔ ان کی ملازمتوں کو خواتین کے دوسرے اداروں میں بحال رکھا تھا۔ کسی کو بے روزگار رہنے نہیں دیا تھا۔ اب واپس آ کر دیکھا تو وہاں دو چار حسین عورتیں نظر آئیں۔ مراد نے اس سے پوچھا۔ ''کیا ہو رہا ہے؟ یہاں خواتین کیا کر رہی ہیں؟''

ہم زاد نے کہا۔ ''کھانا عورتوں کو ہی پکانا چاہیے اس لیے میں نے دو عورتیں کچن میں رکھی ہیں اور چار عورتیں پورے محل کی صفائی ستھرائی کے لیے ہیں۔''

مراد نے کہا۔ ''ہم دو مرد یہاں بیویوں سے محروم ہیں۔ اس محل میں ہماری شریکِ حیات آ سکتی ہیں۔ یہاں نامحرم عورتوں کی موجودگی دینی احکامات کے خلاف ہے۔''

اس نے کہا۔ ''تو پھر بیویوں کو آنا چاہیے۔ ہمیں شادی کرنا چاہیے۔ دینی احکامات کے مطابق ہمیں شریکِ حیات کے بغیر نہیں رہنا چاہیے۔''

''درست کہتے ہو۔ تم جب چاہو اپنی پسند کے مطابق کسی سے نکاح پڑھوا لو۔ میں موجودہ مصروفیات میں الجھا ہوا ہوں۔ شادی کی طرف دھیان نہیں ہے۔ پھر بھی کوئی دیندار خاتون پسند آئے گی تو میں اسے شریکِ حیات ضرور بناؤں گا۔''

اس نے منتظمِ اعلیٰ کو بلا کر کہا۔ ''محل میں جتنی خواتین ہیں انہیں یہاں سے رخصت کر دو اور دوسرے اداروں میں ان کی ملازمتیں بحال کرو۔ انہیں بے روزگار نہیں رہنا چاہیے۔''

وہ حکم کی تعمیل کے لیے چلا گیا۔ ہم زاد نے کہا۔ ''تم ریاست میں رہو گے۔ میں دوسرے ملکوں میں جاؤں گا۔ اپنے لیے ایک شریکِ حیات کو تلاش کروں گا۔''

انمول موتی

☆ ہمدردی وہ عالمگیر زبان ہے جسے جانور بھی سمجھ لیتے ہیں۔ (جیمس ایمن)

☆ کسی راجہ نے پرہیزگار سے پوچھا۔ کیا میں تمہیں کبھی یاد آتا ہوں۔ جواب ملا۔ ہاں۔ جب میں خدا کو بھول جاتا ہوں۔ (شیخ سعدیؒ)

☆ اس دنیا میں سب سے مہنگی اور سب سے قیمتی چیز آزادی ہے اور تاریخ بتاتی ہے کہ انسان نے ہر موڑ پر اس کی پوری قیمت ادا کی ہے۔ (کرشن چندر)

☆ اے عورت تو نے اپنے اتھاہ آنسوؤں سے دنیا کے دل کو اس طرح گھیر رکھا ہے جس طرح سمندر زمین کو گھیرے ہوئے ہے۔ (ٹیگور)

☆ آنسوؤں سے جھلملاتی محبت نہایت دلکش ہوتی ہے۔ (والٹر اسکاٹ)

انتخاب۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

مراد نے کہا۔ ''ابھی نہیں۔ ذرا صبر کرو۔ بارہ گھنٹے کے بعد کہیں بھی جا سکو گے۔''

''بارہ گھنٹے تک یہاں کیوں روک رہے ہو؟''

''میں ان شاء اللہ چار چھ گھنٹے کے بعد ہی محبوب کو اس جہاز سے نکال لاؤں گا۔ پھر تمہیں نہیں روکوں گا اور ایک بات سمجھاتا ہوں۔ دینی احکامات کے خلاف نہ کبھی سوچو، نہ کبھی بولو۔ ہمارے مذہب میں حیا اور پردہ داری کے سلسلے میں جو احکامات ہیں، ان پر سختی سے عمل کیا جائے گا۔''

''تم ڈکٹیٹر نہ بنو۔ میری کوئی تو بات مانو۔''

''تمہاری ہر جائز بات مان لوں گا لیکن میرا دین پتھر کی لکیر ہے اور میں لکیر کا فقیر رہوں گا۔''

انسان کے اندر صحیح اور غلط سوچ کے درمیان جنگ ہوتی رہتی ہے۔ جب صحیح سوچ غالب آ جاتی ہے تو غلط سوچ منہ چھپا کر چلی جاتی ہے۔ ہم زاد چپ چاپ سر جھکا کر چلا گیا۔ رات کے گیارہ بجنے والے تھے۔ مراد خواب گاہ کے دروازے کو اندر سے بند کر کے سو گیا۔ ٹھیک دو بجے عادت کے مطابق اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے وضو کر کے تہجد کی نماز ادا کی پھر بحری جہاز میں پہنچ گیا۔

محبوب اپنے کیبن میں گہری نیند سو رہا تھا۔ آرمی کے افسران اور سپاہی کچھ کھانے سے ڈر رہے تھے کہ پھر موشن

لگ جائیں گے لیکن بھوکے بھی نہیں رہ سکتے تھے۔ ان کے لیے ہلکی خوراک تیار کی گئی۔ ان سب نے گاڈ کا نام لے کر کھا لیا۔ کھانے میں کچھ نہیں تھا۔ وہ نہیں جانتے تھے۔ اس بار پانی میں گڑبڑ تھی۔

انہوں نے کھانا حلق سے اتارنے کے لیے پانی پیا تو دس پندرہ منٹ میں ان کے اعصاب ڈھیلے پڑنے لگے۔ ایسے وقت مراد وہاں پہنچ گیا تھا۔ وہ فوراً ہی ان سب کے موبائل فون اٹھا کر سمندر میں پھینکنے لگا۔ فون بھی ایک ہتھیار ہوتا ہے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ان میں سے کوئی اپنے ہیڈکوارٹر میں فون کرکے اپنے بیمار حالات کی روداد بیان کرے۔

اگر ہیڈکوارٹر میں ذمے دار افسران کو ان کے بدترین حالات کی بھنک بھی ملتی تو جلد ہی انہیں بھرپور امداد ملنے لگتی اور ان کے فرار کے راستے میں رکاوٹ بننے کے لیے آرمی کی دوسری کھیپ چلی آتی۔

جب اسے اطمینان ہوگیا کہ اس نے کسی کا موبائل فون نہیں چھوڑا ہے۔ سب ہی کو سمندر میں غرق کردیا ہے۔ تب اس نے محبوب کے کیبن کے پاس آکر دروازے پر دستک دی۔ اس نے فوراً ہی نیند سے بیدار ہوکر آنکھیں کھولیں پھر اٹھ کر دروازے کو کھولا۔ مراد نے کہا۔ "یہاں سے چلیں۔ حالات ہمارے موافق ہیں لیکن پہلے کپتان کے کیبن میں چلیں اس کے کمپیوٹر میں دیکھیں کہ جہاز ابھی سمندر میں کہاں ہے اور کراچی کا ساحل کتنی دور ہے اور کس سمت میں ہے۔"

وہ دونوں کپتان کے کیبن میں آئے۔ وہ فرش پر بے جان سا پڑا بڑی بے بسی سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ اعصابی کمزوری نے اسے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ محبوب اس کے کمپیوٹر کو آپریٹ کرنے لگا۔

آرمی کا اعلیٰ افسر اپنے کیبن کے بیڈ پر پڑا تھا۔ اس میں بھی ہلنے جلنے کی سکت نہیں رہی تھی۔ اس نے تھوڑی دیر پہلے محبوب کو دیکھا تھا۔ وہ اس کے کیبن میں آکر اس کا موبائل فون چھین کرلے گیا تھا۔ وہ اسے کیسے روکتا جبکہ اس کے اندر بولنے کی سکت بھی نہیں رہی تھی۔

وہ مراد کو محبوب سمجھ رہا تھا۔ یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ مراد وہاں آسکتا ہے۔ اس اعلیٰ افسر نے محبوب سے چھینا ہوا فون اپنے پاس رکھا تھا۔ اس نے بڑی ہمت کرتے ہوئے تکیے کے نیچے ہاتھ لے جا کر اس فون کو نکالا۔ تمام انگلیاں بھی ڈھیلی پڑ گئی تھیں۔ پھر بھی اس نے کوشش کرتے ہوئے ایک [illegible] کر نمبر پنچ کیے پھر اسے کان سے لگا کر لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔

تھوڑی دیر بعد رابطہ ہوا تو اس نے کہا۔ "ہم... ہم مرنے والے ہیں۔ مح...... بوب...... بھاگ...... نے...... والا ہے...... ہیلپ...... ہیلپ...... ڈاک...... ٹر...... دا...... دا...... دوا......"

وہ آگے نہ بول سکا۔ بولنا چاہتا تھا لیکن منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ دوسری طرف سے سوالات کیے جا رہے تھے۔ وہ جواب دینے کے قابل نہیں رہا تھا۔ آخر کہا گیا کہ ابھی آدھے گھنٹے کے اندر امداد پہنچ رہی ہے۔

محبوب کمپیوٹر کے ذریعے اہم معلومات حاصل کرچکا تھا۔ وہاں ایک قطب نما آلہ رکھا ہوا تھا۔ اس کا ایک کانٹا ہمیشہ شمال کی سمت رہتا تھا اور انہیں کراچی پہنچنے کے لیے شمال کی سمت ہی جانا تھا۔ محبوب نے وہ آلہ اپنے پاس رکھ لیا۔

ایک بڑے سے اسٹور روم میں اسلحے کا ذخیرہ تھا۔ موجودہ حالات میں ایک بھی سپاہی مقابلہ کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ یہ اندیشہ تھا کہ کراچی پہنچنے تک دشمن ہیلی کاپٹر یا جنگی طیاروں کے ذریعے ان کے سروں پر پہنچ سکتے ہیں۔

مراد نے ایک کلاشنکوف کو اٹھایا۔ چھ ہینڈ گرینیڈ ایک چھوٹی سی تھیلی میں رکھے پھر محبوب کے ساتھ جہاز کے گراؤنڈ فلور میں آگیا۔ وہ جہاز اوپر سے نیچے تک مریضوں کا اسپتال بنا ہوا تھا۔ وہاں مریض ہی مریض تھے۔ ڈاکٹر ایک بھی نہیں تھا۔ وہاں سب ہی کے پاس ہتھیار تھے لیکن انہیں ہاتھوں سے پکڑنے کی توانائی نہیں رہی تھی۔

وہ سب محبوب کو دیکھ رہے تھے۔ وہ ان کے قریب سے گزر رہا تھا۔ مراد نظر نہیں آرہا تھا۔ ان لمحات میں وہ اپنی توانائی اور صحت یابی کی دعائیں مانگ رہے تھے۔ قیدی فرار ہو رہا ہے تو ہوتا رہے۔ سب ہی کو اپنی جان کی فکر تھی۔

جہاز کے ایک حصے میں وہ گیراج تھا جہاں موٹر بوٹس تھیں۔ انہوں نے دونوں بوٹس کو اچھی طرح چیک کیا۔ ٹنکیاں فل تھیں پھر بھی پیٹرول سے بھرے ہوئے فاضل کین رکھ لیے۔

باہر رات کی گہری تاریکی تھی۔ انہوں نے ایکسٹرا ہیڈ لائٹس رکھ لیں۔ گیراج کے بڑے سے دروازے کو کھولا پھر ایک ایک بوٹ پر آکر انہیں ڈرائیو کرتے ہوئے گہرے سمندر کی سطح پر آکر تیزی سے جانے لگے۔

ان کے لیے ایک بوٹ کافی تھی لیکن انہوں نے دشمنوں کے لیے دوسری نہیں چھوڑی۔ وہ دوسری بھی لے گئے۔ سمندر کی لامتناہی دنیا میں ان کا یہ پہلا اندھا سفر تھا۔

ان کے چاروں طرف پانی ہی پانی تھا۔ رات تھی تاریکی تھی۔ صرف ہیڈ لائٹ کی ایک روشنی میں سامنے کچھ دور تک نظر آرہا تھا۔

وہ فرار ہو رہے تھے۔ اس کے باوجود کنارے سے محروم سمندر کہہ رہا تھا' فرار کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ پوری دنیا پوری کائنات اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ایسی بھیانک تاریکی میں آنکھوں والے بھی عارضی طور پر اندھے ہو جاتے ہیں۔ آگے بڑھنے کے لیے صرف قطب نما کا سہارا تھا۔ اس کے ذریعے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ شمال کی سمت جا رہے ہیں' جہاں پاکستان کا کوئی ساحلی علاقہ ہے۔

دشمن آرمی زیادہ دور نہیں تھی۔ عدن کے ساحل پر ان کا فوجی اڈا تھا۔ انہیں بحری جہاز کے بیمار افسر سے ادھوری معلومات حاصل ہوئی تھیں۔ اس نے فون پر اٹک اٹک کر کہا تھا کہ محبوب بھاگنے والا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ ڈاکٹر اور دواؤں کی مدد مانگ رہا تھا۔

وہاں کی آرمی الرٹ تھی۔ فوراً ہی ڈاکٹروں، نرسوں اور دواؤں سے لدے ہوئے دو ہیلی کاپٹرز نے وہاں سے پرواز کی۔ مزید چار ہیلی کاپٹرز میں مسلح آرمی تھی۔

پہلے ایک ہیلی کاپٹر ڈاکٹروں کو لے کر جہاز کے عرشے پر اترا۔ ڈاکٹروں' نرسوں اور ان کے معاون نے فرسٹ فلور اور گراؤنڈ فلور میں آکر پوری آرمی کو بیمار دیکھا تو حیران رہ گئے۔

حیرانی کی بات یہ تھی کہ وہاں بیک وقت سب ہی بے دست و پا دکھائی دے رہے تھے۔ ان میں بولنے کی بھی سکت نہیں رہی تھی۔ ایک سپاہی نے بڑی کوششیں کرتے ہوئے بتایا کہ محبوب آدھا گھنٹے پہلے فرار ہوا ہے۔

یہ اطلاع ان فوجیوں کو دی گئی جو چار ہیلی کاپٹروں میں آرہے تھے۔ انہوں نے فوراً ہی اپنی پرواز کا رخ شمال کی سمت کر دیا، اپنی پرواز نیچی کر دی۔ سرچ لائٹ کے ذریعے خاموش اور ویران سمندر کو دیکھتے ہوئے تیزی سے آگے بڑھنے لگے۔

دونوں موٹر بوٹس شور مچاتی ہوئی اپنی منزل کی سمت رواں دواں تھیں۔ تب انہوں نے بہت دور سے ہیلی کاپٹروں کی آوازیں سنیں۔ وہ سرچ لائٹ کی روشنی پھینکتے ہوئے قریب آتے جا رہے تھے۔

مراد نے محبوب سے کہا۔ ''آپ آگے جاتے رہیں۔ میں پیچھے آنے والوں کو روک رہا ہوں۔''

اس نے اپنی بوٹ کے انجن کو بند کر دیا۔ محبوب آگے جانے لگا۔ [illegible] سمندر کے گہرے پانی پر رک گئی۔ مراد نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ چاروں ہیلی کاپٹر ایک دوسرے کے پیچھے فاصلہ رکھتے ہوئے چلے آرہے تھے۔

مراد کے پاس پستی سے بلندی پر وار کرنے والا کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ آنے والے اوپر سے فائر کرتے ہوئے دونوں موٹر بوٹس کو ڈبو دیتے یا انہیں بحری جہاز میں واپس جانے پر مجبور کرتے لیکن جسے اللہ رکھے' اسے کون چکھے؟ اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اس نمازی کے لیے تھیں۔ اسے کوئی پسپا نہیں کر سکتا تھا۔

وہ پلک جھپکتے ہی اپنی اسپیڈ بوٹ سے گم ہو کر ایک ہیلی کاپٹر کے اندر پہنچ گیا۔ وہاں پائلٹ کے پیچھے ایک افسر اور بارہ مسلح سپاہی تھے۔ اس نے تھیلی سے ایک ہینڈ گرینیڈ نکال کر اس کی پن کو دانتوں سے کھینچ کر باہر کیا۔ پھر اسے ایک سیٹ کے نیچے رکھ کر وہاں سے گم ہو گیا۔ دوسرے ہی لمحے میں دوسرے ہیلی کاپٹر میں پہنچ گیا۔ اسی وقت آگے جانے والا ہیلی کاپٹر ایک دھماکے سے پرزہ پرزہ ہو کر فضا میں بکھر رہا تھا۔

اس نے دوسرے ہیلی کاپٹر میں بھی یہی کیا۔ وہاں ہینڈ گرینیڈ چھوڑ کر تیسرے ہیلی کاپٹر میں آیا تو زوردار دھماکے سے دوسرے کے بھی پرخچے اڑ گئے۔ تیسرے اور چوتھے ہیلی کاپٹرز والے بھیانک موت کا وہ منظر دیکھ رہے تھے۔ پرواز کی سمت بدل رہے تھے۔ فون کے ذریعے چیخ چیخ کر اطلاع دے رہے تھے کہ ان کی آنکھوں کے سامنے دو ہیلی کاپٹرز یوں دھماکوں سے تباہ ہو گئے جیسے سمندر کی سطح سے کسی نے حملہ کر کے انہیں مار گرایا ہو۔

وہ کہہ رہے تھے۔ ''نیچے کوئی حملہ آور نہیں ہے۔ ہمیں دور بہت دور ایک موٹر بوٹ خالی دکھائی دے رہی ہے۔ ہم یہاں سے واپس جہاز میں جا رہے ہیں۔''

دوسری طرف سے پوچھا گیا۔ ''یہ کیسے ممکن ہے کہ کسی نے حملہ نہیں کیا اور ہمارے دو ہیلی کاپٹر فوجیوں سمیت تباہ ہو گئے۔ واپس نہ جاؤ۔ راستہ بدل کر دیکھو۔ محبوب دوسری بوٹ میں جا رہا ہوگا۔''

افسر نے کہا۔ ''ہم راستہ بدل کر جا رہے ہیں۔''

وہ فون بند کر کے پائلٹ سے کہنے لگا کہ کسی طرح راستہ بدل کر آگے جاتے ہوئے محبوب کو ٹریس کرنا چاہیے۔

مراد سن رہا تھا۔ وہ ہینڈ گرینیڈ کو فون کرنے والے کی گود میں رکھ کر چوتھے ہیلی کاپٹر میں پہنچ گیا۔ ان سب نے دہشت زدہ ہو کر تباہ ہونے والے تیسرے ہیلی کاپٹر کو دیکھا۔ پھر ایک سپاہی فون پر اس تیسرے کی تباہی کی اطلاع دیتے

ہوئے بولا۔ ”ہم واپس آرہے ہیں۔ محبوب کا تعاقب کرنے والے تباہ ہورہے ہیں۔ صرف ہم رہ گئے ہیں۔“

مراد وہاں چپ چاپ دیکھتا رہا۔ جب اسے یقین ہوگیا کہ وہ واپس جارہے ہیں تو وہ دوسرے ہی لمحے میں محبوب کے پاس آگیا۔ اس نے مراد کو دیکھ کر کہا۔ ”تم نے تو کمال کردیا۔ میں نے ایک ہیلی کاپٹر کو تباہ ہوتے دیکھا تھا۔ باقی بہت دور سے ہونے والے دو دھماکے سنے ہیں۔ دو بار کہیں روشنی کے جھماکے ہوئے تھے۔“

مراد نے کہا۔ ”میں نے تین ہیلی کاپٹرز اور درجنوں سپاہیوں کو نابود کردیا ہے۔ چوتھا ہیلی کاپٹر واپس جارہا تھا۔ اس لیے اسے چھوڑ دیا ہے۔“

ہیڈ لائٹ کی روشنی میں دور ایک ویران ساحل نظر آرہا تھا۔ محبوب نے رفتار دھیمی کردی۔ وہ بوٹ آگے جاکر ساحل کی ریت میں دھنس گئی۔ اس نے لائٹ آف کردی، تاریکی اور زیادہ گہری ہوگئی۔

پتا نہیں وہ کون سی جگہ تھی؟ ایک اندازے کے مطابق وہ پاکستان کا ہی ساحلی علاقہ ہوگا۔ یہ سوچا نہیں جاسکتا تھا کہ جان کے دشمن ان سے پہلے وہاں راستہ روکنے کے لیے پہنچ گئے ہوں گے لیکن تاریکی میں چور ڈاکو یا اسمگلرز ہوسکتے تھے۔ وہ سمندر سے آنے والی موٹر بوٹ کے متعلق یہ قیاس آرائی کرسکتے تھے کہ اسمگلنگ کا مال آرہا ہے اور وہ مال لوٹنے کے لیے گولیاں چلاسکتے تھے۔ جہاں تاریکی ہی تاریکی ہو اور پُرنور آنکھیں دیکھنے کے قابل نہ رہی ہوں، وہاں موت یا شامت کہیں سے بھی آسکتی تھی۔

مراد نے کہا۔ ”آپ یہاں بیٹھے رہیں۔ تاریکی میں دیکھنے اور آہٹیں سننے کی کوشش کرتے رہیں۔ میں ساحل پر دور تک جاکر دیکھتا ہوں۔ یہ معلوم کرنا ہوگا کہ ہم کہاں ہیں اور ہمیں کدھر جانا ہوگا؟“

یہ کہتے ہی وہ تاریکی میں گم ہوگیا۔ دیر تک اندھیرے میں رہو تو آس پاس کچھ دکھائی دینے لگتا ہے پھر سنائی بھی دیا۔ کوئی دھیمی آواز میں کہہ رہا تھا۔ ”خان جی! بہت دیر سے بوٹ کی ہیڈ لائٹ بجھی ہوئی ہے۔ پتا نہیں اس بوٹ میں کتنے بندے ہیں اور کیا مال لے کر آئے ہیں۔ ہماری کشتیاں تو رات کے تین بجے آنے والی ہیں۔“

پھر وہ ٹھہر ٹھہر کر جی، جی کہنے لگا۔ وہ فون پر کسی کی باتیں سن رہا تھا۔ مراد اس کے بالکل قریب آیا تو معلوم ہوا وہ دو مسلح شخص ہیں۔ ان میں سے ایک نے فون بند کرکے اپنے ساتھی سے کہا۔ ”خان جی بولتا ہے، ہم بوٹ والوں سے بات کریں۔ معلوم کریں، وہ کون ہیں اور کیا مال لائے ہیں؟“

مراد نے گلا صاف کرنے کے انداز میں کھنکھارا تو وہ دونوں خوف سے اچھل پڑے۔ اپنی رائفلیں تان کر ادھر ادھر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگے۔ وہ دن کی روشنی میں دشمنوں کو نظر نہیں آتا تھا۔ بھلا اس تاریکی میں کیسے دکھائی دیتا؟

ایک نے سہم کر پوچھا۔ ”کون ہو تم؟“

مراد نے پوچھا۔ ”پہلے تم بتاؤ۔ تم لوگ کون ہو؟“

دوسرے نے کہا۔ ”نہیں، پہلے تم بتاؤ؟“

مراد نے کہا۔ ”ہم اِدھر کا مال ادھر اور ادھر کا مال اِدھر کرتے ہیں۔ تم اپنا دھندا بولو؟“

ایک نے کہا۔ ”ہمارا بھی یہی دھندا ہے۔ ہم یہاں سے مال باہر بھیجتے ہیں۔“

وہ بولا۔ ”ہم بوٹ میں سونا لے کر آئے ہیں۔ تمہارے پاس کیا مال ہے اور کتنا مال ہے؟“

اس نے کہا۔ ”ہمارے پاس چار کمسن لڑکیاں اور چھ کمسن بچے ہیں۔“

مراد نے کہا۔ ”ہم سے سودا کرو۔ سونا لو اور لڑکیاں اور بچے ہمارے حوالے کرو۔“

”ارے واہ! اس سے اچھا سودا کیا ہوگا۔ خان جی خوش ہوجائے گا۔ اس کے پاس چل کے بات کرو۔“

”یہ خان جی کون ہے؟ کہاں رہتا ہے؟“

”وہ ہمارا باس ہے۔ اس کا نام شاداب خان ہے۔ یہاں سے تھوڑی دور تک چلنا ہوگا۔“

پھر اس نے پنسل ٹارچ کو روشن کرتے ہوئے پوچھا۔ ”تم کہاں ہو؟ سامنے آؤ۔“

مراد نے کہا۔ ”ٹارچ کی روشنی صرف سامنے رکھو اور راستہ دیکھتے ہوئے چلو۔ اپنے خان کے پاس پہنچنے کے بعد میری صورت دیکھ سکو گے۔“

مراد اب اندھیرے میں جھلک رہا تھا۔ وہ آگے آگے چلنے لگے۔ اس نے پوچھا۔ ”کراچی یہاں سے کتنی دور ہے؟“

”ہم نہیں جانتے کتنی دور ہے۔ ہم پجیرو میں اور ایک ٹرک میں وہاں جاتے ہیں تو آٹھ یا نو گھنٹے میں پہنچتے ہیں۔“

مراد اور محبوب کو کراچی جانا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ”تم لوگوں کے پاس کتنی گاڑیاں ہیں؟“

”ایک پجیرو اور ایک ٹرک ہے۔“

”کیا عورتوں اور بچوں کو اسی ٹرک میں لاتے ہو؟“

”ہاں، کچے راستے میں بڑے جھٹکے لگتے ہیں مگر کیا کیا جائے۔ دھندا ہی ایسا ہے۔ کچے راستے میں صرف ایک

پولیس چوکی پڑتی ہے۔ وہاں تھوڑی سی رشوت دے کر آجاتے ہیں۔"

"پکی سڑک کتنی دور ہے؟"

"ادھر سے کچی سڑک پر پورب کی طرف جانے سے پکی سڑک آجاتی ہے مگر یہاں سے کراچی تک چھ چوکیاں ہیں۔ تم لوگ سونا نہیں لے جاسکو گے۔"

آگے گھنی جھاڑیوں کے پیچھے مٹی گارے سے بنا ہوا ایک بڑا سا مکان تھا۔ مکان کے باہر کھلی جگہ تھی۔ چار پائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ وہاں ان کا باس خان جی تین مسلح کارندوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔

اس نے اپنی جگہ سے اٹھ کر مراد کو کلاشنکوف کے ساتھ دیکھا۔ ایک کارندے نے کہا۔"خان جی! یہ بوٹ میں سونا لایا ہے۔ سونے کے بدلے ہماری عورتوں اور بچوں کو مانگتا ہے۔"

خان نے گھور کر مراد سے پوچھا۔"تم ان عورتوں اور بچوں کو لے کر کیا کرو گے؟"

اس نے کہا۔"نیکی کماؤں گا۔ تم ان عورتوں اور خوبصورت بچوں کو آبرو فروشی کے بازار میں پہنچا رہے ہو۔ میں ان کے گھروں میں انہیں واپس پہنچاؤں گا۔"

وہ غصے سے بولا۔"کیا بکواس کر رہے ہو؟"

مراد نے کہا۔"میں اس بکواس کے عوض پانچ کلو سونا ابھی اسی وقت دوں گا۔"

خان کی آنکھیں حیرت سے پھٹی رہ گئیں۔ وہ بے یقینی سے بڑبڑایا۔"پانچ کلو سونا..."

"ہاں۔ پہلے میں عورتوں اور بچوں کو دیکھوں گا۔"

خان خوش ہو گیا تھا۔ مکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔"ادھر آؤ۔ وہ سب اندر ہیں۔"

اس نے خان اور دو کارندوں کے ساتھ مکان کے اندر آکر دیکھا۔ ایک بڑے سے ہال نما کمرے میں چار لڑکیاں سر جھکائے بیٹھی تھیں۔ وہ چاروں حسین بھی تھیں اور پرکشش بھی۔ عورتوں کی منڈی میں ان کی تگڑی قیمت ملنے والی تھی۔ چھ معصوم پیارے سے کم سن بچے گہری نیند میں تھے۔ ہوس کے بازار میں ان سے بھی اچھی رقم مل سکتی تھی۔

پانچ کلو سونا خان کی سوچ سے بہت زیادہ تھا۔ اس کے دل میں بے ایمانی تھی۔ اس نے سوچا۔ اس اسمگلر کے پاس پانچ کلو سے بھی زیادہ سونا ہوگا۔ فوراً معلوم کرنا چاہیے کہ اس کے ساتھ کتنے بندے ہیں؟

اس نے پوچھا۔"تم کتنے آدمی ہو؟"

مراد نے مکان سے باہر آتے ہوئے کہا۔"ہم دو ہیں۔ باقی ہمارے دو ساتھی دبئی میں ہیں۔"

"کل سونا کتنا ہے؟"

"پچاس کلو ہے۔"

خان جی کی اوپر کی سانس اوپر ہی رہ گئی پھر وہ ایک لمبی سانس لے کر بولا۔"چلو، ابھی بوٹ کے پاس چل کر مال دکھاؤ۔ اپنے ساتھی سے ملاؤ۔"

مراد نے کہا۔"ذرا ٹھہرو۔ پہلے کچھ باتیں سن لو۔"

خان نے کہا۔"ہاں جلدی بولو۔"

اس نے پوچھا۔"خان جی! کیا یہ سچ ہے کہ گناہ گاروں کے دل میں خدا کا خوف نہیں ہوتا؟"

وہ ناگواری سے بولا۔"مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"تم ہی جواب دے سکتے ہو۔ تم مسلمان ہو۔ کیا ان لمحات میں تمہیں اپنے اللہ سے ڈر لگ رہا ہے؟"

"دیکھو مسٹر! دین ایمان اپنی جگہ ہے۔ یہاں صرف دھندے کی بات کرو۔ چلو سونا دکھاؤ۔"

"اللہ تعالیٰ سونے چاندی سے بھی زیادہ انعام اسے دیتا ہے جو غلط دھندے سے توبہ کرتا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں توبہ کرتا ہوں۔ یہ عورتیں اور بچے تمہارے حوالے ہیں۔ آئندہ میں یہ دھندا بھی نہیں کروں گا۔"

"تم سونا حاصل کرنے کے لیے جھوٹ نہ بولو۔"

"میں کیسے یقین دلاؤں کہ سچ بول رہا ہوں؟"

"اگر سچے ہو تو اس انعام کا انتظار کرو جو اللہ کی طرف سے ملنے والا ہے۔ مجھ جیسے حقیر بندے سے سونا طلب نہ کرو۔"

"تم یہ کہہ رہے ہو کہ میں سونا تم سے نہ لوں۔ عورتوں اور بچوں کو تمہارے حوالے کر دوں اور کنگال بن کر اللہ اللہ کرتا رہوں۔ کیا میں تمہیں پاگل دکھائی دیتا ہوں؟"

"دیکھو خان جی! سچے دل سے توبہ کر لو تو اچھا ہے۔ ورنہ میرے پاس سونا نہیں ہے، صرف موت ہی موت ہے۔ ابھی یہاں سے سیدھے جہنم میں جاؤ گے۔"

خان نے اس کی طرف گن اٹھائی تو تینوں کارندوں نے بھی اسے نشانے پر رکھ لیا۔ خان نے کہا۔"ابھی گولیاں چلیں گی تو ہم بھی مارے جائیں گے، تم بھی نہیں بچو گے۔ عقل سے کام لو۔ زندہ رہو اور بوٹ کی طرف چلو۔ سونا دکھاؤ۔"

وہ کلاشنکوف کو زمین پر پھینک کر بولا۔"آخری بار کہتا ہوں۔ تم سب اپنا اسلحہ پھینک کر توبہ کرو۔ حلال کی روزی کماؤ۔ عورتوں اور بچوں کی دلالی نہ کرو۔"

خان نے اس کا نشانہ لیتے ہوئے کہا۔"میں بھی

آخری بار پوچھتا ہوں۔ سودا دے رہے ہو یا نہیں؟"

وہ اپنی بات ختم کرتے ہی یکلخت چونک گیا۔ اس کے کارندے بھی حیرانی سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ وہ اچانک نادیدہ ہو گیا تھا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر گم ہونے والی جگہ کو دیکھ رہے تھے۔

مراد نے خان کے منہ پر ایک گھونسا مارا۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے چلا گیا۔ اس نے ایک ٹھوکر ہاتھ پر ماری تو ریوالور اس کی گرفت سے نکل کر فضا میں اڑتا ہوا ذرا سی بلندی پر گیا۔ پھر نیچے آتے آتے غائب ہو گیا کیونکہ مراد نے اسے کیچ کر لیا تھا۔

وہ سب شدید حیرانی سے منہ کھولے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں؟ کس سے مقابلہ کریں؟ کوئی روبرو ہوتا تو گولیاں چلائی جاتیں۔

اچانک فائر کی دو آوازیں رات کے سناٹے میں گونجیں۔ دو کارندے زمین پر گر کر ڈھیر ہو گئے۔ مراد نے گھوم کر باس کے منہ پر کک ماری۔ وہ تکلیف اور گھبراہٹ سے چیخ پڑا۔ مراد نے پیچھے آ کر اس کی بغل میں ہاتھ ڈال کر گردن میں قینچی ڈالی تو اس کے دونوں ہاتھ اوپر اٹھ گئے۔

وہ چیخ کر بولا۔ "یہ میرے پیچھے ہے۔ پیچھے آ کر گولی مارو۔ جلدی کرو۔"

وہ سب دوڑتے ہوئے پیچھے آئے۔ ایک نے کہا۔ "خان جی! وہ دکھائی نہیں دے رہا ہے۔ آپ کے پیچھے نہیں ہے۔"

وہ غصے سے بولا۔ "گدھے کے بچو! دیکھتے نہیں ہو۔ اس نے مجھے کیسے جکڑ رکھا ہے۔ یہ میری پشت سے لگا ہوا ہے۔ اسے زندہ نہ چھوڑو۔"

اس کا حکم سنتے ہی ان سب نے بیک وقت گولیاں چلائیں۔ مراد ایک پل میں فائر کرنے والوں کے پیچھے آ گیا۔ گولیاں ان کے باس کو لگ رہی تھیں۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا چھلنی ہو کر زمین پر گر پڑا۔ کبھی نہ اٹھنے کے لیے۔

مراد نے زمین پر پڑی ہوئی کلاشنکوف کو اٹھا کر ایک برسٹ مارا تو تڑاتڑ کی مسلسل آوازوں کے ساتھ تین کارندے گرے۔ باقی ایک ہی بچا تھا۔ وہ روشنی سے دور تاریکی کی طرف بھاگنے لگا۔ مراد نے اسے بھی موت کی تاریکی میں پہنچا دیا۔ خس کم جہاں پاک۔

ناپاک دھندا کرنے والوں سے وہ ساحلی علاقہ پاک ہو گیا۔ مراد نے محبوب کے پاس آ کر کہا۔ "آئیں۔ تمام رکاوٹیں ختم ہو گئی ہیں۔"

وہ موٹر بوٹ سے اتر کر اس کے ساتھ چلتے ہوئے بولا۔ "میں فائرنگ کی آوازیں سن رہا تھا۔ تم کیسی جی داری سے بھانت بھانت کے دشمنوں سے لڑتے رہتے ہو۔ میں سوچ سوچ کر حیران ہوتا رہتا ہوں۔"

وہ اس مکان کا دروازہ کھول کر اندر آئے۔ چاروں لڑکیاں اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔ مراد نے کہا۔ "تم سب آزاد ہو۔ دشمن مارے گئے ہیں۔ اپنے بارے میں کچھ بتاؤ۔"

وہ لڑکیاں باری باری اپنے بارے میں بتانے لگیں۔ ان میں سے دو لڑکیاں پنجاب کے علاقوں سے تعلق رکھتی تھیں۔ اپنے عاشقوں کے ساتھ گھر سے بھاگ کر آئی تھیں۔ تیسری کراچی میں رہنے والی لڑکی بھی ایک عاشق کے چکر میں پھنس کر اسمگلروں کے ہتھے چڑھ گئی تھی۔ چوتھی لڑکی کا تعلق سکھر سے تھا۔ وہ کالج سے گھر جا رہی تھی۔ اس وقت اسے اغوا کیا گیا تھا۔ اس کا نام ماہ نور منگی تھا۔

اس کا نام سنتے ہی مراد نے کشش محسوس کی۔ وہ اس کی طرح منگی قبیلے سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کے چہرے کی سادگی اور معصومیت میں بلا کی کشش تھی۔

ایک نامحرم کو دلی لگاوٹ سے نہیں دیکھنا چاہیے۔ مراد نے دوسری لڑکیوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "ان بچوں کو سنبھالو۔ انہیں لے کر ہمارے ساتھ آؤ۔"

محبوب نے کہا۔ "ٹھہرو، پہلے یہ طے کرو کہ یہ لڑکیاں اور بچے کہاں جائیں گے؟ کیا بچوں کو ان کے گھر کا پتا ٹھکانا معلوم ہے؟"

وہ نو دس یا گیارہ برس کے تھے۔ اپنے محلے کا نام جانتے تھے۔ وہاں پہنچ کر اپنا گھر پہچان سکتے تھے۔ تین لڑکیاں جو گھروں سے بھاگ کر آئی تھیں انہوں نے کہا۔ "ہم فون پر اپنے والدین سے باتیں کریں گے۔ وہ ہمیں قبول کریں گے تو ہم خدا کا شکر ادا کریں گے ورنہ آپ ہمیں خواتین کے کسی فلاحی ادارے میں پہنچا دیں۔"

چوتھی لڑکی ماہ نور رونے لگی۔ محبوب نے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟ کیوں رو رہی ہو؟"

مراد نے کہا۔ "تم گھر سے بھاگ کر نہیں آئی تھیں۔ تمہارے گھر والوں کو معلوم ہوا ہو گا کہ تمہیں اغوا کیا گیا ہے۔ وہ تمہیں دل سے قبول کریں گے۔"

وہ انکار میں سر ہلا کر بولی۔ "میرے والد نہیں ہیں۔ صرف والدہ ہیں۔ وہ قبول کر لیں گی لیکن میرے دو بھائی بہت ہی غیرت مند ہیں۔ میری بڑی بہن کسی کے ساتھ بدنام ہو گئی تھی۔ انہوں نے اسے کسی بہانے سے کہیں لے جا کر قتل کر دیا تھا تو وہ میرے بارے میں بھی یہی سوچیں

گے کہ میں پاک دامن نہیں ہوں۔ مجھے قتل کرنے اور میرے حصے کی زمینیں حاصل کرنے کا انہیں بہانہ مل جائے گا۔ وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔''

محبوب نے کہا۔ ''تم میری چھوٹی بہن ہو۔ میرے ساتھ چلو۔ میں تمہارے بھائیوں کو بلا کر سمجھاؤں گا۔ وہ تمہیں پاک دامن تسلیم کر کے گھر لے جائیں گے۔''

اس مکان کے باہر ایک پجیرو اور ایک ٹرک کھڑا ہوا تھا۔ لڑکیوں کو اور بچوں کو ٹرک میں لے جانا مناسب نہیں تھا۔ ٹرک کا پچھلا حصہ کھلا تھا اور آرام دہ نہیں تھا۔ پجیرو میں بارہ افراد کی گنجائش نہیں تھی لیکن گنجائش اس طرح ہو گئی کہ مراد دوسری کسی گاڑی میں آنے والا تھا۔ محبوب سمجھ گیا کہ وہ کسی سواری کے بغیر دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچ جاتا تھا۔

محبوب ڈرائیونگ سیٹ پر آ گیا۔ ماہ نور ایک بچے کے ساتھ اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ باقی تین لڑکیاں اور پانچ بچے پچھلی دو قطاروں میں بیٹھ گئے۔ پھر وہ قافلہ وہاں سے روانہ ہو گیا۔ خان جی کا موبائل فون لایا گیا تھا۔ وہ لڑکیاں اسی فون کے ذریعے باری باری اپنے والدین سے رابطہ کر کے باتیں کرنے لگیں۔

مراد چشم زدن میں پہلے آنے والی پولیس چوکی کے پاس آ گیا۔ وہاں ایک افسر اور چار سپاہی تھے۔ وہ سب کھلے آسمان کے نیچے چارپائیوں پر سو رہے تھے۔ مراد نے کیبن کے اندر آ کر دیکھا۔ وہاں ایک میز، کرسیاں اور ایک الماری تھی۔ الماری مقفل تھی۔ اس نے افسر کے سرہانے آ کر اس کے تکیے کے نیچے ہاتھ ڈالا تو چابیاں مل گئیں۔

وہ پھر کیبن میں آ گیا۔ اس نے الماری کو کھولا، اس کے اندر سیف میں ہزار کے اور سو کے نوٹوں کی گڈیاں تھیں۔ اس نے دو گڈیاں جیب میں رکھیں پھر سیف کو اور الماری کو بند کر کے چابیاں لا کر اس کے تکیے کے نیچے رکھ دیں۔

ایسے ہی وقت کالنگ ٹون ابھرنے لگی۔ فون مراد کی جیب میں تھا۔ رات کی گہری خاموشی میں وہ آواز گونج رہی تھی۔ افسر نے نیند میں کسمساتے ہوئے تکیے کے نیچے ہاتھ ڈالا تو چابیاں ہاتھ میں آ گئیں۔ اس نے چابیوں کو ایک طرف پھینک کر پھر ٹٹولا تو فون ہاتھ میں آ گیا۔

رنگ ٹون ایسے گونج رہی تھی کہ آس پاس سونے والے سپاہیوں کی بھی آنکھیں کھل گئیں۔ افسر نیند کے خمار میں تھا۔ اس نے بٹن کو دبا کر فون کو کان سے لگا کر کہا۔ ''ہیلو کون ہو؟ کیوں فون کر رہے ہو؟''

ایک سپاہی نے کہا۔ ''سر! آپ کا فون بند ہے۔''

افسر نے چونک کر پوری طرح آنکھیں کھول کر اپنے فون کو دیکھا پھر اپنے سرہانے سر اٹھا کر دیکھا۔ دوسرے سپاہی نے کہا۔ ''سر! آواز آپ کے سر کے پاس سے آ رہی ہے۔''

اس نے سر گھما کر پیچھے دیکھا تو کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ مراد نے اپنے فون کی اسکرین کو دیکھا پھر بٹن کو دبایا۔ رنگ ٹون بند ہو گئی۔ اس افسر نے سپاہیوں سے کہا۔ ''ابھی آواز آ رہی تھی۔ تم لوگوں نے سنا ہے نا؟''

وہ سب اثبات میں سر ہلانے لگے۔ ادھر مراد فون پر سپر پاور کے ایک اعلیٰ عہدیدار سے انگریزی زبان میں کہہ رہا تھا۔ ''ہیلو...... کیا نیند اڑ گئی ہے؟''

وہ افسر اور چاروں سپاہی اپنی چارپائیوں سے اچھل کر کھڑے ہو گئے تھے۔ کسی کے بولنے کی آواز سنائی دے رہی تھی لیکن بولنے والا نہیں تھا اور سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا بول رہا ہے۔ کیونکہ وہ انگریزی زبان نہیں سمجھ رہے تھے۔

وہ اعلیٰ عہدیدار بول رہا تھا۔ ''میں ڈیفنس منسٹر بول رہا ہوں۔ آج تک کوئی فوج اس طرح تباہ نہیں ہوئی ہو گی جس طرح تم کر چکے ہو۔ ہماری عقل دنگ رہ گئی ہے۔ ہم سمجھنے سے قاصر ہیں کہ تم کس طرح حملے کرتے ہو؟ کہاں سے چھپ کر کرتے ہو؟ ایک روز پہلے تم نے ہمارے جنگی طیاروں کو پرواز کے دوران تباہ کر دیا تھا۔ ابھی دو گھنٹے پہلے ہمارے تین ہیلی کاپٹرز کو درجنوں سپاہیوں سمیت دھماکوں سے اڑا دیا ہے۔ مائی گاڈ....! کیسے....؟ یہ کیسے کیا ہے؟ تم کس طرح حملے کرتے ہو؟''

مراد جواباً دھیرے دھیرے ہنسنے لگا۔ وہ افسر اور سپاہی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہنسنے کی آوازیں سن رہے تھے۔

ڈیفنس منسٹر کہہ رہا تھا۔ ''بحری جہاز بیچ سمندر میں گہرے پانیوں میں کھڑا ہے۔ تم وہاں کیسے پہنچ گئے تھے؟ ہم یہ نہیں مانیں گے کہ تمہارے پاس آبدوز کشتی ہے اور تم پانی کے اندر ہی اندر جہاز تک پہنچ جاتے ہو۔''

مراد نے کہا۔ ''تمہارے نہ ماننے سے حقیقت نہیں بدلے گی۔ میں سمندر میں اتنی دور تیر کر نہیں جا سکتا تھا۔ مانو یا نہ مانو، میرے ذرائع بہت وسیع ہیں۔ میں نے بڑی رازداری سے ایک آبدوز کشتی تیار کرائی ہے۔ اسی کے ذریعے بحری جہاز تک پہنچا تھا۔ اسی آبدوز کشتی نے گہرائی سے ابھر کر سطح پر آ کر تینوں ہیلی کاپٹرز کو تباہ کیا تھا۔''

وہ فون پر بولتا ہوا آہستہ آہستہ پکی سڑک کی طرف جا رہا تھا۔ وہ افسر اور سپاہی آواز کے پیچھے ٹھہر ٹھہر کر سوچ

سوچ کر چل رہے تھے۔ ایک سپاہی نے کہا۔ ''کوئی انگریزی بول رہا ہے۔ انگریزوں میں بھی بھوت ہوتے ہیں۔''

افسر نے کہا۔ ''یہ کوئی بھوتوں والی زبان بول رہا ہے۔ انگریزی تو میں جانتا ہوں۔ بڑے بڑے انگریزوں سے باتیں کرچکا ہوں۔ یس، نو، آل رائٹ، وہاٹ آر یو وانٹڈ۔''

وہ سپاہی اس کی انگریزی سے مرعوب ہو رہے تھے۔ ایک سپاہی نے ذرا سہم کر کہا۔ ''وہ چپ ہو گیا ہے۔ ہماری طرف دیکھ رہا ہوگا۔''

وہ ڈیفنس منسٹر کی باتیں سن رہا تھا۔ منسٹر کہہ رہا تھا۔ ''مسٹر مراد! ہم تم سے ملنا چاہتے ہیں۔''

''مجھے صرف مسٹر کہو گے تو فون بند کردوں گا۔ میں ایک ریاست کا حکمران ہوں۔ اپنی غلطی درست کرو۔''

''سوری ہز ہائی نس! ہم خیال رکھیں گے۔ ہم آپ کو ریاست ارض اسلام کا حکمران تسلیم کرتے ہیں۔''

''شکریہ۔ میں ماروی اور محبوب علی چانڈیو کو مکمل تحفظ فراہم کرنے کے بعد آپ حضرات سے ملاقات کروں گا۔''

''ہم ماروی اور محبوب علی چانڈیو کے مکمل تحفظ کی ضمانت دیتے ہیں۔ وہ آئندہ روپوش نہیں رہیں گے۔ آزادی سے زندگی گزارتے رہیں گے۔''

مراد نے کہا۔ ''اگر مجھ سے سمجھوتا نہیں ہوگا اور سپر پاور سے دوستانہ تعلقات قائم نہیں ہوں گے تو ماروی اور محبوب کی سیکیورٹی اور سلامتی خطرے میں پڑ جائے گی۔ مجھ سے نادانی کی توقع نہ کرو۔ ماروی اور محبوب میری دو آنکھیں ہیں۔ میں اپنی آنکھوں کی حفاظت خود کروں گا۔ میں ابھی کئی معاملات میں الجھا ہوا ہوں، کال ختم کر رہا ہوں۔ پھر کسی دن باتیں ہوں گی۔''

اس نے فون بند کردیا۔ وہ افسر اور سپاہی کان لگا کر سننے کی کوشش کر رہے تھے پھر افسر نے کہا۔ ''وہ چپ ہو گیا ہے۔ شاید چلا گیا ہے۔''

مراد نے دیکھا' بہت دور سے گاڑی کی ہیڈ لائٹس نظر آرہی تھیں۔ محبوب پجیرو میں لڑکیوں اور بچوں کے ساتھ آرہا تھا۔ وہ افسر اور سپاہی سڑک سے اتر کر اپنی چارپائیوں کی طرف آئے پھر ٹھٹک گئے۔ افسر کا جو ریوالور تکیے کے نیچے تھا، وہ آپ ہی آپ باہر آگیا۔ ریوالور کا رخ ان کی طرف تھا۔ کسی نے انہیں نشانے پر رکھا ہوا تھا۔

پھر ٹھائیں سے گولی چل گئی۔ افسر کے پیروں کے قریب تھوڑی سی مٹی اڑی۔ وہ چاروں خوف زدہ ہو کر چاروں طرف بھاگنے لگے۔ وہ جان بچانے کے لیے سڑک سے دور جارہے تھے۔

محبوب نے فائرنگ کی آواز سن کر گاڑی روک دی تھی۔ مراد نے آکر کہا۔ ''کوئی خطرہ نہیں ہے۔ راستہ صاف ہے۔ آپ بے خوف و خطر چلتے رہیں۔''

محبوب تیزی سے ڈرائیو کرتا ہوا پولیس چوکی سے گزرتا ہوا آگے جانے لگا۔ مراد اس سے بھی آگے دو سو میل دور دوسری پولیس چوکی میں پہنچ گیا۔

وہاں پہنچتے ہی فائرنگ کی آواز سنائی دی۔ پھر کسی نے للکارنے کے انداز میں گرجتے ہوئے کہا۔ ''اگر کسی نے میری عورت کو ہاتھ بھی لگایا تو میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

چوکی کے افسر نے کہا۔ ''اے کتے! تیرے ڈرانے سے ہم ڈر گئے ہیں۔ چل یہاں آ اور اپنی عورت کو لے جا۔''

دوسری طرف سے کہا گیا۔ ''اسے آزاد کردو۔ وہ یہاں میرے پاس آجائے گی۔''

''اسے تو ہم تیرے سردار کے پاس پہنچائیں گے۔ تو نے اپنے قبیلے کے سردار سے پنگا لیا ہے۔ اس کا نتیجہ بھی دیکھے گا۔''

اچانک اس عاشق کے پیچھے سے کئی گولیاں چلنے لگیں۔ افسر نے کہا۔ ''دیکھ، سردار کے آدمی آگئے ہیں۔ آگے ہم ہیں۔ پیچھے وہ ہیں۔ بچ کے کہاں جائے گا؟''

وہ پریشان ہو کر سوچنے لگا کہ کیا کرے؟

اس کی محبوبہ ایک مکان کے کمرے میں رسیوں سے بندھی ہوئی بیٹھی تھی۔ وہ رہ رہ کر زور لگاتے ہوئے رسیاں توڑنے کی ناکام کوششیں کر رہی تھی۔ مراد ان رسیوں کی گرہیں کھولنے لگا۔

وہ کھل گئی۔ آزاد ہو گئی۔ اس کی سمجھ میں آیا کہ وہ اپنی کوششوں میں کامیاب ہوئی ہے۔ وہ فوراً ہی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ وہاں سے دبے قدموں چلتی ہوئی دوسرے کمرے میں آئی۔ اس کمرے کی کھڑکی باہر کی طرف کھلتی تھی۔ وہاں افسر گن لیے کھڑا تھا۔ وہ کھڑکی کے کنارے چھپا ہوا باہر تاریکی میں دیکھنے کی کوششیں کر رہا تھا۔ بہت محتاط تھا۔ باہر سے کوئی گولی اسے آکر لگ سکتی تھی۔

باقی سپاہی مکان کے باہر مورچا بنائے ہوئے تھے۔ وہ سوچنے لگی وہاں سے کیسے نکلے؟ باہر سپاہی ہوں گے اور یہ کمینہ مجھے جانے نہیں دے گا۔ پھر رسیوں سے باندھ دے گا۔ اچانک ہی افسر کے ہاتھ سے گن نکل گئی۔ اسے یوں لگا جیسے کسی نے ایک جھٹکے سے چھین لیا ہو۔ وہ گن اڑتی ہوئی دوسرے کمرے کے دروازے کے سامنے آکر گری۔ وہاں

وہ کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے فوراً ہی جھک کر اسے اٹھالیا۔ پھر اسے نشانے پر رکھتے ہوئے بولی۔ ''تو قانون کا رکھوالا ہے۔ کیا اسی طرح رکھوالی کرتے ہیں؟ میری شادی نواز سے ہونے والی ہے اور تو مجھے سردار کے حوالے کرنا چاہتا ہے۔''

وہ دور ہی سے گن کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''اے کیا کرتی ہے۔ اسے پھینک دے۔ گولی چل جائے گی۔''

''گولی چلنے کے لیے ہوتی ہے۔ مجھ پر نہ چلی، تجھ پر چلے گی۔ اپنے سپاہیوں کو حکم دے۔ وہ ہتھیار پھینک کر دونوں ہاتھ اٹھا کر کمرے میں آجائیں۔''

وہ بولا۔ ''پھر بھی تو نہیں جاسکے گی۔ سردار کے آدمی آگئے ہیں۔ وہ ادھر سے گولیاں چلا رہے ہیں۔''

وہ حقارت سے تھوک کر بولی۔ ''تو ان کو آواز دے۔ ان سے بول کہ میرے نشانے پر ہے۔ وہ ایک بھی گولی چلائیں گے تو ادھر تو مارا جائے گا۔''

وہ تنبیہ کے انداز میں انگلی دکھاتے ہوئے بولا۔ ''تو پچھتائے گی۔ ابھی یہاں سے جائے گی تو سردار صبح تک تیرے مرد کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ گن مجھے دے۔''

اس نے ٹریگر کو دبایا۔ ایک گولی اس کے پیروں کے پاس فرش کو اک ذرا سا ادھیڑتی ہوئی چلی گئی۔ پھر وہ بولی۔ ''جو بول رہی ہوں، وہ اپنے سپاہیوں سے بول۔ نہیں تو دوسری گولی تیرے سینے میں اتار دوں گی۔''

وہ محتاط انداز میں چلتی ہوئی اس کے پیچھے گئی۔ وہ چیخ چیخ کر سپاہیوں سے کہنے لگا۔ ''اپنی بندوقیں پھینک کر یہاں آجاؤ۔ نہیں تو یہ مجھے مار ڈالے گی۔''

تمام سپاہی دوڑتے ہوئے آئے۔ انہوں نے بندوقیں نہیں پھینکی تھیں۔ پہلے اپنے افسر کی صحیح سچویشن معلوم کرنا چاہتے تھے۔ وہ جیسے ہی بندوقیں لے کر دروازے پر آئے، اس نے تڑاتڑ دو گولیاں چلادیں۔ ایک گولی کھا کر مرا، دوسرا زخمی ہوا۔ باقی سب دروازے سے دور جا کر نظروں سے اوجھل ہوگئے۔

وہ چیخ کر بولی۔ ''میں نے کہا تھا، بندوقیں پھینک کر آؤ۔ اب اگر نہیں پھینکو گے تو یہ مارا جائے گا۔''

افسر نے سہم کر کہا۔ ''کیا تم لوگ مجھے مار ڈالنا چاہتے ہو؟ حماقت نہ کرو۔ بندوقیں پھینک کر آؤ۔''

وہاں تین سپاہی رہ گئے تھے۔ چوتھا زخمی پڑا تھا۔ انہوں نے آپس میں مشورہ کیا۔ ایک نے کہا۔ ''وہ نہیں جانتی ہے کہ ہم یہاں تین ہیں۔ ابھی تم ہتھیار پھینک کر جاؤ۔ میں

سنہری کرنیں

☆ جھوٹ بول کر جیت جانے سے بہتر ہے کہ تم سچ بول کر ہار جاؤ۔ دل میں برائی اور بغض رکھ کر ملنے سے بہتر ہے کہ ناراضگی ظاہر کر کے رشتہ توڑ دو۔

☆ حضرت علیؓ فرماتے ہیں۔ ''جتنی بھی بڑی مشکل ہو، جتنا بھی بڑا امتحان ہو۔ گھر سے نکلتے وقت روٹی کے ایک نوالے میں تھوڑا سا نمک ڈال کر کھالو۔ ایسا ممکن ہی نہیں کہ وہ گھر مایوس ہو کر لوٹے۔''

☆ اگرچہ لفظوں کے دانت نہیں ہوتے مگر جب یہ کاٹ لیتے ہیں تو پھر ان کے زخم زندگی بھر نہیں بھرتے۔

☆ حضرت علیؓ نے فرمایا۔ ''اپنے جسم کو ضرورت سے زیادہ نہ سنوارو۔ اسے تو مٹی میں جانا ہے۔ سنوارنا ہے تو اپنی روح کو سنوارو۔ اسے رب کے پاس جانا ہے۔''

بچے ہمارے عہد کے

☆ نئی نسل کا ایک نوجوان جوڑا رومینٹک گفتگو کر رہا تھا۔ بیوی نے بڑے محبت بھرے انداز میں شوہر سے اٹھلا کر پوچھا۔ ''ڈارلنگ! کبھی تم نے سوچا کہ اگر میری شادی کسی اور سے ہوجاتی تو کیا ہوتا؟''

شوہر نے بڑی معصومیت سے جواب دیا۔ ''نہیں، میں نے کبھی کسی کا برا نہیں سوچا۔''

عقلمند

ایک سکھ اپنی بھابی کو خوب مار رہا تھا۔ لوگوں نے پوچھا کہ تم اپنی بھابی کو کیوں مار رہے ہو۔

سکھ نے جواب دیا۔ ''میری بھابی ٹھیک عورت نہیں ہے۔''

لوگوں نے پوچھا۔ ''تمہیں کیسے پتا؟''

سکھ تلملا کر بولا۔ ''آپاں جس دوست کولوں پچھدے آں۔ توں کس نال گل کر رہا ایں۔ اوہ ایوی جواب دیندا اے۔ تیری بھابی نال......''

مرسلہ۔ اختر شاہ عارف، ڈھوک جمعہ، جہلم

یہاں چھپ کر رہوں گا۔ جیسے ہی وہ غافل ہوگی یا جگہ بدلے گی، میں اسے گولی ماردوں گا۔''
اس پلاننگ کے مطابق دو سپاہی ہتھیار پھینک کر دروازے پر آئے۔ محبوبہ نے پوچھا۔'' اور سپاہی کہاں ہیں؟''
ایک سپاہی نے کہا۔'' ہم اتنے ہی رہ گئے ہیں۔ ایک کو تم نے مار ڈالا ہے۔ دوسرا یہاں زخمی پڑا ہے۔''
اسی وقت تیسرے سپاہی کے حلق سے کراہ نکلی۔ اس کے پیٹ میں ایک گھونسا لگا تھا۔ پھر دوسرا اس کے منہ پر لگا۔ اس کے منہ سے آواز نکلی۔ '' ارے باپ رے۔''
محبوبہ نے غصے سے پوچھا۔'' یہ باہر کون بول رہا ہے؟''
ایک سپاہی نے کہا۔'' ہمارا ایک ساتھی کھیت میں گیا تھا۔ فارغ ہو کر ابھی آیا ہے۔''
دونوں سپاہی اسے غصے سے دیکھنے لگے۔ وہ تکلیف سے کراہتے ہوئے بولا۔'' کوئی مجھے مار رہا ہے۔ سچ بول رہا ہوں، وہ نظر نہیں آرہا ہے۔''
وہ بھی نہتا ہو کر دروازے پر آگیا۔ محبوبہ نے دوسرے کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔'' اس کمرے کے اندر جاؤ اور اس زخمی کو بھی لے جاؤ۔''
انہوں نے حکم کی تعمیل کی۔ ان سب کے اندر جاتے ہی وہ افسر سے بولی۔'' دروازے کو باہر سے بند کردو۔''
اس نے آگے بڑھ کر دروازے کو بند کیا۔ اس کی ایک اوپر والی چٹخنی لگائی۔ دوسری درمیانی چٹخنی کو یونہی ہاتھ لگا کر چھوڑ دیا۔ اگر وہ اندر سے دروازے کو دھکا دیتے تو اوپر والی چٹخنی نیچے ہوجاتی۔ دروازہ کھل جاتا۔
مراد نے درمیانی چٹخنی لگادی۔ افسر نے حیرانی سے دیکھا اور اس چٹخنی کو پھر کھول دیا۔ مراد نے اسے پھر لگادیا۔
وہ ڈانٹ کر بولی۔'' یہ کیا کررہے ہو؟ ہٹو وہاں سے۔ کھڑکی کے پاس جاؤ اور سردار کے آدمیوں سے بولو، وہ نواز کو نقصان پہنچائیں گے تو تم یہاں مارے جاؤ گے۔''
وہ کھڑکی کے پاس آکر حلق پھاڑ کر چیخنے لگا۔'' رمزی دادا! نواز پر گولی نہ چلاؤ۔ یہاں میں نشانے پر ہوں۔ نواز کو نقصان پہنچے گا تو میں مارا جاؤں گا۔''
رمزی دادا نے ادھر سے چیخ کر پوچھا۔'' وہاں کون تمہارا دشمن ہے؟ تمہارے سپاہی کہاں مر گئے ہیں؟ فکر نہ کرو۔ ہم اسے چاروں طرف سے گھیر لیں گے۔''
'' ایسا نہ کرنا۔ تم ادھر آؤ گے تو یہ مجھے مار ڈالے گی۔''
اس نے حیرانی سے پوچھا۔'' مار ڈالے گی؟ یہ کیا کہہ رہے ہو؟ کیا تم کسی عورت سے ڈر رہے ہو؟''

'' ہاتھ میں بندوق ہو تو عورت مرد بن جاتی ہے اور مرد عورت کی طرح سہم جاتا ہے۔ میں اس طاقت سے ڈر رہا ہوں جو اس کے ہاتھ میں آگئی ہے۔''
'' آخر وہ ہے کون؟''
وہ لڑکی کو دیکھتے ہوئے بولا۔'' یہ نور جمالہ ہے جسے تم سردار کے پاس لے جانا چاہتے ہو۔''
وہ حیرانی سے بولا۔'' ارے کیا بول رہے ہو؟ اس کے ہاتھ میں بندوق کیسے آگئی؟''
'' میں کیا بتاؤں کہ میرا ریوالور اس کے ہاتھ کیسے لگ گیا ہے۔ جب شامت آتی ہے تو کچھ بھی ہوجاتا ہے۔ میری جان بچاؤ۔ اپنے آدمیوں کے ساتھ واپس چلے جاؤ۔''
'' اگر نور جمالہ کو یہاں سے نہ لے گیا تو سردار جوتے مارے گا۔ اس سے بولو، ریوالور تمہیں واپس کرے۔ ورنہ تمہیں قتل کرنے کے بعد بھی کہیں بھاگ کر نہیں جاسکے گی۔ ہم اس کی آنکھوں کے سامنے نواز کو گولی ماریں گے اور اسے لے جاکر سردار کے قدموں میں گرائیں گے۔''
بات ختم ہوتے ہی اس کے منہ پر ایک گھونسا پڑا۔ پھر ایک کراٹے کا ہاتھ اس کی ناک پر پڑا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا مراد نے اس کی گن چھین لی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے تارے ناچ رہے تھے۔ آسمان ستاروں سے روشن تھا۔ اس نے ستاروں کی مدھم سی روشنی میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔'' یہ...... یہ کون ہے؟ یہ...... مگر...... نظر کیوں نہیں آرہا ہے؟''
پھر وہ ٹھٹک گیا۔ اس کی اپنی بندوق فضا میں معلق تھی۔ اس کا رخ اسی کی طرف تھا۔ بندوق کا سیفٹی کیچ آپ ہی آپ ہٹ گیا۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ کوئی اس کی گولیوں سے اسے ہی چھلنی کرنے والا ہے۔ اس نے ڈرتے ڈرتے اسے پکڑنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو گولی چل گئی۔ اس کے شانے کی ہڈی کو توڑتی ہوئی گزر گئی۔ وہ زخمی شانے پر ہاتھ رکھ کر وہاں سے پلٹ کر بھاگتے ہوئے چیخنے لگا۔ اپنے آدمیوں سے کہنے لگا۔'' بھاگو یہاں سے۔ یہاں کوئی جن یا بھوت ہے۔ یہ ہمیں مار ڈالے گا۔''
نیم تاریکی میں بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز دور ہوتی جارہی تھی۔ مراد نے نواز کے پاس آکر کہا۔'' اے...!''
اس نے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ مراد نے کہا۔ '' مجھے دیکھ نہیں سکو گے۔ سردار کے آدمی میدان چھوڑ گئے ہیں۔ نور جمالہ اس مکان میں اکیلی ہے۔ فوراً ادھر جاؤ۔''
وہ دوڑتا ہوا اس مکان میں آیا۔ نور جمالہ نے للکارا۔

"خبردار! جو ادھر آئے گا، اسے گولی ماردوں گی۔"

وہ بولا۔ "نوراں! میں ہوں نواز۔ گولی نہ چلانا۔"

وہ تیزی سے چلتا ہوا دروازے پر آیا۔ پولیس افسر اس کی محبوبہ کے نشانے پر اکڑوں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ خوش ہوکر بولا۔ "جیو میری نوراں! تو نے تو میرا سینہ چوڑا کردیا ہے۔"

وہ بولی۔ "سپاہی اس کمرے میں ہیں۔ اسے بھی وہاں بند کردے۔ کیا رمزی دادا چلا گیا ہے؟"

"ہاں، کوئی جن ہے نوراں! ہماری مدد کررہا ہے۔"

اس نے افسر کو لات ماری پھر اسے دھکے دیتا ہوا اس کمرے میں دھکیل کر دروازے کو باہر سے بند کردیا۔ نور جمالہ آکر اس سے لپٹ گئی۔ موت سے لڑکر یار کو پھر سے پاکر خوشی کے مارے رونے لگی۔

مراد نے ڈانٹ کر کہا۔ "الگ ہوجاؤ۔"

وہ فوراً ہی ایک دوسرے سے دور ہوگئے۔ اِدھر اُدھر بولنے والے کو دیکھنے کی کوشش کرنے لگے۔

مراد نے پوچھا۔ "کیا تم دونوں کی شادی ہوچکی ہے؟"

دونوں نے انکار میں سر ہلایا پھر نواز نے کہا۔ "ہم شادی کرنے والے تھے لیکن سردار کا دل میری نوراں پر آگیا ہے۔ آج تو ہم آپ کی مہربانی سے بچ گئے ہیں۔"

وہ بولی۔ "لیکن اب اس بستی میں اس علاقے میں نہیں رہ سکیں گے۔ سردار ہمیں جینے نہیں دے گا۔"

مراد نے کہا۔ "باہر جاؤ۔ ایک پیجیرو آرہی ہے۔ اس میں کراچی جاؤ۔ وہاں تم دونوں کی رہائش اور روزگار کا انتظام ہوجائے گا لیکن خبردار! نکاح سے پہلے ایک دوسرے کے لیے نامحرم ہو، تب تک اپنے درمیان فاصلہ رکھو۔"

وہ دونوں مکان سے باہر سڑک پر آگئے۔ پیجیرو وہاں آکر رک گئی۔ مراد نے محبوب سے کہا۔ "کچھ اور نیکیاں کرنی ہیں۔ دو محبت کرنے والوں کے لیے یہاں کی زمین تنگ ہورہی ہے۔ انہیں کراچی لے چلیں۔"

پیجیرو میں مزید کسی کے لیے جگہ نہیں تھی لیکن دل میں جگہ تھی۔ محبوب نے نواز سے کہا۔ "تم چھت پر دو بچوں کو لے کر بیٹھو۔ نور جمالہ گاڑی کے اندر بیٹھے گی۔"

اس طرح گنجائش نکل گئی۔ وہ قافلہ وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ مراد راستے کی رکاوٹیں دور کرتا جارہا تھا۔ کچھ دور جانے کے بعد ایک بستی کی چھوٹی سی مسجد سے اذان کی آواز سنائی دی۔

نماز کا وقت ہوگیا تھا۔ محبوب نے مسجد کے پاس گاڑی روک دی۔ نور جمالہ اور ماہ نور منگی نے کہا۔ "ہمیں بھی نماز پڑھنی ہے۔"

مراد کا دل بے اختیار ماہ نور کی طرف کھنچا جارہا تھا۔ وہ اب تک اس سے دور رہا تھا لیکن دل اس کی طرف اٹکا ہوا تھا۔ انہوں نے مسجد کے ایک گوشے میں ان کی نماز کے لیے جگہ مقرر کی۔ اس چھوٹی سی بستی میں کل چھ نمازی تھے۔ پیش امام نے نماز کے بعد کہا۔ "ہم چھ نمازیوں نے دن رات محنت کرتے ہوئے مسجد کی یہ چار دیواری کھڑی کی ہے۔ بعض اوقات پیش امام کو تین وقت کی روٹیاں بھی نصیب نہیں ہوتیں۔ کبھی کبھی ایک دو وقت کے فاقے ہوتے ہیں۔ اس علاقے کا سردار کبھی کچھ خیرات کردیتا ہے، کبھی انہیں نظرانداز کردیتا ہے۔"

محبوب نے کہا۔ "آپ اور کچھ نہ بولیں۔ ہمیں سن کر تکلیف ہورہی ہے۔ میں کراچی پہنچتے ہی اپنے دو چار آدمی یہاں بھیجوں گا۔ وہ اس مسجد کو مکمل کریں گے اور ہر ماہ بینک کے ذریعے پیش امام صاحب کی تنخواہ اور مسجد کے اخراجات آپ حضرات تک پہنچتے رہیں گے۔"

مراد کے پاس نوٹوں کی گڈیاں تھیں۔ وہ تمام گڈیاں پیش امام کو دیتے ہوئے بولا۔ "یہ آپ چھ نمازیوں کے لیے ہے۔ باقی امداد محبوب صاحب یہاں پہنچاتے رہیں گے۔"

وہ تمام نمازی مراد کو اور محبوب کو دعائیں دینے لگے۔ وہ مسجد سے باہر آگئے۔ ماہ نور منگی پیجیرو کی اگلی سیٹ پر ایک بچے کے ساتھ بیٹھ گئی۔ مراد نے پوچھا۔ "محبوب صاحب! آپ پچھلے چار گھنٹوں سے اس کے ساتھ سفر کررہے ہیں۔ یہ دل کی، دماغ کی اور مزاج کی کیسی ہے؟"

محبوب نے کہا۔ "میں نے اس کی روداد سنی ہے۔ یہ بہت ذہین ہے۔ اس نے کمپیوٹر سائنس میں ڈپلوما حاصل کیا ہے۔ یہ بھائیوں سے خوفزدہ ہے۔ چونکہ یہ ابھی گھر سے بے گھر ہوگئی ہے، غیروں کے ساتھ ہے اس لیے وہ بھائی غیرت کے نام پر اسے قتل کردیں گے۔ بھائیوں نے اس کی بڑی بہن کو بھی رازداری سے قتل کیا تھا۔"

پھر وہ بولا۔ "مراد ایک بات کہوں؟ یہ بہت سہمی ہوئی ہے۔ اسے بھائیوں کے پاس نہ جانے دو۔ اپنی منکوحہ بنالو۔"

مراد کے دل کی دھڑکنیں کچھ تیز ہوگئیں۔ محبوب نے اچانک اس کے دل کی بات کہہ دی تھی۔ اس نے دور بیٹھی ہوئی ماہ نور کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "کیا یہ راضی ہوجائے گی؟"

محبوب نے کہا۔ "اسے سہارے کی ضرورت ہے۔ تم بہت بڑا سہارا بن جاؤ گے۔"

''آپ کراچی پہنچنے تک رشتے کی بات چھیڑیں۔ ہمیں اس کی رضامندی معلوم ہونی چاہیے۔''
''کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ تم پجیرو ڈرائیو کرو۔ اس کے ساتھ بیٹھ کر جاؤ؟''
''پجیرو میں آپ کہاں بیٹھیں گے؟ اگر آپ تنگ ہوکر بیٹھیں گے تو مجھے یہ گوارا نہیں ہوگا۔''
محبوب نے پیش امام کے پاس جاکر پوچھا۔ ''یہاں سے آگے کسی شہر تک جانے کے لیے کوئی سواری ملے گی؟''
اس نے کہا۔ ''اس بستی کا ایک آدمی شہر جاکر ٹیکسی چلاتا ہے۔ ہفتے دو ہفتے میں ادھر آتا ہے۔ اس کی ٹیکسی یہاں ہے۔ ہم ابھی اس سے بات کرتے ہیں۔''
تھوڑی دیر بعد ہی وہ ٹیکسی لے کر وہاں آگیا۔ وہ بہت خوش تھا کہ اسے کراچی تک لمبی سواری مل رہی تھی۔ تگڑی رقم ملنے والی تھی اور وہ کچھ روز کراچی شہر میں ٹیکسی چلا کر کمائی کرنا چاہتا تھا۔
محبوب چار بچوں کے ساتھ ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ مراد پجیرو کی ڈرائیونگ سیٹ پر ماہ نور منگی کے پاس آگیا۔ سب ہی کو آرام سے سفر کرنے کی سہولتیں حاصل ہوگئی تھیں۔ وہ گاڑیاں وہاں سے آگے چل پڑیں۔
مراد کو یوں لگ رہا تھا جیسے پہلی بار ایک حسینہ سے دل لگا رہا تھا۔ رومانس کی ابتدا اور اس کی قربت اچھی لگ رہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا گفتگو کی ابتدا کیسے کرے؟ ماہ نور نے ہی ابتدا کی۔ اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا آپ دونوں جڑواں بھائی ہیں؟''
''نہیں۔ یہ خدا کی قدرت ہے۔ ہم ایک ہی سانچے میں ڈھل کر اس دنیا میں آئے ہیں۔ وہ ایک ارب پتی بزنس مین ہیں، میرے محسن ہیں۔ ایسے نیک انسان ہیں کہ انہیں صرف فرشتہ ہی کہا جاسکتا ہے۔''
''اور آپ کیا کرتے ہیں؟''
اس نے جواب دینے سے پہلے سر گھما کر پیچھے دیکھا۔ وہاں کچھ لڑکیاں جاگ رہی تھیں، کچھ بیٹھے بیٹھے سو رہی تھیں۔ ان میں نور جمالہ اور نواز بھی تھے۔ ان کے متعلق اس حد تک معلوم ہوا تھا کہ وہ سب تعلیم یافتہ نہیں ہیں یا اس حد تک ہیں کہ روانی سے بولنے والی انگریزی سمجھ نہیں پاتے ہیں۔
اس نے ماہ نور سے انگریزی میں پوچھا۔ ''کیا ہم اس لینگویج میں باتیں کرسکتے ہیں؟''
''میں کوشش کروں گی۔''
''اگر میں کہوں کہ میں ایک ریاست کا حکمران ہوں تو کیا یقین کروگی؟''
''میں نے آپ کو یا محبوب صاحب کو ٹی وی چینلز کے ذریعے دیکھا ہے۔ محبوب صاحب سے بھی کہا ہے آپ سے بھی کہتی ہوں کہ آپ کے اور کتنے ہم شکل ہیں۔''
''چینلز کے ذریعے محبوب صاحب کا ہم شکل نظر آنے والا حکمران میں ہی ہوں۔''
''آپ اتنے بڑے حکمران ہوکر ہمارے ساتھ یہاں وقت ضائع کیوں کررہے ہیں؟''
وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''تم خود ہی سوچو' وقت ضائع کررہا ہوں یا نیکیاں کمارہا ہوں؟''
''بے شک ہمارے ساتھ نیکی کررہے ہیں لیکن اپنی ریاست کو چھوڑ کر یہاں کیوں آئے ہیں؟''
''میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔ ایک شریکِ حیات کی تلاش میں بھٹک رہا تھا۔''
وہ بولی۔ ''تھا کا مطلب ہے، تلاش ختم ہوگئی ہے۔ وہ آپ کو مل گئی ہے؟''
''ہاں، میں اس لمحے میں اسے پروپوز کررہا ہوں۔''
وہ ذرا ٹھٹک گئی۔ ذرا جھجک گئی۔ مراد نے کہا۔
''مے آئی سے۔ آئی پروپوز یو فار مائی لائف پارٹنر...''
اس نے سر کو جھکا لیا۔ اپنے آپ میں سمٹنے لگی۔ یہ عورت کی فطرت ہے۔ وہ بدن چرانے لگی۔
مراد نے کہا۔ ''تم شادی سے پہلے جس طرح کا تحفظ اور ضمانت چاہوگی، وہ دوں گا۔''
وہ اپنے سر پر آنچل رکھتے ہوئے بولی۔ ''آپ ہم لڑکیوں اور بچوں کے ساتھ جو نیکیاں کررہے ہیں، یہی آپ کے حق میں بہت بڑی ضمانت ہیں۔''
''شکریہ۔ تو پھر میں خوش ہوجاؤں کہ تمہیں اعتراض نہیں ہے؟ تم نے مجھے قبول کرلیا ہے؟''
وہ سر کے آنچل کو سنبھالنے لگی۔ اس کی یہ ادا کہہ رہی تھی کہ قبول ہے۔ وہ بولا۔ ''ہم کراچی پہنچ کر نکاح پڑھوائیں گے۔''
وہ بولی۔ ''آپ میرے بھائیوں کو نہیں جانتے۔ وہ بہت ظالم ہیں۔''
''ہم نے عورتوں اور بچوں کو اغوا کرنے والے ایک بھی ظالم اسمگلر کو زندہ نہیں چھوڑا۔ یہ منظر تم دیکھ چکی ہو۔ وہ میرا اور تمہارا کچھ نہیں بگاڑیں گے۔ فکر نہ کرو۔''
ماہ نور پھر کچھ نہ بولی۔ وہ دن کے دس بجے کراچی پہنچ گئے۔ محبوب نے فون کے ذریعے معروف جتی کو اطلاع دی۔

"میں ابھی اپنی کوٹھی میں پہنچنے والا ہوں۔ آپ وہاں آجائیں۔"

معروف نے کوٹھی میں آکر سمیرا سے کہا۔ "وہ ابھی آرہا ہے۔ کیا اس نے بتایا ہے کہ دشمنوں سے کیسے نجات ملی ہے؟"

وہ بولی۔ "صرف اتنا کہا ہے کہ مراد نے ناقابلِ یقین دلیری کا مظاہرہ کیا۔ بے شمار فوجیوں کو ہیلی کاپٹرز سمیت تباہ کیا ہے۔ ان کے ساتھ مراد بھی آرہا ہے۔"

معروف نے کہا۔ "اس نے مجھ سے کہا ہے کہ چار لڑکیاں اور چھ کم سن لڑکے ملک سے باہر اسمگل ہونے والے تھے۔ انہیں اسمگلروں سے نجات دلا کر یہاں لا رہے ہیں۔ میں ان سب کو ان کے گھروں میں یا کسی فلاحی ادارے میں پہنچانے کے انتظامات کروں گا۔"

ان کی باتوں کے دوران ہی وہ ایک پجیرو اور ایک ٹیکسی میں آگئے۔ معروف جگی نے فلاحی مقاصد کے لیے اور دینی معاملات میں مالی امداد دینے کے لیے چند کارکنوں کی ایک ٹیم بنائی تھی۔ اس نے ان کارکنوں کو بلا کر ہدایت کی کہ جن لڑکیوں کے والدین یہاں آکر انہیں لے جائیں تو انہیں جانے دو۔ ورنہ انہیں فلاحی ادارے میں پہنچا دو۔ چھ لڑکوں کو ان کے بتائے ہوئے پتے پر ان کے والدین کے پاس لے جاؤ۔ نور جمالہ اور نواز کے لیے حکم دیا کہ ان کی رہائش کا انتظام کیا جائے۔ بعد میں نواز کو ل میں ملازمت دی جائے گی۔

محبوب نے سمیرا سے کہا۔ "یہ ماہ نور ہے۔ اس کا خاص خیال رکھو۔ آج شام کو مراد سے اس کا نکاح پڑھایا جائے گا۔"

اس نے کراچی پہنچنے سے پہلے ہی ماروی کو اطلاع دی تھی کہ وہ خیریت سے ہے اور مراد کے ساتھ کراچی پہنچ گیا ہے۔ نیند پوری کرنے کے بعد رات کو کسی وقت اسے کال کرے گا۔

اس نے بیڈروم میں آکر سمیرا سے کہا۔ "مجھے نیند پوری کرنے اور تھکن اتارنے دو۔ پھر تمہارے ساتھ وقت گزاروں گا۔"

کوٹھی کے باہر سیکیورٹی کے سخت انتظامات کیے گئے تھے۔ کسی طرح کا اندیشہ نہیں تھا۔ سپر پاور جیسے دشمن پر دہشت طاری کردی گئی تھی۔ مراد سے سیاسی سمجھوتا ہونے تک وہ کسی طرح کی عداوت کرنے والے نہیں تھے۔ مراد آرام اور سکون سے سونے کے لیے ریاست کے محل میں آگیا۔ دوسرے مراد یعنی اس کے ہم زاد نے کہا۔ "آرام سے سو جاؤ۔ میں جاگ رہا ہوں۔ اہم معاملات سے مختار رہوں گا۔"

پھر اس نے کہا۔ "میں کل صبح ریاست سے چلا جاؤں گا۔ باہر کسی ملک میں اپنے لیے شریکِ حیات کو تلاش کروں گا۔"

مراد نے کہا۔ "بے شک تمہیں بھی جلد سے جلد رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو جانا چاہیے۔ میں آج شام کو ایک شریف زادی سے نکاح پڑھوانے والا ہوں۔"

"تم تو ہتھیلی پر سرسوں جماتے ہو۔ تمہارے مزاج کے مطابق اتنی جلدی کہاں سے مل گئی؟"

"اللہ تعالیٰ نے دی ہے۔"

وہ بیڈروم میں آکر سو گیا۔ بڑی گہری، غافل کردینے والی نیند آئی۔ وہ بڑی ہی تھکا دینے والی اعصاب شکن جدوجہد سے گزر کر آیا تھا۔ ہم زاد نے آکر اسے محبت سے دیکھا پھر اس کے سرہانے سے فون اٹھا کر لے گیا تاکہ نیند میں مداخلت نہ ہو۔

وہ دوسرے بیڈروم میں آیا تو فون سے رنگ ٹون ابھرنے لگی۔ بلا اسے کال کررہا تھا۔ اس نے بٹن دبا کر کہا۔ "دروازہ کھولو۔ آگیا ہوں۔"

یہ کہتے ہی وہ بلے کے دروازے پر پہنچ گیا۔ بشریٰ نے دروازہ کھول کر کہا۔ "بھائی! السلام علیکم۔"

وہ اندر آتے ہوئے بولا۔ "وعلیکم السلام۔ میں تمہارا بھائی تو ہوں لیکن بھائی کا ہم زاد ہوں۔"

بلے نے پوچھا۔ "وہ کہاں ہے؟"

وہ ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "کچھ نہ پوچھو۔ سپر پاور کے بارہ بجا کر آیا ہے۔ گہری نیند میں ہے۔ میں نے اسے جگانا مناسب نہیں سمجھا۔ مجھے بتاؤ کیوں کال کی ہے؟ کوئی نئی پرابلم پیدا ہورہی ہے؟"

اس نے کہا۔ "پرابلم ہے بھی اور نہیں بھی۔ سپر پاور کے ایک اتحادی ملک کے وزیر خارجہ نے ہم سے ڈائریکٹ فون پر باتیں کی ہیں۔"

بشریٰ نے کہا۔ "جبکہ ہماری کوئی سیاسی اہمیت نہیں ہے۔ اسے آپ سے یا بھائی سے باتیں کرنی چاہئیں۔"

ہم زاد نے پوچھا۔ "وہ کیا کہہ رہا تھا؟"

"وہ کہہ رہا تھا کہ موجودہ حکمران مراد علی منگی نے تمام سفارت خانوں کو اپنی ریاست سے نکال کر بہت بڑی سیاسی غلطی کی ہے۔ اس نے مجھ سے اور بشریٰ سے کہا ہے کہ ہم مراد کو سمجھائیں اور جلد سے جلد ان تمام سفارت خانوں کو یہاں بحال کرائیں۔"

ہم زاد نے کہا۔ "یہ نظامِ حکومت کو چلانے کی باتیں تم

سے کیوں کررہے ہیں؟"
بشریٰ نے کہا۔ "انہوں نے ہمارے بارے میں بڑی معلومات حاصل کی ہیں۔ کہتے ہیں کہ ہم میاں بیوی مراد کے دو اہم بازو ہیں اور بھائی سے ہمارے دیرینہ تعلقات ہیں بلکہ رشتے داری ہے۔ ہم بھائی کو ان کی حمایت میں سمجھا سکیں گے۔"
بلے نے کہا۔ "فارن منسٹر کہہ رہا تھا کہ نگارا خانم نے عالمی عدالت میں مراد کے خلاف مقدمہ دائر کیا ہے۔ مراد پر الزام لگایا ہے کہ وہ سابقہ ملکہ کو جبراً ریاست سے نکال کر وہاں کا خود ساختہ حکمران بن گیا ہے۔ عالمی عدالت انصاف کرے اور اس کی ریاست اسے واپس دلائے۔ نگارا نے سپر پاور سے اور تمام بڑے ممالک سے اپیل کی ہے کہ مراد عدالتی فیصلے سے انکار کرے تو تمام ممالک متحد ہو کر اس ریاست کا بائیکاٹ کریں اور اس پر فوج کشی کریں۔ تمام دشمن نگارا خانم کو مدعی بنا کر ہمارے خلاف زبردست تیاریاں کررہے ہیں۔"
"کرنے دو۔ مراد نے پچھلے دو دنوں میں سپر پاور کے ہوش اڑا دیے ہیں۔ جب تک وہ عداوت سے باز نہیں آئیں گے۔ ہم ان سے دوستی اور سمجھوتا نہیں کریں گے۔"
ایسے ہی وقت رنگ ٹون ابھرنے لگی۔ ہم زاد نے ننھی سی اسکرین کو دیکھ کر کہا۔ "سپر پاور کا کوئی عہدیدار ہے۔"
اس نے بٹن کو دبا کر اسے کان سے لگا کر کہا۔ "ہیلو۔ میں مراد علی منگی بول رہا ہوں۔"
اس نے کہا۔ "ہز ہائی نس! پچھلی رات میری آپ سے بات ہوئی تھی۔ ابھی اطلاع ملی ہے کہ آپ مسٹر محبوب کے ساتھ کراچی پہنچ گئے ہیں۔ یہ دیکھیں کہ ہم کس قدر باخبر رہتے ہیں۔ کراچی میں یا دنیا کے کسی حصے میں آپ یا مسٹر محبوب جاتے آتے، چھپتے اور ظاہر ہوتے رہیں گے۔ وہاں ہماری سیکرٹ سروس کے چھپے ہوئے جاسوس موجود رہیں گے۔ پلیز ذرا ٹھنڈے دماغ سے سوچیں۔ آپ تو روپوش رہنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں لیکن ماروی اور محبوب کو کب تک کہاں کہاں چھپاتے پھریں گے؟"
ہم زاد نے کہا۔ "درست کہتے ہو۔ میں سوچوں گا، سمجھوں گا پھر جواب دوں گا۔"
وہ بولا۔ "ہم جانتے ہیں کہ ماروی لندن میں ہے۔ چیلسی کے وسیع علاقے میں کہیں ہے۔ ہم جلد ہی اس کی خفیہ پناہ گاہ تک پہنچ جائیں گے۔ نہ پہنچ پائے تو اسے اس علاقے سے کسی دوسری جگہ جانے نہیں دیں گے۔ وہاں کی تمام پولیس فورس اور سراغ رسانوں کے پاس اینٹی میک اپ اور اینٹی کاسٹیوم کیمرے ہیں۔ ماروی میک اپ میں اور نقاب میں چھپ کر باہر آئے گی تو ہمارے کیمروں کی آنکھیں اسے کیچ کرلیں گی۔ ہم ماروی کو اور مسٹر محبوب کو ڈھیل دے رہے ہیں۔ ہمارا کوئی جاسوس، کوئی شوٹر ان کے قریب نہیں جائے گا۔ ہز ہائی نس ہماری دوستی اور دیانت داری کی قدر کریں۔ ہم سے معاہدہ کریں اور سفارتی تعلقات بحال کریں۔"
"ہم چند اہم معاملات میں الجھے ہوئے ہیں۔ چوبیس گھنٹے کے بعد آپ سے مذاکرات کریں گے۔"
"آپ کے لیے ایک اہم اطلاع یہ ہے کہ سابقہ ملکہ نگارا خانم نے آپ کے خلاف عالمی عدالت میں مقدمہ دائر کیا ہے جلد ہی آپ کو وہاں حاضر ہونا پڑے گا۔ ملکہ نے ہم سے اور دوسرے تمام بڑے ممالک سے اپیل کی ہے کہ ہم ان کے حقوق واپس دلانے کے لیے آپ پر فوج کشی کریں۔"
"میری سرحد پر آنے والی فوج کا انجام بڑے ممالک دیکھ چکے ہیں۔ آئندہ بھی دیکھیں گے۔ میری نظروں میں نگارا کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ میرے سامنے اس کا ذکر نہ کریں۔"
"او کے۔ ہم چوبیس گھنٹے تک انتظار کرتے رہیں گے۔"
رابطہ ختم ہوگیا۔ ہم زاد نے بشریٰ اور بلے سے کہا۔ "تم دونوں کو یہ بہت بڑی خوش خبری سنا دوں کہ مراد شادی کررہا ہے۔ آج شام کراچی میں اس کی پسند کی ایک لڑکی سے نکاح پڑھایا جائے گا۔"
بشریٰ نے کہا۔ "بھائی نے اتنی بڑی خوش خبری ہمیں نہیں سنائی۔ وہ کہاں ہیں؟"
"وہ محل میں آتے ہی سوگیا ہے۔ تھکن سے چور ہے۔ جاگنے کے بعد ضرور تم دونوں کو اپنی خوشیوں میں شریک کرے گا۔ میں نے اس کا یہ فون اپنے پاس رکھا ہے تاکہ کوئی اس کی نیند میں مداخلت نہ کرے۔"
وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر بولا۔ "میں چلتا ہوں۔ مراد جاگنے کے بعد تم لوگوں کو خوش خبری سنانے ضرور آئے گا۔"
وہ دروازے سے باہر آکر گم ہوگیا۔ اس نے محل میں آکر دیکھا۔ نماز ظہر کا وقت گزر رہا تھا اور وہ غافل پڑا ہوا تھا۔ ہم زاد نے اسے نہیں جگایا۔ خود وضو کرکے بالکونی میں آکر نماز ادا کی۔ پھر آرمی ہیڈ کوارٹر کا دورہ کیا۔ وہ ہر روز آرمی اور پولیس والوں کے درمیان جاتا تھا اور ان کی نظروں سے اوجھل رہ کر ان کے ڈھکے چھپے ارادوں کو سمجھتا رہتا تھا۔ اس طرح وہ چھپے ہوئے دشمنوں کو سمجھنے کے بعد

سزائیں دیتا تھا۔

ریاست کے تمام حساس اداروں کے چھوٹے بڑے عہدیدار سہم گئے تھے۔ اتنے محتاط ہو گئے تھے کہ تنہائی میں اور بند کمرے میں موجودہ حکمران کے خلاف سوچنے کی بھی جرأت نہیں کرتے تھے۔

ریاست کے عوام مراد علی منگی کو دل سے چاہنے لگے تھے۔ ڈھکی چھپی سازشیں اس لیے بھی نہیں ہو رہی تھیں کہ کسی ملک کا سفارت خانہ وہاں نہیں تھا۔ جو غیر ملکی ایک عرصے سے وہاں کام کر رہے تھے اور کسی طرح کی سازش میں ملوث نہیں تھے وہ عزت سے وہاں زندگی گزار رہے تھے۔

مراد کی وہ ریاست ارضِ اسلام اندر سے بہت مضبوط ہوتی جا رہی تھی۔ آئندہ بیرونی سازشوں اور حملوں سے مراد کو نمٹنا تھا۔ ہم زاد اس کا ایک مضبوط بازو بن گیا تھا۔ وہ عصر کی نماز ایک مسجد میں پڑھنے کے بعد محل میں آیا تو مراد اس وقت بھی بے خبر سو رہا تھا۔

مغرب کی نماز کے بعد اس کا نکاح ماہ نور سے پڑھایا جانے والا تھا۔ ہم زاد محبوب کی کوٹھی میں پہنچ گیا۔ وہ محبوب اور معروف سے کہنے آیا تھا کہ مراد بہت تھکا ہوا ہے۔ نمازِ عشا کے بعد نکاح پڑھایا جائے۔ اس وقت تک وہ نکاح قبول کرنے کے لیے آجائے گا۔

وہ نادیدہ ہو کر آیا تھا۔ پہلے وہاں کے افراد کو دیکھنا اور ان کی باتیں سننا چاہتا تھا۔ محبوب اور معروف جگی ڈرائنگ روم میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ پوری کوٹھی میں دو مرد اور دو عورتیں تھیں۔ اس نے بیڈ روم میں آ کر سمیرا اور ماہ نور کو دیکھا۔ سمیرا، ماہ نور کو دلہن بنا رہی تھی۔ میک اپ نے ہیئر اسٹائل نے اور بھڑکتے ہوئے ملبوسات نے ماہ نور کے حسن کو اور بھڑکا دیا تھا۔

ہم زاد دم بخود ہو کر اسے دیکھتا رہ گیا۔ دل بے اختیار اس کی طرف کھنچا جا رہا تھا۔ اس نے دل میں کہا.....

"یا خدا......! یہ کیسا پاگل کر دینے والا حسن ہے۔ کیسی من موہنی سی صورت ہے۔ میں تو پاگل ہو رہا ہوں۔"

اس نے بالکل قریب آ کر کبھی سامنے سے کبھی دائیں بائیں مختلف زاویوں سے اسے دیکھا۔ وہ سحر زدہ ہونے لگا۔ بالکل قریب ہو کر دل کہہ رہا تھا کہ اسے اپنی دھڑکنوں سے لگا لے۔

وہ پیچھے ہٹ گیا۔ اس سے دور ہو کر اسے دیکھنے لگا۔ سوچنے لگا۔ آخر وہ ہم زاد تھا۔ کبھی پازیٹو کبھی نگیٹیو سوچ رکھنے والا تھا۔ وہ بیڈ روم سے باہر آ گیا۔ بند دروازے کو دیکھنے لگا۔ اس دروازے کے پیچھے اس کی تمام آرزوئیں تمام خواہشیں دلہن بنی ہوئی تھیں۔

اس نے کوٹھی کے باہر آ کر کال بیل کے بٹن کو دبایا۔ محبوب نے آ کر دروازہ کھولا۔ اسے دیکھ کر بولا۔ "کہاں رہ گئے تھے تم؟ میں تو تھکن سے چور ہو گیا تھا۔ گھوڑے بیچ کر سو رہا تھا۔ کیا تم بھی نیند سے اٹھ کر آئے ہو؟"

وہ اندر آ کر بولا۔ "ہاں، میں بھی تھکن سے نڈھال ہو گیا تھا۔ آنکھ کھلتے ہی آیا ہوں۔"

اس نے ڈرائنگ روم میں آ کر معروف جگی سے مصافحہ کیا۔ اس وقت مغرب کی اذان ہو رہی تھی۔ معروف جگی نے کہا۔ "ہم مسجد میں چلیں؟"

ہم زاد نے کہا۔ "میں چھپ کر آیا ہوں۔ بے شمار لوگ مجھے کئی چینلز کے ذریعے ایک حکمران کی حیثیت سے دیکھ چکے ہیں۔ یہ مناسب نہیں ہے کہ لوگ ایک ریاست کے حکمران کو یہاں دیکھیں۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ دشمن سراغ رساں بھی میری تاک میں رہتے ہیں۔"

میچلین

اس خاتون کے بارے میں جبران کے ایک سوانح نگار نے لکھا ہے کہ یہ بوسٹن کی ایک حسین، پرجوش اور بذلہ سنج خاتون تھی۔ پورا نام ایملی میچل تھا لیکن پیار سے میچلین کے نام سے پکاری جاتی۔ جبران سے اس کی ملاقات بوسٹن ہی میں ہوئی تھی۔ سوانح نگار نے مزید لکھا ہے کہ یہ خاتون جبران کے پیچھے پیرس بھی گئی تھی اور وہاں اس سے درخواست کی تھی کہ وہ اس سے شادی کر لے۔ جبران نے انکار کر دیا تو اس نے دلبرداشتہ ہو کر اس کا مکان چھوڑ دیا اور پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غائب ہو گئی۔

خلیل جبران کے بعض دوسرے سوانح نگاروں نے بھی اس کہانی کو سچ تسلیم کیا ہے لیکن چند ایک ایسے بھی ہیں جنہوں نے اپنی کتابوں میں نام لے کر بطور خاص اس کا ذکر نہیں کیا۔ جو لوگ اس کہانی کو سچ تسلیم کرتے ہیں۔ وہ اس کے ثبوت میں دو باتیں پیش کرتے ہیں۔ ایک یہ کہ جبران نے عازم پیرس ہونے سے پہلے اس خاتون کی تصویر بنائی تھی اور دوسرے جبران کی ایک کتاب کا انتساب ہے جو میچلین کے نام ہے۔

(خلیل جبران کے افکار پر مشتمل کتاب "روح کے آئینے سے" اقتباس)

وہ تینوں وہیں ڈرائنگ روم میں نماز کے لیے کھڑے ہوگئے۔ ہم زاد نے نماز کی نیت کرتے ہوئے کہا۔
''سبحانک اللھم۔ اے اللہ تیری پاکی بیان کرتا ہوں۔''
اس کے ضمیر نے پوچھا۔ ''اللہ کی پاکی بیان کرنے والے! کیا تیری نیت پاک ہے؟''
ماہ نور کے لیے دھڑکتے ہوئے دل نے کہا۔ ''ہاں، میں نیک نیتی سے اسے شریک حیات بنانے والا ہوں۔''
ضمیر نے کہا۔ ''وہ مراد کی امانت ہے۔''
ہم زاد نے کہا۔ ''میں ہی مراد ہوں۔ میرے باپ کا نام وہی ہے جو اس کے باپ کا نام ہے۔ ہم ایک ہی وجود کے دو حصے ہیں۔ وہ میں ہوں اور میں وہ ہوں، جو ابھی سو رہا ہے۔''
نماز جاری تھی۔ وہ اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کر رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ ''اے اللہ! مجھے صراطِ مستقیم پر چلا۔ اس راہ پر چلا' جس پر تو نے انعام رکھا ہے۔ اس راستے سے بچالے جس پر تیرا غضب نازل ہوتا ہے۔''
اللہ کیوں بچائے گا؟ جبکہ قہر خداوندی کو خود ہی پکارتے ہو۔ اس دلہن کو اللہ کا انعام سمجھ رہے ہو۔ جو مکرو فریب سے حاصل ہونے والی ہے۔ کیا ہے تمہاری نماز؟ رب کے حضور سجدہ کرتے ہوئے بھی خود کو جائز سمجھ رہے ہو۔ وہ پوری نماز کے دوران میں خود کو درست ثابت کرنے کے لیے طرح طرح کے دلائل سیتا رہا۔
یہ خوش فہمی میں مبتلا رہنے والے نمازیوں کی فطرت ہے۔ وہ جان بوجھ کر غلطیاں کرتے ہیں اور بڑے یقین کامل سے کہتے ہیں کہ وہ اللہ کے لاڈلے بندے ہیں۔ اللہ انہیں معاف کردیتا ہے۔ وہ بھول جاتے ہیں۔ جب کسی حادثے کا شکار ہوتے ہیں کہ انہیں غلطیوں کی سزا مل رہی ہے۔ وہ بھول جاتے ہیں، جب بیماریاں ان پر نازل ہوتی ہیں کہ یہ سزائیں مل رہی ہیں۔ وہ سمجھ نہیں پاتے کہ سزا کے طور پر کس طرح ان کی بیویوں اور بچوں پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹ رہے ہیں۔ وہ جان لیں کہ اللہ انہیں معاف نہیں کرتا ہے۔
ہم زاد کی نماز ہوگئی۔ نماز کے ہوجانے اور نماز کے قبول ہوجانے میں فرق ہے۔ وہ سجدے کرتا رہا۔ زمین پر سر مارتا رہا۔ پھر قاضی صاحب آگئے لیکن خدا جو چاہتا ہے وہی ہوتا ہے جب مراد کی قسمت میں ماہ نور کا ساتھ لکھ دیا گیا تھا تو کیسے کوئی تیسرا درمیان میں آسکتا تھا۔ عین وقت پر مراد کی آنکھ کھلی اور پھر برق رفتاری سے سارے فاصلے سمٹتے چلے گئے۔ ہم زاد منہ دیکھتا رہ گیا اور ماہ نور مراد کی ہوگئی۔ آخر میں ہم زاد نے جھنجلا کر کہا۔
''میں جا رہا ہوں۔ میری سمجھ میں آرہا ہے۔ بابا صاحب تم پر مہربان ہیں۔ وہی کچھ کر رہے ہیں۔ میں فریب سے اسے حاصل نہیں کرسکوں گا۔''
وہ چلا گیا۔ ہم زاد کی یہ بات دل کو لگی کہ بابا صاحب کچھ کر رہے ہیں۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا دروازے پر آیا۔ پھر وہ سیج کے سرے پر آکر بیٹھ گیا۔ پھر بولا۔ ''ماہ نور! تم نے قاضی صاحب کے سامنے نکاح قبول کیا۔ میں نے نہیں سنا۔ میں نے بھی قبول کیا تو تم نے نہیں سنا۔ میں اپنے دل کی تسلی کے لیے چاہتا ہوں کہ میرے سامنے مجھ کو قبول کرو۔ میں تمہارے سامنے تمہیں قبول کروں گا۔''
گھونگھٹ کے پیچھے سے رس بھری مترنم آواز سنائی دی۔ ''میں ہزار بار آپ کو قبول کرتی ہوں۔ دل وجان سے آپ کو اپنا سرتاج اپنے سر کا آسمان اور مجازی خدا تسلیم کرتی ہوں۔ اس دنیا میں میرا اور کوئی نہیں ہے۔ آپ ہی میرے اوّل ہیں آپ ہی میرے آخر ہیں۔''
مراد گلدان سے ایک گلاب کا پھول لے آیا۔ اسے گھونگھٹ کے اندر پیش کرتے ہوئے بولا۔ ''رونمائی کے لیے یہ پھول قبول کرو۔ اس کے بعد میری پوری ریاست تمہارے لیے ہے۔''
ماہ نور نے پھول کو قبول کیا۔ اس نے گھونگھٹ اٹھا کر چاند سے چہرے کو دیکھا۔ چاند زمین پر اتر آئے تو اس کی چاندنی میں ضرور نہانا چاہیے۔ وہ نہا گیا۔ سرشار ہوگیا۔

☆☆☆

دوسری صبح مراد اور ماہ نور نے پاک صاف ہوکر ...... نماز پڑھی۔ ایک عبادت گزار کے ساتھ پوری زندگی گزارنی تھی۔ وہ پہلے ہی دن سے نماز کی عادی ہونے لگی۔
اس نے خدشہ ظاہر کیا تھا کہ اس کے دو بھائی بہت ظالم ہیں۔ غیرت مند ہونے کے بہانے بہنوں کو زندہ نہیں چھوڑتے۔ یوں انہیں ختم کرکے ان کے حصے کی جائداد ہتھیا لیتے ہیں۔
مراد نے اپنا فون اسے دے کر کہا۔ ''اپنے کسی بھائی سے بات کراؤ۔ میں تمہارے تمام اندیشے دور کردوں گا۔''
ماہ نور نے فون لے کر نمبر پنچ کیے۔ پھر اسے کان سے لگایا۔ دوسری طرف بیل جا رہی تھی۔ وہ بھائی صبح دیر تک سونے کا عادی تھا۔ اس نے نیند میں ہاتھ بڑھا کر لائن کاٹ دی۔ چند لمحوں کے بعد پھر رنگ ٹون چیخنے لگی۔ اس نے کان

کے اوپر تکیہ رکھ لیا۔ پھر بھی فون پکار رہا تھا۔ اس نے جھنجلا کر کہا۔ ”ارے کون ہے مردود...... کیوں نیند خراب کر رہا ہے؟“

پھر خیال آیا کہ اس نے فون اٹینڈ کرنے کا بٹن نہیں دبایا ہے۔ مجبوراً ہاتھ بڑھا کر فون کو اٹھا کر بٹن دبانے کے بعد اسے کان سے لگایا۔ پھر دہاڑتے ہوئے پوچھا۔ ”کون ہے؟“

جواب میں بہن کی آواز سنائی دی۔ ”اوا...... ! میں ہوں ماہ نور۔ آپ کی بہن...“

”یہ تو ہے۔ اتنے دنوں کے بعد فون کر رہی ہے۔ بے شرم کتنے لوگوں سے منہ کالا کیا ہے؟ ہمارا سر جھکا کر گئی ہے۔ ادھر آئے گی تو تجھے زندہ گاڑ دیں گے۔“

جواب میں مراد کی آواز سنائی دی۔ ”سائیں! غصہ نہ کرو۔ یہ اپنی مرضی سے نہیں گئی تھی۔ اسے اغوا کیا گیا تھا۔ یہ بہت شرم والی ہے۔ اس نے میرے سے شادی کی ہے۔ میں بھی منگی ہوں۔ گدھا گاڑی چلاتا ہوں۔ اچھی آمدنی ہے۔ عزت سے گزارہ ہو رہا ہے۔“

”چلو اچھا ہے۔ وہیں رہو۔ میری نیند خراب نہ کرو۔ اسے یہاں نہ لاؤ۔ ہم اس کی صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتے۔“

”یہ کیسے ہوسکتا ہے سائیں؟ ابھی میرے پاس ایک گدھا گاڑی ہے۔ ماہ نور اپنی زمین جائداد کے کروڑوں روپے لے کر آئے گی تو میں اور دس گدھا گاڑیاں خرید لوں گا۔ کراچی جیسے شہر میں ہم بھی بہت پیسے والے ہو جائیں گے۔“

وہ بڑی حقارت سے بولا۔ ”اچھا تو ماہ نور کو زمین جائداد چاہیے۔ چیونٹی کو پر نکل رہے ہیں۔ آجاؤ یہاں زمینوں کے بدلے کروڑوں روپے ملیں گے۔“

”شکریہ۔ آپ تو بہت اچھے ہیں۔ یہ ماہ نور خواہ مخواہ ڈر رہی تھی۔ میں آج شام ہی کو اس کے ساتھ آؤں گا۔“

رابطہ ختم ہو گیا۔ ماہ نور نے پریشان ہو کر کہا۔ ”ہم نہیں جائیں گے۔ اللہ نے آپ کو ایک ریاست کا حکمران بنایا ہے۔ آپ کی زندگی میں کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔ میں اس ریاست کی ملکہ کہلاؤں گی۔ آپ خواہ مخواہ خطرات کو دعوت نہ دیں۔“

مراد نے کہا۔ ”ماہ نور! ہماری سندھی تہذیب بہت خوبصورت ہے۔ بہت ہی جامع اور مکمل ہے۔ یہ تہذیب ہمارے پاس بزرگوں کی امانت ہے۔ جو لوگ کاروکاری کے اور قرآن مجید سے شادی کی جاہلانہ رسومات کے ذریعے ہماری تہذیب کا چہرہ بگاڑ رہے ہیں، ان کا سختی سے محاسبہ کرنا چاہیے۔ ہمیں زمین جائداد کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارا فرض ہمیں پکارتا ہے اور تقاضا کرتا ہے کہ ہم اپنی تہذیب و ثقافت کو کسی بھی پہلو سے کمزور نہ ہونے دیں۔ جو کمزور کر رہے ہیں، انہیں مٹا کر رکھ دیں۔ ماہ نور! ہم محبت کرنے والوں کے لیے نرم ہیں۔ ان کے آگے جھک جاتے ہیں۔ جیسے محبوب علی چانڈیو ہیں اور گرمی دکھانے والوں کے لیے گرم ہیں جیسا کہ میں ہوں مراد علی منگی۔“

ماہ نور آکر اس کے سینے سے لگ گئی۔ تہذیب کے امین خود کو منوانا جانتے ہوں تو سب ہی راضی ہو کر ان کے سینے سے آکر لگ جاتے ہیں۔

دوپہر کو کھانے کی میز پر سمیرا اور محبوب کے علاوہ معروف تجلی بھی تھا۔ مراد نے کہا۔ ”ماروی لندن میں اکیلی ہے۔ میں اس کی حفاظت کے لیے دن رات وہاں نہیں رہ سکوں گا۔ اسے وہاں سے نکالنا ہوگا۔“

محبوب نے کہا۔ ”میں تمہاری پریشانیوں کو سمجھ رہا ہوں۔ تم اکیلے ہو اور بیک وقت کئی محاذوں پر رہ کر جنگ لڑ رہے ہو۔“

معروف نے کہا۔ ”ماروی یہاں آئے گی تو تم مطمئن ہو کر کاروبار پر پوری توجہ دے سکو گے۔ اسے یہاں لے آؤ۔“

سمیرا نے گھور کر معروف کو دیکھا۔ وہ بوڑھا صرف کاروبار کی بقا اور سلامتی کی فکر میں رہتا تھا۔ سوکن کو اس کے سر پر لا کر بٹھانے کی بات کر رہا تھا۔

اس نے کہا۔ ”میں اس کے ساتھ ایک چھت کے نیچے نہیں رہوں گی اور یہ کوٹھی میری ہے۔ اسے نہیں چھوڑوں گی۔“

محبوب نے کہا۔ ”وہ تمہارا حق چھیننے کے لیے نہیں آرہی ہے۔ تم دیکھ چکی ہو۔ میری ایک اور شاندار کوٹھی ہے۔ ماروی وہاں رہے گی۔“

معروف نے کہا۔ ”وہ یہاں کیسے آئے گی؟ کیا دشمن رکاوٹ نہیں بنیں گے۔“

محبوب سوچ میں پڑ گیا۔ مراد نے کہا۔ ”وہاں کی انٹیلی جنس والوں کو یہ معلوم ہو چکا ہے کہ وہ نمرہ کے نام سے انیس عالم کی فیملی میں رہتی تھی۔“

محبوب نے کہا۔ ”ہاں اس کا شناختی کارڈ اس کا پاسپورٹ سب ہی نمرہ کے نام سے ہے۔ وہ چھپ کر نہیں آسکے گی۔“

معروف نے کہا۔ ”مراد! تم نے تمام ممالک کے سفیروں کو اپنی ریاست سے رخصت کر دیا ہے۔ اگر تم سفارتی تعلقات رکھو گے تو دشمن دوست بن کر رہیں گے۔ وہ خود ہی ماروی کو سلامتی سے یہاں پہنچا دیں گے۔“

محبوب نے کہا۔ ”پھر یہ کہ ماہ نور کو اپنی ریاست میں لے جاؤ گے۔ سفارتی تعلقات بحال ہو جائیں گے تو تم اپنی دلہن کو بھی سلامتی سے وہاں لے جاسکو گے۔“

وہ سر ہلا کر بولا۔ ”مجھے یہی کرنا ہوگا۔ آپ ماہ نور کا پاسپورٹ اور ضروری کاغذات تیار کرائیں۔ میں تمام مالک سے باتیں کرنے کا وقت مقرر کرتا ہوں۔“

کھانے کے بعد ماہ نور اور مراد نے ایک گھنٹے تک آرام کیا۔ پھر مراد گن اور بلٹس لے کر ماہ نور کے ساتھ محبوب کی کار میں آکر بیٹھ گیا۔ وہاں سے ڈرائیو کرتا ہوا اس کے میکے کی طرف جانے لگا۔ اس نے پوچھا۔ ”تمہیں ڈرائیونگ آتی ہے؟“

وہ بولی۔ ”ہاں آتی تو ہے لیکن میں نے کراچی کی سڑکوں پر کبھی گاڑی نہیں چلائی۔“

اس نے کراچی سے باہر آکر نیشنل ہائی وے پر گاڑی روک دی پھر کہا۔ ”میری سیٹ پر آؤ اور ڈرائیو کرو۔“

وہ ڈرائیونگ سیٹ پر آگئی۔ وہ اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس نے بڑے اعتماد سے گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھائی۔ مراد نے کہا۔ ”میری زندگی میں آگ اور بارود کے سوا کچھ نہیں ہے۔“

”میں جانتی ہوں۔ سمیرا بھابی نے مجھے آپ کے بارے میں بہت سی باتیں بتائی ہیں۔“

”میرے دو اہم راز ایسے ہیں جنہیں صرف ماروی اور محبوب صاحب جانتے ہیں اور آج تم جاننے والی ہو۔“

وہ دونوں ہاتھوں سے اسٹیئرنگ کو تھامے ڈرائیو کر رہی تھی۔ مراد نے اس کے ایک ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔ ”میں وہ راز بتا رہا ہوں، تم ڈر تو نہیں جاؤ گی؟“

”ایسی ڈرنے کی کیا بات ہے؟“

”گاڑی ایک کنارے کر کے روکو۔“

اس نے روک کر مراد کو دیکھا۔ مراد نے کہا۔ ”اپنے پیچھے دیکھو۔“

اس نے پیچھے دیکھا۔ مراد نے کہا۔ ”اب مجھے دیکھو۔“

اس نے سر گھما کر دیکھا تو چونک گئی۔ وہ بیٹھے بیٹھے گم ہو گیا تھا۔ نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ سیٹ پر گھٹنوں کے بل اٹھ کر پچھلی سیٹ کی طرف دیکھنے لگی۔ حیرانی سے بولی۔ ”آپ کہاں ہیں؟“

اسے برابر والی سیٹ سے آواز سنائی دی۔ ”میں تمہارے پاس ہوں۔ جہاں بیٹھا ہوا تھا، وہیں ہوں۔ اپنا ہاتھ بڑھاؤ۔“

اس نے ایک ہاتھ بڑھایا تو وہ ہاتھ مراد کے دونوں ہاتھوں میں آگیا۔ ماہ نور ایک ذرا سہم کر بولی۔ ”یہ...... یہ آپ ہیں نا؟“

”میں ہی ہوں تمہارا شوہر، تمہارا مجازی خدا مراد علی منگی۔“

”آپ نظر کیوں نہیں آرہے؟“

”جب کہو گی، نظر آؤں گا۔ ابھی یہ سن لو کہ یہ جادو نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت صلاح الدین اجمیری کے وسیلے سے مجھے دو روحانی کرامات عطا فرمائی ہیں۔ ایک تو یہ کہ جب چاہتا ہوں، نادیدہ ہو جاتا ہوں اور یہ لو ابھی دیدہ ہو گیا۔“

ماہ نور خوش ہو کر اس سے لپٹ گئی۔ وہ نظر آرہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”دوسرا اہم راز یہ ہے کہ میں ایک نہیں دو ہوں۔ ایک اور مراد بالکل میرے جیسا ہے۔“

”کیا آپ کا اور بھی کوئی ہم شکل ہے؟ جیسا کہ محبوب صاحب ہیں؟“

”ہاں مگر وہ دوسرا مراد میرا ہمزاد ہے۔ میری طرح نادیدہ ہو جاتا ہے۔ میرا بہت ہی مضبوط بازو ہے۔ کبھی کبھی بہک جاتا ہے۔ ہر انسان کے اندر مثبت اور منفی سوچ ہوتی ہے۔ اس دوسرے مراد میں کبھی کبھی منفی سوچ پیدا ہوتی ہے۔ وہ غلطیاں کرتا ہے پھر سنبھل جاتا ہے۔ گاڑی آگے بڑھاؤ۔“

وہ اس سے الگ ہو کر کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھانے لگی۔ مراد اسے بتانے لگا کہ ہمزاد نے کیسی غلطی کی تھی اور بڑی مکاری سے اس نے ماہ نور سے نکاح پڑھوانے کی کوشش کی تھی لیکن اب وہ اس سے دور جا چکا ہے۔

ماہ نور نے کہا۔ ”میرے ساتھ اتنا بڑا دھوکا ہونے والا تھا۔ وہ پھر آئے گا تو میں دھوکا کھا جاؤں گی۔ یہی سمجھوں گی کہ آپ آئے ہیں۔“

”وہ آئندہ کبھی تمہارے سامنے نہیں آئے گا۔“

”مکاری کرنے والوں پر آپ کو بھروسا نہیں کرنا چاہیے۔“

”ماہ نور! وہ میری ذات کا ایک حصہ ہے۔ ہم کبھی کبھی شیطان کے بہکانے میں آجاتے ہیں۔ خدا کا خوف دل سے نکال دیتے ہیں لیکن شیطان کا طلسم جلد ہی ختم ہو جاتا ہے۔ ہم پھر راہ راست پر آکر توبہ کرتے ہیں۔ یوں سمجھو کہ میں نے غلطی کی اور میں توبہ کر کے جا چکا ہوں۔ وہ جو میں ہوں، وہ تمہارے سامنے کبھی نہیں آئے گا۔“

”آپ جانتے ہیں وہ کہاں ہے؟“

”ہاں۔ وہ ریاست کے معاملات سنبھال رہا ہے۔“

وہ ونڈ اسکرین کے باہر دیکھتے ہوئے بولی۔ ”ہمارا گوٹھ آرہا ہے۔ یہ دیکھ کر اطمینان ہوا ہے کہ آپ نادیدہ ہوجاتے ہیں۔ اللہ نے چاہا تو آپ کو کسی طرح کا نقصان نہیں پہنچے گا۔“

”اب میں گم ہوجاؤں گا۔ تم اپنے میکے پہنچ کر کہو گی کہ میں ضروری کام کے باعث نہ آسکا۔ کل صبح آؤں گا۔“

کھیتوں کے درمیان ایک کچی سڑک تھی۔ اس نے گاڑی کو اس سڑک پر لاتے ہوئے کہا۔ ”یہاں سے ہماری زمینیں شروع ہوتی ہیں۔ میرا بچپن ایسے ہی کھیتوں میں گزرا ہے۔“

”کیا ایسے ماحول میں کبھی سوچا تھا کہ ایک ریاست کی ملکہ بن جاؤ گی؟“

”ہاں۔ اکثر رانی مہارانی بننے کے خواب دیکھا کرتی تھی۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے۔ تعبیر مل تو رہی ہے۔“

”میں نے گدھا گاڑی چلاتے وقت کبھی نہیں سوچا تھا کہ تقدیر کتنے عذابوں سے اور کیسے جان لیوا تجربات سے گزار کر مجھے اقتدار کی مسند پر بٹھائے گی۔“

”ایسا ہوتا ہے۔ جب اللہ چاہتا ہے، ایک ذرّہ اڑتا ہوا پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ جاتا ہے لیکن غرور سے بچنے کی یہ شرط ہے کہ ذرّہ بلند چوٹی پر پہنچ کر خود کو پہاڑ نہ سمجھے۔ ہم غرور سے باز آکر جھک سکتے ہیں۔ سجدہ کرسکتے ہیں۔ پہاڑ نہیں جھکتا۔ وہ سجدہ نہیں کرتا اس لیے زلزلے کے ایک جھٹکے سے زمیں بوس ہوجاتا ہے۔“

ماہ نور نے اچانک بریک لگا کر گاڑی روکی۔ مراد نے پوچھا۔ ”کیا ہوا؟“

وہ ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے بولی۔ ”بھائی... دونوں بھائی آرہے ہیں۔“

مراد نے ادھر دیکھا۔ وہ بہت دور تھے۔ دو ہٹے کٹے وڈیرے ہاتھوں میں بندوق لیے آرہے تھے۔ ان کے پیچھے چار حواری تھے۔ ان کے ہاتھوں میں کدال اور پھاوڑے تھے۔

مراد چشم زدن میں ان کے پاس پہنچ گیا۔ وہ ایک مہنگی اور خوبصورت سی کار کو آتے دیکھ کر رک گئے تھے۔ ایک وڈیرے نے کہا۔ ”بخشو! کیا وہ اتنی مہنگی کار میں آرہے ہیں؟ مگر وہ تو ایک گدھا گاڑی والا ہے۔ کار کیسے چلائے گا؟“

بخشو نے کہا۔ ”ادا......! یہ وہی دونوں ہیں۔ ہمیں دیکھتے ہی دور گاڑی روک دی ہے۔“

”چلو آگے بڑھ کر دیکھتے ہیں۔“

اس نے پلٹ کر حواریوں سے کہا۔ ”جاؤ۔ گڑھا کھودو۔“

مراد نے ایک حواری کے پیچھے رہ کر بڑی حیرانی سے پوچھا۔ ”گڑھا کس لیے؟“

بخشو نے گھور کر کہا۔ ”تیری ماں کے لیے... ذلیل کتے! تجھے بتایا تو تھا کہ آنے والوں کی لاشوں کو چھپایا جائے گا۔“

حواری نے کہا۔ ”ہاں قسم۔ میں کچھ نہیں بولا تھا۔ میرے پیچھے سے آواز آئی تھی۔“

دوسرے حواری نے اس کے سر پر چپت لگا کر کہا۔ ”کیا پیچھے سے تیرا باپ بول رہا تھا؟“

اس حواری کے ہاتھ میں پھاوڑا تھا۔ مراد نے اس کے ہاتھ کو مضبوطی سے پکڑ کر گھمایا تو پھاوڑا دوسرے حواری کے سر پر لگا۔ وہ چکرا کر گر پڑا۔ بخشو نے رائفل کے کندے سے پھاوڑے والے کے منہ پر مارتے ہوئے کہا۔ ”پاگل کے بچے! تو نے اسے کیوں مارا؟“

وہ مار کھا کر زمین پر گر پڑا تھا۔ تکلیف کے باعث کچھ بول نہیں پا رہا تھا۔ مراد نے بخشو کے پیچھے آکر ایک وڈیرے کو زور کی لات ماری۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا آکر بڑے بھائی سے ٹکرا گیا۔ بڑے وڈیرے نے پوچھا۔ ”کیا ہوگیا ہے تجھے؟“

اس نے بخشو کی طرف انگلی اٹھا کر کہا۔ ”اس کتے نے مجھے لات ماری ہے۔“

وہ اپنے دونوں کان پکڑ کر بولا۔ ”مجھ سے جیسی بھی قسم لے لو۔ میں آپ کی طرف انگلی اٹھانے کی ہمت نہیں کرسکتا پھر لات کیسے ماروں گا؟“

مراد نے بخشو کو پیچھے سے جکڑ کر اس کے ہاتھوں کو مضبوطی سے پکڑ کر کدال کو گھمایا تو اس کی نوک وڈیرے کے سینے میں دھنس گئی۔ یہ ایسا حملہ تھا کہ اس کی سانس اوپر کی اوپر ہی رہ گئی۔ دیدے پھیل گئے۔ ہاتھ سے رائفل چھوٹ گئی۔ پھر وہ زندگی سے چھوٹ کر زمین پر گر پڑا۔

وہ بہن کے لیے گڑھا کھودنے آیا تھا۔ اب اس کے لیے قبر کھودی جانے والی تھی۔ دوسرا وڈیرا بھائی اس پر جھک گیا۔ دونوں بھائیوں نے عمر زیادہ ہونے کے باوجود شادی نہیں کی تھی۔ اس لیے بڑے بھائی کو اس کی موت کا افسوس نہیں ہوا کیونکہ مرنے والے کی زمینیں آئندہ اسے ملنے والی تھیں۔

جس حواری کے ہاتھوں سے کدال چل گئی تھی، وہ

جانتا تھا کہ وڈیرا اسے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ وہ کدال پھینک کر کھیتوں کے اندر بھاگتا چلا گیا۔

ایک وڈیرا مر گیا تھا۔ دو حواری زخمی پڑے تھے۔ تیسرا بھاگ گیا تھا۔ صرف ایک حواری رہ گیا تھا۔ وڈیرے نے پریشان ہو کر کار کی طرف دیکھا۔ وہ بہن اور بہنوئی کو ہلاک کرنے آیا تھا۔ اس کے اپنے ہی ہلاک اور زخمی ہو گئے تھے۔

وہ آخری حواری سے بولا۔ ''اچانک یہ سب کیسے ہو گیا؟ سب ایک دوسرے کو کیوں مار رہے تھے؟ چل کدال اٹھا اور ادھر جا کے گڑھا کھود۔ میں بہن سے نمٹ کر آتا ہوں۔''

وہ حواری کدال اٹھانے لگا تو وڈیرے نے اسے نشانے پر رکھ لیا۔ یہ اندیشہ تھا کہ وہ کدال اس پر چلا سکتا ہے۔ وہاں کچھ ایسی ہی نا سمجھ میں آنے والی باتیں ہو رہی تھیں۔ وہ کدال اٹھا کر دور چلا گیا۔ وڈیرا تیزی سے چلتا ہوا ماہ نور کی طرف جانے لگا۔ جب وہ کار کے قریب پہنچنے لگا تو مراد نے اس کی ٹانگ پر ٹانگ ماری۔ وہ کار کے اگلے حصے سے ٹکراتا ہوا کچی سڑک پر گر پڑا۔ ہاتھ سے رائفل چھوٹ گئی۔

سر پر چوٹ لگی تھی لیکن وہ قابلِ برداشت تھی۔ وہ فوراً ہی اٹھ کر یہ دیکھنے سمجھنے کی کوشش کرنے لگا کہ وہ کیا چیز تھی، جو اس کے پاؤں سے ٹکرائی تھی؟

ایسی کوئی چیز دکھائی نہیں دی۔ رائفل بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ حیران ہو کر ادھر سے ادھر جاتے ہوئے اسے تلاش کرنے لگا۔ وہ زمین پر ڈھونڈ رہا تھا اور وہ آسمان سے ٹپکی اس کے سر پر آ کر گری تو سر چکرانے لگا۔

اس کا سر تو شراب کے نشے میں بھی چکراتا تھا۔ اس نے فوراً ہی جھک کر زمین پر پڑی ہوئی رائفل کو اٹھا لیا۔ یہ اندیشہ تھا کہ پھر گم نہ ہو جائے۔ اس نے حیرانی سے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ زمین پر سے گم ہونے والی رائفل آسمان سے کیسے آ گئی۔

اس نے سوچا کہ یہ بعد میں سمجھا جائے گا۔ پہلے ماہ نور سے نمٹا جائے۔ وہ تیزی سے چلتا ہوا گاڑی کے اگلے دروازے پر آیا۔ اس نے کار کے اندر اگلی پچھلی سیٹوں کو خالی دیکھ کر پوچھا۔ ''وہ کہاں ہے؟''

ماہ نور نے کہا۔ ''تجھ سے نمٹنے کے لیے میں ہی کافی ہوں۔ تو مجھے ہلاک کرنا چاہتا ہے لیکن تیری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ میرے قریب آنے تک ایک بھائی مارا گیا ہے۔ باقی حواری تیرے کسی کام کے نہیں رہے۔ تو گردن اکڑا کر سر اٹھا کر چلنے والا اوندھے منہ گرتا ہوا آیا ہے۔ اب یہ رائفل بھی تیرے کام نہیں آئے گی۔''

یہ سنتے ہی اس نے نشانہ لے کر ٹریگر کو دبایا۔ ایک بار نہیں، دو بار دبایا پھر تیسری بار دبایا۔ کھٹ کھٹ کی آواز ہوئی۔ گولی نہیں چلی۔ بندوق آسمان سے خالی ہو کر آئی تھی۔

اچانک ہی اس کے منہ پر گھونسا پڑا۔ رائفل ہاتھ سے چھوٹ گئی پھر دوسرا گھونسا پڑا۔ پھر تو گھونسوں کی اور لاتوں کی بارش ہوتی چلی گئی۔ وہ زمین پر گرتا ہوا لڑھکتا ہوا دور جا کر اٹھا پھر وہاں سے بھاگنے لگا۔ مراد نے اس کی رائفل کو اٹھا کر لوڈ کیا پھر بھاگنے والے پر گولی داغ دی۔ وہ اچھل کر گرا۔ گرنے سے پہلے اور ایک گولی لگی۔ اس نے رائفل کو ایک طرف پھینک کر ماہ نور کے پاس آ کر کہا۔ ''واپس چلو۔ ہمیں یہاں کسی نے آتے نہیں دیکھا ہے۔''

وہ واپسی کے لیے گاڑی کو موڑتے ہوئے بولی۔ ''امی نے سنا ہوگا کہ میں آ رہی ہوں۔ وہ میرا انتظار کر رہی ہوں گی۔''

''ہم پرسوں تمہارے بھائیوں کے سوئم میں آئیں گے۔ اب تو والدہ کے سوا تمہارا کوئی نہیں رہا ہے۔ تمہارے بھائیوں نے شادیاں نہیں کی تھیں۔ یونہی رنگ رلیاں مناتے رہے تھے۔ اب ان کی تمام زمینیں تمہاری ہوں گی۔''

''ہماری زمینیں سو مربع میل پر پھیلی ہوئی ہیں۔ میں ان کی نگرانی نہیں کر سکوں گی۔ پھر یہ کہ مجھے آپ کے ساتھ ریاست میں رہنا ہے۔ بچپن کے خواب پورے ہو رہے ہیں۔ میں ملکہ عالیہ بن کر رہا کروں گی۔''

''میرا مشورہ ہے، تمام زمینوں کا مختار نامہ محبوب صاحب کے نام لکھ دو۔ وہ انہیں سنبھال لیں گے۔''

''میں یہی کروں گی۔''

انہوں نے کراچی پہنچ کر محبوب اور معروف سے یہی کہا۔ محبوب کو اپنے کاروبار سے چھپر پھاڑ کر دولت مل رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ''میں اتنی زمینیں لے کر کیا کروں گا۔ انہیں ماہ نور کے نام ہی رہنے دو۔ وقت اور حالات بدلتے رہتے ہیں۔ ہو سکتا ہے تمہارے حالات پھر بدل جائیں۔ تمہیں ریاست کو چھوڑ کر پھر پاکستان واپس آنا پڑے۔ بے شک زمینوں کو میرے حوالے کرو۔ میں انہیں کاشتکاری کے لیے ٹھیکے پر دے دوں گا لیکن یہ ماہ نور کے نام پر ہی رہیں گی۔''

معروف نے کہا۔ ''مراد! تم زمین جائداد کے معاملات میں نہ پڑو۔ سپر پاور اور بڑے ممالک سے باتیں کرو۔ ان سے سمجھوتا کرو۔ اپنی ضرورت کے مطابق سیاسی دوستی کرو۔''

رات کے دس بج رہے تھے۔ وہ دوسرے دن سیاسی معاملات سے نمٹنے والا تھا۔ رات کے کھانے کے بعد ماہ نور کے ساتھ خواب گاہ میں آگیا پھر بولا۔ ''تمہیں دو گھنٹے تک تنہا رہنا ہوگا۔ میں اپنی ریاست میں جارہا ہوں۔ وہاں کے حالات کا جائزہ لے کر آجاؤں گا۔''

وہ اس کے سینے پر سر رکھ کر بولی۔ ''میں اپنی ریاست میں جانے اور وہاں کی ملکہ کہلانے کے لیے بہت بے چین ہوں۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ مجھے بھی ایسی کرامات حاصل ہوتیں۔ میں بھی آپ کی طرح پلک جھپکتے ہی وہاں پہنچ جاتی۔''

''انشاء اللہ تمہیں جلد ہی وہاں لے جاؤں گا۔ جلد ہی تمہارا پاسپورٹ اور اہم کاغذات تیار ہوجائیں گے۔''

اس نے دل سے اسے گلے لگایا۔ دل سے پیار کیا پھر پیار سے رخصت ہوگیا۔

☆☆☆

سپر پاور اور تین بڑے ممالک کے حکمران فوج کے اعلیٰ افسران اور سیاست کے ماہر مشیر اپنے اپنے ٹی وی اسکرین کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے اور اسکائپ کے ذریعے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے اور مراد علی منگی کے متعلق باتیں کررہے تھے۔

ایک بڑے ملک کے اعلیٰ حاکم نے کہا۔ ''مراد کو زیر کرنے کی خوش فہمی میں ہم نے بہت نقصان اٹھایا ہے۔ ہماری آرمی ریاست کی سرحد پر گئی تھی۔ ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ مراد آدھی رات کے بعد حملہ کرے گا۔ کیا یہ حیرانی کی بات نہیں ہے کہ اس نے چند گھنٹوں میں ہماری آرمی کے ایک سو دس جوانوں کو ہلاک کیا۔ دو سو سے زیادہ زخمی ہوئے۔ جس خیمے کو ہتھیاروں کا گودام بنایا تھا، اسے پوری طرح تباہ کردیا۔ باقی سپاہیوں کو جان بچا کر وہاں سے بھاگنا پڑا تھا۔''

ایک فوج کے اعلیٰ افسر نے کہا۔ ''تعجب ہے مراد کی آرمی اتنے اندر تک کیسے گھس آئی کہ ہتھیاروں کے گودام کو بھی تباہ کردیا اور ایک سو دس سپاہیوں کو بھی مار ڈالا۔ اس کے سپاہی کتنی تعداد میں تھے؟''

دوسرے فوجی افسر نے کہا۔ ''جو سپاہی زندہ بچ کر آئے ہیں، ان کا بیان ہے کہ ریاستی فوج کا ایک بھی سپاہی ان کے مقابلے پر نہیں آیا تھا یا چند سپاہی ہوں گے۔ انہوں نے ہماری فوج کے ہتھیاروں کے گودام میں اور کئی بڑے خیموں میں جانے کیسے چھپ کر ٹائم بم رکھ دیے تھے۔ ان بموں نے یکے بعد دیگرے ایسے دھماکے کیے تھے کہ درجنوں فوجی اسی دم ہلاک ہوگئے۔ سیکڑوں خیموں میں آگ لگ گئی۔ اس آگ کی روشنی میں دور تک ریاستی فوج کا کوئی سپاہی دکھائی نہیں دیا تھا۔''

ایک بڑے ملک کے حاکم اعلیٰ نے کہا۔ ''یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ لڑنے والا کوئی نہیں تھا اور آپ کی فوج کے سپاہی جلتے اور مرتے چلے گئے اور آخر میں بھاگ آئے؟''

ایک افسر نے کہا۔ ''ایسے کئی سوالات ہم سب کے ذہنوں میں چبھتے رہیں گے۔ اسی رات کی صبح ہونے تک ہمارے چار جنگی طیاروں نے ائربیس سے پروازیں کیں اور بلندی پر پہنچتے ہی زوردار دھماکوں سے ان سب کے پرخچے اڑ گئے۔ ان طیاروں میں بھی ٹائم بم رکھے گئے تھے۔ بیچ سمندر کے آسمان پر پرواز کرنے والے تین ہیلی کاپٹرز بھی اسی طرح تباہ ہوگئے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مراد یا اس کے آدمی کب ہمارے فوجی اڈوں میں آتے ہیں اور کسی کی نظروں میں آئے بغیر ٹائم بم رکھ کر چلے جاتے ہیں؟ سب سے زیادہ حیرانی کی بات یہ ہے کہ ابھی مراد لندن میں ہوتا ہے۔ ماروی کو سیکیورٹی دیتا رہتا ہے۔ ایک آدھ گھنٹے میں معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہزاروں میل دور بحری جہاز میں بھی ہے اور اپنی ریاست میں بھی ہے۔ عقل کام نہیں کرتی۔ یہی بات دماغ میں آتی ہے کہ وہ جادو جانتا ہے۔ اسی لیے بھی ہماری گرفت میں نہیں آتا ہے۔ جب تک ہم اس کی اندرونی خفیہ حکمتِ عملی کو نہیں سمجھیں گے تب تک اسے زیر نہیں کرسکیں گے اور نقصانات اٹھاتے رہیں گے۔ آج ہمیں اسی ایک سوال کا جواب معلوم کرنا ہے کہ ہم اس کے اندر گھسنے کا راستہ کیسے معلوم کریں؟''

ایک نے کہا۔ ''دو ہی راستے سمجھ میں آتے ہیں۔ ایک راستہ سختی کا دوسرا نرمی کا۔ یا تو اسے کسی طرح گھیر کر زنجیروں میں جکڑ کر تھرڈ ڈگری اپلائی کی جائے اور اس کی خفیہ حکمتِ عملی معلوم کی جائے۔ یا پھر محبت سے مارا جائے۔ اس کے اندر کا بھید معلوم کیا جائے۔''

سیاست کے ایک کھلاڑی نے کہا۔ ''ہم سختی کے راستے پر چل کر بہت زیادہ نقصان اٹھا چکے ہیں۔ پھر بھی ایک بار اور اس طرح گھیرا جائے کہ اسے جوابی کارروائی کا موقع نہ ملے۔ اس کے ساتھ ہی دوستی اور محبت کی ایسی زنجیریں پہنائی

جائیں کہ وہ آپ ہی آپ اسیر ہوتا چلا جائے۔"
ایک حاکم اعلیٰ نے کہا۔ "کل وہ ہم سے باتیں کرے گا۔ سفارتی تعلقات بحال کرنے کے سلسلے میں کڑی شرائط پیش کرے گا۔ ہم اسے مان لیں گے۔ اسی طرح ہم اس کا اعتماد حاصل کر سکیں گے۔"
دوسرے دن یہی ہوا۔ مراد کے ساتھ اسی طرح اسکائپ کے ذریعے سپر پاور سے اور چند بڑے ممالک سے مذاکرات ہوئے۔ اس نے کہا۔ "میں آپ تمام حکمرانوں سے امید کرتا ہوں کہ سفارتی تعلقات بحال کرنے کے لیے آپ میری جائز شرائط کو تسلیم کریں گے۔ آپ حضرات یہ تسلیم کریں کہ تمام سفارت خانے در پردہ اپنے اپنے ملک کے لیے جاسوسی کے فرائض انجام دیتے رہتے ہیں۔ کسی بھی ملک کے اندرونی رازوں تک پہنچنے کی کوششیں کرتے رہتے ہیں اور بظاہر سیاسی معاملات دوستانہ انداز میں نمٹاتے رہتے ہیں۔"
ایک حاکم نے کہا۔ "بے شک، اکثر ایسی وارداتیں ہوتی رہتی ہیں۔ ہم تحریری معاہدہ کریں گے۔ اس معاہدے کی رو سے آپ کو بھی شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔"
"میں شکایت نہیں کروں گا۔ کسی بھی سفارت خانے کا کوئی بھی عہدیدار میری ریاست کے خلاف جاسوسی کرتا ہوا اور سازشیں کرتا ہوا پکڑا جائے گا تو ہم کسی عدالتی کارروائی کے بغیر اسے گولی مار دیں گے۔"
ایک فوجی نے کہا۔ "گولی مارنے سے پہلے لازمی ہے کہ آپ انہیں سازشی مجرم ثابت کریں۔"
مراد نے کہا۔ "ہم گولی مارنے کے بعد آپ کو اطلاع دیں گے اور ثبوت پیش کریں گے۔ اس طرح آپ ان کے لیے معافی کی درخواست نہیں کر سکیں گے۔"
ان سب کو ذرا چپ لگ گئی پھر ایک نے بصد مجبوری کہا۔ "منظور ہے۔"
دوسروں نے بھی منظور کیا۔ مراد نے کہا۔ "آپ حضرات کے ملکوں سے جو انجینئرز، ڈاکٹرز، مختلف شعبوں کے کاریگر اور ہنرمند اور فلاحی مقاصد کی جماعتیں آئیں گی، انہیں یہاں کی شہریت دی جائے گی لیکن ان میں سے بھی جو مجرمانہ واردات کرتا ہوا پکڑا جائے گا، اسے بھی پہلے گولی ماری جائے گی پھر اس کے ملک کو اطلاع دی جائے گی۔"
سب نے منظور کیا۔ اس نے کہا۔ "میں اپنے بارے میں آپ کو یہ اطلاع دے رہا ہوں کہ میں نے شادی کی ہے اور میری دلہن کراچی میں ہے۔"

یہ سن کر سب ہی اسے مبارکباد دینے لگے۔ اس کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کرنے لگے۔ اس نے کہا۔ "شکریہ...... میں اپنی وائف کو کراچی سے اپنی ریاست میں لانا چاہتا ہوں۔"
سپر پاور کے اعلیٰ حاکم نے کہا۔ "آپ جب چاہیں ملکہ عالیہ کو ریاست میں لے آئیں۔ ہم بھرپور تعاون کریں گے۔ ہمارا ایک خصوصی وی آئی پی طیارہ ہز ہائی نس کو اور ملکہ کو کراچی سے ریاست تک لے جائے گا۔"
"آپ کا بہت بہت شکریہ۔ میں اپنا ذاتی طیارہ استعمال کروں گا۔ کل صبح چھ بجے وہ طیارہ ریاست سے لندن جائے گا۔ وہاں سے ماروی کو لے کر کراچی جائے گا پھر کراچی سے مجھے اور میری دلہن کو لے کر ریاست پہنچے گا۔ آپ حضرات سے گزارش ہے کہ کل صبح چھ بجے سے چوبیس گھنٹوں تک لندن اور کراچی کے ائرپورٹ کو میرے لیے اوپن رکھا جائے۔ کوئی ہم سے پاسپورٹ ویزا وغیرہ طلب نہ کرے اور نہ ہی کسٹم چیکنگ کے نام پر ہمیں روکا جائے۔"
ایک اعلیٰ حاکم نے کہا۔ "ہم ہز ہائی نس کے کام آکر دوستی اور اعتماد کو مستحکم کریں گے۔ کل سے چوبیس گھنٹے تک لندن ائرپورٹ کا ایک رن وے آپ کے طیارے کے لیے خالی رہے گا۔"
سپر پاور کے ایک حاکم نے کہا۔ "ہمیں آپ کا اعتماد حاصل کرنے کا موقع مل رہا ہے۔ میں ابھی حکم دوں گا تو کراچی ائرپورٹ کا ایک رن وے آپ کے لیے خالی ہو جائے گا۔"
"میں آپ تمام حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اس کے ساتھ ہی وارننگ دیتا ہوں۔ میں پہلی بار آپ پر اعتماد کر رہا ہوں۔ میرے اعتماد کو ٹھیس نہ پہنچائیے گا۔ ورنہ..."
وہ ذرا رک کر بولا۔ "لفظ ورنہ کے بعد کچھ کہنا ضروری نہیں ہوتا۔ بات خود ہی سمجھ میں آجاتی ہے۔"
یہ کہہ کر اس نے رابطہ ختم کیا پھر دوسرے ہی لمحے میں سپر پاور کے اعلیٰ حاکم کے پاس پہنچ گیا۔ وہ اسکائپ پر دوسرے ممالک کے حکمرانوں سے باتیں کرنے لگا۔ ایک ملک کا حاکم کہہ رہا تھا۔ "یہ مراد علی منگی بہت مغرور ہو گیا ہے۔"
دوسرے حاکم نے کہا۔ "عورتوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ خدا جب حسن دیتا ہے تو نزاکت آہی جاتی ہے۔ مرد کے متعلق کہا گیا ہے کہ جب اسے طاقت ملتی ہے تو وہ مغرور ڈکٹیٹر بن جاتا ہے۔ ایسی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔"
ایک نے کہا۔ "یہ اچھا موقع ہے۔ وہ اپنی نئی دلہن

کے ساتھ کراچی سے اپنی ریاست تک سفر کرے گا۔ اس نے آپ کے طیاروں کے اور ہیلی کاپٹروں کے پرخچے اڑائے تھے۔ اس کے جہاز کو بھی زمین و آسمان کے بیچ تباہ کیا جائے گا۔"

سپر پاور کے اعلیٰ حاکم نے کہا۔ "نہیں، دو اہم باتیں ہمارے پیشِ نظر ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہم خوش فہمی میں مبتلا رہ کر بہت نقصان اٹھا چکے ہیں۔ دوبارہ ایسی غلطی نہیں کریں گے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ اس کا اعتماد حاصل کرنے کا یہ بہترین موقع ہے۔ میں آپ سب سے کہتا ہوں، چوبیس گھنٹوں کے لیے اس سے دشمنی بھول جائیں۔ ہماری سیاسی حکمتِ عملی کے دور رس نتائج کو سامنے رکھیں۔ ہم اسے دوست بنا کر رفتہ رفتہ یہ راز معلوم کر سکتے ہیں کہ وہ کس طرح تنہا پوری فوج سے لڑتا ہے۔ اس نے کس طرح طیاروں اور ہیلی کاپٹروں کو فضا میں پرواز کے دوران تباہ کیا تھا۔ ابھی یہ اہم نہیں ہے کہ اسے مار ڈالیں۔ اہم یہ ہے کہ اس کی خفیہ طاقتوں کا سراغ لگائیں۔"

وہ تھوڑی دیر تک ان کی باتیں سنتا رہا۔ یہ یقین ہو گیا کہ دشمن اس کو، ماروی کو اور نئی دلہن کو نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ بڑی حکمتِ عملی سے دوست بن کر سیاسی چالیں چلتے ہوئے اس کی شہ زوری کا راز معلوم کرنے کی کوششیں کرتے رہیں گے۔

ویسے مراد کے حالات بھی اسے دشمنوں پر بھروسا کرنے پر مجبور کر رہے تھے۔ ماروی کو محبوب کے پاس پہنچانا ضروری تھا۔ وہ لندن میں زیادہ عرصے تک تنہا نہیں رہ سکتی تھی اور وہ زیادہ عرصے تک دن رات اس کی نگرانی نہیں کر سکتا تھا۔ ادھر ماروی کو محبوب کے پاس اور اِدھر ماہ نور کو اپنے ساتھ ریاست میں رکھنا ضروری تھا۔ اب تو جو ہونی ہے، وہ تو ہونے ہی والی تھی۔

☆☆☆

اس کا نام جینی جوزف تھا۔ ایسی حسین، ایسی دل نشین اور ایسی اداؤں سے بھرپور تھی کہ ماڈلنگ کی دنیا میں ہمیشہ ٹاپ آف دی لسٹ رہتی تھی۔ جو بھی حسینۂ عالم ہوتی ہے، حسن و جمال میں یکتا اور بے مثال ہوتی ہے۔ اسے حاصل کرنے کے لیے دنیا کے امیر ترین لوگ بڑی سے بڑی بولیاں دیتے ہیں۔

ایسی خوش نصیب حسینائیں دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹتی رہتی ہیں لیکن جینی نے ماڈلنگ کے پہلے ہی دن سے یہ اعلان کر دیا تھا کہ وہ ناقابلِ فروخت ہے۔ کوئی اس کی بولی نہ لگائے۔ وہ بکاؤ مال نہیں ہے۔

اس اعلان نے اس کی قدر و قیمت اور بڑھا دی تھی۔ یہ انسانی فطرت ہے۔ اس کے لیے شجرِ ممنوعہ بن جاؤ تو وہ شجر تک پہنچنے کے لیے جنت سے بھی نکل جاتا ہے۔ جو لاحاصل ہو جائے، اسے حاصل کرنے کے لیے ضدی، سرکش اور باغی ہو جاتا ہے۔

جینی نے لاحاصل ہو کر دل والوں کو دیوانہ اور عیاش مال داروں کو ضدی بنا دیا تھا۔ وہ غصے میں کہتے تھے۔ "وہ سالی خود کو سمجھتی کیا ہے؟ بھاؤ بڑھاتی جا رہی ہے اور ہاتھ نہیں آرہی ہے۔"

کوئی کہتا تھا۔ "اپنا بھاؤ بڑھا کر دنیا کے سب سے زیادہ دولت مند شخص کی آغوش میں جائے گی اور ہمارے ارمان لٹکتے رہ جائیں گے۔"

اور ایسے کئی تھے جو سوچ رہے تھے کہ اسے اٹھا لیا جائے۔ اسے اغوا کرنے کے بعد ایک پیسا خرچ نہیں ہوگا۔ وہ مفت میں حاصل ہو جائے گی۔

یہی آسان راستہ تھا۔ دو چار دولت مند ایسے تھے جنہوں نے واردات کرنے والوں کو ہزاروں ڈالرز اور پاؤنڈز کی آفر کی تھی اور کہا تھا، اسے رازداری سے اغوا کر کے ان کے رنگ محل میں پہنچا دیں۔ جو چیز مانگنے سے اور خریدنے سے بھی نہ ملے اسے چھین لیا جائے۔

اتنی بڑی دنیا میں ایک عورت کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنے بدن کو اپنے کسی آئیڈیل کے لیے محفوظ رکھے۔ جو عورت جینی کی طرح حسین، دل نشین اور اداؤں سے بھرپور ہوتی ہے، وہ سب ہی کو لوٹ کا مال نظر آتی ہے۔ جس میں دم خم ہوتا ہے، وہ آتا ہے اور اسے لوٹ لیتا ہے۔ وہ کبھی محفوظ نہیں رہ سکتی۔

اور یہی ہوا۔ ایک بار اسے اغوا کیا گیا لیکن اس کے نصیب اچھے تھے۔ جس گاڑی میں اسے لے جایا جا رہا تھا اس کا ایک پہیا پنکچر ہو گیا تھا۔ پھر پولیس کے آنے تک واردات کرنے والے فرار ہو گئے تھے۔

تب سے وہ سہم گئی تھی۔ انجانے لوگ کال کرنے لگے تھے۔ وہ پریشان ہو گئی تھی۔ اس نے اپنے اطراف سیکیورٹی مضبوط کر دی تھی لیکن شامت آتی ہے تو سیکیورٹی کے درمیان سے بھی گزر کر آجاتی ہے۔ راجرڈی سوزا ہیروں کی کان کا مالک تھا۔ ڈالرز، پاؤنڈز اور یورو اس کے ہاتھوں کا میل تھے۔ وہ دونوں ہتھیلیاں رگڑتا تو میل نہیں نکلتا تھا کرنسی نکلتی تھی۔

وہ حسن پرست تھا اور جینی کو ہوس کی سیج پر لانے کے لیے پاگل ہو رہا تھا۔ اس نے اغوا کرنے والوں کو بہت بڑی

آفردی تھی۔ اسے لندن سے افریقا کے شہر گوٹاما پہنچانے کے لیے ایک ٹیم بنائی گئی۔ بڑی مضبوط پلاننگ کی گئی۔ ایسے ہی وقت جینی کو ایک پروڈکشن کی ماڈلنگ کے لیے افریقا جانا پڑا۔ مجرموں کے لیے آسانی پیدا ہوگئی۔ وہ شوٹنگ کی خاطر آؤٹ ڈور لوکیشن میں آئی تو وہاں منظم حملہ کیا گیا۔ وہ گولیوں کی بوچھاڑ میں جینی کو اٹھا کر لے گئے۔

وہ بری طرح سہمی ہوئی تھی۔ ایک پجیرو کی درمیانی سیٹ پر بیٹھی سیاہ فام نیگروز کو دیکھ رہی تھی۔ وہ سب جدید اسلحے سے لیس تھے۔ اس نے پوچھا۔ ”کون ہو تم لوگ؟ مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟“

کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سب ہی گونگے بہرے بن گئے تھے۔ وہ پجیرو ایک فورسیٹر طیارے کے پاس آکر رک گئی۔ ان نیگروز نے دروازہ کھول کر اسے باہر آنے کو کہا۔ وہ باہر آئی تو اسے بندوق کے اشارے سے جہاز پر سوار ہونے کو کہا گیا۔ کوئی اس سے نہ بول رہا تھا نہ اسے ہاتھ لگا رہا تھا۔ باس نے سختی سے تاکید کی تھی کہ کوئی اسے ہاتھ لگا کر میلا نہ کرے۔ پہلی بار وہی سرمایہ دار ڈی سوزا اسے چھونا چاہتا تھا۔

وہ طیارہ بلندی پر پرواز کرتا ہوا ایک گھنٹے بعد گوٹاما پہنچا۔ اس شہر کے مضافات میں ایک قلعہ نما وسیع وعریض عمارت تھی۔ اس کے احاطے میں دور تک باوردی سپاہی نظر آ رہے تھے۔ طیارہ ایک چھوٹے سے رن وے پر اتر گیا۔ ایک بہت مہنگی کار فورڈ فیاشا اسے لینے آئی تھی۔ وہ طیارے سے باہر آئی تو کئی باوردی ملازم اسے سیلیوٹ کرنے لگے۔ وہ کار میں آکر بیٹھ گئی۔ اس کا شاہانہ استقبال کیا جا رہا تھا۔

اس کا دل ڈوب رہا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ ایسے شاہانہ حسنِ سلوک کے نتیجے میں کوئی اس اچھوتے بدن کو ہاتھ لگائے گا جسے اب تک کسی نے چھوا نہیں ہے۔ اگر اسے کوئی غیبی طاقت مل جاتی تو وہ کسی کو ہرگز چھونے نہ دیتی۔ وہ کار کی پچھلی سیٹ پر نڈھال سی بیٹھی ہوئی تھی۔ کار اس قلعے کے احاطے کے اندر آکر ایک سمت جا رہی تھی۔ چاروں طرف بہت ہی خوبصورت باغ تھا۔ ہریالی کے ساتھ دور تک رنگ برنگے پھول کھلے ہوئے تھے اور دور تک مسلح سپاہیوں کی موجودگی کہہ رہی تھی کہ اس قلعے کے احاطے کے اندر نہ کوئی اجازت کے بغیر آسکتا ہے اور نہ باہر جا سکتا ہے۔

کار قلعے کے صدر دروازے کے سامنے آکر رک گئی۔ کئی کنیزیں زرق برق لباس میں اس کے استقبال کے لیے کھڑی تھیں۔ سب کالی کلوٹی تھیں۔ چمکتے دمکتے ملبوسات میں عجیب سی لگ رہی تھیں۔ ایک کلوٹی نے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا۔ وہ باہر آئی تو سب نے سینے پر ہاتھ باندھ کر سروں کو جھکا لیا۔ دو کنیزیں بڑے ادب سے اس کے دونوں ہاتھوں کو تھام کر قلعے کے اندر لے آئیں۔

وہ اندر آکر شاہی محل کی آرائش اور اس کا حسن کیا دیکھتی؟ اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ اسے ایک وسیع وعریض خواب گاہ میں پہنچایا گیا۔ کنیزوں نے اسے پھولوں بھری سیج کے سرے پر لا کر بٹھا دیا۔ تب اس دروازے پر ایک قد آور ضخیم کالا کلوٹا نیگرو نظر آیا۔ وہ ہیروں کی کان کا مالک راجر ڈی سوزا تھا۔ اپنی مطلوبہ حسینۂ عالم کو دیکھ کر خوشی سے بتیسی جھلک رہی تھی۔ کالے چہرے کے درمیان سفید چمکتے ہوئے دانت کہہ رہے تھے کہ ہم چبانے کو تیار ہیں۔ وہ اسے دیکھتے ہی رو پڑی۔ کنیزیں سر جھکا کر باہر چلی گئیں۔ آہ! اپنا بدن کسی نہ کسی کو دینا ہی پڑتا ہے لیکن حسین سوغات کو قبول کرنے والا کسی قابل تو ہو۔

وہ کہاں جاتی؟ بھاگنے کا راستہ نہیں تھا۔ وہ دروازے کو اندر سے بند کرنے کے بعد ہنستے ہوئے بولا۔ ”ہی ہی ہی۔ روتی ہوئی خوف زدہ عورتیں اچھی لگتی ہیں۔ بائی گاڈ...... شکار کو دوڑا دوڑا کر اس پر نہ جھپٹو تو شکار کھیلنے کا مزہ ہی نہیں آتا۔“

وہ قریب آکر اس پر جھک کر بولا۔ ”ماں قسم۔ ایسا مدہوش کرنے والا بدن پہلے کبھی نہیں دیکھا۔“

وہ ایک انگلی بڑھا کر بولا۔ ”پہلے ایک انگلی سے چھو کر دیکھتا ہوں کہ یہ تیرے رخساروں سے پھسلتی ہوئی نیچے کہاں تک جائے گی؟“

اس نے انگلی اور آگے بڑھائی۔ وہ سہم کر ذرا پیچھے ہوئی۔ انگلی سرخ وسفید رخسار کے بالکل قریب پہنچ کر رک گئی۔ وہ حیران ہونے لگا۔ انگلی خود نہیں رکی تھی۔ روک دی گئی تھی۔ اس نے اپنی کلائی کو چھو کر دیکھا تو معلوم نہ ہوسکا کہ کیسی گرفت میں ہے؟

اس نے زور لگا کر انگلی کو آگے بڑھانا چاہا اور اسے چھونا چاہا تو ہاتھ پھر اسی طرح رکا رہا۔ اسے شرمندگی ہو رہی تھی۔ وہ حسینۂ عالم کے سامنے انسلٹ محسوس کر رہا تھا۔

وہ بہت شہ زور تھا۔ اس نے ایک جھٹکا دیا تو کلائی نادیدہ گرفت سے آزاد ہوگئی۔ وہ شدید حیرانی سے اپنی کلائی کو سہلاتے ہوئے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ کوئی نہیں تھا اور کلائی کسی کے شکنجے میں آگئی تھی۔

جینی اسے دیکھ کر سوچ رہی تھی۔ ”یہ کالا بخار آتے

آتے کیوں رک گیا ہے؟ او گاڈ! یہ رکا رہے۔ میرے اور قریب نہ آئے۔ مجھے کبھی چھو نہ سکے۔'

وہ اپنے دونوں ہاتھ حملہ کرنے کے انداز میں ادھر ادھر گھما رہا تھا۔ اسے پورا یقین تھا کہ کسی نے اس کی کلائی کو جکڑ لیا ہے۔ یوں پینترے بدل بدل کر دونوں ہاتھ گھماتا رہے گا تو کوئی اس سے مار کھا جائے گا۔

لیکن اسے پکڑنے والا کہیں نہیں تھا۔ وہ ہاتھ گھما کر رہ گیا تھا۔ اس نے گھور کر جینی کو دیکھا پھر کہا۔ ''میرا سر پھر گیا تھا۔ پتا نہیں کیا ہوا تھا؟ میں نے تجھے چھونے کے لیے تیس لاکھ ڈالرز خرچ کیے ہیں۔''

وہ اپنی آستینیں چڑھاتے ہوئے بولا۔ ''کون سالا ہمارے بیچ میں آئے گا۔ میں بھی دیکھتا ہوں۔ یہ لے تجھے چھو رہا ہوں۔''

اس نے چیلنج کرتے ہوئے اسی انگلی کو اس کی طرف بڑھایا پھر اس کے حلق سے ایک کراہ نکلی۔ جینی سہم کر بستر کے سرے سے اتر کر دور ہو گئی۔ اس کی آدھی انگلی کٹ کر قالین پر گر پڑی تھی۔ باقی آدھی انگلی سے لہو ٹپک رہا تھا۔ وہ ایک ہاتھ سے زخمی ہاتھ کو پکڑ کر پیچھے ہٹ رہا تھا۔ پھر اس نے بری طرح سہم کر جینی سے پوچھا۔ ''تم کون ہو؟ خوبصورت بلا بن کر آئی ہو۔ میں سمجھ گیا ہوں۔ تم وچ لیڈی (جادوگرنی) ہو۔''

وہ کچھ بول نہیں پا رہی تھی۔ نگاہوں کے سامنے انگلی کے کٹنے کا منظر ایسا تھا کہ وہ خوف زدہ ہو گئی تھی اور دل کو سمجھا رہی تھی۔ ''مجھے ڈرنا نہیں چاہیے۔ دشمن کو سزا مل رہی ہے۔ یہ میرے کنوارے بدن کو چھونا چاہتا تھا۔ اس کی انگلی کٹ گئی ہے۔ میں اپنے گاڈ سے غیبی مدد مانگ رہی تھی۔ وہ مدد مجھے مل رہی ہے۔ میں نہیں ڈروں گی۔''

وہ دروازہ کھول کر چیخ رہا تھا۔ ''کم آن۔ میں زخمی ہو گیا ہوں۔ ڈاکٹر کو بلاؤ۔ یہ وچ لیڈی ہے۔ اسے گرفتار کرو۔''

پورے قلعے میں ہلچل مچ گئی۔ دوڑتے ہوئے فوجی بوٹوں کی آوازیں گونجنے لگیں۔ راجر ڈی سوزا نے کہا۔ ''اسے گن پوائنٹ پر رکھو۔ یہ وچ لیڈی کوئی جادو دکھائے تو اسے گولی مار دو۔ مگر نہیں، اسے زنجیروں میں جکڑ کر اس کے منہ پر اور آنکھوں پر پٹیاں باندھ دو۔ پھر وہ جادو نہیں کرسکے گی۔ اسے زندہ رکھو۔ میں اسے چھو کر، اسے پکڑ کر رہوں گا۔ اس کے بدن کی دھجیاں اڑا کر رہوں گا۔''

جینی خواب گاہ میں ایک جگہ کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے پھر تماشا دیکھا۔ مسلح سپاہی جیسے ہی دروازہ کھول کر اندر آئے، تڑ تڑ گولیاں چلنے کے ساتھ سپاہیوں کی چیخیں ابھرنے لگیں۔

کچھ گولیاں کھا کر گرے کچھ واپس بھاگ گئے۔

گولیاں کس نے چلائیں؟ کہاں سے چلائیں؟ کچھ نظر نہیں آیا۔ جینی نے دیکھا۔ دروازہ خود بخود بند ہو کر اندر سے لاک ہو گیا تھا۔ باہر سے کوئی اندر نہیں آسکتا تھا۔

وہ دونوں ہاتھ سینے پر رکھ کر عبرانی زبان میں دعائیں مانگ رہی تھی۔ اسے دھیمی سی سرگوشی سنائی دی۔ ''ہیلو!''

وہ چونک کر آواز کی سمت دیکھنے لگی۔ کوئی بالکل قریب ہی تھا اور پوچھ رہا تھا۔ ''کیا مجھ سے ڈر لگ رہا ہے؟''

وہ انکار میں جلدی جلدی سر ہلانے لگی۔ اسے آواز سنائی دی۔ ''شاباش، حوصلہ رکھو۔ میں ان سے نمٹنے جا رہا ہوں۔''

پھر خاموشی چھا گئی۔ یہ سمجھ میں آیا کہ وہ چلا گیا ہے۔ اس نے قالین پر گھٹنے ٹیک کر سر جھکا کر دونوں ہاتھ سینے پر باندھ لیے۔ ''او گاڈ! یو آر گریٹ مائی گاڈ! تو نے میری سلامتی کے لیے میری بہتری کے لیے ایک فرشتے کو بھیجا ہے...''

خواب گاہ کے باہر راجر ڈی سوزا نے حیرانی سے دیکھا کہ خواب گاہ کے اندر سے فائرنگ ہوئی تھی۔ تین سپاہی مارے گئے تھے۔ باقی واپس آکر بول رہے تھے کہ ہم کس پر گولیاں چلاتے؟ کوئی نظر نہیں آرہا تھا اور وہ دروازہ خود بخود بند ہو گیا تھا۔ وہاں بے شمار گن مین آگئے تھے۔ ایک ڈاکٹر اس کی آدھی انگلی کی مرہم پٹی کر رہا تھا۔ اس نے چیخ کر حکم دیا۔ ''دروازہ توڑ دو۔''

دو سپاہیوں نے دروازے کے لاک کو توڑنے کے لیے نشانہ لیا لیکن گولیاں چلانے سے پہلے خود ہی نشانہ بن گئے۔ سب ہی اپنی اپنی گن سنبھالتے ہوئے ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ گولیاں کہاں سے آکر لگی تھیں۔

راجر ڈی سوزا نے غصے سے کہا۔ ''سب مل کر بیک وقت فائر کرو۔ دروازے کو چھلنی کر کے گرا دو۔''

اس کی بات ختم ہوتے ہی تڑا تڑ گولیاں چلنے کی آوازوں کے ساتھ راجر ڈی سوزا کے چاروں طرف قالین کی دھجیاں اڑنے لگیں۔ وہ بوکھلا کر ناچنے کے انداز میں چاروں طرف گھومنے لگا۔ چیخ چیخ کر کہنے لگا۔ ''دروازہ نہ توڑو۔ گولیاں نہ چلاؤ۔ جاؤ، یہاں سے چلے جاؤ۔''

اس کے چاروں طرف فائرنگ رک گئی تھی۔ تمام مسلح سپاہی دوڑتے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ قلعہ نما محل اندر سے خالی ہو گیا۔ صرف وہ رہ گیا تھا۔

وہ دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر بولا۔ ''او مائی گاڈ! او مائی لارڈ! میں تیرے عذاب سے ڈر گیا ہوں۔ توبہ کرتا ہوں۔ کان پکڑتا ہوں۔''

وہ دونوں کانوں کو پکڑتے ہوئے بولا۔ ''میں جینی جوزف کو ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گا۔ اسے جہاں سے اغوا کرایا تھا' وہیں اسے پہنچادوں گا۔''

یہ تماشے کرنے والا ہم زاد تھا۔ وہ ماہ نور کو ہارنے کے بعد ایک حسین دلہن کی تلاش میں نکلا تھا۔ تلاشِ یار میں اس کا دل جینی کے پاس آ کر اٹک گیا تھا۔

اس نے جینی کے پاس آ کر کہا۔ ''راستہ صاف ہوگیا ہے۔ دروازہ کھولو۔ باہر راجر کھڑا ہوا ہے۔ اس سے بولو وہ تمہارے ساتھ چلتا ہوا طیارے میں بیٹھے گا اور تم جہاں چاہتی ہو' تمہیں وہاں پہنچائے گا۔ اس دوران تمہیں کوئی نقصان پہنچانا چاہے گا تو وہ اپنی طرف آنے والی اندھی گولیوں کا نشانہ بن جائے گا۔''

وہ دروازہ کھول کر باہر آئی۔ راجر نے اسے دیکھتے ہی دونوں گھٹنے زمین پر ٹیک دیے۔ اپنے کانوں کو پکڑتے ہوئے بولا۔ ''مجھے معاف کردو۔ تمہیں جہاں سے لایا گیا ہے' میرے آدمی تمہیں وہیں پہنچادیں گے۔''

وہ بولی۔ ''کوئی نہیں۔ صرف تو میرے ساتھ یہاں سے جائے گا۔ چل میرے آگے آگے چل۔''

وہ اس کے آگے آگے چلتا ہوا محل کے باہر آیا۔ پھر ڈرائیور سے بولا۔ ''ہمیں طیارے کے پاس لے چلو۔''

جینی نے سختی سے کہا۔ ''ڈرائیور نہیں۔ تو گاڑی چلائے گا۔ چل میرے لیے دروازہ کھول۔''

اس نے فوراً ہی آگے بڑھ کر ایک تابعدار کی طرح جھک کر پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا۔ وہ ایک ملکہ کی شان کے ساتھ چلتی ہوئی آ کر بیٹھ گئی۔ وہ دروازہ بند کر کے ڈرائیونگ سیٹ پر آگیا۔ کار کو اسٹارٹ کر کے آگے بڑھانے لگا۔

وہ خوشی سے پھولی نہیں سما رہی تھی۔ اس نے تنہا رہ کر اس طاقتور شخص کو شکست دی تھی جو ہیروں کی کان کا مالک تھا۔ جس کے وسیع و عریض قلعے کے اندر بے شمار مسلح سپاہی تھے۔ ان میں سے کئی سپاہی مارے گئے تھے۔

وہ تنہا بے یار و مددگار عورت کی طرح بڑی بے بسی سے اپنی آبرو لٹنے کا تماشا دیکھنے آئی تھی۔ اب کنوارے پن کی سلامتی کے ساتھ واپس جارہی تھی۔ اس نے ایسی فتح و کامرانی کا خواب بھی نہیں دیکھا تھا۔

جب وہ طیارے میں جا کر بیٹھی تو اچانک اس کے ساتھ والی سیٹ پر ایک بڑا سا بیگ آگیا۔ راجر اس سے دور ایک سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ جہاز فضا میں بلند ہو کر ایک مخصوص رفتار سے جارہا تھا۔ اس نے بیگ کی زپ کو ہٹا کر دیکھا تو

اندر بیرے جگمگا رہے تھے۔ ہم زاد انہیں محل کے سیف سے نکال کر لایا تھا۔

وہ خوشی سے جھوم گئی۔ اسے زیرلب پکارا۔ "میرے محسن! میرے محافظ! میری آبرو رکھنے والے! تم کہاں ہو؟"

اسے جواب نہیں ملا۔ اس نے دل میں سوچا کہ وہ راجر کی موجودگی میں نہیں بولے گا۔

وہ چپ ہوگئی۔ سوچنے لگی۔ یہ فرشتہ کون ہے؟ میری مدد کرنے اچانک کہاں سے آگیا ہے؟ او گاڈ! اگر یہ میرے ساتھ رہے۔ کبھی نہ جائے تو مجھ پر میلی نظر رکھنے والوں کو ننگی کا ناچ نچادوں گی۔ میں ابھی تک حیران ہو رہی ہوں کہ ایک فوج رکھنے والے ظالم عیاش نیگرو کو میں نے شکست دی ہے۔ میں اپنے محسن پر قربان ہو جاؤں۔ اس کے قدموں کی دھول بن جاؤں۔"

وہ جلد از جلد تنہائی چاہتی تھی۔ اس سے دل کھول کر باتیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ ایک گھنٹے بعد اشتہاری فلم شوٹ کرنے والوں کے درمیان آگئی۔ سب نے حیرانی سے پوچھا۔ "وہ کون لوگ تھے؟ تمہیں کہاں لے گئے تھے؟"

اس نے جواب دیا۔ "وہ جو بھی تھے، میں انہیں اچھا سبق سکھا کر آئی ہوں۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں بولوں گی۔ بہت تھک گئی ہوں۔ تنہائی چاہتی ہوں۔"

وہ بیگ اٹھا کر ہوٹل کے کمرے میں آگئی۔ دروازے کو اندر سے بند کر کے بولی۔ "تم تو بند کمرے میں بھی آجاتے ہو۔ پلیز آجاؤ، میں تم سے بہت سی باتیں کرنا چاہتی ہوں۔"

اسے جواب نہیں ملا۔ وہ موجود تھا۔ ایک صوفے پر بیٹھا ہوا اسے بڑی لگن سے دیکھ رہا تھا۔ وہ ایسی تھی کہ دیکھتے رہو پھر بھی دل نہیں بھرتا تھا۔ وہ جان بوجھ کر خاموش تھا۔ اس کی بے چینی دیکھ رہا تھا اور چاہتا تھا کہ جینی کے دل میں اور شدت سے اس کی طلب پیدا ہوتی رہے۔ وہ بند دروازے کو دیکھ کر بول رہی تھی۔ "شاید میں دروازہ بند کر کے غلطی کر رہی ہوں۔ اسے کھلا رکھنا چاہیے۔"

اس نے اٹھ کر دروازے کو کھول دیا۔ باہر دیکھتے ہوئے بولی۔ "آجاؤ۔ کچھ بولو۔ تمہاری آواز سننے کے لیے یہ دل پاگل ہو رہا ہے۔ پلیز آجاؤ۔"

وہ تھوڑی دیر تک انتظار کرتی رہی پھر اس نے مایوس ہو کر دروازے کو بند کر دیا۔ زیرلب بڑبڑائی۔ "کیا وہ جا چکا ہے؟ اب نہیں آئے گا؟ کیا وہ نیکی کا فرشتہ تھا؟ اس نے ایک مصیبت سے مجھے بچایا اور جب برا وقت گزر گیا ہے تو

نیکی کو دریا میں ڈال کر چلا گیا ہے۔ کیوں چلا گیا ہے؟ اوہ نو۔ نو مائی گاڈ! اسے نہیں جانا چاہیے۔ واپس آجانا چاہیے وہ نہیں آئے گا تو میرا سکون برباد ہو جائے گا۔"

ہم زاد نے دروازے کے پاس آکر دستک دی۔ اس نے ناگواری سے دروازے کو دیکھا۔ وہ کسی سے ملنا اور باتیں کرنا نہیں چاہتی تھی۔

اس نے دروازے کے باہر جا کر آواز دی۔ "میں ہوں۔ کیا اندر آسکتا ہوں؟"

وہ خوشی سے اچھل پڑی۔ تیزی سے چلتی ہوئی دروازہ کھولنے آئی تو پیچھے سے آواز سنائی دی۔ "میں اندر آگیا ہوں۔"

اس نے فوراً ہی پلٹ کر دیکھا۔ ہم زاد نے کہا۔ "افسوس مجھے کبھی دیکھ نہیں سکو گی۔"

"تم کون ہو؟ میں تمہیں کیوں نہیں دیکھ سکوں گی؟"

"میں کوئی جن بھوت نہیں ہوں۔ انسان ہوں لیکن اپنی پیدائش کے پہلے دن سے ہی نادیدہ ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ ایسا کیوں ہوں؟ یوں سمجھو کہ قدرت کا تماشا ہوں۔ یہ تماشا نظر نہیں آتا ہے۔ نظر نہ آکر بھی تماشے دکھاتا رہتا ہوں۔"

"تم اچانک میری مدد کرنے کیسے آگئے؟ کیا مجھے پہلے سے جانتے تھے؟"

"ہاں۔ تمہیں ایفل ٹاور کے گارڈن میں دیکھا تھا۔ تمہیں دیکھتے ہی یہ دل تمہیں چھونے کے لیے مچل گیا۔ میں جبراً تمہیں حاصل کرنا چاہتا تو تم مجبور ہو جاتیں لیکن میں نے کسی عورت پر کبھی جبر نہیں کیا اور نہ ہی کسی کو آج تک ہاتھ لگایا ہے۔ میں تمہارے کام آکر تمہارا دل جیتنا چاہتا تھا۔ مجھے جلد ہی یہ موقع مل گیا اور آج تمہارے کام آگیا۔ مجھے سچ بتاؤ، کیا میں تمہارا دل جیت رہا ہوں؟"

وہ اپنے دھڑکتے ہوئے دل پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ "تم نے مجھے سر سے پاؤں تک جیت لیا ہے۔ اب میں تمہارے بغیر نہیں رہوں گی۔ وعدہ کرو، مجھے کبھی چھوڑ کر نہیں جاؤ گے۔"

"یہ میں پہلے سے کہہ دوں کہ دن رات تمہارے ساتھ نہیں رہ سکوں گا لیکن آتا جاتا رہوں گا۔ تم جیسے ہی فون پر مس کال دوگی، میں تمہارے پاس آجاؤں گا۔"

"یہی بہت ہے کہ کال کرتے ہی تم آجاؤ گے۔"

"کیا میں تمہیں چھو سکتا ہوں؟"

وہ سر جھکا کر شرمانے لگی۔ وہ قریب ہو کر بولا۔ "میں نظر نہیں آرہا ہوں۔ تمہیں ہاتھ لگاؤں گا تو شاید تم ڈر جاؤ گی۔ پہلے تم مجھے چھو کر میرے وجود کا یقین کرو۔"

جینی نے جھجکتے ہوئے ایک ہاتھ بڑھایا تو وہ ہاتھ اس

کے سینے سے ٹکرا گیا۔ وہ دوسرا ہاتھ بھی وہاں لا کر چٹان کی طرح پھیلے ہوئے سینے کو محسوس کرنے لگی۔ یہ اندازہ ہوا کہ وہ اس سے بہت اونچا ہے۔ اس کے ہاتھ دو پتھر جیسے بازوؤں پر گئے۔ وہ قربت کا عجیب عالم تھا۔ سامنے وہ نظر نہیں آرہا تھا لیکن اس کا ٹھوس وجود تھا۔

پھر اس نے اپنے چہرے پر گرم سانسوں کی حرارتیں محسوس کیں۔ پھر معلوم ہوا کہ اس کے ہونٹ ایک رخسار کو چھو رہے ہیں اور وہاں سے پھسلتے ہوئے لبِ لعلیں پر آگئے ہیں۔

یہ عجیب طلسم تھا۔ کوئی اس سے اس کا بدن چرا رہا تھا۔ وہ بہت پہلے اعلان کر چکی تھی کہ کوئی اس کے بدن کو چھونے کبھی نہیں آئے گا اور یہی ہو رہا تھا۔ کوئی اسے ہاتھ لگانے نہیں آیا تھا۔ اگر سرِ محفل ایسا ہوتا تو سبھی کہتے کہ کوئی اسے نہیں چھو رہا ہے۔ یہ تو صرف وہی جان رہی تھی کہ وہ چھونے کی حد سے گزر رہا ہے۔

پھر یکایک اس کے قدم زمین سے اکھڑ گئے۔ وہ فضا میں معلق ہوگئی۔ اس نے دونوں بازوؤں میں اسے اٹھا لیا تھا۔ پیار کے ایسے مرحلے سے آج تک کوئی ایسے نہ گزری ہوگی۔ اس نے بیج پر اسے لا کر بڑے پیار سے بٹھا دیا۔

یہ گناہ ہے۔ دینی اور دنیاوی قوانین کے مطابق نکاح کے بغیر میرج سرٹیفکیٹ کے بغیر مرد اور عورت کو ایک دوسرے کے قریب نہیں آنا چاہیے۔

لیکن وہ ہم زاد صرف پازیٹو نہیں تھا، نیگیٹو بھی تھا۔ صرف نیک کام نہیں کرتا تھا۔ بدی بھی کماتا تھا۔ جینی کے حسن و شباب نے اسے ورغلایا تھا۔ جب ہوس غالب آئی تو اس نے گناہ کو جائز قرار دینے کے لیے اپنے آپ کو سمجھایا۔ "میں نے جینی سے نیکی کی ہے۔ دوسری نیکی یہ کی ہے کہ راجر جیسے ظالم ہوس پرست کے غرور کو اور اس کی فوجی قوت کو خاک میں ملایا ہے۔ لہٰذا انعام کے طور پر وہ جینی کا حق دار ہے۔ وہ کسی کو تو اپنا وجود دے گی پھر مجھے کیوں نہ دے؟"

اس کے اندر سوال پیدا ہوا کہ جینی کو انعام کے طور پر حاصل کرنے کے لیے اس سے نکاح کیوں نہیں پڑھا لے؟

اس نے یہ جواب دے کر ضمیر کو سمجھایا کہ وہ یہودی حسینہ ہے۔ کسی دن اپنی اصلیت دکھائے گی۔ اس سے باقاعدہ ازدواجی رشتہ قائم نہیں کرنا چاہیے۔

وہ جینی کے سامنے ہمیشہ نادیدہ بن کر رہنا چاہتا تھا۔ اگر اپنی صورت دکھاتا تو اس کے پیٹ میں بات نہ رہتی۔ وہ بڑے فخر سے دور تک یہ خبریں پھیلا دیتی کہ ریاست ارضِ اسلام کا حکمران مراد علی منگی اس کی زلفوں کا اسیر ہے اور وقتِ ضرورت نادیدہ ہو جایا کرتا ہے۔

پھر سپر پاور اور تمام بڑے ممالک کی سمجھ میں آجاتا کہ مراد تنہا ہو کر پوری فوج کو کس طرح مار بھگاتا ہے اور ان کے طیارے اور ہیلی کاپٹر کس طرح پرواز کے دوران میں تباہ ہو چکے ہیں۔ ایک یہودی حسینہ تمام رازوں کو طشت از بام کر دیتی۔ اس پہلو سے ہم زاد نے دانشمندی کا ثبوت دیا تھا۔

☆☆☆

محبوب نے فون کے ذریعے ماروی سے کہہ دیا تھا کہ وہ صبح نو بجے لندن ائرپورٹ کے پرائیویٹ رن وے کے شیڈ میں پہنچ جائے اور ریاست سے آنے والے طیارے میں بیٹھ جائے۔ دشمنوں سے سمجھوتا ہو چکا ہے۔ وہ کسی طرح کا اندیشہ نہ کرے۔ پھر یہ کہ مراد بڑی رازداری سے اس کا ہم سفر رہے گا۔

ریاست کے حکمران مراد علی منگی کا طیارہ صبح چھ بجے وہاں سے روانہ ہوا۔ طیارے میں 'پائلٹ' کو 'پائلٹ' اسٹیوارڈ اور دو گن مین تھے۔ مراد کسی کو نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ لوگ تین گھنٹے میں لندن پہنچے۔ ماروی رن وے کے شیڈ میں بیٹھی فون پر محبوب سے کہہ رہی تھی۔ "ابھی ایک طیارہ رن وے پر آکر رکا ہے۔ میرا دل گھبرا رہا ہے۔ میں کیا کروں؟"

محبوب نے کہا۔ "گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے، حوصلہ کرو۔ پرواز کے دوران فون کا رابطہ نہیں رہے گا۔ مراد تمہارا محافظ رہے گا۔"

اسی وقت مراد کی آواز سنائی دی۔ ماروی نے فوراً ہی سر کے آنچل کو گھونگھٹ بنا کر خود کو چھپا لیا۔ وہ بولا۔ "پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ طیارے میں جا کر بیٹھ جاؤ۔"

اسٹیوارڈ اور دو گن مینوں نے ماروی کا استقبال کیا۔ وہ سیڑھیاں چڑھ کر طیارے کے اندر چلی گئی۔ وہاں سے کچھ فاصلے پر اس ملک کی آرمی کے سپاہی اسلحے کے ساتھ کھڑے تھے۔ وہ ماروی اور طیارے کو سیکیورٹی دے رہے تھے۔

مراد نے چشم زدن میں کراچی پہنچ کر اپنے فون پر سپر پاور کے اعلیٰ حاکم سے کہا۔ "آپ کا شکریہ۔ ابھی ماروی نے فون پر بتایا ہے کہ آپ کی آرمی اسے سیکیورٹی دے رہی ہے اور میرا طیارہ وہاں سے فلائی کرنے والا ہے۔ میں بہت مصروف ہوں پھر کسی وقت رابطہ کروں گا۔"

وہ فون بند کر کے پھر ماروی کے پاس آگیا۔ اس طرح سپر پاور کے اعلیٰ حاکم کو کال کر کے فون کے کوڈ نمبر کے

ذریعے یہ ثابت کر دیا کہ وہ کراچی میں ہے۔
جس وقت وہ طیارہ کراچی جانے کے لیے پرواز کر رہا تھا، اس وقت سپر پاور اور اس کے اتحادی ممالک کے درمیان گرما گرم بحث جاری تھی۔ وہ کہہ رہے تھے کہ ایسا سنہری موقع پھر ہاتھ نہیں آئے گا۔ ماروی کو بخیریت کراچی جانے دیا جائے اور مراد پر کڑی نظر رکھی جائے۔ پوری طرح یہ یقین کیا جائے کہ مراد ہی اپنی نئی دلہن کے ساتھ اس طیارے میں اپنی ریاست کی طرف جا رہا ہے۔
جب یقین ہو جائے کہ وہ مراد ہی ہے تو پھر اس طیارے کو ریاست میں پہنچنے نہ دیا جائے لیکن سپر پاور کا اعلیٰ حاکم اور آرمی کے اعلیٰ افسران اتحادی ممالک کی مخالفت کر رہے تھے۔ وہ اپنے فیصلے پر ڈٹے ہوئے تھے۔ کہہ رہے تھے کہ سیاسی حکمتِ عملی سے کام لیا جائے۔ مراد کو اور اس کی وائف کو بخیریت ریاست پہنچا کر اس کا اعتماد حاصل کیا جائے۔ اس طرح ہم قابلِ اعتماد دوست بن کر دوسرے الفاظ میں میٹھی چھری بن کر اسے آہستہ آہستہ کاٹتے رہیں گے۔
لیکن اتحادی ممالک اتنا لمبا کھیل نہیں کھیلنا چاہتے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ جب وہ کسی شک و شبہے کے بغیر مراد ہی ہوگا تو اسے آج ہی گرفتار کر لیا جائے۔ اسے طیارے سے باہر نہ نکلنے دیا جائے۔ اچھی طرح زنجیروں میں جکڑنے کے بعد اسے ٹارچر سیل میں پہنچایا جائے۔ وہاں اس سے یہ راز اگلوایا جائے گا کہ وہ کس طرح تنہا پوری فوج کو مار بھگاتا ہے؟ اور کس طرح طیاروں اور ہیلی کاپٹروں کو پرواز کے دوران تباہ کر دیتا ہے؟
سپر پاور اپنے اتحادی ممالک کو ناراض کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ان کے دباؤ میں آ رہا تھا۔ ہوا کا رخ بدل رہا تھا۔ دشمن دوست بنتے بنتے پھر دشمنی کی طرف کروٹ لے رہے تھے۔ ماروی کراچی پہنچ گئی۔ وہ نمرہ کے بہروپ میں تھی۔ اس کا اپنا چہرہ لندن میں گم ہو گیا تھا۔ وہاں آخری دنوں میں وہ روپوش رہا کرتی تھی۔ اسے اپنے اصلی چہرے کی طرف لوٹ آنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ محبوب نے کہا تھا کہ کراچی میں پلاسٹک سرجری کے کسی ماہر سے اس کا پیدائشی چہرہ اسے واپس مل جائے گا۔ وہ معروف جگی کے ساتھ ائرپورٹ آیا تھا۔ اس نے معروف کو بتایا کہ یہی ماروی ہے۔ معروف نے اسے حیرانی سے دیکھا پھر اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے دعائیں دیں۔ پھر کہا۔ ”بیٹی! ہمارے درمیان اختلافات بھی رہے اور محبتیں بھی رہیں۔ اس تمام عرصے میں سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ محبوب اپنے کاروبار سے غافل رہا۔ اب اس کے کاروبار میں استحکام پیدا کرنے کی ذمے داری تمہاری ہے۔ تم یہاں مستقل محبوب کے ساتھ رہو گی تو یہ اپنے بزنس پر بھرپور توجہ دیتا رہے گا۔“
ماروی نے کہا۔ ”میں یہاں مستقل رہوں گی اور خود بزنس میں دلچسپی لیتی رہوں گی تو یہ بھی میرے ساتھ لگے رہیں گے۔“
سمیرا اس کے استقبال کے لیے نہیں آئی تھی۔ محبوب نے بھی مناسب نہیں سمجھا تھا کہ دو سوتنیں ایک دوسرے کا سامنا کریں۔ اس نے ماروی کے لیے دوسری کوٹھی کی... از سرِ نو آرائش کی تھی۔ وہ اسے وہاں لے گیا۔
مراد کا ذاتی طیارہ رن وے کے ایک حصے میں کھڑا تھا۔ ادھر اس کے دو گن مین پہرے دار کے طور پر تھے۔ کسی اعلیٰ افسر کو بھی اس طیارے کے قریب جانے کی اجازت نہیں تھی... یہ اندیشہ تھا کہ کوئی وہاں دھماکا خیز مواد رکھ سکتا ہے۔ مراد حفاظتی معاملات میں بہت محتاط تھا۔ وہ طیارے کی طرف سے پوری طرح مطمئن ہونے کے بعد محبوب کی کوٹھی میں آ گیا۔
ماہ نور اس کی منتظر تھی۔ اسے ریاست کی طرف سفر کرنا تھا۔ وہ تمام ضروری سامان پیک کر چکی تھی۔ ادھر ریاست میں پہلے ہی اعلان کرا دیا گیا تھا کہ ریاست کی نئی ملکہ بیگم ماہ نور مراد تشریف لانے والی ہیں۔ وہاں نئی ملکہ کے استقبال کی اور جشن منانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔
شام کو ماروی، محبوب اور معروف جگی انہیں الوداع کہنے کے لیے ائرپورٹ میں آئے۔ ماروی نے ماہ نور کو گلے لگا کر شادی خانہ آبادی کی مبارکباد دی۔ معروف نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعائیں دیں۔ محبوب نے دل کی گہرائیوں سے ان کے لیے نیک تمناؤں کا اظہار کیا پھر وہ دونوں اپنے ذاتی طیارے میں آ کر بیٹھ گئے۔
سپر پاور کے اعلیٰ حاکم نے اسے فون پر مخاطب کیا۔ ”لیو لانگ ہز ہائی نس مراد علی منگی! ہمیں پل پل کی خبر مل رہی ہے۔ ہماری آرمی آپ کو بھرپور سیکیورٹی دے رہی ہے۔ آپ نے لندن اور کراچی کے ائرپورٹ میں کسی طرح کی رکاوٹ کا سامنا نہیں کیا ہے اور کسی رکاوٹ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہم کسی بھی حال میں آپ کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچائیں گے۔“
مراد نے کہا۔ ”آپ کا بہت بہت شکریہ۔ آئندہ ہمارے درمیان بہت مضبوط سیاسی اور ثقافتی تعلقات قائم ہوں گے۔ جہاز پرواز کرنے والا ہے۔ میں فون بند کر رہا ہوں۔“

''مجھے امید ہے، یہ سفر خوشگوار ہوگا اور آپ نئی دلہن کے ساتھ بخیریت ریاست تک پہنچ سکیں گے۔''

رابطہ ختم ہوگیا۔ وہ جہاز رن وے پر دوڑتا ہوا فضا میں بلند ہوگیا۔ ایسے وقت سپر پاور اور اس کے اتحادی ممالک کے درمیان بڑی ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ یہ کشمکش تھی کہ مراد کو گھیر کر پابہ زنجیر کیا جائے یا نہیں؟

ان کے جاسوس پچھلے چوبیس گھنٹوں سے کراچی میں یہ دیکھتے آرہے تھے اور معلومات حاصل کرتے آرہے تھے کہ مراد اور محبوب دونوں، ہم شکل کراچی میں ہیں۔ انہوں نے مراد کو نئی دلہن کے ساتھ کوٹھی سے نکل کر ائرپورٹ آتے دیکھا تھا۔ ان کی آنکھوں کے سامنے معروف نے، محبوب اور ماروی نے انہیں الوداع کہا تھا اور تازہ ترین اطلاع کے مطابق مراد اپنی ریاست میں نہیں تھا۔ وہاں نئی دلہن کے ساتھ اس کے استقبال کی اور جشن منانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔

کسی بھی پہلو سے شبہے کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ ہر پہلو سے یقین ہوگیا تھا کہ مراد علی منگی ہی اپنے ذاتی طیارے میں ریاست کی طرف جا رہا ہے۔ وہ پہلی بار دشمنوں کے سامنے آنے کی غلطی کر چکا ہے۔

اس کی یہ غلطی ناقابلِ معافی ہوگئی۔ آرمی کے ایک ائربیس سے چار جنگی طیاروں نے پرواز کی۔ پھر ایک گھنٹے میں مراد کے ذاتی طیارے کے قریب پہنچ گئے۔ دو طیارے اس کے دائیں بائیں آگئے۔ ایک پیچھے تھا اور ایک بلندی پر مراد کے طیارے کے اوپر رہ کر پرواز کر رہا تھا۔

مراد نے کھڑکیوں سے دائیں بائیں طیاروں کو دیکھا۔ پائلٹ نے آواز دی۔ ''سر! کنٹرول ٹاور سے کہا جا رہا ہے کہ چار جنگی طیاروں نے ہمیں گھیر لیا ہے۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ ہمیں حراست میں لیا گیا ہے۔ وہ آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔''

مراد نے کہا۔ ''ان سے بولو میں ٹوائلٹ میں ہوں، چند منٹوں کے بعد ان سے بات کروں گا۔''

ماہ نور پریشان ہوگئی تھی۔ مراد نے اسے تھپک کر کہا۔ ''آرام سے بیٹھی رہو۔ کچھ نہیں ہوگا۔''

اس کے دونوں گن مین اور اسٹیوارڈ نے اپنی اپنی گنیں سنبھال لی تھیں۔ اس نے کہا۔ ''انہیں رکھ دو۔ یہ کسی کام نہیں آئیں گی۔ یاد رکھو، میں جب بھی حکم دوں ان کے سامنے ہتھیار پھینک دینا۔''

یہ کہہ کر وہ ٹوائلٹ میں گیا، پھر دروازے کو اندر سے بند کر کے ہم زاد کے پاس پہنچ گیا۔ ان لمحات میں وہ جینی سے باتیں کرتے ہوئے اسے آغوش میں لینے والا تھا۔ مراد کو دیکھتے ہی ہڑبڑا کر اس سے دور ہوگیا۔ جینی نے پوچھا۔ ''کیا ہوا؟''

وہ بولا۔ ''کچھ نہیں، مجھے فوراً جانا ہوگا۔ پھر کسی وقت آؤں گا۔''

یہ کہتے ہی وہ مراد کے ساتھ ریاست کے محل میں آگیا۔ مراد نے اس کے ایک بازو کو پکڑ کر جھنجوڑتے ہوئے کہا۔ ''یہ کیا ہو رہا تھا؟ کیا تم نے اس سے نکاح پڑھایا ہے؟''

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ''وہ...... وہ بات ذرا لمبی ہے۔ تم آرام سے بیٹھو۔ میں بتاتا ہوں۔''

''میرے پاس وقت نہیں ہے۔ فوراً آؤ اور دیکھو کہ میرے جہاز کو کس طرح گھیرا جا رہا ہے۔''

وہ دونوں جہاز کے ٹوائلٹ میں پہنچ گئے۔ مراد باہر آیا۔ اس کے ساتھ ہم زاد نادیدہ تھا۔ اس نے دونوں طرف کی کھڑکیوں سے جنگی طیاروں کو دیکھا۔ مراد پائلٹ کے پاس آکر ہیڈ فون کان سے لگا کر بولا۔ ''یہ کیا ہو رہا ہے؟ یہ کون ہیں جو مجھے گھیر رہے ہیں؟''

دوسری طرف سے کہا گیا۔ ''تمہارے کسی سوال کا جواب نہیں دیا جائے گا۔ ہم تمہارے پائلٹ کو حکم دے رہے ہیں۔ آگے ایک ویران علاقے میں ایک رن وے ہے۔ وہاں سے سگنل ملتے رہیں گے۔ اسی رن وے پر تمہارے جہاز کو اتارا جائے۔ انکار کی صورت میں وہ چاروں جہاز تمہارے طیارے کو تباہ کر دیں گے۔ اپنی خیر مناؤ تم نے بلندی بہت دیکھ لی، اب کوئی مسئلہ پیدا کیے بغیر زمین کی پستی میں اتر آؤ۔''

مراد نے کہا۔ ''میں کوئی مسئلہ پیدا نہیں کروں گا۔ میرے طیارے کو تمہارے مطلوبہ رن وے پر اتارا جائے گا۔''

پھر وہ ماہ نور سے اور دوسرے تمام لوگوں سے دور پچھلی ایک سیٹ پر آکر بیٹھ گیا۔ ہم زاد اپنا کان اس کے قریب لے آیا۔ وہ بہت دھیمی سرگوشی میں بولنے لگا۔ جو اسے دیکھ رہے تھے، وہ سمجھ رہے تھے کہ ایسے وقت وہ دھیمی آواز میں کچھ پڑھ رہا ہے، اپنے رب سے مدد مانگ رہا ہے۔

ہم زاد نے تمام ہدایات سننے کے بعد اپنا منہ مراد کے کان کے پاس لا کر کہا۔ ''میں یہی کروں گا، جا رہا ہوں۔''

وہ اپنا فون مراد کو دے کر مراد کا فون لے کر وہاں سے چلا گیا۔ مراد ماہ نور کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ اس کا ہاتھ

تھام کر بولا۔ ”تم نے کبھی ایسے حالات کا سامنا نہیں کیا ہے۔ اللہ پر بھروسا کرو۔ تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔“

وہ بولی۔ ”مجھے اپنی ذرا بھی فکر نہیں ہے۔ آپ کے لیے پریشان ہو رہی ہوں۔ آپ اکیلے دشمنوں سے کیسے نمٹ سکیں گے جبکہ ہم زمین پر نہیں ہیں؟“

”میری فکر نہ کرو۔ تم ابھی دیکھوگی، میں ان سے نمٹ لوں گا۔ انشاء اللہ ہم جلد ہی اپنی ریاست میں پہنچیں گے۔“

اسٹیوارڈ نے کہا۔ ”سر! ہم لینڈ کر رہے ہیں۔ سیٹ بیلٹ باندھ لیں۔“

وہ ماہ نور کی سیٹ بیلٹ باندھ کر پائلٹ کے پاس آگیا۔ وہاں سے اس نے دیکھا۔ طیارہ ایک رن وے پر اتر رہا تھا۔ وہاں بڑی بڑی سولر لائٹس کے ذریعے رات روشن ہوگئی تھی۔ جہاں طیارہ آکر رکا، وہاں رن وے کے آس پاس سیکڑوں کی تعداد میں مسلح سپاہی موجود تھے۔ کچھ فاصلے پر ایک وسیع و عریض عمارت بھی نظر آرہی تھی۔ اس ویرانے میں وہی ایک عمارت تھی اور وہی عمارت کنٹرول ٹاور تھی۔ وہاں سے کہا گیا۔ ”ہم مراد سے بات کرنا چاہتے ہیں۔“

اس نے ہیڈفون کان سے لگا کر کہا۔ ”ہاں بولو۔“

کنٹرول ٹاور سے پوچھا گیا۔ ”تم نے اپنے فون کا سوئچ آف کیا ہے۔ اسے آن کرو۔ سپر پاور کے کمانڈر ان چیف بات کریں گے۔“

مراد نے کہا۔ ”سی ان سی سے بولو، ابھی تھوڑی دیر میں انجانے نمبر کی کال آنے والی ہے۔ اسے ریسیو کریں۔ مجھ سے باتیں ہوسکیں گی۔“

اس نے دو منٹ کے بعد ہمزاد کے فون سے اسے کال کیا۔ سی ان سی کی آواز سنائی دی۔ ”تم کون ہو؟“

”میں وہ مراد ہوں جسے تم نے طیارے سمیت اپنے شکنجے میں لے لیا ہے اور جس مراد سے تم فون پر باتیں کرتے رہے ہو، وہ کراچی میں تھا۔ اس نے آخری بار تم سے باتیں کرکے اپنے فون کا سوئچ آف کردیا ہے۔ اس نے ایسا کیوں کیا ہے؟ یہ تمہیں پانچ گھنٹے بعد معلوم ہوگا۔ بہرحال تم نے دوستی کا فریب دے کر اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری تمہیں چھ گھنٹے کے اندر یقین ہوجائے گا کہ میں مراد کی ڈمی ہوں میرے ساتھ جو عورت ہے وہ بھی ملکہ ماہ نور کی ڈمی ہے۔ مراد کے لیے چھ گھنٹے اس لیے ضروری ہیں کہ وہ حملے کی تیاریاں کررہا ہے۔ چھ گھنٹے بعد سپر پاور اور اس کے اتحادی ممالک کے فوجی اڈوں پر قیامت آنے والی ہے۔“

”یو شٹ اپ۔ تم بکواس کررہے ہو۔ تم نے فون کی سم بدل دی ہے۔ دوسری سم سے مراد کی ڈمی بن کر بول رہے ہو۔“

”ذرا عقل سے سوچو۔ میں سم بدل کر ڈمی مراد بن کر کب تک دھوکا دے سکوں گا؟ چھ گھنٹے... صرف چھ گھنٹے میں تم سب کے ہوش اڑ جائیں گے۔ حقیقت معلوم ہوجائے گی کہ میں مراد نہیں ہوں اور یاد رکھو، اس جہاز کے کسی ایک فرد کے جسم پر ہلکی سی خراش بھی آئے گی یا ہمارے ساتھ بدسلوکی کی جائے گی تو تمہارے اور اتحادیوں کے تمام ملکوں میں قیامت سے پہلے قیامت آجائے گی۔“

اس وقت تمام ممالک اسکائپ کے ذریعے ایک دوسرے سے رابطے میں تھے۔ مراد کی یہ باتیں ان تک پہنچ رہی تھیں اور انہیں تشویش میں مبتلا کررہی تھیں۔ وہ الجھ گئے تھے۔ سمجھنے کی کوشش کررہے تھے کیا وہ دھوکا کھا گئے ہیں؟ ایک ڈمی مراد کو گرفتار کررہے ہیں؟

انہوں نے فوراً ہی فیصلہ کیا کہ جو مراد گرفت میں آگیا ہے اسے چھ گھنٹوں تک حراست میں رکھ کر انتظار کیا جائے اور اپنے اپنے ملک کے فوجی اڈوں کی نگرانی سخت کردی جائے اور اگر اصل مراد حراست میں نہیں آیا ہے تو معلوم کیا جائے کہ وہ کہاں ہے اور کیا کررہا ہے؟

اس نے اب سے پہلے آرمی کے سیکڑوں سپاہیوں کو ہلاک کرکے طیاروں اور ہیلی کاپٹروں کو تباہ کرکے یہ دہشت پیدا کردی تھی کہ وہ آئندہ بھی بہت کچھ کرسکتا ہے۔ انہوں نے پھر جہاز میں مراد سے رابطہ کیا۔ اس سے کہا۔ ”کسی بھی طرح مراد سے ہماری بات کراؤ۔“

اس نے جواب دیا۔ ”کسی بھی طرح رابطہ نہیں ہوسکے گا۔ وہ اپنی حکمتِ عملی کو سمجھتا ہے۔ وہ ہم سے بھی نہیں بول رہا ہے۔ چھ گھنٹے تک انتظار کرنا ہی ہوگا۔“

فون پر کہا گیا کہ جہاز کے دروازے پر سیڑھیاں لگائی جارہی ہیں۔ وہ سب ہتھیار پھینک کر باہر آجائیں۔

مراد نے کہا۔ ”اس طیارے کا دروازہ نہیں کھلے گا۔ ہم باہر نہیں آئیں گے۔ اگر جلد بازی کروگے، چھ گھنٹے تک انتظار نہیں کروگے تو بہت پچھتاؤ گے۔“

وہ جبر نہیں کرسکتے تھے۔ انہیں انتظار کرنا تھا۔ دو گھنٹے گزر چکے تھے اور چار گھنٹے رہ گئے تھے۔

حیرت انگیز واقعات، سحر انگیز لمحات اور سنسنی خیز گردشِ ایام کی دلچسپ داستان کا مزید احوال اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

بے رنگ

مقبول حسین

جب کوئی بچہ چھوٹی چھوٹی شرارتوں سے اپنی ذہانت کو ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے تو بڑوں کی آنکھیں اس ذہانت میں کہیں چھپی کسی کمی کو دیکھ کر مسکرا اٹھتی ہیں لیکن ... یہی کھیل جب کوئی مجرم کھیلتا ہے تو قانون اس کی تمام چالیں الٹی کردیتا ہے کیونکہ جو کمی بچہ معصومیت میں چھوڑتا ہے ویسا ہی کوئی سقم مجرم اپنی چالاکی، ہوشیاری کے باوجود سمجھ نہیں پاتا... اور پھر یہی چوک آہستہ آہستہ اس کے گلے کا پھندا بن جاتی ہے۔ اس بے رنگ منظر میں بھی جب وقت نے دھیرے دھیرے رنگ بھرے تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہوگیا۔

عداوتوں کی زنجیر میں لپٹا مغربی دنیا کا تحفہ

ظاہر ہے پیر کی رات کو میں اس کے لیے کمرا چھوڑ دینے کی تجویز خوشی سے تو قبول نہیں کرسکتا تھا کیونکہ منگل کی رات کو میں ہر ہفتے کالج جاتا ہوں اور اسی لیے میں پیر کی رات کو پڑھتا ہوں اور یہ بات وہ بھی اچھی طرح جانتا تھا کیونکہ ہم کافی عرصے سے ایک دوسرے کے ساتھ رہ رہے تھے۔

لیکن اس نے پھر بھی کہا۔ ''یار! آج دفتر میں اس کا فون آیا تھا۔ کہہ رہی تھی بہت ضروری بات کرنا ہے اور آج

ہی رات کرنا ہے۔ تمہیں تو پتا ہے، میں اس کے گھر نہیں جاسکتا۔ اس کے گھر والے مجھے پسند کہاں کرتے ہیں۔ لہٰذا اب یہی کمرا رہ جاتا ہے۔ اسے میں نے یہیں بلالیا ہے۔ صرف ایک بار ریڈ! صرف ایک بار مجھے اجازت دے دو۔ آئندہ میں تم سے اس قسم کی درخواست نہیں کروں گا۔''

میں نے سوچا، انکار کردوں مگر اس کے بعد پھر اس سے تعلقات خراب ہوجاتے اور بہرحال اسے اس کمرے پر آدھا حق تو حاصل تھا۔ ایک بات اور تھی۔ اس رات بارش بھی ہورہی تھی۔ میں نے سوچا کہ لائبریری میں پڑھنے کا خیال بھی چھوڑ دوں۔ اگلے دن کلاس شروع ہونے سے پہلے کالج میں پڑھ لوں گا۔ آج رات ادھر ادھر گھوم پھر کر گزار دیتا ہوں۔

''ٹھیک ہے۔'' میں نے اس سے کہا۔ ''تو کرفیو کب نافذ ہوجائے گا؟''

''تم غلط سمجھ رہے ہو۔'' اس نے احتجاج کیا۔ ''وہ صرف بات کرنے آرہی ہے ہماری کوئی ڈیٹ نہیں ہے۔ آج اس نے کہا تھا کہ آج کی باتوں پر ہم دونوں کے مستقبل کا دارومدار ہے۔ وہ تنہائی میں بات کرنا چاہتی ہے اور بس۔ اگر تم بھی یہاں موجود رہے تو نہ تم پڑھ سکو گے، نہ ہم بات کرسکیں گے۔ تم اس کے آنے کے بعد چلے جانا۔ میں نے تمہیں پہلے اس لیے بتا دیا ہے کہ اس کے آنے کے بعد کوئی مسئلہ نہ کھڑا ہو۔ وہ ساڑھے آٹھ بجے تک آجائے گی۔''

''ساڑھے آٹھ تو بجنے والے ہیں۔'' میں نے کوٹ اور ہیٹ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''شاید مجھے کسی فلم کا ٹکٹ ہی مل جائے۔'' میں نے نیم دلی سے کہا۔

وہ میرے ساتھ دروازے تک آیا۔ ''تم خیال نہ کرنا ریڈ!''

اب خیال کرنے سے ہوتا بھی کیا۔ کیوں نہ میں خوش دلی سے اس پر احسان ہی دھر دوں...... ''چھوڑو بھی یار!'' میں نے آنکھ مار کر کہا اور نکل آیا۔

وہ مجھے سیڑھیوں پر ملی۔ میں نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا مگر اتنا ذکر سنا تھا کہ میں فوراً سمجھ گیا کہ یہ وہی ہے۔ وہ سبز رنگ کی برساتی پہنے ہوئے تھی۔ میں نے ایک نظر میں ہی اندازہ کرلیا کہ وہ ایک اچھی لڑکی ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک بیگ بھی تھا۔ وہ بھی مجھے دیکھ کر سمجھ گئی تھی کہ میں کون ہوں۔ وہ اخلاقاً مسکرائی اور بولی۔ ''اس نے میری وجہ سے آپ کو آرام کیا ہوگا!''

میں نے بھی اخلاقاً کہا۔ ''نہیں نہیں...... میں تو یوں بھی باہر جانے والا تھا۔''

پھر ہم شب بخیر کہہ کر اپنے اپنے راستے پر ہولیے۔ میں نے دروازہ کھلنے کی آواز سنی۔ اس نے یقیناً کھڑکی سے دیکھ لیا ہوگا کہ وہ آرہی ہے کیونکہ لڑکی نے دستک تو نہیں دی تھی۔

''ہیلو، اسٹیل!'' وہ بولا۔ اس کی آواز کچھ پریشان سی تھی۔

اگلے چند گھنٹوں کے دوران مجھے ان دونوں کا کئی بار خیال آیا مگر محض اس لیے کہ ان کی وجہ سے مجھے بے آرامی ہورہی تھی۔ اکیلے پینے کی بھی عادت نہیں ہے لہٰذا کسی بار میں بھی نہیں جاسکتا تھا۔ آخر کار میں نے فیصلہ کیا کہ کسی کافی ہاؤس میں بیٹھ جاؤں۔

☆☆☆

ساڑھے گیارہ بج گئے تو میں نے سوچا کہ گھر چلنا چاہیے۔ آخر وہ لوگ تین گھنٹے کی تنہائی میں بات کرچکے ہوں گے۔ اب میں مزید رعایت کے موڈ میں نہیں تھا۔ وہ لڑکی اگر اب بھی وہاں ہوئی تو اب اسے جانا ہی ہوگا تاکہ میں گیلے جوتے اتار سکوں۔

سڑک پار کرنے سے پہلے میں نے دوسرے موڑ سے جھانک کر کھڑکیوں کی طرف دیکھا۔ وہاں روشنی ہورہی تھی۔ مجھے اپنے ساتھی کا سایہ بھی لہراتا ہوا نظر آیا۔ لڑکی کا کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔

''میں تو آرہا ہوں۔ تم جانے کے لیے تیار ہو یا نہیں، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' میں نے خود سے کہا۔ میرے جوتوں میں اتنا پانی بھر چکا تھا کہ ان سے چوں چرر...... چرر چوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ میں نے سڑک پار کی اور سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ میں نے ہیٹ اتار کر ہاتھ میں لے لیا تھا تاکہ اس پر پڑی بوندیں جھٹک جائیں۔

میں نے دروازے پر کھڑے ہو کر چند سیکنڈ سننے کی کوشش کی۔ میرے ساتھی کے چلنے پھرنے کی آوازیں آرہی تھیں مگر بولنے کی کوئی آواز نہیں تھی۔ شاید وہ چلی گئی تھی، وہ بھی کچھ جلدی میں معلوم ہوتا تھا۔ میں نے ان چند سیکنڈ میں ہی اسے تین بار کمرے میں ادھر سے ادھر چلتے ہوئے سنا۔ یقیناً وہ ٹہل رہا تھا۔ میں نے دستک دی۔ کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ وہ دروازے تک نہیں آیا۔ میں نے دوبارہ دستک دی۔ اس نے دروازہ کھول کر مجھے دیکھا۔ اس کی آنکھیں سکڑی ہوئی تھیں۔ مجھے دیکھ کر اس

کے چہرے کی تنی ہوئی جلد ڈھیلی پڑ گئی۔ دروازہ بھی پورا کھل گیا مگر میں نے اس کی ہچکچاہٹ کو محسوس کر لیا تھا۔

''تمہاری چابی کہاں گئی جو تم نے دستک دی؟'' اس نے تیز لہجے میں پوچھا۔

''تم اتنے نروس کیوں ہو؟'' میں نے جواباً سوال کر دیا۔ ''چابی تو ہے مگر جب تم اندر موجود تھے تو مجھے گیلی جیبوں میں تلاش کرنے کی کیا ضرورت تھی؟''

میں اندر آ گیا اور چاروں طرف نظر دوڑائی......

''تمہاری گرل فرینڈ گئی؟''

''ہاں۔ تمہارے آنے سے ذرا پہلے......''

''تم بھی عجیب آدمی ہو۔ تم نے اتنی رات میں اسے اکیلے جانے دیا؟''

''میں نے اسے ٹیکسی میں سوار کرا دیا تھا......'' یہ کہہ کر وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

اس نے حماقت یہ کی کہ ٹانگیں پھیلا کر ایک دوسرے پر رکھ لیں۔ اس سے اس کے جوتوں کے تلے صاف نظر آنے لگے۔ وہ خشک اور صاف تھے۔ بھلا کوئی شخص اپنی محبوبہ کو ٹیکسی دلانے جائے اور اس کے جوتے تک گیلے نہ ہوں۔

وہ جھوٹ بول رہا تھا۔ اسے یقیناً شرم آئی ہو گی کہ میں اسے کتنا سنگ دل سمجھوں گا...... خیر میں نے نظر انداز کرتے ہوئے موزے نچوڑے مگر وہ کچھ اتنا مگن تھا کہ اسے دھیان ہی نہیں رہا۔

پتا نہیں وہ کیا سوچ رہا تھا۔ ورنہ وہ جب بھی اپنی محبوبہ سے مل کر آتا تو گھنٹوں مجھے اس کی باتیں سننا پڑتیں کہ وہ اتنی خوبصورت ہے۔ آج اس نے یہ کہا، وہ کہا یا پھر اس کی ماں کی شکایتیں کہ وہ انہیں علیحدہ کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ مگر آج تو اس کے چہرے پر کسی اندرونی جذبے کا نقاب پڑا ہوا تھا۔ میں کوئی ماہر نفسیات یا قیافہ شناس تو تھا نہیں جو اسے سمجھ سکتا۔

وہ اسی طرح کرسی پر بیٹھا رہا...... میں نے کپڑے بدلے اور خواب گاہ میں جاتے ہوئے بولا...... ''کیا بات ہے یار؟ کیا لڑائی ہو گئی ہے؟''

اس نے مجھے کوئی جواب نہیں دیا۔ خیر مجھے اس سے بھی سروکار نہیں تھا۔ وہ اچانک اٹھا اور تیزی سے اس ایک کپ بورڈ کی طرف بڑھا جہاں ہم ایک بوتل کو محفوظ رکھا کرتے تھے۔ اس نے بوتل نکال کر اوپر کی۔ ''خالی ہے۔''

اس نے مایوسی سے ہاتھ لٹکا لیا۔

''میں ابھی ایک پیگ پی کر آتا ہوں!'' وہ بولا۔

''آخر اتنی رات گئے ایک پیگ کی کیا ضرورت ہے؟''

ہم لوگ زیادہ پینے کے عادی نہیں تھے۔ صرف سنیچر کی رات کو پی لیتے تھے۔ اتنی رات کو ایک پیگ کے لیے باہر نکلنے کی بات بالکل نئی تھی۔ اس نے مجھ سے ساتھ چلنے کے لیے بھی نہیں کہا۔ شاید اس لیے کہ میں نے کپڑے بدل لیے تھے۔ وہ کہتا تو میں ساتھ نہ جاتا۔

''میں تو سونے جا رہا ہوں......'' میں نے ہدایت کی۔

''تم اپنی چابی ساتھ لے جاؤ......''

''میں ابھی آیا۔ مجھے بھی فوراً سونا ہے۔''

وہ دروازہ بند کر کے چلا گیا اور میں سر جھٹک کر کمرے میں داخل ہو گیا۔ مگر پھر خیال آیا تو ننگے پیر روشنی بجھانے واپس پلٹا۔ وہ اسے بند کرنا بھول گیا تھا۔

کوئی چیز میرے پیر میں چبھی اور میں نے اسے اٹھا کر دیکھا۔ یہ ایک کلپ تھا جس میں سبز رنگ کی برساتی کا ننھا سا ٹکڑا پھنسا ہوا تھا۔ میرے دوست کی محبوبہ کا کلپ گر گیا تھا مگر ایسا لگتا تھا جیسے وہ خود نہیں گرا تھا بلکہ اسے کھینچا گیا تھا۔ شاید وہ کسی چیز میں اٹک گیا ہو۔ میں سوچنے لگا۔ وہ اسے نکال کر ساتھ کیوں نہ لے گئی۔ میں نے اسے احتیاط سے ایک جگہ رکھ دیا اور بستر پر لیٹ گیا۔

مجھے لیٹنے کے بعد تین کروٹیں بدلنا پڑتی ہیں۔ ہر کروٹ کے درمیان پانچ منٹ کا وقفہ ہوتا ہے تب کہیں جا کر نیند آتی ہے اور پھر میں اپنے باپ کے لیے بھی اٹھنے کو تیار نہیں ہوتا۔

میری آنکھیں بند ہونے کو تھیں کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے سختی سے آنکھیں موند لیں کہ میری نیند خراب نہ ہو۔ مجھے یقین تھا کہ وہ کوئی رانگ نمبر ہو گا۔ اتنی رات گئے کسی کو ہمیں فون کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ گھنٹی بجتی رہی۔ آخر کار مجھے اٹھنا ہی پڑا۔ میں نے اٹھ کر گاؤن پہنا اور کوستا ہوا ٹیلی فون کی طرف بڑھا۔ میں نے روشنی جلانے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ دوسری طرف سے ایک عورت بول رہی تھی۔ اس کی آواز میں بیک وقت غصے اور خوف کی آمیزش تھی۔

''ذرا میری بیٹی کو بلا دو......'' اس نے کسی القاب و آداب کا تکلف کیے بغیر کہا۔ ''وہ کہہ کر گئی تھی کہ آج آخری بار تم سے فیصلہ کن بات کر کے آئے گی اور فوراً واپس آ جائے گی۔ اس شرط پر میں نے اسے تم سے ملنے کی اجازت دی تھی۔ اور اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ ساری رات روک کر تم اسے قائل کر لو گے تو......'' پھر جیسے اسے کچھ خیال آیا اور وہ بولی۔

''تم مسٹر ڈکسن بول رہے ہو نا؟'' اس نے یہ نام بھی بڑی نفرت سے لیا تھا۔
''جی نہیں! میں اسٹورٹ کار بول رہا ہوں۔ اس کا روم میٹ...... اور وہ ابھی آنے ہی والا ہے۔''
وہ سرد مہری اور نفرت فوراً خاتون کے لہجے سے غائب ہو گئی۔ صرف خوف باقی رہا۔ ''اوہ! آئی ایم سوری...... تو پھر شاید وہ جا چکی ہے اگر وہ شریف آدمی ہوتا تو اسے اس وقت تک نہ روکے رکھتا بلکہ اس سے بہت پہلے گھر پہنچوا دیتا۔ مجھے پریشان ہو کر فون نہ کرنا پڑتا۔''
میں نے خاتون کو تسلی دینے کی کوشش کی۔ ''وہ تو پون گھنٹا ہوا چلی گئی تھی۔ اب وہاں پہنچنے ہی والی ہو گی۔''
مجھے گھر آئے بہت دیر ہو چکی تھی اور ڈکسن نے کہا تھا کہ وہ میرے آنے سے ذرا پہلے گئی تھی۔ میں نے شاید غلط بات کہہ دی تھی کیونکہ وہ اور خوفزدہ ہو گئی تھی۔ ''پون گھنٹا پہلے......؟ تو وہ اب تک آئی کیوں نہیں؟ وہاں سے یہاں تک صرف چھ بلاک کا فاصلہ ہے۔ اتنی دیر تو نہیں لگتی!''
اور میرا دوست کہہ رہا تھا کہ وہ اسے ٹیکسی میں بٹھا کر آیا ہے۔
''وہ کمبخت اسے اس بھیگی رات میں سڑکوں پر ٹہلا رہا ہوگا!'' لہجہ اور تلخ ہو گیا تھا۔ وہ شاید سوچ رہی تھی کہ ڈکسن اسے پیدل گھر کی طرف لا رہا ہوگا۔ میں نے سوچا کہ اسے یہ بتانا جلتی پر تیل چھڑکنا ہوگا کہ ڈکسن نے اسے اکیلے ٹیکسی میں بٹھا دیا تھا۔
''وہ اب آتی ہی ہو گی......'' میں نے پھر اسے اطمینان دلانا چاہا۔
''خدا کرے جلد آ جائے......'' وہ دھیمے سے بولی اور پھر فوراً ہی اس کی آواز بلند ہو گئی...... ''اگر وہ چند منٹ کے اندر اندر یہاں نہ پہنچی تو میں......'' اس نے جملہ ختم کیے بغیر ریسیور رکھ دیا۔
میں نے بھی ریسیور رکھ کر دروازے کی طرف دیکھا۔ مجھے سونا تھا کیونکہ صبح جلدی اٹھنا تھا۔ میں فوراً بستر میں گھس گیا اور پھر جلد ہی سو گیا۔
اچانک پھر میری آنکھ کھل گئی۔ گھنٹی پھر بج رہی تھی۔ میں غنودگی کے عالم میں ہی اٹھ کر فون کی طرف بڑھا۔ اسی عورت کی آواز سن کر میری نیند فوراً غائب ہو گئی۔ اس بار اس کی آواز میں خوف ہی خوف تھا۔ ''میں جان ڈکسن سے بات کرنا چاہتی ہوں۔ میری بیٹی کہاں ہے؟''
''کیا وہ اب تک نہیں پہنچی؟'' میں نے حیرت سے کہا۔
میری حیرت کا اس نے کوئی نوٹس نہیں لیا...... ''اس کمبخت نے میری بیٹی کے ساتھ کیا کیا ہے؟ وہ اب تک کیوں نہیں آئی ہے؟'' میری ایسٹیل اتنی رات گئے اپنی مرضی سے گھر سے باہر نہیں رہ سکتی۔ اب میں مزید انتظار نہیں کر سکتی۔ تین دفعہ تو بارش میں باہر کونے تک جا کر دیکھ آئی ہوں...... اس وقت کیا بجا ہے؟''
مجھے بھی وقت کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ میں سمجھا تھا، مجھے سوئے ہوئے شاید بیس پچیس منٹ ہوئے ہوں گے۔
''ایک منٹ ٹھہریے!'' میں نے یہ کہہ کر لائٹ جلائی اور گھڑی پر نگاہ ڈالی' اف خدایا! پونے تین بج رہے تھے۔ ڈکسن کو گئے بھی تین گھنٹے ہو چکے تھے۔ وہ ساڑھے تین گھنٹوں میں چھ بلاک کا فاصلہ طے نہیں کر سکی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کیا کہوں؟
''وہ...... وہ بھی باہر چلا گیا تھا کہ ابھی آتا ہوں...... وہ بھی...... نہیں پلٹا......'' میں نے ہکلاتے ہوئے کہا۔
مگر اسے یقین نہیں آیا...... ''وہ خود مجھ سے فون پر بات کیوں نہیں کرتا......؟ وہ کب تک مجھ سے بچ سکے گا؟''
خاتون کا لہجہ کنٹرول سے باہر ہو گیا تھا...... ''مجھے اپنی لڑکی واپس چاہیے۔ میں اب پولیس کو رپورٹ کرنے جا رہی ہوں...... پولیس ہی بتائے گی کہ وہ گھر کیوں نہیں پہنچی؟'' یہ کہہ کر اس نے فون پٹخ دیا۔
چند سیکنڈ بعد ہی تالے میں چابی گھومنے کی آواز آئی اور وہ اندر آیا۔
''تم کہاں تھے......؟ تم تو صرف ایک پیگ پینے گئے تھے اور آدھی رات کر دی۔ یہاں بلاوجہ میری نیند غارت ہو رہی ہے۔''
اس کے چہرے پر جیسے ایک سایہ سا لہرا گیا......
''کیا ہوا؟''
''ہونا کیا ہے؟ اپنی خیر مناؤ۔ تمہاری محبوبہ ابھی تک گھر نہیں پہنچی ہے۔ اس کی ماں دو بار فون کر چکی ہے اور اب وہ پولیس میں رپورٹ درج کرانے گئی ہے۔ اب تم جلدی سے اس کا پتا لگاؤ ورنہ۔''
وہ چپ کھڑا تھا...... میں بھی چپ ہو گیا۔ پھر میں نے کہا۔ ''تم کم از کم اس کی ماں کو تو فون کر دو۔''
''فون کر کے کیا کروں...... وہ میری بات ہی نہیں سنے گی...... وہ مجھ سے نفرت کرتی ہے۔ اس نے ہم دونوں کو جدا کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔''
''یہ کوئی دلیل نہیں ہے۔ لڑکی یہاں آئی تھی اور اس کی

ماں کو یہ پتا ہے۔ اگر تم اس سے بات نہیں کرو گے تو وہ نہ معلوم کیا کیا سوچ لے گی......!"

"وہ پہلے ہی سب کچھ سوچ چکی ہو گی...... میں کچھ بھی کہوں، اسے یقین نہیں آئے گا۔"

اب اس پتھر سے سر پھوڑنا حماقت تھی۔ وہ مصیبت کو خود دعوت دینے پر تلا ہوا تھا۔ میں خاموش ہو کر کن انکھیوں سے اس کا جائزہ لینے لگا۔ وہ پیے ہوئے نہیں تھا...... تو وہ تین گھنٹے تک کیا کرتا رہا۔ "تم تھے کہاں؟ میکیز میں گئے تھے کیا؟"

اس نے کچھ بولے بغیر اثبات میں سر ہلا دیا۔

یہ کونے پر واقع ایک بار تھا جو رات بھر کھلا رہتا تھا مگر جب اس نے زیادہ پی بھی نہیں تھی تو وہ وہاں بیٹھا کیا کر رہا تھا؟ وہ جیسے میرا سوال جان کر خود ہی بولا۔

"میں نے ایک پیگ لیا تھا۔ میں خیالات میں اتنا کھویا ہوا تھا کہ مجھے وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔"

میں کھڑکی کے قریب اس کی طرف پشت کر کے کھڑا ہو گیا۔ بارش میں بھیگی ہوئی سڑک سیاہ ہو گئی تھی۔ اچانک میرا جسم تن گیا۔ میں نے سوچا کہ اسے پہلے سے بتا دوں تاکہ وہ ذہنی طور پر تیار ہو جائے۔ میں نے رخ تبدیل کیے بغیر کہا...... "ایک پولیس والا ابھی گاڑی سے اترا ہے اور اسی طرف آرہا ہے۔"

"ریڈ! تم میرا ساتھ دینا۔"

میں ایکدم گھوم گیا۔ "ساتھ دینا! کیا مطلب ہے تمہارا؟"

وہ گردن کھجانے لگا۔ جیسے اس سوال کا جواب سوچ رہا ہو۔

"اگر پولیس آکر پوچھے کہ تم نے لڑکی کو جاتے دیکھا تھا تو تم کہہ دینا کہ ہاں۔ تم کہنا کہ جب تم واپس آئے تو میں اسے ٹیکسی میں بٹھا رہا تھا۔"

"مگر یہ غلط ہے......" میں نے سختی سے کہا۔

"ہاں اگر تم پانچ منٹ پہلے آجاتے تو اسے جاتا دیکھ لیتے...... اگر تم یہ نہیں کہو گے تو کون کہے گا کہ وہ یہاں سے گئی ہے۔ میں خواہ مخواہ پھنس جاؤں گا۔"

مجھے اس کے جوتوں کے خشک تلے یاد آئے مگر مجھے اپنا اطمینان بھی تو کرنا تھا۔ 'میں ایک سوال کرتا ہوں' میں نے سوچا۔ 'اگر اس کا جواب بھی اس نے غلط دیا تو وہ میری۔'

"یہ تو بتاؤ کہ تم واقعی اسے دروازے تک چھوڑنے اور ٹیکسی میں بٹھانے گئے تھے؟"

شاید میرا لہجہ کام کر گیا کہ اس نے صحیح جواب دے دیا۔ "نہیں۔ میں اسے دروازے تک چھوڑنے نہیں گیا۔ مگر میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ وہ یہاں سے چلی گئی تھی اور ٹیکسی میں ہی گئی تھی۔"

"مگر پہلے تو تم نے کہا تھا کہ تم خود اسے ٹیکسی میں بٹھا کر آئے تھے؟"

"ہاں! مگر اس وقت معاملے کی نوعیت اتنی سنجیدہ نہیں تھی۔ دراصل مجھے تمہیں یہ بتاتے ہوئے شرم آرہی تھی کہ میں اسے چھوڑنے تک نہیں گیا...... میں کمرے کے دروازے تک گیا تھا...... وہ باہر نکل گئی۔ پھر میں نے اسے سیٹی بجا کر ٹیکسی کو بلواتے ہوئے سنا تھا۔ پھر مجھے کھڑکی سے ایک ٹیکسی کے رکنے کی آواز بھی آئی...... پھر اس نے دروازہ کھولا اور بیٹھ گئی اور......"

"ایک منٹ! تم نے اسے خود اندر بیٹھتے ہوئے دیکھا تھا؟"

اس نے مجھے گھور کر دیکھا...... "دراصل کھڑکی کے قریب میں تاخیر سے پہنچا۔ میں نے اسے جھکے ہوئے دیکھا۔ اس کا ایک ہاتھ ٹیکسی کے دروازے کے ہینڈل پر تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ وہی ہو سکتی تھی اور کون ہو سکتا تھا؟ ایک منٹ پہلے ہی تو وہ نکلی تھی۔ میں اس کے بعد پانچ منٹ تک کھڑکی کے سامنے کھڑا رہا۔ کوئی اور باہر نہیں نکلا۔ اب تو تم کہہ سکتے ہو نا کہ جب تم آئے تو وہ ٹیکسی میں بیٹھ رہی تھی۔ میں صرف......"

دروازے پر دستک ہوئی، میں نے انگوٹھے سے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ تب بھی اس نے دروازہ کھولنے سے پہلے ایک بار درخواست کی...... "تم میرا ساتھ دو گے؟ بولو! دو گے نا؟"

اسے یقین دہانی کی ضرورت تھی میں سوچنے لگا کہ آخر اس کی اپنی بے گناہی اسے سہارا دینے کے لیے کیوں کافی نہیں ہے اور پھر یہ پولیس والا تو محض ایک ماں کی رپورٹ پر معمول کی چیکنگ کے لیے آیا تھا۔ جیسے کوئی ٹریفک والا چالان کرتا ہے۔ یا کسی گھر سے شور و غل کی آواز آئے تو تنبیہ کرنے آجاتا ہے۔ پھر ڈکسن اتنا پریشان کیوں تھا؟

پولیس والا اندر آکر اس سے سوال کر کے جواب لکھتا جا رہا تھا اور وہ کہہ رہا تھا۔ "وہ پونے بارہ بجے چلی گئی تھی...... نہیں! میں نے کہا تھا مگر اس نے کہا کہ اس کے پاس برساتی ہے اور وہ دروازے سے ہی ٹیکسی لے لے گی......"

اچانک مجھے خیال آیا اور میں نے میز کی طرف نگاہ ڈالی جہاں میں نے برساتی کا ٹوٹا ہوا کلپ رکھا تھا...... وہ وہاں نہیں تھا۔ میں نے ڈکسن کی طرف دیکھا...... اس نے نظریں نیچے کرلیں۔

پولیس والے نے مجھ سے صرف ایک سوال کیا تھا......

''آپ یہاں تھے؟''

میں نے صرف ایک لفظ میں جواب دیا۔ ''نہیں!''

ابھی وہ مرحلہ نہیں آیا تھا جہاں مجھے ڈکسن نے ساتھ دینے کے لیے درخواست کی تھی۔

وہ چلا گیا اور ہم دونوں لیٹ گئے ...... میں سویا تو وہ جاگ رہا تھا۔ چار بج رہے تھے۔ میں اٹھا تو تب بھی وہ جاگ رہا تھا۔ میری نیند پوری نہیں ہوئی تھی اور میں جلدی میں بھی تھا۔ میں کوٹ پہنتے ہوئے نیچے اتر گیا۔

☆☆☆

جب میں گھر آیا تو وہ ابھی نہیں آیا تھا۔ میں نے دروازہ کھولا تو اندر ایک شخص بڑے اطمینان سے کرسی پر بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا مگر میں اس کے چہرے کے تاثرات سے بھانپ گیا کہ اس نے چابی کی آواز سن کر وہ اخبار اٹھایا ہے۔ قالین کا ایک کونا اٹھا ہوا تھا جیسے وہ اس کے نیچے کچھ تلاش کرتا رہا ہو......

''کیا ہو رہا ہے؟'' میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔

اس نے مجھے اپنا بیج دکھایا...... ''میں آپ کا انتظار کر رہا تھا۔ آپ مسٹر کار ہیں؟ آپ ہی ڈکسن کے ساتھ رہتے ہیں؟''

''ہاں۔''

''ایک لڑکی ایسٹیل مشل کل رات یہاں آئی تھی؟''

''ذرا میں بیٹھ جاؤں۔ راستے بھر بس میں کھڑا رہا ہوں۔''

''ہاں، ہاں!''

''ہاں!'' میں نے سرد لہجے میں اس کے سوال کا جواب دیا۔ ''ایک لڑکی یہاں آئی تو تھی۔ ایسٹیل ہی نام ہوگا اس کا۔''

''کتنے بجے آئی تھی؟''

''ساڑھے آٹھ بجے۔''

''آپ نے اسے آتے دیکھا تھا؟''

''میری اس سے سیڑھیوں پر مڈبھیڑ ہوئی تھی۔''

''آپ واپس کب آئے تھے؟''

''بارہ بجے کے قریب!''

''وہ اس وقت یہاں موجود تھی؟''

''نہیں، اسی وقت گئی تھی۔''

''آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ اسی وقت گئی تھی؟ کیا آپ نے خود اسے جاتے دیکھا تھا یا آپ کے دوست نے بتایا تھا؟''

اب وہ دشوار گزار مرحلہ آگیا تھا۔ اگر مجھے ڈکسن پر اطمینان ہوتا تو میں کہہ دیتا کہ میں اسے خود کونے تک چھوڑ کر آیا تھا۔ جہنم میں جائے پولیس مگر مجھے خود اس کی طرف سے تسلی نہیں تھی۔

''دیکھا تو تھا!'' میں نے محتاط لہجے میں کہا۔

''دیکھا تو تھا، سے کیا مراد ہے؟''

''دراصل میں جب کونے پر مڑا تو ایک ٹیکسی دروازے کے آگے کھڑی تھی اور کوئی اس میں بیٹھ رہا تھا۔ اوپر کھڑکی میں ڈکسن کھڑا نیچے دیکھ رہا تھا۔''

''آپ کو یقین ہے کہ وہی ٹیکسی میں بیٹھ رہی تھی؟''

''میں نے یہ تو نہیں کہا......'' میں ڈکسن کا جہاں تک ساتھ دے سکتا تھا، دے رہا تھا مگر میرا اپنا ضمیر بھی عجیب ہے۔ پہلے اپنا اطمینان چاہتا ہے۔ ''یہ مجھے یقین ہے کہ وہ کوئی لڑکی ہی تھی مگر رات اتنی اندھیری تھی کہ اس کا چہرہ نظر نہیں آرہا تھا۔ جب اوپر گیا تو ڈکسن نے بتایا کہ وہ ابھی گئی ہے...... اب آپ خود نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں۔''

''آپ نے اس لڑکی کو پہلے کبھی دیکھا تھا؟''

''نہیں...... کل رات پہلی بار اس سے سیڑھیوں پر ملاقات ہوئی تھی......''

اب وہ کچھ نرم پڑا۔ یعنی اس نے سمجھ لیا کہ ایک دفعہ دیکھنے سے کوئی چہرہ رات کی تاریکی میں پہچاننا مشکل ہے، جبکہ بارش بھی ہو رہی ہو۔

''وہ گھر واپس کب آتا ہے؟''

وہ روزانہ اس وقت تک گھر آجاتا تھا مگر مجھے بتانے کی کیا ضرورت تھی۔ ''اس کا کوئی وقت مقرر نہیں ہے۔'' میں نے بے پروائی سے کہا۔ ''ممکن ہے وہ اپنی دوست کے گھر چلا گیا ہو......''

''ٹھیک ہے، میں اس کا انتظار کر لیتا ہوں......''

''میں باہر جا کر کچھ کھا سکتا ہوں؟ دوپہر سے صرف کافی پر چل رہا ہوں......''

اس نے دوستانہ انداز میں ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ''جاؤ کار! بڑے شوق سے جاؤ......'' مگر مجھے اس کا لہجہ پسند نہیں آیا۔ جیسے وہ کہہ رہا ہو کہ مجھے تم سے کوئی سروکار نہیں ہے، کسی اور سے ہے۔

میں بغیر کچھ کہے باہر نکل آیا۔ جب میں کونے پر پہنچا تو ایک کھڑی ہوئی کار تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ تب مجھے وہ ایک ڈیوڑھی میں نظر آیا...... "تم یہاں کیا کررہے ہو؟ آنکھ مچولی کھیل رہے ہو کیا؟"

"جوتے کا فیتہ نکل گیا تھا۔ اسے باندھ رہا تھا......" وہ بولا۔ "کوئی آیا تو نہیں تھا؟"

"ایک پولیس والا تمہارے انتظار میں اوپر بیٹھا ہے......"

وہ پھر بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلا...... وہیں کھڑا رہا۔

"تم جاکر اس سے بات کیوں نہیں کرلیتے؟"

وہ مجھے یوں دیکھنے لگا جیسے میں اس سے کسی آدم خور شیر کی کچھار میں جانے کو کہہ رہا ہوں۔

"تم اس لڑکی کے ہاں گئے تھے کیا؟"

اس نے نفی میں سر ہلا دیا اور نیچے دیکھنے لگا۔

"تو کل رات سے تم نے ان سے بات کرنے کی بھی کوشش نہیں کی؟"

"اس کی ماں مجھ سے نفرت کرتی ہے...... وہ مجھے دیکھتے ہی برس پڑے گی اور میری حالت ایسی نہیں ہے کہ یہ برداشت کرسکوں۔"

"دیکھو ڈکسن!" میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "لڑکی کی گمشدگی میں تمہارا کوئی ہاتھ نہیں ہے تو تم اس کی ماں...... یا پولیس...... یا کسی اور سے بات کیوں نہیں کرنا چاہتے؟"

"تم اپنے آپ کو دیکھ لو......" وہ تلخ لہجے میں بولا...... "تمہیں خود میری بات کا یقین نہیں ہے...... تمہاری آنکھوں سے صاف معلوم ہوتا ہے۔"

میں نے اس کے جملوں کو نظر انداز کردیا......

"خیر اب تم جاؤ۔ تمہارا تسمہ بھی بندھ چکا ہے......"

میں جاتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ وہ ایک بے وقوف آدمی ہے اور خود کو اچھا بھلا پھنسا لے گا۔ چاہے بعد میں چھوٹ ہی کیوں نہ جائے اگر اس کی جگہ میں ہوتا تو خود پولیس کے پیچھے پڑ جاتا کہ میری دوست کو تلاش کیا جائے...... لیکن وہ تو خود ہی مشتبہ نظر آنے لگا تھا۔

میں کھانا کھا کر واپس گیا تو وہ پھر غائب تھا اور اس کے ساتھ پولیس والا بھی۔ چالیس منٹ بعد وہ آیا تو اس کا چہرہ سفید تھا۔ جیسے اس کا خون نچوڑ لیا گیا ہو۔

"وہ مجھے لے کر ہیڈ کوارٹر گئے تھے...... تفتیش کرنے۔" وہ بولا۔ اس نے کوٹ اتار دیا اور کرسی پر بیٹھ کر ٹائی ڈھیلی کرنے لگا جیسے اس کا دم گھٹ رہا ہو۔ "ایک بار تو مجھے ایسا لگا جیسے اب وہ مجھے چھوڑیں گے نہیں...... مگر پھر چھوڑ دیا۔"

میں نے شانے اچکائے...... "آخر کیوں نہ چھوڑتے تمہیں؟"

"میں اب مزید برداشت نہیں کرسکتا......"

"کیوں؟ اس سے پہلے تو تم اتنے حساس نظر نہیں آئے......" میں نے کہا۔ "آخر تم اس کا اتنا اثر کیوں لے رہے ہو؟ پولیس تو سوالات کرتی ہی ہے۔ انہیں تم پر تو شک نہیں ہے نا؟"

وہ تلخی سے ہنسا۔ "مجھے تو لگتا ہے کہ وہ مجھ پر ہی شک کررہے ہیں......" میں نے سوچا کہ اگر وہ ہیڈ کوارٹر میں بھی اسی طرح بیٹھا رہا ہوگا تو یقیناً اس پر شک کرنے میں وہ حق بجانب ہیں۔ میں نے سوچا کہ اس آڑے وقت میں، میں ہی اسے سہارا دوں۔

میں تھوڑی دیر ٹہلتا رہا۔ پھر اس کی کرسی کے قریب آکر بولا۔ "دیکھو یار! تم کم از کم میری خاطر ہی اس کی ماں کو فون کرو۔ پتا تو چلے کہ اسے کوئی اور بات معلوم ہوئی یا نہیں۔ اس طرح بیٹھے رہنے سے کوئی فائدہ نہیں......"

وہ پھر ہچکچایا...... "میں تم سے کئی بار کہہ چکا ہوں کہ وہ مجھے مجرم سمجھ رہی ہوگی۔ میں اس سے کوئی بات نہیں کرسکتا۔"

میں نے پھر ٹہلنا شروع کردیا اور یکدم رک کر بولا۔ "لیکن کیا اس لڑکی سے تمہیں کوئی دلچسپی نہیں تھی؟"

اس جملے نے اسے بھڑکا دیا...... "ریڈا مجھے اس سے دیوانگی کی حد تک محبت تھی۔ میں اسے اپنانے کے لیے سب کچھ کرسکتا تھا۔ میں ایسٹیل کی اس شخص سے شادی کے بجائے اس کی موت گوارا کرسکتا تھا۔" اسے...... بہت بعد میں احساس ہوا کہ وہ کیا کہہ چکا ہے۔

وہ قول اور فعل دونوں میں غلطیاں کرتا جارہا تھا۔

"اس قسم کا جملہ کسی اور کے سامنے نہ کہنا......" میں نے اسے نصیحت کی اور فون اٹھالیا۔

"تم کسے فون کررہے ہو؟"

"ایسٹیل کے گھر کا نمبر بتاؤ......!"

اس نے نمبر بتایا...... میں نے ڈائل کیا...... دوسری طرف سے ایک مرد نے اٹھایا۔

"مسٹر مشل سے بات کرنا ہے......"

"آپ کون صاحب ہیں......؟"

"ڈکسن بات کرنا چاہتا ہے۔"

یقیناً وہ سراغ رساں تھا کیونکہ اس کے بعد کافی دیر تک وقفہ رہا یقیناً وہ آپس میں بات کررہے ہوں گے

......پھر مجھے اس عورت کی آواز آئی۔ ''آپ کو مجھے مجبور نہیں کرنا چاہیے......''

میں نے ڈکسن کی طرف دیکھ کر زور سے سر ہلایا جیسے کہہ رہا ہوں کہ آؤ بات کرو۔ پھر بھی وہ نہیں اٹھا تو میں نے زبردستی ریسیور اس کے ہاتھ میں دے دیا۔

وہ کسی قدر بے جان لہجے میں بول رہا تھا...... ''مسز مشل! ایستیل کی کوئی اطلاع ملی؟''

یقیناً دوسری طرف سے کوئی تلخ جواب ملا ہوگا۔ اس کا چہرہ اور سفید ہو گیا تھا۔ ریسیور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر گیا۔ میں نے اٹھا کر کان سے لگایا تو اس کی آواز آرہی تھی۔ وہ صرف ایک لفظ چیخ چیخ کر کہے جا رہی تھی...... ''قتل! قتل! قتل!''

میں نے فون رکھ دیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ شراب پی رہا تھا۔ یہ بوتل وہ ہیڈ کوارٹر سے واپسی پر لایا تھا۔ میں اسے اس پر قصور وار نہیں سمجھتا تھا۔ اس کی ماں کے جملے سننے کے بعد میری بھی یہی حالت ہوتی۔

''دیکھا تم نے!'' میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی...... ''اگر تم رات کو میری بات مان کر اسے فون کر لیتے تو بات یہاں تک نہ پہنچتی۔ تم نے تو لڑکی کی گمشدگی کی اطلاع پا کر ایسی حرکات شروع کر دیں کہ انہیں خود تم پر شبہ ہو......''

اب بھی اگر میں ہوتا تو ان کے گھر جا پہنچتا اور خود بھی اس کی ماں کے ساتھ مل کر طوفان اٹھا لیتا۔ مگر یہ میں نہیں، وہ تھا۔ ایک خیال بار بار میرے ذہن سے تکرا رہا تھا۔ اگر میں بے گناہ نہ ہوتا تو کیا پھر بھی ایسی ہی حرکتیں کرتا جیسی وہ کر رہا ہے۔

میں نے اس...... خیال کو زبردستی ذہن سے نکالنے کی کوشش کی مگر وہ نکلا نہیں۔ پھر میں اٹھا۔ اب وہ کھڑکی سے جھانک رہا تھا جیسے دیکھ رہا ہو کہ اس کی نگرانی تو نہیں ہو رہی۔ میں باہر نکلنے لگا تو اس نے پوچھا۔

''تم جلدی آجاؤ گے نا۔'' آج سے پہلے کبھی اس نے یہ سوال نہیں پوچھا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ دراصل وہ مجھ سے کہنا چاہ رہا ہے کہ دیکھنا باہر کوئی گھر کی نگرانی تو نہیں کر رہا۔

''میں جلدی آجاؤں گا۔'' میں نے بے دھیانی سے کہا۔ دراصل ایک دو باتیں میرے ذہن پر سوار تھیں جنہیں میں حل کرنا چاہتا تھا۔

☆☆☆

میکیز ایک بندر جیسی صورت کا گنجا شخص تھا۔ وہ مجھے

پرہیز

ایک موٹی عورت وزن کم کرنے کا مسئلہ حل کرنے ڈاکٹر کے پاس گئی۔ ڈاکٹر صاحب نے کچھ دوائیں تجویز کیں اور چند مشورے پرہیزی غذا کے متعلق دیے۔ خاتون بڑی سعادت مندی سے سر ہلاتی رہی۔ آخر کو خدا حافظ کہہ کر رخصت ہوئی۔ دروازے کے پاس جا کر اسے کچھ یاد آیا تو بولی۔

''ڈاکٹر صاحب! دوائیں تو ٹھیک ٹھاک سمجھ آگئیں مگر آپ نے جو پرہیزی غذا بتائی ہے، وہ کھانا کھانے سے پہلے کھانی ہے یا بعد میں......؟''

☆☆☆

ملامتِ ضمیر

الیکشن میں ایک امیدوار ووٹر کو سمجھا رہا تھا۔ ''میرے بھائی میرے دوست...... بھلا تم میرے حریف کو ووٹ کیسے دو گے۔ تمہارا ضمیر تمہیں ملامت نہیں کرے گا۔ ذرا سوچو میں نے تمہارے باپ کو نوکری دلوائی۔ تمہارے بھائی کو دکان الاٹ کروائی۔ تمہاری بہن کو گورنمنٹ اسکول کی پرنسپل بنوایا حالانکہ وہ ہرگز اس کی اہل نہ تھی۔ میں نے تمہارے دوست انور کو جو رشوت لینے کے الزام میں گرفتار ہوا تھا، قید سے چھڑوایا میں نے......''

ووٹر نے جھٹ امیدوار کی بات کاٹ کر کہا۔ ''وہ تو سب ٹھیک ہے مگر آپ نے میرے لیے کیا کیا......؟''

☆☆☆

ایک ہی کمی

ایک بادشاہ نے اپنا مقبرہ زندگی میں تعمیر کرا لیا۔ مکمل ہونے پر بادشاہ مقبرے کا جائزہ لینے گیا۔ مقبرہ دیکھنے کے بعد اس نے معمار سے پوچھا۔ ''بہت اچھا بنا ہے اور کوئی کمی رہ گئی ہو تو بتاؤ؟''

ابھی معمار نے کچھ جواب نہ دیا تھا کہ قریب کھڑا ایک سرپھرا بول اٹھا۔ ''حضور! بس آپ کی کمی رہ گئی ہے۔''

مرسلہ۔ نجی رحمان، یو ایس اے

اور ڈکسن کو خوب پہچانتا تھا۔ ہم لوگ باقاعدہ پینے والے نہیں تھے مگر آٹھ ماہ سے صرف اسی کے بار میں جایا کرتے تھے۔
"کل میرا دوست یہاں آیا تھا؟" میں دراصل ان تین گھنٹوں کا کھوج لگانا چاہ رہا تھا۔
"ڈکسن؟" وہ بولا۔ "ہاں آیا تو تھا مگر کل کیا ہوا تھا اسے...... آدھا پیگ چھوڑ گیا۔"
"یہ تو اس نے بھی مجھے بتادیا تھا۔ میں خود اس کی پریشانی جاننا چاہ رہا ہوں۔" میں نے ذرا نارمل رہنے کی کوشش کی۔ "وہ یہاں کتنی دیر رہا؟"
"تین بجے تک بیٹھا رہا۔ اس کے علاوہ یہاں کوئی تھا ہی نہیں!"
ایک دم میرا تناؤ ختم ہوگیا۔ میں نے اس بیئر کی چسکی لی جو پینا نہیں چاہتا تھا۔
"آج اس کی طبیعت ٹھیک ہوگئی؟" وہ پوچھنے لگا۔ پھر خود ہی بڑبڑایا۔ "معدہ خراب ہو تو اس کا یہ مطلب ہے کہ کچھ نہ کھایا جائے۔ خود بخود ٹھیک ہوجائے گا۔"
معدے کی خرابی! کیا مطلب؟ یہ تاثر اس نے کیسے لیا؟ صرف ایک ہی وجہ ہوسکتی تھی جس سے یہ تاثر لیا جاسکتا تھا۔ میں نے ایک دو منٹ توقف کیا پھر اٹھا۔ "ابھی آتا ہوں" اور باتھ روم کی طرف ہولیا۔ اس سے پہلے ایک دو بار میں وہاں گیا تھا مگر اسے اتنی اہمیت نہیں دی تھی۔ ایک گندا سا واش بیسن لگا ہوا تھا اور روشنی بھی ناکافی تھی۔ وہاں ایک کھڑکی بھی تھی۔ لمبی اور پتلی۔ شیشے پر بھی گرد جمی ہوئی تھی۔ وہ اوپر سے ہوا کے لیے ذرا سی کھلی ہوئی تھی۔ اس پتلی سی کھڑکی میں سے کسی کا نکلنا ناممکن ہی تھا اور پھر وہ یہاں "بعد" میں آیا تھا...... "بعد" میں آکر وہ عدم موجودگی کے عذر سے کیا حاصل کرلیتا؟ لعنت ہے! اس پر شبہ بھی نہیں ہوسکتا تھا اور بھروسا بھی نہیں کیا جارہا تھا۔
میں نے واش بیسن پر پیر لگا کر کھڑکی کے اوپر کھلے حصے سے باہر جھانکا۔ باہر ہوا کے نکلنے کا راستہ بنا ہوا تھا جس سے نہ نیچے جایا جاسکتا تھا اور نہ اوپر...... میں نیچے اتر آیا اور کھڑکی کو نیچے سے کھول کر دیکھنے لگا۔ نیچے کھڑکی کی منڈیر تھی...... میری آنکھیں بہت تیز ہیں اور میں بہت غور سے دیکھ بھی رہا تھا۔ پھر بھی میں نے آنکھوں پر بھروسا نہ کرتے ہوئے جیب سے اخبار نکالا اور اسے جلا کر پھر باہر دیکھنے لگا۔
اس سے پہلے کہ وہ میرا ہاتھ جلائے، میں نے اسے اندر کرکے فرش پر ڈال کر بجھا دیا۔
پہلے میں نے اپنا ہاتھ ڈالا۔ پھر میں جھکا اور ہاتھ نیچے کیا۔ میری انگلیاں کسی چیز سے چھوگئیں۔ میں نے اسے فوراً اٹھالیا...... یہ دو بٹن تھے جو اسی برساتی کے تھے۔ اگر مجھے کوئی شبہ تھا تو وہ ان میں لگے ہرے رنگ کے برساتی کے ریشوں سے دور ہوگیا۔ یہ ویسے ہی بٹن تھے جیسا مجھے کمرے میں ملا تھا۔
تین بٹن ٹوٹنے کا مطلب تھا کہ برساتی پہننے والے کے ساتھ کوئی بدسلوکی ہوئی تھی مگر بدسلوکی اتنی دہشت ناک نہیں تھی۔ جتنی اسے چھپانے کی یہ کوشش...... اس نے یقیناً کھڑکی کے کھلے حصے سے گرائے ہوں گے اور اسے یہ خیال بھی نہ آیا ہوگا کہ یہ نیچے بھی گر سکتے ہیں۔ پھر وہ برساتی کہاں گئی۔ برساتی جس پلاسٹک کی بنی ہوتی ہے، وہ آسانی سے جل سکتا ہے۔ اگر وہ جلائی نہیں گئی تو کس طرح باہر لے جائی گئی ہوگی۔ ہاں! پتلون کے اوپر باندھ کر، جیسے بعض لوگ ہوٹلوں سے تولیے چراتے ہیں۔ میں نے بٹن اٹھا کر کاغذ میں لپیٹ کر جیب میں ڈال لیے اور باہر نکل آیا۔ میں اپنے ذہن کو سمجھانے کی کوشش کرنے لگا کہ ابھی اپنے دوست کو شک کا فائدہ دوں۔
اب میں سوچ رہا تھا کہ کہاں جاؤں...... واپس گھر جاؤں تو وہ ان دو بٹنوں کو بھی تیسرے بٹن کی طرح غائب کردے گا۔ پولیس کے پاس جاؤں؟...... مگر نہیں، اس موقع پر وہاں جانا مناسب نہ ہوگا...... اگر کوئی شخص ڈوب رہا ہو تو آپ اسے سہارا دے کر نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔
تو پھر اسٹیل کے گھر جانا چاہیے...... اور مجھے ان کا پتا معلوم نہیں تھا مگر ہاں ڈائریکٹری سے معلوم ہوسکتا ہے۔ ٹیلی فون نمبر تو تھوڑی دیر پہلے اس نے بتایا ہی تھا...... اس سے ملا کر میں نے پتا ڈھونڈ نکالا۔ وہ ہمارے گھر سے بہت قریب تھا۔ اتنا قریب کہ اتنے سے فاصلے کے درمیان اس لڑکی کو کوئی گزند نہیں پہنچ سکتی تھی۔

☆☆☆

یہ ایک پرانی عمارت تھی جو صفائی کی وجہ سے رہنے کے قابل نظر آتی تھی۔ یقیناً اس کی ماں اپنی محدود آمدنی کی وجہ سے یہاں رہ رہی ہوگی۔ میں نے فلیٹ کی بیل بجانے سے پہلے پھر سوچا کہیں میں ریاکاری تو نہیں کررہا ہوں۔ میری جیب میں دو بٹن ہیں جو میں انہیں دکھانے کا ارادہ بھی نہیں رکھتا۔ آخر میں کس کا طرف دار ہوں؟ ان کا یا اپنے ساتھی کا......؟
میں بے چینی سے وہیں ٹہل رہا تھا۔ دیکھنے والا یہ سمجھ رہا ہوگا کہ لفٹ سے اوپر جانے کے لیے کھڑا ہوں۔ اسی

دوران مجھے دو پولیس والے آتے نظر آئے۔ وہ کسی چیز کو تھامے ہوئے تھے جسے انہوں نے اخبار سے ڈھانپ رکھا تھا۔ ایک دوسرے سے کہہ رہا تھا۔

"خود باہر آنے کے بجائے انہوں نے ہمیں اندر کیوں بلوالیا؟"

"پتا نہیں...... شاید وہ بے چاری باہر نہ آسکتی ہو......"

وہ دونوں چلتے ہوئے اسی دروازے کے سامنے آکر رُکے جہاں تھوڑی دیر پہلے میں کھڑا تھا۔ ان کے قریب آنے سے مجھے اخبار کے نیچے ڈھکی ہوئی چیز کو ایک نظر دیکھنے کا موقع مل گیا۔ نیچے سے سبز رنگ کی برساتی کا ایک حصہ نظر آرہا تھا۔ ان دونوں پولیس والوں کو کیا معلوم کہ میں کون ہوں؟ ......انہوں نے مجھے عام سا آدمی سمجھا ہوگا ورنہ وہ شاید اسے چھپانے کی کوشش کرتے۔

میں ان کے سامنے تیزی سے باہر نہیں آیا...... بلکہ جب وہ اندر چلے گئے تو تبھی میں دو تین منٹ وہیں کھڑا رہا۔ ایسٹیل کی ماں شاید دروازے کے قریب ہی تھی کیونکہ فوراً ہی ایک دہشت ناک چیخ ابھری اور پھر جیسے کوئی چیز نیچے گری۔

میں تیزی سے باہر آیا اور تیز تیز چلتا ہوا اپنے گھر آگیا۔ کمرے میں اندھیرا تھا پہلے میں سمجھا کہ وہ اندر نہیں ہے مگر وہ بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ اس طرح نہیں جیسے کوئی سونے کے لیے لیٹتا ہو۔ وہ آڑا اور اوندھا لیٹا ہوا تھا۔ اس نے میرے آنے کی آہٹ سن کر سر اٹھا کر دیکھا۔

"یہ تم ہو ریڈ......؟"

"ہاں! یہ میں ہوں......" میں دروازے پر ہی کھڑا تھا۔

وہ بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا اور بڑی مشکل سے بولا......

"تم مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہے ہو؟"

"تم اب تیار ہوجاؤ...... تمہاری محبوبہ مر چکی ہے......"

اس کے چہرے پر اتھل پتھل سی مچ گئی۔ جیسے وہ رو دینے کو ہے۔ پھر وہ بولا۔ "کیا انہیں یقین ہے؟"

"وہ اسے اندر لے کر جارہے تھے کہ میں نے اس کی برساتی کی جھلک دیکھ لی!"

اس نے ایک گہری سانس کھینچی اور ایک دم تیزی سے اٹھ کر دروازے کی طرف لپکا۔ "میں یہاں سے جارہا ہوں......" وہ ایک دم گھبرا گیا تھا۔ میں نے فوراً دروازہ بند کرلیا اور کہا۔

"ایک منٹ! پاگل کیوں ہوتے جارہے ہو۔ اتنی بڑی حماقت کرو گے؟"

"میں باہر جارہا ہوں۔ آج انہوں نے ہیڈکوارٹر میں جو سلوک میرے ساتھ کیا ہے، وہی کافی ہے۔ اب لاش ملنے کے بعد تو......" وہ دروازہ کھولنے کی کوشش کررہا تھا اور میں اسے بند رکھنے کی۔

"کیا تم مجھے یہاں روکے رکھنے کے لیے آئے ہو تاکہ پولیس آکر پکڑلے......؟"

"نہیں! میں تو تمہیں بروقت اطلاع دینے کے لیے آیا تھا۔" میں نے ایک ہاتھ دروازے سے ہٹالیا۔

"تو پھر مجھے جانے دو ریڈ! مجھے کم از کم ایک موقع تو دو......"

"تم سمجھتے کیوں نہیں ہو کہ تم کتنی بڑی غلطی کررہے ہو۔ اس طرح تو انہیں یقین ہوجائے گا کہ اسے تم نے ہی مارا ہے......"

مگر وہ اب دلائل کی منزلوں سے گزر چکا تھا......

"باتیں بنانا آسان ہے۔ میری جگہ تم ہوتے تو پتا چلتا...... میری زندگی پر بن آئی ہے۔ اگر میں یہاں رک گیا تو ہمیشہ کے لیے پھنس جاؤں گا اور مجھے خود کو بچانے کا کوئی بھی موقع نہیں مل سکے گا۔"

وہ مجھے ہٹا کر دروازہ نہیں کھول سکتا تھا۔ تھوڑی دیر جدوجہد کرنے کے بعد اس نے ہمت ہاردی اور کرسی میں دھنس گیا۔ ہم دونوں ہانپ رہے تھے۔

"تو تم میرے دوست ہو......؟" بالآخر وہ بولا۔

اور یہ جملہ اپنا کام کرگیا۔ اگر وہ مجھ سے جسمانی کشتی کرتا رہتا تو میں کبھی اسے باہر نہ نکلنے دیتا مگر اس کے اندازِ پسپائی نے مجھے مجبور کردیا اور میں ایک طرف ہٹ گیا۔ "تم باہر نکل کر بھی بچ نہیں سکو گے......" میں نے کھڑکی کے قریب آکر باہر جھانکا۔ ابھی تک کوئی آثار نہیں تھے مگر اس نے بھی دروازے کی طرف بڑھنے کی کوشش نہیں کی۔ شاید یہ بات اس کی سمجھ میں آگئی تھی۔

میں نے اپنا کوٹ اور ہیٹ اس کی طرف اچھالتے ہوئے کہا...... "لو! یہ تم پہن لو۔ انہوں نے مجھے اس عرصے میں دو تین بار دیکھا ہے۔ اس طرح تم بچ کر نکل سکتے ہو۔ مگر سامنے کی طرف سے مت جانا۔ پیچھے سے نکلنا، وہاں شاید نگرانی نہ ہو رہی ہو...... اور اگر تم باہر نکلو تو میری طرح لمبے لمبے ڈگ بھر کر چلنا۔ اپنی چال نہ چلنا۔ بایاں ہاتھ پتلون کی جیب میں رکھنا اور ہیٹ کا اگلا سرا میری طرح جھکائے رکھنا۔ بس کافی ہے......"

اس نے دروازہ کھولا...... میں تقریباً پگھل چکا تھا۔

"لو! کچھ پیسے رکھ لو......" یہ کہہ کر کچھ نوٹ میں نے اس کے ہاتھ میں ٹھونس دیے۔

''میں تم سے رابطہ کہاں قائم کروں گا ریڈ!''
''کیا تمہیں اس کی ضرورت ہوگی؟'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔
''ہاں۔ مجھے...... مجھے معلوم کرنا ہوگا کہ میرے بعد کیا ہوا۔ خیر میں کوئی نہ کوئی ترکیب تلاش کروں گا...... یہاں گھر پر یا تمہارے دفتر میں تو رابطہ نہیں ہوسکتا۔'' یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔
کتنا احمق تھا وہ... میں اسے سیڑھیاں اترتے دیکھتا رہا۔ کوٹ کی وجہ سے اس کے حلیے میں کسی قدر تبدیلی آگئی تھی۔ شاید نگرانی کرنے والا دھوکا کھا جائے۔
میں نے اس کے نیچے اترنے اور پچھلا دروازہ کھولنے کی آواز سنی اور پھر میں اندر گیا...... آخر میں نے یہ کیوں کیا؟ میں اپنے آپ سے پوچھ رہا تھا۔

☆☆☆

ان لوگوں کو شاید آنے میں دیر لگ رہی تھی۔ یقیناً کچھ انتظامات کرنے ہوں گے۔ بہرحال انہیں شبہ تو تھا نہیں کہ میں نے کچھ دیکھ لیا ہے ورنہ وہ جلد پہنچ جاتے۔
دروازے پر دی جانے والی دستک اس بات کا ثبوت تھی کہ ڈکسن بچ نکلنے میں کامیاب ہوگیا ہے۔
وہ دو تھے۔ پہلا مجھے ہٹا کر اندر گھس آیا...... ''باہر نکل آؤ ڈکسن! ورنہ ہم خود تمہیں پکڑ لیں گے۔''
''وہ تو یہاں ہے ہی نہیں!'' میں نے معصومیت سے کہا۔
دوسرا آدمی وہی تھا جو پہلے بھی یہاں آیا تھا۔ اس کا نام ہیلر تھا۔ میں نے اس کے ساتھی کو پکارتے سنا...... ''یہ رہا اس کا کوٹ اور ہیٹ، اور تمہارا کہاں ہے؟'' وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔
''الماری میں بائیں سے تیسرا......'' میں نے کہا۔
''تو تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ وہ پہن کر چلا گیا......'' وہ مجھے یوں دیکھ رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو کہ کیا میں بھی اس کا مددگار ہوں...... ''تم کیا کر رہے تھے......؟''
''میں تو اندر شیو کر رہا تھا۔ مجھے کیا معلوم کہ وہ کیا کر رہا ہے؟''
وہ باتھ روم میں گیا اور اس نے میرا برش چھو کر دیکھا۔ تولیے سے ہاتھ پونچھتے ہوئے بھی وہ مطمئن نظر نہیں آرہا تھا۔ پھر اس نے میرے گال چھو کر دیکھے۔ میں نے واقعی شیو کیا تھا۔ میں رات کو شیو کرتا تھا اور ڈکسن کے جانے اور ان کے آنے کے درمیانی وقفے میں، میں نے شیو کرلیا تھا۔
ہیلر نے آنکھیں سکیڑ کر پوچھا...... ''تمہیں یقین ہے کہ تم اس کا ساتھ نہیں دے رہے ہو......؟''
''اس کے جانے یا ٹھہرنے سے مجھے کیا فائدہ تھا......''
وہ مایوس سا ہوگیا...... ''چلو! یہاں ٹھہرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ وہ لوٹ کر نہیں آئے گا...... ہاں کار! اس بار تم ہمارے ساتھ چلو۔ تم سے کچھ سوالات کرنا ہیں......''
مجھے بغیر کوٹ اور ہیٹ کے جانا پڑا۔ ہیلر نے تجویز پیش کی تھی کہ میں ڈکسن کا کوٹ اور ہیٹ پہن لوں۔ مگر مجھے عجیب سا وہم آگیا۔ مجھے اب بھی یقین نہیں تھا کہ اس کوٹ اور ہیٹ کے پہننے والے نے واقعی کسی کی جان لی ہے یا نہیں؟
انہوں نے مجھے کریدنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہوئے۔ چاہے وہ جھوٹ ہو یا سچ، اگر آدمی زیادہ اڑنے کی کوشش نہ کرے تو کامیاب رہتا ہے۔ میں نے اپنے گھر کے دروازے پر دھندلکے میں ایک عورت کو ٹیکسی میں بیٹھتے دیکھا تھا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ ایسٹیل تھی یا کوئی اور۔ میری ساری کہانی یہ تھی۔ اس قدر سادہ اور مختصر سی بات کو کوئی پیچیدہ بناتا بھی تو کیسے۔
انہوں نے اب بھی میری جان نہیں چھوڑی بلکہ مجھے لے کر ایسٹیل کے گھر پہنچے۔ ایک شخص ہمیں اندر لے گیا۔ پہلے میں سمجھا کہ وہ انہی لوگوں کا ساتھی ہے۔ ہیلر نے اس سے کہا تھا...... ''ذرا مسز مشل کو بلوا دو۔ انہیں کچھ بتانا ہے......''
وہ بولا...... ''ڈاکٹر نے ابھی انہیں سکون بخش دوا دی ہے۔ اس لیے زیادہ پریشان نہ کرنا......'' پھر وہ ہمیں جس طرح اندر لے گیا اس سے ثابت ہوتا تھا کہ وہ مسز مشل کا کوئی عزیز ہے۔ اس کی عمر تیس پینتیس کے درمیان تھی۔ ہمیں کوریڈور میں بٹھا کر وہ مسز مشل کو ایک ہاتھ کا سہارا دیئے لے کر آیا۔ اس واقعے نے اس عورت کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ کوریڈور میں لگی اپنی تصویر سے وہ بالکل مختلف ہوگئی تھی۔ آنکھیں گڑھوں میں دھنس گئی تھیں۔ اس شخص نے جس کا نام ٹریمولٹ تھا، اسے کرسی پر بٹھا دیا اور اپنا بازو اس کے شانے پر رکھ لیا...... اور بولا۔
''بیٹھ جائیں مام!''
مگر وہ لڑکی کا بھائی تو نہیں لگتا تھا۔ ممکن ہے سوتیلا بھائی ہو۔ میں نے اس کے ہاتھ دیکھے تو سمجھ گیا کہ وہ اپنی پریشانی کس طرح برداشت کرنے کا عادی ہے۔ اس نے اپنے ناخن آدھے کھا لیے تھے، کمرے میں سوگواری چھائی ہوئی تھی۔ ایک ننھا سا کتا بھی غمزدہ سا وہیں آگیا۔
ہیلر بولا...... ''میں ایک بار اور آپ کو زحمت دے رہا ہوں، مسز مشل......''

"ہاں بولو......" وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔

"کیا بولوں؟" میں بے چین ہو گیا۔ "صرف یہی کہ میں نے ایک عورت کو ٹیکسی میں بیٹھتے......" اور میں نے ایک دفعہ پھر وہی کہانی دہرا دی۔

"نہیں! یہ نہیں ......" ہیلر بولا۔ "تم مجھے یہ بتاؤ کیا کسی نے ٹیکسی کو بلانے کے لیے آواز دی تھی...... کیونکہ اتنی دھند میں صرف ہاتھ کے اشارے سے تو کوئی ٹیکسی ڈرائیور نہیں آسکتا تھا......"

اب میں یہ چال سمجھ گیا...... وہ میرے اور ڈکسن کے بیان میں تضاد پیدا کرنا چاہتا تھا۔ مجھے سوچنے کے لیے ایک سیکنڈ سے بھی کم وقت ملا۔ مجھ پر چھ آنکھیں جمی ہوئی تھیں۔ اگر میں نے انکار کیا کہ میں نے آواز نہیں سنی تو ڈکسن کا بیان جھوٹا پڑ جائے گا۔ اس نے اوپر کھڑکی میں سے آواز کیسے سن لی جبکہ میں باہر سڑک پر یہ آواز نہیں سن سکا تھا۔ اس چال میں بھی ایک چال تھی۔ ہیلر نے لفظ "آواز" استعمال کیا تھا۔ جبکہ ڈکسن نے کہا تھا کہ ایسٹیل نے سیٹی بجائی تھی...... اس نے مجھ سے کہا تھا کہ واقعہ یہی ہے...... صرف پانچ منٹ کے وقفے کی بات ہے۔ بہرحال مجھے یا تو اس کے پورے بیان کی تائید کرنا تھی یا تردید۔

"آواز نہیں تھی...... بلکہ سیٹی بجائی تھی جو میں نے سنی۔"

کوئی کچھ نہیں بولا۔ اب وہ مسز مشل کے بولنے کے منتظر تھے جیسے وہ سب پہلے ہی وہ کچھ جانتے ہیں جو مجھے معلوم نہیں۔ ٹریمولٹ مسز مشل کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بالآخر وہ نہایت دھیمی آواز میں بولی...... "میری بیٹی سیٹی بجا ہی نہیں سکتی تھی۔ زبان کی کسی خرابی کی وجہ سے جب بھی کوشش کرتی، بس ایک سانس کی آواز آکر رہ جاتی۔ جب بھی وہ کتے کو باہر لے جاتی تو اس کا نام لے کر آواز دیتی تھی......"

اب تک وہ ہیلر سے مخاطب تھی۔ پھر وہ ٹریمولٹ کے سہارے اندر جاتے ہوئے میری طرف مڑ کر بولی...... "اگر تم نے اپنے دروازے پر کسی عورت کو سیٹی بجا کر ٹیکسی بلاتے سنا ہے تو وہ میری بیٹی نہیں ہو سکتی۔ تم نے میری بیٹی کو اس گھر سے نکلتے نہیں دیکھا......" پھر اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اس کی آواز آئی۔ "کسی نے بھی نہیں دیکھا۔"

ہیلر میری طرف دیکھ رہا تھا اور میں خیالات میں گم تھا۔ میرے ذہن میں ایک جملہ گھوم رہا تھا۔ بار بار چکرا رہا تھا...... "ڈکیل جھوٹا! ڈکیل، جھوٹا!"

میں ان کے ساتھ ہیڈ کوارٹر واپس آگیا...... اب میں کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ وہ کہاں گیا ہے۔ اگر معلوم بھی ہوتا تو یہ معاملہ میرے اور اس کے درمیان تھا۔

وہ مجھے لے کر مردہ خانے گئے۔ انہوں نے ایک لمبی دراز کھینچی جس میں لاشیں رکھی جاتی تھیں اور چادر ہٹا دی۔ میں ان کی موجودگی کے باوجود ڈر گیا۔ گردن بری طرح ٹوٹی ہوئی تھی جیسے کوئی اسے بازو میں جکڑ کر گھوم گیا ہو۔ مگر اتنی طاقت تو کسی غیر معمولی آدمی میں ہی ہو سکتی تھی۔

انہوں نے مجھے مزید تفصیل بتانا ضروری سمجھا......

"غور سے دیکھو کار! اس لڑکی کی عمر صرف بائیس سال تھی۔ کیا اس کے ساتھ یہ سلوک ہونا چاہیے تھا؟ وہ تو صرف یہ بتانے گئی تھی کہ اب وہ کبھی اس سے نہیں ملے گی...... اور ٹریمولٹ سے اس کی شادی......"

"ٹریمولٹ سے......؟" میں اب تک اسے بھائی سمجھ رہا تھا۔ "ہاں! وہ کئی برس سے ان کے ساتھ رہ رہا ہے اور جب وہ اسکول میں تھی تب سے اسے چاہتا تھا۔ یہ طے تھا کہ جب وہ بڑی ہوگی تو وہ اس سے شادی کرے گا۔ اس نے مسز مشل کی بہت مدد کی تھی اور وہ اس کا قرض کبھی نہیں اتار سکتی تھی۔ ایسٹیل بھی اسے پسند کرتی تھی مگر پھر ڈکسن درمیان میں آگیا لیکن اس کی ماں اسے قائل کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ یہاں تک کہ ایسٹیل قائل ہو ہی گئی......"

"اس رات وہ اسے یہی بتانے گئی تھی۔ بے وقوف ماں نے اسے اکیلا جانے دیا۔ ٹریمولٹ کو بھی علم نہیں تھا۔ ایسٹیل تمہارے دوست کو اپنا فیصلہ سنا کر باہر نکلی ہوگی کہ اس نے سیڑھیوں پر اسے پکڑ لیا۔ پھر اس کی گردن دبا کر اوپر کھینچ لیا کہ کہیں وہ چلا نہ پڑے۔ وہ بے ہوش ہوئی تو ڈکسن نے سمجھا کہ وہ مر گئی ہے۔ گھبرا کر وہ اسے ایک زینے پر لے گیا اور چھپا دیا۔ کیونکہ اسی وقت اسے نیچے کسی کی آہٹ سنائی دی ہوگی۔ اس نے لڑکی کے جسم کو کوڑے دان میں ڈال دیا تھا۔

"کار! تم تو کوڑے دان کی تکنیک جانتے ہو۔ تم ایک دھات کا ہینڈل گھماتے ہو اور کوڑا نیچے چلا جاتا ہے۔ اب تم برداشت کر سکتے ہو تو سنو! اور ہاں، ہم ہر چیز کا سائنسی ثبوت دیں گے۔ اس نے ہینڈل گھما کر اس کے جسم کو نیچے کرنا چاہا۔ اس وقت وہ زندہ تھی اور اس کا سر نیچے اور ٹانگیں اوپر تھیں۔ اس وقت یقیناً کوئی نیچے سے اوپر یا اوپر سے نیچے آرہا ہوگا۔ اس نے گھبرا کر اسے نیچے کرنا چاہا اور جب خطرہ ٹل گیا تو اسے اوپر کھینچنا چاہا مگر اس کا شانہ اور سر پھنس گیا تھا۔ لو! تم خود دیکھ لو......"

''بند کروا سے......'' مجھے متلی ہونے لگی تھی۔
''اس نے کھینچ کر نکال تو لیا مگر اس کی گردن ٹوٹ گئی۔ ہم یہ سوچ کر خود کو تسلی دے سکتے ہیں کہ اس وقت وہ بے ہوش تھی مگر ذرا سوچو کہ ایک شخص تمہارے ساتھ اسی کمرے میں رہ رہا تھا......''
میں نے رومال نکال کر اپنا چہرہ تھپکا۔
''پھر وہ اسے کھینچ کر چھت پر لے گیا اور ملحقہ چھتوں سے ہوتا ہوا ایک ایسی چھت پر آیا جہاں ابھی رنگ ہوا تھا اور ڈرم وہیں پڑا تھا۔ اس نے ڈرم کا باقی ماندہ سامان نکال کر پہلے لڑکی کو اس میں ڈالا اور پھر وہ سامان بھر دیا۔ جب مزدور اسے لے کر نیچے آئے تو پتا چلا کہ وہ اتنا بھاری کیسے ہو گیا تھا۔''
''کیا تم اب بھی ایسے شخص کو بچانے کی کوشش کرو گے؟'' دوسرا بولا۔ ''بتاؤ وہ کہاں گیا ہوگا؟ تمہیں کوئی آئیڈیا تو ہوگا......''
میں نے رومال ہٹا کر کہا......'' کاش! مجھے معلوم ہوتا......'' اور انہوں نے مجھے گھر جانے دیا۔ انہیں یقین تھا کہ اب اگر مجھے اس کا پتا مل گیا تو میں انہیں ضرور بتاؤں گا......وہ میری آنکھیں دیکھ کر یقین کر سکتے تھے۔
میں اس رات سو نہیں سکا بار بار مجھے اس کا چہرہ اور وہ جملہ یاد آتا رہا۔ ''اس نے میری وجہ سے آپ کو بے آرام کیا ہوگا۔''

☆☆☆

اسے اگلے روز دفنا دیا گیا۔ میں بھی تدفین میں گیا اور پھول بھی بھیجے جس میں کارڈ لگا ہوا تھا۔ کارڈ کی عبارت تھی۔ ''اس شخص کی طرف سے جسے اس رات گھر پر ٹھہرنا چاہیے تھا۔'' یقیناً ٹریمولٹ بڑی اذیت سے دوچار رہا ہوگا۔ وہ بار بار ماچس کی تیلیاں توڑ رہا تھا۔ سب کے نکلنے کے بعد میں نے دیکھا، جہاں وہ بیٹھا......تھا وہاں بے شمار تیلیاں ٹوٹی پڑی تھیں۔
میں پھر اپنی اسٹڈی میں مصروف ہو گیا۔ ہم جلد اول پچھلے ہفتے ختم کر چکے تھے اور ڈکسن کو بھی معلوم تھا کہ مجھے اب جلد دوم لانا ہے۔ میں دفتر سے واپسی پر لائبریری گیا اور جلد دوم اجرا کرالی۔
گھر آ کر میں نے آستینیں چڑھائیں اور پنسل کاغذ لے کر بیٹھ گیا۔ کتاب میرے سامنے کھلی ہوئی تھی۔ جب میں نے دوسرا صفحہ پلٹا تو مجھے وہ نظر آیا۔ اکثر لوگ پڑھتے پڑھتے کتاب پر لکھ دیتے ہیں۔ کسی نے شاید ایسی ہی عبارت لکھ دی تھی مگر......
یہ تو میرا نام تھا۔ گو کسی نے بہت گھسیٹ کر لکھا تھا مگر میں پہچان گیا......''ریڈ! پیغام ملنے کے بعد دس بجے رات میلام کے ہاں میرے فون کا انتظار کرنا......'' یہ اس قاتل ڈکسن کی تحریر تھی۔ وہ یقیناً دن میں کسی وقت لائبریری گیا ہوگا اور اس نے اسی کتاب پر پیغام لکھا ہوگا جو اسے معلوم تھا کہ میں لے جاؤں گا۔ یہ اس کی بہت بڑی غلطی تھی۔ میں لڑکیوں کے قاتلوں سے کوئی ہمدردی نہیں رکھتا۔
میں نے زور سے کتاب بند کردی اور فون کی طرف ہاتھ بڑھایا......پھر رک گیا......''نہیں'' پہلے میں اسے یہاں لاؤں گا تاکہ ہیلرا سے یہیں سے پکڑلے۔ میری غلطی کی تلافی اسی طرح ہو سکتی تھی۔
''میلام'' ایک بہت بڑی دواؤں کی دکان تھی جہاں ہم اکثر جاتے تھے۔ اس نے کوئی ٹیلی فون نمبر نہیں دیا تھا مگر وقت لکھا تھا اب میرا کام اس وقت پر اس جگہ پہنچنا تھا۔ باقی کام وہ خود کرے گا۔
میں دس بجے دکان میں موجود تھا۔ ٹھیک دس بجے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی دکاندار بڑھا۔ میں نے اسے روک دیا......'' یہ میرا فون ہوگا......''
اس نے خود ہی بات کی۔ ''تمہیں پیغام مل گیا......؟''
''ہاں!'' میں نے اپنی آواز پرسکون رکھنے کی کوشش کی تھی۔ ورنہ سارا کھیل بگڑ جاتا۔
''تم اکیلے ہو......تمہارا کوئی تعاقب تو نہیں کر رہا؟''
''قطعی نہیں......''
''مجھے تم سے ملنا ہے ریڈ! اخبارات میں اب کچھ نہیں آ رہا۔ تم ہی میرے واحد دوست ہو۔ میں بری طرح پھنس گیا ہوں۔ یہاں سے نکل بھی نہیں سکتا۔ کسی اور سے کہہ بھی نہیں سکتا۔''
''مجھ سے جو ہو سکا، میں کروں گا......'' میں نے وعدہ کیا۔
وہ جلدی جلدی بولنے لگا۔ ''لاول ایوینیو کی بس پکڑو۔ براڈلین اسٹاپ پر اترنا۔ وہاں ۳۰۵ نمبر کی عمارت ہے۔ جس کے نیچے درزی کی دکان ہے۔ ایک زینہ چڑھنا۔ ہیرس نام ہے۔'' پھر وہ توقف کے بعد بولا......''اگر کوئی پیچھے آ رہا ہو تو......''
''وہ لوگ مجھ سے مایوس ہو چکے ہیں۔ تم پریشان مت ہو، سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔'' اس نے ریسیور رکھ دیا تھا۔

☆☆☆

اس کی بہت بری حالت تھی۔ لگتا تھا جیسے وہ یہاں آنے کے بعد سویا ہی نہ ہو۔ کمرے میں سگریٹ کے بے شمار ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔ وہ تیار شدہ کھانا کھاتا رہا تھا اور سگریٹ پیتا رہا تھا۔

پھر وہ کمرے میں ٹہلنے لگا...... "یہ ناانصافی ہے۔ بلاقصور میرا کتے کی طرح پیچھا کیا جا رہا ہے۔ میں بے قصور ہوں اور دنیا میں صرف ایک شخص ہے جسے اس پر یقین ہے......"

"نہیں!" میں قطعیت سے بولا...... "تم مجھے ساری دنیا میں شامل کرلو...... اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے......"

یہ جملہ سن کر وہ چونک گیا اور پھر بستر پر بیٹھ کر اس نے گدے کا کونا پکڑ لیا۔

"دیکھو! اس رات جب میں واپس آیا تو تم ادھر سے ادھر چل رہے تھے، میں نے خود دیکھا تھا......"

"ہاں! اس بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ تم میری جگہ ہوتے تو اپنی محبوبہ کے چلے جانے پر یہی کرتے۔"

"میں نے چابی سے کھولنے کے بجائے دستک دی تو تم ڈر گئے۔ تم نے دروازہ ذرا سا کھول کر دیکھا۔ پھر مجھے دیکھ کر تم نے پورا دروازہ کھول دیا......"

"یہ بھی فطری ردِعمل تھا۔ میں کسی سے ملنا نہیں چاہتا تھا......"

"تم نے کہا تھا کہ تم اسے ٹیکسی پر بٹھانے گئے تھے مگر تمہارے جوتے خشک تھے......"

"وہ جھوٹ تھا مگر میں نے تمہیں اس کی وجہ بھی بتا دی تھی۔"

"تم نے کہا تھا کہ تم نے اس کے سیٹی بجانے کی آواز سنی تھی اور تم نے مجھے بھی یہی جھوٹ بولنے پر مجبور کیا۔ اس کی ماں کہتی ہے کہ وہ سیٹی بجا ہی نہیں سکتی تھی......"

وہ آنکھیں پھاڑ کر میری طرف دیکھنے لگا۔ "یہ مجھے نہیں معلوم تھا۔"

میرے ہونٹ سکڑ گئے۔ "وہ تمہاری محبوبہ تھی اور تمہیں یہ بات نہیں معلوم تھی؟"

"ایسا موقع کبھی نہیں آیا کہ وہ بتاتی اور پھر میں نے واقعی سیٹی کی آواز سنی تھی۔"

"کوئی چڑیا ہو گی......" میں نے کہا۔ "تم بارہ بجے پیگ پینے گئے۔ میکینز نے مجھے بتایا کہ تم وہاں دو بجے پہنچے تھے۔ تم آخر کیا کرتے رہے......؟"

"میں سڑک پر گھومتا رہا تھا۔ ایسے آدمی کی طرح جس کا کچھ کھو گیا ہو......"

"شاید یہ کھویا تھا......" میں نے دونوں بٹن اس کی طرف بڑھا دیے۔ "ایک بٹن گھر میں گرا تھا جو میں نے اٹھا کر میز پر رکھا تھا مگر تم نے اسے دیکھتے ہی غائب کر دیا......"

"ہاں!" اس نے سر جھکا لیا۔ "صورتِ حال پہلے ہی میرے لیے بگڑ چکی تھی۔ اسے بٹن مل جاتا تو کیا ہوتا؟ تم خود سوچ سکتے ہو۔ جب وہ جا رہی تھی تو میں نے اسے روکنے کی کوشش کی تھی مگر قتل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس نے اپنی برساتی کھینچی تو بٹن ٹوٹ گئے۔ آخر سب ہی حماقتیں کرتے ہیں۔ پھر میری ذرا سی حماقت کی اتنی سزا کیوں دی جائے۔"

"اور تم نے دو بٹن میکینز بار کی کھڑکی سے باہر پھینک دیے!"

"ہاں! یہ بھی میں نے غصے میں کیا تھا۔ تم خود سوچو ریڈ! اگر مجھے انہیں چھپانا تھا تو میرے پاس دو گھنٹے تھے۔ جب میں ٹہلتا رہا تھا، کہیں بھی پھینک دیتا۔ آخر مجھے بار ہی میں جا کر پھینکنے کی کیا ضرورت تھی......؟"

"ممکن ہے تمہیں اندر جا کر یاد آیا ہو کہ بٹن تمہارے پاس ہیں۔" میں نے ہاتھ ہلائے۔ "اب کوئی فائدہ نہیں ڈکسن! تم اب بھی مجھے قصوروار سمجھو گے اگر میں تمہیں اس لڑکی کا قاتل گردانوں؟"

"تو تم انہیں جا کر بتا دو گے کہ میں یہاں ہوں؟ جاؤ بتا دو......"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

"تو پھر...... تم کہاں جا رہے ہو......؟"

"اپنے گھر......" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا...... "اور تم بھی میرے ساتھ چلو گے!"

"اچھا!" اس نے کہا اور تب مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ مجھے پتا چل گیا کہ وہ گدے کا کونا کیوں پکڑے ہوئے تھا۔ اس نے نیچے ہاتھ ڈال کر ایک پستول نکالا۔ اس نے یقیناً پستول کا رخ میری طرف کیا اور بولا۔ "تم یہاں سے زندہ بچ کر نہیں جا سکو گے۔ اب میں اپنی زندگی کے لیے لڑ رہا ہوں۔ اگر تم میرے سگے بھائی بھی ہوتے تو......"

"بالآخر تم نے آخری ثبوت بھی فراہم کر دیا......" میں نے کہا۔ "جو شخص اپنے بہترین دوست پر پستول اٹھا سکتا ہے، وہ اپنی محبوبہ کو بھی مار سکتا ہے۔ اگر تم نے اسے قتل نہیں کیا تو تم میرے ساتھ جانے سے ڈرتے کیوں ہو......؟"

مجھے پتا نہیں تھا کہ وہ کس وقت پستول چلا دے گا۔ وہ کسی بھی لمحے ایسا کرسکتا تھا۔ وہ لوہے کے جس پلنگ پر بیٹھا تھا۔ اس کے پائے اندر فولڈ ہوجاتے تھے۔ ایک پایہ پوری طرح سیدھا نہیں تھا۔ میں نے اندر آتے ہی دیکھ لیا تھا لیکن اگر میں اس وقت حرکت کرتا تو وہ دیکھ لیتا۔ میں نے کہا۔ ''چلو! تم ہی اپنی خواہش پوری کرلو......'' یہ کہہ کر میں نے اپنی گردن پکڑ کر سر پیچھے ڈال دیا۔ اس کی توجہ میرے جسم کے اوپری حصے پر مبذول ہوگئی۔ میں نے موقع پاتے ہی پیر کو حرکت دی اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ سکتا' پلنگ کا ایک حصہ نیچے آچکا تھا۔ گولی چل گئی مگر نشانہ بدل چکا تھا۔ میرے ہاتھ اوپر اٹھے ہوئے تھے۔ گولی بغل کے نیچے سے نکل گئی۔ میں نے اس پر چھلانگ لگادی اور پستول چھین کر نیچے پھینک دیا۔

میں نے اس کی پٹائی شروع کردی جس سے پلنگ کا دوسرا حصہ بھی نیچے بیٹھ گیا۔ ہم دونوں لڑھکتے ہوئے نیچے آگئے۔ میں نے اسے گھونسوں پر رکھ لیا۔

پستول اٹھا کر میں نے جیب میں ڈال لیا تھا۔ کسی نے گولی چلنے کی آواز یا تو سنی نہیں تھی یا اس علاقے کے لوگ اپنے کام سے کام رکھنے کے عادی تھے۔ میں اسے لے کر باہر نکلا اور اس سے پہلے کہ اسے نیم بے ہوشی میں کچھ سمجھ آتا، میں اسے ٹیکسی میں ڈال کر گھر لے آیا تھا۔ دروازہ بند کر کے میں نے اسے اس کی پسندیدہ کرسی پر پھینک دیا۔

وہ ہلا تک نہیں۔ نہ منہ سے کچھ بولا۔ اس کی آنکھیں میرا تعاقب کررہی تھیں۔ ان میں التجا تھی......

''مجھے اس طرح مت دیکھو......'' میں نے کہا اور اپنے زخمی ہاتھوں پر آیوڈین لگانے لگا۔ میں نے اسے آیوڈین نہیں دی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ اسے پی جاتا۔ ''کیا تم سمجھتے ہو کہ مجھے، تمہیں ان کے حوالے کرنے میں خوشی ہوگی......'' یہ کہہ کر میں نے ٹیلی فون کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

وہ یہاں آنے کے بعد پہلی اور آخری بار بولا۔ ''کار! تم انسان نہیں ہو۔'' اس بار اس نے مجھے ریڈ نہیں کہا تھا جو وہ مجھے میرے سرخ بالوں کی وجہ سے کہتا تھا۔

''پولیس ہیڈ کوارٹر ملانا!'' میں نے اس کی بات پر توجہ نہ دیتے ہوئے آپریٹر سے کہا۔

اسی لمحے نیچے کہیں ایک سیٹی بجی اور کوئی عورت بولی...... ''اوہ ٹیکسی!''

پھر سیٹی بجی اور کسی گاڑی کے رکنے اور دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ میں نے ریسیور نیچے رکھ دیا اور کھڑکی کی طرف لپکا۔ میں ایک منٹ تاخیر سے پہنچا تھا ٹیکسی کی چھت تو نظر آئی مگر سیٹی بجانے والی اندر بیٹھ چکی تھی۔ اس کا ہاتھ باہر نکلا اور دروازہ بند ہوگیا۔

میں پوری قوت سے چلایا۔ ''ڈرائیور! ذرا روکنا۔''

اس نے اوپر دیکھا اور بولا...... ''ٹیکسی خالی نہیں ہے......''

میں نے اپنا کوٹ ہلایا...... وہ اتنی دور سے کچھ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ''پولیس!'' میں نے چیخ کر کہا اور سر اندر کرلیا۔ فون پر دوسری طرف کوئی چیخ رہا تھا...... ''کون ہے بھئی؟ بولو! میں پولیس ہیڈ کوارٹر سے بول رہا ہوں......''

میں نے ''ساری! رانگ نمبر'' کہہ کر فون رکھا اور ڈکسن کو اندر ہی مقفل کر کے دوڑا۔ ٹیکسی میں بیٹھی عورت پینتیس چھتیس سال کی تھی سنہرے بالوں والی۔ وہ سر باہر نکالے مجھے دیکھ رہی تھی۔

''آپ یہاں رہتی ہیں۔ اسی عمارت میں؟'' میں نے اس سے پہلے اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

''ہاں! سیکنڈ فلور پر۔ تین ہفتے قبل آئی ہوں۔''

''گزشتہ پیر کو رات گیارہ بجے کیا آپ نے اس دروازے پر ٹیکسی کو آواز دی تھی؟ جیسے ابھی سیٹی بجائی تھی...... اس روز بارش ہورہی تھی۔''

''ہاں!'' وہ فوراً بولی...... ''میں روز رات کو ٹیکسی کو آواز دیتی ہوں۔ بارش ہو یا نہ ہو۔ مجھے اپنے کام پر پہنچنا ہوتا ہے۔ میں ہر رات کیریکا کلب میں بارہ بج کر پانچ منٹ پر خصوصی پروگرام پیش کرتی ہوں۔ سیٹی اس لیے بجاتی ہوں کہ مجھے اس میں بڑی مہارت حاصل ہے۔ لیونورا میرا نام ہے اور......''

تو وہ سچ بول رہا تھا۔ اس نے واقعی سیٹی کی آواز سنی تھی۔ پھر اس نے ایک ٹیکسی دیکھی۔ جیسے میں نے ابھی دیکھی تھی۔ اور اسی سے سارا معاملہ مختلف ہوگیا۔ کتنے عجیب و غریب اتفاقات تھے جنہوں نے اس کی قسمت پر مہر لگادی تھی۔

وہ عورت کہہ رہی تھی...... ''مسٹر! اب مجھے جانا ہے اگر میری سیٹی کی آواز سے لوگ ڈسٹرب ہوتے ہیں تو میں آواز دے لیا کروں گی......''

''نہیں!'' میں نے ممنونیت سے کہا۔ ''آپ کی سیٹی نے تو ایک آدمی کی جان بچالی ہے۔ آپ جب واپس آئیں تو مجھ سے مل لیں۔ میرا نام کار ہے اور میں چوتھی منزل پر رہتا ہوں۔''

میں اوپر چلا آیا...... وہ اسی طرح بیٹھا ہوا تھا۔ شاید

اب وہ تھک چکا تھا۔

"تم میری نظر میں بے گناہ ہو۔" میں نے کہا۔ وہ مجھے گھورتا رہا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

"ہیلر نے مجھے بتایا تھا کہ وہ اتنا معلوم کر چکے ہیں کہ ایستیل سیڑھیوں پر آئی تھی۔ پھر کسی نے اسے پکڑ لیا ہوگا۔ اس کا گلا دبایا تو وہ بے ہوش ہوگئی۔ اسی لمحے یہ لیو نورا نکلی ہوگی۔ ایستیل اس وقت زندہ تھی مگر وہ یہ سمجھا کہ مر گئی ہے۔ گھبرا کر وہ اسے اوپر لے گیا اور کوڑے دان میں ڈال دیا۔ وہیں وہ مر گئی۔ اسی لمحے تم نے نیچے سیٹی کی آواز سنی۔ تم نے کھڑکیوں میں سے دیکھا اور اس عورت کو ایستیل سمجھے۔

"اب مسئلہ یہ ہے کہ وہ شخص کون تھا؟ وہ کوئی لیٹرا نہیں ہوسکتا۔ وہ یقیناً اس کا منتظر رہا ہوگا۔ وہ اس کا پیچھا کرتے ہوئے آیا ہوگا اور جب تک وہ اندر تمہارے ساتھ رہی، وہ باہر کھڑا رہا ہوگا اور اس نے اس کے یہاں آنے کا نہایت غلط نتیجہ نکالا ہوگا......!"

"ہاں!" وہ افسردگی سے بولا...... "وہ بار بار یہی کہہ رہی تھی کہ وہ مجھے چاہتی ہے۔ جب وہ باہر نکلی تو پھر واپس آئی۔ مجھے الوداعی پیار کیا اور بولی... جانی! تمہاری جگہ کوئی اور بھی نہیں لے سکے گا۔"

"یہ جملہ اس نے سن لیا ہوگا اور اس نے حسد کی آگ اور بھڑکا دی ہوگی۔ وہ تمہارا مقابلہ نہیں کرسکتا ہوگا اس لیے اس نے تمہارے اندر جانے کا انتظار کیا...... اور تب اسے پکڑا......"

ہم دونوں میں سے کسی نے اس کا نام نہیں لیا تھا مگر ہم دونوں اسے جانتے تھے لیکن صرف جاننے سے کیا ہوتا ہے۔ ہم دونوں خاموش ہو کر سوچنے لگے۔

میں سگریٹ سلگا کر ٹہلنے لگا اور وہ ناخن کترنے لگا۔ یہ اس کی مخصوص عادت تھی۔ پھر اسے کچھ خیال آیا تو منہ سے ہاتھ ہٹا کر بولا۔ "اس نے میری یہ عادت چھڑا دی تھی۔ یہ لڑکیاں اپنے محبوب کی ہر ناپسندیدہ عادت سب سے پہلے ختم کراتی ہیں اور اب میں پھر وہی حرکت کر رہا تھا۔ شاید اس لیے کہ اب منع کرنے والی نہیں رہی......"

میں کچھ نہ بولا......

"اور صرف یہی بات وہ ٹریمولٹ کی تعریف میں کہتی تھی کہ وہ تو کبھی ناخن نہیں کترتا، تم ایسا کیوں کرتے ہو؟"

میں رک کر اس کی طرف پلٹ پڑا۔ وہ چونک گیا...... "وہ نہیں کترتا۔ میں نے خود اس کے ناخن دیکھے ہیں...... اس کے تو ناخن نہ ہونے کے برابر تھے اور پھر تدفین کے دوران جب وہ نروس تھا تو... ماچس کی تیلیاں توڑ رہا تھا۔ اگر وہ ناخن کترنے کی عادت میں مبتلا ہوتا تو اس وقت بھی یہی کر رہا ہوتا۔ ایستیل صحیح کہتی تھی لیکن پھر اس نے اس کی موت کے فوراً بعد اپنے ناخن اس قدر کیوں کاٹ ڈالے؟"

پھر میں نے اپنے سوال کا جواب خود ہی دیا...... "اس لیے کہ ان میں کچھ لگا ہوا ہوگا...... شاید اس ڈرم کا چونا یا رنگ...... شاید ہم اسے اسی بنیاد پر گرفت میں لاسکیں۔"

"مگر کیسے؟" وہ اب بھی مایوس تھا۔ "ناخن تو اب ہیں نہیں۔ ان کے ساتھ چونے یا رنگ کے آثار بھی مٹ چکے ہوں گے۔"

"ممکن ہے ایسا نہ ہو۔" اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ "ارے ہاں! وہ جمعدار کہہ رہا تھا کہ کوڑے دانوں پر ابھی رنگ کرایا گیا ہے۔ ایک دو روز پہلے ہی تو وہ مجھے سیڑھیوں پر رنگ اور برش لیے ملا تھا۔ ٹھہرو! میں ابھی دیکھ کر آتا ہوں۔ تم یہیں رکو! کوئی تمہیں دیکھ نہ لے۔"

میں نے اوپر جا کر وہ کوڑے دان دیکھا جس میں ایستیل کو ڈالا گیا تھا۔ اس پر تازہ سبز رنگ کیا گیا تھا۔ اب یہ پتا نہیں تھا کہ رنگ اس واقعے سے پہلے کیا گیا تھا یا بعد میں۔ اگر پہلے کیا گیا تھا تو اس کے ناخنوں میں یہی تازہ رنگ لگ گیا ہوگا۔ میں نے یونہی ایک جگہ سے کھرچ کر دیکھا نیچے سے پرانا رنگ جھانکنے لگا تھا۔ میں بھاگتا ہوا تہ خانے میں آیا اور جمعدار سے پوچھا۔

"نہیں...... یہ قتل کے بعد کیا گیا ہے قتل والے دن میں آپ کے فلور تک پہنچا تھا۔ اگلے روز میں پانچویں منزل کے کوڑے دان پر کرتا۔ وہ چوتھی منزل والے کوڑے دان میں اسے نہیں ڈال سکتا تھا۔ کیونکہ میں نے اس کا دروازہ بند کردیا تھا تاکہ رنگ سوکھنے سے پہلے کوئی اسے ہاتھ نہ لگادے۔ اسی لیے وہ اسے اوپر کی منزل پر لے گیا جب پولیس والوں کا کام ختم ہوگیا۔ تب میں نے اسے رنگ کیا۔"

تو اس کا مطلب یہ تھا کہ اس کے ناخنوں پر تازہ رنگ نہیں لگا تھا جس کی وجہ سے اس نے انہیں کاٹ کر پھینک دیا۔ شاید ڈرم کا رنگ لگا ہو مگر جیسا کہ ڈکسن نے کہا جب ناخن ہی نہیں رہے تو ثابت کیا کیا جاسکے گا۔

میں اپنے فلیٹ میں واپس آگیا اور مایوسی سے ہاتھ پھیلا دیے اور اسی لمحے مایوسی کی انتہا پر مجھے ایک خیال آیا۔ کہتے ہیں کہ جب انسان بری طرح الجھ جائے اور مایوس ہو کر ہار مان لے تو الجھن کا حل خود بخود اس کے ذہن میں آجاتا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "تم بتا سکتے ہو کہ دوبارہ رنگ

کیے جانے سے پہلے کوڑے دان کا رنگ کیا تھا؟''

''نہیں...... میں وہاں کب جاتا ہوں؟''

''جب کہ تم یہیں رہتے ہو۔ مجھے بھی پتا نہیں تھا۔ ابھی میں نے اوپری سطح کھرچی تو اندر سے کوئی اور رنگ نکلا' میں اسی پر اسے پکڑنے کی کوشش کرتا ہوں۔ یہ ایک حربہ ہے مگر اس کے علاوہ اور کوئی ترکیب نہیں ہے۔''

وہ حیران ہو کر مجھے دیکھنے لگا۔

''اس رات اس کا رنگ زرد تھا اور پولیس نے اسے دو دن تک رنگ نہیں کرنے دیا۔ اب اگر وہ ایسٹیل کو وہاں لے کر نہیں گیا تو اسے اس بات کا علم بھی نہیں ہوگا۔'' یہ کہہ کر میں نے فون اٹھالیا اور جب میں نے ہیڈ کوارٹر کا نمبر مانگا تو وہ پریشان نظر آنے لگا۔ ''تم مطمئن رہو ڈکسن!'' میں نے اس کی ڈھارس بندھائی۔ جب ہیلر لائن پر آگیا تو میں نے اس سے کہا......

''آپ مجھ سے مسز مشل کے ہاں مل سکتے ہیں۔ میں آپ کو کچھ بتانا چاہتا ہوں۔''

میں ڈکسن کو وہیں چھوڑ کر اور روشنی نہ کرنے کی ہدایت دے کر وہاں سے چل پڑا۔

مسز مشل کے دروازے پر مجھے ہیلر کو قائل کرنے میں بڑی دشواری ہوئی۔ وہ کچھ سننے پر تیار نہ تھا۔

''میں آپ سے صرف اتنی درخواست کر رہا ہوں کہ میں جو کچھ کہوں' آپ اس کی تردید نہ کریں تاکہ ایسا معلوم ہو جیسے یہ آپ کے اشارے پر کہہ رہا ہوں۔ آپ سنیے گا وہ کیا کہتا ہے؟ آپ کو یقین ہے کہ اس واقعے کے بعد وہ اس کوڑے دان کے قریب نہیں گیا؟''

''وہ کیا، کوئی پرندہ بھی وہاں پر نہیں مار سکتا تھا۔''

''بس تو ٹھیک ہے۔'' میں نے گھنٹی بجائی۔ ٹریمولٹ نے دروازہ کھولا اور ہم دونوں اندر آگئے۔ میں اندر سے بری طرح کانپ رہا تھا۔ مجھے ایک دھاگے کا سہارا ملا تھا اور میں اس پر عمارت کھڑی کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ٹریمولٹ بڑا پرسکون نظر آرہا تھا۔ اس کے ناخن پھر بڑھنے لگے تھے۔ اس کا مطلب صاف تھا کہ وہ باقاعدہ دانتوں سے ناخن کترنے کا عادی نہیں تھا۔ اب مجھے اس کے ذہن کو تھوڑا سا چکرانا تھا تاکہ وہ چند لمحوں کے لیے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہو جائے۔ میں دھیرے دھیرے کہانی بناتا ہوا ٹیمپو تیز کرتا رہا۔ یہاں تک میں نے براہ راست حملہ کر دیا۔

''یہ تم تھے۔ ہمیں شروع سے معلوم تھا۔'' میں خوفزدہ تھا کہ کہیں ہیلر تردید نہ کر دے مگر اس نے وعدے کا پاس کیا اور چپ چاپ بیٹھا رہا۔

''تمہارا کمرا بالکل سامنے کی طرف ہے اور مسز مشل کا پیچھے کی طرف۔ اس نے تمہیں آٹھ بجے اندر آتے دیکھا تھا۔ اس کے بعد تم اس کے علم میں لائے بغیر ہزار بار نکل کر اندر آسکتے تھے۔ تمہارے پاس اپنی چابی تھی اور پھر مسز مشل دوبارہ اس وقت تمہارے پاس آئی جب آدھی رات گزرنے کے باوجود ایسٹیل واپس گھر نہ لوٹی۔''

میں نے اندازہ لگایا کہ اب لوہا گرم ہو چکا ہے گو بہ ظاہر وہ اب بھی پُرسکون تھا مگر وہ اضطراری طور پر ماچس کھول رہا تھا۔ یہ ابتدا تھی۔ ''اور تم نے اپنے ناخن اس قدر گہرے کترنے کی ضرورت کیوں محسوس کی؟'' پھر میں نے اسے سوچنے کی مہلت دیے بغیر حملہ کر دیا۔ ''میں بتاتا ہوں۔ اس لیے کہ تمہارے ناخنوں پر کوڑے دان کا نیلا رنگ لگ چکا تھا۔''

وہ اب بھی پُرسکون رہا۔ ''کیا کہنے؟ تم مجھے گھیرنا چاہتے ہو۔ اس کوڑے دان کا رنگ نیلا نہیں بلکہ زرد تھا اس لیے میں کس طرح......''

میں خاموش ہو گیا۔ اب مجھے کچھ بولنے کی ضرورت نہیں تھی۔

ہیلر صرف اتنا بولا۔ ''یہ بات تمہیں معلوم ہونا چاہیے تھی۔'' اور کرسی سے اٹھ گیا۔

☆☆☆

میں گھر پہنچا تو صبح ہونے والی تھی۔ ''آؤ یار! میں تمہیں ہیڈ کوارٹر لے جانے آیا ہوں۔'' میں نے ڈکسن کو مخاطب کیا جو شاید تمام رات ایک لمحے کو بھی نہ سو سکا ہوگا۔ وہ میری بات سن کر مزید خوفزدہ ہو گیا۔

''اب ڈرنے کی ضرورت نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''سارا بھید کھل چکا ہے۔ ٹریمولٹ اچھی طرح گرفت میں آچکا ہے۔ میں نے وعدہ کیا تھا کہ میں تمہیں پیش کروں گا۔ اس لیے میں تمہیں لینے آیا ہوں۔''

نیچے اترتے ہوئے میں نے اس سے کہا۔ ''اس نے تمہیں پھنسانے کی کوشش کی تھی مگر اس کوشش میں وہ اکیلا نہیں تھا۔''

''تو اور کون تھا اس کے ساتھ......؟'' اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

''تم خود تھے...... میں نے آج تک ایسا شخص نہیں دیکھا جو خود کو دلدل میں دھنسانے کی اتنی کوشش کر رہا ہو......''

ان دنوں برصغیر میں ہر قسم کے لوگ کھنچے چلے آرہے تھے۔ تجارت پیشہ، ہنر مند، کاریگر، جنگ جو، عالم اور صوفی، مغل سلطنت اپنے عروج کو پہنچ چکی تھی۔ جلال الدین اکبر کا عہدِ حکومت تھا اور ابھی دینِ الٰہی وجود میں نہیں آیا تھا۔ انہی دنوں سمرقند سے خواجہ عبدالسلام نامی ایک بزرگ اپنے بال بچوں کے ساتھ برصغیر میں داخل ہوئے اور دہلی کے قریب نریلہ نامی ایک بستی میں مقیم ہو گئے۔ اپنے کردار اور گفتار کی وجہ سے لوگوں نے انہیں اپنے دلوں میں جگہ دی اور آنکھوں پر بٹھایا۔ ان کی علمیت

ابوالعلیٰ
قطبِ دوراں

ضیا تسنیم بلگرامی

ہر عہد میں نیکی اور بدی نے اپنے اپنے کرداروں کو اتنی خوبی سے نبھایا ہے کہ کہیں کوئی کمی محسوس نہیں ہوتی... اگر بدی نے کسی کو اپنی گرفت میں قید کیا تو اسے مکمل تباہ وبرباد کرڈالا۔ اسی طرح جب نیکی نے اپنے حصار میں پناہ دی تو اسے مٹی سے سونا بنا دیا... آپ کا تعلق بھی اسی قبیلے سے تھا جنھوں نے اپنے رب العزت کی رسّی کو مضبوطی سے تھاما اور تمام تر دشواریوں کو بہ آسانی عبور کرلیا... یہی اس کی شانِ بے نیازی کا کرشمہ ہے کہ ذرّے کو آفتاب بنادیتا ہے... لیکن یہ تو وہ ذرّہ ہی جانتا ہے کہ آفتاب بننے کا رستہ کن کن آزمائشوں سے گزر کر طے کیا گیا۔

مسلم تھی۔ زبان میں تاثیر تھی جس سے مخاطب ہوتے، اپنا بنا لیتے۔ جس کے کان میں ان کی آواز پڑ جاتی وہ والہ وشیدا ہو جاتا۔

کچھ عرصہ نریلہ میں رہ کر فتح پور سیکری کا رخ کیا۔ وہاں قیام کر کے آگے کا ارادہ کیا کیونکہ وہ ان مقامات مقدسہ کی زیارت کرنا چاہتے تھے جن کے دم قدم سے ہندوستان میں اسلام پھیلا تھا اور جن کے روحانی فیوض و برکات نے ایک زمانے کو اپنا اسیر بنا رکھا تھا۔ خواجہ عبدالسلام کا شہرہ جلال الدین اکبر کے کانوں تک پہنچ چکا تھا۔ بعض امرائے دربار بھی خواجہ عبدالسلام کے ارادت مند تھے۔ بادشاہ نے ان سے پوچھا۔ ”کیا تم میں کوئی بھی خواجہ عبدالسلام سے واقف ہے؟“

کئی امیروں نے ہامی بھری اور واضح لفظوں میں بتایا کہ آج کون ہے جو خواجہ عبدالسلام سے واقف نہیں۔

بادشاہ نے کہا۔ ”میں نے سنا ہے وہ بہت بڑے عالم اور صوفی بزرگ ہیں؟“

ایک امیر نے جواب دیا۔ ”اس میں کیا شک! بلاشبہ وہ بہت بڑے عالم ہیں۔“

بادشاہ نے تردد سے کہا۔ ”میں نے سنا ہے وہ فتح پور سیکری سے کہیں اور چلے جانا چاہتے ہیں۔“

کسی دوسرے امیر نے جواب دیا۔ ”اگر وہ کہیں جانا چاہیں گے تو انہیں روک بھی کون سکتا ہے۔ ممکن ہے ان کا دل ہندوستان سے بھر گیا ہو اور وہ یہاں سے چلے جانا چاہتے ہوں۔“

بادشاہ نے کہا۔ ”لیکن میں انہیں نہیں جانے دوں گا، چاہے وہ کیسی بھی کوشش کریں۔“

امراء خوفزدہ ہو گئے کہ معلوم نہیں بادشاہ کا ان باتوں سے مطلب کیا ہے۔ انہیں خوف تھا کہ کہیں بادشاہ خواجہ عبدالسلام سے ناراض تو نہیں ہے۔ ایک امیر نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ ”کیا حضور کو خواجہ عبدالسلام کی کوئی بات گراں گزری ہے؟“

بادشاہ نے جواب دیا۔ ”نہیں، میں خواجہ کی عزت کرتا ہوں اور میں اس بزرگ کو یہاں سے اس لیے نہیں جانے دوں گا کہ میں ان کی قربت میں سعادت محسوس کرتا ہوں۔“

امراء کی جان میں جان آئی۔ جب خواجہ عبدالسلام کو یہ معلوم ہوا کہ بادشاہ انہیں کہیں اور نہیں جانے دے گا اور ان کی قربت کو اپنے حق میں سعادت سمجھتا ہے تو یہ خود ہی رک گئے اور فتح پور سیکری میں مستقل اقامت اختیار کی۔ بادشاہ کو ان کی اقامت سے بڑی خوشی حاصل ہوئی۔

کچھ عرصے بعد خواجہ عبدالسلام نے بادشاہ سے حج بیت اللہ پر جانے کی اجازت چاہی جو دے دی گئی۔ خواجہ عبدالسلام نے سرزمین حجاز ہی میں انتقال فرمایا۔ ان کے بعد ان کے بیٹے امیر ابوالوفا نے باپ کی جانشینی کی اور ارادت مندوں نے انہیں اپنا مرجع بنا لیا لیکن یہ بھی زیادہ عمر لے کر نہیں آئے تھے۔ فتح پور سیکری ہی میں ان پر درد قولنج کا دورہ پڑا اور اسی میں ان کا انتقال ہو گیا۔ امیر ابوالوفا نے اپنی نیابت کے لیے ایک کمسن بچہ چھوڑا تھا، اس کا نام تھا امیر ابوالعلیٰ۔

اس کمسن بچے کی تعلیم و تربیت کی ذمے داری ان کے نانا خواجہ محمد فیض کے سر پڑی۔ وہ ان دنوں بردوان (بنگال) میں ناظم تھے چنانچہ نانا نے اپنے نواسے کو بردوان ہی بلوا لیا۔ انہوں نے امیر ابوالعلیٰ کی تعلیم و تربیت پر بڑی توجہ دی۔ ان کی ذہانت، حافظے اور فہم و ادراک کا یہ عالم تھا کہ جو کچھ بتایا یا پڑھایا جاتا، ازبر ہو جاتا۔ نانا کو بڑی خوشی تھی کہ اتنا لائق اور ہونہار نواسہ ان کی سرپرستی میں پرورش پا رہا تھا۔

بنگال کی صوبے داری راجا مان سنگھ کے سپرد تھی۔ امیر ابوالعلیٰ کے نانا خواجہ محمد فیض، مان سنگھ ہی کے ملازم تھے۔ راجا مان سنگھ نے امیر ابوالعلیٰ کو کئی بار دیکھا اور ان سے باتیں کر کے اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ نوعمر امیر ابوالعلیٰ ایک نہ ایک دن بڑی شہرت کا حامل ہوگا۔ اس نے امیر ابوالعلیٰ کے نانا سے کہا۔ ”خواجہ فیض! آپ کا نواسہ غیر معمولی شخصیت کا حامل معلوم ہوتا ہے اس لیے آپ اگر میری بات مانیں تو ان صاحبزادے کو کسی اعلیٰ منصب پر فائز کرا دیں۔“

نانا نے جواب دیا۔ ”راجا جی! جب تک میں زندہ ہوں، اپنے نواسے پر کسی قسم کی ذمے داری کا بوجھ نہیں ڈالنا چاہتا۔ اس کو ذرا اور بڑا ہو لینے دیجیے پھر تو میں خود ہی اس کی سفارش کر کے کسی اعلیٰ منصب پر فائز کرا دوں گا۔“

راجا مان سنگھ نے کہا۔ ”جیسی آپ کی مرضی، ورنہ میں اس نوعمر کے لیے بڑے اچھے جذبات رکھتا ہوں۔“

نانا خواجہ فیض نے اپنے نواسے کو زمانے کے دستور کے مطابق فن سپاہ گری بھی سکھائی اور امیر ابوالعلیٰ نے اس میں خاصی شہرت حاصل کر لی۔

اسی دوران خواجہ فیض کو راجا مان سنگھ کی طرف سے ایک مہم میں جانا پڑا۔ وہاں گھمسان کا رن پڑا جس میں خواجہ فیض شہید ہو گئے۔ جب یہ خبر امیر ابوالعلیٰ کو پہنچی تو بہت پریشان ہوئے کیونکہ اب ان کا کوئی سرپرست نہیں رہ گیا تھا۔ راجا مان سنگھ

بہ نفسِ نفیس خود چل کے امیر ابوالعلیٰ کے پاس پہنچا اور ان سے تعزیت کی۔ امیر ابوالعلیٰ نے جواب میں کہا۔ "راجا جی! مشیت ایزدی پوری ہوگئی، ہم آپ کیا کرسکتے ہیں۔ میں تو ہر حال میں صابر و شاکر ہوں۔"

راجا مان سنگھ نے امیر ابوالعلیٰ کی باتوں میں عظمت محسوس کی، کہا۔ "صاحبزادے! میں تم سے کوئی وعدہ تو نہیں کر رہا ہوں لیکن میں تمہارے لیے جو جذبات رکھتا ہوں، اس کا عنقریب عملی اظہار کروں گا۔"

امیر ابوالعلیٰ خاموش ہوگئے۔ کئی ماہ بعد راجا مان سنگھ ان کے پاس دوبارہ آیا اور کہا۔ "صاحبزادے! میرا خیال ہے علم وفضل اور فنونِ سپاہ گری میں تم بہتوں پر فوقیت رکھتے ہو چونکہ تمہارے نانا خواجہ فیض مرحوم کوئی بیٹا نہیں رکھتے تھے اور انہوں نے تم کو ہی بیٹوں کی طرح پالا پوسا تھا، اس لیے میں منصب نظامت پر تمہارے نانا کی جگہ تم کو فائز کر رہا ہوں۔ اس سلسلے میں میں نے بادشاہ سے باقاعدہ منظوری بھی حاصل کرلی ہے۔ میں چاہتا تو یہ منصب اسی وقت تمہیں دے دیتا جب تمہارے نانا شہید ہوئے تھے لیکن میں مضبوط کام کرنا چاہتا تھا اور اب جبکہ بادشاہ نے بھی تحریری منظوری دے دی ہے تو تم اپنے نانا کے منصب پر پختہ ہوگئے ہو۔"

اس طرح نوعمر امیر ابوالعلیٰ کو بادشاہ کی طرف سے منصب سہ ہزاری ذات وسوار حاصل ہوگیا۔ دیکھنے والوں کو حیرت تھی کہ اس قدر نوعمری میں بادشاہ اور راجا مان سنگھ نے امیر العلیٰ کو عہدۂ نظامت کیونکر عطا کردیا لیکن جب ان کا کام دیکھا تو اور دنگ رہ گئے۔ یہ اپنے فرائضِ منصبی کو جس دیانت، فراست اور لیاقت سے انجام دے رہے تھے، بڑے بڑے آزمودہ کار بھی ان کے مدمقابل نہیں ٹھہرتے تھے۔

چند سال بعد امیر ابوالعلیٰ کو اپنے اندر ایک بے چینی سی محسوس ہونے لگی۔ وہ اپنے منصب سے مطمئن نہیں تھے۔ انہیں دنیاداری بری لگنے لگی۔ جاہ وحشمت سے نفرت سی محسوس ہونے لگی۔ اس بے چینی اور اکتاہٹ میں ایک شب انہوں نے خواب میں دیکھا کہ ان کے پاس تین بزرگ تشریف فرما ہیں۔ امیر ابوالعلیٰ ان سے نظریں ملاتے ہوئے گھبرا رہے تھے۔ ایک بزرگ نے ان سے پوچھا۔ "سید ابوالعلیٰ! ایک بات تو بتا؟"

انہوں نے شرما کر کہا۔ "کون سی بات؟ پوچھیے تو۔"

بزرگ نے کہا۔ "تو نے یہ کیسی وضع اختیار کر رکھی ہے؟ کیا دنیا اور جاہ وحشمت واقعی اتنی دلچسپ اور مزے کی چیزیں ہیں جن میں آدمی اپنی زندگی گزار دے۔"

ابوالعلیٰ نے پوچھا۔ "پھر میں کیا کروں؟"

بزرگ نے جواب دیا۔ "اپنی موجودہ وضع قطع کو ترک کر کے ہماری روش اختیار کرو۔"

ابوالعلیٰ نے عرض کیا۔ "اور فکرِ معیشت؟ زندہ رہنے کے لیے کوئی کام تو کرنا ہی پڑے گا۔"

بزرگ نے جواب دیا۔ "سید ابوالعلیٰ! اللہ زمینوں اور آسمانوں کا نور ہے۔ اپنے دل میں خدشوں اور وسوسوں کو کوئی جگہ نہ دو۔"

اتنا کہہ کے ان بزرگ نے استرہ نکالا اور اس سے ان کے سر کے بال صاف کردیے۔ دوسرے بزرگ نے آگے بڑھ کر ان کا لباس اتار پھینکا اور اس کی جگہ کفنی پہنا دی۔ تیسرے بزرگ نے آگے بڑھ کر ان کے سر پر ایک عمامہ رکھ دیا اور پھر تینوں نے ان سے کہا۔ "ہم تینوں نے تو اپنے اپنے حصے کا کام کردیا۔ آگے تم جانو اور تمہارا کام۔"

امیر ابوالعلیٰ کی آنکھ کھلی تو ان کی بے چینی دور ہوچکی تھی اور انہیں ایک عجیب سی طمانیت حاصل ہوچکی تھی۔ صبح انہوں نے پہلا کام یہ کیا کہ حجام کو بلوا کر سر کے بال کٹوا دیے۔ عہدۂ نظامت کا لباس اتار پھینکا اور ایک معمولی لباس زیب تن کیا۔ اب ان کا کسی کام میں جی نہیں لگ رہا تھا، دنیا ہیچ نظر آتی تھی۔ کاروبارِ دنیا سے دل بے زار ہوچکا تھا۔ اسی حالت میں یہ راجا مان سنگھ کے پاس پہنچے۔ وہ اچانک انہیں اپنے روبرو دیکھ کر یہ سمجھا کہ شاید ان پر کوئی افتاد آن پڑی ہے، اس کا حل معلوم کرنے تشریف لائے ہیں، پوچھا۔ "ابوالعلیٰ! کیا بات ہے؟ خیریت تو ہے، یہ بے وقت کی تشریف آوری کیسی؟"

ابوالعلیٰ نے عرض کیا۔ "راجا جی! آپ نے مجھے میرے نانا کے منصب پر فائز کر کے جو احسان کیا تھا، میں چاہتا ہوں اسے آپ کو واپس کردوں۔"

راجا مان سنگھ نے حیرت سے پوچھا۔ "میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا، تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

ابوالعلیٰ نے جواب دیا۔ "راجا جی! میں محسوس کر رہا ہوں کہ میں اس منصب کا اہل نہیں ہوں۔"

راجا مان سنگھ یہ سمجھا شاید ابو العلیٰ سے کوئی غلط سلط کام ہوگیا ہے اس سے دل برداشتہ ہوکر ایسی باتیں کر رہے ہیں، جواب دیا۔ ”صاحبزادے! آپ اس منصب کے اہل ہیں یا نہیں ہیں، یہ فیصلہ تو میں کروں گا، بادشاہ کرے گا۔ وہ لوگ کریں گے جو آپ سے متعلق ہیں اور جن کا شب و روز آپ سے واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ اگر آپ سے کوئی اونچ نیچ ہوگئی ہو تو بتائیے، میں اس کا حل نکال دوں گا اور اس کا تدارک کر دیا جائے گا۔“

ابو العلیٰ نے جواب دیا۔ ”راجا جی! مجھ سے چند ایسی غلطیاں ہوگئی ہیں جن کا آپ تدارک نہیں کر سکتے اس لیے میں اپنے آپ کو عہدۂ نظامت کا اہل نہیں سمجھتا۔“

راجا مان سنگھ نے پوچھا۔ ”صاحبزادے! آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟“

ابو العلیٰ نے عرض کیا۔ ”میں چاہتا ہوں، مجھ کو عہدۂ نظامت سے سبکدوش کر دیا جائے۔“

راجا مان سنگھ کی نظر میں یہ ایک غیر معمولی مطالبہ تھا، جواب دیا۔ ”ابو العلیٰ! میں آپ کا احترام کرتا ہوں۔ آپ جانتے ہیں کہ جس منصب پر آپ فائز ہیں، وہ کوئی معمولی منصب نہیں ہے اور اس پر ہمیشہ جہاں دیدہ آزمودہ اور تجربے کار لوگوں کو فائز کیا جاتا ہے۔ میں نے آپ میں معلوم نہیں کیا دیکھا تھا جو بادشاہ سے یہ منصب آپ کو دلا دیا اور آپ اس کی ناقدری کر کے اسے چھوڑ دینا چاہتے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں آخر کیوں؟ اس کی کوئی خاص وجہ؟“

ابو العلیٰ نے کہا۔ ”راجا جی! جب آپ نے مجھے یہ منصب عطا فرمایا تھا، میں بہت خوش ہوا تھا لیکن اب میں خود کو دنیا اور کاروبارِ دنیا سے نفور اور بےزار محسوس کرتا ہوں اس لیے اپنے عہدے سے مستعفی ہو جانا چاہتا ہوں۔“

راجا مان سنگھ نے آپ کو ٹٹولنا چاہا، بولا۔ ”میں آپ کی لیاقت اور قابلیت سے اچھی طرح واقف ہوں۔ اگر آپ پسند کریں تو میں بادشاہ سے سفارش کر کے آپ کو کوئی اس سے بھی بڑا منصب دلوا سکتا ہوں۔“

ابو العلیٰ نے جواب دیا۔ ”اگر آپ میرا استعفا منظور فرمالیں گے تو میں آپ کا بہت شکریہ ادا کروں گا۔“

راجا مان سنگھ نے ایک بار پھر سمجھانے کی کوشش کی۔ ”سید صاحب! آپ اپنے فیصلے پر نظرثانی کیجیے۔ آپ جو کچھ کر رہے ہیں اس سے آپ کو نقصان پہنچ جائے گا۔“

ابو العلیٰ نے جواب دیا۔ ”راجا جی! یہ اپنی اپنی سوچ کی بات ہے ورنہ میں تو اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اب تک میں نے جو کچھ کیا ہے، اس سے مجھے نقصان پہنچا ہے۔ میں مزید نقصان کا متحمل نہیں ہوسکتا۔“

مان سنگھ نے آپ کا استعفا لے کر رکھ لیا، کہا۔ ”میں آپ کا استعفا اپنے پاس رکھے لیتا ہوں اور آپ کو سوچنے کا کچھ اور وقت دے رہا ہوں ممکن ہے چند دنوں بعد آپ اپنے اس فیصلے پر شرمسار اور نادم ہوں، اس وقت آپ اپنا یہ استعفا واپس لے سکتے ہیں۔“

ابو العلیٰ نے کہا۔ ”راجا جی! افسوس کہ آپ میری بات سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کر رہے۔ میں نے یہ استعفا بہت سوچ سمجھ کر دیا ہے براہِ کرم آپ اس کو منظور فرما کر مجھے سبکدوش فرما دیں۔“

راجا مان سنگھ نے کہا۔ ”افسوس کہ میں بھی بہت مجبور ہوں، جب تک مجھے آپ جیسا کوئی اور شخص اس منصب کے لیے نہیں مل جاتا، میں آپ کا استعفا نہیں منظور کر سکتا۔“

آپ کو راجا مان سنگھ کی حیل حجت سے دکھ پہنچا اور عاجزی سے فرمایا۔ ”راجا جی! میرا دل نہ دکھائیے، میرا استعفا منظور کر لیجیے۔“

راجا مان سنگھ نے جواب دیا۔ ”سید صاحب! آپ بھی میری بات نہیں سمجھ رہے ہیں۔ اس وقت میں بڑی اہم مہم میں الجھا ہوا ہوں، جب تک ادھر سے فراغت نہ مل جائے، میں آپ کا استعفا نہیں منظور کر سکتا۔“

آپ نے طوعاً و کرہاً راجا کی بات مان لی۔

چند دنوں بعد راجا مان سنگھ نے آپ کو طلب کیا اور کہا۔ ”سید صاحب! میں نے آپ سے جس مہم کا ذکر کیا تھا اس کا وقت آچکا ہے۔ مینا پور کے میدان میں باغیوں کی فوجیں جمع ہو رہی ہیں اور مجھ کو کسی غیبی طاقت نے یہ بتایا ہے کہ اگر یہ مہم آپ کی سرکردگی میں لڑی گئی تو ہم کامیاب ہو جائیں گے ورنہ ناکام رہیں گے۔ آپ کو اس مہم میں شاہی افواج کی سالاری کرنا ہے چنانچہ اب آپ تیار ہو جائیں۔“

دم مارنے کا چارہ نہ تھا۔ آپ نے راجا مان سنگھ کی بات مان لی اور شاہی افواج کو لے کر مینا پور روانہ ہوگئے۔ وہاں

باغی آپ کا انتظار کر رہے تھے۔ شاہی افواج کو دیکھتے ہی حملہ آور ہو گئے۔ آپ نے ان کے حملوں کو نہایت پامردی اور ہوشیاری سے روکا اور خود جوابی حملہ کر دیا۔ گھمسان کا رن پڑا اور شام سے پہلے ہی باغیوں کو پسپا کر دیا۔ انہوں نے راہِ فرار اختیار کی تو آپ نے ان کا تعاقب کیا اور بیشتر باغیوں کو زندہ گرفتار کر لیا۔ راجا مان سنگھ کو یہ خبر پہنچی تو وہ بہت خوش ہوا۔

آپ فتح کا نقارہ بجاتے ہوئے بردوان میں داخل ہوئے تو یہاں آپ کا شاندار استقبال کیا گیا۔ راجا مان سنگھ نے آپ کو سینے سے لگا لیا اور کہا۔ ''صاحبزادے! آپ میرے کہنے سے اپنے استعفے پر نظرِ ثانی کیجیے، میرا دل نہیں چاہتا کہ آپ کو سبکدوش کر دوں۔ آپ بہت لائق نوجوان ہیں۔''

ابوالعلیٰ نے جواب دیا۔ ''راجاجی! میں نے آپ کا کام کر دیا، آپ بھی اپنا وعدہ پورا کیجیے۔ میں دنیا سے بے زار ہوں اور اس سے کنارہ کشی اختیار کرنا چاہتا ہوں۔''

مان سنگھ نے کہا۔ ''آپ ابھی صاحبزادے ہیں، یہ عمر ترکِ دنیا کی نہیں۔''

ابوالعلیٰ نے بڑے تحمل سے کام لیا، فرمایا۔ ''راجاجی! جو قوتیں مجھے دنیا سے بے زار کر رہی ہیں، ان میں یہ طاقت بھی ہے کہ وہ آپ کو یا بادشاہ کو میرا استعفا قبول کرنے پر مجبور کر دیں۔''

مان سنگھ نے جواب دیا۔ ''اگر یہ بات ہے تو میں ان نادیدہ قوتوں کے دباؤ کا انتظار کروں گا اور جب تک میں ان کے دباؤ میں آکر استعفا منظور نہ کر لوں، آپ اپنا کام کرتے رہیے۔''

ابوالعلیٰ اپنے گھر واپس آ گئے اور بہت اداس رہنے لگے' جب تک استعفا منظور نہ ہو جاتا وہ بردوان سے ہل بھی نہیں سکتے۔

وہ انتہائی مغموم اور فکرمند رات کو اپنے بستر پر سو گئے تو خواب میں پہلے تینوں بزرگوں کے ساتھ ایک اور بزرگ بھی نظر آئے۔ یہ چوتھے بزرگ سب سے زیادہ نورانی شکل و صورت رکھتے تھے۔ ان کا چہرہ آفتاب کی طرح روشن اور ماہتاب کی طرح ٹھنڈا تھا۔ ان میں سے ایک بزرگ نے آگے بڑھ کر انہیں مخاطب کیا۔ ''ابوالعلیٰ! تو نے یہ کیسی روش اختیار کر رکھی ہے، اپنی آبائی روش کیوں نہیں اختیار کرتا؟''

ابوالعلیٰ نے عرض کیا۔ ''حضرت! میں کیا کروں۔ میں نے کئی بار کوشش کی کہ میرا استعفا منظور کر لیا جائے لیکن راجا مان سنگھ ہر بار ٹال دیتا ہے۔ میں کمبل کو کس طرح چھوڑ دوں۔ کمبل نے تو مجھے پکڑ رکھا ہے، کسی طرح چھوڑتا ہی نہیں۔''

ایک بزرگ نے جواب دیا۔ ''ابوالعلیٰ! مت گھبرا۔ ہم نے اس کا بھی انتظام کر دیا ہے۔''

ابوالعلیٰ نے بے صبرے پن سے پوچھا۔ ''حضرات! وہ کس طرح؟''

جواب دیا۔ ''بردوان تیرا دامن پکڑے ہوئے ہے اور ہم بردوان ہی سے تیرا پیچھا چھڑا دیں گے۔''

اس کے بعد ابوالعلیٰ کی آنکھ کھل گئی اور دنیا سے بے زاری میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔ انہوں نے ایک بار پھر راجا مان سنگھ پر دباؤ ڈالا کہ ان کا استعفا منظور کر لیا جائے لیکن مان سنگھ نے ایک بار پھر انہیں ٹال دیا۔ اب آپ کو خواب کی تعبیر کا انتظار تھا۔ آپ کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ آخر بردوان ان کا پیچھا کس طرح چھوڑے گا۔

ایک شب اچانک راجا مان سنگھ کا ہرکارہ ابوالعلیٰ کے پاس آیا اور عرض کیا کہ راجاجی نے انہیں فوراً ہی طلب فرمایا ہے۔

ابوالعلیٰ اسی وقت راجا مان سنگھ کے پاس چلے گئے اور پوچھا۔ ''اس بے وقت طلبی کا کوئی خاص مقصد ہے کیا؟''

راجا مان سنگھ بہت اداس تھا۔ ایسا لگتا تھا گویا بس رونے ہی والا ہے۔ ابوالعلیٰ کا ماتھا ٹھنکا اور اندازہ لگا لیا کہ یہاں کوئی خاص بات ضرور ہے، پوچھا۔ ''راجاجی! آپ نے کچھ بتایا نہیں۔ آپ نے اس رات کے اندھیرے میں کیوں طلب فرمایا ہے؟''

راجا مان سنگھ کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ ایک طرف بیٹھ جانے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''صاحبزادے! بیٹھ جائیے۔ اصرار نہ کریں، ابھی بتاتا ہوں۔''

ابوالعلیٰ راجا مان سنگھ کے سامنے بیٹھ گئے۔ راجا مان سنگھ نے اپنی جیب سے رومال نکالا اور آنکھوں کے گوشوں کو خشک کر کے کہنا شروع کیا۔ ''سید صاحب! شہنشاہ اکبر کی بابت تمہاری کیا رائے ہے؟''

ابوالعلیٰ نے جواب دیا۔ ''شہنشاہ اکبر اس ملک کا حکمراں ہے اور ہم سب اس کے نمک خوار ہیں۔''

راجا مان سنگھ نے کہا۔ "تو یہ منحوس خبر بھی سن لیجیے کہ ہمارے ولی نعمت کا انتقال ہوگیا۔ شہنشاہ اکبر سورگ باشی ہو گئے اور اب ان کی جگہ ان کے بیٹے نورالدین جہانگیر نے تاج و تخت سنبھالا ہے۔ جہانگیر نے ہمیں حکم دیا ہے کہ فوراً آگرے پہنچیں کیونکہ وہ جملہ صوبے دارانِ مملکت اور دوسرے بڑے منصب داروں کو اپنے روبرو دیکھنا چاہتا ہے۔ شاید یہ بھی ممکن ہے کہ ہم میں سے بعض کو معزول کر دیا جائے اور نئی تقرریاں عمل میں آئیں۔"

ابو العلیٰ کی خوشی کی انتہا نہ رہی، وہ تو چاہتے ہی یہی تھے۔ راجا مان سنگھ نے انہیں خوش دیکھ کر کہا۔ "تو گویا آپ بہت خوش ہیں؟"

ابو العلیٰ نے جواب دیا۔ "ہاں، میں خوش ہوں اور اس لیے خوش ہوں کہ اب میں کاروبارِ دنیا سے بہت جلد نجات حاصل کرلوں گا۔"

راجا مان سنگھ بہت دل برداشتہ تھا، بولا۔ "تب پھر سفر کی تیاریاں کیجیے۔"

ابو العلیٰ کو تیاری ہی کون سی کرنا تھی، معمولی سار ختِ سفر لیا اور اکبر آباد روانہ ہو گئے۔ راستے میں جہاں جہاں اہل اللہ کا پتا ملا، اس سے ملاقات کو ضرور پہنچے۔ چنانچہ منیر نامی قصبے میں قیام کیا تو پتا چلا کہ یہاں مشہور صوفی شیخ یحییٰ منیری کی اولاد میں سے کوئی بزرگ رہتے ہیں۔ ابو العلیٰ ان سے ملاقات کو پہنچے تو انہوں نے دیکھتے ہی کہا۔ "آؤ شاہ علی آؤ...... مرحبا، جزاک اللہ۔ یہ تم نے خوب کیا کہ دنیا کو چھوڑ دیا۔ الدنیا جیفۃ وطالبھا کلاب (دنیا مردار ہے اور اس کے طالب کتے) اور بھائی کمال تو یہ ہے کہ پہلے تو جیفہ پر گوشت بھی تھا مگر اب سوکھی ہڈی باقی ہے۔"

ابو العلیٰ ان سے مل کر خوش بھی ہوئے اور روح میں ایک تازگی بھی محسوس کی۔ کچھ دن ان کے پاس رہ کر اکبر آباد روانہ ہو گئے۔ وہاں پورے ملک سے امراء اور ناظم جمع ہو رہے تھے اور جہانگیر ان سب سے ملاقاتیں کر کے ان کی قابلیت اور لیاقت کا اندازہ لگا رہا تھا چنانچہ جہانگیر نے ابو العلیٰ سے بھی ملاقات کی اور ان کی شخصیت سے بے حد متاثر ہوا، پوچھا۔ "کیا آپ خواجہ فیض کے نواسے ہیں؟"

انہوں نے جواب دیا۔ "ہاں، میں خواجہ فیض کا نواسہ ہوں۔ میرے نانا خواجہ فیض کے نام سے مشہور تھے۔"

جہانگیر نے پوچھا۔ "خواجہ عبدالسلام آپ کے کون تھے؟"

جواب دیا۔ "وہ میرے دادا تھے جن کا سرزمینِ حجاز میں انتقال ہوگیا۔ خلد مکانی شہنشاہ اکبر ان کا بے حد احترام کرتے تھے۔"

جہانگیر نے پوچھا۔ "آپ کے باپ کا نام خواجہ ابوالوفا تھا؟"

ابو العلیٰ نے جواب دیا۔ "ہاں، میں خواجہ ابوالوفا کا بیٹا ہوں اور یہ سب تارکِ دنیا لوگ ہوتے تھے۔"

جہانگیر نے مسکرا کر طنزاً کہا۔ "مگر آپ تو تارکِ دنیا نہیں ہیں۔"

انہوں نے جواب دیا۔ "یہ راجا مان سنگھ کی نوازشوں سے ہے۔ میں نے کئی بار دنیا کو چھوڑنا چاہا مگر اس مردِ شریف نے اجازت ہی نہیں دی۔ اب میں آپ کی خدمت میں آگیا ہوں، امید ہے کہ آپ میرا استعفا ضرور منظور کرلیں گے۔"

جہانگیر نے کہا۔ "آپ دربار میں آتے جاتے رہیں، میں آپ کی درخواست پر غور کروں گا۔"

ابو العلیٰ نے دربار میں آنا جانا شروع کر دیا۔ جہانگیر ان سے بہت متاثر ہوا لیکن اپنے تاثر کو ان سے چھپائے رکھا۔ اس نے ابو العلیٰ کو اس محفل میں بھی شریک کرلیا جس میں شراب کا دور چلتا تھا۔

ایک دن جہانگیر بہت خوش تھا۔ ساقی، بادشاہ کو شراب کے جام پیش کر رہا تھا اور بادشاہ مزے لے لے کر انہیں ہونٹوں سے لگا رہا تھا۔ بادشاہ کے پاس ہی ابو العلیٰ موجود تھے۔ بادشاہ کو معلوم نہیں کیا سوجھی، اس نے ایک جام ان کی طرف بڑھا دیا۔ ابو العلیٰ نے بے جھجک جام تو لے لیا لیکن اسے فرش پر انڈیل دیا۔ جہانگیر کو یہ بات بہت گراں گزری۔ اس کا تو جیسے نشہ ہی ہرن ہوگیا۔ گھور کر ابو العلیٰ کی طرف دیکھا۔ ساقی کی جان نکلی جا رہی تھی کہ یہ ابو العلیٰ کو ہو کیا گیا ہے۔ شاید اب ان کی خیر نہیں، اول تو انہیں جام لینا ہی نہیں چاہیے تھا۔ بادشاہ سے معذرت کر لیتے اور جب لیا ہی تھا تو اس کو فرش پر انڈیلنا نہیں چاہیے تھا۔

بادشاہ نے کچھ سوچ کر ساقی سے دوسرا جام لیا اور یہ جام بھی ابو العلیٰ کی طرف بڑھا دیا۔ انہوں نے یہ جام بھی بادشاہ سے لے کر فرش پر اوندھا کر دیا۔ بادشاہ اس گستاخی کو برداشت نہ کرسکا۔ غصے سے بولا۔ "ابو العلیٰ! ابھی تک میں

تیری عزت کرتا تھا لیکن تو گستاخ نکلا۔ کیا تو آدابِ شاہی سے واقف نہیں ہے۔ یہ خود نمائی، بے اعتنائی۔ کیا تو غضبِ سلطانی سے نہیں ڈرتا؟"

ابوالعلیٰ نے جواب دیا۔ "بے شک میں غضبِ سلطانی سے نہیں ڈرتا مگر قہرِ ربانی سے ضرور ڈرتا ہوں۔"

بادشاہ نے غصے میں کہا۔ "اگر یہ بات ہے تو، تو اسی وقت میری محفل سے اٹھ جا۔"

ابوالعلیٰ بادشاہ کی محفل سے اٹھ آئے اور اپنے گھر میں بند ہو کر بیٹھ رہے۔ جب بادشاہ کو ذرا ہوش آیا تو اس نے انہیں طلب کیا لیکن ابوالعلیٰ نے جانے سے انکار کر دیا۔

بادشاہ نے دوبارہ آدمی بھیجا اور کہلایا۔ "میں نے جو کچھ کیا تھا، نشے میں کیا تھا، اس کو بھلا دیجیے اور تشریف لے آیئے۔ میں آپ کی عزت کرتا ہوں۔"

آپ نے جواب میں کہہ دیا۔ "میں دنیاداری کے چکر میں بہت ذلیل ہو چکا ہوں، میں استعفے کی منظوری کا انتظار کرتا رہا اور دنیا میں مبتلا اور رسوا رہا لیکن اب میں اس کے لیے تیار نہیں ہوں۔ آپ میرا استعفا منظور کریں یا مسترد کر دیں۔ میں شاہی ملازمت نہیں کر سکتا۔"

جہانگیر بے بس ہو گیا اور آپ کا استعفا منظور کر لیا۔ راجا مان سنگھ نے کہلایا۔ "شاہی ملازمت چھوڑ کر آپ نے اچھا نہیں کیا۔ آپ بہت پچھتائیں گے۔"

آپ نے جواب دیا۔ "شرمندگی اور پچھتاوا تو ان کا مقدر ہے جو دنیا میں پھنسے رہتے ہیں۔ وہ کیا پچھتائیں گے جنہوں نے دنیا کو لات مار دی۔"

انہوں نے اپنا سارا مال و متاع تقسیم کر دیا اور اپنے پاس کچھ بھی نہیں رکھا۔ اب وہ اپنے طور پر مراقبے میں رہنے لگے۔

ایک دن مراقبے میں آپ نے ایک بزرگ کو دیکھا، وہ ان سے کہہ رہے تھے۔

"اے فرزندِ ارجمند! تمہارا کشود کار خواجہ معین الدین چشتی سے مقدر ہے۔ تم تساہل مت اختیار کرو، اٹھو، اجمیر روانہ ہو جاؤ دیر نہ لگاؤ، جاؤ اور اپنا حصہ اپناؤ۔"

آپ نے اسی وقت اپنا وہ سامان بھی راہِ خدا میں دے دیا جو بچ گیا تھا۔ سفید تہ بند باندھ کر جسم کو چادر میں چھپا لیا اور دہلی روانہ ہو گئے۔ وہاں قطب الدین بختیار کاکی اور نظام الدین اولیا کے مزار پر حاضری دی اور پھر اجمیر روانہ ہو گئے۔ مزار پر حاضری دی اور اس بات پر حیران رہ گئے کہ خواجہ چشتیؒ نے عالم رویا میں ان سے ملاقات کی۔ پھر ایک دن یہ خواجہ کے مزار کا طواف کر رہے تھے کہ انہیں اپنے پاس ہی خواجہ کی موجودگی کا احساس ہوا۔ انہوں نے خواجہ کو دیکھا تو بس دم بخود دیکھتے ہی رہ گئے۔ خواجہ نے ان کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا اور کچھ دیتے ہوئے کہا۔ "ابوالعلیٰ! اسے کھا لو۔"

ابوالعلیٰ نے اپنے ہاتھ میں تسبیح کے دانے جیسے کوئی سرخ چیز دیکھی اور بے تامل منہ میں رکھ کر حلق سے اتار لیا۔ اس کے اترتے ہی ابوالعلیٰ نے اپنی کیفیت میں نمایاں تبدیلی محسوس کی۔ ان کا قلب روشن ہو چکا تھا۔ وہ کچھ دن اور اجمیر میں رہتے لیکن خواجہ نے انہیں حکم دیا۔ "آگرے واپس جاؤ، تمہارا کام ہو چکا۔"

ابوالعلیٰ نے عرض کیا۔ "حضرت! میں تو آپ کی بیعت کو حاضر ہوا ہوں اور آپ مجھے آگرے واپس جانے کا حکم دے رہے ہیں۔"

خواجہ نے جواب دیا۔ "ابوالعلیٰ! تو نے اپنے چچا امیر عبداللہ کو معلوم نہیں کیوں بھلا رکھا ہے حالانکہ وہ بہت بڑے عبادت گزار بندے ہیں۔ جا انہی سے بیعت ہو جا اور ان کی بیٹی سے شادی کر لے۔"

ابوالعلیٰ آگرے واپس چلے گئے اور اپنے چچا امیر عبداللہ کی خدمت میں پہنچے۔ انہوں نے دیکھتے ہی مسکرا کر فرمایا۔

"ابوالعلیٰ! میرے بھتیجے...... میں تیرا انتظار کر رہا ہوں، آ میرے پاس بیٹھ جا۔"

ابوالعلیٰ ان کے پاس بیٹھ گئے۔ انہوں نے اپنے بھتیجے کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بڑی دل سوزی سے کہا۔ "اگر خواجہ نے تجھ کو میرے پاس نہ بھیجا ہوتا تو، تو مجھ سے اسی طرح دور، دور رہتا حالانکہ میں تیرا منتظر تھا۔"

ابوالعلیٰ نے معذرت کی۔ "عمِ محترم! جب میں چھوٹا سا تھا اور والدِ محترم رحلت فرما گئے تھے تو اس وقت آپ نے مجھ کو سہارا دیا ہوتا حالانکہ میرے نانا خواجہ فیض نے مجھے اپنی سرپرستی میں لے لیا تھا۔ آپ نے میری سرپرستی فرمائی ہوتی تو شاید مجھ کو ..... یہ ہدایت نہ ملتی۔"

امیر عبداللہ نے جواب دیا۔ ”جو ہوا، سو ہوا۔ اب اس ذکر کو چھوڑو۔“
اس کے بعد انہوں نے ابو العلیٰ کو بیعت کیا اور اپنی بیٹی سے ان کی شادی کر دی۔

☆☆☆

اب تو ابو العلیٰ کا حال ہی کچھ اور ہو چکا تھا۔ ریاضت اور مجاہدے نے ان میں بڑی تبدیلیاں کیں اور مکاشفات ہونے لگے۔ تاثیر نے ظہور کیا اور آپ کی ذات سے ایسی باتیں ظاہر ہونے لگیں کہ جو سنتا حیران رہ جاتا، جو دیکھتا عاجز ہو جاتا۔ آپ کے حلقۂ ارادت میں بیٹھنے والوں میں ایک صاحب ملا عمر بھی تھے۔ ان پر سماع کا خاصا اثر ہوتا تھا۔ یہ سماع سے اتنے زیادہ متاثر ہو جاتے کہ کئی کئی گھنٹے بے ہوش رہتے۔

ایک دن محفلِ سماع میں یہ اتنی زور سے اچھل کر گرے کہ حاضرین پریشان ہو گئے اور انہیں گھیرے میں لے لیا۔ ملا عمر بے ہوش ہو چکے تھے۔ لوگوں نے بڑی کوشش کی کہ یہ ہوش میں آجائیں لیکن ناکام رہے۔ آخر کافی دیر بعد کسی نے یہ اعلان کیا کہ ملا عمر کا وصال ہو چکا ہے اس لیے ان کے ہوش میں آنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

اس اعلان نے کچھ کو تو دم بخود کر دیا اور کچھ رونے لگے۔ رونے کی آواز سن کر ابو العلیٰ حجرے سے باہر نکلے اور پوچھا۔
”کیا معاملہ ہے، یہ گریہ وزاری کیسی۔“

کسی نے جواب دیا۔ ”ملا عمر سماع سے از خود رفتہ ہو کر وصال پا گئے۔“

ابو العلیٰ نے فرمایا۔ ”یہ کس طرح ہو سکتا ہے۔ کہاں ہے ملا عمر؟ میں بھی تو دیکھوں!“

لوگوں نے آپ کو ملا عمر کے سرہانے پہنچا دیا۔ ابو العلیٰ نے ملا عمر کو جھک کر بغور دیکھا اور کچھ دیر دم بخود رہے، پھر حاضرین سے پوچھا۔ ”کون کہتا ہے کہ ملا عمر مر گیا؟“

ایک نے جواب دیا۔ ”اب ان میں رکھا ہی کیا ہے اور سبھی یہ کہتے ہیں کہ ملا عمر کا وصال ہو گیا۔“

ابو العلیٰ نے ملا عمر کو شانے سے پکڑ کر ہلایا اور ازراہِ مذاق کہا۔ ”ارے بھائی! کیوں مکر کرتا ہے، اٹھ بہت دیر مستی مار لی۔ اب لوگوں کو پریشان نہ کر۔“

ملا عمر کسمسا کر اٹھا اور اپنے آس پاس لوگوں کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔ ایک ایک سے سوال کرنے لگا۔ ”یہ لوگ کیوں جمع ہیں؟ انہیں کیا ہو گیا؟“

ابو العلیٰ نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”سوال یہ نہیں ہے کہ ان لوگوں کو کیا ہو گیا، سوال تو یہ ہے کہ ابھی ابھی تجھ کو کیا ہو گیا تھا؟“

ملا عمر نے کہا۔ ”مجھے نیند آگئی تھی اور میں خواب میں یہ دیکھ رہا تھا کہ میرا وجود بالکل ہلکا ہو چکا ہے اور میں اوپر اٹھا چلا جا رہا ہوں۔ پھر معلوم نہیں کس نے مجھے واپس کر دیا اور جب ہوش میں آیا تو اپنے اردگرد ہجوم دیکھ کر حیران ہو رہا ہوں۔“

ابو العلیٰ نے فرمایا۔ ”حیران ہونے کی ضرورت نہیں، ہوش میں آنے کے بعد نمازِ شکرانہ ادا کر۔“

ملا عمر نے عرض کیا۔ ”حضرت! میں سب کچھ کرنے کو تیار ہوں لیکن یہ معما کیا ہے۔ مجھ کو تو ایسا لگ رہا ہے کہ میں نے جو کچھ بتایا ہے، اس پر کسی نے بھی یقین نہیں کیا۔“

ابو العلیٰ نے جواب دیا۔ ”تیری باتوں پر میں نے یقین کر لیا اب اس کو بار بار دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ جو کچھ ہو گیا، ہو گیا۔“

کسی ارادت مند نے کہا۔ ”ملا عمر! تیرا تو وصال ہو چکا تھا مگر پیرو مرشد کی دعا سے تجھے دوبارہ زندگی مل گئی۔۔۔ سمجھا یا اب بھی نہیں سمجھا؟“

ملا عمر نے حیرت سے پوچھا۔ ”کیا کہا؟ کیا میں مر چکا تھا؟“

ابو العلیٰ نے فرمایا۔ ”ملا عمر! اب تو اپنے گھر چلا جا، یہاں باتیں نہ بنا کیونکہ تیری باتوں پر بہ مشکل ہی کوئی یقین کرے گا۔ لوگ تجھے پاگل کر دیں گے۔“

ملا عمر جانا تو نہیں چاہتا تھا لیکن جب سبھی نے مجبور کیا تو وہ چلا گیا مگر خاصا متردد اور پریشان رہا۔ چند دنوں بعد اس نے سبھی پر یہ بات واضح کر دی کہ وہ واقعی مر چکا تھا مگر شاہ ابو العلیٰ کی دعاؤں اور مہربانیوں سے دوبارہ زندہ ہو گیا تھا۔ جب یہ واقعہ بہت زیادہ شہرت پا گیا تو ابو العلیٰ کی ولایت لوگوں میں شہرت پا گئی۔

☆☆☆

ابوالعلیٰ کسی ضرورت سے دریائے جمنا کے پار تشریف لے گئے۔ آپ کی شہرت آپ سے پہلے ہی پہنچی ہوئی تھی یا پہنچ جاتی تھی چنانچہ جمنا پار کے لوگ آپ کو خوش آمدید کہنے حاضر ہوئے۔ آپ ہر ایک سے خوش اخلاقی سے پیش آتے تھے۔ آپ کی یہ شہرت ہندوؤں میں بھی پھیل چکی تھی۔ چنانچہ وہ بھی آپ کے پاس آنے جانے لگے۔ جمنا پار ایک ہندو جوگی بھی چمتکار دکھانے میں خاصی شہرت رکھتا تھا۔ ابوالعلیٰ کی وجہ سے اس کے درشن کرنے والوں کی تعداد میں کمی واقع ہوگئی۔ اس کے چیلے تشویش میں پڑ گئے۔ گروجی کافی کافی دیر بعد پوچھتے۔ ''کوئی آیا؟''

چیلے جواب دیتے۔ ''گروجی! کوئی نہیں۔''

گروجی نے پوچھا۔ ''یہ آنے جانے والے کہاں مر گئے؟''

ایک چیلے نے جواب دیا۔ ''گروجی! ایک میاں آئے ہوئے ہیں، سننے میں آیا ہے کہ بڑے پہنچے ہوئے ہیں۔ یہاں کے تمام ہندو مسلمان انہی کے پاس آجا رہے ہیں۔''

گروجی نے پوچھا۔ ''کیا یہ مسلمان گرو مجھ سے زیادہ چمتکار دکھا سکتا ہے؟''

چیلے نے جواب دیا۔ ''پتا نہیں لیکن لوگ یہی کہتے ہیں کہ بڑا چمتکاری گرو ہے۔''

گرو فکر مند ہو گئے، پھر بولے۔ ''پھر کام کیسے چلے گا، ان سے ملنا چاہیے۔'' چیلوں سے پوچھا۔ ''کیا تم لوگ ان میاں جی کو میرے پاس لا سکتے ہو؟''

ایک چیلے نے جواب دیا۔ ''نہیں، شاید ہم سب میں سے ایک بھی ان میاں جی کو یہاں نہیں لا سکتا۔''

گروجی نے سختی سے کہا۔ ''لیکن میں ان سے ملنا چاہتا ہوں، انہیں آزمانا چاہتا ہوں۔ ان کے چمتکار دیکھنا اور اپنے دکھانا چاہتا ہوں۔ یہ کام کس طرح ہوگا؟''

چیلے نے جواب دیا۔ ''گروجی! وہ میاں جی تو یہاں آنے سے رہے، شاید آپ کو خود ہی وہاں جانا پڑے گا۔''

گروجی خاصے فکر مند ہو چکے تھے۔ کچھ دیر حیرت میں پڑے خاموش رہے، پھر پوچھا۔ ''شاید سچ مچ مجھی کو جانا پڑے گا لیکن سوال تو یہ ہے کہ کیا مجھے ان میاں جی کے پاس جانا چاہیے؟ کیا میرا یہ قدم مناسب رہے گا؟''

چیلے نے جواب دیا۔ ''گروجی! اگر آپ کو میاں جی سے ملنا ہے اور ان کے چمتکاروں سے اپنے چمتکاروں کا مقابلہ کرنا ہے تو ان کے پاس ضرور جانا پڑے گا ورنہ خاموش بیٹھے رہیے۔ پھر جب میاں جی یہاں سے چلے جائیں گے تو لوگ آپ کے پاس پھر آنے جانے لگیں گے۔''

گروجی نے کہا۔ ''وہ تو، تو ٹھیک ہی کہتا ہے لیکن اس طرح تو میری ہوا اکھڑ جائے گی۔''

چیلے نے عرض کیا۔ ''پھر آپ کو یہی کرنا ہوگا کہ ان میاں جی کے پاس چلے چلیں اور یہ دیکھیں کہ وہ کتنے پانی میں ہیں۔ اس کے علاوہ دوسری کوئی صورت نہیں۔''

گروجی بڑی دیر تک جانے نہ جانے کی فکر میں پڑے رہے اور آخر کار اس نتیجے پر پہنچے کہ انہیں ان میاں جی سے ضرور ملنا چاہیے اور مل کر انہیں ان کے مریدوں اور چیلوں کے سامنے نیچا دکھا دینا چاہیے ورنہ اس کی اپنی ہوا اکھڑ جائے گی اور لوگوں کی نظروں میں اس کی کوئی عزت نہیں رہے گی۔

آخر اس نے اپنے چیلوں سے کہہ دیا۔ ''ان میاں جی کو مطلع کر دو کہ میں ان سے ملنے آرہا ہوں۔ تاکہ وہ ادھر ادھر نہ ہو جائیں۔''

جب جوگی کا یہ پیغام ابوالعلیٰ کو ملا تو آپ نے ہندو جوگی کو کہلا دیا۔ ''میں تیرا انتظار کر رہا ہوں، جب جی چاہے چلا آ...... میں ملوں گا۔''

ہندو جوگی اپنے چند چیلوں کے ساتھ ابوالعلیٰ کے پاس پہنچ گیا۔ آپ نے نہایت خوش اخلاقی سے اس کا سواگت کیا اور کچھ دیر مزاج پرسی میں لگے رہے۔ جوگی غلط فہمی میں پڑ گیا۔ اس نے آپ کی خوش اخلاقی کا یہ مطلب لیا کہ شاید آپ اس سے مرعوب اور خوفزدہ ہو گئے ہیں، بولا۔ ''شریمان جی! آپ کو دریا کے دوسری ہی طرف رہنا چاہیے تھا، یہ علاقہ میرا ہے یہاں میری حکومت ہے۔ میری حکومت میں چند دنوں تک آپ کی پوچھ رہ سکتی ہے لیکن زیادہ دنوں تک نہیں۔ آخر کار آپ شرمندہ ہو کر واپس چلے جائیں گے۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''جوگی جی! میں یہاں کسی سے مقابلہ کرنے تو آیا نہیں۔ رہ گئی حکومت کی بات تو دریا کے اس پار

یا اس پار، ہر جگہ اسی ایک حاکم کی حکومت ہے جو احکم الحاکمین کہلاتا ہے۔ یہ وسوسہ اپنے دل سے نکال دو کہ کہیں تمہاری بھی حکومت ہے۔“

جوگی نے اکڑ کر کہا۔ ”میاں جی! میری بات سمجھنے کی کوشش کرو، میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، سچ کہہ رہا ہوں۔ یہاں میری حکومت ہے۔ آپ کو یہاں نہیں آنا تھا اور اگر آئے ہی تھے تو اپنے اردگرد لوگوں کا مجمع نہیں لگانا تھا۔“

آپ نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”اب تو لوگوں کا مجمع لگ ہی گیا، میں کیا کرسکتا ہوں۔“

جوگی نے کہا۔ ”میں مسلمان آنے جانے والوں کی بابت تو کچھ بھی نہیں کہوں گا لیکن ہندوؤں کی بابت یہ کہوں گا کہ انہیں اپنے پاس نہ آنے دیجیے اور ان سے صاف صاف کہہ دیجیے کہ وہ آپ کے پاس آکر اپنا دھرم نہ برباد کریں۔“

آپ نے پوچھا۔ ”اگر میں انہیں نہ منع کروں اور انہیں آنے جانے سے نہ روکوں تو؟“

جوگی نے جواب دیا۔ ”پھر تو خرابی پیدا ہوجائے گی۔ میں آپ کو اور آپ کے پاس آنے جانے والوں کو یہ بتاؤں گا کہ ہم دونوں میں کون کتنا بڑا یا کتنا چھوٹا ہے۔“

آپ نے فرمایا۔ ”بہتر ہے، میں تو کسی کو منع کرنے سے رہا۔ اب تُو انہیں ہماری اور اپنی چھٹائی بڑائی کی بابت جو کچھ بتانا چاہتا ہے بتادے۔“

جوگی کو آپ سے اس جواب کی امید نہیں تھی، بولا۔ ”میاں جی! میں آپ کو اپنا مہمان سمجھتا ہوں۔ آپ کو شرمندہ کرکے مجھے شرمندگی ہوگی۔“

ابوالعلیٰ نے جواب دیا۔ ”تو میری شرمندگی کی فکر نہ کر۔“

جوگی نے کہا۔ ”تب پھر ایسا ہے کہ میں صبح آپ کے پاس آؤں گا۔ آپ اپنے مریدوں اور چیلوں کو روک لیجیے گا، انہی کے سامنے کچھ کام کی باتیں ہوجائیں گی۔“

آپ نے جوگی کی بات مان لی اور اس کے اعلان کو قبول کرلیا۔ دوسرے دن علی الصباح آپ اپنے مریدوں کے ساتھ جوگی کا انتظار کرنے لگے۔ مریدوں کے علاوہ کچھ ہندو بھی آگئے تھے، یہ بھی ابوالعلیٰ کے عقیدت مندوں میں شامل تھے۔

کچھ دیر بعد جوگی بھی آگیا۔ اس نے آتے ہی ہجوم پر نظر ڈالی اور متکبرانہ شان سے کہا۔ ”میاں جی! یہ گھڑی آپ کی شہرت اور عظمت کی آخری گھڑی ہے کیونکہ میں اس کو پارہ پارہ کرنے آیا ہوں۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”تو غرور کیوں کرتا ہے، معلم الملکوت نے غرور کیا تھا ابلیس بنادیا گیا۔ غرور صرف اللہ کو زیب دیتا ہے، مخلوق کو نہیں۔“

جوگی نے اپنی دھوتی کے پھینٹے میں سے ایک ڈبیا نکالی اور اس کو کھول کر آپ کے سامنے رکھ دیا، پوچھا۔ ”میاں جی! اس ڈبیا میں کیا رکھا ہے، کچھ جانتے ہو؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”میں کیا جانوں، اس میں کیا رکھا ہے...... تو ہی بتا اس میں کیا ہے؟“

جوگی نے کہا۔ ”اس میں اکسیر بھری ہے۔“

آپ نے پوچھا۔ ”یہ اکسیر کس کام آتی ہے؟“

جوگی نے جواب دیا۔ ”اس کو تانبے سے چھوا دو، وہ سونا بن جائے گا۔“ پھر مجمعے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”آپ اس کا تجربہ کرسکتے ہیں تاکہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اس کا آپ اور یہ ہجوم مشاہدہ بھی کرلے۔“

آپ نے حیرت سے کہا۔ ”اچھا تو یہ بات ہے۔“ آپ نے ڈبیا اٹھالی اور اس کو دیکھنے لگے۔

جوگی نے اصرار کیا۔ ”میاں جی! ڈبیا دیکھنے سے کام نہیں چلے گا، اس کا چمتکار خود بھی دیکھیے اور دوسروں کو بھی دکھائیے۔“

آپ نے وہ ڈبیا اٹھا کر جمنا میں پھینک دی، بولے۔ ”یہ میرے کس کام کی، میں سونا بنا کر کیا کروں گا؟“

جوگی نے اپنا سر پکڑلیا، بڑی بے مروتی سے بولا۔ ”میاں جی! یہ آپ نے کیا کردیا؟ آپ نے تو میرا نقصان کردیا۔ آپ نے اکسیر کا چمتکار تو کسی کو دکھایا ہی نہیں۔“

آپ نے فرمایا۔ ”سادھو جی! انسان تو خود اکسیر ہے، ایسی صورت میں کسی دوسری اکسیر کی تدبیر کرنا انسان کی تحقیر ہے۔“

جوگی بہت اداس اور دل برداشتہ تھا، بولا۔ ''میاں جی! میں جانتا ہوں آپ نے ایسا کیوں کیا۔ آپ مجھ سے مقابلہ کر کے شرمندہ نہیں ہونا چاہتے تھے اس لیے ڈبیا دریا میں پھینک دی حالانکہ یہ ڈبیا میری زندگی بھر کی کمائی تھی، میں تو برباد ہو گیا۔''

آپ نے دریافت فرمایا۔ ''اچھا یہ تو بتاؤ، یہ اکسیر ہوتی کیسی ہے؟''

جوگی نے جواب دیا۔ ''خاک جیسی۔''

آپ نے فرمایا۔ ''خاک کی یہ دھاک۔ یہ افسوس یہ ملال۔ میں تیرا افسوس دور کردوں گا۔ ادھر جمنا کی ساحلی ریت کی طرف دیکھ۔ یہ سب خاک ہے۔''

جوگی نے کہا۔ ''اس خاک کا میں کیا کروں گا، میرے کس کام کی یہ خاک۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''جمنا کی ساحلی ریت کو اٹھا کر اپنے پاس رکھ لے۔ تیری ڈبیا تو ذرا سی تھی، یہ تو بہت ساری ہے۔ اس سے جتنا سونا بنانا چاہے، بنالے۔ یہ بھی وہی کام کرے گی جو تیری اکسیر کرتی تھی۔''

جوگی سمجھا آپ اس سے مذاق کر رہے ہیں، بولا۔ ''میاں جی! خواہ مخواہ کیوں مذاق کر رہے ہو؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''میں مذاق نہیں کر رہا ہوں، تو تجربہ کرلے۔''

جوگی نے دریا کی ساحلی ریت اٹھا کر اس کو تانبے پر ملا۔ وہ سونا بن گیا۔ جوگی ہکا بکا رہ گیا۔ اس نے دوسری جگہ سے خاک اٹھائی اور اس سے بھی سونا بنالیا۔ ہجوم دم بخود تھا۔ جوگی پریشان اور بدحواس۔ پورے مجمعے نے ابوالعلیٰ کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور ان کے ہاتھ پاؤں چومنے لگا۔ جوگی کچھ دیر آپ کے پاس کھڑا واقعے پر غور کرتا رہا۔ اس کے بعد وہ بھی آپ کے ارادت مندوں میں داخل ہو گیا۔ ہندو تماشائی بھی مسلمان ہو گئے۔ اس واقعے کا اتنا شہرہ ہوا کہ جو سنتا، بھاگا چلا آتا، آپ کی زیارت کرتا اور ہندو ہوتا تو مسلمان ہو جاتا۔

☆☆☆

کچھ دنوں بعد آپ اپنی خانقاہ میں واپس چلے گئے۔ آپ کے مریدوں اور ارادت مندوں میں دن رات اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ آپ نماز پڑھنے جامع مسجد تشریف لے جاتے تو آپ کے ساتھ ایک ہجوم مسجد میں داخل ہوتا۔

ایک دن نماز جمعہ کے بعد آپ مسجد ہی میں بیٹھے مریدوں کو کچھ سمجھا رہے تھے کہ انہیں شور وغل کی آواز سنائی دی۔ ایک مرید کو حکم دیا کہ باہر جا کر دیکھ، یہ شور وغل کیسا ہے؟

مرید باہر جا کر واپس آ گیا۔ وہ خاصا پریشان تھا۔ آپ نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟ تو پریشان کیوں ہے؟''

مرید نے جواب دیا۔ ''حضرت! ایک بدمست ہاتھی ادھر ادھر بھاگا پھر رہا ہے۔ لوگ اس کے خوف سے دور بھاگ رہے ہیں۔ ڈر ہے کہ وہ ادھر مسجد میں نہ آ جائے۔''

آپ اسی وقت اٹھ کھڑے ہوئے، بولے۔ ''اگر وہ ادھر آنا چاہتا ہے تو میں اس کو یہاں آنے ہی کیوں دوں گا، اسے باہر ہی کیوں نہ روک لوں گا۔''

ابوالعلیٰ باہر نکل گئے۔ کئی مریدان کے پیچھے گئے اور انہیں سمجھانے کی کوشش کی، بولے۔ ''حضرت! کیا آپ کو اپنی جان پیاری نہیں ہے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''جان کس کو پیاری نہیں ہوتی۔''

مرید نے عرض کیا۔ ''حضرت! آپ باہر نکل آئے، بدمست ہاتھی سامنے سے آ رہا ہے۔ معلوم نہیں آپ کا حشر کیا ہو؟''

ابوالعلیٰ نے جواب دیا۔ ''بابا ابوالعلیٰ اپنی راہ جاتا ہے، ہاتھی اپنی راہ جائے۔''

ابھی یہ بات پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ ایک طرف سے بدمست ہاتھی بھی نمودار ہو گیا۔ وہ آپ کی طرف بڑھا۔ آپ کھڑے ہو کر اس کا انتظار کرنے لگے۔ جب وہ پاس آیا تو آپ نے فرمایا۔ ''یہ کیا کر رہا ہے؟ مجھے نہیں معلوم کہ تو ایسا کیوں کر رہا ہے؟ لیکن اگر تو ایسا نہ کرے تو تیرا کیا نقصان ہو جائے گا۔''

ہاتھی کھڑا آپ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کئی دن بعد لوگوں نے آپ کو خبر دی کہ بدمست ہاتھی خانقاہ کے در پر کھڑا ہے۔ آپ باہر گئے اور یہ دیکھ کر حیران ہو گئے کہ ہاتھی چپ چاپ ان کے در پر کھڑا ہے۔

آپ نے ہاتھی کے پاس جا کر اس کے کان میں کہا۔ ''احمق! یہ تو مخلوق کو خواہ مخواہ کیوں پریشان کر رہا ہے؟''

ہاتھی نے ایک سرسری نظر آپ پر ڈالی اور ایک دوبار چنگھاڑ کر خاموش کھڑا رہا۔
آپ نے فرمایا۔ ''مخلوق کو تنگ کرنا یا نقصان پہنچانا اچھی بات نہیں ہے۔ اگر تو میری بات مانے تو میں تجھ کو مشورہ دوں گا کہ راج گھاٹ چلا جا اور لوگوں کو اپنی پشت پر بٹھا کر دوسرے کنارے پر پہنچانے کا کام شروع کر دے۔''
ہاتھی کچھ دیر تو کھڑا رہا، اس کے بعد راج گھاٹ چلا گیا۔ چند دنوں بعد لوگوں نے اطلاع دی کہ ہاتھی راج گھاٹ کی سواریوں کو دوسرے کنارے تک پہنچانے کی خدمت بڑی مستعدی سے انجام دے رہا ہے۔ پھر اس ہاتھی کو ہر کوئی میر صاحب کا ہاتھی کہنے لگا۔

☆☆☆

آپ کی خدمت میں ہر قسم کے لوگ آیا کرتے تھے۔ تاجر، سپاہی، کاشت کار، دکاندار، طالب علم، عالم، ہر کوئی آتا اور اپنے حق میں دعائیں لے کر چلا جاتا۔ ایک دن ایک سپاہی آیا اور آپ سے درخواست کی۔ ''حضرت! میں ایک مہم پر جا رہا ہوں، میرے حق میں دعا فرماتے رہیے۔''
آپ نے دریافت فرمایا۔ ''کیا محاذِ جنگ پر جا رہا ہے تو؟''
اس شخص نے جواب دیا۔ ''جی پیرو مرشد! میں محاذِ جنگ پر جا رہا ہوں۔''
آپ کچھ دیر کے لیے مراقبے میں چلے گئے پھر فرمایا۔ ''تجھے تیر سے نقصان پہنچ سکتا ہے۔ سو اس کا انتظام کیے دیتا ہوں۔''
سپاہی نے عرض کیا۔ ''بابا! کوئی ایسا عمل بتا دیجیے کہ میں تیر کے علاوہ دوسرے ہتھیاروں سے بھی محفوظ رہوں۔''
آپ نے اپنی ٹوپی اتار کر سپاہی کے سر پر رکھ دی، فرمایا۔ ''بس تیرے لیے یہی کافی ہے۔''
وہ شخص محاذِ جنگ پر چلا گیا۔ عین اس وقت جب گھمسان کا رن پڑا ہوا تھا، ایک طرف سے ایک تیر آیا اور اس کی ٹوپی میں لگ کر نیچے گر گیا۔ اس شخص نے ٹوپی کو سر سے اتار کر جو دیکھا تو وہ بالکل محفوظ تھی مگر تیر کا پھل ٹیڑھا ہو چکا تھا۔ اسی وقت ایک آواز سنائی دی۔ ''دیکھا میں جو کہتا تھا۔ تجھے تیر ہی سے خطرہ تھا جو ٹل گیا، اب بے خوف و خطر رہ، تیرا کوئی کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا۔''
ایک دن آپ علی الصباح اٹھے اور وضو کے لیے جانے لگے مگر انہیں ایسا محسوس ہوا گویا وہ خود کو گھسیٹ رہے ہیں اور جسم خاصا بھاری ہو چکا ہے۔ اس کے بعد جب وہ وضو کرنے لگے تو ایک ہاتھ اور ایک پاؤں ان کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ انہیں خود ہی احساس ہو گیا کہ وہ مفلوج ہو چکے ہیں۔ وہ عام لوگوں کی طرح پریشان نہیں ہوئے۔ کئی دن تک اس اذیت اور اس دکھ کو جھیل جانے کے بعد آپ نے فارسی کا ایک شعر پڑھنا شروع کر دیا۔

دردم از یار است و درماں نیز ہم
دل فدائے او شد و جاں نیز ہم

(میرا درد بھی تو درماں بھی تو... میرا قلب و جسم و جان بھی تو)
اس شعر کی تاثیر نے ابوالعلیٰ پر گہرا اثر کیا اور چند دنوں کے اندر ہی انہوں نے اپنے جسم میں خون کے دوران کو صحیح صحیح گردش کرتے ہوئے محسوس کیا۔ اب وہ بالکل ٹھیک ہو چکے تھے۔
آپ سے ایک زمانے کو فیض پہنچا اور آپ کے مریدوں میں جید ترین لوگ گزرے ہیں۔
آپ صوفیوں سے فرمایا کرتے تھے کہ تصوف یہ نہیں ہے کہ چلہ کشی میں مشغول ہو جاؤ، بلکہ تصوف یہ ہے کہ صوفی خود باقی نہ رہے۔
9 صفر 1061 ہجری میں آپ نے رحلت فرمائی اور بے شمار لوگوں کو سوگوار چھوڑ گئے۔ اس وقت آپ کی عمر اکہتر سال تھی۔ آپ نے دو لڑکے چھوڑے تھے، امیر فیض اللہ اور امیر نور العلیٰ اور ان دونوں ہی نے آپ کے بعد بڑا نام پیدا کیا اور ولیوں میں شمار ہوئے۔

ماخذات

لہواثر

کاشف زبیر

خون میں گرمی اور والدین کی نرمی جب انتہا کو چھو جائے تو سمجھ لینا چاہیے کہ آنے والے دنوں میں وقت کے پردوں میں کوئی نہ کوئی حادثہ پرورش پارہا ہے۔ جیسے کہ یہاں ماں کی تربیت نے اپنی ہی اولاد کی ترتیب کو بگاڑ کر رکھ دیا تھا لیکن ذمے داری کسی اور کے کاندھے پر ڈال کر کوئی بھی خود کو مکافات کے چنگل سے نہیں نکال سکتا... ایک ذرا سی غلطی نے کس طرح ان کی زندگی کا نقشہ اور رشتوں کی ست ہی کو بدل ڈالا تھا۔

تلخ حقائق اور مکروفریب کا حیرت انگیز

امتزاج

اس نے آئینے میں خود کو دیکھا تو اسے یقین نہیں آیا کہ یہ وہی تھی۔ اس کا چہرہ جگہ جگہ سے سوجا ہوا اور نیلگوں تھا۔ ماتھے پر زخم کا نشان اور اس پر ٹانکے لگے ہوئے تھے۔ دائیں کان کے آگے رخسار سوج کر یوں ابھر آیا تھا کہ اس کے چہرے کا یہ حصہ دوسرے حصے سے دوگنا لگ رہا تھا۔ روبینہ ایک خوب صورت لڑکی تھی اور اسی وجہ سے اس پر یہ آفت آئی تھی۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اس کی کلاس کا سب سے کم گو اور ہمہ وقت سر جھکائے رکھنے والا لڑکا اس کی آبرو لوٹنے کی کوشش کرے گا اور اس حد تک چلا جائے گا کہ اس کا یہ حال کردے گا۔ گزشتہ روز ہی یہ واقعہ پیش آیا تھا اور اسے چوبیس گھنٹے گزر چکے تھے مگر روبینہ کو لگ رہا تھا کہ ابھی چند منٹ پہلے ہی سب ہوا ہو۔ اس میں

شہزاد بھی شامل تھا۔ صرف چہرہ ہی نہیں، اس کا جسم بھی زخموں سے چُور تھا اور دواؤں کے زیرِ اثر بھی وہ ان زخموں اور چوٹوں کی اذیت محسوس کر رہی تھی مگر سب سے زیادہ تکلیف اس کے دل میں تھی۔

دو سال پہلے ماسٹر کرنے کے بعد اس نے ملازمت کا سوچا تھا۔ اس کا تعلق ایک متوسط گھرانے سے تھا۔ باپ نے ساری عمر محنت کر کے جو کمایا تھا، اس سے ایک چھوٹا سا گھر بنا لیا تھا اور اب اس کے پاس اتنا نہیں تھا کہ وہ تین بیٹیوں کی شادی کر سکتا۔ یہ ذمے داری اس نے دو بڑے بیٹوں کے سپرد کر دی تھی کہ وہ اپنی تین چھوٹی بہنوں کی شادیاں کریں۔ روبینہ سے بڑی دو بہنوں سینا اور امینہ کی شادی یوں ہوئی کہ ماں باپ نے ایک بیٹے کے ساتھ ایک بیٹی بھی نمٹا دی تھی۔ روبینہ کی باری میں کوئی بیٹا نہیں تھا اور دونوں بیٹے بھی شادی شدہ ہو گئے تھے اس لیے اس کی فکر نہیں رہی تھی۔ باپ ریٹائر ہو کر خود بیٹوں پر آ گیا تھا۔ اب اس کے پاس کچھ نہیں تھا جو وہ روبینہ کو بھی عزت سے، گھر کا کر دیتا۔

بڑے بھائیوں نے شادی کے بعد مکان کے اوپر اپنا اپنا فلور بنا لیا تھا اور اپنی زندگی میں مگن ہو گئے تھے۔ رفتہ رفتہ انہیں یہ ہوش بھی نہیں رہا کہ ماں باپ اور روبینہ کا گزارہ کیسے ہوگا۔ روبینہ نے ٹیوشن پڑھا کر اور کوشش کر کے وفاقی یونیورسٹی سے بائیولوجی میں ماسٹر کر لیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اسے کہیں جاب مل جائے گی مگر جب اس نے کوشش کی تو اسے معلوم ہوا کہ اس ملک میں سائنسی تعلیم کی نہ تو قدر ہے اور نہ ہی ضرورت۔ زیادہ سے زیادہ اسے کہیں ٹیچر کی نوکری مل سکتی تھی اس لیے اس نے یہی کیا۔ اسکولوں میں اپلائی کرتی رہی۔ بالآخر اسے ایک متوسط اسکول میں جاب مل گئی۔ یہاں ایک سال کے تجربے کے ساتھ وہ اس اچھے درجے کے اسکول میں آئی تھی۔ یہاں زیادہ تر اوپری متوسط طبقے کے بچے پڑھتے تھے۔ فیس خاصی زیادہ تھی جو عام افراد افورڈ نہیں کر سکتے تھے۔

ٹیچرز کو بھی کسی قدر بہتر تنخواہ اور سہولیات دی جاتی تھیں۔ روبینہ کو آغاز میں سولہ ہزار مل رہے تھے پھر اس کی قابلیت کے لحاظ سے تنخواہ بیس ہزار کر دی گئی۔ جب روبینہ نے جاب شروع کی تو کم تنخواہ کی وجہ سے اسے بہت مشکل پیش آئی تھی۔ تنخواہ کا زیادہ حصہ تو آنے جانے اور خود پر خرچ ہو جاتا تھا۔ اس کے پاس دو ہی اچھے سوٹ تھے جو اس نے پہلی تنخواہ ملنے تک چلائے تھے۔ مگر رفتہ رفتہ تنخواہ بڑھی اور اس کے ذاتی خرچے بھی کم ہوئے تھے۔ اب اس کے پاس خاصے سوٹ اور دوسری چیزیں تھیں۔ اس لیے وہ ہر مہینے بارہ تیرہ ہزار روپے ماں کے ہاتھ پر رکھ سکتی تھی۔ ماں گھر کا خرچ چلانے کے ساتھ ساتھ اس میں سے روبینہ کی شادی کے لیے بھی بچت کر لیتی تھی۔

روبینہ کے ذمے میٹرک اور ایف ایس سی کی کلاسز کو بائیولوجی پڑھانا تھا۔ یہ ہائی اسکول تھا اس لیے یہاں انٹر کی کلاسز بھی ہوتی تھیں۔ کلاسز زیادہ نہیں تھیں مگر پڑھائی کا شیڈول بہت سخت تھا۔ طلبا اور ٹیچرز دونوں کو بہت جان مارنی پڑتی تھی۔ ہر مہینے ٹیسٹ اور پھر پریکٹیکل ہوتے تھے۔ روز کے کام کے علاوہ اسے آنے والے ٹیسٹ اور پریکٹیکل کی تیاری بھی کرنی پڑتی تھی۔ اکثر وہ چھٹی کے بعد بھی کاپیاں اور جرنل چیک کرنے میں لگی ہوتی تھی۔ وہ صبح ساڑھے سات بجے گھر سے نکلتی اور ڈھائی بجے اس کی چھٹی ہوتی تھی۔ تین بجے وہ گھر میں داخل ہوتی تو تھک کر چُور ہو چکی ہوتی تھی۔ البتہ وہ شام میں ماں کا ہاتھ بٹاتی اور رات تک کچن صاف کر کے اور اسکول کا کام نمٹا کر سونے کے لیے لیٹتی تو ساڑھے گیارہ بج جاتے۔ صبح وہ سات بجے اٹھ جاتی اور آدھے گھنٹے میں تیار ہو کر اور ناشتا کر کے اسکول کے لیے نکل جاتی۔

اسکول گھر سے فاصلے پر تھا اور اسے بس یا ویَن سے جانا پڑتا تھا۔ یہ نجی اسکول تھا اس لیے ٹیچرز کو وقفے میں بیٹھ کر چائے کے ساتھ گپ شپ کرنے کی قطعی اجازت نہیں تھی۔ پرنسپل اور اسکول ایڈمن طلبا سے زیادہ کڑی نظر ٹیچرز پر رکھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اسکول کا معیار بلند تھا اور بورڈ کے امتحانات میں کوئی نہ کوئی طالب علم پوزیشن لیتا تھا۔ شہزاد ایف ایس سی فائنل میں تھا۔ وہ متوسط درجے کا طالب علم تھا، نہ بہت اچھا اور نہ بہت خراب۔ وہ شاذ ہی اے گریڈ لیتا تھا مگر کبھی فیل بھی نہیں ہوا تھا۔ اپنے ساتھی طلبا سے کم گھلتا ملتا تھا اور روبینہ نے کبھی اسے لڑکیوں کی طرف متوجہ ہوتے بھی نہیں دیکھا تھا۔ حالانکہ اکثر لڑکے، لڑکیوں کے چکر میں ہوتے تھے۔ لڑکیاں بھی کم نہیں تھیں۔ اس درجے میں تقریباً ساری ہی لڑکیاں اور لڑکے اٹھارہ انیس سال کے تھے۔ مگر اسکول کے سخت ڈسپلن کی وجہ سے کوئی حد سے تجاوز نہیں کرتا تھا۔

روبینہ کئی دن سے محسوس کر رہی تھی کہ شہزاد اسے غور سے دیکھتا ہے اور جب وہ اس کی طرف متوجہ ہوتی ہے، وہ جلدی سے نظریں جھکا لیتا ہے۔ وہ اپنے کام میں مگن ہو جاتی تو پھر اسے دیکھنے لگتا۔ روبینہ نے اس بات پر خاص توجہ نہیں

دی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ خوب صورت ہے اور نوجوان لڑکے اسے دیکھتے ہیں۔ روبینہ کی عمر چوبیس سال تھی مگر اپنے نقوش اور ہلکی جسامت کی وجہ سے وہ اپنی کئی طالبات سے بھی چھوٹی لگتی تھی۔ شہزاد ابھی سترہ سال کا ہوا تھا مگر وہ اپنے پانچ فٹ دس انچ قد اور وزنی جسم کی وجہ سے اپنی عمر سے کہیں بڑا لگتا تھا۔ کلاس میں اس جسامت کا کوئی اور لڑکا نہیں تھا حالانکہ بہت سے لڑکے عمر میں اس سے بڑے تھے مگر وہ دبلے اور چھوٹے قد کے تھے۔ یہ اور بات تھی کہ شہزاد اپنے دبے انداز کی وجہ سے ان میں نمایاں نہیں ہو پاتا تھا۔

ان دنوں ٹیسٹ ہو رہے تھے اور اس روز شہزاد کا بھی ٹیسٹ تھا۔ اتفاق سے ٹیسٹ دو بجے کے قریب ختم ہوا جب چھٹی ہونے والی تھی بلکہ نچلے درجے کی کلاسز کی چھٹی ہو چکی تھی۔ ٹیسٹ کے جرنل جمع کراتے ہوئے طلبا نے باہر کا رخ کیا۔ وقت بچانے کے لیے روبینہ نے جرنل چیک کرنا شروع کر دیے۔ جب آخری جرنل بھی اس کے پاس آ گیا تو وہ نصف کے قریب جرنل چیک کر چکی تھی۔ پھر تھکن کی وجہ سے اس نے سر کرسی سے ٹکا لیا۔ کچھ دیر بعد اس نے چونک کر گھڑی دیکھی تو دس منٹ گزر چکے تھے۔ اس نے دوبارہ جرنل چیک کرنا اور نمبر دینا شروع کیے۔ جس وقت وہ آخری جرنل چیک کر رہی تھی، کلاس روم کا دروازہ کھلا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو شہزاد اندر آ رہا تھا۔

روبینہ کو علم نہیں تھا کہ اس وقت سارا اسٹاف چھٹی کر کے جا چکا ہے۔ صفائی کرنے والی ماسی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اور وہ بارہ بجے ہی چھٹی کر کے چلی گئی تھی ورنہ وہ عام طور سے چھٹی کے بعد پورے اسکول کی صفائی کر کے چھٹی کرتی تھی۔ باہر گیٹ پر ایک چوکیدار ہوتا تھا اور شہزاد نے اسے دو سو روپے دے کر کھانا کھانے بھیج دیا تھا۔ وہ اصل میں نشہ کرتا تھا اور اس کے پاس نشے کے لیے رقم نہیں تھی اس لیے جب شہزاد نے اسے اس شرط پر دو سو روپے دیے کہ وہ جا کر دوپہر کا کھانا کھالے تو اس نے زیادہ غور نہیں کیا اور خوشی خوشی چلا گیا۔ اس کا خیال تھا کہ اسکول اندر سے لاک ہے۔ اس کی ذمے داری صرف گیٹ تک تھی۔ اسکول کو اندر سے بند کرنا صفائی کرنے والی عورت کی ذمے داری تھی۔ صرف لیب اور دفتر کا حصہ خود ایڈمن بند کرتا تھا، باقی کلاس رومز صفائی کرنے والی لاک کر کے جاتی تھی مگر وہ پہلے ہی جا چکی تھی اس لیے کلاس روم کھلے رہ گئے۔ چوکیدار کو بھیج کر شہزاد اوپر آیا۔ روبینہ کو حیرت ہوئی، اس نے کہا۔

"تم ابھی تک گئے نہیں؟"

شہزاد نے جواب دینے کے بجائے دروازہ اندر سے بند کر دیا اور پلٹ کر اس کی طرف بڑھا تو روبینہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ "یہ کیا کر رہے ہو...... تم نے دروازہ کیوں بند کیا ہے؟"

عام سا اور دبو سا نظر آنے والا شہزاد اچانک ہی اسے بڑا اور خوفناک لگنے لگا تھا۔ روبینہ نے پیچھے ہٹنے کی کوشش کی تو شہزاد نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ یہاں سے ایک خوفناک کشمکش کا آغاز ہوا۔ روبینہ نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی اور الٹے ہاتھ سے شہزاد کے منہ پر تھپڑ مارا۔ اس پر شہزاد بپھر گیا اور اس نے پوری قوت سے روبینہ کے منہ پر تھپڑ مارا۔ اس کے ہاتھ پر شہزاد کی گرفت سخت تھی۔ وہ پلٹ کر واپس آئی تو شہزاد نے دوسرا تھپڑ مارا اور اس بار اس کا ہاتھ بھی چھوڑ دیا۔ روبینہ دونوں بار تھپڑ کھا کر حلق کے بل چیخی۔ اسے امید تھی کہ چوکیدار اس کی آواز سن لے گا مگر وہ وہاں ہوتا تو سنتا۔ روبینہ دیوار سے ٹکرائی اور اس کے شانے پر چوٹ آئی مگر اس چوٹ نے اس کے حواس بحال کر دیے اور اس نے شہزاد کو خود پر جھپٹتے دیکھا۔ خود کار سے انداز میں اس کا پاؤں حرکت میں آیا اور وہ نیچے جھکتے شہزاد کے منہ پر لگا۔

روبینہ نے سخت تلے اور پتلی ایڑی والی سینڈل پہن رکھی تھی۔ ضرب اتنی شدید تھی کہ شہزاد کی ناک کی ہڈی ٹوٹنے کی آواز روبینہ نے بھی سنی۔ وہ بلبلایا اور پیچھے گرا۔ خون فوارے کی طرح اس کی ناک سے نکل کر اس کی سفید شرٹ پر گرا۔ روبینہ نے اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی مگر جب وہ شہزاد کے پاس سے گزرنے لگی تو اس نے ٹانگ اڑا کر اسے گرا دیا۔ روبینہ منہ کے بل گری اور اس کا ماتھا فرش سے ٹکرایا۔ ضرب اتنی شدید تھی کہ کھال پھٹ گئی اور خون بہنے لگا مگر روبینہ کو پتا نہیں چلا کیونکہ اس کے حواس گم ہو گئے تھے۔ اس دوران میں شہزاد اس تک آ گیا۔ اس نے روبینہ کو شانے سے پکڑ کر سیدھا کیا اور دست درازی کرنے لگا۔ روبینہ کے ڈوبتے ذہن نے اسے خبردار کیا کہ اس کی عزت خطرے میں ہے اور اگر وہ مزاحمت نہ کر سکی تو اپنی قیمتی ترین متاع سے محروم ہو جائے گی۔ مگر اس کا ذہن اس طرح چکرا رہا تھا کہ وہ اپنے اندر ہاتھ پاؤں ہلانے کی سکت بھی نہیں پا رہی تھی۔ وہ خود پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی اور گہرے سانس لے رہی تھی۔ ایک منٹ کے لیے شہزاد کو اپنی من مانی کرنے کا موقع ملا پھر وہ اس کی طرف جھکا تھا کہ روبینہ نے اچانک انگلی سیدھی کر کے اس کی آنکھ میں اتار دی۔

روبینہ کا ناخن کسی قدر لمبا اور نکیلا سا تھا۔ شہزاد کو اس وار کی توقع نہیں تھی۔ ناخن اس کی آنکھ میں اتر گیا اور اس

نے درد سے بے تاب ہو کر چیخ ماری۔ روبینہ نے ہاتھ پیچھے نہیں کیا بلکہ انگلی کو آنکھ میں گھساتی چلی گئی اور شہزاد اس کے اوپر سے ہٹ کر پیچھے گرا۔ اس کے گرنے سے روبینہ کی انگلی اس کی آنکھ سے نکل آئی جو خون اور آنکھ کے ملغوبے سے لتھڑی ہوئی تھی۔ شہزاد اب فرش پر لوٹ رہا تھا اور اس کے منہ سے دھاڑیں نکل رہی تھیں۔ روبینہ بہ مشکل کھڑی ہوگئی مگر اس بار بھاگنے کے بجائے وہ کھڑی رہی۔ اس کا غصے سے برا حال تھا۔ اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ''ذلیل، کتے، کمینے...... میں تجھے قتل کردوں گی۔''

اس نے کہتے ہوئے ایک کرسی اٹھائی اور اسے گھما کر شہزاد پر دے مارا۔ اس نے قتل کرنے والی بات غصے میں کی تھی اور اس کا ارادہ نہیں تھا۔ وہ شہزاد کے سر پر کرسی مار کر اسے ناک آؤٹ کرنا چاہتی تھی مگر ہوا یہ کہ جیسے ہی اس نے کرسی مارنا چاہی شہزاد فرش سے اٹھنے لگا۔ کرسی کا دھاتی پایہ بہت قوت سے اٹھتے شہزاد کی گردن پر لگا اور خشک ٹہنی چٹخنے جیسی آواز آئی۔ شہزاد اوندھے منہ نیچے گرا اور ساکت ہوگیا مگر وہ مکمل ساکت نہیں تھا اس کا جسم ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ اس سے زیادہ زور سے روبینہ کانپ رہی تھی۔ اس نے کرسی پھینک دی۔ پہلی بار اسے اپنی حالت کا احساس ہوا۔ شہزاد کی دست درازی سے اس کی قمیص پھٹ گئی تھی۔ روبینہ نے دوپٹے سے ستر پوشی کی اور پھٹ جانے والی قمیص مٹھی میں پکڑ کر لڑکھڑاتے قدموں سے باہر آئی۔ اس کے حواس ابھی تک بحال نہیں ہوئے تھے۔ اسے خود کو لگنے والی چوٹوں کا احساس بھی نہیں تھا۔ ماتھے سے بہنے والا خون پورے چہرے پر پھیل گیا تھا۔ وہ بہ مشکل سیڑھیوں سے اتر کر نیچے آئی تو اسی لمحے چوکیدار آگیا۔ اس کی حالت دیکھ کر وہ بھی بدحواس ہوگیا۔ وہ گیٹ سے اندر آیا۔

''یہ کیا ہوا بی بی؟''

''میڈم کو...... فون کرو۔'' اس نے بہ مشکل کہا اور وہیں ڈھیر ہوگئی۔ کچھ دیر بعد چوکیدار نے اس کے منہ پر پانی چھڑکا اور کچھ پانی اس کے حلق میں ڈالا تو اسے ہوش آیا۔ اس نے اٹھ کر خود کو سنبھالا اور سب سے پہلے کال کرکے ماں باپ کو اطلاع دی۔ اسکول پرنسپل جو میڈم کہلاتی تھی، پاس ہی رہتی تھی اور چوکیدار کی کال پر وہ دس منٹ میں وہاں پہنچ گئی۔ اس نے روبینہ کی حالت دیکھی تو اسے اپنے دفتر میں لے آئی۔ دفتر کی ایک چابی اس کے پاس بھی ہوتی تھی۔ روبینہ نے اسے رک رک کر ساری کہانی سنائی تو وہ دہل گئی اور پھر اس نے واپس آکر پولیس کو کال کی۔ روبینہ نے اس سے شہزاد کے بارے میں پوچھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ مرچکا ہے۔ خشک ٹہنی چٹخنے جیسی آواز اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹنے کی تھی۔

روبینہ نے ایک انسان کو مار دیا تھا۔ بے شک اس نے اپنی عزت بچانے کے لیے یہ قتل کیا تھا مگر پھر بھی قتل تو تھا اور اسے تو سوچ کر ہی بے ہوش ہو جانا چاہیے تھا مگر جسمانی تکلیفوں سے قطع نظر وہ پُرسکون تھی۔ جب پرنسپل نے اس سے پوچھا کہ کیا ہوا تھا تو اس نے اسے تفصیل سے بتایا کہ شہزاد نے اس کے ساتھ کیا کرنا چاہا تھا اور اس مزاحمت کے نتیجے میں وہ زخمی تھی اور اوپر شہزاد کی لاش پڑی تھی۔ میڈم جہاندیدہ عورت تھی۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ روبینہ سو فیصد سچ کہہ رہی ہے۔ اس نے روبینہ کو سمجھایا کہ پولیس کے سامنے اس طرح کھل کر بیان نہ دے۔ خاص طور سے از خود کرسی مارنے کا اعتراف بالکل نہ کرے۔ بلکہ کرسی اپنے دفاع میں مارنے کی بات کرے۔ پولیس کے آنے تک میڈم نے چوکیدار کو بھی پکا کرلیا تھا۔ شہزاد کے گھر والوں کو اطلاع دینے کی ذمے داری اس نے پولیس پر چھوڑ دی تھی۔

☆☆☆

روبینہ خود کو آئینے میں دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ یہ زخم اور نیلے نشانات چند دن میں مٹ جائیں گے مگر اس کے دامن پر جو داغ آگیا ہے، کیا وہ مٹ سکے گا؟ اس نے پولیس کو بیان دیا اور پولیس نے اسے ذاتی ضمانت پر چھوڑ دیا مگر اس کے خلاف کیس بنتا تھا اور اسے عدالت سے بری ہونا تھا۔ یہ پہلا مرحلہ تھا کہ اس کے بڑے بھائی کے ایک دوست وکیل نے اسے یقین دلایا کہ وہ چند پیشیوں میں باعزت بری ہوجائے گی۔ اس کے بعد اسے معاشرے کی عدالت سے بری ہونا تھا۔ کل رات تک معاملہ میڈیا پر آگیا تھا اور شہزاد کی بیوہ ماں رو رو کر کہہ رہی تھی کہ اس کا بیٹا بے گناہ اور معصوم تھا۔ اسے سازش کرکے مارا گیا ہے اور مارنے کے بعد قاتلوں نے اس پر یہ الزام لگایا تاکہ خود کو سزا سے بچا سکیں۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ غریب عورت ہے اور شوہر کے مرنے کے بعد اس نے ملازمت کرکے بیٹے کو پالا تھا۔

عورت نے خاصے قیمتی کپڑے پہن رکھے تھے۔ اس کی عمر چالیس بیالیس برس سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ گوری چٹی اور نقوش کے لحاظ سے خاصی خوب صورت تھی۔ جسمانی طور پر بھی خود کو سنبھال رکھا تھا اسی لیے اپنی عمر سے دس سال چھوٹی لگ رہی تھی۔ بیٹے کی موت کے غم میں وہ بے حال تھی لیکن روبینہ کو یقین تھا کہ عام زندگی میں وہ خاصی تنک سک

سے تیار رہتی ہو گی۔ شہزاد سانولے رنگ اور موٹے نقوش والا عام سا لڑکا تھا جسے بہ مشکل ہی قبول صورت کہا جا سکتا تھا۔ وہ اس عورت سے خاصا مختلف تھا اور یقیناً اپنے باپ پر گیا تھا۔ شگفتہ نامی یہ عورت خود کو غریب کہہ رہی تھی جبکہ اسکول کی فیس ہی سات ہزار روپے ماہانہ تھی۔ وین والا تین ہزار روپے لیتا تھا۔ دس ہزار تو سامنے کا خرچ تھا۔

اس کے علاوہ بھی اسکول کا دو ڈھائی ہزار مہینے کا خرچ تھا۔ پھر شہزاد کا ذاتی خرچ بھی تھا۔ یہ سب مل ملا کر سولہ سترہ ہزار روپے تک پہنچ جاتا ہوگا۔ روبینہ حیران تھی کہ خود کو غریب بیوہ کہنے والی شگفتہ اتنا خرچ کہاں سے برداشت کر رہی تھی۔ پولیس کو بیان دینے سے پہلے اسے ایک ڈاکٹر نے چیک کیا تھا جسے میڈم نے فون کر کے بلایا تھا۔ اس نے روبینہ کو ابتدائی طبی امداد بھی دی تھی۔ پھر پولیس نے اسے اسپتال لے جا کر میڈیکل رپورٹ بنوائی اور اس میں اسے کچھ ناگوار مرحلوں سے گزرنا پڑا مگر یہ سب قانونی کارروائی اور اس کے بعد عدالتی کارروائی کے لیے ضروری تھا۔ اس کے باوجود روبینہ کو بہت عجیب سا لگ رہا تھا۔ عام حالات میں وہ کبھی اپنا اس طرح معائنہ کرنے کی اجازت نہ دیتی۔ شام تک پولیس کی طرف سے اسے گھر جانے کی اجازت مل گئی تھی۔

پولیس سے پہلے روبینہ کے ماں باپ آگئے تھے اور ماں اس کے لیے چادر لے آئی تھی جسے اوڑھ کر اس نے سکون کا سانس لیا تھا ورنہ پھٹی قمیص کے ساتھ وہ بہت مشکل میں تھی کہ اس حلیے میں پولیس کا سامنا کیسے کرے گی۔ اسپتال میں اس کے بھائی بھی آگئے تھے اور انہوں نے ہی کوشش کر کے اس کی شخصی ضمانت کرائی تھی۔ ورنہ پولیس شاید اسے پولیس اسٹیشن لے جاتی۔ ڈاکٹر نے اسے ایک درد کش دوا دی تھی جسے دودھ کے ساتھ لے کر وہ سو گئی۔ اس کی آنکھ رات گئے کھلی تھی جب سب گھر والے سو گئے تھے۔ تب اس نے ٹی وی لگا کر دیکھا اور اسے پتا چلا کہ اس کے ساتھ پیش آنے والا واقعہ میڈیا پر بھی آچکا ہے۔ اگرچہ اس کی تصویر نہیں آئی تھی مگر اسکول کے ساتھ اس کا نام آیا تھا تو یقیناً سارے ہی جاننے والے جان گئے تھے۔ وہ صبح تک سوچتی رہی کہ اب اس کے ساتھ کیا ہوگا۔ فجر کے بعد اسے نیند آگئی۔

☆☆☆

”تمام واقعات، گواہوں اور ثبوتوں کی روشنی میں عدالت روبینہ انصاری ولد احمد انصاری کو قتل کے الزام سے بری الذمہ قرار دیتے ہوئے نہ صرف باعزت بری کرتی ہے بلکہ ان کے حوصلے اور بہادرانہ جدوجہد کو سلام کرتی ہے جو انہوں نے اپنی عزت بچانے کے لیے کی۔“ جج نے فیصلہ سنانے کے بعد میز پر ہتھوڑا مارا اور اٹھ کر کمرائے عدالت سے چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی عدالت میں شور مچ گیا تھا۔ سب سے اگلی نشست پر اپنے وکیل کے ساتھ بیٹھی شہزاد کی ماں نے رونا اور دھاڑنا شروع کر دیا۔ وہ چلا چلا کر کہہ رہی تھی۔

”میں اس فیصلے کو نہیں مانتی، اس حرافہ نے میرے اکلوتے بیٹے کو قتل کیا ہے۔ میں اسے چھوڑوں گی نہیں، اس کا خون پی جاؤں گی۔“

دوسری طرف ماں باپ نے روبینہ کو لپٹا لیا۔ بھائی اسے مبارک باد دے رہے تھے کیونکہ اس کیس کا فیصلہ متوقع تھا۔ باہر میڈیا موجود تھا اس لیے روبینہ بہ مشکل ہی نکلی تھی۔ اس کی طرف سے اس کے بڑے بھائی نے میڈیا سے بات کی اور اس فیصلے کو حق و انصاف کی فتح قرار دیا۔ ساتھ ہی اس نے میڈیا سے اپیل کی کہ اب مزید اس بارے میں میڈیا پر نہ دیا جائے کیونکہ اس تشہیر سے روبینہ اور اہل خانہ کو ذہنی اذیت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ اس واقعے کو جتنی جلدی فراموش کر دیا جائے، اتنا ہی اچھا ہوگا۔ گھر جاتے ہوئے روبینہ گاڑی کے باہر کی دنیا دیکھ رہی تھی سب ویسا ہی تھا مگر اس کے لیے دنیا بدل گئی تھی کیونکہ اس کے ساتھ ایسا واقعہ پیش آگیا تھا جو ساری عمر اس کی ذات سے چمٹا رہتا۔ اس نے اپنی عزت بچانے کے لیے ایک انسان کو قتل کر دیا تھا۔

اسکول کی ملازمت اس نے پہلے ہی چھوڑ دی تھی۔ اس دوران میں وہ نہ تو بلا ضرورت گھر سے نکلی نہ کسی رشتے دار یا دوست کے ہاں گئی۔ لوگ اس سے ملنے آتے تو وہ زیادہ دیر ان کے سامنے نہیں بیٹھ پاتی تھی لیکن پولیس اور عدالت کی پیشیوں سے جان چھوٹنے پر اس نے خود کو بہت بہتر محسوس کیا تھا۔ وہ پورے ڈیڑھ مہینے سے اس ذہنی اذیت کو برداشت کر رہی تھی۔ اس رات وہ سوتے سے اٹھ کر پانی پینے لاؤنج میں آئی تو اس نے ماں باپ کو کمرے میں بات کرتے سنا۔ وہ اس کے مستقبل کے بارے میں فکر مند تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ اس کی شادی کر دیں مگر ساتھ ہی یہ پریشانی بھی تھی کہ اس واقعے کے بعد اس کے لیے کسی اچھے رشتے کی آمد مشکل نظر آرہی تھی۔ ماں نے کہا۔ ”ابھی تو واقعہ تازہ ہے۔ وقت گزرے گا تو دھول بیٹھ جائے گی اور تب میں کوشش کروں گی۔“

”کوشش ابھی سے شروع کر دو۔“ باپ نے کہا۔ ”تم

روبینہ کے بھائیوں اور بھابیوں کا رویہ دیکھ رہی ہو۔ اس مشکل وقت میں وہ کتنی مشکل سے ہماری منت سماجت کے بعد آگے آئے۔"

"میں دیکھ رہی ہوں۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ ہمارے پاس روبینہ کی شادی کے لیے کچھ ہی جمع جتھا رہ گیا ہے۔ وہ بھی تیزی سے خرچ ہو رہا ہے۔ میں نے روبینہ کی تنخواہ سے ہی بچایا تھا۔"

"پولیس اور عدالت کے چکروں میں کتنا خرچ ہوا ہے۔ اگر اس لڑکے کی ماں کیس کو آگے کسی عدالت میں لے گئی تو ہم کیسے اپنی بیٹی کا کیس لڑیں گے۔"

ماں سہم گئی۔ "پھر عدالت کچہری کے چکر لگیں گے۔"

"لگ سکتے ہیں۔" باپ نے تھکے تھکے انداز میں کہا۔ "وہ عورت غربت کا شور تو بہت مچا رہی تھی مگر وہ کہیں سے غریب نہیں لگتی ہے اور پھر معاملہ اس کے اکلوتے بیٹے کا ہے، وہ ہائی کورٹ بھی جا سکتی ہے۔ روبینہ کو سیشن کورٹ نے بری کیا ہے۔"

روبینہ کا دل رک سا گیا۔ اس نے گھبرا کر دعا کی کہ اب یہ سلسلہ یہیں رک جائے۔ اس سے آگے نہ جائے۔ اسے احساس ہوا کہ اس کے ملازمت چھوڑنے سے اس کے ماں باپ مشکل میں آگئے تھے۔ باپ کو لگی بندھی پنشن ملتی تھی جو بلوں کی ادائیگی میں ختم ہو جاتی تھی۔ باقی گھر روبینہ کی تنخواہ سے چل رہا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ کچھ عرصے بعد دوبارہ سے کسی اور اسکول میں ملازمت کی کوشش شروع کرے گی۔ نئی جگہ اور نئے لوگ ہوں گے تو اسے اتنی مشکل نہیں ہوگی۔ ماں باپ کی گفتگو سے اسے اندازہ ہوا کہ گھر کی مالی حالت اس کے اندازے سے زیادہ خراب ہے اور اسے فوری ملازمت کی ضرورت ہے۔

اس کا ایک بڑا بھائی ذاتی کاروبار کرتا تھا اور سپلائی کا کام کرتا تھا۔ اس کی آمدنی اتنی اچھی تھی کہ اس نے اپنا فلور ہر سہولت اور آسائش والی چیز سے بھر لیا تھا۔ بہترین فرنیچر اور دیگر ضروریاتِ زندگی کی چیزیں تھیں اور اس کا ماہانہ خرچ بھی خاصا کھلا ہوا تھا مگر ماں باپ کو وہ صرف دو ہزار دیتا تھا۔ جس دن وہ دو ہزار دینے آتا اس کا موڈ بہت خراب ہوتا تھا۔ اس سے چھوٹا ایم بی اے تھا اور ایک پرائیویٹ کمپنی میں جاب کرتا تھا۔ تنخواہ اس کی بھی مناسب تھی مگر وہ اخراجات اور مہنگائی کے بہانے کچھ بھی نہیں دیتا تھا۔ روبینہ سے بڑی بہنیں اچھے گھروں میں بیاہی گئی تھیں اور کھاتی پیتی تھیں مگر وہ ماں باپ کی بس اتنی ہی مدد کرتی تھیں جتنا کہ ان کے آنے جانے سے ان پر بوجھ پڑتا تھا۔ یوں صرف روبینہ تھی جو ماں باپ کا سہارا تھی اور اب وہ بھی گھر بیٹھ گئی تھی۔ اب تک اسے ان کی حالت کا احساس نہیں تھا مگر ان کی باتیں سن کر روبینہ کو پتا چلا تھا کہ وہ کتنے پریشان تھے، اس کے حوالے سے بھی اور گھر کے خرچ کے حوالے سے بھی۔

کمرے میں آتے ہوئے اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اگلے دن سے ہی جاب کی تلاش شروع کر دے گی۔ ان کے گھر اتوار کے دن اخبار آتا تھا۔ اتفاق سے اگلے دن اتوار ہی تھا۔ ناشتا کرتے ہی روبینہ نے اخبار سنبھالا اور ٹیچرز کے لیے جاب کے اشتہارات دیکھنے لگی۔

ملازمتوں والا حصہ دیکھ کر اسے اندازہ ہوا کہ اسکول بزنس کتنا چل رہا تھا۔ اسے درجنوں کے حساب سے اشتہارات ملے اور صرف بائیولوجی کی ٹیچر کے سات آٹھ اشتہارات تھے۔ اس نے سب پر نشان لگایا اور نمبرز و ای میل نوٹ کر لیے۔ جب سے اس واقعے کے بعد وہ گھر بیٹھی تھی تو اپنی جسمانی حالت ٹھیک ہوتے ہی اس نے ذہن کو انتشار سے بچانے کے لیے گھر کے کام اپنے ذمے لے لیے تھے۔ ماں کو اس نے سب کرنے سے منع کر دیا تھا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ اسے سوچنے کے لیے وقت کم ملتا تھا اور جب وہ رات کو بستر پر لیٹتی تو اتنی تھک چکی ہوتی کہ نیند آنے میں زیادہ دیر نہیں لگتی تھی۔ آج اسے ای میل کرنی تھیں اور اس کے لیے اسے وقت نکالنا پڑا۔ اس کے پاس اسمارٹ فون تھا جس سے وہ نیٹ استعمال کر سکتی تھی۔ اوپر بھائیوں نے ڈی ایس ایل نیٹ اور وائی فائی لگوایا ہوا تھا اس کے سگنل نیچے بھی آتے تھے اور روبینہ اپنے موبائل سے نیٹ استعمال کر سکتی تھی۔ اس نے اپنی سی وی تمام جگہوں پر بھیج دی۔

اگلے دن سے ہی اسے انٹرویو کے لیے کالز آنا شروع ہو گئیں۔ روبینہ جانتی تھی کہ جب وہ انٹرویو کے لیے جائے گی تو اس کی سابقہ جاب کا پوچھا جائے گا اور تب یہ واقعہ بھی سامنے آئے گا۔ اس لیے اس نے مناسب سمجھا کہ کال پر ہی بتا دے تاکہ انہیں انکار کرنا ہو تو ابھی کر دیں۔ وہ دھکے کھا کر انکار سنے تو یہ اس سے تو بہتر ہوتا۔ اس کی صاف گوئی کی داد دیتے ہوئے تقریباً تمام ہی کالرز نے اسی وقت انکار کر دیا۔ ایک نے بعد میں بتانے کو کہا اور اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ بھی دوبارہ کال کرنے کی زحمت نہیں کرے گا۔ اگلے روز اس نے مزید کچھ اسکولوں میں اپنی سی وی بھیجی اور جہاں سے اسے کال آئی اس کے بارے میں جانتے ہی انہوں نے منع کر دیا۔ روبینہ مایوس تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اسے کسی اسکول

میں شاید ہی ملازمت ملے اور اگر ملی بھی تو کسی معمولی سے اسکول میں ملے گی جہاں تنخواہ بھی معمولی سی ہوگی۔

آج کل موبائل پر اشتہاری ایس ایم ایس بہت زیادہ آنے لگے ہیں۔ روبینہ کے موبائل پر بھی روزانہ درجنوں اشتہار والے میسج آتے تھے اور وہ انہیں پڑھے بغیر ڈیلیٹ کردیتی تھی مگر جب وہ فارغ ہوکر گھر بیٹھی تو ان میسجز کو بھی وقت گزاری کے لیے دیکھ لیتی تھی۔ تب اسے پتا چلا کہ ان میں جابس کے میسج بھی آتے ہیں۔ مختلف کوالیفکیشن رکھنے والے خواتین و حضرات کے لیے جابس آفر ہوتی ہیں۔ ایک کال کے بعد مایوسی کے عالم میں وہ سوچ رہی تھی کہ اب کیا کرے گی کہ میسج آیا اور اس نے اوپن کیا تو اس میں جاب آفر تھی۔ جاب کال سینٹر کی تھی اور صرف خواتین کے لیے تھی۔ اچھی آواز، بولنے کا مناسب انداز اور انگریزی سے واقفیت لازمی شرط تھی۔ اشتہار میں ای میل دیا ہوا تھا۔ اس نے سوچا اور پھر ماں سے پوچھا۔ اس نے روبینہ کے باپ سے پوچھا اور ان کی رضامندی پا کر روبینہ کو ہاں کردی۔ اس نے اپنی سی وی میل کردی۔

ای میل پر ہی اسے جواب آیا۔ اسے کہا گیا کہ وہ دارالحکومت میں اس پتے پر صبح دس بجے آئے جو ای میل میں دیا گیا تھا۔ روبینہ کی رہائش دارالحکومت کے ساتھ ہی جڑواں شہر میں تھی۔ مگر یہ جگہ اس کی رہائش سے زیادہ دور نہیں تھی۔ جب وہ انٹرویو دینے پہنچی تو اسے کسی قدر مایوسی ہوئی۔ یہ ایک چھوٹی سی کمرشل بلڈنگ کے اوپر بنا ہوا دفتر تھا۔ اگرچہ بلڈنگ اور دفتر صاف ستھرا اور جدید طرز کا تھا مگر سناٹے اور کم افراد کی وجہ سے یہ جگہ کمرشل کے بجائے رہائشی لگتی تھی۔ اس کے خیال میں اسے یہاں جاب مل بھی جاتی تو تنخواہ اچھی نہیں ملے گی۔ مگر کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا تو بہتر تھا۔ انٹرویو اچھا رہا اور سب سے اچھی بات یہ ہوئی کہ کال سینٹر کے مالک نے اس سے اس کی سابقہ ملازمتوں کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا۔ انٹرویو کے بعد کال سینٹر کے مالک نے کہا کہ اسے ایک دن بعد کال کر کے بتایا جائے گا اور اگلے ہی دن... اسے تین دن کے ٹرائل پر طلب کرلیا گیا۔ اگر وہ ٹرائل میں کامیاب ہوجاتی تو اسے جاب مل جاتی۔

کال سینٹر اسی دفتر کے پیچھے چھوٹی سی جگہ میں تھا۔ یہاں کارڈ بورڈ سے پارٹیشن کر کے پانچ کیبن بنائے گئے تھے جن میں پانچ پی سی اور ان کے لوازمات تھے۔ پی سی انٹرنیٹ سے منسلک تھے۔ کال سینٹر کا کام اصل میں انٹرنیٹ کی مدد سے ہی چلتا تھا۔ کام مسلسل تین شفٹوں میں ہوتا تھا۔ یعنی کسی وقفے کے بغیر چوبیس گھنٹے چلتا تھا۔ مارننگ شفٹ صبح نو سے شام پانچ بجے تک ہوتی تھی۔ ایوننگ شفٹ پانچ سے رات ایک بجے تک اور ایک سے صبح نو بجے تک نائٹ شفٹ ہوتی تھی۔ مارننگ میں اس سمیت تین لڑکیاں تھیں۔ جبکہ ایوننگ اور نائٹ شفٹ میں لڑکے ہوتے تھے۔ پہلے دن کال سینٹر کے مالک رضا مراد نے خود اسے تربیت دی کہ اسے کیا اور کیسے کرنا ہے۔ شام تک وہ تقریباً سیکھ چکی تھی اور آنے والے دو دن تک وہ اپلائی کرتی رہی۔

تین دن بعد اس کی کارکردگی سے مطمئن ہوکر رضا مراد نے اسے سترہ ہزار کی پیشکش کی جو اس کی توقع سے زیادہ تھی اس لیے اس نے قبول کرلی۔ رضا مراد نے اسے یقین دلایا تھا کہ اسے بہت اچھا ماحول ملے گا اور مارننگ شفٹ میں کسی مرد کا عمل دخل نہیں ہوگا۔ وہ خود بھی کال سینٹر والے حصے میں نہیں آتا تھا اور اپنے آفس میں بیٹھ کر نگرانی کرتا تھا۔ آپریٹر جو کال ریسیو کرتی تھیں، وہ رضا مراد بھی سن سکتا تھا۔ اس لیے کالز کے معاملے میں انہیں الرٹ رہنا پڑتا تھا۔ البتہ وہ ان کی آپس میں ہونے والی گفتگو نہیں سن سکتا تھا۔ ان کے کمرے کے ساتھ ہی دو واش رومز تھے جن میں سے ایک خواتین کے لیے مخصوص تھا اور وہ اپنی شفٹ کے بعد جاتے ہوئے اسے لاک کر کے جاتی تھیں۔ دوسرا باتھ روم لڑکوں کے لیے تھا۔ کمپیوٹر اور دوسری چیزیں لڑکے بھی استعمال کرتے تھے مگر انہیں ان میں کسی قسم کی تبدیلی یا آفس میں اپنی ذاتی چیز رکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ کمپیوٹر میں کسی قسم کے پروگراموں کی انسٹالیشن ممکن نہیں تھی اور نہ ہی ان میں ڈیٹا کاپی یا ان سے نکالا جا سکتا تھا۔

رضا مراد کے علاوہ دفتر میں صرف ایک پیون تھا جو دیگر کاموں کے لیے مخصوص تھا۔ وہی ان کے لیے لنچ لے کر آتا تھا۔ بارہ بجے سب اپنی اپنی پسند کی چیزوں کی لسٹ پیسوں کے ساتھ اس کے حوالے کردیتی تھیں۔ لنچ سب مل کر نہیں کرتی تھیں بلکہ ایک لنچ کرتی تو باقی دو کال پر ہوتی تھیں۔ کال سینٹر کو زیادہ کال یورپ اور امریکا سے آتی تھیں اس لیے مارننگ میں لوڈ کم ہوتا تھا اور اسی وجہ سے یہاں تین لڑکیاں تھیں جبکہ باقی شفٹوں میں پورے پانچ پانچ لڑکے کام کرتے تھے۔ اس کے باوجود انہیں سر کھجانے کی فرصت نہیں ملتی تھی اور انہیں کھانے کا وقفہ بھی نہیں ملتا تھا۔ بہ مشکل وہ واش روم جا پاتے تھے۔ رات کو شفٹ انچارج بھی آتے تھے اور اکثر اوقات انہیں بھی آپریٹر بننا پڑتا تھا۔ یہ سب رابعہ اور مونا نے اسے بتایا تھا۔ ان کے مزے تھے کہ کبھی

آدھے گھنٹے بھی کوئی کال نہیں آتی تھی اور وہ اس دوران آرام یا گپ شپ کرتی تھیں۔

اس بار جاب کرتے ہوئے اسے ماں باپ کے خدشات سے بھی نمٹنا پڑا تھا۔ ایک حادثے نے انہیں اس کے حوالے سے سہما دیا تھا مگر اس نے انہیں قائل کرلیا کہ ہر بار اس کے ساتھ ایک ہی حادثہ نہیں ہوگا اور کسی واقعے سے متاثر ہو کر گھر بیٹھ جانا مسائل کا حل نہیں ہوتا ہے۔ سب سے بڑھ کر گھر کو اس کی جاب کی ضرورت تھی۔ یہ بات ماں باپ بھی سمجھتے تھے اس لیے مجبوراً وہ راضی ہو گئے۔ اسکول کے لیے وہ ساڑھے سات بجے گھر سے نکلتی تھی اور عام طور سے تین ساڑھے تین بجے واپس آجاتی۔ یہاں وہ ساڑھے آٹھ بجے گھر سے نکلتی اور ساڑھے پانچ بجے واپس آتی تھی اس لحاظ سے دورانیہ بڑھ گیا تھا۔ البتہ کام کا بوجھ اسکول کی جاب کے مقابلے میں کہیں کم تھا۔ اسے پورے دن میں بیس سے پچیس کالز اٹینڈ کرنا پڑتی تھیں جن کا دورانیہ مشکل سے ڈیڑھ سے دو گھنٹے ہوتا تھا۔

باقی وقت وہ فارغ ہوتی تھی اور اسے نہ تو تیاری کرنی پڑتی اور نہ ہی جاب کے بعد کرنے کو کچھ باقی رہ جاتا تھا۔ اگر اسے کوئی مشکل پیش آتی تو وہ رضا مراد سے مدد لے سکتی تھی۔ یعنی کام کے لحاظ سے جاب بہت آسان تھی۔ شروع میں تین دن تو وہ پبلک ٹرانسپورٹ سے دفتر گئی لیکن اس کے بعد وہ گاڑی میں آنے جانے لگی۔ گاڑی رابعہ کے پاس تھی۔ اس کا تعلق ایک متوسط گھرانے سے تھا۔ گاڑی اس کے باپ کی تھی جو سرکاری نوکری سے ریٹائر ہو گیا تھا اور اس نے اپنی گاڑی بیٹی کے حوالے کردی تھی۔ جاب وہ وقت گزاری کے لیے کررہی تھی مگر وہ اکیلی روز گاڑی میں آنا جانا افورڈ نہیں کر سکتی تھی اس لیے اس نے اپنے ساتھ کام کرنے والی لڑکیوں سے بات کی اور لڑکیاں اس کے ساتھ آنے جانے لگیں۔ وہ ان سے دو دو ہزار لیتی تھی۔ اس سے سی این جی کا خرچ نکل آتا تھا اور مرمت و سروس وہ خود کرا لیتی تھی۔ پھر ایک لڑکی نے جاب چھوڑ دی اور اس کی جگہ روبینہ نے پُر کر دی۔ اتفاق سے تینوں جڑواں شہر کے ایک ہی علاقے میں پاس پاس رہتی تھیں۔ رابعہ اسے گھر کے دروازے سے لیتی اور واپسی میں دروازے پر چھوڑتی تھی۔

اگرچہ بس یا ویگن میں آنے جانے کی صورت میں ہزار روپے کرایہ لگتا مگر سہولت دیکھتے ہوئے روبینہ نے دو ہزار دینا قبول کرلیا۔ ماں باپ کو بھی اس کی طرف سے اطمینان ہو گیا کہ اسے اسٹاپ پر کھڑے ہونا اور پبلک ٹرانسپورٹ میں دھکے نہیں کھانے پڑیں گے۔ کچھ وقت گزرا تو روبینہ کی زندگی رفتہ رفتہ معمول پر آگئی۔ اب اسے اس واقعے کی سوچیں تنگ نہیں کرتی تھیں۔ پھر شہزادی کی ماں نے اپنی دھمکی کے برعکس کیس ہائی کورٹ لے جانے کی کوشش نہیں کی۔ اس لیے وہ تقریباً اس حادثے کے حصار سے نکل آئی۔ ماں باپ خوش تھے کہ اس کی زندگی روٹین پر آگئی ہے۔ ماں نے اس کے لیے رشتے کی تلاش شروع کردی اور اپنی جاننے والیوں سے کہہ دیا۔ چند ایک رشتے تجویز بھی ہوئے مگر وہ اسے روبینہ کے لحاظ سے مناسب نہیں لگے تھے۔

رشتوں میں تعلیم یا شکل صورت کی کمی تھی۔ ایک لڑکا اچھا پڑھا لکھا اور صورت کا بھی اچھا تھا مگر اس کا تعلق دیہات سے تھا۔ وہ ملازمت کرنے شہر آیا تھا اور شادی کرکے بیوی کو گاؤں لے جاتا۔ روبینہ یا اس کے ماں باپ اس پر راضی نہیں ہوئے۔ ان کی بیٹی شہر میں پیدا ہوئی اور پلی بڑھی تھی، وہ گاؤں میں نہیں رہ سکتی تھی۔ بہرحال اب انہیں عجلت بھی نہیں تھی۔ مشکل وقت گزر گیا تھا اور وہ روبینہ کا رشتہ دیکھ بھال کر کرنا چاہتے تھے۔ یہ انسان کی فطرت ہے کہ مشکل وقت گزر جانے کے بعد وہ مضطرب نہیں رہتا۔ روبینہ اپنی زندگی کو دوبارہ معمول پر لانے میں رضا مراد کی شکر گزار تھی۔ اس نے نہ صرف اسے ملازمت دی بلکہ کام کے لیے بہت اچھا ماحول بھی دیا۔ ورنہ لڑکیوں کے لیے کال سینٹر کی جاب کو عام طور سے اچھا نہیں سمجھا جاتا ہے۔

روبینہ کا واسطہ صرف دو لڑکیوں سے تھا اور وہ دونوں مہذب اور اچھی فطرت کی تھیں۔ انہوں نے اس سے دوستانہ تعلق استوار کرلیا مگر زیادہ گہرائی میں جا کر اس بارے میں نہیں پوچھا تھا۔ رضا مراد نہ صرف خود لڑکیوں کی شفٹ کے دوران کمرے میں آنے سے گریز کرتا تھا بلکہ پیون کو بھی بغیر بلائے اندر آنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس لیے وہ سکون سے بنا کسی اندیشے کے رہتی تھیں۔ شام کو جب لڑکوں کی شفٹ کا وقت آتا تو جب تک تمام لڑکیاں کمرے سے نہیں نکل جاتیں کوئی اندر نہیں آتا تھا۔ لڑکوں سے صرف آتے جاتے سامنا ہوتا تھا۔ اگرچہ لڑکے باس کا رویہ دیکھتے ہوئے محتاط رہتے تھے مگر ایک دو واقعات ہوئے جب کسی لڑکے نے حد سے تجاوز کرنے کی کوشش کی اور لڑکی کی شکایت پر رضا مراد نے اسے ایسا سبق سکھایا کہ اب خاصے عرصے سے کسی نے ایسی جرأت نہیں کی تھی۔

یہ سارا کمال یقیناً رضا مراد کی ایڈمنسٹریشن کا تھا۔ اس نے دس سال پہلے یہ کال سینٹر قائم کیا تھا۔ اس وقت یہاں

بہت کم لوگ کال سینٹر کے بارے میں جانتے تھے۔ اسے شروع میں بہت مشکلات پیش آئیں۔ بزنس کا حصول آسان نہیں تھا کیونکہ اس کاروبار پر انڈین چھائے ہوئے تھے۔ شروع میں اس کے پاس صرف ایک دو آپریٹر ہوتے تھے اور وہ خود بھی آپریٹر کے طور پر کام کرتا تھا۔ اکثر اوقات اسے تینوں وقت کام کرنا پڑتا تھا اور اسے آرام کا موقع بھی کم ملتا تھا۔ رفتہ رفتہ اسے بزنس ملنے لگا اور اس کا کام چل نکلا۔

اس کی کوشش تھی کہ کچھ بزنس مڈل ایسٹ سے بھی حاصل کر لے تاکہ مارننگ شفٹ بھی پوری طرح کام کر سکے۔ مڈل ایسٹ میں انگریزی جاننے اور بولنے والے خاصے لوگ تھے۔ وہ یہاں عربی جاننے والے کال آپریٹر بھی رکھ سکتا تھا۔ روبینہ کو رفتہ رفتہ اس کے بارے میں پتا چلتا رہا اور کچھ عرصے میں اس نے...... رضا مراد کے آگے کے عزائم کے بارے میں جان لیا تھا۔ رضا مراد نے لڑکیوں سے وعدہ کیا تھا کہ اگر اس کا سیٹ اپ بڑھا تو وہ ان کی تنخواہیں بھی بڑھائے گا اور مارننگ شفٹ میں مزید لڑکیاں جاب پر رکھے گا۔ مارننگ شفٹ کو اس نے لڑکیوں کے لیے ہی مخصوص کر دیا تھا۔ یہ ایک طرح سے اس کی مجبوری بھی تھی۔ لڑکے صبح کے وقت دستیاب نہیں تھے اور جو دستیاب تھے وہ اس تنخواہ پر کام کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

روانی سے انگریزی بولنے والے کم سے کم پچیس ہزار مانگتے تھے۔ البتہ لڑکیاں کم تنخواہ پر بھی راضی ہو جاتی تھیں اس لیے رضا مراد نے صبح کی شفٹ لڑکیوں کے لیے مخصوص کر دی تھی۔ انہیں جاب پر آمادہ رکھنے کے لیے اس نے اچھا ماحول دیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ لڑکیاں تنخواہ سے زیادہ جاب کے ماحول کو دیکھتی ہیں۔ اگر وہ ماحول سے خوش ہیں تو کم تنخواہ پر بھی کام کرنے کو آمادہ ہو جائیں گی۔ شام اور رات میں اس کے پاس کام کرنے والے لڑکے زیادہ تر طالبِ علم تھے۔

رضا مراد تقریباً چالیس بیالیس برس کا سانولے مگر کھلتے رنگ اور پرکشش نقوش والا جوان اور صحت مند آدمی تھا۔ جسم متناسب تھا اور ایسا لگتا تھا کہ وہ باقاعدگی سے کوئی جسمانی سرگرمی کرتا تھا جس سے اس کا جسم چھریرا تھا۔ بے داغ چہرے اور سیاہ بالوں کی وجہ سے وہ اپنی عمر سے دس سال چھوٹا لگتا تھا۔ رابعہ اور مونا نے اس کی خانگی زندگی کے بارے میں بتایا تھا کہ وہ غیر شادی شدہ تھا اور اکیلا ہی رہتا تھا۔ ماں باپ دنیا سے گزر گئے تھے اور بہن بھائی اپنی زندگی میں مگن تھے۔ ایک دن رابعہ نے اسے چھٹی کے بعد

لطائف

متوقع پھانسی کے مجرم نے اپنے سردار وکیل سے کہا۔ ”کوشش کرنا عمر قید ہو یعنی پھانسی سے بچ جاؤں۔“

پیشی کے بعد سردار وکیل۔

”بڑی مشکل سے عمر قید کرائی ہے آپ کو، جج صاحب تو رہا کر رہے تھے۔“

مرسلہ۔ شفقت محمود، کھیوڑہ

آدمی فون پر ڈاکٹر سے۔ ”ڈاکٹر صاحب! چہرے کی پلاسٹک سرجری کے کتنے پیسے لیتے ہیں؟“

ڈاکٹر۔ ”تین لاکھ۔“

آدمی۔ ”اگر پلاسٹک اپنی لے آؤں تو؟“

ڈاکٹر۔ ”پھر میرے پاس آنے کی ضرورت نہیں، گھر میں ہی گرم کر کے منہ پہ لگالیں۔“

انتخاب۔ نعمان شاذل لوسر شرفو، واہ کینٹ

مصروفیت

لڑکا۔ ”ہیلو! کیا کر رہی ہو؟“

لڑکی۔ ”میں بہت تھکی ہوئی ہوں۔ آج گھر کا بہت کام کیا ہے۔ نماز پڑھ کر سونے جا رہی ہوں اور تم کیا کر رہے ہو؟“

لڑکا۔ ”میں ابھی سینما میں فلم دیکھ رہا ہوں اور تمہاری پیچھے والی سیٹ پر بیٹھا ہوں۔“

جھوٹ

”ممی! وہ کہتا ہے میں اس شہر کی سب سے خوب صورت لڑکی ہوں۔“

”تو تم اس مکار سے شادی کرنا چاہتی ہو جو شروع سے ہی جھوٹ بول رہا ہے۔“

مرسلہ۔ زبیر حسین شیخ، ڈیرہ مراد جمالی

تکرار

مرد دھیرے دھیرے پنجوں کے بل چلتا ہوا گھر میں داخل ہوا۔ اسی لمحے گھڑیال نے تین بجایا۔ مرد سمجھ گیا کہ بیوی یہ آواز سن کر جاگ گئی ہوگی۔ زور سے گھڑیال کی طرف منہ کر کے بولا۔ ”میں سمجھ گیا کہ ایک بجا ہے۔ تین دفعہ تکرار کی کیا ضرورت ہے۔“

مرسلہ۔ عاصمہ گلزار، بھکر

گھر جاتے ہوئے رضا مراد کا مکان دکھایا تھا۔ یہ دو سو گز پر بنا ہوا جدید طرز کا ایک منزلہ مکان تھا۔ دلکش ڈیزائن اور خوب صورت کلر اسکیم سے آراستہ تھا۔ مکان کے باہر بھی بڑی سی کیاری تھی۔ مکان کے اگلے حصے میں کھلا صحن تھا اور اس میں آرائشی درخت لگے ہوئے تھے۔ دیواروں پر بیلیں چڑھ رہی تھیں۔ روبینہ نے مکان دیکھ کر کہا۔ ''لگتا ہے سر کو فطرت سے عشق ہے۔''

روبینہ کو ذاتی طور پر پھول پودے پسند تھے اور اس نے گھر میں نہ صرف کیاری بنائی ہوئی تھی بلکہ گملوں میں بھی بہت سے پودے لگائے ہوئے تھے۔ اگلے دن روبینہ کام کر رہی تھی کہ رضا مراد نے اسے طلب کیا۔ وہ اٹھ کر اس کے آفس میں آئی۔ ''یس سر؟''

''آپ کیسی ہیں؟'' رضا مراد نے اتنے عرصے میں اس سے پہلی بار کام سے ہٹ کر کوئی بات کی اس لیے وہ ذرا گڑبڑا گئی اور پھر سنبھل کر بولی۔

''میں ٹھیک ہوں سر۔''

''میرا گھر کیسا لگا؟''

روبینہ چونکی اور انجان بن کر بولی۔ ''آپ کا گھر؟''

''ہاں کل آپ سب خواتین میرا گھر دیکھنے گئی تھیں۔ اتفاق سے میں بھی اسی وقت وہاں آیا تھا۔''

روبینہ بوکھلا گئی کہ رضا مراد نے ان لوگوں کو وہاں دیکھ لیا تھا اس نے جلدی سے وضاحت کرنے کی کوشش کی۔ ''ہم اتفاق سے اس طرف سے گزرے تو آپ کے گھر کا ذکر ہوا اور ہم نے سوچا......''

''فارگیٹ اٹ۔'' رضا مراد نے خوشگوار لہجے میں کہا۔ ''میں نے برا محسوس نہیں کیا بلکہ مجھے اچھا لگا۔''

روبینہ نے اطمینان کا سانس لیا۔ ''آپ کا مکان بہت خوب صورت ہے سر اور آپ نے اسے بہت اچھے انداز میں سجایا ہے۔''

''تھینکس فور دس کمپلی منٹ۔'' اس نے سر ہلایا۔ ''اگر آپ لوگ مکان اندر سے دیکھنا چاہیں تو اپنی ٹائم ویلکم ہے۔''

''تھینک یو سر۔'' روبینہ نے دل سے کہا۔ ''اس کا زیادہ شکریہ کہ آپ نے ہمارے تجسس کا برا نہیں مانا۔''

''میں آفس میں جتنا سخت نظر آتا ہوں، عام زندگی میں اتنا سخت نہیں ہوں۔'' رضا نے آہستہ سے کہا۔

اپنے کیبن میں آنے کے بعد بھی روبینہ سوچتی رہی کہ اس نے یہ بات کیوں کی۔ اس دن وہ چھٹی کر کے نکلیں تو رابعہ نے اطلاع دی کہ کل وہ گاڑی نہیں لا سکے گی اس میں کچھ کام تھا تو وہ آج ورکشاپ میں دیتی ہوئی جائے گی اور گاڑی اسے کل شام واپس ملے گی اس لیے کل ان سب کو خود سے آنا اور جانا پڑے گا۔ مہینے میں ایک دو بار ایسا ہو جاتا تھا۔

اگلے روز روبینہ بروقت پہنچنے کے لیے جلدی گھر سے نکلی اور اتفاق سے اسے فوراً ہی وین مل گئی اور وہ پندرہ منٹ میں آفس پہنچ گئی۔ رابعہ اسے اور مونا کو لیتی تھی اس لیے آفس آتے آتے بیس منٹ سے زیادہ ہی لگ جاتے تھے۔ آج وہ معمول سے ذرا جلدی پہنچ گئی تھی۔ اتفاق سے اسی وقت رضا مراد بھی پہنچا۔ اس نے گاڑی سڑک کے کنارے پارک کی اور اترتے ہوئے بولا۔

''خیریت، آج گاڑی میں نہیں آئیں؟''

''گاڑی ورکشاپ گئی ہے۔'' اس نے کہا۔ ''آج وین میں آئی ہوں۔''

''اور واپسی؟''

''ظاہر ہے، وہ بھی وین میں ہوگی۔''

مگر جب وہ شام کو آفس سے نکلی تو پتا چلا کہ ٹرانسپورٹ والوں نے اچانک ہی کسی وجہ سے ہڑتال کر دی ہے اور سڑکیں گاڑیوں سے خالی ہو گئی تھیں۔ ٹرانسپورٹرز کا پولیس سے کسی بات پر جھگڑا ہوا اور اس کی سزا عوام کو دی جا رہی تھی۔ چھٹی سے پہلے روبینہ واش روم گئی تھی اور جب وہ نکلی تو رابعہ اور مونا جا چکی تھیں۔ وہ اسے اسٹاپ پر بھی نظر نہیں آئیں۔ شاید وہ آگے ایک بڑی ہائی وے تک چلی گئی تھیں جہاں سے باہر سے آنے والی بسیں بھی مل جاتی تھیں۔ اس دن روبینہ صبح سے اٹھی ہوئی تھی اور آج کام بھی زیادہ تھا۔ اب اس میں ایک کلومیٹر پیدل چلنے کی ہمت نہیں تھی۔ دارالحکومت میں رکشوں کو اجازت نہیں تھی۔ وہاں کچھ ٹیکسیاں تھیں مگر وہ اکیلے ان میں بیٹھنے کی ہمت نہیں کر پا رہی تھی۔ ابھی سوچ رہی تھی کہ پیدل ہی چلنا شروع کر دے کہ رضا مراد کی کار اس کے پاس آ کر رکی۔ اس نے بنا تمہید فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ ''آجائیں، میں آپ کو ڈراپ کر دیتا ہوں۔''

وہ کسی قدر ہچکچاہٹ کے ساتھ اندر بیٹھ گئی۔ ''شکریہ، اس وقت تو یہاں دور دور تک کسی ٹرانسپورٹ کا نام و نشان نہیں ہے۔''

''آپ کی خوش قسمتی کہ مجھے اس طرف کام تھا اور میں یہاں آ گیا ورنہ یہ میرا روٹ نہیں ہے۔''

''میں شکر گزار ہوں۔''

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔ کولیگ ہونے کے ناتے

ایک دوسرے پر حق ہوتا ہے۔'' رضا مراد نے کہا۔ ''میں نے آج تک کہا نہیں لیکن آج میں بتا دوں کہ آپ ان چند بہترین کال آپریٹرز میں سے ہیں جو میرے آفس میں آئی ہیں اور جب آپ جائیں گی تو مجھے افسوس ہوگا۔''

''میں فی الحال تو نہیں جا رہی۔''

''عام طور سے فیمیل زیادہ عرصے نہیں رکتی ہیں اور شادی یا کسی اور وجہ سے جاب چھوڑ دیتی ہیں۔''

''شادی کا ابھی کچھ پتا نہیں ہے۔'' روبینہ نے جھینپ کر کہا۔ ''جاب چھوڑنے کی کوئی اور وجہ بھی نہیں ہے۔ ویسے آپ کے آفس میں الٹا ہوتا ہے، لڑکیاں زیادہ عرصے جاب کرتی ہیں اور لڑکے جلدی چھوڑ جاتے ہیں۔''

''کیونکہ وہ پارٹ ٹائم کرتے ہیں اور لڑکیاں فل ٹائم کرتی ہیں۔ اس کے باوجود وہ پانچ سال سے زیادہ جاب نہیں کرتیں۔ رابعہ سب سے پرانی ہے مگر اگلے سال تک وہ بھی جاب چھوڑ دے گی۔'' رضا مراد نے کہا اور پھر سرسری سے انداز میں پوچھا۔ ''آپ جاب ٹائم پاس کے لیے کرتی ہیں یا......؟''

''ضرورت کے تحت۔'' اس نے صاف گوئی سے جواب دیا۔ ''میرے والد ریٹائر ہیں اور بڑے بھائی اتنا نہیں کرتے کہ ہم اپنا خرچ پورا کر سکیں اس لیے مجھے جاب کرنی پڑی۔''

''تب آپ سراہے جانے کے قابل ہیں۔'' رضا مراد نے تعریفی انداز میں کہا۔ ''بیٹے ہوں یا بیٹی، ماں باپ کی بڑھاپے میں خدمت دونوں پر فرض ہے۔ اس لحاظ سے آپ خوش قسمت ہیں کہ ماں باپ کی خدمت کر رہی ہیں۔ میں اس معاملے میں بدقسمت ہوں کہ ابھی پڑھ رہا تھا کہ وہ دونوں ایک ایک کر کے دنیا سے رخصت ہو گئے اور میں ان کی زیادہ خدمت نہیں کر سکا۔''

''اوہ، افسوس ہوا۔'' روبینہ نے کہا اور پھر بے ساختہ پوچھ لیا۔ ''تب سے آپ اکیلے ہیں سر؟''

''ہاں، تب سے میں اکیلا ہی ہوں۔''

''آپ نے شادی نہیں کی؟'' یہ سوال اس نے جھجک کر کیا۔

''پہلے اپنا کیریئر بنانے میں لگا رہا۔ وراثت میں مجھے صرف یہ مکان ملا تھا اور میرے پاس کچھ نہیں تھا۔ میری تعلیم بھی مکمل نہیں ہوئی تھی۔ میں نے ڈگری ملنے تک رقم کے لیے ہوٹلوں میں ڈش واشنگ تک کی ہے۔ میرا شروع سے ارادہ تھا کہ میں اپنی آئی ٹی کمپنی کھولوں گا اور اس لیے میں نے ایم سی ایس کیا۔''

''پھر آپ نے یہ کال سینٹر کھول لیا؟''

''نہیں، پہلے چھ سال دوسری کمپنیوں میں کام کیا اور پھر کچھ رقم جمع ہوئی تو کال سینٹر کا بزنس شروع کیا۔ آئی ٹی کمپنی اس لیے نہیں شروع کر سکا کہ اس کے لیے زیادہ رقم اور اعلیٰ تعلیم یافتہ اسٹاف چاہیے تھا۔ کال سینٹر اس کے مقابلے میں کم رقم میں ہو سکتا تھا۔ یہ دفتر میں نے کرائے پر لیا تھا اور عمارت نئی تھی۔ اس کے اندر پلستر تک نہیں ہوا تھا۔ رنگ و روغن کا سارا کام میں نے ہی کیا۔ آفس کے لیے سیکنڈ ہینڈ فرنیچر اور کمپیوٹرز لیے۔ چند سال بعد کال سینٹر چل نکلا اور میری گنجائش ہوئی تو میں نے کچھ قرض لے کر یہ آفس ہی خرید لیا۔ درمیان میں گنجائش دیکھ کر فرنیچر اور سسٹم اپ گریڈ کرتا رہا۔ اب آفس میں سب میری مرضی کے مطابق ہے۔ مجھ پر سے قرض اتر گیا ہے اس لیے میں اپنا بزنس بڑھا رہا ہوں۔ برابر والا آفس بھی اسی لیے خریدا ہے۔''

''اسی وجہ سے آپ نے شادی بھی نہیں کی؟''

''نہیں، اس کی اصل وجہ وقت کی کمی تھی۔ دن میں یہاں ہوتا تھا اور رات کو نیٹ پر بزنس ڈیلنگ کرتا تھا۔ یوں سمجھ لیں کہ سونے اور کھانے کے لیے بھی وقت مشکل سے ملتا تھا۔ یہ ضروری نہیں تھا کہ آنے والی میری مصروفیات سے سمجھوتا کرتی۔ بس اسی وجہ سے میں شادی سے گریز کرتا رہا۔ اب میں اس قابل ہوں کہ بیوی کو مناسب وقت دے سکوں مگر شاید اب وقت گزر گیا ہے۔''

''آپ شادی کر لیں۔'' روبینہ نے سنجیدگی سے کہا۔ ''آپ کے پاس ابھی وقت ہے مگر ضائع کرنے کے لیے بہت کم ہے۔''

''آپ نے ٹھیک کہا مگر میں ایسا آدمی نہیں ہوں جو کسی بھی لڑکی سے شادی کر لوں۔ میرے خیال میں انسان کی ہونے والی بیوی سے مائنڈ میچنگ ضروری ہے۔''

''اس کے لیے تو آپ کو تلاش کرنا پڑے گا۔''

''مجھے مل گئی ہے۔'' رضا نے اس کی طرف دیکھا تو روبینہ کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ اس نے جھجک کر پوچھا۔

''وہ کون ہے سر؟''

''ابھی میں نہیں بتا سکتا کہ وہ میرے بارے میں نہ جانے کیا سوچتی ہے؟''

''تب آپ رشتہ بھیج دیں۔ آپ کو خود پتا چل جائے گا کہ وہ آپ کے بارے میں کیا سوچتی ہے۔''

''میں ایسا ہی کروں گا لیکن پہلے اس کی رضامندی

ضروری ہے۔''

''سر! آپ جیسے شخص کے رشتے سے کون انکار کرے گا۔'' روبینہ نے یقین سے کہا۔ ''یہ اس لڑکی کی خوش قسمتی ہوگی۔''

''نہیں، اس کی رضامندی لازمی ہے اور ایک مسئلہ اور ہے کہ وہ عمر میں مجھ سے خاصی کم ہے۔'' رضا نے کہا۔ ''پندرہ سال چھوٹی ہے۔ پھر اس میں کوئی کمی نہیں ہے۔ بہت خوب صورت اور اتنی ہی خوب سیرت ہے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے۔ اسے اپنے معیار کا رشتہ مل سکتا ہے۔''

روبینہ کی دھڑکنیں تیز ہوتی جارہی تھیں۔ اب اس سے بولا نہیں جارہا تھا اور اسے لگ رہا تھا کہ رضا مراد اس کے بارے میں ہی بات کررہا ہے۔ گاڑی اس کے گھر کے سامنے رکی تو وہ چونکی۔ اس نے بہ مشکل کہا۔ ''سر...... آپ کوشش تو کریں۔''

وہ کہتے ہی نیچے اتر آئی۔ بدحواسی میں وہ رضا مراد کا شکریہ ادا کرنا بھی بھول گئی تھی۔ اس کے پاس چھوٹے گیٹ کے آٹومیٹک لاک کی چابی تھی اس لیے اسے کال بیل یا دروازہ نہیں بجانا پڑتا تھا۔ اندر آکر اس نے سب سے پہلے فریج سے پانی نکال کر پیا۔

وہ چینج کرنے کے لیے کمرے میں آئی۔ اسے پہلی بار خیال آیا کہ رضا مراد نے اسے گھر تک چھوڑا تھا۔ بے شک آفس کے ریکارڈ میں اس کے گھر کا پتا تھا مگر رضا مراد نے اس کا گھر تو نہیں دیکھا تھا، تب وہ بنا اس سے پوچھے اس کے گھر تک کیسے آگیا تھا؟ اسے رضا مراد کی باتیں یاد آئیں۔ وہ اپنی پسند کی لڑکی کے بارے میں بتارہا تھا اور اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ روبینہ کے لیے سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ اس کا اشارہ اسی کی طرف تھا مگر ساتھ ہی وہ اپنے خیال کو جھٹلا رہی تھی۔ اسے لڑکیوں کی کیا کمی ہوسکتی تھی جو وہ اس سے اس کی رضامندی چاہتا اور اس کے حسن اور کم عمری کا خیال کرتا۔

شاید وہ کسی اور کے بارے میں بات کررہا ہو اور ہو سکتا تھا کہ وہ ایک کولیگ ہونے کے ناتے اس سے یہ باتیں کررہا تھا اور اس نے واضح طور پر تو کچھ نہیں کہا تھا۔ اگر اس کی پسند وہ تھی تو اسے کھل کر یہ بات کہہ دینی چاہیے تھی۔ روبینہ نے فیصلہ کیا کہ وہ اس معاملے میں دیکھے اور انتظار کرے گی۔ اگر رضا نے کھل کر بات کی تو وہ اسے اپنے ماں باپ سے بات کرنے کا کہہ دے گی۔

عورت مرد کا کردار اور زندگی کے بارے میں اس کا رویہ دیکھتی ہے۔ خاص طور سے وہ عورت جو میچور ہو اور روبینہ پہلے ہی میچور تھی اور اس واقعے کے بعد اس میں مزید میچورٹی آگئی تھی۔ کردار کے معاملے میں اس نے رضا مراد کو بہترین انسان پایا تھا۔ جہاں تک بات پندرہ سال کے فرق کی تھی تو یہ اتنی اہم بات نہیں تھی۔ پھر ہمارے معاشرے میں عمر کے لحاظ سے بے جوڑ شادیاں عام ہیں۔

صبح وہ آفس آئی اور اس کا رضا مراد سے سامنا ہوا تو وہ معمول کے مطابق تھا۔ اس نے ایک بار بھی اسے غور سے نہیں دیکھا کہ وہ آج خاص طور سے تیار ہوکر آئی تھی۔ وہ میک اپ سے گریز کرتی تھی مگر آج اس نے ہلکا میک اپ کیا تھا اور راستے میں اس کی کولیگز نے اس کی تعریفوں کے پل باندھ دیے تھے بلکہ گاڑی چلاتی رابعہ نے اسے کئے بھی مارے تھے۔ ''کتنی پیاری لگ رہی ہے۔ کیا اس طرح سے تیار ہوکر نہیں آسکتی؟''

''تیار نہیں ہوئی ہوں۔'' اس نے جھینپ کر کہا۔ ''لائٹ میک اپ کیا ہے۔''

''یہی کرلیا کرو۔'' مونا بولی۔ ''آج تو سب تمہیں ہی دیکھیں گے۔''

وہ ہنسی۔ ''آفس میں سوائے سر اور پیون کے ہوتا ہی کون ہے؟''

''چل وہی دیکھ لیں گے۔''

لیکن جس کے لیے اس نے تیاری کی تھی، اس نے سرسری سا دیکھا اور بنا کسی ردعمل کے اپنے کام میں لگ گیا مگر کچھ دیر بعد جب وہ کمپیوٹر کے سامنے بیٹھی تھی، اس کے موبائل پر ایس ایم ایس آیا۔ ٹون سن کر اس نے موبائل دیکھا تو رضا کا ایس ایم ایس تھا۔ ''آج آپ بہت اچھی لگ رہی ہیں۔''

روبینہ کو لگا کہ وہ اندر سے کھل اٹھی ہے۔ اس نے جوابی ایس ایم ایس کیا۔ ''شکریہ۔''

''آپ نے برا نہیں مانا اس کا شکریہ۔''

روبینہ نے کچھ دیر سوچا اور پھر میسج کیا۔ ''آپ کو کچھ بھی کہنے کے لیے میسج کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''تب میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ آپ لنچ کے بعد میرے کمرے میں آیئے گا۔''

''آپ مجھے طلب کرلیجیے گا۔'' روبینہ نے جوابی میسج کیا۔ ''خود سے آپ کے آفس میں کوئی نہیں جاتا ہے۔''

''اوکے، میں کال کرلوں گا۔'' رضا مراد نے کہا۔ اسی اثنا میں اسے کال آنے لگی اور وہ کال ریسیو کرنے لگی۔ لنچ انہوں نے ڈیڑھ بجے کیا۔ دو بجے رضا مراد نے اسے طلب کیا اور وہ یوں گئی جیسے رضا مراد نے اسے کسی کال کے سلسلے

میں بلایا ہے۔ دھڑکتے دل کے ساتھ وہ اس کے کمرے میں داخل ہوئی تو رضا مراد جیسے سراپا منتظر تھا۔ وہ اس کے سامنے بیٹھی تو اس سے نظریں نہیں اٹھائی جا رہی تھیں لیکن اس سے پہلے رضا مراد کچھ کہتا اس نے کہا۔

"سر! میں آگئی ہوں۔"

"کاش کہ تم پہلے آگئی ہوتیں۔" رضا مراد نے جذباتی لہجے میں کہا۔ "میری زندگی اتنی سونی نہ ہوتی۔"

"سر! آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" اس نے بہ مشکل کہا۔

"روبینہ! میں اسٹریٹ فارورڈ قسم کا آدمی ہوں اس لیے سیدھی بات کروں گا۔ میں آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں اور اس کے لیے آپ کی اجازت سے آپ کے گھر رشتہ بھیجنا چاہتا ہوں۔"

روبینہ نے خود کو سنبھال لیا تھا۔ حالانکہ اس کا خیال تھا کہ ایسی کوئی بات سن کر وہ شاید بدحواس ہو جائے گی مگر اس کے برعکس ہوا تھا۔ اس نے کہا۔ "سر! میں اسے اپنی عزت افزائی سمجھوں گی لیکن جہاں تک شادی کا تعلق ہے، اس کا فیصلہ کرنے کے مجاز میرے ماں باپ ہیں لیکن اس سے پہلے میں آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔"

"میں سن رہا ہوں۔"

"وقت نہیں ہے اس لیے میں مختصراً بتاؤں گی۔" روبینہ نے کہا اور اسے اپنی زندگی کا بھیانک ترین واقعہ سنا دیا۔ رضا مراد حیران نظر آیا۔ وہ سنا کر کھڑی ہو گئی۔ "یہ میری زندگی کا وہ واقعہ ہے جو شاید ساری عمر میرا پیچھا کرے گا اور میں نہیں چاہوں گی کہ میرے ساتھ کوئی اور بھی اس سے متاثر ہو۔ آپ اب سوچ سمجھ کر فیصلہ کیجیے گا مگر آپ کے کسی بھی فیصلے سے میرے دل میں آپ کے لیے موجود عزت پر کوئی فرق نہیں آئے گا۔"

وہ اپنے کیبن میں آئی تو اس کا دل بوجھل تھا اور آنکھوں میں آنسو تھے۔ خوش قسمتی سے رابعہ لنچ کر رہی تھی اور مونا ایک کال اٹینڈ کر رہی تھی اس لیے دونوں اس کی کیفیت نہیں دیکھ سکیں۔ وہ سیدھی واش روم گئی اور وہاں سے دل اور آنکھوں کا بوجھ ہلکا کر کے باہر آئی۔ منہ دھونے سے میک اپ صاف ہو گیا تھا اور اس نے منہ دھونے کی وجہ بھی یہی بتائی کہ اسے میک اپ میں رہنے کی عادت نہیں ہے، الجھن ہوتی ہے اس لیے اس نے منہ دھو لیا۔ مونا معنی خیز انداز میں بولی۔ "ڈیئر! عادت ڈال لو، جلد تمہیں میاں جی کی خاطر دیر تک میک اپ میں رہنا پڑے گا۔"

وہ ہنسی۔ "وہ وقت ابھی دور ہے۔"

رابعہ لنچ سے فارغ ہو گئی تھی۔ اس نے کیبن سے جھانک کر کہا۔ "قسم سے میں لڑکا ہوتی تو اسے اغوا کر کے لے جا چکی ہوتی۔ پتا نہیں لوگ اندھے ہیں جو انہیں روبینہ نظر نہیں آتی۔"

"تم لوگوں کے پاس کوئی اور موضوع نہیں ہے۔" اس نے کسی قدر چڑ کر کہا تو مونا ذرا حیران ہوئی تھی۔ اس نے شانے اچکائے۔

"تجھے پسند نہیں ہے تو نہیں کرتے۔"

روبینہ اپنے کیبن میں آگئی اور کام میں لگ گئی۔ زیادہ تر کال دو بجے کے بعد آتی تھیں اور وہ مصروف رہتی تھیں۔ شام کے وقت جب وہ چھٹی کر کے نکل رہی تھیں تو رضا مراد پہلے ہی جا چکا تھا۔ روبینہ کے اندر ہوک سی اٹھی۔ وہ سارے وقت انتظار کرتی رہی کہ رضا کی طرف سے میسج آئے گا اور وہ اسے بتائے گا کہ اس کے نزدیک اس بات کی کوئی اہمیت نہیں ہے اور اس نے جو کیا ٹھیک کیا۔ سب سے بہادر عورت وہی ہوتی ہے جو عزت کے لیے جان دے دے یا کسی کی جان لے لے مگر کوئی میسج نہیں آیا اور اب وہ وقت سے پہلے آفس سے جا چکا تھا۔ شاید اسے روبینہ کی ذات سے منسوب اس واقعے سے دھچکا پہنچا تھا اور وہ اب اپنے فیصلے پر نظر ثانی کر رہا تھا۔ روبینہ کے خیال میں اگر وہ ایسا کر رہا تھا تو وہ حق بہ جانب تھا۔ بھلا کون ہو گا جو ایسی عورت کے ساتھ زندگی گزارے جس نے ایک انسان کو قتل کیا ہو۔ بے شک اپنے دفاع ہی میں کیوں نہ کیا ہو۔ وہ گھر آئی تو ماں بہت خوش تھی۔ اس نے روبینہ کو چوم کر پیار کیا۔

"کیا ہوا امی...... آج بہت پیار آرہا ہے؟"

"کیوں نہ آئے، میری بچی اتنی پیاری ہے۔ آج ایک عورت کا فون آیا تھا۔ وہ رشتے کراتی ہے۔ اسے کسی توسط سے پتا چلا تھا کہ ہم تیرے لیے رشتہ تلاش کر رہے ہیں تو اس نے پیشکش کی ہے کہ اس کے پاس ایک بہت اچھا رشتہ ہے۔ وہ کل آئے گی اور اگر ہمیں لڑکا پسند آگیا تو پرسوں اتوار کو وہ لڑکے کو بھی لے آئے گی۔"

ماں کی خوشی دیکھ کر وہ زبردستی ہنسی۔ "اتنی جلدی...... کیا ہتھیلی پر سرسوں جمانا چاہتی ہے وہ۔"

"بیٹا اس کا کہنا ہے کہ رشتہ بہت اچھا ہے اور ایسا رشتہ قسمت والوں کو ملتا ہے۔"

"آپ دیکھیے گا۔" اس نے کمرے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ "میرے لیے سب سے بہتر فیصلہ آپ ہی کریں گی۔"

"جیتی رہو، خوش رہو بیٹی۔" ماں نے خوش ہو کر کہا۔

اگلے دن وہ دفتر سے آئی تو ماں خوش بھی تھی اور کسی قدر فکرمند بھی۔ وہ کمرے میں آئی تو ماں بھی اس کے پیچھے آئی۔ ''آج وہ عورت آئی تھی۔''

''اچھا تو آپ نے کیا کہا؟''

''ابھی تو میں نے کچھ نہیں کہا، سوچا پہلے تجھ سے بات کرلوں پھر اسے جواب دوں گی۔''

''مجھ سے کیا بات کرنی ہے جبکہ میں نے سب آپ پر چھوڑا ہوا ہے۔''

''ہاں مگر اس رشتے کے لیے تجھ سے پوچھنا ضروری ہے۔ وہ عورت تیرے باس کا رشتہ لے کر آئی تھی۔ رضا مراد نام ہے نا اس کا؟''

روبینہ کچھ دیر کے لیے ساکت رہ گئی۔ پھر اس نے چونک کر کہا۔ ''ہاں، ان کا یہی نام ہے۔''

''کیا اس نے تیری مرضی سے رشتہ بھیجا ہے؟''

روبینہ ماں کے لہجے میں موجود اصل سوال تک پہنچ گئی اور اس نے سنجیدگی سے کہا۔ ''اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے کہ انہوں نے رشتہ میری مرضی سے بھیجا ہے یا نہیں۔ اصل اہمیت آپ اور ابو کے فیصلے کی ہوگی اور مجھے آپ کا فیصلہ بخوشی قبول ہوگا۔''

ماں نے گہری سانس لی۔ ''تب میں تیرے ابو سے بات کرتی ہوں۔'' وہ باہر جاتے جاتے رکی اور کہا۔ ''تو جانتی ہے رضا مراد عمر میں تجھ سے کافی بڑا ہے۔''

''جی جانتی ہوں۔'' روبینہ نے جواب دیا۔

''تصویر میں وہ خاصا کم عمر لگ رہا تھا۔''

''سامنے سے بھی ایسے ہی لگتے ہیں۔ اگر آپ نے ملنے کا فیصلہ کیا تو دیکھ لیں گی۔''

ماں نے اسی رات اس کے باپ سے بات کی اور باپ نے بھائیوں سے بات کی۔ ماں کے توسط سے انہوں نے رضا مراد کے بارے میں روبینہ سے بہت سے سوالات کیے اور اسے جن کے جواب آتے تھے، وہ اس نے دیے۔ آنے والے ایک ہفتے تک وہ رضا مراد کے بارے میں چھان بین کرتے رہے۔ اس کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں ملی تھیں مگر اس میں کوئی شک والی بات بھی نہیں تھی۔ اس کے دو بھائی اور دو بہنیں تھیں اور سب شادی شدہ تھے۔ پیچھے سے بھی اچھے خاندان سے تھا اور اپنا بزنس کر رہا تھا۔ اگلے اتوار سے پہلے پہلے گھر کی رائے عامہ رضا مراد کے حق میں ہموار ہوگئی تھی۔

اس دوران روبینہ معمول کے مطابق دفتر جاتی رہی۔ نہ تو اس نے رضا مراد سے پوچھا اور نہ ہی اس نے بتایا۔ دونوں میں جتنی بار گفتگو ہوئی، دفتری کاموں کے سلسلے میں ہوتی تھی۔ روبینہ نے رابعہ اور مونا کو بھی نہیں بتایا تھا کہ کیا چکر چل رہا ہے۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اگر اس کے گھر والے اس رشتے پر راضی ہوگئے تو وہ جاب چھوڑ دے گی اور پھر ان دونوں کو بتا کر جائے گی۔ لیکن اگر اس کے گھر والے راضی نہ ہوئے تو بھی وہ جاب چھوڑ دے گی اور ان کو اصل بات نہیں بتائے گی۔ جاب چھوڑنے کے لیے کوئی ذاتی وجہ بیان کردے گی مگر ہفتے والے دن وہ گھر پہنچی تو ماں نے اسے بتایا کہ انہوں نے فیصلہ کرلیا ہے اور اگلے دن رضا مراد کو بلا لیا ہے۔ وہ رشتہ کرانے والی عورت کے ساتھ آئے گا۔ روبینہ چونکی۔ ''کیا وہ اپنے بہن بھائیوں کو نہیں لائیں گے؟''

''اس کا کہنا ہے کہ وہ خود فیصلہ کرسکتا ہے۔ وہ ذمے دار اور بڑی عمر کا آدمی ہے۔''

''یہ تو ٹھیک ہے لیکن انسان ایسے موقع پر رشتے داروں کو تو لاتا ہے۔'' روبینہ نے کہا۔ ماں مطمئن تھی مگر اسے عجیب سا لگ رہا تھا۔ اتوار والے دن اس نے خاص طور سے ڈرائنگ روم صاف کیا۔ چونکہ اسے رضا مراد کے سامنے نہیں جانا تھا اس لیے اس نے ذاتی تیاری پر توجہ نہیں دی البتہ کچن میں بہت کچھ بنا لیا تھا۔ رضا مراد رشتہ کرانے والی عورت کے ساتھ شام کے وقت آیا تھا۔ ذرا سی دیر میں وہ اس کے باپ اور بھائیوں سے اتنا بے تکلف ہوگیا کہ ان کے ہنسنے کی آوازیں کچن تک آرہی تھیں۔ وہ شام کی چائے پر آیا تھا مگر اسے اصرار کرکے رات کے کھانے تک روک لیا گیا اور روبینہ کو ایمرجنسی میں رات کے کھانے کا بھی اہتمام کرنا پڑا۔ وہ دس بجے گیا تو روبینہ تھک کر چور ہوگئی تھی۔ اس نے زندگی میں بھی اتنا وقت کچن میں نہیں گزارا تھا مگر ساتھ ہی وہ بہت خوش تھی۔ رضا مراد کے لیے اس کے گھر والوں نے بہت اچھا ردعمل دیا تھا اور کسی نے اس بات پر اعتراض نہیں کیا کہ وہ اسی کے دفتر میں کام کرتی تھی۔ رہت کو متوقع پاتے ہی اس نے ماں کو اپنے فیصلے سے آگاہ کردیا۔

''آپ لوگوں نے رضا مراد کو ہاں کردی ہے تو کل سے میں دفتر نہیں جاؤں گی۔''

ماں نے سکون کا سانس لیا۔ ''یہی میں تجھ سے کہنے والی تھی۔ تیرے باپ اور بھائی چاہتے ہیں کہ اب تو گھر بیٹھے۔''

''میں استعفا بھیج دوں گی۔'' روبینہ نے کہا اور اس نے رات میں ہی کال کرکے رابعہ اور مونا کو بتا دیا تھا۔ وہ دنگ رہ گئیں۔ مونا نے کہا۔

"تو اتنی چھپی رستم نکلے گی، میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔"
رابعہ کسی قدر خفا تھی۔ "تو نے بتانا بھی گوارا نہیں کیا۔"

روبینہ نے اسے بتایا کہ اس نے کیوں نہیں بتایا تھا۔ اب بتا رہی تھی کیونکہ سب طے ہو گیا تھا اور وہ کل سے دفتر نہیں آئے گی۔ ای میل سے اپنا استعفا بھیج دے گی۔ اسے سنانے کے بعد ان دونوں نے اسے مبارک باد بھی دی تھی کہ اسے رضا مراد جیسا اچھا آدمی مل رہا تھا۔ اس نے اگلے دن ای میل سے رضا مراد کو اپنا استعفا بھیج دیا۔ اس نے کال کر کے اسے بتایا کہ اس نے استعفا قبول کر لیا ہے اور اس کی اس مہینے کی تنخواہ براہِ راست اس کے اکاؤنٹ میں بھیج دی جائے گی۔ روبینہ نے منع کیا کہ اس کی ضرورت نہیں ہے، وہ صرف سات دن تو اس مہینے آئی تھی مگر رضا مراد نہیں مانا۔ اس نے صرف تنخواہ ہی نہیں بلکہ دو بونس تنخواہیں بھی اس کے اکاؤنٹ میں ڈال دی تھیں۔ روبینہ اس رشتے سے خوش تھی مگر ساتھ ہی فکر مند بھی تھی۔ فکر اسے ماں باپ کی تھی کہ اب ان کا گزارہ کیسے ہوگا۔ اس نے ماں سے کہا تو اس نے جواب دیا۔

"تو کیوں فکر کرتی ہے۔ جس نے پیدا کیا ہے اسی نے رزق کا وعدہ بھی کیا ہے۔"

"پھر بھی امی کوئی سبیل بھی تو ہو۔"

"تیرے ابا نے سوچا ہے کہ ڈرائنگ روم کے ایک حصے کو دکان میں تبدیل کر لیں گے اور وہاں کوئی کام کر لیں گے۔"

"ابا اس عمر میں کام کریں گے؟" اس نے دکھ سے کہا۔

"ہاں میری بچی، ایک تو مجبوری ہے دوسرے تیرے ابا ٹھیک ٹھاک اور چلتے پھرتے ہیں۔ آدمی آخری وقت تک کچھ نہ کچھ کرتا رہے تو ٹھیک ہے۔ بیٹھ جانا بھی ٹھیک نہیں ہوتا اگر تیرے ابا ریٹائرمنٹ کے بعد ہی کچھ کر لیتے تو آج یہ نوبت نہ آتی۔"

ماں نے اس کی تنخواہ سے بہت کچھ بچایا ہوا تھا اور اب وہی اس کے جہیز کی تیاری میں کام آ رہا تھا۔ پھر بھائیوں نے بھی ماں کو رقم دی تھی۔ آنے والے اتوار کو رضا مراد پھر رشتہ کرانے والی عورت کے ساتھ آیا تھا اور اس نے تاریخ طلب کی تھی۔ فون پر پہلے ہی سب طے ہو گیا تھا اس لیے ایک مہینے بعد کی تاریخ دے دی گئی۔ روبینہ کو ایک بار پھر محسوس ہوا کہ رضا مراد کے بہن بھائی نہیں آئے تھے۔ اس نے اسے میسج کر کے پوچھ بھی لیا اور اس نے جواب دیا کہ وہ اس کی شادی سے خوش نہیں تھے۔ اتفاق سے سب ہی چاہتے تھے کہ وہ ان کی مرضی سے شادی کرے اور انہوں نے اس کے لیے رشتے بھی دیکھ رکھے تھے۔ اس کے انکار کے بعد وہ اس سے خفا تھے اور امکان یہی تھا کہ وہ اس کی شادی میں بھی شریک نہیں ہوں گے۔ اگر یہ نارمل رشتہ ہوتا یا روبینہ کے ساتھ وہ حادثہ نہ پیش آیا ہوتا تو شاید اس کے گھر والے بھی اس بات کو محسوس کرتے مگر اب انہوں نے کیا تھا تو رضا مراد پر اس کا اظہار نہیں کیا تھا۔

ان چند مہینوں میں ماں نے اس کے رشتے کے لیے جو کوششیں کی تھیں، ان سے اسے پتا چل گیا تھا کہ اب روبینہ کو کوئی معقول رشتہ ملنا مشکل ہے اور جو رشتے آ رہے تھے اس سے بہتر تھا کہ وہ گھر بیٹھی رہتی۔ رضا مراد میں صرف ایک چیز تھی کہ اس کی عمر روبینہ سے خاصی زیادہ تھی مگر یہ عیب بھی نمایاں نہیں تھا۔ رضا مراد نے جہیز کی چیزوں کے لیے منع کر دیا۔ اس نے کہا کہ اس کے پاس سب کچھ ہے۔ انہوں نے جو دینا ہے، وہ اپنی بیٹی کو ذاتی طور پر دے دیں۔ بلکہ اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ وہ روبینہ کو دو کپڑوں میں اس کے ساتھ رخصت کر دیں تو وہ زیادہ خوشی محسوس کرے گا۔

اس لیے ماں نے روبینہ کے لیے سوٹ بنا لیے تھے اور زیور بنایا تھا۔ برات اور ولیمے کا سوٹ رضا مراد کی طرف سے ہونا تھا لیکن کیونکہ اس نے جہیز کو منع کر دیا تھا اس لیے انہوں نے روبینہ کے یہ دو سوٹ بھی خود بنانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اسی طرح مراد نے کہہ دیا تھا کہ وہ اپنے کپڑے خود بنائے گا۔ برات کے لیے طے ہوا تھا کہ وہ سادگی سے صرف چند لوگ لے کر آئے گا۔ اس نے تو کہا تھا کہ وہ گھر میں تقریب رکھ لیں اور نکاح بھی یہیں ہو جائے گا مگر ان کے بہت سے رشتے دار تھے اس لیے انہوں نے لان کرایا تھا۔ رضا مراد نے ولیمے کے لیے ایک اعلیٰ درجے کا بینکوئٹ بک کرایا تھا۔ ولیمہ برات کے ایک ہفتے بعد تھا۔ ایک اتوار کو شادی تھی اور دوسرے اتوار کو ولیمہ تھا۔ روبینہ اور اس کے گھر والوں نے بھی توجہ نہیں دی تھی کہ رضا مراد نے ولیمہ اتنا آگے کیوں رکھا تھا؟

☆☆☆

روبینہ کو لگ رہا تھا کہ اس کا سر گھوم رہا ہے۔ کمرا گھوم رہا تھا اور ہر چیز جیسے رقص میں تھی۔ اسے بس اتنا یاد تھا کہ رضا مراد کے گھر آنے کے بعد ایک عورت نے اسے پینے کے لیے کچھ دیا تھا اور اصرار کر کے اس کے چند گھونٹ پلا دیے تھے۔ یہ عجیب سے ذائقے والا شربت تھا۔ برات میں صرف ایک گاڑی میں پانچ لوگ تھے۔ تین مرد جن میں رضا

مراد بھی تھا اور دو عورتیں۔ ان میں سے ایک عورت نے نقاب کیا ہوا تھا اور اس نے عورتوں میں آکر بھی نقاب نہیں اتارا تھا۔ دوسری عورت وہی تھی جس نے رشتہ کرایا تھا۔ گاڑی رضا مراد کی تھی اور وہ خود ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس نے سادہ شلوار سوٹ پہنا ہوا تھا۔ واپسی میں ان میں سے ایک مرد گاڑی میں تھا۔ پیچھے روبینہ دونوں عورتوں کے ساتھ تھی اور آگے ایک مرد رضا مراد کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ روبینہ عجیب سی بے چینی محسوس کر رہی تھی حالانکہ اسے خوش ہونا چاہیے تھا۔

جب وہ گھر میں آئے تو اسے گاڑی سے اتار کر ایک سادہ بیڈ روم میں لایا گیا۔ سادہ ان معنوں میں کہ یہ دلہن کے لحاظ سے سجا ہوا نہیں تھا لیکن یہاں فرنیچر اعلیٰ درجے کا تھا۔ فرش پر بیش قیمت دبیز قالین اور اس سے میچ کرتے ہوئے پردے تھے۔ روبینہ کو ڈبل بیڈ پر بٹھایا گیا تھا اور اس کے کچھ دیر بعد اسی نقاب پوش عورت نے اسے تقریباً زبردستی شربت پلایا تھا۔ اس کے تیسرے گھونٹ کے بعد اسے ہوش نہیں رہا تھا۔ جب اسے ہوش آیا تو اسے لگ رہا تھا کہ اس کا سر چکرا رہا ہے اور کمرا گھوم رہا ہے۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر اس سے اٹھا نہیں جا رہا تھا۔ اس میں اتنی سکت بھی نہیں تھی کہ ہاتھ پاؤں ہلا سکے۔ اس سے کچھ دیر بعد اس کی نیم کھلی آنکھوں کے سامنے رضا مراد کا چہرہ نمودار ہوا۔ اس نے لہراتی آواز میں کہا۔

''کیسا محسوس کر رہی ہو؟''

''مجھے...... کیا ہوا...... ہے؟''

''کچھ نہیں۔'' دوسرا چہرہ نمودار ہوا اور یہ شگفتہ کا چہرہ تھا...... شہزاد کی ماں شگفتہ کا۔ اب روبینہ کو شبہ ہونے لگا کہ وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہے۔ بھلا شگفتہ یہاں کہاں سے آگئی؟ وہ اسے طنزیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ ''شاید تمہیں یقین نہیں آرہا ہے۔''

''تم...... تم شگفتہ ہو؟'' اس نے بہ مشکل کہا۔

''تم نے ٹھیک پہچانا، یہ شگفتہ ہے۔'' رضا مراد نے کہا اور اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر اسے اپنے قریب کر لیا۔ روبینہ کو ایک بار پھر اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ آج اس کی شادی تھی اور اس کا شوہر جس نے اسے چھوا بھی نہیں تھا، وہ اس عورت کو اپنی بانہوں میں لیے ہوئے تھا جس کے بیٹے نے روبینہ پر مجرمانہ حملہ کرنے کی کوشش کی تھی اور نتیجے میں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ اس نے خود سے کہا۔

''نہیں، یہ خواب ہے...... میں خواب دیکھ رہی ہوں۔''

''یہ حقیقت ہے۔'' شگفتہ زہریلے لہجے میں بولی۔ ''تیری زندگی کی سب سے بھیانک حقیقت لیکن تو اسے کسی کو بتانے کے لیے زندہ نہیں رہے گی۔''

رضا مراد نے شگفتہ کی تائید کی۔ ''آج رات تم مر جاؤ گی۔''

''میں کیسے مر جاؤں گی...... مجھے کیا ہوا ہے؟'' اس نے پوچھا۔ اب روبینہ کو کسی قدر احساس ہوا کہ وہ جو دیکھ رہی ہے، وہ خواب نہیں ہے مگر اس کا شبہ باقی تھا۔

''تمہیں کچھ نہیں ہوا ہے لیکن صبح کے قریب یہاں ڈاکو آئیں گے کیونکہ یہ شادی کا گھر ہے اور وہ لوٹ مار کے بعد مزاحمت کرنے پر گولیاں چلائیں گے۔'' رضا مراد نے یوں اطمینان سے کہا جیسے روزمرہ کی کوئی بات کر رہا ہو۔

''اس میں سے ایک گولی تمہیں لگے گی۔'' شگفتہ نے بات آگے بڑھائی۔ ''اور تم مر جاؤ گی۔''

روبینہ کے حواس کسی قدر بہتر ہوئے اور اس کا سر چکرانا کم ہوا تھا اور اسے آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو شگفتہ نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر اسے واپس لٹا دیا۔ ''میں نے تمہیں جو شروب دیا تھا، اس میں دوا تھی اور وہ انسان کو بے ہوش کر دیتی ہے۔ تمہاری بے ہوشی سے فائدہ اٹھا کر ہم نے گھر میں ڈاکے کا سیٹ اپ بنا دیا ہے۔''

''اب ایک کام باقی ہے۔'' رضا مراد نے اس کے سامنے پستول لہرایا۔ ''لیکن جلدی نہیں ہے۔ تم دوا کے اثر سے نکل آؤ۔ ایسا نہ ہو کہ پوسٹ مارٹم میں دوا کا ذکر آجائے۔''

''تب تک ہم برابر والے بیڈ روم میں سہاگ رات مناتے ہیں۔'' شگفتہ نے بے شرمی سے کہا۔ ''میں نے تو تجویز دی تھی کہ تمہارے سامنے ہی......'' اس نے رک کر رضا مراد کو دیکھا۔ ''مگر یہ نہیں مانا۔''

شگفتہ کی دشمنی تو واضح تھی لیکن رضا مراد اس کے ساتھ کیوں تھا؟ اس نے یہی سوال کیا تو رضا مراد نے ذرا جھک کر کہا۔ ''تم نے جس نوجوان کو قتل کیا تھا، وہ میرا بیٹا تھا...... میرا اکلوتا بیٹا۔ میں نے اور شگفتہ نے کم عمری میں شادی کی تھی اور شادی کے چند مہینے بعد ہی ہمارے درمیان جھگڑے کی وجہ سے طلاق ہو گئی۔ بدقسمتی سے ہم نے اس کا ذکر بھی کر دیا اور یوں ہمیں جدا ہونا پڑا مگر ہم صرف دنیا کی نظر میں جدا ہوئے تھے۔ ویسے ہم چھپ چھپ کر ملتے رہے۔ جب میں نے شگفتہ کو طلاق دی تو شہزاد اس کے پیٹ میں تھا اور مجھے بعد میں پتا چلا، تب تک بہت دیر ہو گئی تھی۔'' کہتے ہوئے رضا مراد کا چہرہ بگڑ گیا۔ ''کتیا...... تو نے میرے بیٹے کو قتل کیا، اب تجھے

پتا چل گیا ہوگا کہ میں کیوں شگفتہ کے ساتھ ہوں؟''
''میں مرتے دم تک اپنے بیٹے کا چہرہ نہیں بھول سکوں گی جسے تو نے بگاڑا اور پھر اسے مار دیا۔'' شگفتہ نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''میں تجھے ہائی کورٹ میں گھسیٹتی مگر رضا نے مجھے انتقام کا بہتر راستہ دکھایا۔ اب میں تیرا چہرہ بھی ایسے ہی بگاڑوں گی۔''
''اس نے میری عزت برباد کرنے کی کوشش کی تھی۔'' روبینہ کمزور لہجے میں بولی۔ ''پھر بھی میں اسے مارنا نہیں چاہتی تھی۔ جو ہوا وہ بغیر کسی ارادے کے ہوا۔''
''لیکن ہم جو کریں گے پورے ارادے سے کریں گے۔'' رضا مراد نے کہا۔ ''جیسے تمہیں ملازمت کے لیے بلایا اور پھر ملازمت دی۔ تمہیں شادی کے جال میں پھنسایا اور یہاں بلالیا۔ کچھ دیر بعد یہاں فائرنگ ہوگی اور ڈاکو تمہیں قتل کرکے فرار ہوں گے مگر وہ ڈاکو نہیں شگفتہ ہوگی۔ مردانہ کپڑوں اور نقاب میں، محلے والے فائرنگ کی آواز سن کر باہر آئیں گے اور ڈاکوؤں کو فرار ہوتے دیکھیں گے۔ گاڑی کے پچھلے حصے میں دو ڈمیاں بھی ہوں گی جو بالکل اصل لگیں گی۔ پھر میں روتا پیٹتا باہر آؤں گا اور لوگوں کو بتاؤں گا کہ میری ایک رات کی دلہن کو ڈاکو مار گئے ہیں۔ سب میری بات مانیں گے، کوئی مجھ پر شک نہیں کرے گا۔''
''چلو۔'' شگفتہ نے رضا مراد کو بازو سے پکڑ کر کھینچا۔ ''وقت کم ہے، ابھی مجھے جانا بھی ہے۔ اسے میں اپنے ہاتھ سے شوٹ کروں گی، تب میرے کلیجے میں ٹھنڈ پڑے گی۔''
''تب تک تم زندگی کے آخری لمحات گزارو۔'' رضا مراد نے کہا اور وہ دونوں کمرے سے نکل گئے اور دروازہ بند ہوگیا تھا۔ روبینہ نے اٹھنے کی کوشش کی مگر اس سے اٹھا نہیں جا رہا تھا۔ پتا نہیں اسے شربت میں کیسی دوا دی گئی تھی جس نے اس کی جان نکال لی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ آنکھ بند کرکے لیٹ جائے۔ مگر اس کے پاس وقت نہیں تھا۔ اس کے قاتل کچھ دیر کے لیے گئے تھے اور جلد وہ اسے مارنے آجاتے۔ روبینہ کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ رضا مراد کا اصل روپ یہ ہوگا۔ وہ کتنی چالاکی اور ماہرانہ اداکاری سے اسے بے وقوف بنا رہا تھا۔ دفتر میں اس نے اپنا کیسا تاثر بنایا ہوا تھا۔ عورتوں کے معاملے میں کتنا مہذب بنا تھا۔ شاید اس کے اسی تاثر کی وجہ سے روبینہ کے دل میں اس کے لیے جگہ بنی اور وہ اس کے بچھائے ہوئے جال میں بہت آسانی سے پھنس گئی۔

وہ چت لیٹ کر اور گہرے سانس لے کر اپنی حالت پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔ کچھ دیر بعد اس نے محسوس کیا کہ وہ اٹھ سکتی ہے مگر اس سے سیدھا نہیں اٹھا جا رہا تھا اس نے پہلے کروٹ لی اور پھر ہاتھوں پر زور دے کر اٹھنے لگی۔ اسے لگا جیسے اس کا وزن بہت بڑھ گیا ہو یا پھر کشش ثقل میں اچانک اضافہ ہوگیا تھا۔ بہت کوشش کرکے وہ اٹھی تو یوں ہانپ رہی تھی جیسے اس نے نہ جانے کتنی طویل مسافت طے کی ہو۔ اس کا گلا خشک ہو رہا تھا۔ مگر وہاں پانی نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ اسے شدت سے پیاس لگ رہی تھی اور دل کر رہا تھا کہ کہیں سے ڈھیروں پانی ملے اور وہ پی جائے۔ اس نے کمرے کا جائزہ لیا تو اس کی نظر ایک طرف چھوٹے دروازے پر گئی۔ شاید یہ باتھ روم کا دروازہ تھا۔ وہ اٹھی اور نیچے قالین پر گرگئی۔ اگر قالین دبیز نہ ہوتا تو اسے چوٹ آتی اور آواز بھی پیدا ہوتی۔
اس نے بہتر سمجھا کہ اٹھنے کی کوشش میں توانائی اور وقت ضائع کرنے کے بجائے وہ قالین پر ہی سرک کر آگے بڑھے۔ یہ زیادہ آسان ثابت ہوا اور وہ ایک منٹ میں اس دروازے تک پہنچ گئی۔ ہینڈل گھما کر اس نے نیم کھلے دروازے سے اندر جھانکا تو سامنے ہی جدید طرز کا واش بیسن دیکھ کر اسے خوشی ہوئی۔ وہ اسی حالت میں اندر آئی اور سہارا لے کر اوپر ہوئی۔ نل کھولتے ہوئے اس نے منہ براہِ راست اس سے لگا دیا اور اس وقت تک پانی پیتی رہی جب تک وہ حلق میں نہیں بھر گیا اور پھر اسے قے آگئی۔ اس سے شادی کا کھانا نہیں کھایا گیا تھا اور اس نے مشکل سے چند لقمے لے لیے تھے۔ اس قے میں صرف پانی نکلا۔ مگر پانی کے نکلتے ہی اس کی حالت میں حیرت انگیز تغیر آیا۔
اسے لگا جیسے اس کا جسم اور ذہن دونوں ہلکے ہوگئے ہوں۔ وہ گہرے سانس لے رہی تھی اور جب اس کا دل ہلکا ہوا تو اس نے اس بار صرف چند گھونٹ پانی پیا۔ پھر اس نے منہ دھویا اور باتھ روم میں چل پھر کر اپنی حالت کا جائزہ لیا۔ اسے لگا کہ وہ نوے فیصد ٹھیک ہوگئی ہے۔ ذہن بالکل صاف تھا اور جسمانی توانائی بھی لوٹ آئی تھی۔ اس نے وہاں دیکھا مگر اسے کوئی ایسی چیز نظر نہیں آئی جسے وہ ہتھیار کے طور پر استعمال کر سکتی۔ صرف ایک وائپر تھا جس کا ڈنڈا اتنی ہلکی پلاسٹک کا بنا ہوا تھا کہ اس سے کسی بلی کے بچے کا بھی کچھ نہیں بگڑ سکتا تھا۔ وہ بیڈ روم میں آئی اور جلد اسے مطلب کی چیز نظر آگئی۔ یہ ماربل کا بنا ہوا ڈیڑھ فٹ لمبا اور تقریباً تین سیر وزنی گلدان تھا۔

اس کی گردن والا حصہ آسانی سے گرفت میں آ گیا۔ وہ دبے قدموں اس دروازے تک آئی جس میں رضا مراد اور شگفتہ گئے تھے۔ اس نے پہلے اس کمرے کی تیز لائٹس آف کیں اور ہینڈل گھمایا۔ خلافِ توقع وہ آسانی سے کھل گیا۔ دوسری طرف ایسا ہی بیڈ روم تھا۔ وہاں بھی نیم تاریکی تھی اور اس نیم تاریکی میں گناہ کا پرانا کھیل جاری تھا۔ اب روبینہ کی سمجھ میں آیا کہ بہ ظاہر دبو اور سیدھے سے شہزاد کے اندر یہ گند کہاں سے آیا کہ اس نے استاد شاگرد کے مقدس رشتے کو پامال کرنے میں ذرا بھی حیا محسوس نہیں کی۔ یہ ان دونوں بے حیا مرد عورت کے خون کا فطری اثر تھا جو شہزاد میں آیا تھا۔ دونوں ایک دوسرے میں اس قدر کھوئے ہوئے تھے کہ انہیں دروازہ کھلنے اور روبینہ کی آمد کا پتا ہی نہیں چلا۔

وہ بہت دیر تک کھڑی اندر داخل ہونے کی ہمت کرتی رہی۔ اس کے قدم ہی نہیں اٹھ رہے تھے۔ پھر اس نے خود کو یاد دلایا کہ اگر اس نے ہمت نہیں کی تو یہ لوگ کامیاب ہو جائیں گے۔ وہ اندر آئی اور دبے قدموں بیڈ کی طرف بڑھی۔ وہ کوشش کر رہی تھی کہ اس کی نظریں اور ذہن اس منظر سے دور رہیں لیکن یہ ممکن نہیں تھا۔ پھر شگفتہ کی نظر اس پر پڑی اور وہ چلا گئی۔ رضا مراد نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور اسی لمحے روبینہ نے گلدان گھما کر اس کے سر پر دے مارا۔ وہ کراہا اور نیچے گرا۔ شگفتہ نے چیخ ماری اور اپنی... ناگفتہ بہ حالت کی پروا کیے بغیر بیڈ کے دوسری طرف مڑ گئی۔ اس نے سائڈ دراز سے پستول اٹھایا اور اس کا رخ روبینہ کی طرف کر دیا۔ اس نے بلا جھجک ٹریگر دبایا تھا مگر گولی نہیں چلی کیونکہ سیفٹی کیچ لگا ہوا تھا۔ اس نے لرزتے ہاتھ سے سیفٹی کیچ ہٹایا۔ روبینہ ساکت کھڑی تھی۔ اسے اپنی جان بچانے کا خیال ہی نہیں آیا۔ شگفتہ نے سیفٹی کیچ ہٹاتے ہوئے چلا کر کہا۔ "کتیا......"

اس نے کہتے ہی گولی چلا دی مگر اسی لمحے قالین سے رضا مراد اٹھ رہا تھا اور گولی اس کی پیشانی پر لگ کر پیچھے سے نکل گئی۔ اس کا خون اچھل کر روبینہ پر آیا۔ خون کے چھینٹوں اور فائر کی آواز نے روبینہ کو چونکا دیا اور اس نے بے ساختہ ہاتھ میں موجود گلدان شگفتہ پر دے مارا۔ وزنی گلدان اس کے ماتھے پر لگا اور وہ الٹ کر پیچھے گری اور ساکت ہو گئی۔ روبینہ ہسٹریائی کیفیت میں باہر کی طرف لپکی۔ اسے احساس نہیں تھا کہ اس کے منہ سے چیخیں نکل رہی تھیں اور آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ جب وہ گیٹ سے باہر آئی تو محلے والے اور چوکیدار پہلے ہی فائر کی آواز سن کر جمع ہو رہے تھے۔

☆☆☆

روبینہ دفتر میں آئی تو لڑکیوں کی شفٹ شروع ہو گئی تھی۔ مونا کے علاوہ دو لڑکیاں سحر اور فرحانہ آئی تھیں۔ رابعہ کی چند دن پہلے ہی شادی ہوئی تھی۔ ایک سال کے طویل عرصے میں روبینہ نے معاملات پر کسی حد تک قابو پا لیا تھا اور وہ اب بزنس آگے بڑھا رہی تھی۔ ماضی کی بھیانک یادیں رفتہ رفتہ اتنی پیچھے رہ گئی تھیں کہ اب اسے بہ مشکل ہی ان کا خیال آتا تھا۔ اس نے ایک مہینا بہت مشکل دیکھا تھا۔ پولیس نے اسے گرفتار کر لیا تھا مگر اس کے ماں باپ نے ایک قابل وکیل کیا جس نے ثابت کیا کہ وہ مظلوم ہے اور اس کے خلاف سازش ہوئی ہے۔ پولیس نے پہلے شگفتہ سے ساز باز ...کی اور اسے مدعی بنا لیا مگر چند پیشیوں کے بعد صورتِ حال بدل گئی اور عدالت نے نہ صرف پولیس چالان مسترد کر دیا بلکہ نئے سرے سے انویسٹی گیشن کر کے نیا چالان پیش کرنے کا حکم دیا۔ روبینہ کی خوش قسمتی کہ اس بار تفتیش جس ڈی ایس پی کے سپرد ہوئی، اس نے محنت اور دیانت سے اسے مکمل کیا۔ شگفتہ رضا مراد کی سازش میں اس کی ساتھی اور اس کے قتل کی مجرم قرار پائی۔ تمام شہادتیں اس کے خلاف آئی تھیں اور جس پیشی پر روبینہ کو باعزت بری کیا گیا، اسی پیشی میں اس پر فردِ جرم عائد کر دی گئی۔ چھ مہینے بعد سیشن کورٹ نے اسے عمر قید کی سزا سنا دی تھی۔ شگفتہ کے وکیل نے ہائی کورٹ میں اپیل کی ہوئی تھی مگر سزا سے بچنے کا امکان کم تھا۔ روبینہ کا وکیل بھی استغاثہ کی معاونت کر رہا تھا اور اس نے یقین دلایا تھا کہ سزا کسی صورت ختم نہیں ہوگی۔

کیونکہ روبینہ رضا مراد کی بیوی تھی اس لیے اس کی دولت اور اثاثوں میں بڑا حصہ روبینہ کو ملا تھا۔ اس کی دونوں بہنوں نے حصہ لیا تھا مگر اس کے بھائیوں نے حصہ لینے سے انکار کر دیا تھا۔ روبینہ کو کمپنی کے علاوہ مکان بھی ملا تھا۔ اس کے بھائیوں نے اسے بزنس فروخت کرنے کا مشورہ دیا مگر اس نے اسے چلانے کا فیصلہ کیا۔ وہ ماں باپ کے ساتھ اپنے مکان میں منتقل ہو گئی تھی اور خوش تھی کہ اب وہ ماں باپ کی مکمل دیکھ بھال کر سکتی تھی۔ اپنے مستقبل کے بارے میں اس نے مزید کچھ نہیں سوچا تھا۔ شاید آنے والے دنوں میں اسے کوئی مخلص آدمی مل جاتا مگر فی الحال اس کی ساری توجہ ماں باپ اور بزنس پر تھی۔

کفن بہ دوش

بے پناہ آزمائشوں میں مبتلا دنیا کی بہادر قوم کی المناک داستان

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

دوسرا اور آخری حصہ

کائنات کے کچھ حصوں میں زندگی کچھ اس طرح محبوس ہے کہ قدم قدم پر گویا سانسیں اپنے آنے جانے کا تاوان دے رہی ہوں... جیسے مقبوضہ کشمیرجہاں زندگی اور موت کی آنکھ مچولی اور تماشائیوں کی بھیڑ... کون ہے جو اس الجھی گتھی کو سلجھا سکے۔ بے شک حسن دیکھنے اور چاہے جانے کے لیے ہی بنایا گیا ہے، جسے پانے کے لیے دل مچل جاتا ہے مگر دیکھنے، چاہنے اور پانے کی خواہش میں کون اپنی حدود اور دوسرے کے سکون کی پروا کرتا ہے اور کون اپنی خواہشوں کی قربانی دیتا ہے... اس کا احساس تو بس کوئی ذی شعور ہی کرسکتا ہے... لیکن اس دھکم پیل میں کوئی یہ بھی سوچتا ہے کہ جس حسن کے پیچھے یہ جنگ جاری ہے کیا وہ اس تباہ کاری سے قائم بھی رہ سکے گا اور کیا پانے کے جنون میں مبتلا لوگ جب اسے پائیں گے تو وہ اپنی اصل حالت میں بھی باقی رہے گا۔ چھینا جھپٹی کے اس کھیل میں اس سرزمین پر پیدا ہونے والوں کا بھلا کیا قصور ہے جو اپنے حقوق کی جنگ لڑتے لڑتے بقا کا بھرم ٹوٹ جانے پر قبر میں اترتے جارہے ہیں۔ اپنی چیز کو اپنا کہنا بھی جہاں کسی بڑے جرم سے کم نہیں۔ دنیا بھر کے لوگ اپنے اپنے گھروں میں سکون کی نیند سوتے ہیں اور یہاں نہ رات کا چین نہ دن کا سکون۔ قدم قدم پر قدرت کی طرف سے دولت کی ریل پیل مگر پھر بھی بھوک وافلاس گھر گھر میں براجمان... یہ عجب امتحان ہے، جانے کب اور کیسے اس خونیں کھیل کا اختتام ہوگا... اور کیا خبر کیا انجام ہو... لیکن مسلمانوں کا ایمان ہے کہ اللہ کے گھر میں دیر ہے اندھیر نہیں... بس اسی یقین وایمان کے ساتھ یہ جہدِ مسلسل جاری ہے۔

بھارتی فوجیوں کی اس دراندازی پر شیر علی پریشان ضرور ہوا تھا مگر خوف کا ایک شائبہ تک اس کے چہرے پر نہیں آیا تھا۔اس کے برعکس وہ کیپٹن بھگوت کھٹپال کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ہوئے تھا جہاں کینہ توزی کی نمایاں چمک موجود تھی۔

''یہ...... یہ کیا حرکت ہے......؟'' دفعتاً کمرے کے خاموش ماحول میں غزالہ کی آواز ابھری، اس میں ہراس بھی تھا اور برہمی بھی۔

اسی کے ملے جلے لہجے کی عکاسی کرتی اس کے بھائی تنویر کی بھی چلاتی آواز سنائی دی تھی۔

''یہ ایک غلط حرکت ہے۔ہم احتجاج کریں گے۔تم لوگوں کی اس جارحانہ دراندازی پر......''

کیپٹن بھگوت کھٹپال نے اب شیر علی کی طرف سے نظریں ہٹا کر ان دونوں بہن بھائیوں کی طرف دیکھتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔''تم دونوں کون ہو اور یہاں کس مقصد کے لیے آئے ہو۔یہ ہم اچھی طرح جانتے ہیں......''

''تمہارا مقصد کیا ہے یہ کہنے کا کہ کون ہیں ہم...... جاسوس؟ دہشت گرد؟ بس اب تم لوگوں کو اپنا سیاہ چہرہ چھپانے کے لیے اسی طرح کے الزامات کا جھوٹا سہارا لینا رہ گیا ہے؟'' غزالہ جواب کافی سنبھل چکی تھی، اس بھارتی افسر کی بات پر تیز لہجے میں بولی۔ساتھ ہی غیر ضروری سے انداز میں وہ اپنے گلے میں جھولتے لاکٹ کے ''پینڈل'' کے ساتھ چھیڑ چھاڑ بھی کرنے لگی۔ایسے میں تنویر نے اپنا اور اپنی بہن کا تعارف ایک پاکستانی صحافی اور سیاح کی حیثیت سے کروادیا۔

اس پر کیپٹن بھگوت کھٹپال کی تنگ سیاہ پیشانی پر کچھ سلوٹیں ابھر آئیں۔پاکستانی اور پھر صحافی کے تعارف نے اس کی جارحانہ سوچ اور دراندازی کے اس دہشت گردانہ عمل کو اگر ایک طرف مہمیز بھی کیا تھا تو دوسری طرف اسے محتاط انداز اپنانے پر بھی مجبور کیا تھا اسے معلوم تھا کہ پاکستان کی شہ رگ اور بھارت کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھے ہوئے یہ دونوں صحافی ...کسی بھی وقت ان کی سیاہ کاریوں کی ''لائیو'' کوریج کو دنیا کے سامنے لا اور دکھا سکتے تھے۔ورنہ تو وہ یہی سمجھا تھا کہ یہ دونوں (غزالہ اور تنویر) کوئی عام سے سیاح ہیں جو بھارت ہی کے کسی شہر سے یہاں آئے ہوئے ہیں۔

اگلے چند سیکنڈوں میں تنویر اور غزالہ نے اپنی کاغذی طور پر شناخت بھی کروادی۔جس میں انٹرنل سیکیورٹی کلیئرنس کے خصوصی کاغذات بھی شامل تھے جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ دونوں مقبوضہ کشمیر میں پرامن طریقے اور رائج الوقت قانون کے مطابق داخل ہوئے تھے۔

کیپٹن بھگوت نے ان کے کاغذات چیک کیے۔اس پر مزید یہ حقیقت کھلی کہ یہ دونوں بہن بھائی پاکستان کے ایک بڑے اخباری ادارے کے مالک بھی ہیں۔لہٰذا وہ دل ہی دل میں ان دونوں بہن بھائیوں کو اپنی ''نظر'' میں رکھتے ہوئے روایتی مکاری سے بولا۔

''ٹھیک ہے لیکن یہاں کے حالات کے مطابق آپ دونوں کا ہم سے تعاون کرنا بھی فرض بنتا ہے۔کسی قسم کی مداخلت آپ کو مشکل میں بھی ڈال سکتی ہے۔'' کیپٹن بھگوت کھٹپال یہ کہنے کے بعد شیر علی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے مسلح اہلکاروں سے تحکمانہ انداز میں بولا۔

''اسے گرفتار کر کے ساتھ لے چلو۔'' اس کے حکم کی تعمیل میں فوراً بھارتی اہلکار شیر علی کو گرفتار کرنے کے لیے لپکے مگر تنویر اور غزالہ فوراً شیر علی کی ڈھال بن کر اس کے سامنے آن کھڑے ہوئے۔

''اسے کیوں گرفتار کیا جا رہا ہے؟ یہ تو بے چارہ ایک عام سا غریب کشمیری گائیڈ ہے؟ آخر اس کا قصور کیا ہے؟'' غزالہ نے کیپٹن بھگوت کھٹپال کی طرف دیکھ کر احتجاجاً کہا تو وہ اس کی طرف بڑی خرانٹ نظروں سے گھورتے ہوئے بولا۔

''میں ابھی تم دونوں سے یہ کہہ چکا ہوں کہ یہاں ہمارے کسی بھی معاملے میں تم دونوں کی دخل اندازی برداشت نہیں کی جائے گی۔یہ ایک ریاستی اور قانونی معاملہ ہے، ورنہ۔'' اس نے تہدیدی انداز میں دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا اور ساتھ ہی ایک بار پھر اپنے ساتھی اہلکاروں کو اشارہ کیا۔وہ دونوں ایک بار پھر حرکت میں آئے اور شیر علی کو دبوچ لیا تو وہ چلا کر بولا۔

''مجھے تم لوگ کس جرم میں گرفتار کر رہے ہو؟ کیا قصور کیا ہے میں نے؟''

''اپنا قصور تو تم خود بھی اچھی طرح جانتے ہو، جیوت بالکے اب زیادہ اداکاری مت دکھاؤ، چلو ہمارے ساتھ۔'' ان دو میں سے ایک اہلکار نے استہزائیہ لہجے میں کہا اور پھر یہ لوگ شیر علی کو اپنے ساتھ لے کر کمرے سے نکل گئے۔ہوٹل کے عملے میں سے کسی نے بھی ان کے آڑے آنے کی جرأت نہ کی تھی، لیکن تنویر اور غزالہ ان لوگوں کے کمرے سے نکلنے کے کچھ سیکنڈوں بعد کمرے سے باہر نکلے اور ہوٹل کے گیٹ پر آگئے۔ بھارتی فوجی شیر علی کو لیے جیپ

میں سوار ہو رہے تھے کہ اچانک ایک بوڑھے کو چیختے چلاتے ہوئے ان کی طرف بڑھتے دیکھا تو بری طرح ٹھٹکے۔

وہ بوڑھا محمد علی تھا، شیر علی کا باپ۔ وہ بے چارہ اپنے دونوں ہاتھ جوڑتا ہوا کیپٹن بھگوت کھٹپال کے سامنے آ گیا اور داد فریاد کرنے لگا مگر ایک فوجی نے اسے پرے دھکیل دیا اور شیر علی کو لے کر جیپ میں سوار ہو گئے۔ جیپ روانہ ہونے لگی تو وہ بوڑھا ''ہائے۔ میرا بچہ لے گئے۔ میرے بچے کو بچاؤ'' کہتا ہوا جیپ کے پیچھے دیوانہ وار دوڑ پڑا اور ایک جگہ ٹھوکر کھا کے گر پڑا۔ اریب قریب کے لوگ بوڑھے کو سنبھالنے کے لیے لپکے تو تنویر اور غزالہ بھی چونک کر اس کی طرف بڑھے۔

وہ بوڑھا اب اس طرح روئے چلائے جا رہا تھا جیسے بھارتی فوجی اس کی عمر بھر کی جمع پونجی اس سے چھین کر لے گئے ہوں۔

اتنے میں یہ دونوں بہن بھائی بھی اس کے قریب پہنچ گئے اور تنویر نے اس سے پوچھا۔ ''بابا! کیا یہ واقعی تمہارا بیٹا تھا؟'' محمد علی نے اپنی بوڑھی آنکھوں کے آنسو پونچھتے ہوئے روہانسے لہجے میں جواب دیا۔

''ہاں! یہ مجھ بدنصیب کا ہی لختِ جگر تھا۔ وہ ظالم اب نہ جانے اس کا کیا حشر کریں گے۔ میں لٹ گیا لوگو! برباد ہو گیا میں۔ سمجھایا بھی تھا باہر مت نکلنا، حالات صحیح نہیں۔ آہ۔ اب کیا کروں میں۔'' محمد علی کو آہ و زاریاں کرتے ہوئے غش آ گیا اور وہ وہیں گر پڑا۔ اس غریب بوڑھے کشمیری کی حالتِ زار دیکھ کر تنویر کے پورے وجود میں کرب کی لہر سی دوڑ گئی۔ اس کے قریب کھڑی غزالہ کے چہرے پر بھی دکھ کے آثار امڈ آئے تھے۔ باقی لوگ بوڑھے کو سنبھالنے لگے۔

تنویر کے اندر کھد بدی ہونے لگی، اس نے سوچا آخر پتا تو چلے شیر علی کو کس جرم میں بھارتی فوجی اس طرح اٹھا کر لے گئے تھے؟ تب اسے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ اصل معاملہ کیا تھا۔ پھر تنویر غزالہ کو ساتھ لیے کمرے میں آ گیا اور بولا۔

''ہمیں اس کی مدد کرنی چاہیے تھی۔'' غزالہ نے کہتے ہوئے اپنے ہونٹ بھینچے تو تنویر بولا۔

''ہم بھلا کیا مدد کر سکتے تھے اس غریب کی۔ تم نے اس بھارتی کیپٹن کا لہجہ محسوس نہیں کیا تھا کہ وہ ہم سے بھی کس قدر خار کھائے ہوئے تھا...... اس کا بس چلتا تو وہ ہمیں بھی گرفتار کر کے ساتھ لے جاتا۔'' بھائی کی بات پر وہ کچھ [illegible] بولی۔

''چلو اپنے کمرے میں، ایک شے تمہیں دکھاتی ہوں اور کم از کم جو ہم کر سکتے ہیں وہ تو ضرور ہمیں کرنا ہی چاہیے...... آؤ۔'' وہ یہ کہہ کر پلٹی۔ تنویر بہن کی بات پر چونکا، پھر اس کے ساتھ ہو لیا۔

ہوٹل کے کمرے میں پہنچ کر غزالہ نے اپنے گلے میں جھولتے ہوئے لاکٹ کو اتارا اور اسے کھولنے لگی تو تنویر ایک ہلکی اور معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ بے اختیار ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ شاید وہ سمجھ چکا تھا کہ غزالہ اسے کیا دکھانا چاہ رہی تھی۔ بولا۔

''آئی سی۔ اب سمجھا...... تم تو مجھ سے بھی تیز نکلیں۔ میرے ذہن میں بھی یہ بات تھی لیکن مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ سب اتنی جلدی ہو جائے گا۔''

''میں نے تو یہاں کے حالات کے مطابق داخلے کے وقت سے ہی اس کی تیاری کر لی تھی۔'' غزالہ مسکرائی۔ وہ دل کی شکل کا ''پینڈل'' کھول چکی تھی جس میں ایک مائیکرو ویلنس کیمرا تھا۔ وہ اپنے اس خفیہ کیمرے میں اس ساری مختصر مگر اہم کارروائی کی ویڈیو بنا چکی تھی۔ اس نے اپنا لیپ ٹاپ بیگ کھولا، اندر سے اور بھی چند ڈیوائسز نکالیں، پھر تھوڑی دیر میں ہی وہ مختصر ویڈیو کلپ اپنے لیپ ٹاپ کے ویڈیو فولڈر میں منتقل کر چکی تھی۔

''اسے شیئر کرنے کی جلدی مت کرنا ابھی۔'' تنویر، جو اس کی میز کے قریب ہی ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ چکا تھا، گہری متانت سے بولا۔ اس کے لہجے میں تنبیہ تھی۔ غزالہ نے بہ دستور اپنے لیپ ٹاپ پر نگاہیں جمائے رکھتے ہوئے اس سے جواباً کہا۔

''ہاں! مجھے بھی اس خطرے کا احساس ہے، جس کی طرف تم میری توجہ دلانا چاہتے ہو، کیونکہ ہمارے تعارف سے ہی وہ بھارتی کیپٹن اندر سے کھٹک گیا ہو گا اور ہم پر پوری نظر رکھے ہوئے ہو گا۔ اور کوئی بعید نہیں کہ اس نے ہمارے پیچھے اپنے جاسوس بھی چھوڑ دیے ہوں اور یہ کہ ابھی ''بگ'' کرنے کی کوشش چاہے گا، اسی لیے ابھی میں ایسی کسی جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کروں گی۔ تم بے فکر رہو، یوں بھی ابھی میرا کام نامکمل ہے۔ میں ایسے اور کئی ویڈیو کلپس لینا چاہوں گی اور جب یہ ایک مکمل ڈاکیومینٹری قسم کی فلم بن جائے گی تو ہم پاکستان لوٹنے کے بعد دنیا کے سامنے سیکولر بھارت کا اصل چہرہ دکھائیں گے۔''

''گڈ! تو گویا آپ اپنے نجی ٹی وی چینل کے لانچ ہونے تک یہ تہلکہ خیز ویڈیو ڈاکیومینٹری فلم تیار کر چکی ہوں

گی۔'' تنویر اس کے نیک عزائم جان کر توصیفی لہجے میں بولا اور تب تک غزالہ اپنا کام مکمل کر چکی تھی۔

☆☆☆

شیر علی کی بھارتی فوجیوں کے ہاتھوں گرفتاری کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پوری وادی میں پھیل گئی اور اس کے گھر سے لے کر عبدالرحمان کے گھر اور گل نور کے کانوں تک پہنچی تو وہ تڑپ اٹھی۔ اس کا چاچا گھر پر نہیں تھا، وہ خود اس وقت اپنی چاچی کے ہمراہ رات کے کھانے کی تیاری میں ان کا ہاتھ بٹا رہی تھی کہ یہ اطلاع کسی پڑوس کی خاتون نے دی اور پھر گل نور پریشان ہو گئی۔ اس کی چاچی کی نگاہوں سے اس کی ''پریشانی'' چھپی نہ رہ سکی تھی۔ تب اس نے کہا۔

''نور بیٹی! میرا برقع نکال، ابھی عائشہ بہن کے پاس جا کر خیر خبر لے آتے ہیں۔'' وہ جیسے اسی بات کی منتظر تھی، فوراً اندر کمرے کی طرف لپکی اور اپنا پشمینہ سنبھالنے کے بعد چاچی کا برقع بھی لے آئی۔

عائشہ خاتون کا گھر ایک دو گھر چھوڑ کے برابر میں ہی تھا۔ وہاں اور بھی محلے کی عورتیں پریشان حال ماں بیٹیوں کو تسلی دینے کی کوشش کر رہی تھیں۔ یہ بھی پہنچیں تو شیر علی کی بہن زینو جو گل نور کی سہیلی اور ''رازداں'' بھی تھی، اسے دیکھ کر روتے ہوئے اس کے ساتھ لپٹ گئی اور اسی لہجے میں بولی۔

''نن...... نور! وہ...... وہ ظالم، میرے شیر جیسے بھائی کو اٹھا کر لے گئے۔ اب کیا ہوگا؟ یہ بھارتی غنڈا فوجی بہت ظالم ہیں۔ وہ...... وہ......'' اس کی ہچکیاں بندھ گئیں اور فرطِ غم کے باعث وہ اپنا جملہ بھی پورا نہ کر سکی۔ خود گل نور کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں اور تشویش سے چہرہ پھیکا پڑ گیا تھا۔ وہ تو خود تسلی کے لیے آئی تھی، اسے تسلی دیتے ہوئے بولی۔

''زینو! اللہ سے دعا مانگو۔ وہی ہمارا حامی و ناصر ہے۔ خدایا شیر علی کو اپنی امان میں رکھنا۔''

وہ خود بھی آخر میں دعائیہ بولی تو زینو نے اس سے پوچھا۔ ''چاچا رحمان کہاں ہیں نور...... انہیں خبر ہے؟''

''وہ گھر پہ نہیں تھے، لیکن تم فکر نہ کرو وہ جہاں بھی ہوں گے اتنی اہم خبر ان سے چھپی نہیں رہی ہوگی اور جیسے ہی انہیں پتا چلے گا وہ شیر علی کو ان ظالم بھارتیوں سے چھڑانے کی پوری کوشش کریں گے۔'' گل نور نے تسلی دینی چاہی مگر خود اس کا اپنا دل طرح طرح کے وسوسوں اور خدشات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔

شیر علی اور گل نور کا بھی عجب قصہ تھا۔ ان دونوں نے کبھی سامنا ہونے پر بھی ایک دوسرے سے اظہار محبت نہیں کیا تھا اور نہ ہی کبھی انہوں نے اس کی ضرورت بھی سمجھی یا محسوس کی تھی۔ وہ دونوں اسی طرح تو ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر جوان ہوئے تھے۔ ایک دوسرے کے ساتھ کھیل کر ان کی محبت پروان چڑھی تھی اور اس کا اظہار وہ دید پُرشوق تھی، جو ایک دوسرے کی ہر وقت بے چینی سے راہ تکتی رہتی تھی۔ پھر جب اپنایت کی ان بڑھتی ہوئی معصوم منزلوں نے جوانی کی بہار دیکھی تو تب تک آپوں آپ دونوں نے یکجا ہو کر باہم ایک پاکیزہ محبت کا سیپ بنا لیا تھا...... یوں بچپن سے لڑکپن اور پھر نوجوانی تک یہ سیپ بحر الفت کی تہ میں انتظار کی اس وصل شب کی پیاس سہہ رہا تھا، جس طرح ایک سیپ برسوں سمندر کی تہ میں رہنے کے باوجود پیاس سہتا ہے اور تب ہی تو اسے سچا موتی نصیب ہوتا ہے۔ دونوں کی پیاسی آنکھوں نے اور بے چین دلوں کی تڑپ نے باور کروا دیا تھا کہ ان کی محبت محتاجِ اظہار نہیں رہی ہے۔ تو پھر بند خول کی اس سفید و شفاف محبت کی سیپ پر داغ کیوں لگایا جائے؟

شیر علی سے متعلق اس بری خبر نے گل نور کو ستا کے رکھ دیا تھا۔ وہ اس وقت خود درد و الم کی گٹھڑی بنی ہوئی تھی، جس نے اپنے غم کا بوجھ خود ہی اٹھا رکھا تھا اور اب دوسروں کے درد کا درماں بنی یہاں موجود تھی۔ اس کی باتوں سے شیر علی کی لاڈلی بہن زینو کو تسلی تو ہوئی تھی مگر وہ بار بار چاچا رحمان کا ذکر کرتے ہوئے اسے یاد دلا رہی تھی کہ وہ وادی میں ایک معتبر حیثیت رکھتے ہیں اور ان کا مقام ایک بہادر اور جری کشمیری کمانڈر کا تھا۔ انہیں بھائی شیر علی کی بخیریت رہائی کے لیے اقدامات اٹھانے چاہئیں اور یہی گل نور اسے تشفی دیتے ہوئے سمجھا رہی تھی کہ وہ اب تک اس مقصد میں مصروف کار ہو چکے ہوں گے اور بہت جلد انہیں اچھی خبر سننے کو ملے گی۔

کمانڈر عبدالرحمان کو شیر علی کی گرفتاری کی جب خبر ملی تو وہ اس وقت اپنے چند سرفروش مجاہدوں کے ساتھ بارہ مولا کے ایک خفیہ ٹھکانے میں موجود تھے۔ یہ اطلاع پاتے ہی وہ پریشان اور تشویش زدہ ہو گئے۔ ان کے قریب بیٹھے مجاہد ان کے حکم کے منتظر تھے۔

''ہمیں فوراً وادی میں ہڑتال کروانا ہوگی اور نوہاٹا چوک کی طرف سب کشمیری بھائیوں کو اکٹھا کرنا ہوگا۔'' نائب کمانڈر شجاع احمد نے مشورہ دینے کے انداز میں ان سے کہا تو وہ انکار میں اپنا سر ہلاتے ہوئے بولے۔

''نہیں، ان ہڑتالوں سے ہمارے غریب کشمیری بھائیوں کا نقصان زیادہ ہوتا ہے اور پھر ہڑتال کے ساتھ ہی

بھارتی فوجیوں کو وادی میں کرفیو نافذ کرنے کا بھی موقع مل جاتا ہے، اس طرح صورتِ حال برعکس ہو جاتی ہے۔"

"تو پھر محترم! اب کیا کیا جائے؟ اس نئے مسئلے کی وجہ سے ہماری موتی بھون والی مہم التوا کا شکار بن رہی ہے۔" شجاع نے کہا۔ اس کے لہجے سے ایک جوش آمیز تفکر مترشح تھی۔

درحقیقت امیراں کدل پل پر واقع بھارتی فوجیوں کی ایک عارضی چھاؤنی "موتی بھون" کو تباہ کرنے اور بھارتی درندہ صفت کرنل ستیارام ڈوڈیجا کو جہنم واصل کرنے کا منصوبہ بنایا جا رہا تھا لیکن ابھی تک اس سلسلے میں کوئی عملی پیش رفت نہیں ہو سکی تھی۔ مجاہدین نے دو "ایکشن پلان" بھی مرتب کیے تھے لیکن بعض اہم سقم کی وجہ سے کمانڈر عبدالرحمان نے انہیں رد کر دیا تھا۔ اب انہوں نے ایک تیسرا پلان بنایا تھا تو وہ بھی رد کیا جا چکا تھا کہ شیر علی والا معاملہ اٹھ کھڑا ہوا۔

کمانڈر عبدالرحمان نے اپنے نائب کی بات پر غور کرنے کے انداز میں اس کے چہرے پر ایک نظر ڈالی اور اپنی باریش پہ ایک ذرا ہاتھ پھیر کر بولے۔

"موتی بھون والی مہم سے زیادہ اہم معاملہ شیر علی کا ہے۔ شجاع! شیر علی کو شاید تم نہیں جان سکے، جتنا کہ میں اسے جاننے لگا ہوں۔ میں نے اس نوجوان کی آنکھوں میں جس روز سے آزادی کی شمع کو ایک ولولے کے ساتھ فروزاں دیکھا ہے، اس دن سے میں اس کو قدر کی نگاہ سے دیکھنے لگا ہوں۔ شیر علی جیسے مجاہد، دس سرفروش مجاہدین کے برابر ہوتے ہیں۔ اسی لیے ہمیں سب سے پہلے شیر علی کے معاملے پر توجہ دینی ہوگی۔"

کمانڈر عبدالرحمان کی بات پر نائب شجاع نے اپنے سر کو پورے احترام کے ساتھ تفہیمی جنبش دی تھی، تاہم عبدالرحمان کی گھاگ نظروں نے اس کی آنکھوں سے جھلکتی بے چینی کو صاف طور پر محسوس کر لیا تھا۔ کمانڈر عبدالرحمان اپنے ساتھیوں پر اپنی مرضی تھوپنے کے قائل تھے نہ ہی اپنا حکم مسلط کرنے کے عادی۔ وہ اپنے سارے کمانڈوز ساتھیوں کی "یک رائے" جاننے کے بعد اسی روشنی میں اپنا حتمی فیصلہ سناتے تھے، اسی لیے ان کا وہی فیصلہ آخری سمجھا جاتا تھا۔

بہر طور انہوں نے شجاع کی طرف دیکھتے ہوئے نہایت ملائمت آمیزی سے پوچھا۔

"کیا بات ہے شجاع! تم شاید کچھ کہنا چاہتے تھے؟"

اپنے ہر دلعزیز کمانڈر کے یوں کہنے پر جیسے شجاع کی مراد بر آئی، وہ بہ یک ترنت بولا۔

"محترم! شیر علی والا معاملہ اپنی جگہ مگر موتی بھون والی مہم بھی اہمیت کی حامل ہے۔ اسے جلد پایۂ تکمیل تک پہنچانا بھی ضروری ہے، ورنہ ان بھارتی غاصبوں کی... دراندازی بڑھتی جائے گی۔ اننت ناگ اور بارہ مولا میں اس خبیث کرنل ستیارام نے غریب اور نہتے کشمیری بھائیوں کا جینا حرام کر رکھا ہے۔ اس کے دستِ راست کیپٹن بھگوت کھنپال نے ہماری غیرت اور عزتِ نفس کو خاص طور پر نشانہ بنا رکھا ہے۔ میں چاہتا ہوں آپ شیر علی والا معاملہ سنبھال لیں اور مجھے ایک الگ گروپ کی کمانڈ اینڈ کنٹرول تفویض کر دیں۔ میں سب سے پہلے اپنے گروپ کے چند ساتھیوں کی مدد سے موتی بھون والی مہم کو سر کرنا چاہتا ہوں۔" شجاع نے اپنی بات ختم کی تو کمانڈر عبدالرحمان کے چہرے پہ ہلکی سی مسکراہٹ عود کر آئی۔ ان کی نظروں میں شجاع کی وہی اہمیت تھی جو اب شیر علی کے سلسلے میں ان کی نگاہ انتخاب میں آنے والی تھی۔

شجاع ایک ستائیس اٹھائیس سالہ پُرجوش اور بہادر نوجوان تھا۔ یہ اننت ناگ کا رہنے والا تھا اور کشمیری مجاہدوں کے اس گروپ میں شامل ہوئے اسے کچھ زیادہ طویل عرصہ بھی نہیں ہوا تھا مگر گروپ میں شمولیت اختیار کرتے ہی اس نے خصوصی تربیت کے بعد ایسے ایسے کارہائے نمایاں انجام دیے تھے کہ اسے مجاہدین کے.... عبدالرحمان گروپ کا نائب بنا دیا گیا تھا۔

مضبوط تن و توش جسامت کا مالک شجاع فطرتاً ایک... جوشیلا اور اپنے کاز پر جان لڑا دینے والا ایک جری نوجوان تھا۔ اپنی مادرِ گیتی کے سینے پر غاصب بھارتیوں کے ناپاک قدم پر جہاں دیگر کشمیریوں کے دل شعلہ جوالا بنے ہوئے تھے، ان میں شجاع بھی پیش پیش تھا لیکن اس نے اپنی عملی مجاہدانہ زندگی کا آغاز اس وقت کیا تھا جب ایک ہندو میجر چندر گپتا نے اپنے شیطانی ٹولے سمیت اس کے گھر پر ہلا بولا تھا اور اس کے ماں باپ کو بے دردی سے قتل کر دیا تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ اس کی بھابی اور جوان بہن کی عصمت بھی تار تار کرنے کے بعد میجر چندر گپتا اور اس کے شیطانی ٹولے نے اس کے گھر کو بھی آگ لگا دی تھی جس میں سوائے اس کے سب شہید ہو گئے تھے۔ اب یہ اس کی خوش قسمتی تھی یا پھر کاتبِ تقدیر نے رذیل صفت میجر چندر گپتا کی موت اس کے ہاتھوں لکھی تھی کہ شجاع زندہ بچ گیا تھا مگر زخمی حالت

میں اس نے پورا ایک ماہ بستر پر گزارا تھا اور کیسے ایک جگہ پڑے رہ کر اس نے ایک صدی جیسا مہینا گزارا تھا یہ وہی جانتا تھا۔ ورنہ تو اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ صبح ہوتے ہی میجر چندر گپتا کو واصلِ جہنم کر ڈالتا۔

ایک ماہ جیسے تیسے گزارنے کے بعد اس نے مجاہدین کے مذکورہ گروپ میں شرکت کی اور خصوصی تربیت لینے کے بعد اس نے اپنے سینے کی آتشِ انتقام سرد کرنے کے لیے اس درندہ صفت بھارتی میجر چندر گپتا اور اس کے ٹولے کی سرکوبی کے لیے زبروان نامی سلسلہ کوہ کے دامن میں واقع میجر چندر گپتا کے ٹھکانے پر گوریلا حملہ کر کے اسے جہنم رسید کر ڈالا۔

اس شیطان صفت بھارتی میجر کے فنا کے گھاٹ اترتے ہی اننت ناگ اور بارہ مولا کے مسلم کشمیریوں نے سکھ کا سانس لیا تھا مگر اب کچھ عرصے سے ایسے ہی ایک اور بھارتی شیطانی ٹولے کرنل ستیا رام اور اس کے دستِ راست، جو اپنی فطرت میں میجر چندر گپتا سے بھی دو ہاتھ آگے تھے نے بارہ مولا اور اننت ناگ سمیت سری نگر میں ایک عرصے سے ظلم و بربریت کا بازار گرم کر رکھا تھا۔

بہر طور کمانڈر عبدالرحمان نے شجاع کی یہ تجویز قبول کرتے ہوئے اسے موتی بھون والی مہم کا سرخیل بناتے ہوئے اپنی صوابدید پر اسے پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی اجازت دے ڈالی۔ شجاع کی بڑی بڑی روشن آنکھوں میں ایسی ہی چمک ابھری تھی جیسی کسی عقاب کو بلندی سے نیچے اپنا کوئی شکار دکھائی دے جائے۔

☆☆☆

جیپ بڑی تیزی کے ساتھ فراٹے بھرتی اپنے عقب میں دھول اڑاتی، امیراں کدل پل والے راستے پر دوڑی جا رہی تھی۔

ہوٹل سے شیر علی کو گرفتار کرنے کے بعد روانہ ہوتے ہی کیپٹن بھگوت کھٹپال نے اپنے مخبر جسونت تیواری سے رابطہ کیا تھا اور اسے مذکورہ ہوٹل میں مقیم دونوں پاکستانی صحافی بہن بھائی پر نظر رکھنے کی ہدایت دے دی تھی۔ ساتھ ہی اسے تاکید کی تھی کہ ان کی کسی بھی مشکوک حرکت پر بلا تاخیر متعلقہ تھانے کے انچارج انسپکٹر چندر لال کو فوراً اس کی اطلاع کرے۔ اس سلسلے میں کیپٹن بھگوت کھٹپال نے پہلے ہی سے انسپکٹر چندر لال کو ”بریف“ کر رکھا تھا...... وہ ”مشکوک“ حرکت کیا ہو سکتی تھی، اس کا مخبر جسونت کو بہ خوبی اندازہ

شیر علی کے کانوں تک بھی یہ ”ہدایت“ پہنچی تھی مگر بھگوت کو اس کی پروا نہ تھی۔ اسے شاید اپنی طاقت کا کچھ زیادہ ہی زعم تھا کہ اب ان کا شکار (شیر علی) بھلا ان کے شکنجے سے کہاں بچ کر جا سکتا ہے؟ تاہم شیر علی ان دونوں بہن بھائیوں کی طرف سے فکرمند سا ہو گیا۔ خود اسے اپنی سے زیادہ گھر والوں اور بالخصوص گل نور کی بھی فکر ستا رہی تھی کہ جب ان سب کو اس کی بھارتی فوجیوں کے ہاتھوں گرفتاری کا پتا چلے گا تو ان بے چاروں پہ کیا گزرے گی۔ اسے اپنے بوڑھے باپ کی آہ و زاری پر بھی دکھ ہو رہا تھا کہ وہ کس طرح اس کی رہائی کے لیے اس مردود کیپٹن بھگوت کے آگے ہاتھ جوڑ کر منتیں کر رہا تھا۔ وہ نہ جانے کس طرح اسے ڈھونڈتا ہوا وہاں آن نکلا تھا۔

ایک موڑ کاٹنے کے بعد جیپ نے اپنا راستہ بدل دیا اور قلعہ موتی بھون کے کھنڈرات والے علاقے میں داخل ہو گئی۔ لگ بھگ کوئی چھ سات کلومیٹر کے بعد جیپ، اس عارضی چھاؤنی کے بڑے سے پھاٹک کے اندر داخل ہو رہی تھی جہاں قلعے کے اندر بڑی بڑی کئی چھولداریاں بنی ہوئی تھیں۔

جیپ انہی میں سے ایک نسبتاً بڑی چھولداری کے سامنے ایک جھٹکے سے جا رکی اور کیپٹن بھگوت کھٹپال سمیت دیگر فوجی کدکڑے مار کر نیچے اتر آئے۔ شیر علی کو بھی دو فوجیوں نے دبوچ کر نیچے اتار لیا اور اسے لیے چھولداری کی طرف بڑھے۔

شیر علی اندر سے پریشان ضرور تھا مگر ہراساں نہیں تھا۔ وہ یہاں پہلی بار لایا گیا تھا مگر اس نے یہاں آتے وقت بھی اپنے حواسوں پر قابو پائے رکھا تھا اور اب دزدیدہ نظروں سے اطراف کا بھی جائزہ لیتا جا رہا تھا۔

اندر کرنل ستیا رام فون پر کسی سے باتیں کرنے میں مصروف تھا۔ شیر علی کو کیپٹن بھگوت نے اس کے روبرو پیش کر دیا۔ اس کے مکروہ چہرے اور بدہیئت سیاہ ہونٹوں پر بڑی فاتحانہ مسکراہٹ تھی اور وہ اسی نظروں سے اپنے گرو گھنٹال کرنل ستیا رام کی طرف تکے جا رہا تھا کہ ایسے میں ستیا رام نے فون پر اپنی گفتگو کا سلسلہ موقوف کر کے ریسیور قریب کھڑے ایک وردی پوش اہلکار کی طرف بڑھا دیا اور چند قدم چلتا ہوا شیر علی کے قریب آن کھڑا ہوا۔

چند ثانیے وہ چندی چندی مکارانہ نظروں سے شیر علی کے چہرے کو بہ غور گھورتا رہا، اس کے بعد جھٹکے دار لہجے میں اس کا نام پوچھا۔

''کیا نام ہے رے تیرا؟''

''شیر علی۔''

''ہم۔ نام تو تیرا بڑا جیوٹ ہے رے، دکھتا بھی ایک دم دھاکڑ ہے، پرنتو کیا ہے کہ اپنے مزاج میں آتنگ وادی کی تعریف کرنا چنتا نہیں۔ بس! اس سے بڑھ کر ہم تمہاری تعریف نہیں کریں گے۔'' کرنل ستیا رام جیسے شیر علی کی بے بسی اور قید و بند جیسی کیفیات سے حظ اٹھاتے ہوئے بولا اور پھر ایکا ایکی اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ سفاکی میں بدل گئی اور وہ کسی باؤلے کتے کی طرح اپنے دانت نکوستے ہوئے، غراہٹ سے مشابہ آواز میں اس سے دوبارہ مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

''کشمیر بنے گا پاکستان کا نعرہ تو نے ہی لگایا تھا نا؟''

''ہاں۔'' شیر علی نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے جم کر کہا۔

''سزا جانتا ہے اس نعرے کی تو؟'' کرنل ستیا رام کے لہجے میں تہدید کی ایسی سنسنی خیزی تھی جو رگوں میں دوڑتے لہو کو بھی منجمد کر دے مگر شیر علی بے تاثر لہجے میں بولا۔

''نہیں۔''

''اچھا لگا رے تیرا جواب۔ نہیں ں ں ں......'' کرنل ستیا رام نے ''نہیں'' کے نون غنہ کو ذرا طویل کھینچا۔ ''چلو بتائے دیتے ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے کرنل ستیا رام۔۔ بہ ظاہر پیچھے کی طرف مڑا۔ لگا ایسا ہی تھا کہ وہ اپنی جگہ کی طرف بڑھے گا مگر اچانک ہی وہ وہیں کھڑے کھڑے دوبارہ پلٹا اور شیر علی کا گریبان پکڑ کر ایک جھٹکے سے اس کا چہرہ اپنے مکروہ چہرے کے قریب کرلیا اور ایک ایک لفظ چبا کر بولا۔

''پاکستان کا نام لینے والے کو بھی ہم زندہ جلا دیا کرتے ہیں اور یہ معاملہ تو پھر کشمیر کا ہے۔ بول اب کیا کہتا ہے؟ چکائے گا اس نعرے کی قیمت اپنی چتا پر بلی دے کر؟''

''میں جو اپنے بڑوں کی زبانی سنتا آیا تھا، وہی بول بھی دیا۔ کیا اس طرح نعرہ لگا دینے سے کشمیر پاکستان بن جائے گا؟ کیا تم لوگ پاکستان سے اتنے ہی خوف زدہ رہتے ہو؟'' شیر علی نے بہ ظاہر سپاٹ لہجے میں جواب دیا مگر اندر اس کے ایک آگ سی بھڑکنے لگی تھی اور اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اس غاصب کرنل کا گلا دبوچ ڈالے مگر وہ مصلحتاً درمیانی راہ اختیار کیے ہوئے تھا، کیونکہ وہ ایک ذلیل کتے کے ہاتھ بے نام موت نہیں مرنا چاہتا تھا۔ ان کے خلاف کچھ کر کے گلے لگانے میں اسے مطلق افسوس نہ ہوتا

لیکن باوجود اس کے اس نے آخر میں اسے پاکستان سے روایتی خوف لگے رہنے کا طعنہ بھی ضرور دے دیا تھا، جس پر کرنل ستیا رام قدرے چونک کر اس کا چہرہ کچھ غور سے تکنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں واضح طور پر ایک نامعلوم سی الجھن تیر گئی۔ اس کی اپنی بھی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ شیر علی نے طنزو استہزائیہ کا یہ جوتا جو اس کے منہ پر مارا تھا، وہ واقعی ایسا ہی تھا یا پھر اس نے روا روی میں ایسا کہہ دیا تھا؟ تاہم وہ اس کی اول اللہ ذکر بات ''میں جو اپنے بڑوں کی زبانی سنتا آیا تھا وہی بول بھی دیا، کیا اس طرح نعرہ لگا دینے سے کشمیر پاکستان بن جائے گا؟'' پر اس نے اپنے تئیں یہ اندازہ لگانے کی ضرور سعی چاہی تھی کہ وہ اسے جو سمجھ رہا تھا، شاید ایسا تھا نہیں۔ یا پھر اٹھارہ انیس سالہ یہ دبلا مگر مضبوط کاٹھی کا بالکا اسے ڈاج دینے کی کوشش کر رہا تھا۔

اس نے ایک اور زوردار جھٹکے سے اس کا گریبان چھوڑ بھی دیا اور نتیجے میں شیر علی چند قدم دانستہ پیچھے کو لڑکھڑاتا چلا گیا اور پھر کرنل ستیا رام اور اس کا دست راست کیپٹن بھگوت کھنپال کو شاید چونکنے کا موقع بھی دیر سے ملا تھا کہ چند قدم دانستہ ذرا پیچھے تک لڑکھڑاتے ہوئے شیر علی نے یک دم پلٹا کھایا اور چھولداری سے باہر کو دوڑ لگا دی۔

چھولداری کے باہر سردیوں کی شام بھی جھکنے لگی تھی اور ہر سو رات کا گماں ہوتا تھا۔ اسی تاریکی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے شیر علی نے چھولداری سے باہر نکلتے ہی ایک طرف کو دوڑ لگا دی تھی۔ عارضی ٹھکانے کا یہ محل وقوع ایسا ہی تھا، جیسے جگہ جگہ ''کیمپنگ'' کی گئی ہو۔ لہٰذا اس نے فرار ہوتے وقت ایک عقل مندی یہ ضرور کی تھی کہ کھلے کی طرف، جہاں کچھ گن بردار فوجی کھڑے تھے...... رخ کرنے کے بجائے، ان کیمپوں کے درمیان بنے خلا میں داخل ہو گیا تھا جو ایک طرح سے بھول بھلیوں کا منظر پیش کرتے تھے۔

اندر کرنل ستیا رام اور کیپٹن بھگوت کھنپال ایک دوسرے کا منہ تکتے رہ گئے۔ شیر علی کی یہ درانہ وار حرکت ان بھارتی ''مہاویر چکروں'' کے لیے قطعی غیر متوقع تھی۔

''پکڑو اسے۔ وہ ہاتھ بھر کا لونڈا ہمیں ترت بھاؤ دکھا گیا۔'' کرنل ستیا رام حلق کے بل چلایا اور تب ہی جیسے کیپٹن بھگوت کھنپال کو بھی ہوش آیا۔ وہ ''پکڑو پکڑو۔ جانے نہ پائے'' کا شور مچاتا ہوا باہر کو دوڑا۔

ادھر شیر علی بھی ایک چھلاوا ثابت ہوا۔ بھرپور جسمانی قوت کے ساتھ اس کا ذہن بھی دوڑ رہا تھا۔ جب تک دیگر فوجی اس کے تعاقب میں لپکے، وہ موتی بھون کے برسوں پرانے

کھنڈرات کی اسرار بھری تاریکیوں میں مدغم ہو چکا تھا۔

اس کی ڈھنڈیا پڑ چکی تھی اور خاصا شور مچ گیا تھا، جس میں کبھی کبھار ہلکی ساخت کی مشین گن کے برسٹ چلنے کی خوفناک آواز بھی شامل ہو جاتی تھی۔ یہ فائرنگ اسے خوف زدہ کرنے کے لیے کی گئی تھی مگر شیر علی کیا، اس جیسے نہ جانے کتنے ہی کشمیری نوجوان ایسی فائرنگ اور گولیوں کی چھاؤں میں پل بڑھ کر جوان ہوئے تھے، بھلا انہیں یہ ”پٹاخے“ کیا خوف زدہ کرتے؟

شیر علی یہاں کے چپے چپے سے واقف تھا۔ موتی بھون کے اس پرانے اور خوابیدہ کھنڈرات میں وہ ایسے خفیہ راستے کی طرف بڑھا، جو..... امیراں پل کے بالکل قریب ہی نکلتا تھا۔ اگرچہ وہاں سے نکلنا بھی آسان نہ تھا، کیونکہ اس طرف بھی پہرا ہوتا تھا مگر اس کے لیے وہاں سے نکلنا مشکل ضرور تھا ناممکن نہیں۔

امتدادِ زمانہ کی عکاسی کرتے اس قلعے کا رقبہ خاصا وسیع تھا۔ بدلتے وقتوں اور جغرافیائی تغیر و تبدل نے اس کی سطحِ مرتفع پر بھی اثر ڈالا تھا جس کے باعث اس کی زمین کہیں کہیں سے ڈھلانی ہو گئی تھی۔

وہ چھپتا چھپاتا کھنڈرات کے بعید ترین گوشے کی طرف نکل آیا۔ یہاں ڈیوڑھی سی بنی ہوئی تھی، اوپر تھوڑا کھلا آسمان نظر آتا تھا جو روشن اور چمک دار تھا، اسی کی روشنی میں اس نے اطراف کا جائزہ لیا۔ اس کے اردگرد پھیلے ہوئے کھنڈرات کے سیلن زدہ سنگی اور خالی چوکھٹوں کے خلا اسے گھورتے محسوس ہو رہے تھے۔ ہر سو تاریک سناٹے کا راج تھا۔ معاً ہی عقب سے دو تین تلے اوپر فائر ہوئے، قلعے کے متروک در و بام کافی دیر تک اس کی آہنی آوازوں میں چیختے رہے۔ اس نے فوراً حرکت کی اور جلد ہی سینے کے بل پر آ گیا اور اسی طرح تیزی سے رینگتا ہوا وہ اپنی مطلوبہ سمت کی طرف نکل آیا، جہاں ایک ڈھلان تھی جو خاصی عمودی تھی۔ ایک خاص ٹرک سے اسے عبور کرنا شیر علی کے لیے کوئی مشکل نہ تھا۔ اس نے اللہ کا نام لیا اور خود کو ڈھلان پر چھوڑ دیا۔

شیر علی نے اس بات کا خیال ضرور رکھا تھا کہ ڈھلان سے رگڑ کھاتے ہوئے اس کے جسم سے اس کا سر ذرا اوپر کو اٹھا رہے۔ اس ڈھلان کا اختتام اس دریا کے کراڑے پر ہوتا تھا، جس پر امیراں کدل پل بنا ہوا تھا۔ وہاں تک پہنچتے ہی وہ چند ثانیے کے لیے چیتے کی طرح دبکا گردوپیش کی سن گن لیتا رہا۔

پل دور تھا اور وہاں سے کچھ ٹمٹماتی روشنیاں دکھائی دیتی تھیں، اس نے قدرے اطمینان سے اپنے سر کو اثبات میں جنبش دی۔ وہ پہرے دار چوکیوں سے کافی دور تھا۔ اسی وقت وہ بری طرح ٹھٹکا۔ اچانک ایک پٹاخے جیسا دھماکا ہوا تھا اور اس کی ٹھٹکی ہوئی نظروں نے دیکھا کہ ایک تیز سی شعاع دار لکیر تاریک آسمان کی طرف لپکی اور مخصوص بلندی پر پہنچ کر منتشر ہو گئی۔ یہ فلش بم تھا۔ اس نے دور و نزدیک روشنی سی پھیلا دی تھی۔ حتیٰ کہ خود شیر علی بھی روشنی میں نہا گیا۔ وہ تھوڑا سا گھبرا گیا، ٹھیک اسی وقت یکے بعد دیگرے دو تین فائر ہوئے۔ چوکی سے اس کی طرف اسنائپر گن سے فائر کیا گیا تھا۔ ایک گولی اس کے قدموں سے محض چند فٹ کے فاصلے پر زمین میں پیوست ہوئی تھی اور دوسری اس کے دائیں طرف جھاڑیوں میں جا دھنسی تھی، جبکہ تیسری گولی تو بالکل اس کی کنپٹی کے قریب سے شائیں کرتی گزری تھی جس کی سنسناتی ہوئی ”جھپک“ اسے اپنے چہرے پہ صاف محسوس ہوئی تھی۔ اس کی خوش قسمتی تھی کہ وہ بال بال بچا تھا۔ بس یہی وہ موقع تھا جس سے شیر علی نے فوراً فائدہ اٹھاتے ہوئے خود کو جھاڑیوں میں گرا لیا۔

وہ سمجھ گیا تھا کہ اس فلش بم کی روشنی میں، بہت دور واقع چوکی کی طرف سے اس پر اسنائپر گن سے فائر کیا گیا تھا۔ روشنی اب بجھ گئی تھی۔ وہ تیزی سے جھاڑیوں میں کرالنگ کرتا ہوا دریا کے کراڑے کی آڑ لیتا ایک پہاڑی ڈھلان کی طرف نکل آیا۔ یہاں پہنچ کر وہ ذرا ستانے کے لیے رکا۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی مگر بھارتی فوجیوں کے نرغے سے اس طرح بچ نکل جانے پر وہ ان کی شکست سے خوشی بھی محسوس کر رہا تھا۔

تھوڑا اور آگے جا کر اس نے پانی میں چھلانگ لگا دی اور اسی جوش و جذبے نے اس کے اندر ایک طاقت اور قوتِ ارادی کو ایسی تحریک دی تھی کہ پھر وہ نہیں رکا اور تیرتا چلا گیا، یہاں تک کہ دوسرے کنارے پر ہی جا کر دم لیا۔ یہاں سے اس کے گھر کا راستہ آسان اور قریب تھا۔ وہ تھوڑا ستانے کے بعد اٹھا اور ایک نظر پیچھے ڈالنے کے بعد آگے بڑھ گیا۔

گھر پہنچ کر اس کا ارادہ ان دونوں پاکستانی صحافی بہن بھائیوں سے ملنے کا تھا، وہ ان سے مل کر بھارتی فوجیوں کے مخبر جسونت تیواری کے بارے میں بھی بتانا چاہتا تھا اور اس سے ہوشیار رہنے کی تلقین بھی کرتا۔

اس کے اطراف میں گہری خاموشی اور ویرانی کا راج تھا۔ دور ڈل جھیل کی طرف سے روشنیوں کی قندیلیں سی

جلتی نظر آتی تھیں۔ وہ یہاں بھی محتاط روی کا مظاہرہ کرتے ہوئے آگے بڑھتا رہا اور بالآخر جب پہر رات کی خاموشی میں اپنے گھر پہنچا تو وہاں ایک خون کے آنسو رلا دینے والا سانحہ رونما ہو چکا تھا۔

☆☆☆

کیپٹن بھگوت کھٹپال کی حالت پاگل جنونیوں جیسی ہو رہی تھی۔ شیر علی جس طرح ان کی ناک کے نیچے سے نکل جانے میں کامیاب ہوا تھا، اس کا دل و دماغ یہ قبول کرنے کو تیار ہی نہیں ہو پا رہا تھا۔ جب وہ اس کی تلاش میں ناکام ہو کر واپس منہ لٹکائے اپنے افسر کرنل ستیارام کے روبرو ہوا، تو اس کے ناکام لوٹنے پر وہ بھی چراغ پا ہو گیا۔

''کون تھا یہ؟ جن یا چھلاوا؟ مجھے وشواش نہیں ہو رہا کہ وہ ہاتھ بھر کا لونڈا اس طرح ہماری آنکھوں میں دھول جھونک کر نکل بھاگا اور ہم ... ہاتھ ملتے رہ گئے۔'' کرنل ستیارام کی حالت اپنے بال نوچنے جیسی ہو رہی تھی۔ اس پر بھگوت بولا۔

''سر! آپ چنتا نہ کریں۔ میں ابھی اس کے گھر پر ہلا بول دوں گا اور اسے بھی اس کے گھر والوں سمیت زندہ جلا ڈالوں گا۔'' اس کے لہجے میں سفاکی تھی۔

''وہاں تم ایسی کوئی کارروائی نہیں کر سکتے۔'' کرنل ستیارام نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''وہاں کشمیری راہنما کمانڈر عبدالرحمان کا بھی گھر ہے۔ اس سے وادی میں کشیدگی بڑھ جائے گی اور عالمی منظرنامے پر ہماری ساکھ پہلے ہی بری طرح متاثر ہوئی ہے اوپر والوں کی طرف سے اس سلسلے میں سخت احکامات ہیں کہ جو کرو اس کا جواز پہلے پیدا کرو، خواہ جھوٹا ہی کیوں نہ ہو۔'' اپنے افسر کی بات پر کیپٹن بھگوت کھٹپال نے کہا۔

''سر! جواز گھڑنا ہمارے لیے کون سا مشکل کام ہے۔ ہم......''

''اب مشکل ہو گیا ہے یہ کیپٹن کھٹپال!'' ستیارام نے ایک بار پھر اپنے ماتحت افسر کی بات کاٹی۔ وہ خاصا چھلایا ہوا تھا۔ بولا۔ ''عالمی منظرنامے میں ہمارے اس لنگڑے لولے جواز کو کسی نے تسلیم نہیں کیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ عالمی سطح پر کشمیریوں کی یہ جنگ اپنا اثر دکھانے لگی ہے۔ ہم جتنا اس معاملے سے چشم پوشی کر رہے ہیں، اتنا ہی یہ معاملہ عالمی سطح پر ابھر کے سامنے آ رہا ہے۔''

''ویسے سر! اس کا علاج بھی پھر یہی ہے کہ ہم اپنی پرانی روش کو جاری رکھیں۔ یعنی وادی کے ہر اس کشمیری کو پیروں تلے کچل ڈالیں جو کشمیر اور پاکستان کی بات کرتا ہو۔'' کیپٹن کھٹپال نے زہرخند لہجے میں کہا تو ستیارام بولا۔

''ہاں! ہونا تو اب بھی چاہیے لیکن کب تک؟ ہم جتنا ان لوگوں پر ظلم و تشدد کی انتہا کرتے ہیں اتنا ہی ان کا جذبۂ جرأت اور حریت و آزادی بلند ہونے لگتا ہے، بہت کمال کا حوصلہ ہے ان مسلے کشمیریوں میں بھی، اس قدر جبر و ظلم برداشت کرتے ہیں، مگر اپنی بات سے اپنے کاز اور مقصد سے ذرا بھی پیچھے نہیں ہٹتے۔ خیر۔''

کرنل ستیارام اتنا کہہ کر ذرا رکا پھر بولا۔ ''کشمیریوں کا بچہ بچہ ہم سے نفرت کرنے لگا ہے اور عام کشمیری نوجوانوں کے دلوں میں تو آزادی اور حق خود ارادیت کا جنون سوار ہے، حالانکہ ان کا شمار آتنک وادیوں (مجاہدین) میں بھی نہیں ہوتا، لیکن بہت جلد یہ لوگ مختلف کشمیری گروپس میں شمولیت اختیار کر کے ان آتنک وادیوں کے ہاتھ مضبوط کریں گے۔ میں شیر علی کو بھی اسی نظر سے دیکھ رہا ہوں۔ اسی لیے ایسے نوجوانوں کو سب سے پہلے کچلنا چاہیے مگر ابھی تم پہلے کمانڈر عبدالرحمان پر ہاتھ ڈالو۔ میں کل سے ہی نقضِ امن اور نوجوان طبقے کو ہمارے خلاف ورغلانے کا جواز تھوپ کے اس کی نظربندی کے احکامات جاری کیے دیتا ہوں۔''

''ویری ناکس سر!'' کیپٹن بھگوت کھٹپال ایک پرجوش سی مسرت تلے بولا۔

''وادی میں کسی بھی قسم کا ہنگامہ یا بلوا ہو تو کرفیو لگا دیا جائے۔''

''اوکے سر! ایسا ہی ہو گا لیکن ایک درخواست کرنا چاہوں گا سر!''

''ہاں کہو۔''

''سر! شیر علی کے معاملے میں مجھے فری ہینڈ دے دیں۔ میں جانتا ہوں کہ مجھے یہ مسئلہ کیسے حل کرنا ہے۔''

''تم ہر معاملے میں فری ہینڈ ہو...... کیپٹن بھگوت کھٹپال!'' کرنل ستیارام نے کہا۔

''جب اوپر والوں نے یہاں کے لیے میرا انتخاب کیا تھا تو کچھ دیکھ کر ہی کیا تھا۔ وہ ایسے ہی لوگوں کو یہاں تعینات کرتے ہیں جن کے دل و دماغ میں یہ کشمیری سانپ کی طرح لوٹتے ہیں اور یہ ان کا پھن کچلنے کو بےتاب رہتے ہیں۔ پھر جب مجھے اپنا نائب خود چننے کی آزادی دی گئی تو میرا انتخاب تم تھے...... کیوں؟ اس لیے کہ میں تمہارے بیک گراؤنڈ سے واقف تھا۔ تمہارے... دادا جنم جنم سے

پاکستان اور مسلموں کے نمبر ایک دشمن رہے ہیں۔ اسی لیے کیپٹن بھگوت کھنپال تم آزاد ہو مگر دھیان رہے کہ گولی چلانے سے پہلے جواز پیدا کرلینا...... چاہے جھوٹا ہی سہی۔“

اپنے گرو گھنتال کی بات سن کر کیپٹن بھگوت کھنپال کی کالے بیل جیسی ابلی ہوئی آنکھوں میں مکروہ چمک ابھری۔ اس نے سب سے پہلے شیر علی کے گھر چھاپا مارنے کا ارادہ باندھ لیا تھا۔ کسی مسلمان کے گھر اس طرح چھاپا مارنے کا اس کا ایک مکروہ مقصد بھی ہوتا تھا۔ یہی سبب تھا کہ اس کی آنکھوں میں ابھرنے والی چمک میں ہوس کاری بھی نمایاں ہوگئی تھی......

☆☆☆

پَو پھٹنے تک گل نور کو ایک بری خبر اور ایک خوشی کی خبر مل چکی تھی۔ بری خبر یہ تھی کہ محمد علی دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کر چکا تھا۔ وہ بوڑھا بے چارہ پہلے ہی نمونیا جیسی مہلک بیماری سے اٹھا تھا اور اس پر سوا یہ ہوا کہ جوان اکلوتے بیٹے کی ناحق......... گرفتاری نے اسے ساری رات تشویش میں جلا رکھا تھا۔ یوں دل پر بوجھ پڑنے سے وہ اس کے ناگہاں حملے کا شکار ہوگیا۔ وائے نصیب کہ اس کے انتقال کے تھوڑی دیر بعد ہی جب اس کی بیٹی زینو اور بیوی عائشہ رو پیٹ رہی تھیں، تو دروازے پر دستک ہوئی۔ ماں نے ہی دروازہ کھولا تو سامنے اپنے بیٹے کو زندہ سلامت دیکھ کر وہ بے چاری نہ خوشی کا اظہار کر پائی اور نہ ہی غمی کا۔ بس ایک ہوک سی اٹھ کر رہ گئی، اور اسے غش آگیا۔

کمانڈر عبدالرحمان اپنی بیوی اور بھتیجی گل نور سمیت ان کے گھر پہنچے تھے اور پھر یوں رفتہ رفتہ وہاں لوگوں کا تانتا بندھتا چلا گیا۔

شیر علی اپنے بوڑھے باپ کی لاش سے لپٹ کر بہت رویا تھا۔ سوچ رہا تھا کہ کاش! وہ اس وقت اپنے باپ کی بات مان لیتا، جب اس نے اسے گھر سے باہر نکلنے سے منع کیا تھا اور جب وہ اس کے کام میں ہاتھ بٹانے کے لیے سبزی منڈی پہنچا تھا تو اس نے اسے اسی وقت گھر لوٹ جانے کی تلقین کی تھی مگر شیر علی گھر واپس لوٹنے کے بجائے ہوٹل کی طرف نکل گیا تھا۔

شیر علی کے باپ کی میت کو دفنانے کے لیے یہ لوگ قبرستان کی طرف روانہ ہو گئے۔ گھر میں صرف زینو اور عائشہ خاتون تھیں جبکہ عبدالرحمان کے ہاں ان کی بیوی اور بھتیجی گل نور تھیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی یہ دونوں زینو اور اس کی ماں کو تسلی دے کر اپنے گھر لوٹی تھیں اور ناشتا وغیرہ تیار کرنا تھا اور شیر علی کے ہاں بھی پہنچانا تھا۔ ظاہر ہے فوتگی کا گھر تھا، وہاں تو اب تین دن چولہا سرد پڑے رہنا تھا، ایسے میں اڑوس پڑوس سے کھانا وغیرہ آجاتا تھا۔

دن نکل آیا تھا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ فضا میں عجیب سی اداسی گھلی ہوئی تھی۔ گل نور رسوئی میں ناشتا بنانے میں مصروف تھی اور شیر علی کے بارے میں ہی سوچے جارہی تھی کہ اسے آج کتنے بڑے دکھ کا سامنا کرنا پڑا تھا لیکن جانے کیا بات تھی، اس کا دل بار بار ایک نامعلوم سی بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ شیر علی کے بھارتی فوجیوں کے چنگل سے چھوٹ کے آجانے کی اسے خوشی تو تھی مگر باوجود اس کے وہ ایک بے کلی سی محسوس کر رہی تھی۔ چاچی دوسرے کمرے میں مصروف تھیں کہ اچانک رسوئی میں ناشتا بناتے ہوئے گل نور ایک آواز پر چونکی۔

آواز بھاری گاڑیوں کے شور کی تھی، جو ایک مقام پر ٹھہر گئی تھیں۔ پھر اس کی دھڑکتی سماعتوں نے دھڑدھڑاتے قدموں کی آواز سنی اور اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا...... ایسے مخصوص قسم کے بھاری شور و شغب کی آوازوں سے اب تو وادی کا بچہ بچہ بھی آگاہ ہو چکا تھا۔ گل نور کے اندر ہول اٹھنے لگے۔ وہ رسوئی کے اندر سے ہی پوری طاقت سے چلائی۔

”چاچی......“ پھر اٹھ کر دوڑی۔ اس کا رخ اسی کمرے کی طرف تھا، جدھر چاچی کسی کام میں مصروف تھی۔ وہ ابھی صحن میں ہی تھی کہ اچانک گولیوں کی خوفناک تڑتڑاہٹ ابھری......

☆☆☆

گھر کی فضا ماتمی تھی۔ در و دیوار اپنی سوگوار آنکھوں سے خالی صحن کو گھورتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ گھر میں صرف زینو اور اس کی ماں عائشہ خاتون موجود تھیں۔

بعد نماز فجر محمد علی کو دفنا دیا گیا تھا۔ عبدالرحمان ایک جہاندیدہ اور چشم دیدہ انسان تھے۔ خطرے کی بو انہوں نے اسی وقت سونگھ لی تھی جب انہیں شیر علی کے اس طرح بھارتی فوجی کیمپ موتی بھون سے فرار ہونے کی اطلاع ملی تھی۔ یوں بھی وہ اب سمجھنے لگے تھے کہ شیر علی کا ابھی کچھ روز اپنے گھر میں رہنا مناسب نہ ہوگا۔ لہٰذا وہ اسے اپنے ساتھ مجاہدین کے کیمپ میں لے گئے تھے۔ نیز اسی ممکنہ خطرے کے پیش نظر وہ اپنے دس بارہ بہادر اور تربیت یافتہ کمانڈوز کو شیر علی کے گھر کے اطراف میں تعینات کر گئے تھے۔ اس ہدایت کے ساتھ اگر بھارتی فوجیوں کی...

دہ اندازی صرف پوچھ گچھ کی حد تک محدود ہوتو ان پر حملہ کرنے کے بجائے صرف خاموشی سے ان پر نظر رکھی جائے، جب تک کہ وہ کوئی جارحانہ پیش قدمی پر نہ اتر آئیں۔

ان میں چار کمانڈوز رحیم متوکا، آصف لٹرم سمیت دوساتھی، منیب اور عبید سدھن، شیر علی کے گھر کی چھت پر موجود تھے، جبکہ تین مجاہدین عبدالرحمان کے مکان کے اطراف میں چھپے گھات لگائے چوکس بیٹھے تھے۔ باقی پانچ کمانڈوز عام کشمیری نوجوانوں کے روپ میں گلی کے اندر اور باہر مٹرگشت کررہے تھے۔

اس گروپ کی کمانڈ رحیم متوکا کے ہاتھ میں تھی جو شیر علی کے مکان کی چھت کی جنوبی منڈیر والی دیوار کے قریب تھا اور وہ تھوڑے وقفے سے اپنی آنکھوں سے دوربین لگا کر امیراں کدل پل کی طرف جانے والے راستے کی طرف دیکھ لیا کرتا تھا۔

رحیم متوکا کا شمار عبدالرحمان گروپ کے مجاہدین میں ایسے نوجوانوں میں ہوتا تھا جو کم عمری میں ہی اپنی زندگی کے ایک مقصد کا تعین کرچکے ہوتے ہیں۔ یعنی آزادی اور حق خودارادیت کے لیے علم جنگ ہاتھوں میں پکڑ لیتے ہیں۔ اس کے عزم اور قوت ایمانی کے جذبے کو دیکھتے ہوئے۔ گروپ کے نائب شجاع احمد نے انیس، بیس سالہ رحیم متوکا کو خود گوریلا تربیت دی تھی اور جلد ہی اسے اپنا قریبی ساتھی بھی بنالیا تھا۔ اپنی آئندہ کی موتی بھون والی مہم میں اس کا ارادہ رحیم کو اپنے ساتھ رکھنے کا بھی تھا۔

رحیم نے جب تیسرا چکر چھت کی مذکورہ سمت کا لگایا اور جیسے ہی اپنی آنکھوں سے دوربین لگائی تو وہ ذرا چونک گیا۔ امیراں کدل پل کی طرف سے آنے والے راستے پر اسے ایک بھارتی فوجیوں کی جیپ آتی ہوئی نظر آئی۔ رحیم متوکا نے اپنے تجربے کی بنا پر اندازہ لگایا کہ یہ جیپ کہاں اور کس مقصد کے تحت جارہی تھی؟ اور اس میں کس حد تک جارحانہ پہلو تھا؟

جلد ہی اسے اندازہ ہوگیا کہ ایسی کوئی بات نہ تھی جیسی وہ سمجھا تھا۔ جیپ معمول کی رفتار اور اپنے عمومی گشت کے انداز میں جارہی تھی اور اس کا رخ ڈل جھیل کی طرف تھا۔ نیز اس کے اندر بھی محض دوتین ہی فوجی براجمان تھے۔ تاہم پھر بھی وہ اپنی تسلی کی خاطر دوربین کو اس وقت تک اپنی آنکھوں سے لگائے رہا جب تک وہ جیپ ڈل جھیل کی طرف جانے والے راستے کی طرف نہ مڑگئی۔

اب راستہ ویران ہوگیا تھا۔ اس نے سکون کی ایک گہری سانس لی اور پلٹا۔ تھوڑی دیر پہلے بھارتی فوجی جیپ کو دیکھ کر اس کے تنے ہوئے اعصاب اب معمول پر آگئے تھے۔

جیسا کہ مذکور ہوا، یہ علاقہ شہری آبادی سے ذرا پرے اور نسبتاً الگ تھلگ مقام پر تھا اور اس کے تین اطراف میں اونچے نیچے ٹیلے بنے ہوئے تھے۔ گھروں کی تعداد بہ مشکل بیس، پچیس کے قریب تھی اور ایک اچھی خاصی آبادی یہاں بھی مقیم تھی۔ اگرچہ مکانوں کی ترتیب بے واضح اور قطاریں ٹیڑھی میڑھی تھیں کئی جگہوں پر سطح ڈھلوانی اور اونچی نیچی تھی ...... یہی صورت حال ان راستوں کی بھی تھی جو ان کے درمیان سے گویا اچانک ابھرتے ہوئے دکھائی دیتے تھے...... ان میں کئی ایک راستے تو مکانوں کے درمیان سے اچانک نمودار ہوتے محسوس ہوتے تھے۔

انہی راستوں پر اچانک دوتین بھاری گاڑیوں کی آوازیں سنائی دیں جو ایک دم تیزی کے ساتھ عبدالرحمان اور شیر علی کے مکان کے سامنے آن رکی تھیں۔ ان میں ایک فوجی ٹرک اور دوتین بڑی جیپیں بھی تھیں۔ مذکورہ مکانوں کی چھت پر مورچا زن گوریلا مجاہدین بھارتی فوجیوں کی یہ مکاری دیر سے سمجھے تھے اور اب اپنے گروپ لیڈر رحیم متوکا کے اشارے کے منتظر تھے۔ نیز اطراف میں مٹرگشت کے انداز میں چکراتے ساتھی کمانڈوز ... بھی اس کی اطلاع تب ہی دے پائے تھے جب دشمن ان کے سر پر پہنچ چکے تھے۔

اب صورت حال یک دم بدل گئی تھی، اسی لیے رحیم نے ابھی انہیں اشارے سے اپنی اپنی جگہوں پر دبکے رہنے کی ہدایت دی تھی۔ ان کے دل تیزی سے دھڑکنے لگے تھے۔ لگتا ایسا ہی تھا کہ دھرتی پر ایک اور خونی باب رقم ہونے جارہا تھا۔

رحیم نے اپنی گن پر گرفت مضبوط کی اور اپنے ساتھ موجود ایک ساتھی آصف لٹرم کو اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔ اس کا چہرہ بھی بھارتی فوجیوں کی اتنی بڑی تعداد کو اچانک اتنے قریب دیکھ کر جوش سے سرخ ہوگیا تھا، اگرچہ اس میں ایک تفکر و تشویش کا عنصر بھی غالب تھا۔

”آصف! تم دروازے پر نگاہ رکھو۔ میں نیچے جاتا ہوں۔“

”ہمیں کمک کے لیے مجاہدین بلواتے ہوں گے۔ ان کی بھاری تعداد سے ان کے خطرناک اور مذموم ارادوں کا پتا چل رہا ہے۔“ آصف نے سرگوشی میں کہا تو رحیم بھی نیچی آواز میں جوابا بولا۔

"اب اس کا وقت نہیں رہا۔ ہم ان کی مکاری میں آچکے ہیں۔ دوبدو فائرنگ نقصان کا باعث بن سکتی ہے، گوریلا ایکشن عمل میں لانا پڑے گا۔"

رحیم نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک بھاری قدموں کی دھمک کے ساتھ ہی گولیوں کی خوفناک تڑتڑاہٹ ابھری......

فوجیوں نے شیر علی کے گھر کا دروازہ توڑ کر گرادیا تھا۔

رحیم نے فوراً آصف کو دستی بم ہاتھ میں پکڑے رہنے کی ہدایت دی اور خود دبے پاؤں سیڑھیاں اترنے لگا۔ اچانک اسے صحن سے شیر علی کی بہن زینو کی چیخ سنائی دی۔

☆☆☆

کیپٹن بھگوت کھٹپال نے اپنی روایتی چال بازی اور مکر سے کام لیا تھا۔ اس بات کا اندازہ اسے پہلے سے ہی تھا کہ شیر علی کے گھر پہنچتے ہی سب سے پہلے اس کا پڑوسی عبدالرحمان اسے اپنی پناہ میں لینے کی کوشش کرے گا اور۔ کوئی بعید نہیں کہ وہ اپنے تربیت یافتہ گوریلوں کا ایک ٹولا بھی پہرے وغیرہ کے لیے وہاں چھوڑے رکھے۔ یہی سبب تھا کہ انہیں ڈاج میں رکھنے کے لیے کیپٹن بھگوت کھٹپال نے پہلے ایک عام سی گاڑی جھیل ڈل کی طرف روانہ کردی تھی تاکہ اگر اس راستے پہ مجاہدین کی نظر ہو بھی تو ان کی توجہ کسی حد تک بٹی رہے، جبکہ خود وہ ایک بڑے ٹرک اور دو بڑی جیپوں میں اپنے مسلح قافلے کی صورت اندرونی تنگ راستوں سے یہاں آن پہنچا تھا۔ اسی کے اشارے پر سب سے پہلے ایک برسٹ مار کے شیر علی کے گھر کا دروازہ توڑ کے گرایا گیا پھر کیپٹن بھگوت نے دانستہ زوردار آواز میں چلا کر اپنے حواریوں سے کہا۔

"جس گھر سے ذرا بھی صدائے احتجاج بلند ہوتے دیکھو، اس گھر پر دستی بم پھینک کر آگ لگا دو۔"

اس کے بعد وہ اپنے چند مسلح ساتھیوں سمیت اندر گھستا چلا آیا۔ اس نے سب سے پہلے شیر علی کی جوان بہن اور اس کی ماں عائشہ خاتون کو نشانے پر رکھتے ہوئے ان سے شیر علی کے بارے میں پوچھا۔

"وہ......وہ گھر پہ نہیں ہے۔"

عائشہ کی ماں نے ڈری سہمی آواز میں اس کی طرف دیکھ کر کہا تو کیپٹن بھگوت کھٹپال کے بدہیئت ہونٹوں پر مکروہ مسکراہٹ ابھری اور وہ اسی لہجے میں ایک شیطانی نظر اس کے ساتھ کھڑی تھرتھر کانپتی اس کی بیٹی زینو کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "تجھے بتانا تو پڑے گا ہی [illegible] اس وقت کدھر ہے۔ ورنہ اس کی سزا تیری اس جوان، خوبصورت بیٹی کو بھگتنا پڑے گی۔" عائشہ خاتون نے جو اس رذیل انسان کی گندی زبان سے یہ سنا تو سرتاپا تھرا اٹھی، فوراً اپنا دوپٹا ہاتھوں میں لے کر جھولی کی طرح کیپٹن بھگوت کھٹپال کے سامنے پھیلا دیا اور دہائی دیتے ہوئے بولی۔

"مجھ غریب دکھیاری بیوہ پر رحم کرو جس کے شوہر کی قبر کی مٹی بھی ابھی گیلی ہے۔ م......میرا بیٹا گھر پہ نہیں ہے۔"

"بڑھیا! زیادہ چلترباز ی نہیں کر میرے ساتھ۔ وہ تو ہم بھی دیکھ رہے ہیں وہ یہاں نہیں ہے۔ پھر وہ ہے کہاں؟ یہ پوچھ رہے ہیں ہم۔"

کیپٹن بھگوت نے عائشہ خاتون کی طرف خونخوار نظروں سے دیکھتے ہوئے درشت لہجے میں کہا اور ساتھ ہی اپنے دو ساتھیوں کو اشارہ کیا۔ وہ کمروں اور گھر میں گھس کر تلاشی لینے لگے۔ اوپر چھت پر سیڑھیوں والی منڈیر کے قریب دبکے بیٹھے رحیم نے اپنی گن پر گرفت مضبوط کرلی۔ اس نے پکا تہیہ کر رکھا تھا کہ اگر اس خبیث ہندو کیپٹن نے ان خواتین کے ساتھ کوئی ایسی ویسی حرکت کرنے کی کوشش کی تو وہ اسے کسی بھی نتیجے کی پروا کیے بغیر برسٹ چلا کر بھون ڈالے گا۔ نظر کچھ ایسا ہی آرہا تھا کہ شیطانی کھیل کی ابتدا اب تب میں ہونے والی تھی۔

کیپٹن بھگوت کھٹپال نے خونخوار انداز میں دانت پیستے ہوئے، ڈری سہمی کھڑی زینو کی طرف گھورا اور اس کے بعد کسی شکرے کی طرح جھپٹا مار کر اسے دبوچ لیا۔ مارے خوف کے زینو کے حلق سے چیخ خارج ہوگئی۔ سر کی چادر سرک کر کیپٹن بھگوت کے پیروں پر آگری جس پر وہ خبیث اپنا بھاری بوٹ رکھ کر عائشہ خاتون کی طرف دیکھ کر غراتے ہوئے بولا۔ "سچ بتا دے اب۔ ورنہ اس کی طرح مسل دوں گا تیری جوان بیٹی کی عزت کو۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے پیروں تلے زینو کا دوپٹا روند ڈالا۔

بے چاری عائشہ خاتون کی مارے دہشت کے آنکھیں پھیل سی گئیں۔ وہ جلدی سے بول پڑی۔ "ب...... بتاتی ہوں۔ وہ......وہ......عبدالرحمان کے ساتھ......گیا ہے۔"

عبدالرحمان کا نام سنتے ہی کیپٹن بھگوت کھٹپال کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ دہاڑ کر بولا۔ "کدھر لے کر گیا ہے وہ اسے؟"

"پ......پتا نہیں۔" عائشہ خاتون نے اپنے خشک پڑتے ہونٹوں پہ زبان پھیرتے ہوئے کہا، جبکہ بھگوت کے بے رحم شکنجے میں جکڑی ہوئی معصوم دبلی پتلی زینو خزاں رسیدہ

پتے کی طرح کانپ رہی تھی۔ کیپٹن بھگوت نے اپنے حواریوں کو...... عبدالرحمان کے گھر بھی ہلا بولنے کا حکم دے ڈالا۔

ادھر سیڑھیوں کی منڈیر کی دیوار کے عقب میں پوزیشن لیے بیٹھے رحیم کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوا جارہا تھا۔ ایک ہندو فوجی کے ہاتھوں مسلم کشمیری خاتون کی یہ بے عزتی اس کی قوتِ برداشت سے باہر ہوتی جارہی تھی۔ اچانک ایک چلاتی ہوئی آواز ابھری۔

''ہالٹ! وہاں کوئی ہے۔'' رحیم بری طرح ٹھٹکا، وہ یہی سمجھا شاید اسے دیکھ لیا گیا ہے۔ اسی وقت ایک برسٹ چلنے کی آواز ابھری۔ رحیم کو اپنے ایک ساتھی کی کرب انگیز چیخ سنائی دی اور اس کے ساتھ ہی کسی کا لہراتا ہوا وجود اس کے قدموں کے قریب لڑکھڑاتا ہوا نیچے لڑھکتا چلا گیا۔ یہ آصف لٹرم تھا۔ اسی وقت نیچے سے ایک بھارتی فوجی اوپر جھانکا تھا۔ اس کی اچانک اور جانے کیسے آصف پر نگاہ پڑ گئی تھی اور اس نے اس پر برسٹ چلادیا تھا۔

اپنے ساتھی کی اس طرح ہلاکت پر رحیم کے تن بدن میں آگ بھر گئی۔ اس نے اس قاتل بھارتی فوجی کو سنبھلنے بھی نہ دیا اور اپنی گن کی لبلبی دبا دی۔ نال کا رخ اسی کی طرف تھا۔ وہ فوجی اپنے حلق سے کربیہہ انگیز چیخ خارج کر کے وہیں ڈھیر ہوگیا۔ دوسری پھرتی کا مظاہرہ اس نے منڈیر کی دیوار سے صحن کی طرف ایک اور برسٹ چلا کر کیا تھا۔ کیپٹن بھگوت تو بال بال بچا تھا مگر اس کے دو حواری چیخ مار کر گرے۔ کیپٹن بھگوت نے وہیں سے اپنے پستول کا ٹریگر دبایا اور دباتا چلا گیا۔ مقصد رحیم کو اپنی جگہ محبوس کرنا تھا، تاکہ وہ فائر نہ کر پائے اور اس کے حواریوں کو موقع ملے لیکن چھت پر موجود منیب اور عبید سدھن نے ان پر فائر کھول ڈالے۔ بھارتی فوجی منتشر ہونے لگے لیکن کیپٹن بھگوت ... نے فوراً مکاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے زینو کردبوچ کر اپنی ڈھال بنالیا۔

اسی دوران میں باہر موجود فوجیوں نے چھت پر خطرہ محسوس کرتے ہی وہاں دو دستی بم اچھال دیے۔ اس بات کا اندیشہ صرف چند سیکنڈ پہلے ہی محسوس کرتے ہوئے منیب اور عبید نے مکان کی عقبی دیوار سے نیچے چھلانگ لگادی اور یہی وہ وقت تھا جب دونوں بم چھت پر گرے اور سماعت شکن دھماکوں سے پھٹے کہ مکان کی چھت ہی نیچے آرہی۔ ہر طرف گرد و غبار کا طوفان اٹھ گیا۔ رحیم تب تک فائرنگ کرتا ہوا صحن میں آگیا تھا۔

ابھی فائرنگ جاری تھی۔ اس کے کمانڈو ساتھیوں نے بھارتیوں پر ہلا بول دیا تھا۔ فائرنگ دو طرفہ ہو رہی تھی۔ اسی وقت رحیم کے کانوں سے ایک عورت کی چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔

''میری بچی کو بچالو اس شیطان سے...... خدا کے لیے۔''

یہ شیر علی کی ماں عائشہ خاتون کی آواز تھی۔ جو اس کے دائیں جانب سے ابھری تھی۔ وہ اسی سمت میں دوڑا تو وہ ٹوٹی چھت کے گرے ہوئے ایک بڑے سے شہتیر کے نیچے دبی ہوئی آخری سانسوں پہ تھی، رحیم جب تک اسے سنبھالنے کے لیے بڑھا وہ ختم ہو چکی تھی۔ بس اس بدنصیب ماں کے یہی آخری حسرت زدہ سے الفاظ تھے جس نے رحیم کو رلا کے رکھ دیا تھا۔

مکان کو آگ پکڑنے لگی تھی۔ باہر مجاہدین اور بھارتی فوجیوں کے درمیان گھمسان کا رن پڑا ہوا تھا۔ بھارتی فوجیوں کی اس کھلی بربریت پر دیگر مسلم کشمیری گھروں سے بھی نوجوان، مرد جن کے ہاتھ اسلحے کے نام پر جو لگا، ان کا مقابلہ کرنے نکل آئے۔ پتھراؤ بھی ہوا۔ جن کے پاس بندوقیں تھیں...... وہ ہاتھوں میں لے کر نکل آئے تھے۔

رحیم کو زینو کی تلاش تھی اور اس نے آخری بار اس معصوم کو کیپٹن بھگوت کے شکنجے میں دیکھا تھا۔ مکان میں آگ لگ چکی تھی۔ وہ دروازے کی طرف دوڑا۔ اسے زینو کے ساتھ اپنے کمانڈر عبدالرحمان کے گھر کی بھی فکر ہو رہی تھی۔ اگرچہ وہاں اس کے تین ساتھی موجود تھے لیکن جب وہ باہر نکلا تو اس کے صحن سے بھی اس نے دھواں اٹھتا دیکھا۔ اسے تشویش نے گھیر لیا۔

باہر ہر سو گرد و غبار اور بارود کا دھواں سا پھیلا ہوا تھا۔ ایک طرف بھارتی فوجیوں کا ٹرک شعلوں کی لپیٹ میں نظر آیا۔ جلد ہی اس نے محسوس کیا کہ بھارتی فوجی رفو چکر... ہونے کی کوشش میں تھے کہ اچانک اسے کہیں قریب سے ایک نسوانی چیخ سنائی دی، وہ بری طرح ٹھٹک گیا اور زینو کی چیخ پہچان کر بلاتاخیر وہ اسی سمت کو دوڑ پڑا۔ ذرا ہی دیر بعد جب وہ دھوئیں سے ابھرا تو اس نے کیپٹن بھگوت کو جیپ میں سوار ہوتے دیکھا، اس نے زینو کو دبوچ رکھا تھا۔ رحیم نے اپنی گن سیدھی کرلی مگر اسی وقت اس کے قریب ہی ایک دھماکا ہوا۔ بھاگتے ہوئے فوجیوں نے ایک دستی پھینک دیا تھا۔ رحیم کو یوں لگا جیسے کسی غیر مرئی قوت نے اسے اٹھا کر ذرا پرے اچھال دیا ہو۔ وہ ایک جگہ زخمی ہو کر گرا۔ گن ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ چند ثانیے کے لیے وہ بے حس و حرکت سا رہا، پھر اس کی زخمی سماعتوں میں شیر علی کی ماں کے یاس زدہ

الفاظ گونجنے لگے۔

"میری بچی کو بچالو اس شیطان سے...... خدا کے لیے۔"

وہ ہمت کر کے اٹھا اور ایک گلی کی طرف دیوانہ وار دوڑتا چلا گیا۔ یہاں بھی بزدل بھارتی فوجیوں نے چند مکانوں میں دستی بم پھینک کر آگ لگادی تھی۔

اس کی تلاش میں نکلے ہوئے اس کے دو جری ساتھی منیب اور عبید بھی اس کے پیچھے ہولیے تھے۔ بھارتی فوجیوں کے ٹرک کو بم مار کر انہوں نے آگ لگائی تھی اور ان کے فرار کی راہ مسدود کرنے کی کوشش کی تھی۔ کئی فوجیوں کو مجاہدین نے... جہنم واصل کرڈالا تھا۔

ادھر رحیم اندھا دھند دوڑتا ہوا، ایک شارٹ کٹ راستہ اختیار کرتا اس طرف نکل آیا تھا جہاں سے بھارتی فوجیوں کی گاڑیاں گزر رہی تھیں، جو اب صرف دو کی تعداد میں تھیں۔ کچھ فوجی پیدل دوڑ لگا رہے تھے۔ رحیم متوکا کے رکتے ہی اس کے عقب میں دوڑتے ہوئے آتے منیب اور عبید بھی اس کے ساتھ آن ملے۔

"وہ خبیث شیطان بھارتی کیپٹن بھگوت، اپنے زخم چاٹنے کے بعد شیر علی کی جوان بہن کو اٹھا لے گیا ہے۔" رحیم نے دانت پیس کر کہا۔ اس کی خونخوار نظریں دور ہوتی بھارتی گاڑیوں پر مرکوز تھیں۔

"ہمارے بیشتر ساتھی شہید ہو چکے ہیں۔ جیسا آپ کا حکم ہو۔ ہم تیار ہیں ان کا تعاقب کرنے کے لیے۔" منیب نے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان کہا اور رحیم نے کوئی جواب دیے بغیر آگے قدم بڑھا دیے۔ منیب اور عبید نے فوراً اس کی تقلید کی تھی۔

☆☆☆

گل نور کی چیخ سن کر اندر سے اس کی چاچی برآمد ہوئی۔ گولیوں کا برسٹ چلنے کی آواز پر دونوں متوحش سی ہو گئی تھیں۔ اس کی چاچی نے بے اختیار خوف زدہ ہو کر اپنی بھتیجی کو خود سے یوں لپٹا لیا تھا جیسے اس نے شکرے کو دیکھ لیا ہو۔ اسی وقت ان کے مکان کی چھت پر متعین ان پانچوں کشمیری مجاہدین میں سے ایک نے ان دونوں خواتین کو اندر کمرے میں چلے جانے کی ہدایت کی۔

اس کے تھوڑی دیر بعد ہی جیسے رقصِ ابلیس شروع ہو گیا۔ فائرنگ، دھماکے، آہ و فغاں اور آگ کے اس طوفان کے تھمنے کے بعد تک یہ دونوں خواتین کمرے میں ہی دبکی رہی تھیں۔

[illegible] بھی بزدل فوجیوں نے خون کی ہولی کھیلنے کی کوشش کی تھی، مگر چھت پر موجود... مجاہدین نے ان کی یہ کوشش ناکام بنادی تھی، مگر تین مجاہدین نے اس کوشش میں اپنی جانوں کا بھی نذرانہ پیش کر دیا تھا۔ صحن میں بارود کی بو اور دھوئیں میں پڑی ان کی لاشیں گل نور بھی دیکھ چکی تھی۔

جب ہر سمت خاموشی چھا گئی تو گل نور بے تابانہ انداز میں کمرے سے باہر نکلی۔ اس کی چاچی نے اسے عقب سے تنبیہی انداز میں... پکارا بھی، مگر اسے اپنی سہیلی زینو اور اس کی ماں کی فکر لاحق ہو گئی تھی۔

نہ جانے اس کے اندر اتنی جرأت اور حوصلہ کیسے پیدا ہو گیا تھا کہ وہ ٹوٹے دروازے سے یک دم باہر نکل آئی اور سیدھی شیر علی کے گھر کی طرف دوڑی اور بھی لوگ وہاں جمع ہو چکے تھے اور اپنی سی رضا کارانہ کارروائیوں میں مصروف تھے۔ جلد ہی گل نور کو شیر علی کی ماں عائشہ خاتون کے شہید... ہونے اور بھارتی کیپٹن بھگوت کے ہاتھوں زینو کے اٹھا لے جانے کی روح فرسا خبر مل گئی۔ اسے غش آنے لگا اور وہ وہیں اپنے سر پہ ہاتھ رکھ کر زمین پر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے تھے۔

☆☆☆

بھارتی فوجیوں کی اس بہیمانہ اور بزدلانہ کارروائی کے بعد سری نگر، بارہ مولا اور اننت ناگ تک کے حالات کشیدہ ہوتے چلے گئے۔ ہڑتالیں کی گئیں اور بھارت سرکار کی عمارتوں کے سامنے کشمیریوں نے سخت احتجاج کے ساتھ بھارت کے جھنڈے اور اس کے انتہا پسند حکمرانوں کے پتلے نذر آتش کیے اور ان کے خلاف نعرے بازی کی۔ اس کے جواب میں بھارتی سرکار نے ہمیشہ کی طرح جھوٹ اور منافقانہ بیان دیا کہ مذکورہ علاقے میں فوجی صرف پوچھ گچھ کرنے گئے تھے، مگر علاقے کے لوگوں (کشمیریوں) نے بلاوجہ اشتعال میں آ کر ان پر پتھراؤ اور فائرنگ تک کرڈالی، لہٰذا اپنے تحفظ میں فوجیوں کو بھی "مجبوراً" گولیاں چلانی پڑیں۔

یہ ان کا رٹا رٹایا بیان تھا جو بھارت سرکار اپنے چہرے کی کالک دھونے کی ناکام کوشش میں دیا کرتے تھے۔ اس مجمعے میں تنویر اور غزالہ بھی شامل تھے اور ایک ایک منظر کی آڈیو ویڈیو رپورٹ بنا رہے تھے۔ نیز اصل حقائق کی جانچ پڑتال کے لیے وہ مذکورہ علاقے میں بھی پہنچے تھے جہاں بھارتی فوجیوں نے خون کی ہولی کھیلی تھی۔

انہوں نے وہاں موجود عینی شاہدین کا بیان لیا تھا اور عائشہ خاتون کی لاش بھی دیکھی تھی۔ انہیں اس دردانگیز

حقیقت کا بھی پتا چلا تھا کہ ان کے گائڈ شیر علی کی جوان کنواری بہن کو بھی بھارتی کیپٹن بھگوت انتقاماً اٹھالے گیا تھا۔

ادھر کیپٹن بھگوت کا ان دونوں پاکستانی صحافی بہن بھائیوں کے پیچھے چھوڑا ہوا مخبر جسونت تیواری، برابر ان کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ کیپٹن بھگوت کی ہدایت کے مطابق اس نے فوراً سری نگر کے متعلقہ تھانے میں جا کر انسپکٹر چندر لال کو اس کی رپورٹ دی۔

انسپکٹر چندر لال ایک پینتیس، چالیس سالہ دراز قد آدمی تھا۔ رنگت سانولی تھی اور سر گنجا تھا۔ چہرہ فٹ بال کی طرح گول تھا۔ بات کرتے ہوئے بار بار اپنے ہونٹ بھینچ لینا اس کی عادت تھی۔ اسے خصوصی طور پر کرنل ستیارام ڈوڈیجا نے یہاں تعینات کروایا تھا اور اس میں کیپٹن بھگوت کے خصوصی انتخاب کا دخل بھی تھا۔ اسی نے کرنل ستیارام سے سفارش کی تھی۔

وہ شہری انتظامیہ کی آڑ میں امن و امان کی بحالی کے بجائے، ہمیشہ بھارتی فوجیوں کی کارروائیوں کو سپورٹ کرتا تھا۔ نیز اس طرح کے حالات میں وہ انسانی حقوق کی پامالی کرنے سے بھی نہیں چوکتا تھا اور ایسے کشمیریوں پر کڑی نظر رکھتا تھا جو اپنے اندر حقِ خود ارادیت کا جذبہ رکھتے تھے۔ ان کے خلاف وہ طرح طرح کے اوچھے ہتھکنڈے بھی آزمانے سے گریز نہیں کرتا تھا۔

مخبر جسونت تیواری نے جیسے ہی اسے ان دونوں بہن بھائیوں کے متعلق بتایا تو وہ فوراً معمول کی انکوائری کے بہانے ان کے ہوٹل جا پہنچا، جہاں تنویر اور غزالہ مقیم تھے مگر اس وقت وہ وہاں موجود نہ تھے، اگرچہ اس کا چندر لال کو پہلے ہی سے علم تھا مگر وہ اپنی تسلی کی خاطر ہوٹل کی انتظامیہ سے ان کے بارے پوچھ تاچھ اور کچھ ضروری ”ہدایات“ جو ڈھکی چھپی دھمکیوں پر ہی مشتمل تھیں، دینے گیا تھا۔ اس کے بعد وہ وہیں سے ان کی تلاش میں نکل پڑا۔ اسے خوب اندازہ تھا کہ یہ دونوں کن کن مقام پر پائے جاسکتے تھے۔ تاہم مذکورہ ہوٹل سے نکلتے وقت وہ اپنے دو آدمی سادہ وردی میں وہاں چھوڑ آیا تھا۔ پھر جیسے ہی اسے اطلاع ملی کہ دونوں بہن بھائی واپس آچکے ہیں تو وہ فوراً وہاں جا دھمکا۔

دروازے پر دستک کے جواب میں تنویر نے ہی دروازہ کھولا تھا اور سامنے ایک پولیس انسپکٹر کو وردی پوش دیکھ کر چونکا۔

”جی! میں کیا خدمت کرسکتا ہوں آپ کی؟“ طوعاً کرہاً اس نے پوچھ لیا تو انسپکٹر چندر لال بہ غور اس کے چہرے اور عقب میں کھڑی غزالہ کو ایک گھورتی نظر سے دیکھتے ہوئے خرانٹ لہجے میں بولا۔

”تم سے بات کرنی ہے ہمیں۔ تنویر تمہارا ہی نام ہے؟ اور یہ تمہاری بہن غزالہ؟“

اس کی اتنی جان کاری پر تنویر کے اندر کسی الجھن نے سر ابھارا، تاہم وہ بھی کھنڈی ہوئی متانت سے بولا۔ ”ہاں! آیئے۔ اندر۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے اسے راستہ دیا اور انسپکٹر چندر لال گہری گہری نظروں سے کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے اندر آگیا اور ہونٹ بھینچے کھڑا ہوگیا۔ اس کے ہمراہ دو ساتھی اہلکار بھی تھے۔

”بیٹھیں۔“ غزالہ نے بھی گویا چاروناچار اسے ایک صوفے پر بیٹھنے کا کہا۔

وہ عادتاً اپنے ہونٹ بھینچنے کے بعد ایک گہری ہمکاری خارج کر کے اکھڑے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”میں یہاں بیٹھنے نہیں آیا ہوں۔ مجھے تم دونوں کی شناخت درکار ہے۔“

تنویر کے مقابلے میں غزالہ ذرا جوشیلی تھی۔ انسپکٹر چندر لال کی بات پر اس کے چہرے پر تندی کی لہر سی ابھری لیکن تنویر نے فوراً اس سے کہا۔

”یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں غزالہ! انہیں اپنی شناخت کرادو۔“ یہ کہتے ہوئے تنویر چند قدم آگے بڑھا۔ غزالہ نے پُرمتانت چہرے کے ساتھ ایک بڑے سے بیگ کے فولڈر سے چھوٹا چرمی ہینڈ بیگ نکالا اور اس کے اندر سے تمام ضروری کاغذات نکال کر انسپکٹر کے سامنے کردیے۔ ساتھ ہی وہ اس کے بھاری گول چہرے کا بھی جائزہ لینے لگی۔

اسے انسپکٹر چندر کے چہرے سے صاف محسوس ہو رہا تھا کہ وہ صرف ان کی شناخت کے کاغذات ہی نہیں چیک کرنے آیا تھا، اس کا مقصد کچھ اور بھی تھا یہی سبب تھا کہ ان کے کاغذات تو اس نے بے دلی کے ساتھ دیکھے تھے، لہٰذا وہ انہیں واپس لوٹاتے ہوئے خرانٹ لہجے میں بولا۔

”یہاں آنے والے پاکستانیوں کے کاغذات تو ٹھیک ہی ہوتے ہیں، لیکن ان کے یہاں آنے کا مقصد ٹھیک نہیں ہوتا۔ اسی لیے مجھے تمہارے کمرے اور سامان کی تلاشی لینا ہوگی۔“

”یہ کیا بات ہوئی بھلا؟“ غزالہ پھٹ پڑی۔ ”ایسی تلاشی کا بھی کوئی معقول جواز ہونا چاہیے۔ کدھر ہے سرچ وارنٹ؟“

انسپکٹر چندر لال نے بڑی خشم آلودہ نظروں سے غزالہ کی طرف گھورا اور کرخت لہجے میں بولا۔ ”جواز کی

بات نہ ہی کرو تو اچھا ہے بی بی! رہی بات سرچ وارنٹ کی تو یہاں کے حالات کے پیش نظر ہمیں اختیارات ملے ہوئے ہیں کہ ہم یہاں آنے والے کسی بھی وزیٹر، بالخصوص پاکستانیوں کی کسی بھی سے مکمل تلاشی لے سکتے ہیں۔ اب آپ ہمارا وقت ضائع نہ کریں اور خاموشی سے تلاشی دیں یا ہم دوسرا طریقہ استعمال کریں؟" اس کے لہجے میں ایک ایسی تہدید اتر آئی تھی۔ غزالہ غصے سے دانت پیسنے لگی تب ہی تنویر نے کسی حد تک مصلحت سے کام لیتے ہوئے اپنی بہن سے کہا۔

"غزالہ! انہیں تلاشی لینے دو۔ ہمیں ڈرنے کی کیا ضرورت ہے، جبکہ ہمارا دامن صاف ہے۔"

"دامن داغ دار ہونے میں بھلا دیر ہی کتنی لگتی ہے۔" انسپکٹر چندر لال نے ہولے سے مگر استہزائیہ کہا اور پھر اپنے دونوں ساتھی اہلکاروں کو مخصوص قسم کا تحکمانہ اشارہ کیا۔

تلاشی شروع ہو گئی۔ غزالہ ایک طرف کھڑی اندر ہی اندر غصے سے بل کھا رہی تھی۔ تنویر کے چہرے سے تشویشناک ... پریشانی کے آثار مترشح ہو رہے تھے۔

"انہیں آن کر کے چیک کرنا ہوگا۔" معاً انسپکٹر چندر لال نے غزالہ کی طرف دیکھ کر کہا۔ اس کا اشارہ اس بیگ کی طرف تھا جس کے اندر لیپ ٹاپ اور دیگر ڈیوائسز رکھے تھے۔ وہ تنک کر بولی۔

"یہ میرے پرسنل ..... آرٹیکل ہیں۔ انہیں چیک کرنے کا تمہیں کیا حق پہنچتا ہے؟"

"ہمیں تو کپڑے اتروا کے بھی چیکنگ کا اختیار ہے محترمہ!" چندر لال نے غزالہ کے خوب صورت سراپا کا گرسنہ نظروں سے جائزہ لیتے ہوئے خبیثانہ لہجے میں کہا تو تنویر بھی اپنے جوش غیظ پر قابو نہ پا سکا اور اس سے مخاطب ہو کر بولا۔

"مائنڈ یور لینگویج مسٹر! تمیز سے بات کرو، تمہیں شرم آنی چاہیے، ایک عورت ذات سے اس طرح بے ہودہ لہجے میں بات کرتے ہوئے۔" اس کی سخت کلامی پر انسپکٹر چندر لال کی آنکھوں میں یکایک درشت چمک اتر آئی اور اس نے سنسناتی ہوئی نظروں سے تنویر کی طرف دیکھا پھر دوسرے ہی لمحے اس نے آگے بڑھ کر اس کی گردن دبوچ لی۔ غزالہ کی چیخ نکل گئی۔ وہ اس کی طرف بڑھتے ہوئے حلق کے بل چلائی۔

"یو راسکل! ربش! چھوڑ دو میرے بھائی کو ورنہ....." اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا تھا۔ انسپکٹر چندر لال نے اپنے دائیں ہاتھ سے بہ دستور تنویر کی گردن پکڑے رکھتے ہوئے الٹے ہاتھ کا ایک زوردار تھپڑ غزالہ کے چہرے پر رسید کر دیا۔ اس کے حلق سے کراہ آمیز چیخ... خارج ہو گئی، وہ کئی قدم پیچھے کی طرف لڑکھڑا کے بیڈ سے جا ٹکرائی اور گر پڑی۔

"اس کتیا کو دبوچ لو اور اس کے پرسنل سامانوں کو بھی قبضے میں لے لو۔ اب تھانے لے جا کر ہی ان سے بات ہو گی۔" انسپکٹر چندر لال نے سرخ انگارہ آنکھوں سے بیڈ پر گری غزالہ کی طرف دیکھ کر کہا اور دونوں اہلکار اسے دبوچنے کو لپکے۔ اس رذیل انڈین پولیس انسپکٹر کے خطرناک عزائم کا اندازہ ہوتے ہی تنویر کے اندر کوئی حلق پھاڑ کے چلایا۔

"اب نہیں تو کبھی نہیں۔" اس نے بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ ایک ایسی حرکت کر ڈالی تھی جو انسپکٹر چندر لال کے سان گمان میں بھی نہ تھی۔

تنویر نے ایک جذبے اور جوش غیظ تلے بڑی سرعت کے ساتھ انسپکٹر چندر کے دائیں ہولسٹر سے اس کا سروس ریوالور نکال کر ہاتھ میں لے لیا تھا اور ایک جھٹکے سے اپنی گردن اس کے ہاتھ سے چھڑا کر ریوالور کی سیاہ نال چندر لال کی پیشانی پر رکھ دی تھی اور وحشت لہو رنگ لہجے میں چلا کر بولا......

"خبردار! کسی نے اگر ذرا بھی اپنی جگہ سے حرکت کی تو۔"

تنویر کی آنکھوں میں یکایک اترے ہوئے خون کی لالی کو محسوس کرتے ہوئے اس کی بہن کی طرف بڑھتے دونوں بھارتی پولیس اہلکاروں کے قدم وہیں رک گئے۔ ان کا افسر گن پوائنٹ پر تھا جبکہ انسپکٹر چندر لال کے چہرے پر بھی تنویر کے خوں رنگ لہجے کا خاطر خواہ اثر دیکھنے میں آیا تھا۔ وہ جانتا تھا شاید ایک مسلمان کی غیرت کب اسے کٹ مرنے پر آمادہ کر ڈالتی ہے اور وہ کسی بھی وقت ہر حد سے گزر جانے کو تیار رہتا ہے لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے ہمت کر کے کہا۔

"تم بہت خطرناک غلطی کر رہے ہو مسٹر تنویر!"

"شٹ اپ ذلیل انسان! اپنی زبان بند رکھو۔ ورنہ سوراخ کر دوں گا تمہاری پیشانی پر۔" تنویر غراہٹ سے مشابہ آواز میں اس سے بولا اور غزالہ کو اشارہ کیا۔

اس نے یک دم اپنی جگہ چھوڑی۔ اگلے چند سیکنڈوں میں وہ ان تینوں کو انہی کی ہتھکڑی لگا کر باتھ روم میں بند کر چکے تھے۔ بیڈ کی چادر پھاڑ کر انہوں نے اس کی دھجیاں بنا کے ان کے منہ میں گھسیڑ دی تھیں تاکہ وہ اپنی مدد کے لیے

کسی کو بلا نہ سکیں۔

اپنا ساز و سامان سمیٹ کر وہ ہوٹل انتظامیہ کو بغیر مطلع کیے خاموشی اور رازداری سے نکل گئے۔

تنویر کو اس رذیل انسپکٹر کے ہی نہیں بلکہ بھارتی فوج کے کیپٹن بھگوت کھنپال کے ناپاک اور جارحانہ عزائم کا بھی بہ خوبی اندازہ ہو چکا تھا۔یہی سبب تھا کہ اس کے پاس یہ انتہائی قدم اٹھانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔یوں بھی وہ اپنا ''کام'' مکمل کر چکے تھے۔کشمیر میں ہونے والے بھارتی فوجیوں کے انسانیت سوز ظلم و تشدد کے واقعات کی آنکھوں دیکھی کارروائی کے جس مشن میں وہ یہاں آئے تھے،وہ مقصد پورا ہو چکا تھا۔

لہٰذا اس سے پہلے کہ ان کی ناکہ بندی کی جاتی، انہوں نے فوراً ائرپورٹ کا رخ کیا اور پہلی دستیاب فلائٹ سے پاکستان کی طرف پرواز کر گئے......

☆☆☆

رحیم اپنے دونوں ساتھیوں، منیب اور عبید کے ہمراہ ان بھارتی فوجیوں کے تعاقب میں بڑھے چلے جارہے تھے۔انہوں نے جو شارٹ کٹ راستہ اپنایا تھا، وہ دو برفانی چٹانوں کے درمیان سے گزرتا اس طرف جا نکلتا تھا، جدھر سے قوس کی شکل میں گھومتی ہوئی امیراں کدل پل کی طرف جاتی یہ سڑک نسبتاً قریب پڑ جاتی تھی۔

یہ تینوں دوڑتے ہوئے اسی طرف نکل آئے تھے اور اب پوزیشنیں سنبھالے بیٹھ گئے تھے۔چند ثانیے تک گہرے گہرے سانس لینے کے بعد وہ ایک دوسرے سے بات کرنے کے قابل ہوئے تو عبید نے رحیم سے پوچھا۔

''سب سے پہلے ان پر دستی بم پھینک کر انہیں منتشر کیا جائے گا،تب ہی کوئی گوریلا کارروائی کر کے بھن کو بچانا ہوگا۔''

''نہیں، یہ منتشر ہونے کے بجائے ہم پر بیک وقت اپنی گنوں کا منہ کھول دیں گے اور وہ بزدل کیپٹن بھگوت راہِ فرار اختیار کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔'' رحیم نے کہا۔

''لیکن ہمیں جلدی اس قلیل موقع سے فائدہ اٹھانا ہو گا، اگر یہ امیراں کدل پل کے نزدیک بھی پہنچ گئے تو ہاتھ سے نکل جائیں گے۔'' منیب نے تشویش ظاہر کی تو رحیم چند ثانیے کی پُرسوچ خاموشی کے بعد بولا۔

''سنو! ہمیں سب سے پہلے ان دونوں گاڑیوں کے ٹائروں کو نشانہ بنانا ہوگا، تاکہ یہ بے کار ہو جائیں اور ان کی پیش قدمی کی رفتار بھی ٹوٹ جائے۔اس کے بعد ہی دستی بموں کا حملہ کرنے کے بعد گوریلا کارروائی ہوگی۔میں سب سے پہلے کیپٹن کی جیپ کے قریب ہونے کی کوشش کروں گا جبکہ تم فائرنگ کر کے ان سب کو الجھائے رکھنا۔''

رحیم کا یہ خطرناک فریضہ منیب نبھانا چاہتا تھا لیکن اس وقت رحیم کے کاندھوں پر اس مشن کا بوجھ تھا اور وہ اسے اپنی صوابدید پر پایۂ تکمیل تک پہنچانا چاہتا تھا۔

''الرٹ! دشمن سامنے ہیں۔میں آگے بڑھتا ہوں۔'' معاً رحیم متوکا نے کہا اور پھر تیزی سے ایک طرف رینگ گیا۔اس کے باقی دونوں ساتھی سڑک کے کنارے اگی خودرو جھاڑیوں کی طرف بڑھ گئے۔ایک ایک لمحہ ان کے دھڑکتے ہوئے دلوں پر فیصلہ کن گھڑی کی دھمک دیتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔

جیسے ہی ان کی گاڑیاں نشانے پر آئیں، انہوں نے دونوں گاڑیوں کے ٹائروں کا نشانہ لے کر ٹریگر دبا دیے فضا میں جیسے یک دم گولیوں کی بھیانک تڑتڑاہٹ ابھری تھی۔ان کا نشانہ خطا نہیں گیا تھا۔دوڑتی ہوئی گاڑیوں کے ٹائر سماعت شکن دھماکوں سے برسٹ ہوئے تھے اور وہ ایک طرف کو جھکتی چلی گئی تھیں۔یہاں تک کے سڑک کنارے کچے میں جا اتریں۔

رحیم کی عقابی نظریں کیپٹن بھگوت کھنپال کی جیپ پر جمی ہوئی تھیں۔اس نے جیسے ہی اس کی جیپ کو ایک طرف جھکتے اور سڑک کنارے شرابی چال کی طرح لڑکھڑاتے آتے دیکھا تو فوراً پوزیشن سنبھال لی اور سینے اور کہنیوں کے بل آگے بڑھنے لگا۔اسی دوران میں فوجیوں نے بھی جوابی فائرنگ داغ ڈالی تھی جبکہ منیب اور عبید کو رحیم کی بھی فکر تھی اور وہ اسے بھی کور دینے کی تگ و دو میں تھے مگر فوری طور پر ترتیب دیے جانے والے ایکشن پلان کے مطابق ان کے پاس جتنے دستی بم تھے، وہ سبھی ان کی طرف اچھال دیے۔

پے در پے کئی سماعت شکن دھماکے ہوئے اور ان میں کئی بھارتی فوجیوں کی چیخیں بھی شامل تھیں۔اس کے بعد منیب اور عبید نے فوراً ہی ایک مخصوص جنگی فارمیشن کے تحت اپنی جگہ بدلی تھی، مگر تب تک بھارتی فوجیوں کا وہ ٹولا جو بموں کی زد میں نہیں آسکا تھا، سنبھلتے ہی ان کی سمت پر اپنی گنوں کے آتشیں دہانے کھول دیے۔ان کی طاقت ور جدید گنیں کسی آگ اگلنے والے ڈریگون کی طرح گرج رہی تھیں۔منیب تو بروقت اپنی جگہ چھوڑ چکا تھا، لیکن عبید کو سلائڈ کرنے میں لمحے بھر کی تاخیر ہو گئی، نتیجتاً وہ گولیوں کی ایک لپکتی ہوئی خوفناک آتشیں باڑ کی زد میں آگیا۔اس کے حلق سے برآمد ہونے والی کرب انگیز چیخ نے بے اختیار منیب کا دل ہولا دیا۔

اس نے پلٹ کر اپنے ساتھی کا جائزہ لیا، پھر اس کے شہید ہونے کی تصدیق کے بعد وہ شدت غم تلے اپنے ہونٹوں کو بھینچتا ہوا گن سنبھالے تیزی سے آگے بڑھ گیا۔

اس نے ایک جگہ رک کر اپنے تیزی سے کام کرتے ذہن میں ایک فیصلہ کیا۔ وہ بھارتی فوجیوں کو جتنا نقصان پہنچا سکتے تھے وہ پہنچا چکے تھے مگر اب اس نے اپنے گروپ لیڈر رحیم کی فکر کی اور اسی جانب تیزی سے سینے کے بل رینگتا چلا گیا جدھر وہ غائب ہوا تھا۔

منیب جانتا تھا کہ رحیم متو کا ٹارگٹ کیپٹن بھگوت تھا اور اس کی جیپ اسے دکھائی دے گئی تھی۔ وہ اسی طرف بڑھا اور تب ہی اس کی نظر جیپ سے اترتے ہوئے کیپٹن بھگوت پر پڑی۔ وہ بزدل زینو کو دبوچے جیپ سے برآمد ہو رہا تھا۔ دو تین ساتھی اہلکار بھی اس کے ہمراہ تھے۔ ایسے ہی میں اس نے رحیم کو جوش غیرت تلے جھاڑیوں سے ابھرتے اور کیپٹن کو للکارتے دیکھا۔

"ذلیل کتے! چھوڑ دے اس معصوم کو۔" اس کے للکارنے کی دیر تھی کہ بیک وقت کئی گنیں اس کی طرف اٹھ گئیں، جبکہ بزدل کیپٹن بھگوت نے خطرہ محسوس کرتے ہی زینو کو اپنی ڈھال بنالیا۔ اس کے ساتھیوں نے رحیم متوکا کو نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی کہ ان کا دھیان بٹانے کے لیے منیب نے اچانک ابھر کے انہیں للکار دیا اور ساتھ ہی ان پر فائرنگ بھی کر ڈالی۔ اس بات کا دھیان اس نے رکھا تھا کہ کوئی گولی کیپٹن بھگوت کی راہ نہ پائے کیونکہ وہ مردود بزدل، معصوم زینو کو اسی مقصد کے لیے اپنے ساتھ لگائے ڈھال بنائے ہوئے تھا کہ کسی مجاہد کی گولی اسے جہنم واصل نہ کر ڈالے۔

اس کے ساتھ کھڑے ساتھی فوجیوں میں سے دو گر پڑے تیسرے نے اس پر فائر کھولا۔ رحیم چیخ مار کے گرا تو منیب دہل گیا۔ گن سنبھالتا ہوا تیزی سے آگے بڑھا تو کیپٹن بھگوت کھٹپال کے گرد اس کے کچھ ساتھی لپکے۔ اسی وقت اسے زینو کی چلاتی ہوئی آواز سنائی دی۔

"میرے کشمیری مجاہد بھائی! تم جو کوئی بھی ہو، ایک مسلم بہن تم سے التجا کرتی ہے کہ میری عصمت کو ان بھارتی کافر درندوں سے بچا لو۔ م...... مجھ پر ایک احسان کردو۔ م...... مجھے گولی مار دو۔ گولی مار دو مجھے۔ میں مرنا قبول کرتی ہوں۔"

منیب کو اس آواز میں ایک درد ایک کرب کی تڑپ محسوس ہوئی تھی۔ ایسا درد جس میں حسرت بھی تھی اور یاس کے تازیانے بھی۔ منیب کا دل دکھ سے بھر گیا۔ اسی وقت منیب کو قریب کی جھاڑیوں سے ایک کراہتی ہوئی آواز سنائی دی۔

"ی ی۔ یہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔ م...... منیب! اسے گگ...... گولی مار دو۔" وہ چونکا۔ یہ اس کے زخمی ساتھی رحیم متوکا کی آواز تھی۔ منیب غیر ارادی طور پر اس آواز کی سمت بڑھا تھا کہ اچانک ایک بھارتی درندے کو اس کی جھلک نظر آگئی۔ اس نے ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر اس پر برسٹ چلا دیا۔ منیب نے گولیوں کی بوچھاڑ کی آواز سنتے ہی بچنے کی کوشش کی مگر اس کا بایاں شانہ زد میں آگیا۔ اس نے اپنے حلق سے ابھرنے والی چیخ کو بہ مشکل اپنے دانتوں اور ہونٹوں تلے بھینچا تھا۔ وہ نظروں میں آگیا تھا اور اس حقیقت کا اسے اچھی طرح علم ہو چکا تھا۔

زینو کے الفاظ اب اس کے لیے انگارے بننے لگے تھے، وہ بہ مشکل آگے بڑھا۔ اس پر ایک اور برسٹ فائر کیا گیا تھا مگر اس بار اس نے متوقع خطرہ بھانپتے ہی خود کو گرا لیا تھا اور پھر اپنے مضروب بدن کی تمام طاقت کو مجتمع کر کے آگے بڑھا۔ اس پر متواتر اور اندھا دھند برسٹ فائر ہو رہے تھے، کہ اچانک ایک گولی اس کے دائیں پہلو کو گھائل کر گئی۔ وہ بری طرح زخمی ہو چکا تھا اور آنکھوں کے سامنے موت کی دھندلاہٹ طاری ہونے لگی تھی کہ اچانک اسی دھندلاہٹ میں اسے بس صرف ایک جھلک دکھائی دی تھی زینو کی۔ اس نے اسی کا نشانہ لے کر پورا برسٹ فائر کر دیا۔ اس کی زخمی سماعتوں سے زینو کی دل خراش چیخ سنائی دی اور اس نے جیسے مطمئن ہو کر اپنی آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند کر لیں......

تھوڑی دیر بعد بھارتی فوجیوں کا یہ درندہ صفت ٹولا زینو کی لاش کو وہیں چھوڑ کر آگے بڑھ چکا تھا۔ فضا ساکت تھی۔ ماحول میں بارود کی بو گھلی ہوئی تھی، کہیں کہیں سے دھواں سا اٹھ رہا تھا۔ وقت تھما ہوا لگتا تھا، جیسے اسے موت آگئی ہو۔ زینو کی خون میں لتھڑی لاش سڑک کے درمیان آڑی ترچھی نظر آ رہی تھی اور پھر تب ہی اچانک قریب کی جھاڑیوں سے کوئی آہستہ آہستہ سینے کے بل رینگتا ہوا، زینو کی لاش کی طرف بڑھا اور قریب پہنچ کر اس نے بے اختیار زینو کی خون آلودہ پیشانی پر بوسہ دے ڈالا۔ یہ رحیم تھا۔ اس کے بعد وہ اسی طرح واپس پلٹ گیا۔

☆☆☆

(پس منظر)

لاری کے روانہ ہونے تک زلیخاں اس مخمصے کا کافی

دیر تک شکار رہی تھی کہ آخر شفیق یوں اچانک غائب کہاں ہو گیا تھا اور کیوں؟ کیا واقعی اس میں اسے جاتے ہوئے دیکھنے کی تاب نہیں رہی تھی یا پھر کوئی اور بات تھی؟

دو لاریوں اور تین ٹرکوں پر مشتمل مسلمانان جموں کا ہجرت کرنے والا یہ قافلہ نصف رات کی پہر تاریکی میں روانہ ہو چلا تو بے اختیار کھڑکی کے قریب بیٹھی زلیخاں کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

اس نے اپنے ہونٹ، ضبط کے انداز میں بھینچ رکھے تھے، تاکہ چہرہ مزید اشکبار نہ ہو۔ شکر تھا کہ سر پہ حجاب کی چادر تنی ہوئی تھی اور اس کا مرتعش وجود اس کی ''لپیٹ'' میں چھپا ہوا تھا، تاہم کسی سے بات کرنے پر لہجے کی غم آگیں لڑکھڑاہٹ تو ظاہر ہو سکتی تھی، اس کے لیے وہ خود کو سنبھالا دینے کی کوشش کرنے لگی۔

اس کے برابر والی سیٹ پر بھابی کلثوم ایک بچے کو گود میں لیے بیٹھی تھی جبکہ ان کے پیچھے والی سیٹ پر اس کا باپ رحیم خان اور بھائی ولی خان اپنے دوسرے بچے کو گود میں لیے بیٹھا تھا۔ لاری دو رویہ سیٹوں کی قطاروں پر مشتمل تھی۔ اور یہ کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ سیٹوں کی قطاروں کی درمیانی جگہ میں بھی لوگ سکڑ سمٹ کر بیٹھے تھے، کئی چھت پر بھی بھرے پڑے تھے۔ لاری کی رفتار مناسب تھی اور دو لاریاں، تین ٹرک ایک قطار کی صورت دھیر کوٹ کی سڑک کو عبور کرتے ہوئے کوٹلی روڈ پر آگئے۔

یہاں سے آگے سوچیت گڑھ کا فاصلہ خاصا طویل تھا اور گورکھا بلدیو سنگھ پٹھانیہ کے مطابق سوچیت گڑھ سے یہ لوگ سیالکوٹ (پاکستان) کی طرف عازم سفر ہو جائیں گے۔

سفر جاری تھا۔ لاری کے روانہ ہوتے ہی بیشتر مسافروں کو ایک عجیب سی چپ کھا گئی تھی۔ زلیخاں کھڑکی سے باہر تکے جا رہی تھی جہاں اب بنجر ویرانے کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ آسمان پر تکے طباق چاند کی روشنی میں پیچھے بھاگتے مناظر کو دیکھ کر زلیخاں کو ایک لمحے کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ اسے لوٹ آنے کا کہہ رہے ہوں۔ بس! یہی وہ وقت تھا جب اس کے دل و دماغ میں نامعلوم سی بے چینی نے گھر کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ یک دم جیسے بے کل سی ہو گئی۔ اس نے یونہی شاید اپنے اندر کی بے چینی کو کم کرنے کی غرض سے اپنے قریب بیٹھی بھابی کلثوم سے نیچی آواز میں کہا۔

''بھابی! اور کتنا فاصلہ رہ گیا ہوگا سوچیت گڑھ کا؟''

''ابھی تو کوٹلی سے نکلے ہمیں آدھا گھنٹا ہی ہوا ہوگا۔'' کلثوم بولی۔ ''میرا خیال ہے کھٹوعہ روڈ کے بعد ایک گھنٹے کا سفر اور ہوگا یا پھر دو گھنٹوں کا؟''

''بھابی! ہم سب بہ خیریت پاکستان پہنچ جائیں گے نا؟''

اندیشناک وسوسوں کی غمازی کرتے زلیخاں کے لہجے نے جانے کیوں کلثوم کو بھی لمحے بھر کے لیے چونکا سا دیا تھا۔ بولی۔ ''ہاں! انشاء اللہ کیوں نہیں پہنچیں گے!'' زلیخاں... خاموش ہو کر دوبارہ کھڑکی سے باہر، گم صم نگاہوں سے تکنے لگی۔ کافی دیر اسی طرح گزر گئی تو اچانک کسی مسافر نے پیچھے سے ہانک لگائی۔

''ارے! یہ لاریاں کھٹوعہ روڈ کی طرف کیوں مڑ رہی ہیں؟''

''میاں! ہو سکتا ہے، اس طرف کا راستہ خراب ہو۔ اسی لیے بیچ کا راستہ اختیار کیا جا رہا ہو؟'' ایک دوسری آواز میں خیال ظاہر کیا گیا تھا۔ اسی طرح کی ملی جلی مزید کچھ اور بھی آوازیں ابھریں، اس کے بعد لاری میں پھر وہی دھڑکتی خاموشی چھا گئی۔

تھوڑی دیر بعد لاری کو ہچکولے لگنا شروع ہو گئے۔ لوگ پریشان سے ہو گئے، صاف لگتا تھا کہ لاری اپنے اصل راستے سے ہٹ کر کسی اور طرف کو جا رہی تھی۔ مسافروں میں بے چینی کی لہر سی دوڑ گئی اور وہ کھڑکی سے باہر سر نکال نکال کر ویران تاریکی میں آنکھیں پھاڑے دیکھنے لگے۔ آگے پیچھے آنے والی گاڑیاں بھی اسی طرف کو ہی مڑی چلی آ رہی تھیں۔

لاری میں طرح طرح کی چہ میگوئیوں کا بم بچ ابھرنا شروع ہوا تو جانے کیوں زلیخاں کے اندر کی بے چینی بھی سوا ہونے لگی۔ اس بار تو اس کی بھابی کلثوم بھی پریشان تھی اور بار بار اپنی گردن پیچھے موڑ کر اپنے شوہر اور سسر کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگتی۔ بالآخر اس نے اپنے شوہر ولی خاں سے کہا۔

''کیا معاملہ ہے یہ؟ آپ ذرا پتا تو کریں؟''

اس کا شوہر اور سسر رحیم خاں خود پریشان سے تھے۔ اچانک لاری کی رفتار دھیمی پڑنے لگی۔ زلیخاں نے ایک تیز روشنی سی کھڑکی سے باہر دیکھی، وہ ایک طویل میدانی علاقہ ہی نظر آتا تھا، جہاں جا بجا مشعلیں اور الاؤ دہک رہے تھے۔ وہیں اسے لمبے تڑنگے گورکھوں کا قرولی بہ دست ٹولا دکھائی دے گیا۔ کسی کے ہاتھ میں کرپان تھی تو کسی کے پاس لانبی لانبی تلواریں۔

''یا اللہ...... رحم۔'' لاری میں ایک کپکپاتی ہوئی آواز ابھری تھی۔

اس کے بعد جیسے ایک تماشا خوں رنگ شروع ہو گیا، ہر طرف چیخ و پکار مچ گئی۔ لٹیرے لمبی لمبی کرپانیں اور تلواریں، قرولیاں لیے گاڑیوں پر حملہ آور ہو گئے۔ ان کی لاری پر بھی آٹھ دس خونخوار چہروں والے گورکھا لٹیرے وحشیانہ آوازوں کے ساتھ چڑھ آئے۔ انہوں نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق سب سے پہلے مردوں اور بوڑھی عورتوں پر حملہ کر دیا۔ زلیخاں اور کلثوم ہراساں ہو گئیں۔

"چلو...... چلو اترو...... جلدی۔" پیچھے سے ولی اور رحیم نے انہیں کھدیڑا۔ دونوں اپنی سیٹوں سے اٹھی ہی تھیں کہ ایک وحشیانہ چنگھاڑ ابھری اور کلثوم کے قدموں پر کوئی شے لڑھکتی ہوئی آن گری۔ اس نے دیکھا تو مارے دہشت کے حلق سے ایک چیخ برآمد ہو گئی۔ وہ اس کے شوہر ولی خاں کا کٹا ہوا سر تھا، اسے غش آ گیا۔ وہ گرنے لگی تو پیچھے سے زلیخاں نے اسے سنبھالا دینا چاہا مگر اس کے تو اپنے اوسان خطا تھے۔ اسی وقت اس کے باپ کی بھی سربریدہ لاش اس کے اوپر آن پڑی۔ زلیخاں چیختی ہوئی آگے بڑھی عقبی سیٹ پر اس نے اپنے بھائی ولی کی سرکٹی لاش پڑی دیکھی، اس کی گود میں جو آٹھ سالہ بچہ بیٹھا تھا، وہ ایک گورکھا کے پیروں پہ جا گرا تھا اور روئے جا رہا تھا۔ ایک دوسرے وحشی گورکھا لٹیرے نے اس معصوم کے جسم کو عقب سے اپنی لمبی تلوار میں پرو کر پرے اچھال دیا۔ اس انسانیت سوز بربریت پر زلیخاں کی آنکھیں پھیل گئیں، جو نو سالہ بیٹا اس کی بھابی کلثوم کے ساتھ تھا، اس نے اس کا ہاتھ پکڑا اور دروازے کی طرف دوڑی اور اسے کسی طرح ان ننگ انسانیت وحشی گورکھا ٹولے کے سفاک پنجوں سے بچا کر لاری سے نیچے اتر آئی...... جبکہ بھابی کلثوم کو دو لٹیرے دبوچ کر اپنے ساتھ لے گئے، اسے بھی ایک گورکھے نے دبوچنا چاہا تھا مگر وہ اسے دھکا دے کر اپنے معصوم بھتیجے کا ہاتھ پکڑے لاری سے اتر آئی تھی مگر یہاں بھی سفاکی اور بربریت کا بازار گرم تھا، ہر طرف قیامت صغریٰ مچی ہوئی تھی۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کدھر جائے؟ کہاں کی راہ لے؟ یہاں تو ہر طرف موت کا بازار گرم تھا۔ تلواروں، کرپانوں کی خوں رنگ سنسناتی "شپا شپ" میں بھتیجا اس قدر خوف زدہ ہو گیا تھا کہ اس کی گھگی بندھ گئی تھی۔ شاید اس نے اپنے بھائی کا انجام دیکھ لیا تھا۔ وہ اس معصوم کا ہاتھ تھامے ایک طرف کو بھاگی تھی کہ دو مسٹنڈے گورکھے چیتے کی طرح اس پر جھپٹے۔ اس کے حلق سے چیخ بلند ہو گئی، اور وہ ہراساں ہرنی کے مانند ان دونوں کے شکنجوں میں تڑپنے لگی، بچے کا ہاتھ چھوٹ گیا تھا۔ وہ تھوڑی دور جا کر ایک دوسرے وحشی گورکھے کی بربریت کی بھینٹ چڑھ گیا۔

ادھر ان دونوں گورکھوں نے سب سے پہلے زلیخاں کی چادری کھینچ کر اسے بے پردہ کر ڈالا۔ اس کے بعد شیطانی قہقہے لگاتے، اسے دبوچے ہوئے ایک طرف کو چل دیے، جدھر ایک بڑے سے ٹیلے کے قریب خیمے گڑے ہوئے تھے۔

کٹھوعہ کے قریب واقع اس میدان کو جیسے میدان کربلا بنا دیا گیا تھا۔ مہندر جنگ سنگھ نے مہاراجا کی "ہدایت" کے مطابق اپنے حواری بلدیو سنگھ کے ساتھ مل کر مسلمانان جموں کے اس طرح قتل عام کی جو سازش کھیلی تھی، اس میں انہیں کامیابی حاصل ہوئی تھی۔

ہزاروں مسلمانوں مرد بوڑھوں اور بچوں کا قتل عام کرنے کے بعد ان کی جوان عورتوں کو دبوچ کر یہ لٹیرے اپنے اپنے خیموں میں گھسیٹ کر لے گئے تھے۔ یہ معصوم اور عفت مآب عورتیں زندہ لاشوں کی شکل کر دی گئیں، بعد میں انہیں بھی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

زلیخاں کو دبوچ کر اپنے ساتھ ایک خیمے کے اندر لانے والے دو گیم شحیم ڈوگرا گورکھے اسے ایک طرف کونے میں دھکیلنے کے بعد اس کی طرف گرسنہ نظروں سے گھورے جا رہے تھے اور اس کی بے بسی پر حظ اٹھا رہے تھے۔

"خ...... خدا کے لیے م...... مجھے چھوڑ دو...... ی ی...... یا مار ڈالو...... لی لیکن میرے ساتھ یہ ظلم مت کرو۔" زلیخاں ایک طرف کونے میں کھڑی تھر تھر کانپتی...... ہوئی ان کی منت ساجت کرتے ہوئے بولی۔ اس کی چادر غائب تھی، دوپٹا بھی جانے کہاں جا پڑا تھا، وہ بے چاری اپنے دوپٹے سے بے نیاز سینے پر اپنے دونوں ہاتھوں کی قینچی بنائے کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ دھلے ہوئے لٹھے کی طرح سپید پڑ چکا تھا۔ خوف اس کی آنکھوں سے لہو کے مانند بہتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اسے تو اب اپنی جان کی بھی پروا نہیں رہی تھی، مگر اب اس کی کوشش یہی تھی کہ یہ دونوں ظالم شیطان اس کی عزت سے نہ کھیلیں۔

ایک گورکھے نے قریب پڑی صراحی اٹھائی اور اپنے منہ سے لگا لی۔ پھر اپنی بہتی باچھوں کو اپنی شلوکے دار قمیص کی آستین سے پونچھتے ہوئے اپنے دوسرے ساتھی سے بولا۔ "یہ لے رگھو! لے خالص تاڑی کا مزہ لے، پھر اس کنیا سے کھلواڑ کرنے کا لطف دوبالا ہو جائے گا۔"

صراحی میں شاید شراب تھی، اس کے رگھو نامی دوسرے ساتھی نے صراحی لی اور بولا۔

"جلدی کرلے۔ ابھی دوسروں کی باری آجائے گی تو اندر گھسے چلے آئیں گے سالے۔ پہلے ہم اس کا مزہ لوٹ لیں۔"

زلیخاں ان کی یاوہ گوئی پر سرتا پا لرز اٹھی تھی۔ گویا ان دونوں شیطانوں کے بعد اور بھی شیطان اس کی حصے داری کرنا چاہتے تھے۔ باہر دیگر خیموں سے عورتوں کی روح فرسا چیخ وپکار اور گورکھا لٹیروں کے شیطانی قہقہوں کی آوازیں جاری تھیں جو زلیخاں کے کانوں تک بھی پہنچ رہی تھیں...... اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس قیامت کے گزرنے سے پہلے اپنی جان ہی ختم کرڈالے۔

اسی وقت اس کی نگاہ قریب رکھی ایک قرولی پر پڑی، وہاں ذرا فاصلے پر ایک ایک کرپان بھی پڑی ہوئی تھی جو ابھی دونوں خبیثوں کی تھیں۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اس طرف تیزی کے ساتھ پیش قدمی کی اور جھک کر وہ قرولی اپنے ہاتھ میں ..... پکڑلی، لیکن ایک گورکھے نے پہلے ہی سے اس کی یہ حرکت بھانپ لی تھی اور اس نے بھیڑیے جیسی غراہٹ کی آواز سے اس پر جھپٹا مارا اور قرولی چھین لی، بلکہ زلیخاں کو بھی دبوچ لیا۔ وہ بے بس اور معصوم چڑیا کی طرح اس کے شکرے ایسے شکنجے میں پھڑپھڑانے لگی تو دوسرے گورکھے نے اس کے گریبان پر ہاتھ ڈال کر اسے پھاڑ ڈالا۔ برہنگی کے احساس نے اس عفت مآب دوشیزہ کو گھڑوں شرم تلے ڈبو دیا اور وہ اپنے دونوں ہاتھ جوڑے انہیں خدا کے واسطے دینے لگی جبکہ وہ دونوں شیطان اس کی بے بسی اور کمزوری سے ایک شیطانی لذت محسوس کرتے اس کی طرف ہوس ناک نظروں سے گھورتے دھیرے دھیرے اس کی طرف بڑھنے لگے۔ زلیخاں خوف زدہ نگاہوں سے ان کی طرف تکتی، پیچھے ہٹنے لگی مگر کہاں تک ہٹتی؟ بالآخر خیمے کی دیوار سے جا لگی اور وہ دونوں گورکھا اس کے بالکل نزدیک پہنچ گئے۔ ٹھیک اسی وقت کوئی تیزی سے خیمے کے اندر داخل ہوا تھا۔

اس کے ہاتھ میں تلوار تھی جو اس نے آگے بڑھ کر ایک گورکھا کی پشت میں بھونک دی۔ اس کے حلق سے بیل جیسی ڈکراہٹ بلند ہوئی تو دوسرا چونک کر زلیخاں کی طرف سے توجہ ہٹا کے پلٹا مگر تب تک تو وارد پہلے والے شیطان گورکھے کی پشت سے تلوار نکال چکا تھا اور وہ اس نے دوسرے کے پیٹ میں گھونپ دی۔ اس کا پیٹ چرتا چلا گیا اور ساری انتڑیاں باہر کو آپڑیں۔ منہ خون سے بھر گیا۔ دونوں دھپ کی آواز سے گرے۔ زلیخاں کی حیرت بھری نگاہ اپنے سامنے پڑی تو جیسے وہ بت بن گئی۔ اس کے سامنے شفیق علی کھڑا تھا۔

"جلدی آؤ زلیخاں! وقت کم ہے۔" وہ اس کی طرف دیکھ کر بولا اور زلیخاں کا جیسے سکتہ ٹوٹا۔ "شش...... شفیق...... تت...... تم......" کہتے ہوئے وہ اس کی طرف لپکی تھی کہ شفیق نے فوراً اس کی چادر اٹھا کر اس کی طرف اچھال دی۔ پھر وہ اسے اپنے ساتھ لیے۔ خیمے سے باہر آ گیا۔

باہر ہر طرف محشر کا سا سماں تھا، قتل و غارت گری کا ایک طوفان سا برپا تھا۔ شکر تھا کہ شفیق خود ایک گورکھے کے لباس اور "گیٹ اپ" میں تھا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، زلیخاں کو اپنے کاندھوں پر ڈالا اور ایک طرف کو بھاگا۔ دور سے اسے دیکھ کر یہی محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی لٹیرا گورکھا اپنے "شکار" کو دبوچے لے جا رہا ہو۔

جلد ہی وہ اس میدانِ خارزار و کارزار سے بہت دور نکل گئے۔ ایک محفوظ مقام پر پہنچ کر وہ ذرا ستانے کے لیے رکے تو بے اختیار اپنے گھر والوں اور معصوم بھتیجیوں کا انجام یاد کر کے اس کا دل بھر آیا اور وہ شفیق کے سینے میں اپنا منہ چھپا کر رو پڑی، اور اس ہچکیوں کے درمیان اس ساری ظلم ناک شب کا حال بتا ڈالا، جسے سن کر شفیق بھی آبدیدہ ہو گیا تھا، تاہم وہ اسے تسلیاں دینے کے سوا اور کیا کر سکتا تھا؟

بہر طور بعد میں شفیق نے اسے بتایا کہ عین وقت پر جانے اس کے دل میں کیسی بے چینی نے سر ابھارا کہ وہ گھبرا سا گیا۔ اس کے جی میں آئی کہ اپنی تسلی کی خاطر کم از کم سوچیت گڑھ تک وہ زلیخاں کو اپنی آنکھوں کے سامنے ہی جاتا دیکھ کر اچھی طرح تسلی کر لے۔ اس نیت سے وہ بھی دانستہ اس کی نگاہوں سے چھپ کر لاری میں سوار ہو گیا تھا۔

جب گورکھوں اور ڈوگروں نے چنگیزیت کا کھیل کھیلا تو وہ بھی اس کی زد میں آگیا، مگر اسے زلیخاں کی فکر تھی۔ بڑی مشکلوں سے وہ کسی طرح اپنی جان بچانے میں کامیاب ہوا اور ایک گورکھے کا شکار کرتے کے بعد وہ اس کے لباس میں ذرا منظر عام میں آنے کے قابل ہوا تو پھر وہ اسے (زلیخاں کو) ڈھونڈتے ہوئے وہاں آن پہنچا۔

ظلم کی یہ شب گزیدہ رات تمام ہونا تھی اور ہر ایسی شب کے بعد سویرا بھی ہوتا ہے۔ ایسے ہی ایک نئے

سویرے کی امید میں شفیق، زلیخاں کو ہمیشہ کے لیے اپنے گھر لے آیا تھا۔

☆☆☆

حجرہ دوتھان کی ایک نسبتاً بڑی سی کوٹھڑی میں کمانڈر عبداللہ، اپنے دونوں جوان جری بیٹوں، عبدالقیوم اور عبدالرحمان سمیت دیگر چند جانباز ساتھیوں کے ساتھ موجود اہم نشست میں مصروف تھا۔

مسلمانان جموں و کشمیر تک اس سانحہ شب گزیدہ کی خبر پہنچ چکی تھی اور پوری ریاست میں ڈوگروں اور ہندو گورکھوں کے خلاف غم و غصے کی ایک شدید لہر سی دوڑ گئی۔ انہیں پتا چل چکا تھا کہ یہ قتلِ عام سوچی سمجھی سازش کا نتیجہ تھا جس کے پیچھے مہاراجا اور اس کے دستِ راست ڈوگرا سالار مہندر جنگ سنگھ کا ہاتھ تھا۔

ہرنہ میرا اور بجیرہ والی کامیاب مہم اور خان غفار اور محمود کی شہادت کے بعد ان کے قریبی ساتھیوں میں شرجیل باقی بچا تھا جو وہاں موجود تھا۔

یہ لوگ اس وقت ڈوگرا سرکار کے اہم مہرے مہندر جنگ سنگھ کو جہنم واصل کرنے کے منصوبے پر غور کر رہے تھے، سوچیت گڑھ کے اس خون ریز واقعے نے ان مجاہدین کی رگوں میں بھی لاوا سا بپا کر دیا تھا اور وہ اس کا انتقام لینے کے لیے بے چین بیٹھے تھے۔

ہرنہ میرا اور بجیرہ والی مہم کی کامیابی کے بعد انہیں اپنے جیالیوں کی طرف سے یہ اطلاع ملی تھی، کہ دریائے پونچھ کے دوسرے کنارے پر واقع کوٹلی میں دھیر کوٹ کے مقام پر موجود ڈوگرا شاہی کے ایک اہم افسر مہندر جنگ سنگھ نے اپنی شکست (کیپٹن اشرف حسین وغیرہ والی مہم) اور یہ حقیقت جان لینے کے بعد کہ بہت جلد سرحد پار سے (پاکستان سے) غیور قبائلیوں کا ایک پورا جتھا ڈوگرا شاہی سے فیصلہ کن جنگ کرنے کے لیے جوق در جوق جموں پہنچ رہا ہے تو اس نے خوب زور دار بدلہ لینے کے لیے بھارت سرکار سے مدد مانگ لی ہے اور اس سلسلے میں بھارت نے نہ صرف اس کی مدد کرنے کی ہامی بھر لی ہے بلکہ اس سلسلے میں ہندو اور گورکھا کمپنیوں پر مشتمل دو بٹالین پہنچ بھی چکی تھیں جن کی مشترکہ کمانڈنگ بھارتی فوج کا ایک افسر میجر کالی کھرانہ کر رہا تھا، جس نے اپنا فوجی کیمپ نالا پناکھ کے قریب قائم کر رکھا تھا۔

کمانڈر عبداللہ کا خیال تھا کہ انہیں اس صورت حال... میں کیپٹن حسین خان اور اشرف خان کے ہاتھ مضبوط کرنا چاہیے تھے اگرچہ وہ ایسا کر بھی رہے تھے، ڈوگرا شاہی کے خلاف تازہ جنگ میں کامیابی اس کی حالیہ مثال تھی۔

"ہمیں یا تو ایک بار پھر اس جنگ میں ہمیشہ کی طرح دوستوں (کیپٹن حسین خان اور اشرف خان) کے شانہ بشانہ ہونا پڑے گا یا پھر اس سے پہلے ایک آخری اور فیصلہ کن گوریلا کارروائی کرنا ہوگی جس میں ہمیں مہندر جنگ سنگھ کو ہر قیمت پر جہنم واصل کرنا ہوگا اور اس کا کیمپ ایمونیشن سمیت تباہ کرنا پڑے گا۔ اس طرح اندر سے ان کی کمر ٹوٹ جائے گی اور جنگ کے اچھے اور متوقع نتائج بھی برآمد ہوں گے۔"

کمانڈر عبداللہ نے اپنی باریش پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ساتھیوں سے مشورہ طلب لہجے میں کہا تو تھوڑی مذاکراتی بحث و تمحیص کے بعد سب متفق ہو گئے۔

اس مختصر مگر اہم نشست کے ایک گھنٹے بعد ہی پانچ مسلح گوریلا گروپ کمانڈر عبداللہ کی لیڈ میں، دریائے پونچھ کے دوسرے کنارے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ہمیشہ کی طرح عبداللہ خود بھی بہ نفسِ نفیس اس مہم میں شامل تھا۔ باقی چار میں دو اس کے بازو یعنی بیٹے، عبدالقیوم اور عبدالرحمان تھے، تیسرا ساتھی شرجیل اور چوتھا ان کا ایک نیا قریبی ساتھی تیمر تھا۔ یہ ایک اٹھارہ انیس سالہ پرجوش نوجوان تھا۔

رات اپنے نصف پہر میں داخل ہو چکی تھی اور یہ پانچوں مجاہد اسی تاریکی کا حصہ بنے، دریائے پونچھ کے دوسرے کنارے تک کامیابی سے پہنچ چکے تھے۔ یہ علاقہ کوٹلی کے قریب تھا اور یہاں سے انہیں پیادہ آگے دھیر کوٹ کی طرف روانہ ہونا تھا۔

انہیں اس بات کا ادراک تھا کہ دھیر کوٹ میں دشمنوں کے پکٹے اور چوکیاں بھی قائم تھیں اگرچہ ہرنہ میرا اور بجیرہ والی مہم کی کامیابی کے بعد دشمنوں کی پیش قدمی کو کافی حد تک مشکلات سے دوچار کر دیا تھا اور پھر دونوں طرف سے تازہ اور فیصلہ کن جنگی تیاریوں کی مصروفیت کے باعث دشمن کا دھیان بھی مجاہدین کی کسی بھی ممکنہ گوریلا کارروائی کی طرف کم ہی تھا۔ اسی لیے کمانڈر عبداللہ نے یہی وقت مناسب قرار دیا تھا کہ دشمنوں کی ریڑھ کی ہڈی پر وار کر کے اسے وقت سے پہلے کمزور کر دیا جائے لیکن اس کا یہ مطلب بھی... ہرگز نہ تھا کہ یہ مہم اتنی سہل تھی بلکہ اس وقت تو پورے دھیر... کوٹ میں دشمنوں کی مشترکہ فوج اتری ہوئی تھی۔ میجر کالی کھرانہ کی دو بٹالین کمپنیاں (ہندو اور گورکھا) اور ڈوگرا شاہی کا افسر اعلیٰ مہندر جنگ سنگھ بھی اپنی عسکری قوت کا ڈیرا ڈالے بیٹھا تھا۔

یہی سبب تھا کہ اس خطرناک مگر اہم مہم میں روانگی سے پہلے ہی کمانڈر عبداللہ نے اپنے دونوں بیٹوں اور ساتھیوں سے واضح لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ یہ ایک کفن بدوش مہم ہے اور ہمیں اپنی جانوں کی پروا کیے بغیر اس میں بہر صورت کامیاب ہونا ہے۔ کیونکہ دشمنوں کے خلاف بہت جلد ہونے والی ایک بڑی جنگ میں مسلمانان جموں و کشمیر کی فتح کا دارو مدار اسی گوریلا کارروائی پر تھا۔ ان چاروں نے بھی اپنے کمانڈر کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اس عزم کا اظہار کیا تھا کہ وہ ان کے ساتھ سربکف ہیں۔

دریا کے کنارے بنے ٹیلوں ٹبوں کی طرف پیش قدمی کے دوران یہ پانچوں ایک مقام پر ذرا سستانے کے لیے رک گئے۔ کمانڈر عبداللہ نے اوپر کھلے آسمان کی طرف دیکھا اور دل میں شکر ادا کیا کہ فضا صاف ستھری ہوئی تھی اور آسمان روشن تھا، جس پر ٹمٹماتے ستاروں کی روشنی میں اس نے گردوپیش کا جائزہ لیا تھا۔ اس کے بعد وہ سرگوشی میں اپنے ساتھیوں کو ہدایت دیتے ہوئے بولا۔

''ہم اس وقت چوحدہ کے بالکل ٹھیک مقام پر موجود ہیں۔ کیونکہ ادھر ہی سے ایک راستہ نصف میل کے بعد ڈوگرہ شاہی کی عسکری کمک کے ان کیمپوں کی طرف جاتا ہے، جہاں میجر کالی کمرانہ اپنی دونوں بٹالین کے ساتھ موجود ہے۔ اس طرف میں جاؤں گا اور ان کا ایمونیشن تباہ کرنے کی کوشش کروں گا۔ میرے ہمراہ عبدالرحمان اور شرجیل ہوں گے جبکہ ہمارے دو ساتھی، عبدالقیوم اور قیصر ڈوگرا کے کیمپ میں گھس کر مہندر سنگھ کو ہلاک کرنے کی کوشش کریں گے اور ممکنہ حد تک ان کے ڈمپ کو نقصان پہنچانے کی حتی الوسع کوشش بھی کریں گے۔''

یہ طے پاتے ہی یہ دو کی ٹولیوں میں تقسیم ہو کر اپنے اپنے ہدف کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ کمانڈر عبداللہ اپنے بیٹے عبدالرحمان اور ساتھی شرجیل کے ساتھ یہاں سے سیدھے ہاتھ کی طرف روانہ ہو گیا، جبکہ دوسرا بیٹا عبدالقیوم اپنے ساتھی قیصر کے ہمراہ ناک کی سیدھ میں چل پڑا۔

عبداللہ ... اپنی توڑے دار رائفل، جس کی نال کے آگے تیز دھار سنگین نصب تھی، تانے محتاط روی کے ساتھ ٹیلوں کی آڑ لیتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ دشمن کے ایک پکٹ کے قریب جا پہنچا۔ وہاں اسے سناٹا سا محسوس ہوا۔ اس نے چند ثانیے تھم کر گردوپیش کا جائزہ لیا، اس کے بعد اپنے دونوں ساتھیوں کو ایک مخصوص اشارہ کیا وہ دونوں ... ایک طرف کو کہنیوں اور سینے کے بل رینگ گئے۔ جبکہ خود عبداللہ بائیں جانب گھوم گیا اور سنگین بہ دست رائفل تانے جھکا جھکا پکٹ کی جنوب مشرقی سمت کی دیوار کے قریب سرک آیا۔ اندر جھانکا تو اس کی آنکھوں میں شکاری چمک ابھری۔ پکٹ واقعی ویران اور خالی تھا مگر یہ بات اس کے لیے الجھن کا باعث بھی تھی، جس سے خطرے کی بو آتی محسوس ہو رہی تھی۔ اتنی مشکلوں اور محنت سے بننے والے پکٹ کو دشمن بھلا خالی کیسے چھوڑ سکتا تھا؟ یہی وہ خیال تھا جو ایک سوالیہ آنکڑے کے مانند اس کے حلق میں اٹک گیا تھا اور تب اس نے محتاط روی کے ساتھ دیوار پھلانگ کر اندر قدم رکھا تو ایکا ایکی جیسے اسے سانپ سونگھ گیا اور وہ اپنی جگہ جہاں کا تہاں کھڑا رہ گیا۔ جانتا تھا کہ اس نے لاعلمی میں خطرے کے جس بٹن پر اپنا پاؤں رکھ دیا تھا، وہ کسی بھی وقت بارودی سرنگ کی طرح پھٹ سکتا تھا۔ یہاں جا بجا ڈوگروں کا مخصوص ہتھیار یعنی الارمنگ سسٹم بچھا ہوا تھا اور بال سے باریک تار جو پہلی نگاہ میں تو کیا دوسری نظر میں بھی دکھائی نہیں دیتے تھے، یہ ہر طرف بچھے ہوئے تھے۔ یک بیک دشمن کی یہ چال سمجھتے ہی عبداللہ نے اپنی سانسیں تک روک لیں اور وہ دل ہی دل میں اب یہ دعا مانگنے لگا کہ اس کے وہ دونوں ساتھی جنہیں اس نے پکٹ کی دوسری جانب جانے کا اشارہ کیا تھا، کہیں وہ دشمنوں کے اس ''خاموش'' جھانسے میں نہ آجائیں، ورنہ ان کی یہ مہم ابتدا میں ہی بری طرح ناکامی سے دوچار ہو جائے گی بلکہ یہ لوگ بھی بے موت مارے جائیں گے۔

دشمنوں نے یہ پکٹ دانستہ خالی چھوڑا تھا تاکہ کوئی بھی دشمن یہاں کا رخ بھی کرے تو پکٹ کو خالی پا کر جوش جرأت میں اندر داخل ہوتے ہی، جا بجا بچھائے تاروں کے جال سے تو ضرور ہی ٹکرا جائے گا اور یوں ذرا فاصلے پر پوزیشنیں تانے بیٹھے مسلح فوجیوں کے قریب جھولتے بھانڈے بج کر انہیں کسی بھی خفیہ پیش قدمی کے بارے میں مطلع کر دیں گے۔

عبداللہ چند ثانیے تو ... سانس تک روکے اپنی جگہ جامد کھڑا رہا۔ اس کے بعد اس نے بہت سکون اور باریک بینی کے ساتھ غور کرتے ہوئے ... اس نادیدہ جال کی ''دیدگی'' کا ساماں کیا اور پھر نہایت احتیاط کے ساتھ کسی تار سے ٹکرائے بغیر وہ دھیرے دھیرے پیچھے سرکنے کے بجائے آگے ہی بڑھنے لگا کیونکہ فوراً ہی اس کے ذہن میں یہ خیال بجلی کی سی تیزی کے ساتھ ابھرا تھا کہ اگر وہ ادھر ہی سے واپس پلٹ گیا تو، پھر کبھی آگے نہ بڑھ سکے گا کیونکہ اس پکٹ کو بغیر کسی تار سے ٹکرائے اگر اس نے کامیابی سے پار کر لیا تو

آگے دشمن کی شہ رگ کے قریب پہنچنا نسبتاً آسان اور کارآمد بھی ثابت ہو جائے گا۔ وہ بہت احتیاط کے ساتھ یہ تاریں پھلانگ رہا تھا، اپنی سنگین کو اس نے پیروں کے قریب جھکا رکھا تھا۔ اس کی دھار سے منعکس ہونے والی روشنی میں تار میں چمک پیدا ہو رہی تھی، جو اوپر کھلے اور روشن آسمان کی مرہون منت تھی۔

اسی طرح وہ کامیابی سے یہ پکٹا کراس کر کے جب دشمنوں کے گڑھ میں قدم رکھ چکا تو ٹھٹک کر رہ گیا، اسے یہ دیکھ کر ایک نہایت خوشگوار حیرت ہوئی تھی کہ اس کے دونوں ساتھی بھی اسی طریقہ کار پر عمل کرتے ہوئے، وہاں پہنچ چکے تھے۔ یہ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر فاتحانہ انداز میں مسکرائے اور پھر آگے بڑھتے چلے گئے۔

جلد ہی یہ تینوں دشمن کیمپوں کے نزدیک پہنچ چکے تھے اور اب یہاں سے ان کا اصل کام شروع ہونا تھا۔ ایمونیشن ڈمپ اسی کیمپ میں کہیں موجود تھا، جس کا ابھی انہیں علم نہ ہو سکا تھا لیکن اپنی ذہنی فراست کو بروئے کار لاتے ہوئے، انہیں اس کا بھی اندازہ ہونے میں دیر نہ لگی تھی کیونکہ ایمونیشن کی مخصوص انداز کی رکھوالی ہی اس کی نشاندہی کے لیے کافی تھی۔

وہاں سخت پہرا تھا۔ کامیابی کے نزدیک پہنچ کر عبداللہ نے دل میں پکا تہیہ کر لیا تھا کہ وہ اس کیمپ کو تباہ کرنے میں اپنی جان بھی لڑا دینے سے دریغ نہیں کرے گا۔

☆☆☆

رات کی دم بہ خود تاریکی میں عبدالقیوم اور قیصر محتاط روی کے ساتھ آگے بڑھ رہے تھے۔ وہ اب ایسے مقام پر پہنچ چکے تھے، جہاں سے مسلح ڈوگروں کے پہرے، پکٹوں اور مورچوں کی صورت میں نظر آ رہے تھے، اور ان دونوں نے ان سے بچ کر ہی رہائشی کیمپ تک رسائی حاصل کرنا تھی۔

دونوں ایک دوسرے کو کور کیے آگے بڑھ رہے تھے۔ یہاں بھی انہوں نے اپنے کمانڈر عبداللہ کی سکھائی ہوئی تربیت کے مطابق اپنی رائفلوں کی سنگینیں اپنے پیروں کی طرف جھکا رکھی تھیں لیکن ابھی تک کسی چھپی ہوئی تار کی چمک کا انعکاس نہیں ہوا تھا، جس کا مطلب تھا یہاں ایسا کوئی الارمنگ سسٹم موجود نہیں تھا، لیکن یہ ان کی خام خیالی تھی۔ چند قدم مزید آگے بڑھنے کے بعد قیصر ایک جگہ رک کر بری طرح ٹھٹک گیا۔

وہ دونوں اس وقت دشمنوں کی ناک کے نیچے سے گزر رہے تھے، اس لیے ایک دوسرے سے سرگوشی تک کرتے ہوئے بھی محتاط تھے۔ تاہم قیصر کے یوں اچانک رکتے ہی قیوم نے اس کی طرف قدرے چونک کر دیکھا اور تب ہی قیصر نے اپنے ایک ہاتھ کو مخصوص انداز میں حرکت دی قیوم پیشانی پہ سلوٹیں نمودار ہو گئیں۔ وہ رکا اور پھر اپنی رائفل کی نال کو آگے کی طرف لہرایا۔ بال بھر باریک تاروں کا ایک سلسلہ جاتا دکھائی دیا۔ ان دونوں نے فوراً اپنا راستہ بدل دیا مگر اس طرح ان کی توجہ کچھ بٹ گئی اور یہیں ان سے ایک فاش غلطی ہو گئی کہ قیوم ایک پہرے دار کی نگاہ میں آ گیا۔

"ہالٹ! کون ہے وہاں؟" مسلح ڈوگرا پہرے دار نے سنسناتے لہجے میں کہا اور پکٹے کی دیوار سے ذرا سر ابھار کے دیکھا بھی تھا۔ تب ہی اسے قیوم دکھائی دے گیا اور اس کے ساتھ ڈوگرا پہرے دار نے اس کی طرف اپنی گن تان لی، مگر وہ اس پر گولی چلانے کی حسرت پوری نہ کر سکا، یہی وہ وقت تھا جب قیصر کو تمام احتیاط بالائے طاق رکھتے ہوئے حرکت میں آنا پڑا۔ چونکہ وہ اور قیوم تھوڑا فاصلہ دے کر ایک دوسرے کو کور دیے آگے بڑھ رہے تھے۔ قیوم تو پہرے دار کی زد میں تھا مگر قیصر کی زد میں بروقت وہ مسلح پہرے دار آ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ قیوم اس کا ساتھی ہی نہیں بلکہ اس کے دلیر کمانڈر عبداللہ کا بڑا بیٹا بھی ہے۔

اس نے نہایت پھرتی کے ساتھ اپنی رائفل کی سنگین اس کی گردن میں بھونک دی۔ بدقسمتی سے وہاں موجود اس کے دو ساتھی پہرے دار اس کی آواز پر متوجہ ہو چکے تھے۔ انہوں نے خطرہ بھانپتے ہی تیزی کے ساتھ حرکت کی اور قیصر پر اپنی گنیں تاننے کی کوشش کی کہ اچانک قیوم نے تب تک قیصر کے دیے ہوئے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی کپڑے کی بیلٹ میں اڑسا ہوا چاقو نکال کر ایک پہرے دار پر پھینکا جو اس کی شہ رگ کاٹتا ہوا نکل گیا، پہرے دار کی گردن سے خون کا فوارہ اچھلا اور وہ اپنی گردن پکڑے ذبح کیے جانور کی طرح خرخرانے جیسی گھٹی گھٹی آوازیں خارج کرتے ہوئے تیورا کر گر پڑا۔

تیسرے پہرے دار کو قیصر نے اپنی جگہ سے بجلی کی طرح پھرتی کے ساتھ اچھل کے چھاپ لیا، جو ابھی اپنی رائفل کا گھوڑا اچڑھانے کی ناکام کوشش ہی کر رہا تھا، وہ اسے رگیدتا ہوا لے گیا۔ قیوم بھی قیصر کو کور دینے کے لیے پکٹے کے اندر جا کودا تھا کہ کہیں اندر موجود کوئی چوتھا دشمن اس کے ساتھی پر وار نہ کر جائے مگر اور کوئی نظر نہ آیا۔ قیصر نے تیسرے پہرے دار کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا۔

ان دونوں نے پکٹے کا جائزہ لیا۔ خوش قسمتی سے انہیں

اندازہ ہو گیا تھا کہ اسی پکٹے کو پار کر کے وہ اپنی مطلوبہ سمت میں آگے بڑھ سکتے تھے لیکن مسئلہ وہی تھا کہ ادھر بھی سخت پہرا تھا۔ قیوم کے ذہن رسا میں اچانک ایک خیال بجلی کی سی تیزی کے ساتھ کوندا۔ اس نے قیصر سے کچھ کہا اور اس نے مسکرا کر اپنے سر کو اثبات میں جنبش دی۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد وہ بڑے آرام سے اور بلاخوف پکٹے کے راستے سے اپنی مطلوبہ سمت کی طرف بڑھ گئے۔

ان کے جسموں پر اب ڈوگرا پہرے داروں کی مخصوص وردیاں تھیں۔ آگے دو تین مورچے اور مسلح ڈوگرا فوجیوں کے ٹھکانے آئے، مگر کسی نے بھی انہیں روکنے کی کوشش نہیں کی مگر رہائشی خیمے کی طرف جاتے ہوئے انہیں اچانک گورکھا فوجیوں نے روک لیا۔

قیوم اور قیصر منزل کے قریب پہنچ چکے تھے۔ سامنے انہیں وہ رہائشی کیمپ نظر آ رہا تھا، جس میں ڈوگرا فوجی سالار مہندر جنگ سنگھ اپنی موت سے بے خبر محو استراحت تھا۔ دونوں ... وردی پوش ڈوگرا فوجیوں میں سے ایک نے کڑک دار لہجے میں ان سے مخاطب ہو کر پوچھا۔

”تم کدھر اس طرح منہ اٹھائے چلے آ رہے ہو؟ تمہیں تو اس وقت اپنے پکٹے میں موجود ہونا چاہیے تھا؟“ جواباً قیوم نے فوراً مودبانہ لہجے میں کہا۔

”جناب! ہمارے ایک مقامی عیالی نے ایک ضروری اطلاع دی تھی وہ ہم شالار (سالار) صاحب کو ترنت پہنچانے آ گئے ہیں۔“ قیوم نے اپنے لہجے کو خالص گورکھا اسٹائل میں بنانے کی کوشش کی تھی۔ فوجی اس کی بات پر چونکے، پھر دوسرے نے اسی طرح بارعب انداز میں پوچھا۔

”کس نمبر کے پکٹے سے آئے ہو تم دونوں؟“

”جی حجور! نمبر سات سے۔“ اس بار قیصر نے کہا۔

”سات نمبر سے......؟“ پہلا والا الجھ کر بولا۔ قیوم کی بھانپتی نظروں نے اس کی پیشانی پہ پڑتے والی سلوٹوں سے اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ کہیں کوئی گڑبڑ تھی۔ کیونکہ پہلے والے کا سوالیہ انداز کھٹک پیدا کرنے والا تھا۔

”مگر وہاں تو۔“ وہ کچھ کہتے کہتے رکا اس کے بعد اس نے اپنے ساتھی کو ان پر نگاہ رکھنے کو کہا اور پاس بنے ایک حجرے میں چلا گیا۔

پہلے والے پہرے دار کے ہاتھ میں مشین گن تھی جو اس نے ان دونوں پر تان رکھی تھی۔ قیوم اور قیصر کے دل بری طرح دھڑ دھڑا رہے تھے۔ ڈوگرے فوجی کی نگاہ ان کے چہرے پر جمی ہوئی تھی۔ قیوم نے ذرا دزدیدہ نظروں سے اندر حجرے کی طرف دیکھا تو اسے داخلی راستے سے پہلے والے پہرے دار کی جھلک دکھائی دی اور وہ سنسنا اٹھا...... وہ چرخی والے وائرلیس ٹیلی فون پر کسی سے رابطہ کرنے کی کوشش میں تھا۔

”خطرہ!“ بے اختیار قیوم کے ٹھٹکتے ہوئے ذہن میں یہ لفظ ابھرا تھا اور پل کے پل اسے اس بات کا اندازہ ہو گیا کہ اس کے ان دونوں پر شبہے کی کیا وجہ ہو سکتی تھی۔

مذکورہ پکٹے میں یقیناً ان کے ہی کوئی خاص اور ”چنیدہ“ آدمی متعین ہو سکتے تھے اور یہ اتفاق ہی تھا کہ قیوم اور قیصر کا ٹکراؤ بھی پہلے انہی سے ہو گیا۔ یہی بات ان کی الجھن کا سبب بنی تھی اور اب وہ ان کے بارے میں کنفرمیشن کرنا چاہتا تھا۔

قیوم نے اپنی آنکھوں کو دائرے کی صورت غیر محسوس انداز میں گھما کے، سامنے اور دائیں بائیں کا جائزہ لیا۔ ان کے عقب میں تو گلیارا تھا دائیں بائیں کیمپ ذرا فاصلے پر تھے اور وہاں دو چار پہرے دار نظر آتے تھے، وہ بھی نیند اور تھکن سے السائے ہوئے دکھائی دے رہے تھے، جبکہ سامنے ان کا مطلوبہ کیمپ تھا۔ اسی وقت قیوم کی سماعتوں سے پہلے والے پہرے دار کی کھردری مگر بارعب آواز ٹکرائی۔ ”ہیلو ہیلو...... کاشن...... پلیز ہیلو...... کاشن۔“

یہی وہ وقت تھا جب قیوم نے دل ہی دل میں اللہ کا ذکر کرتے ہوئے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ حرکت کی۔ اسے لات چلانے کا موقع تب ہی ملا تھا جب اس دوسرے پہرے دار نے لمحے بھر کو اپنی گردن ذرا موڑ کر حجرے کی طرف دیکھا تھا اور قیوم کی لات تیزی سے حرکت میں آ گئی تھی۔ مشین گن اس کے ہاتھ سے اچھلی اور قیصر نے موقع تاک کر اس پر جھپٹا مارا۔ ادھر قیوم نے اپنا ابتدائی کام نمٹا کر حجرے والے پہرے دار کی طرف پیش قدمی کی۔ پہرے دار کی اچانک اس پر نگاہ پڑی اسے یوں اپنی طرف جارحانہ انداز میں بڑھتا دیکھتے ہوئے...... اس نے چرخی دار وائرلیس فون پھینک کر اپنی گن کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ قیوم نے اپنی گن کی سنگین سیدھی کر رکھی تھی۔ وہ اس ڈوگرے فوجی کے سر پہنچ چکا تھا۔ قیوم نے سنگین اس کے پیٹ میں گھونپنا چاہی تھی مگر ڈوگرے نے سنبھلنے کی کوشش میں خود کو اس مہلک وار سے بچایا اور پیٹ کے بجائے سنگین اس کے

پہلو میں پیوست ہوگئی، تب تک وہ بھی اپنی مشین گن سیدھی کر چکا تھا اور اس نے لبلبی دبا دی۔ مشین کے آتشیں دہانے سے گولیوں کی پوری باڑ چنگھاڑتی ہوئی خارج ہوئی اور قیوم چھلنی ہو کر گر پڑا۔ وہ جام شہادت نوش کر چکا تھا۔ خود ڈوگرا فوجی بھی بری طرح گھائل تھا اور زیادہ دیر اپنے قدموں پر کھڑا نہ رہ سکا۔ لہرا کر گرا تو تب تک قیصر دوسرے پہرے دار کو جہنم واصل کر چکا تھا۔

اس نے اپنے ساتھی کا یہ انجام دیکھا تو کرب و دکھ کی لہر نے اس کے پورے وجود کو آنسو بنا دیا مگر دوسرے ہی لمحے اس نے اپنی رقت بھری اس کیفیت پر قابو پایا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر اسے ذرا بھی دیر ہوگئی تو نہ صرف اس کے ساتھی کی قربانی ضائع چلی جائے گی بلکہ وہ خود بھی بے موت مارا جائے گا، جبکہ ابھی اس کا مشن ادھورا تھا اور فائرنگ کے شور کی وجہ سے کیمپ میں کھلبلی مچ چکی تھی، اس نے سب سے پہلے اس زخمی ڈوگرے کو سنگین گھونپ کر ہلاک کیا پھر اس کی مشین گن قبضے میں کرتے ہی کیمپ کی طرف دوڑا۔ اندر داخل ہوا تو مہندر جنگ سنگھ ہاتھ میں پستول لیے اپنی مسہری سے اٹھ رہا تھا۔ ایک پستول وہ اپنے تکیے کے نیچے رکھ کر سوتا تھا۔ فائرنگ کی آواز سے اس کی آنکھ کھل چکی تھی۔ جیسے ہی قیصر جارحانہ انداز میں اندر داخل ہوا، تو مہندر سنگھ اسے دیکھ کر ایک لمحے کو چونکا کیونکہ وہ ڈوگرا پہرے دار کی مخصوص وردی میں تھا لیکن قیصر کے تیوروں اور جارحانہ انداز نے اسے پل کے پل بہت کچھ سمجھا دیا اور...... اس نے اس پر گولی چلا دی۔ قیصر کے حلق سے ایک کرب ناک چیخ خارج ہوئی۔

گولی اس کے دائیں پہلو میں پیوست ہوگئی تھی لیکن اس نے بھی اپنی گن کی لبلبی دبا دی، جس کی نال کا رخ پہلے ہی مہندر جنگ سنگھ کی طرف تھا۔ وہ گولیوں سے چھلنی ہو کر گرا اور وہیں ختم ہو گیا۔

مہاراجا کا دست راست اور سوچیت گڑھ میں ہزاروں مسلمانوں، بوڑھوں اور معصوم بچوں کے ساتھ خون کی ہولی کھیلنے، اور پاک دامن مسلم خواتین کی عصمت دری کروانے والا سفاک درندہ صفت ڈوگرا سالار بالآخر اپنے عبرت ناک انجام کو پہنچ چکا تھا۔ قیصر زخمی حالت میں واپس پلٹا اور اس کے سامنے کئی گورکھا اور ڈوگرا فوجی ہاتھوں میں رائفلیں لیے تنے کھڑے تھے۔ قیصر کا مشن پورا ہو چکا تھا۔ اس نے زیر لب کلمہ پڑھا اور اپنی آنکھیں موند لیں۔

☆☆☆

ایک تاریک گوشے کی طرف پیش قدمی کرنے کے بعد عبداللہ نے اپنے بیٹے عبدالرحمان اور ساتھی شرجیل کو چند مختصر مگر ضروری ہدایت دی اور ایک نسبتاً الگ گوشے کی طرف

انہوں نے گربہ قدمی سے آگے بڑھنا شروع کیا۔ وہ ہندو بھارتی فوجی ایمونیشن کیمپ کی مشرقی سمت کی طرف کھڑے آپس میں باتوں میں مشغول تھے، جبکہ چار وردی پوش مسلح فوجی ان سے ذرا فاصلے پر موجود تھے۔ یہاں ذرا قریب پہنچ کر عبداللہ نے اپنے بیٹے عبدالرحمان کو ایک مخصوص اشارہ کیا، وہ ان سے جدا ہو کے تھوڑے فاصلے پر جا کھڑا ہوا اور پھر اپنے دونوں ہاتھوں کا بھونپو بنا کر حلق سے عجیب آواز خارج کی۔ آواز کا بم چیخ اس نے صرف اسی قدر رکھنے کی کوشش کی تھی کہ صرف قریب کے دو پہرے داروں کے کانوں تک ہی پہنچے۔ یہ آواز ایسی ہی تھی جیسے کوئی جانور اچانک کسی کو دیکھ کر بدک کے بھاگا ہو۔ وہ دونوں پہرے دار اس آواز پر چونکے۔ ایک نے آواز کی طرف اپنا رخ پھیرا اور دوسرا اپنی رائفل تانے اسے کور دیتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔

جب وہ دونوں خاصے فاصلے پر چلے گئے تو عبداللہ نے شرجیل کو اشارہ کیا۔ وہ تیزی سے مخالف سمت کی طرف رینگ گیا اور جہاں وہ چار فوجی کھڑے تھے، ان سے ذرا فاصلے پر جا کے وہی عمل کیا جو عبدالرحمان نے کیا تھا۔ توقع کے عین مطابق ان میں سے صرف دو فوجیوں نے اس آواز کی جانب محتاط روی سے حرکت کی تھی، باقی دو اپنی جگہ پر کھڑے رہے، البتہ ان کا دھیان اب اپنے انہی دونوں ساتھیوں کی طرف مبذول ہو چکا تھا۔ یہی وہ وقت تھا جب عبداللہ نے بہ سرعت اپنی جگہ سے حرکت کی اور سرک کر ان کے بالکل قریب جا پہنچا اور پھر اپنی رائفل کی سنگین ایک کی پشت میں گھونپ دی۔ وہ ایک گھٹی گھٹی کراہ آمیز چیخ کے ساتھ تیورا کر گرا تو دوسرے نے پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کی طرف اپنا رخ پھیرا۔ عبداللہ کو گھات مل چکی تھی، لہٰذا مات دشمن کا مقدر ٹھہری، دوسرا فوجی ابھی اس کی طرف بہ مشکل پلٹا ہی تھا کہ عبداللہ نے رائفل کی سنگین کھینچ کر رائفل کا ٹھوس کندا اس کی کن پٹی پر بجا دیا۔ اس نے تیزی سے ایمونیشن ڈمپ کی طرف رخ کیا مگر ابھی چند قدموں کے فاصلے پر ہی تھا کہ بری طرح ٹھٹک گیا۔

اسے گولی چلنے کی آواز سنائی دی تھی۔ سمت وہی تھی جدھر گھات لگا کر شرجیل نے ان دو فوجیوں کو دبوچنا تھا، مگر شاید شرجیل سے کہیں کوئی فاش غلطی ہو گئی تھی۔ ایمونیشن ڈمپ کے قریب ایسی غلطی خود ان کے لیے کسی بارود کے ذخیرے پر پاؤں رکھنے کے مترادف تھی کیونکہ اس ''حساس'' مقام پر ایسا ذرا سا مشکوک واقعہ بھی پوری ہندو اور ڈوگرا فوجیوں یہاں متوجہ کرنے کا باعث تھا، لیکن یہ غلطی ہو چکی تھی مگر عبداللہ نے تو اپنی جان پر کھیل کر یہ اہم ترین مشن پورا کرنے کی قسم کھا رکھی تھی سو وہ نہیں رکا اور دیوانہ وار دوڑتا ہوا ایمونیشن والی اس عمارت میں داخل ہو گیا۔ جس کی دیواریں ریت اور گاچنی مٹی سے بنائی گئی تھیں۔

اندر داخل ہوتے ہی اس نے اپنی طائرانہ نظروں سے جائزہ لیا اور پھر تھوڑی سی کوشش کے بعد فلیتوں (فتیلوں) کو آگ لگانا شروع کر دیا۔ چار پانچ فلیتوں کو آگ لگا کے وہ دوسری سمت سے باہر کی طرف لپکا تھا کہ ٹھٹک کے رک گیا۔ اس کا بیٹا عبدالرحمان اور شرجیل زخمی حالت میں سات آٹھ ڈوگرا اور بھارتی فوجیوں کے نرغے میں آ چکے تھے سوچنے کا وقت نہیں تھا، اس کے دونوں ساتھی کسی وقت بھی اپنی جان سے جا سکتے تھے۔ اس نے وہیں سے انہیں للکارا۔ دشمن اس کی طرف متوجہ ہوئے اور ایک مجاہد کو اپنے اسلحے اور بارود کے ڈھیر پر دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ عبداللہ حلق کے بل چلا کے بولا۔

''میرے ساتھیوں کو جانے دو۔ ورنہ میں بارود کے ڈھیر میں گولی چلا کر سب کو خاک کر ڈالوں گا۔'' کہتے ہوئے اس نے اپنی رائفل کا رخ اندر بارودی ذخیرے کی طرف کر دیا۔ اگرچہ فلیتوں کو وہ شعلہ دکھا چکا تھا، مگر ابھی انہیں بلاسٹ ہونے میں چند سیکنڈ باقی تھے مگر دشمن یہ نہیں جانتے تھے کہ وہ ان کی پہلے ہی قبر کھود چکا ہے۔

پھر سب کچھ چشم زدن میں ہی وقوع پذیر ہو گیا۔ وہ چند سیکنڈوں میں یا تو اپنی جان بچا کر بھاگ جاتا اور اپنے بیٹے سمیت اپنے ساتھی شرجیل کو دشمنوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتا، یا پھر ان کا دھیان ذرا دیر کو بٹا کر انہیں پہلے نکل بھاگنے کا موقع دیتا مگر اس میں اس کی اپنی موت یقینی تھی اور وہی ہوا وہ دل ہی دل میں کلمہ طیبہ کا ورد بھی کرنے لگا تھا۔ اس کے عقب میں ایک ساعت شکن دھماکا ہوا اور اس کا وجود سیکڑوں ٹکڑوں میں بٹ گیا۔ دشمن اس کی طرف متوجہ تھے، ان میں افراتفری مچ گئی۔ دشمن کیمپ پر آگ اور شعلوں کی سرخ چادر سی تن گئی تھی۔ عبدالرحمان اور شرجیل اس موقع سے فائدہ اٹھا کر وہاں سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو چکے تھے مگر عبدالرحمان کو اپنے باپ کی شہادت کا دکھ بھی تھا اور شرجیل کی آنکھیں اپنے بہادر کمانڈر کی اس بے مثال قربانی پر آبدیدہ ہو گئی تھیں۔

بہرطور انہیں پورا یقین تھا کہ اب دشمن کی کمر ٹوٹ چکی تھی۔ اور... آئندہ ہونے والی جنگ ان کی شکست کا

باعث بننے والی تھی اور وہی ہوا۔ اللہ رب العزت نے فتح وکامرانی مسلمانان جموں وکشمیر کے نام لکھ دی تھی، کیونکہ اس کے کچھ ہی روز بعد ڈوگرا اور گورکھوں کو اس جنگ میں شکست فاش کا سامنا کرنا پڑا تھا اور وہ بری طرح پسپا ہو کر پیچھے ہٹ گئے تھے اور مہاراجا ہری سنگھ کو بالآخر اپنی راجدھانی سے کنارہ کش ہونا پڑا لیکن اس نے پاکستان کے اس اٹوٹ انگ کشمیر کو بہ ظاہر آزاد اور کشمیریوں کے حق... خودارادیت کے نام پر کرتے کے دھوکے میں اسے بھارت کے نام لکھ دیا اور اسے ہندوستان کی ریاست میں شامل کر کے تاریخ کا ایک سیاہ ترین باب رقم کر ڈالا۔

☆☆☆

(پیش منظر)

اس دل دوز واقعے کے بعد وادی میں زبردست کشیدگی پھیل گئی۔ نوہاٹا چوک پر آئے دن بھارت اور اس کی غاصبانہ وظالمانہ دراندازی پر احتجاج اور بھارتی ظلم و بربریت کے خلاف تقریریں اور مرتے دم تک ان کے جبرو استبداد سے لڑتے کا عزم کیا جاتا۔

شیر علی اپنے خاندان کی بربادی، اپنی ماں اور بہن کی موت کے بعد اپنا راستہ مجاہدوں کے ساتھ طے کر چکا تھا۔ وہ اب انہی کے تربیتی کیمپ میں اپنے روز و شب گزارا کرتا تھا۔ وہ بغیر کسی اشد ضرورت کے کسی سے فالتو بات نہیں کرتا تھا۔ رحیم اور شجاع اسے گوریلا طرز کی ٹریننگ دینے میں مصروف تھے۔

کمانڈر عبدالرحمان نے اگرچہ شیر علی کو اپنے ہاں رہنے کی پیشکش کی تھی، لیکن شیر علی نے صاف انکار کر دیا تھا۔ اس نے اب اپنا جینا مرنا بھی ان مجاہدین کے ساتھ کر دیا تھا۔ سچی بات تو یہ تھی کہ وہ گل نور کو بھی فراموش کیے ہوئے تھا، مگر اس کی فراموشی ایک اہم مقصد کی تکمیل تک محدود تھی اور وہ اہم مقصد تھا کرنل ستیارام اور کیپٹن بھگوت کی موت۔

یوں بھی ان دنوں مجاہدین نے امیراں کدل پل پر واقع اس بھارتی فوجی ٹھکانے کو کرنل ستیارام اور کیپٹن بھگوت کھٹپال سمیت نیست و نابود کرنے کا پختہ عزم کر رکھا تھا۔

نائب کمانڈر شجاع اور رحیم اس مہم کو جلد از جلد سر کرنے کا حتمی ارادہ کیے ہوئے تھے، جبکہ شیر علی کی ابھی تربیت مکمل نہیں ہوئی تھی اسی لیے اسے اس اہم مہم میں شامل ہونے کی اجازت نہیں ملی تھی۔ اس بات نے شیر علی کو بے چین کر کے رکھ دیا تھا۔ اسے حیرت تھی کہ اس کے بارے میں ایسا کیوں سوچا گیا تھا؟ جبکہ وہ تو بھارتی فوجیوں کے امیراں کدل پل اور موتی بھون جیسے اہم ٹھکانے سے کامیابی کے ساتھ فرار بھی ہوا تھا جس کا مطلب واضح تھا کہ وہ کس قدر جری اور چابک دست تھا۔ دوسری اہم بات یہ تھی کہ وہ ان کے ٹھکانے کے چپے چپے سے بھی واقف تھا۔

اس نے اس مہم میں شمولیت نہ ملنے کی پُرزور احتجاجی شکایت جب کمانڈر عبدالرحمان سے کی تو انہوں نے بھی اس سے ایک ایسی اور عجیب بات کہہ ڈالی کہ وہ ہکا بکا رہ گیا۔

”شیر علی! میں تمہارے عزم اور حوصلے کی قدر کرتا ہوں... اور تمہارے دل میں جلتی ہوئی اس آتش انتقام سے بھی... بخوبی واقف ہوں، جو ان بھارتی غاصبوں کی ہی لگائی ہوئی ہے لیکن صرف انتقامی جذبات ہی ایسی اہم نوعیت کی مہمات کے لیے کافی نہیں ہوا کرتے بیٹا!“ عبدالرحمان نے اپنی باریش پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے پُرشفقت لہجے میں اسے سمجھانے کی کوشش کی تو شیر علی حیرت سے ان کا چہرہ تکتے ہوئے بولا۔

”محترم! یہ انتقام کا جذبہ ہی تو ہے، جو ہمیں ابھی تک ان غاصب بھارتی فوجیوں کے سامنے سیسہ پلائی دیوار بنایا ہوا ہے اور ہم ان کے سامنے ابھی سے نہیں بلکہ کئی سالوں سے ڈٹے ہوئے ہیں۔ ان کے ظلم وستم اور جبرو استحصال کے سامنے اسی جذبے نے ہی تو ابھی تک ہمیں جھکنے نہیں دیا اور رہی بات میرے انتقام کی تو... شاید اسے آپ نے ایک ذاتی نوعیت پر محمول کیا ہے، حالانکہ آپ اچھی طرح جانتے بھی ہیں کہ میں تو ہر اس کشمیری نوجوان کی طرح اسی دن سے ہی آزادی کی شمع اپنے اندر روشن کیے ہوئے ہوں جب سے ہماری وادی میں ان بھارتی درندوں نے اپنی اجارہ داری و دراندازی قائم کرنے کی کوشش کر رکھی ہے۔ کیا آپ ڈل گیٹ والا واقعہ بھول گئے؟ آپ نے خود میرے گھر پر آ کر میری پیٹھ ٹھونک کر مجھے شاباشی دی تھی۔ اس وقت تک تو میرے گھر والوں پر کوئی آنچ نہیں آئی تھی، تو پھر وہ میں نے بھلا کس انتقامی جذبے کے تحت کیا تھا؟“

”مجھے سب یاد ہے میرے بچے!“ وہ اسی طرح شفیق لہجے میں بولے۔ وہ واقعی اس کی بات سے لاجواب ہو گئے تھے۔

”لیکن شجاع اور رحیم کے مطابق تمہاری تربیت کا معیار ابھی اس مقام تک نہیں پہنچ سکا ہے اور تمہیں ایسی خطرناک اور اہم مہم پر بھیج کر ہم اپنے مستقبل کے بہادر اور

پُرعزم کمانڈو کو ضائع نہیں کرسکتے۔"

کمانڈر عبدالرحمان کی دلیل بھی اپنی جگہ تھی لیکن شیر علی مطمئن نہ ہوا اور نہ ہی عبدالرحمان کو اس سلسلے میں قائل کرنے میں کامیاب ہوسکا لیکن حکم عدولی اور سرکشی بھی اس کی سرشت میں شامل نہ تھی۔ لہٰذا اس نے چپ سادھ لی مگر اس کے اندر کی آگ کم نہ ہوئی تھی بلکہ وہ پوری شدت کے ساتھ بھڑکتی ہی رہی تھی۔

اس روز کی شب وہ شجاع اور رحیم کو موتی بھون والی مہم پر جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا اور اس کے اپنے دل و دماغ میں ہلچل سی ہورہی تھی۔ شجاع اور رحیم اپنے پانچ کمانڈو مجاہدین کے ساتھ جب امیراں کدل کی طرف روانہ ہوگئے تو شیر علی بھی خود کو نہ روک سکا، اس نے سوچا تھا کہ جب وہ وہاں سے واپس آسکتا تھا تو پھر جانے میں اسے کیا تامل تھا؟

ان مجاہدین کے روانہ ہوتے ہی وہ۔ بھی خاموشی کے ساتھ اپنی مختصر "تیاری" کے بعد انتہائی رازداری سے مجاہدین کے اس کیمپ سے روانہ ہوگیا۔

وہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ دشمن سے برسرپیکار ہونے کے لیے کسی تربیت کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ اس کے لیے، عزم و حوصلہ ہی کافی ہوتا ہے، ایک سچے مسلمان مجاہد کا ہتھیار اس کا ایمانی طور پر پختہ ہونا ہی کافی ہوتا ہے پھر یوں بھی وہ مجاہدین کے اس تربیتی کیمپ میں کب تک ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھا رہتا؟ اس نے مختصر مدت میں ہی سہی، جو بھی سیکھا تھا وہ اسے ناکافی ہرگز محسوس نہیں ہورہا تھا۔

اس مہم میں تنہا نکلنے کے جذبے سے سرشار وہ۔ امیراں کدل پل والے راستے پر ہولیا تھا۔ اس نے موتی بھون تک جانے کے لیے وہی راستہ اپنایا تھا جس سے وہ فرار ہوکے لوٹا تھا۔

ایک مطلوبہ مقام پر پہنچ کر وہ دریا میں اتر گیا۔ اس نے اپنی اسلحے کی کٹ سر پہ لاد رکھی تھی۔ سخت سردی میں پانی کی برودت نے اسے بری طرح ٹھٹھرا کر رکھ دیا تھا، مگر اسے اب ان موسمی اثرات کی کب پروا رہی تھی۔ وہ بہ آسانی رات کی تاریکی میں اپنے الگ راستے پر گامزن تھا اور یوں دوسرے کنارے پر جا پہنچا۔ دشمن کے علاقے یعنی "ریڈ زون" میں پہنچتے ہی اس نے مشین گن اپنے ہاتھ میں پکڑ لی تھی۔ وہ سب سے پہلے اس شیطان صفت سفاک درندے کیپٹن بھگوت کھنپال کا شکار کرنا چاہتا تھا۔

آج جانے کیوں آسمان بھی اسے تاریک سا محسوس ہو رہا تھا۔ اسی تاریکی کا فائدہ اٹھائے آگے ہی آگے بڑھتا رہا۔ پھر ایک جگہ روشنی دیکھ کر وہ رکا۔ وہ دشمن مورچے کے قریب پہنچ چکا تھا اور یہاں سے آگے موتی بھون کے کھنڈرات کا علاقہ شروع ہوتا تھا جہاں بھارتی فوجی کیمپ قائم تھا۔

مورچے کے اطراف کا تقریباً تیس چالیس گز تک کا علاقہ گھاس اور خودرو جھاڑیوں سے صاف کیا جاچکا تھا تاکہ کوئی ان کے مورچے کے قریب نہ پہنچ پائے اور اگر کوئی ایسی حرکت کرے بھی تو وہ نظروں میں آسکے۔ یہی مشکل شیر علی کو تھوڑا پریشان کرگئی تھی۔

وہ چند ثانیے وہیں تاریکی کا حصہ بنا بیٹھا کچھ سوچتا رہا۔ اس کے بعد اس نے اپنا راستہ بدلا۔ پھر مورچے سے دور اس مقام پر ٹھہر گیا جہاں سے خودرو جھاڑیوں کا سلسلہ موقوف ہوتا تھا۔

اس کا ذہن تیزی سے کام کررہا تھا۔ اس نے غور کیا کہ اب تک مجاہدین کا ٹولا کہاں تک پہنچنے میں کامیاب ہوسکا ہوگا؟ کیونکہ اس کے اندازے کے مطابق اب تک انہیں اپنی کارروائی کی ابتدا شروع کردینی چاہیے تھی۔ شاید وہ اسی بات کا منتظر تھا کہ افراتفری کا کوئی سماں پیدا ہو تو وہ اپنی پیش قدمی کو دشمن کے مرکزی ٹھکانے تک ممکن بنا سکے مگر اس طرح ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بےکار بیٹھنے سے بھی اسے سخت کوفت ہورہی تھی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اسے خود ہی کوئی تدبیر کرنی چاہیے۔ ابھی اس کے ذہن میں یہ خیال آیا ہی تھا کہ اچانک اسے سامنے موتی بھون کے علاقے سے ایک تیز چمکتا شعلہ سا تاریک آسمان کی جانب اٹھتا دکھائی دیا اور وہ چونک گیا۔ اس کا مطلب وہ جانتا تھا، ایسا اس کے ساتھ بھی ہوچکا تھا، جب فرار ہوتے وقت اسے دیکھ لیا گیا تھا اور دشمن نے اپنے ساتھیوں کو خبردار کرنے کے لیے یہ "فلش بم" فائر کیا تھا۔

تو گویا اس کے ساتھی مجاہد دشمنوں کی نگاہ میں آچکے تھے؟ اس نے سوچا۔

ٹھیک اسی وقت دور کہیں اس کی سماعتوں میں گولیوں کی تڑتڑاہٹ سنائی دی، اس کے اعصاب یکلخت تن گئے۔ گولیوں کے ساتھ ہی دھماکے اور بھاری گنوں کی سمع خراش آوازیں بھی سنائی دینے لگیں تو وہ اٹھا اور سینے اور کہنیوں کے بل پر تیزی کے ساتھ مورچے کی طرف بڑھنا شروع ہوا۔

بلاشبہ اس نے ایک خطرناک رسک لیا تھا۔ محض اس خیال سے کہ دشمن مورچے کی توجہ دوسری جانب ہٹ چکی ہوگی مگر ایسا نہیں تھا۔ بےشک مورچے میں موجود دشمن دوسری طرف متوجہ ہوچکے تھے، مگر ایک دو نے سامنے بھی نگاہ

رکھی ہوئی تھی۔ ان کے پاس جدید انفراریڈ دوربین تھی لیکن شیر علی کی قسمت اچھی تھی کہ وہ ابھی تک ان کی زد میں نہیں آیا تھا لیکن تھوڑا قریب پہنچتے ہی ایک دشمن کو اس کا حرکت کرتا ہیولا دکھائی دے گیا۔ اس نے اپنی دور مار اسٹین گن کی نال اس کی طرف گھما دی اور ٹریگر دبا دیا۔ گولیوں کی گرج دار اور خوفناک باڑ نے شیر علی پر شب خون مارنا چاہا تھا لیکن وہ بھی ایسے کسی اچانک اور ممکنہ خطرے کے لیے تیار تھا اور اپنی سماعتوں کو آواز پر مرکوز رکھے ہوئے تھا۔ جیسے ہی اس نے گولیوں کی گرج سنی اس نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ لڑھکنی لگائی اور پھر فوراً ہی اٹھ کر زگ زیگ انداز میں مورچے کی طرف دوڑ لگا دی۔

یہ اس کا بہادرانہ اور سرفروشانہ جذبہ ہی تھا کہ جسے اس نے اس اقدام پر اکسایا تھا، کیونکہ اس کے سوا اس کے پاس اور کوئی چارہ بھی نہ تھا، وہ سر سے کفن باندھ کے نکلا تھا، واپس لوٹنے کے لیے نہیں، آگے بڑھنے اور دشمن کو نیست و نابود کرنے کے لیے۔

اس نے دوڑتے ہوئے جوابی فائرنگ بھی کر ڈالی۔ اس وقت مورچے کے بیشتر فوجی دوسری طرف مصروف ہو چکے تھے۔ شیر علی کی فائرنگ سے اسٹین گن والا زد میں آ گیا... فائرنگ موقوف ہوتے ہی شیر علی نے بھی اپنی دوڑنے کی رفتار تیز کر دی اور درانہ وار مورچے کی دیوار پھلانگ کر زخمی شیر کی طرح گرجتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ وہاں دو بھارتی فوجی اسے یوں درانہ وار اپنے سامنے کودتا دیکھ کر ایک لمحے کے لیے خوف زدہ سے ہو گئے، لیکن دوسرے ہی لمحے سنبھلے مگر شیر علی نے اندر کودتے ہی ان پر چھلانگ لگا دی تھی۔ وہ ان دونوں کو بیک وقت رگیدتا ہوا زمین پر آ رہا تھا۔ پھر سنبھلتے ہی اس نے ایک کی ٹھوڑی پر اپنی گن کا ٹھوس کندا رسید کر دیا اور دوسرے کے پیٹ پر اپنا گھٹنا پوری قوت سے رسید کر دیا۔ دشمن تکلیف سے دہرا ہو گیا، پہلے والے نے لیٹے لیٹے اپنی گن سیدھی کرنی چاہی تھی کہ شیر علی نے دوسرے معتوب شکار کے اوپر پڑے پڑے اس پر برسٹ فائر کر دیا، اسے چھلنی کرتے ہی، اس نے دوسرے کو بھی ڈھیر کر دیا۔ مورچے پر اب اس کا قبضہ تھا۔ اس نے اندرونی گوشے کا رخ کیا اور وہاں سے موتی بھون کیمپ کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

اندر داخل ہوتے ہی وہ ایک تاریک گوشے میں جا چھپا۔ فائرنگ کا سلسلہ جاری تھا اور اس کے آہنگ سے صاف [illegible] کہ یہ دو طرفہ فائرنگ تھی۔

وہ آگے بڑھتا۔ اس کا رخ کیپٹن بھگوت کھنپال کی طرف تھا لیکن اس کی مڈبھیڑ ایک مسلح بھارتی ٹولے سے ہو گئی۔ جو وہاں گھات لگائے بیٹھا تھا اور شاید مجاہدین پر دوسری سمت سے حملے کے لیے پر تول رہا تھا۔

ادھر مجاہدین بھی سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے تھے اور دشمنوں کی اس روز والی سفاکانہ کارروائی کا بھرپور انتقام لینے پر تلے ہوئے تھے لیکن شیر علی کو محسوس ہو رہا تھا کہ مجاہدین کی پیش قدمی کو دشمن بڑی کامیابی سے روکے ہوئے تھا اور مجاہدین اس وقت صرف دفاعی پوزیشن اختیار کیے ہوئے تھے۔

تو کیا ان کا حملہ ناکام گیا تھا؟ اس نے پل بھر کو سوچا۔

جس ٹولے سے اس کی مڈبھیڑ ہوئی تھی، وہ دوسری جانب سے مجاہدین کی اس دفاعی پوزیشن کو بھی کمزور کرنے کی نیت سے آگے بڑھنے کے لیے پر تولے ہوئے تھا مگر شیر علی نے اپنی کٹ سے دو دستی بم ان کی طرف اچھال دیے۔

ایک سماعت شکن دھماکے میں اسے دشمن فوجیوں کی کریہہ انگیز چیخیں سنائی دی تھیں، وہ سرشار ہو گیا اور تیزی سے آگے بڑھا مگر فوراً ہی رکا۔ اسے یوں لگا جیسے اچانک ہی فائرنگ کا سلسلہ بتدریج موقوف ہونے لگا ہو۔ دو ہی خیال ذہن میں آتے تھے۔ پہلا تو یہ کہ مجاہدین کو فتح حاصل ہوئی تھی جس کا امکان کم ہی تھا، کیونکہ اس طرح اچانک فائرنگ کا سلسلہ تھمنا کوئی اور معنی بھی رکھتا تھا، جبکہ دوسرا خیال شیر علی کے ذہن میں آیا تھا کہ مجاہدین پٹ چکے تھے۔

بہرطور وہ اپنی گن سنبھالتے آگے بڑھا۔ اس کا ہدف کیپٹن بھگوت کا کیمپ تھا۔ وہ ابھی کھنڈرات کے اندر ہی بھٹک رہا تھا مگر درست سمت میں بڑھ رہا تھا۔

ایک مقام پر پہنچ کر تو اسے ایکا ایکی خاموشی اور سناٹے کا احساس ہوا۔ اس کے دل و دماغ میں طرح طرح کے اندیشے سر اٹھانے لگے۔ تب پھر اچانک ہی اس کے بھیانک اندیشوں کی تصدیق ہو گئی۔

وہ ایک شناسا مگر مکروہ آواز تھی جسے سن کر شیر علی کو اندازہ ہو گیا کہ مجاہدین پسپائی کے قریب تھے... بلکہ انہیں ایک جگہ پر محبوس ہونے پر مجبور بھی کر دیا گیا تھا۔

"خبردار! تم سب ایک ایسے گوشے میں مقید ہو چکے ہو جو مکمل طور پر ہماری زد میں ہے۔ اس لیے بہتر یہی ہے تم سب اپنے ہتھیار ڈال دو۔"

یہ اس خبیث کیپٹن بھگوت کی آواز تھی۔ یکلخت شیر علی کے اعصاب تن گئے۔ اس کے پاس فقط دو ہی دستی بم بچے

تھے۔ وہ انہیں اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑے، آگے بڑھا اور ایک بوسیدہ مگر سنگلاخ۔۔۔ آڑ سے جھانکا تو اسے سامنے ہی ذرا فاصلے پر کیپٹن بھگوت اور اس کے آٹھ، دس مسلح فوجیوں کا ٹولا گنیں تانے پوزیشنیں سنبھالے دکھائی دے گیا۔ وہ موتی بھون کے اس گوشے کو نشانے پر لیے ہوئے تھے، جو غلام گردشوں کے عقب میں ایک کھلے ہال کمرے کی سال خوردہ سنگی دیواروں پر مشتمل تھا اور اس کے اندر مجاہدین محبوس ہو چکے تھے۔ جبکہ اس گوشے کو تین اطراف سے دشمن ٹولے کی بھاری تعداد نے اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ دوسرا ٹولا شیر علی کو آگے پیش قدمی کرتے ہوئے نظر آیا تھا۔

یہی وہ وقت تھا جب شیر علی نے پل کے پل ایک حتمی فیصلہ کیا اور پہلے ایک دستی بم کی پن دانتوں سے کھینچ کر کیپٹن بھگوت والے ٹولے کی طرف اچھال دیا۔ ایک سماعت شکن دھماکا ہوا...... اور دوسرا بم اس نے دوسرے ٹولے کی جانب پھینکا۔ یہ عمل بیک وقت چابک دستی اور پھرتی کا متقاضی تھا، جو شیر علی نے بڑی کامیابی سے سرانجام دیا تھا۔

اس کے فوراً بعد ہی اس نے اپنی گن سے فائر بھی کھول دیا۔

دستی بموں کے ہونے والے پے در پے دو دھماکوں اور پھر فوراً بعد مخالف سمت سے ہونے والی فائرنگ نے دشمنوں کو تتر بتر کر دیا اور یہی موقع اندر محبوس مجاہدین کے لیے کافی تھا اور وہ اس پر حیران بھی تھے کہ یہ غیبی امداد کہاں سے آ پہنچی تھی۔

درحقیقت شجاع اور رحیم کو پہلے ہلے میں کامیابی حاصل ہوئی تھی، اگرچہ اس میں ان کے کچھ ساتھی بھی مارے گئے تھے، لیکن کامیابی کے اسی جوش میں انہوں نے بلا سوچے سمجھے جس طرف رخ کیا تھا، اس کا موقع دشمن نے دانستہ انہیں خود ہی فراہم کیا تھا۔ کیونکہ موتی بھون کے اس منحوس کھنڈر سے صرف بھارتی فوجی ہی واقف تھے۔ بہر طور یہی گوشہ مجاہدین کے لیے چوہے دان ثابت ہوا تھا۔

اب شیر علی کی اس بروقت کارروائی کے بعد ان مجاہدین کے لیے اتنا ہی موقع کافی تھا کہ وہ نہ صرف اپنی جان بچا لیتے بلکہ آگے بڑھ کر دشمن پر کاری وار بھی کرتے۔ تاہم انہیں اس بات کی حیرت تھی کہ یہ ''کارنامہ'' آخر کس نے انجام دیا تھا؟

ادھر شیر علی نے اس سمت جست لگائی تھی جہاں کیپٹن بھگوت کے ٹولے پر اس نے دستی بم پھینکا تھا۔

وہ زخمی ہو کر فرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا مگر شیر علی ملک الموت بنا اس کے سر پہ جا پہنچا۔

''کدھر جا رہے ہو کیپٹن بھگوت؟ اپنی موت سے تو نظریں ملا لو ذرا۔''

شیر علی نے نفرت اور غیظ بھرے جوش تلے اسے للکارا تو اسے کھنڈر میں ہونے والی مدھم روشنی میں وہی ''ہاتھ بھر'' کا چھوکرا گن ہاتھ میں لیے کھڑا نظر آ گیا۔

''ظالم انسان! تو نے اس وادی کے معصوم اور بے گناہ لوگوں پر بہت ظلم ڈھائے ہیں، نہ جانے کتنی عفت مآب پاک دامن عورتوں کو اپنی ہوس کی بھینٹ چڑھایا ہے۔ دیکھ لے اپنی موت کا انجام اپنی آنکھوں سے اور مجھے بھی۔'' شیر علی کہتے ہوئے خون کے آنسو رو پڑا۔

''پہچان لے مجھے اے ظالم انسان کہ ہر ظلم کو زوال ہے اور ہر حوصلہ حق کو کمال زور ہے۔ میں وہی ہوں جس کے گھر پہ تو نے شب خون مارا۔ اسے آگ لگا دی۔ میری ماں کو بھی نہ چھوڑا، اور...... اور میری معصوم بہن زینو...... بھی تیری ہی بربریت کی بھینٹ چڑھی۔ دیکھا تھا اس معصوم کا حوصلہ کتنا کمال کا تھا تیرے اس شرمناک ظلم کے آگے کہ وہ تیری ہوس کی بھینٹ چڑھانے کے بجائے موت کو گلے لگانا زیادہ بہتر سمجھتی تھی اور اس نے وہی کیا بھی۔''

یہ کہتے ہی شیر علی نے اپنی گن کی نال اس کے سینے پر لگا دی۔ کیپٹن بھگوت کے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا۔ وہ معافی مانگنے لگا مگر شیر علی نے لبلبی دبا دی۔ اتنے قریب سے پڑنے والے گولیوں کے برسٹ نے کیپٹن بھگوت کھنپال کا ناپاک وجود بری طرح ادھیڑ کر رکھ دیا تھا۔

شیر علی پلٹا تو ٹھٹک کر رک گیا۔ سامنے شجاع اور رحیم اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہے تھے......

مجاہدین کو اس اہم ترین مہم میں فقید المثال کامیابی حاصل ہوئی تھی اور اس کامیابی کا سہرا انہوں نے شیر علی کے سر باندھا تھا...... کرنل ستیارام کو چھاؤنی چھوڑ کر بھاگنا پڑا تھا اور اس نے بھارت جا کر ہی دم لیا تھا۔

امیراں کدل پل کے موتی بھون میں واقع ایک بڑی بھارتی فوجی چھاؤنی کو تباہ کرنا مجاہدین کشمیر کا آنے والے وقتوں میں ایک بڑا کارنامہ تصور کیا جاتا رہا تھا، کیونکہ اس کے خاتمے کے بعد کافی عرصے تک وادی میں امن رہا تھا۔

شیر علی اور...... گل تور بھی اپنی وہ منزل پا چکے تھے جن کا ان دونوں نے بچپن سے ہی خواب دیکھ رکھا تھا۔

(ختم شد)